نجوم الفرقان

من تفسیر آیات القرآن

از رشحات قلم

حضرت علامہ مولانا
عبدالرزاق بھترالوی حطاروی

ناشر
ضیاء العلوم پبلی کیشنز راولپنڈی پاکستان

نجوم الفرقان فی تفسیر القرآن

کتاب لاریب کی توضیحات وتشریحات، علوم عقلیہ ونقلیہ کی روشنی میں
علمی وتحقیقی ذوق رکھنے والوں کے لئے قدیم وجدید احکامات ومسائل پر ابحاث کا حسین مرقع
تفسیر القرآن بالقرآن، ارشادات نبویہ، اقوال صحابہ، تحقیقات اسلاف اور روایات صحیحہ پر مشتمل تفسیر

مسمّٰی بہ

نجوم الفرقان

جلد چہارم

سورۃ البقرہ آیات 142 تا 195

از رشحات قلم

محقق اہلسنت
استاذ العلماء حضرت علامہ مولانا
عبد الرزاق بھترالوی حطاروی
مدظلہ العالی

ناشر ضیاء العلوم پبلی کیشنز راولپنڈی پاکستان

اشاعتی ضابطہ

نام کتاب: نجوم الفرقان من تفسیر آیات القرآن

تصنیف: علامہ مولانا عبد الرزاق چشتی بھترالوی

کمپوزنگ: ضیاء العلوم کمپوزنگ سنٹر سیٹلائیٹ ٹاؤن راولپنڈی

کمپیوٹر گرافکس: قاضی محمد یعقوب چشتی، اظہر اقبال اعوان

ضخامت: $\frac{20 \times 30}{8}$ 864 صفحات

پروف ریڈنگ: اظہر اقبال ملک

بار طبع: اوّل دسمبر 2006ء

قیمت: =/240 روپے

ناشر: سید شہاب الدین شاہ

ضیاء العلوم پبلی کیشنز راولپنڈی پاکستان

رابطہ: 0333- 5166587 - Fax 051-4580404
Email:ziauloom@isb.paknet.com.pk

عنوان	صفحہ

پیش لفظ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ وَالصَّلٰوةُ وَالسَّلَامُ عَلٰی اَشْرَفِ الْاَنْبِیَاءِ وَالْمُرْسَلِیْنَ

أما بعد ! خالق کائنات جل جلالہ نے اپنے پیارے حبیب ﷺ کی نسبت جلیلہ کا صدقہ اس اُمت کو جو ابدی پیغام قرآن مجید فرقانِ حمید کی صورت میں انعام فرمایا وہ بے مثال کلام ہے۔ یہ عظیم معجزہ ہونے کے ساتھ ساتھ علم ومعرفت کا بحر زخار ہے۔ اس بحر بے کنار میں جس نے بھی نیک نیتی سے غوطہ لگایا نئے موتی نکال کر لایا۔ اس کے دُرہائے یگانہ غیر متناہی ہیں۔ نہ ختم ہونیوالے اس سلسلہ کو اُمت مسلمہ کے کاملین نے ہر دور میں اپنائے رکھا اور آئندہ آنیوالی نسلوں کے لئے حکمت و دانش کے عظیم باب رقم فرماتے رہے۔

باب مدینة العلم حضرت علی رضی اللہ عنہ نے عظمت قرآنی اور اس کے رموز ودقائق کے دُرہائے بے بہا اور نہ ختم ہونے والی حقیقتوں کے متعلق مرفوعاً روایت فرمائی ہے۔

" قال اما انی سمعت رسول الله ﷺ يقول الا انها ستكون فتنة قلت ما المخرج منها يا رسول الله ؟ قال كتاب الله ، فيه نبأ ما قبلكم و خبر ما بعدكم و حكم ما بينكم ، هو الفصل ليس بالهزل ، من تركه من جبار قصمه الله ومن ابتغى الهدى في غيره اضلّه الله ، وهو حبل الله المتين ، وهو الذكر الحكيم ، وهو الصراط المستقيم ، هو الذى لا تزيغ به الأهواء ولا تلبس به الألسنة ، ولا يشبع منه العلماء ، ولا يخلق عن كثرة الرد ، ولا ينقضى عجائبه هو الذى لم تنتبه الجنُّ اذا سمعته حتى قالوا انا سمعنا قرانا عجبًا يهدى الى الرشد فامنا به من قال به صدق ، ومن عمل به اجر ، ومن حكم به عدل ، ومن عاد اليه هدى الى صراط مستقيم . "

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ خبردار میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا ہے آپ فرماتے تھے خبردار بے شک یہ قصہ عنقریب فتنہ بنے گا۔ میں نے عرض کی یا رسول اللہ

اس کے نکلنے کی جگہ کوئی ہوگی۔آپ نے فرمایا کہ اللہ کی کتاب؛ کیونکہ اس میں تم سے پہلے اور بعد والی امتوں کی خبریں ہیں۔اور تمہارے درمیان جو حوادث ہیں ان کا بھی فیصلہ ہے۔یہ قرآن حق و باطل کے درمیان فرق کرنے والا ہے۔جس نے اس کو کسی جبار کی وجہ سے چھوڑ دیا۔اللہ تعالیٰ اس کو توڑ دے گا۔اور جس نے اس کے غیر میں ہدایت کو تلاش کیا اللہ نے اس کو گمراہ کر دیا۔کیونکہ یہ اللہ کی مضبوط رسی ہے۔یہ ذکر، حکم اور صراط مستقیم ہے۔یہ وہ کلام ہے کہ اہل ہواء اس کی تبدیلی پر قادر نہیں ہیں۔اس کی وجہ سے زبانوں پر التباس نہیں آتا۔اس سے علماء سیر نہیں ہوتے۔اس کی قرأت کی تکرار بار بار لوٹاتے، قرأت کی لذت دوسروں سے سننے کی وجہ سے زائل نہیں ہوتی، کیونکہ اس کے عجائب ختم نہیں ہوتے، یہ وہ چیز ہے کہ جنوں نے جب اس کو سنا تو تو اس پر بلا توقف کہا کہ: ہم نے تعجب میں ڈالنے والے قرآن کو سنا ہے، جو بھلائی کی طرف ہدایت دیتا ہے، ہم اس پر ایمان لائے۔جس نے اس کے ساتھ کلام کیا وہ سچا ہوا، اور جس نے اس پر عمل کیا اس کو اجر دیا گیا، اور جس نے اس کے ساتھ فیصلہ کیا اس نے عدل کیا، جس نے اس کی طرف بلایا اس کو صراط مستقیم کی طرف ہدایت دی گئی۔

حضرت امام شعرانی اپنی مشہور زمانہ تصنیف ''الیواقیت والجواہر'' میں حضرت علی کرم اللہ وجہہ الکریم کا وہ ارشاد گرامی نقل کرتے ہیں جس کا مفہوم یہ ہے کہ اگر سورۂ فاتحہ شریف کی تفسیر لکھوں تو اس ایک چھوٹی سورت کے رموز کی تفسیر کا حجم اونٹوں کا بوجھ بن جائے مگر پھر بھی فاتحہ شریف کے رموز باقی رہیں گے۔

تاہم جس نے بھی اپنی فکر و دانش کو غالب کر کے قرآن مجید کے مفاہیم کو بیان کرنے کی کوشش کی اس کیلئے '' من قال فی القرآن برأیہ فقد أخطأ '' کے مصداق خائب و خاسر ہونا ہی نصیبہ بنا ہے۔

استاذ العلماء حضرت مولانا عبدالرزاق چشتی بھترالوی کہنہ مشق، نہایت محنتی اور فاضل مدرس ہونے کے ساتھ ساتھ زود نویس اور سہل نگاری کے بھی جامع ہیں۔آپ ان خوش نصیبوں میں سے ہیں جنہیں قسام ازل نے پیارے حبیب لبیب ﷺ کی نسبت صدقہ خدمت دین کی سعادت رفیق

فرمائی ہے۔

اللہ تعالیٰ جل مجدہ نے علامہ موصوف کو اسلام کی خدمت اور بالخصوص قرآن وسنت کے مفاہیم اور مطالبِ عالیہ کو قلم وقرطاس کے ذریعہ سہل انداز میں پیش کر کے عامۃ الناس کو بہرہ مند کرنے کا بہترین ملکہ ودیعت فرمایا ہے۔

حضرت مولانا فطری اور طبعی طور پر تدریسی شعبے سے متعلق ہیں۔ علمی خانوادے کا چشم و چراغ ہونے کے ناطے معقولات ومنقولات میں ید طولیٰ رکھتے ہیں۔ زندگی کا بیشتر حصہ اسی نہج پر راہ نوردی کرتے گزار دی ہے۔ آپ کے تلامذہ میں سے کئی محقق علماء اپنے علم وتحقیق کا لوہا منوا چکے ہیں۔

درس وتدریس سے متعلق آدمی کے لئے آسان پیرائے میں لکھنا کافی مشکل کام ہوتا ہے؛ کیونکہ ایسے شخص کو...... جو ہمہ وقت فنی اصطلاحات اور علمی محاورات بولنے اور کہنے کا عادی ہو ... مشکل تراکیب کو ترک کرنا قدرے دشوار ہوتا ہے۔ مگر مولانا موصوف اپنی تحریر میں پختگی زودنویسی کے ساتھ عامۃ الناس کے فہم وادراک کا بھی پورا پورا خیال رکھتے ہیں۔

آپ کے قلم سے کئی علمی شہپارے منصہ شہود پر آچکے ہیں، اہل علم اور قدردان عامۃ الناس کے ہاں قبولیت کا شرف پا چکے ہیں۔ میرے خیال میں آپ کی تصنیفات میں بالخصوص نصابی کتب کی شروحات وحواشی آپ کا بہت ہی وقیع کارنامہ ہے۔ اردوخواں طبقہ کے لئے یا درمیانے درجے کے خطباء کے لئے اردو کتابیں ہی بڑا سرمایا ہیں۔ ایسی کتابوں کی مقبولیت مصنف کے لئے حوصلہ افزائی کا باعث ضرور بنتی ہے لیکن وہ پائیدار فائدہ جس سے قابل علماء ومدرسین پیدا ہوتے ہیں وہ درسی کتابوں کا فہم وادراک ہی ہے۔

مولانا موصوف کی تصانیف میں عام قاری اور زیر تعلیم طلباء کے لئے ہی نہیں بلکہ ایک استاد کی سہولت کے لئے کافی علمی مواد موجود ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آپ کی عربی تصنیفات کو اہل علم کے ہاں قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ چند سال پہلے مجھے ساؤتھ افریقہ جانے کا اتفاق ہوا۔ ایک علمی مجلس میں انڈیا سے تشریف لائے ہوئے ایک عالم دین سے ملاقات ہوئی۔ جب انہیں یہ علم ہوا کہ میرا تعلق

جامعہ رضویہ ضیاء العلوم راولپنڈی پاکستان سے ہے تو بڑی خوشی کا اظہار فرمایا اور بتایا کہ حضرت مولانا عبدالرزاق چشتی بھترالوی کا نورالایضاح پر عربی حاشیہ ہمارے ہاں بڑا مقبول ہے۔اس حاشیہ وتوضیح کو اہل علم نے بڑا پسند کیا ہے۔

حضرت علامہ بھترالوی کا انداز تحریر انتہائی سادہ اور عام فہم ہے۔آپ قلم برداشتہ لکھنے کے عادی ہیں۔ادبی موشگافیوں کی طرف کم ہی توجہ دیتے ہیں۔تاہم مسائل ومفاہیم کا تذکرہ کرتے وقت اسلاف کرام کا تتبع کرتے ہوئے کوئی پہلو تشنہ چھوڑنے کو عار سمجھتے ہیں۔آپ کی تحریر کو پڑھ کر یوں محسوس ہوتا ہے کہ درس نظامی کے باذوق طلباء کو دورِ اسلاف کا کوئی عظیم مدرس سبق پڑھا رہا ہے اور کتاب کی عبارت کے مالھا اور ماعلیہا سے کوئی بھی نکتہ چھوڑنا نہیں چاہتا۔

حضرت مولانا ایک طویل مدت تک جامعہ رضویہ ضیاء العلوم کے تدریسی شعبہ میں عظیم الشان خدمات انجام دیتے رہے ہیں۔اس طویل عرصہ میں ہم نے آپ کو انتہائی محب اور شفیق پایا۔آپ کی ہمہ جہت شخصیت میں اور خوبیوں کے علاوہ ایک خوبی یہ بھی ہے کہ آپ وقت کی قدر کو جانتے ہیں۔اور ضیاع وقت اور اسکے نقصانات کا انہیں بھرپور احساس ہے۔اس لئے اپنا قیمتی وقت ضائع نہیں کرتے۔تدریسی خدمت بھی بہت محنت اور محبت سے انجام دیتے ہیں، بلکہ طلباء پر شفقت کرتے ہوئے ادارہ کے مقررہ تعلیمی وقت سے زائد اضافی اسباق پڑھاتے ہیں۔یہ استاد کی شفقت اور اپنے تلامذہ سے انتہائی محبت کی علامت ہے کہ زانوئے تلمذ طے کرنے والے طلباء کی تعلیم وتربیت شفقت ومحبت سے انجام دے۔

زیر نظر تصنیف قرآن مجید فرقانِ حمید کی تفسیر کا مقدمہ اور سورۃ فاتحہ کی تفسیر جو کہ حضرت مولانا کی تدریسی وعلمی تحقیقات کا پرتو اور مظہر ہے۔اگرچہ میں اس کا پورے طور پر مطالعہ نہیں کر پایا تاہم چند ایک مقامات سے دیکھنے کا اتفاق ہوا۔دیکھ اور پڑھ کر دل سے دعا نکلتی ہے۔ **اللّٰھم زد فزد۔**

تفسیر کو دیکھ کر جو تأثر قائم ہوا ہے وہ یہ کہ حضرت علامہ کی زندگی درس وتدریس کرتے گزری ہے۔طلباء وعلماء کو پڑھانے، سمجھانے، ان کے ذوق طبع کے مطابق انداز بیاں اور حسب استعداد طرز تکلم اپنانے کا سلیقہ ومہارت ہے۔اور دوسری طرف فقہی مسائل ومعاملات سے متعلق فتاویٰ کی ذمہ داری

بھی ایک عرصہ سے نباہ رہے ہیں جس کے باعث عامۃ الناس کو درپیش مسائل اور ان کے افہام و تفہیم کا تجربہ بھی رکھتے ہیں۔ بایں ہمہ دارالحکومت اسلام آباد میں امامت وخطابت کی سرکاری ذمہ داری کے باعث دورِ جدید کی ضروریات، جدت پسند طبقہ کی مذہبی وفکری ترجیحات ورجحانات اور ذہنی ارتقاء وتنزل سے بخوبی واقف ہیں۔ لہٰذا آپ کی تحریر میں ہر طبقہ کے لوگوں کی علمی تشفی کا ساماں ہے۔ البتہ آپ کی حیات پر تدریسی رنگ غالب ہونے کی وجہ سے آپ کی اس تصنیف میں بھی تشریح وتوضیحات کے ضمن میں یہی تدریسی ذوق غالب نظر آتا ہے۔

اسلاف کرام کی محبت ومودت میں راسخ ہیں۔ اختلاف آراء کی بھول بھلیوں میں بھی اسلاف کرام کی تحقیقات انیقہ سے اکتساب فیض کرنے کو اپنے لئے سعادت گردانتے ہیں۔ انتہائی خلیق طبیعت کے مالک ہیں۔ جی میں آئی بات کو کہہ گزرنے میں باک نہیں رکھتے۔

حضرت علامہ کا تعلق جس علمی خانوادے سے ہے وہ اپنی عظیم تاریخ اور روشن ماضی کے اعتبار سے انتہائی اعلیٰ اقدار کا حامل ہے۔ عصر حاضر کی ہمہ ہمی میں کئی ایک سلف صالحین کے راہِ حق کو خیر باد کہہ چکے ہیں مگر آپ کے پائے ثبات میں کوئی لغزش نہ آئی۔ یہ آپ کی ثابت قدمی کا ہی مظہر ہے کہ تنہا آپ نے تحریری میدان میں وہ کام کر دکھایا جو ایک پوری جماعت کے لئے بھی مشکل نظر آتا ہے۔

حق گوئی وبے باکی کے ساتھ ساتھ مولانا جب بھی اپنے مذہبی ومسلکی مخالفین کو مخاطب کرتے ہیں یا کسی اختلافی مسئلہ پر اظہار خیال کرتے ہیں تو اسلامی واخلاقی اقدار کا بھرپور خیال رکھتے ہوئے انتہائی شستہ انداز میں مخاطب کرتے ہیں۔ اور اصلاح وتبلیغ کے جذبہ سے سرشار ہو کر مخالفین اور ان کے پیروکاروں کو راہِ خطر سے محفوظ کرنے کا تہیہ کئے نظر آتے ہیں۔

دعا: اے ارحم الراحمین! اے اجیب دعوۃ الداع اذا دعان کی شان والے رب! تیرے جود وسخا کے مظہر، تیری رحمتوں کی بھرن عطا کرنے والے حبیب لبیب ﷺ نے تیری یہ شان ہمیں بتائی ہے کہ تو اپنے منگتوں کو خالی دامن نہیں لوٹاتا۔ اپنے سائل کو خالی ہاتھ لوٹاتے ہوئے تجھے حیا آتی ہے۔

الٰہی! تیری اسی کریمی کا واسطہ دے کرالتجا کرتا ہوں کہ میری اس دعا کوشرف قبولیت سے نواز!

''مولائے کریم حضرت مولانا کے علم وعمل میں برکتیں عطا فرما۔ان کی اس تصنیف کو پایہ تکمیل تک پہنچانے میں اپنی خصوصی نصرت عطا فرما۔ ان کے فیضان علمی کواور زیادہ وسعتیں دے۔ان کی ذریت نسبی وحسبی کوان کا حقیقی متبع بنا۔ہم سب کواپنے پیارے حبیب ﷺ کی حقیقی محبت سے آشنا فرمااوراسی میں زندہ رکھاوراسی محبت میں ہمارا خاتمہ فرما۔''

ایں دعائے من واز جملہ جہاں آمین باد

ان دعوات صالحہ اور ہدیہ تحسین کے ساتھ حضرت مولانا موصوف بلکہ ہر پائیدار، نفع بخش اور محنت طلب کام میں مصروف بزرگ کومشورہ پیش کرتا ہوں کہ کئی دفعہ معاصرانہ چشمک سے پیدا ہونے والے مرض تحاسد یاناپختہ اذہان کی کج بحثی فروعی وغیرضروری ابحاث کے گرداب میں پھنسا کردانستہ یا نادانستہ طور پر مقاصد عالیہ کی راہ سے برگشتہ کر لیتے ہیں ۔مقصد رفیع کی خاطران سے تغافل برتنا ضروری ہے وگرنہ اصلی مقصود پیش نظر رہنے کی بجائے ''شخصیت'' مقصد بن جاتی ہے۔لہٰذا خیر خواہی اسی میں ہے کہ ایسے جذبات انگیز موقع پرنہایت صبروتحمل سے کام لیتے ہوئے " والکاظمین الغیظ والعافین عن الناس "اور " اذا خاطبھم الجاھلون قالوا سلاما "کومشعل راہ بنایا جائے۔
وصلی اللہ تعالیٰ علی خیر خلقہ محمد و علی آلہ واصحابہ اجمعین

ابوالخیرحسین الدین غفرلہ (مہتمم وشیخ الحدیث)

جامعہ رضویہ ضیاء العلوم راولپنڈی پاکستان

﴿سَيَقُولُ السُّفَهَآءُ مِنَ النَّاسِ مَا وَلّٰهُمْ عَنْ قِبْلَتِهِمُ الَّتِي كَانُوا عَلَيْهَا قُلْ لِّلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ يَهْدِي مَنْ يَّشَآءُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيمٍ﴾

۱) ''اب کہیں گے بیوقوف لوگ کس نے پھیر دیا مسلمانوں کو ان کے اس قبلہ سے جس پر تھے تم فرمادو کہ پورب پچھم سب اللہ ہی کا ہے جسے چاہے سیدھی راہ چلاتا ہے''۔

۲) ''عنقریب کہیں گے بیوقوف لوگ کس نے پھیر دیا ان کو ان کے اس قبلہ سے جس پر وہ تھے تم فرمادو اللہ کے لئے ہی ہے مشرق اور مغرب ہدایت دیتا ہے جسے چاہے سیدھی راہ کی''۔

شانِ نزول: نبی کریم ﷺ جب مکہ مکرمہ میں تھے تو بیت المقدس کی طرف منہ کر کے نماز ادا فرماتے لیکن کعبہ شریف بھی آپ کے سامنے ہوتا۔ لیکن مدینہ طیبہ میں جب آپ تشریف لائے تو بیت المقدس ہی کی طرف متوجہ ہونے کا رب تعالیٰ نے آپ کو حکم دیا۔ مدینہ طیبہ میں چونکہ کعبہ شریف جنوبی جانب ہے اور بیت المقدس شمالی جانب ہے وہاں ممکن نہ تھا کہ بیت المقدس کی جانب توجہ کرنے سے کعبہ شریف بھی سامنے ہو۔

سولہ سترہ ماہ تو آپ بیت المقدس کی طرف متوجہ ہو کر نماز ادا فرماتے رہے لیکن آپ کی دلی تمنا تھی کہ جدامجد حضرت ابراہیم علیہ السلام کا قبلہ کعبہ شریف ہی ہمارا قبلہ بھی ہو جائے تو آپ کو کعبہ شریف کی طرف منہ کر کے نماز ادا کرنے کا حکم دے دیا گیا۔

لیکن اللہ تعالیٰ نے تحویل قبلہ سے پہلے ہی اس آیۃ کریمہ کو نازل فرما کر نبی کریم ﷺ کو تسلی دے دی کہ یہود، منافقین اور مشرکین جو بیوقوف لوگ ہیں وہ آپ کو طعنہ دیں گے کہ قبلہ سے تمہیں کس چیز نے پھیر دیا ہے لیکن آپ اطمینان قلب سے ان کو جواب دینا کہ رب تعالیٰ نے ہی بیت المقدس کو قبلہ بنایا تھا اسی نے اب کعبہ کو قبلہ بنا دیا ہے وہی ہر چیز کا مالک ہے، وہی مشرق و مغرب کا مالک ہے، وہ جس سمت کو چاہے قبلہ بنادے، ہم تو صرف اس کے حکم کو تسلیم کرنے والے ہیں اس کی ذات پر کوئی اعتراض

کرنے والے نہیں۔

﴿ سَيَقُوْلُ السُّفَهَآءُ مِنَ النَّاسِ ﴾ ''عنقریب کہیں گے بے وقوف لوگ''

ان الفاظ مبارکہ میں دو احتمال ہیں ایک یہ کہ اگرچہ ﴿ سیقول ﴾ مستقبل کا صیغہ ہے لیکن ماضی کے معنی میں استعمال ہے جیسا کہ کہا جاتا ہے '' الرجل یعمل عملا فیطعن فیه بعض اعدائه '' فلاں شخص کے کام پر اس کے دشمنوں نے اسے طعنہ دیا۔ اس قول کے مطابق قبلہ کے بدل جانے اور بیوقوفوں کے طعنہ کے بعد اس آیۃ کا نزول ہوا۔ مجازی طور پر معنی یہ ہوگا ''بے وقوف لوگوں نے کہا ان کو قبلہ سے کس چیز نے پھیر دیا''۔

لیکن دوسرا احتمال قوی ہے راقم نے بھی اس کے مطابق شان نزول ذکر کیا ہے دوسرا احتمال یہ ہے '' ان اللہ تعالیٰ اخبر عنهم قبل ان ذکروا هذا الکلام انهم سیذکرونه ''

کہ بیشک اللہ تعالیٰ نے اس آیۃ کریمہ کو پہلے نازل کر کے یہ خبر دے دی کہ وہ اس قسم کا کلام کریں گے یہی احتمال قوی ہے اس میں کئی فوائد پائے گئے ہیں۔

پہلا فائدہ : جب نبی کریم ﷺ نے واقعہ سے پہلے خبر دے دی کہ بے وقوف یہ کہیں گے انہوں نے وہی کہا '' کان هذا اخبارا عن الغیب فیکون معجزا '' تو یہ نبی کریم ﷺ کی غیبی خبر ہوگئی جو آپ کا معجزہ ہے سبحان اللہ علامہ رازی رحمہ اللہ نے نبی کریم ﷺ کے علم غیب کو آپ کا معجزہ کہا ہے۔

پھر یہ بھی واضح کر دیا کہ رب تعالیٰ نے اس آیۃ کریمہ کو نازل کر کے آپ کو پہلے علم عطا کر دیا جو آپ کا علم غیب ہے اسی سے ان لوگوں کا رد ہو گیا جو کہتے ہیں کہ جو رب تعالیٰ بتا دے وہ غیب نہیں رہتا کاش کہ رب تعالیٰ ان کو علم عطا فرما دے اور حق سمجھنے کی توفیق عطا فرمائے۔

دوسرا فائدہ : رب تعالیٰ نے جب پہلے ہی آپ کو بتا دیا کہ بیوقوف اس قسم کا کلام کریں گے تو نبی کریم ﷺ کو علم حاصل ہو گیا جب آپ نے ان سے وہی سنا جس کی آپ کو خبر دے دی گئی تھی۔ '' فانه یکون تأذیه من هذا الکلام اقل مما اذا سمعه منهم اولا '' تو آپ کو سن کر زیادہ تکلیف نہ ہوئی اگر آپ ان سے اچانک سنتے تو یقیناً آپ کو بہت تکلیف ہوتی۔

تیسرا فائدہ: اللہ تعالیٰ نے ان کے کلام کرنے سے پہلے ہی آپ کو خبر دے دی اور ساتھ ساتھ

جواب بھی ذکر کر دیا تو جب انہوں نے طعنہ زنی کی تو حضور ﷺ نے ان کو فوراً جواب دے دیا۔ نبی کریم ﷺ چونکہ رب تعالیٰ کے ارشاد گرامی کے منتظر رہتے تھے اس لئے پہلے بتا دینا بہتر تھا بنسبت اس کے کہ آپ جواب کا انتظار فرماتے کہ رب تعالیٰ کیا حکم فرماتا ہے۔ (از کبیر)

﴿اَلسُّفَهَآءُ﴾ کا ذکر پہلے ﴿كَمَا آمَنَ السُّفَهَآءُ﴾ کی وضاحت میں ہو چکا ہے تاہم "فان من لا یمیز بین ماله و علیه" جو شخص نفع نقصان میں فرق نہ کر سکے وہ بیوقوف ہے "ویعدل عن طریق منافعه الی ما یضره" جو شخص نفع مند چیزوں کو چھوڑ کر نقصان دہ چیزوں کے درپے ہو جائے وہ بیوقوف ہے "یوصف بالخفة و السفه" کم عقل کو سفیہ (بے وقوف) کہا جاتا ہے۔

اور یہ بھی خیال رکھا جائے کہ جو شخص دنیا کے معاملہ میں نقصان دہ راہ کو اختیار کرے جب اسے سفیہ (بیوقوف) کہا جاتا ہے تو یقیناً دین میں نقصان دہ راہ کو اختیار کرنا بہت بڑی بیوقوفی ہے کیونکہ "ولاشک ان الخطأ فی باب الدین اعظم مضرة منه فی باب الدنیا" اس میں کوئی شک نہیں کہ دین میں غلط راہ کو اختیار کرنا بہت زیادہ نقصان دہ ہے بنسبت دنیا میں غلط راہ پر چلنے کے۔ (از کبیر)

اَلسُّفَهَآءُ سے مراد کون لوگ ہیں؟

"قال ابن عباس و مجاهد هم الیهود" حضرت ابن عباس اور مجاہد رضی اللہ عنہم نے کہا اس سے مراد یہود ہیں اس لئے کہ جب نبی کریم ﷺ بیت المقدس کی طرف منہ کر کے نماز ادا کرتے تھے تو وہ لوگ یہ امید لگائے بیٹھے تھے کہ ابھی یہ نبی ہمارے قبلہ کی موافقت کر رہے ہیں آہستہ آہستہ مکمل طور پر ہمارے دین کی تابعداری کریں گے جب قبلہ شریف کے تبدیل کرنے کا حکم نافذ ہو گیا تو ان کو غم لاحق ہو گیا نبی کریم ﷺ سے اپنے آپ کو مکمل دور سمجھنے لگ گئے ان بیوقوفوں نے تحویل قبلہ پر ہی اعتراض کرنا شروع کر دیا جس کی خبر رب تعالیٰ نے پہلے ہی دے دی۔

وہ کہنے لگے کہ یہ شخص اپنے آباء کے دین کی طرف لوٹ گیا اور ان کے دین کا مشتاق ہو گیا اگر ہمارے قبلہ پر ثابت رہتا تو ہمیں معلوم ہوتا" انه الرسول المنتظر المبشر به فی التوراة" کہ بیشک یہ وہی رسول ہے جس کی انتظار کی جا رہی تھی اور جس کی آمد کی بشارت کی خبر توراۃ میں دی گئی۔

" وقال ابن عباس والبراء بن عازب والحسن والاصم انهم مشرکوا العرب "
حضرت ابن عباس اور براء بن عازب اوراصم رضی اللہ عنہم کا ایک قول یہ ہے کہ اس سے مراد مشرکین عرب ہیں۔اس لئے کہ جب نبی کریم ﷺ مکہ مکرمہ میں رہتے ہوئے بیت المقدس کی طرف منہ کر کے نماز ادا کرتے تو وہ لوگ اسے ناپسند کرتے اور اس سے تکلیف محسوس کرتے اور جب مدینہ طیبہ میں بیت المقدس سے پھر کر کعبہ شریف کی طرف متوجہ ہونے کا حکم ہوا تو وہ کہنے لگے کہ اب محمد ہمارے دین کی طرف لوٹ آئے ہیں۔

" ولو ثبت علیه لکان اولی به "اگر وہ اس پر ثابت رہے تو یہ ان کے لئے بہتر ہے۔

لیکن وہ بیوقوف بھی یہ کہہ رہے تھے کہ پہلے بیت المقدس کی طرف منہ کیوں کیا تھا اب کعبہ کی طرف منہ کیوں کیا ہے اس طرح کے ان کے لغویات کی خبر رب تعالیٰ نے پہلے ہی دے دی " وثالثها انهم المنافقون وهو قول السدی " اور تیسرا قول اس میں سدی رحمہ اللہ کا ہے کہ اس سے مراد منافقین ہیں وہ استہزاء (مزاح) کے طور پر قبلہ کے تبدیل کرنے پر اعتراض کرتے تھے کیونکہ وہ قبلہ کے بدلنے کی حکمت سے بے خبر تھے وہ کہہ رہے تھے کہ یہ قبلہ کی تبدیلی بے مقصد ہے اور فقط رائے اور خواہشات پر مبنی ہے اس آیۃ کریمہ میں بھی ﴿اَلسُّفَهَآءُ﴾ سے مراد منافقین ہی ہیں اور ﴿ اَلَآ اِنَّهُمْ هُمُ السُّفَهَآءُ وَلٰكِنْ لَّا يَعْلَمُوْنَ ﴾ میں بھی منافقین کو ہی بیوقوف کہا گیا ہے۔

تمام اقوال کا جامع قول:

" ورابعها انه یدخل فیه الکل " چوتھا قول یہ ہے کہ اس آیۃ کریمہ میں ﴿ اَلسُّفَهَآءُ ﴾ سے مراد یہود و مشرکین اور منافقین تمام ہی مراد ہیں یہی قول زیادہ بہتر ہے کیونکہ اس میں تمام اقوال سمٹ کر آ جاتے ہیں اور وجہ یہ بھی واضح ہے کہ اس مقام میں سیاق و سباق (پہلے اور بعد کلام) سے بھی کوئی تخصیص نہیں اس لئے ﴿ اَلسُّفَهَآءُ ﴾ سے مراد عموم ہے اور اس پر الف لام بھی استغراقی ہے جو عموم پر دلالت کر رہا ہے اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ " فلا کافر الا سفیه " کوئی کافر ایسا نہیں جو بے وقوف نہ ہو ہر کافر ہی بیوقوف ہے اور رب تعالیٰ نے ملت ابراہیمی سے اعراض کرنے والے تمام

لوگوں کو ہی بے وقوف کہا ہے۔

﴿ وَمَنْ يَّرْغَبُ عَنْ مِلَّةِ اِبْرَاهِيْمَ اِلَّا مَنْ سفه نَفْسه ﴾

لہٰذا اس آیۃ میں " فوجب ان يتناول الكل " ضروری ہے کہ السفہاء سے مراد یہود مشرکین اور منافقین تمام ہی ہوں عقل کا تقاضا بھی یہی ہے کہ تمام ہی مراد لئے جائیں۔

" لان الاعداء مجبولون على القدح والطعن فاذا وجدوا مجالا لم يتركوا مقالا البتة "

کیونکہ دشمنوں کا کام ہی یہ ہے وہ عیب لگائیں اور طعنہ دیں اس لئے وہ کوئی موقع اپنے ہاتھ سے جانے نہیں دیتے جب موقع ملا طعنہ زنی شروع کردی۔ (از بحر)

﴿ ماوَلّٰهُمْ عَنْ قِبْلَتِهِمُ الَّتِىْ كَانُوْا عَلَيْهَا ﴾

" کس چیز نے پھیر دیا ہے ان کو ان کے اس قبلہ سے جس پر وہ تھے "

" ما " استفہام کے لئے ہے جو استہزاء اور تعجب کے لئے وہ استعمال کرتے تھے یعنی کفار نے مسلمانوں پر عیب لگاتے ہوئے مزاح اڑاتے ہوئے کہا تمہیں قبلہ سے کس چیز نے پھیر دیا ہے۔ (از کبیر)

قبلہ کو قبلہ کہنے کی وجہ: قبلہ اس جہت کو کہتے ہیں جس کا انسان استقبال کرے اور یہ " مقابلہ " سے لیا ہوا ہے " وانما سميت القبلة قبلة لان المصلى يقابلها وتقابله " قبلہ کا نام اسی وجہ سے قبلہ رکھا گیا ہے کہ نمازی اس کے مقابل ہوتا ہے اور وہ نمازی کے مقابل ہوتا ہے۔

اور قطرب نے یہ کہا ہے کہ عرب حضرات اس معنی میں بھی قبلہ کا استعمال کرتے ہیں۔

" ليس لفلان قبلة اى ليس له جهة يأوى اليها " فلاں شخص کا قبلہ ہی نہیں یعنی اسے کسی جہت پر قرار نہیں قبلہ کو استقبال سے بھی ماخوذ کرتے ہیں جب دو شخص ایک دوسرے کے آمنے سامنے ہوں تو کہا جاتا ہے "فكل واحد منهما قبلة للآخر " ہر ایک، ایک دوسرے کا استقبال کر رہا ہے اور بعض محدثین نے کہا:

جعلت مأواک لی قرارا	وقبلة حيثما لجأت
تمہارا ٹھکانا میرے لئے قرار ہے	اور جہاں بھی جائے پناہ کی ضرورت ہو وہی میرا قبلہ ہے

﴿ قُلْ لِلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ ﴾ ''فرمادیجئے اللہ کے لئے ہی مشرق اور مغرب ہے''

یعنی سب جہات اللہ تعالیٰ کی ملکیت ہیں کوئی جہت بھی ذاتی طور پر قبلہ بننے کی مستحق نہیں " بل انما تصیر قبلة لان الله تعالیٰ جعلها قبلة " بلکہ قبلہ تو وہی ہوتا ہے جسے رب تعالیٰ قبلہ بنادے لہٰذا رب تعالیٰ جسے چاہے قبلہ بنادے ہر جہت اس کی مملوک ہے ہر چیز پر وہ قادر ہے اس سے سوال نہیں کیا جاسکتا تو کیا کر رہا ہے اس لئے ایک جہت سے قبلہ کو پھیر کر دوسری جہت کو قبلہ بنادے تو اس پر اعتراض نہیں کیا جاسکتا۔ (از کبیر)

﴿ يَهْدِي مَنْ يَّشَآءُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴾ ''ہدایت دیتا ہے جسے چاہے سیدھی راہ کی''

" وهو ما توتضيه الحكمة وتقتضيه المصلحة من التوجه الى بيت المقدس والكعبة اخرى" رب تعالیٰ کی حکمت کے مطابق ہے اور مصلحت کا تقاضا ہے کہ اس نے جب بیت المقدس کو قبلہ مقرر کرنے میں حکمت سمجھی اسے قبلہ بنادیا اور جب کعبہ شریف کو قبلہ مقرر کرنے میں حکمت سمجھی اسے قبلہ بنا دیا۔ بھلا کون سا انسان ہے جو رب تعالیٰ کے علم سے مقابلہ کر سکے۔ (ماخوذ از بیضاوی)

☆☆☆☆☆

وَكَذٰلِكَ جَعَلْنَاكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَاءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا وَمَا جَعَلْنَا الْقِبْلَةَ الَّتِىْ كُنْتَ عَلَيْهَا اِلَّا لِنَعْلَمَ مَنْ يَّتَّبِعُ الرَّسُوْلَ مِمَّنْ يَّنْقَلِبُ عَلٰى عَقِبَيْهِ وَاِنْ كَانَتْ لَكَبِيْرَةً اِلَّا عَلَى الَّذِيْنَ هَدَى اللّٰهُ وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُضِيْعَ اِيْمَانَكُمْ اِنَّ اللّٰهَ بِالنَّاسِ لَرَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ

۱) ''اور بات یوں ہی ہے کہ ہم نے تمہیں کیا سب امتوں میں افضل کہ تم لوگوں پر گواہ ہو اور یہ رسول تمہارے نگہبان و گواہ اور اے محبوب تم پہلے جس قبلہ پر تھے ہم نے وہ اس لئے مقرر کیا تھا کہ دیکھیں کون رسول کی پیروی کرتا ہے اور کوئی الٹے پاؤں پھر جاتا ہے اور بیشک یہ بھاری تھی مگر ان پر جنھیں اللہ نے ہدایت کی۔ اور اللہ کی شان نہیں کہ تمہارا ایمان اکارت کرے بیشک اللہ آدمیوں پر بہت مہربان رحم والا ہے''۔

۲) ''اور اسی طرح بنایا ہم نے تمہیں افضل امت، کہ تم لوگوں پر گواہ بنو۔ اور ہوں یہ رسول تمہارے نگہبان و گواہ اور نہیں بنایا ہم نے قبلہ جس پر تم تھے سوائے اس کے کہ ہم آزمائیں کون تابعداری کرتا ہے رسول کی اور کون پھر جاتا ہے الٹے پاؤں اور بیشک یہ بھاری تھی سوائے ان لوگوں کے جن کو اللہ نے ہدایت دی اور نہیں اللہ تعالیٰ ضائع کرتا تمہاری نمازوں کو بیشک اللہ لوگوں پر بہت مہربان، رحم کرنے والا ہے''۔

شانِ نزول : یہود وغیرہ جو قبلہ شریف کے تبدیل ہونے پر مسلمانوں کو طعنہ دے رہے تھے کہ کس چیز نے تمہیں قبلہ سے پھیر دیا ہے تو ان کو ایک اور جواب دینے کے لئے آیۃ کریمہ کو نازل کیا کہ قبلہ شریف کو بدلنے میں درحقیقت لوگوں کی آزمائش مقصود تھی کہ کون لوگ رسول اللہ ﷺ کی تابعداری کرتے ہیں اور کون الٹے پاؤں پھر جاتے ہیں۔

اور اس آیۃ کریمہ میں نبی کریم ﷺ کی امت کی افضلیت کو بھی بیان کر دیا گیا۔ اور مسلمانوں کی اس پریشانی کو بھی دور کر دیا گیا کہ جو لوگ قبلہ کے تبدیل ہونے سے پہلے بیت المقدس کی طرف منہ کر کے نمازیں ادا کرتے رہے کیا ان کی نمازیں ضائع تو نہیں ہوئیں تو ان کو ﴿ وما کان اللہ لیضیع ایمانکم ﴾ سے جواب دے دیا گیا جس کا ذکر ان شاء اللہ آگے آرہا ہے۔

﴿ وَكَذٰلِكَ جَعَلْنَاكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا ﴾ ''اور اسی طرح ہم نے بنایا تمہیں افضل امت''

﴿ كَذٰلِكَ ﴾ کا اشارہ ہے پہلی آیۃ کے مفہوم کی طرف، یعنی جس طرح ہم نے تمہیں ہدایت دی سیدھی راہ کی۔ اسی طرح ہم نے تمہیں افضل بنایا۔

یا اس کا مطلب یہ ہے کہ جس طرح ہم نے تمہارا قبلہ تمام قبلوں سے افضل بنایا اسی طرح ہم نے تمہیں تمام امتوں سے افضل امت بنایا۔

﴿ وسطا ﴾ " ای خیارا او عدولا " یعنی وسط کا معنی بہتر اور افضل ہے اگرچہ لغوی معنی کے لحاظ پر درمیان میں جو چیز واقع ہوا سے ''وسط'' کہا جاتا ہے لیکن یہاں صفت ہے امت کی جس کا معنی ''خیر'' ہے کیونکہ دوسری آیۃ کریمہ سے اس معنی کو تائید حاصل ہے رب تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ ﴾ ''تم بہتر امت ہو''

اور وسط کا معنی عادل ہونا بھی ہے ترمذی شریف میں حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے " عن النبی ﷺ انه فسر وسطا فی هذه الآیة بقوله عدلا " کہ نبی کریم ﷺ نے اس آیۃ کریمہ میں " وسطا " کی تفسیر عادل ہونے سے فرمائی ہے۔ اب مطلب یہ ہوگا کہ ہم نے تمہیں عادل امت بنایا اور معنی یہ ہے " مزکین بالعلم والعمل " کہ ہم نے تمہیں پاکیزہ بنایا کہ علم اور اچھے اعمال عطا کیے۔

یعنی گناہوں اور جہالت کی میل کچیل سے پاکیزہ بنایا اور علمی فضیلت عطاء کی اور اچھے اعمال سے مزین کیا " ولا شک ان من کان مزکی بالعلم والعمل جامعا بینهما یکون

خیراو عدلا " یقینی بات ہے جوشخص علم اور اچھے اعمال کی وجہ سے پاکیزگی حاصل کرلیتا ہے وہ بہتر بھی ہوتا ہے اور عادل بھی ہوتا ہے اور تمام اچھی خصلتیں حاصل ہوتی ہیں جو افراط وتفریط (زیادتی اور کمی) کے درمیان پائی جاتی ہیں جیسا کہ جودان کو حاصل ہے جو بخل اور اسراف کے درمیان پایا جاتا ہے اور شجاعت ان کو حاصل ہے جو بزدلی اور بلاوجہ کسی پر زیادتی کرنے کے درمیان میں ہے۔

فائدہ: انسان کی ترکیب میں تین قوتیں رکھی گئی ہیں ایک مبدأ ادراک حقائق، دوسری مبدأ وجوب منافع اور تیسری عظیم ہولناک کاموں پر مبدأ اقدام اور گناہوں سے بچنے کا شوق۔

پہلی قوت کا نام ہے قوت نطقیہ جب اس میں اعتدال پایا جائے تو اس سے حاصل ہونے والی قوت کا نام ہے حکمت۔

دوسری قوت کا نام ہے قوت شہویہ۔ جب اس میں اعتدال پایا جائے تو اس سے حاصل ہونے والی قوت کو عفت کہا جاتا ہے۔

تیسری قوت غضبیہ ہے جب اس میں اعتدال پایا جائے تو اس سے حاصل ہونے والی قوت کو شجاعت کہا جاتا ہے۔ یہ تین خصلتیں یعنی حکمت اور عفت اور شجاعت تمام اچھے کاموں کے لیے اصل ہیں باقی تمام کیفیات اور اچھی عادات ان کے اوپر متفرع ہیں اور یہ تینوں کیفیات افراط اور تفریط کے درمیان ہیں افراط اور تفریط دونوں رذیل (گھٹیا) ہیں اور درمیانی کیفیت ہی بہتر ہے۔

حکمت: یہ وہ کیفیت اور قوت ہے جو انسان کو طاقت بشریہ کے مطابق حقائق کی معرفت حاصل ہو اور اس میں افراط کو" جربزہ" کہا جاتا ہے افراط یہ ہے کہ فکر کو ان چیزوں میں استعمال کیا جائے جن میں استعمال نہیں کرنا چاہئے جیسے آیات متشبہات۔

اور اس میں تفریط کو" غباوۃ " کہا جاتا ہے کیونکہ اس میں قوت فکریہ کو مکمل طور پر معطل رکھا جاتا ہے یعنی اس سے کوئی کام نہیں لیا جاتا۔

شجاعت: انسان کو درندگی والی ایک قوت حاصل ہے اگر اسے حکمت اور علم اور صحیح سمجھداری کے مطابق استعمال کیا جائے تو اسے شجاعت کہا جاتا ہے اور اگر اس میں افراط (زیادتی) پائی جائے تو اسے" تہور" کہا جاتا ہے یہ جیسا کہ " الاقدام علی مالا ینبغی " یعنی نامناسب چیزوں کی طرف

قدم بڑھانا۔ اور اس میں تفریط کو ''جبانۃ'' کہا جاتا ہے یعنی بزدلی سے کام لینا۔

عفت : انسان کو چوپاؤں والی قوت شہویہ حاصل ہے اگر انسان اسے معتدل طور پر اپنے کام میں لائے اور حکمت کے مطابق اس سے کام لے یعنی وہ شریعت کے مطابق ہو تو اسے عفت کہا جاتا ہے اور اگر حد سے بڑھ جائے تو اسے ''خلاعۃ'' کہا جاتا ہے یعنی ایسی لذات اور خواہشات میں منہمک ہو جانا (کامل ان میں مبتلاء ہو جانا) جو شریعت کے خلاف ہو۔ اور اس میں تفریط کو ''جمود'' کہا جاتا ہے یعنی جن لذات اور خواہشات کے حاصل کرنے کی عقلاً اور نقلاً اجازت ہو یعنی شریعت اجازت دے اور عقل بھی جائز سمجھے پھر ان سے دور رہنا۔

نتیجہ واضح ہوا " ان الاوساط فضائل والاطراف رذائل " درمیانی صورت فضیلت والی ہے اور دونوں طرفیں یعنی افراط اور تفریط گھٹیا کیفیتیں ہیں۔ جب یہ تینوں چیزیں انسان کو حاصل ہو جائیں یعنی حکمت اور عفت اور شجاعت تو انسان کو خود بخود عدالت حاصل ہو جاتی ہے اسی لئے " وسطا " کی تفسیر " عدولا " سے کی گئی ہے۔ (بیضاوی و شیخ زادہ)

تنبیہ: اگرچہ " وسطا " کی تفسیر ''خیرا'' سے بھی کی گئی ہے اور " عدولا " سے بھی لیکن " خیرا " سے تفسیر زیادہ بہتر ہے جس میں چند وجوہ پائی گئی ہیں:

ایک وجہ تو یہ ہے کہ ''وسط'' خیر کے معنی میں جمادات میں بھی استعمال ہے لیکن ''وسط'' عادل کے معنی میں جمادات میں استعمال نہیں۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ ''وسط'' کو خیر کے معنی میں استعمال کیا جائے تو دوسری آیۃ کریمہ ﴿ كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ ﴾ کی مطابقت حاصل ہو جائے گی۔

تیسری وجہ یہ ہے کہ عام محاورہ میں بھی ''وسط'' خیر کے معنی میں زیادہ استعمال ہے جیسا کہ کہا جاتا ہے " فلان اوسطنا نسبا " اس کا معنی مراد لیا جاتا ہے " انہ اکثر فضلا " کہ بیشک وہ زیادہ فضیلت رکھنے والا ہے۔ اسی طرح کہا جاتا ہے " ھذا وسط فیھم کواسطة القلادة " یہ ان میں ایسے افضل ہے جیسے ہار کو فضیلت حاصل ہوتی ہے ''وسط'' کو اس لئے بھی افضل کہا جاتا ہے کہ رئیس کے

اردگرد اس کے متبعین گھیرا بنا کر بیٹھتے ہیں اور وہ وسط میں ہوتا ہے اور اسے افضلیت حاصل ہوتی ہے۔

چوتھی وجہ یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ کی امت افراط اور تفریط کے درمیان ہے نہ ان میں غلو ہے اور نہ ہی ان میں تقصیر پائی جاتی ہے یعنی نصرانیوں کی طرح ان میں غلو نہیں کہ نبی کو اللہ کا بیٹا مان لیا جائے یا نبی کو خدا مان لیا جائے اور نہ ہی یہودیوں کی طرح ان میں تقصیر پائی جاتی ہے جیسا کہ انہوں نے انبیاء کرام کو شہید کیا اور کتب کو تبدیل کر دیا۔ (از کبیر)

اسی آیۃ کریمہ سے معتزلہ کا رد ہو گیا:

معتزلہ کا مذہب یہ ہے کہ انسان اپنے اعمال کا خود خالق ہے لیکن رب تعالیٰ نے ﴿ وکذلک جعلناکم امۃ وسطا ﴾ ''اور اسی طرح ہم نے بنایا تمہیں افضل امت'' اس سے واضح ہوا کہ بندے کے تمام افعال کا خالق اللہ تعالیٰ ہے " **لان ھذہ الآیۃ دالۃ علی ان عدالۃ ھذہ الامۃ وخیریتھم بجعل اللہ وخلقہ** " کیونکہ اس آیۃ کریمہ سے واضح ہو رہا ہے کہ اس امت کو عدالت اور افضلیت اللہ تعالیٰ کی تخلیق سے حاصل ہے۔ (از کبیر)

اجماع امت دلیل ہے: اس مسئلہ میں جمہور اہل سنت اور معتزلہ کا اتفاق ہے کہ اجماع امت حجت (دلیل) ہے اس مسئلہ پر دلیل یہ پیش کی گئی ہے:

" **اخبر اللہ تعالیٰ عن عدالۃ ھذہ الامۃ عن خیریتھم فلوا قدموا علی شئی من المحظورات لما اتصفوا بالخیریۃ واذا ثبت انھم لا یقدمون علی شئی من المحظورات وجب ان یکون قولھم حجۃ** "

اللہ تعالیٰ نے جب اس امت کی عدالت اور خیریت وافضلیت کی خبر دی تو اگر یہ لوگ ممنوعات پر متفق ہو جائیں تو ان کی صفت خیریت سے بیان نہیں ہو سکتی جب یہ ثابت ہو گیا کہ تمام ممنوع اشیاء پر اتفاق نہیں کر سکتے تو اسی سے واضح ہو گیا کہ اجماع امت حجت ہے۔ (کبیر)

اعتراض : اس امت کے کتنے لوگ گناہوں کا ارتکاب کرتے ہیں نیکیوں کو چھوڑ دیتے ہیں تو یہ کس طرح افضل امت اور کس طرح ان کا اجماع حجت ہے؟

جواب : اس امت کی افضلیت کا ذکر پہلے ہو چکا ہے کہ بنسبت یہود ونصاری کے یہ افضل ہے کہ نہ تو انہوں نے انبیاء کرام کو رب تعالیٰ کا شریک مانا اور نہ ہی خدا کا بیٹا مانا اور نہ ہی دین میں تحریف کی اور نہ ہی انبیاء کرام کو شہید کیا پھر اگر ان سے گناہ سرزد ہو جائے تو سچے دل سے توبہ کر لیں تو ان کی توبہ قبول ہو جاتی ہے۔

پھر یہ تمام کے تمام گناہ پر متفق نہیں ہو سکتے، پس اجماع امت کے حجت ہونے پر یہی دلیل کافی ہے اور اجماع امت کے حجت ہونے پر معصوم ہونا ضروری نہیں اور مجتہدین کا اجتہادی خطاء سے محفوظ ہونا بھی ضروری نہیں کیونکہ اجتہادی خطا حقیقت میں خطا نہیں۔ (از روح المعانی)

﴿ لِتَكُونُوا شُهَدَاءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُونَ الرَّسُولُ عَلَيْكُمْ شَهِيدًا ﴾: ''تا کہ تم لوگوں پر گواہ بن جاؤ اور رسول تم پر نگہبان و گواہ''یعنی تمہیں افضل امت بنایا تا کہ تم لوگوں پر گواہی دو۔

" عن عائشة رضی اللہ عنہا قالت قال رسول اللہ ﷺ یعنی فی اھل الکتاب انھم لایحسدوننا علی شئی کما یحسدوننا علی یوم الجمعة التی ھدانا اللہ لھا وضلوا عنھا وعلی القبلة التی ھدانا اللہ لھا وضلوا عنھا وعلی قولنا خلف الامام آمین "(مسند احمد)

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اہل کتاب ہمارے ساتھ کسی چیز میں حسد نہیں کرتے جیسا کہ وہ (تین چیزوں میں ہمارے ساتھ حسد کرتے ہیں) جمعہ کے دن پر ہمارے ساتھ حسد کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں وہ عطاء کیا اور وہ اس سے محروم رہے اور قبلہ پر وہ ہمارے ساتھ حسد کرتے ہیں جو اللہ تعالیٰ نے ہمیں عطاء کیا اور ان کو اس سے محروم کیا اور وہ ہمارے ساتھ امام کے پیچھے آمین پڑھنے میں حسد کرتے ہیں یعنی وہ اس سے محروم ہیں۔

اور گویا کہ رب تعالیٰ نے فرمایا کہ ہم نے تمہارے لئے قبلہ کو تبدیل کر کے تمہیں ابراہیم علیہ السلام والا قبلہ عطاء کر دیا اور وہی تمہارے لئے اختیار فرمایا تا کہ تمہیں تمام امتوں سے افضلیت حاصل ہو اور تم لوگوں پر قیامت کے دن گواہی دو " لان الجمیع معترفون لکم بالفضل "اس لئے کہ تمام تمہاری فضیلت کے معترف ہیں۔

نبی کریم ﷺ کی امت کی گواہی پر احادیث مبارکہ:

"عن ابی سعید قال قال رسول الله ﷺ یدعی نوح یوم القیامة فیقال له هل بلغت فیقول نعم فیدعی قومه فیقال لهم هل بلغکم فیقولون ما اتانا من نذیر و ما اتانا من احد فیقال لنوح من یشهدلک فیقول محمد و امته"

حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ نوح علیہ السلام کو قیامت کے دن بلایا جائے گا ان کو کہا جائے گا کیا تم نے تبلیغ فرمادی تھی آپ عرض کریں گے۔ ہاں (ان کو تیرا پیغام پہنچا دیا تھا) پھر آپ کی قوم کو بلایا جائے گا ان سے پوچھا جائے گا کیا تمہیں انہوں نے تبلیغ کردی تھی۔ وہ کہیں گے ہمارے پاس تو کوئی ڈرانے والا نہیں آیا اور ہمارے پاس تو کوئی ایک بھی نہیں آیا تھا۔ نوح علیہ السلام کو کہا جائیگا تمہاری گواہی کون دے گا وہ کہیں گے حضرت محمد ﷺ اور ان کی امت۔

(مسند احمد)

"عن ابی سعید الخدری قال قال رسول الله ﷺ یجئی النبی یوم القیامة ومعه الرجلان و اکثر من ذلک فیدعی قومه فیقال لهم هل بلغکم هذا فیقولون لا فیقال له هل بلغت قومک فیقول نعم فیقال من یشهد لک فیقول محمد و امته فید عی محمد و امته فیقال لهم هل بلغ هذا قومه فیقولون نعم فیقال و ما علمکم فیقولون جاء نبینا فاخبرنا ان الرسل قد بلغوا" (مسند احمد)

حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا قیامت کے دن نبی آئیں گے ان کے ساتھ دو آدمی یا دو سے زیادہ ہوں گے ان کی قوم کو بلایا جائے گا ان سے پوچھا جائے گا کیا تمہیں نبی نے تبلیغ کردی تھی وہ کہیں گے نہیں۔ پھر اللہ تعالیٰ اپنے نبی سے پوچھے گا، کیا تم نے ان کو تبلیغ کردی تھی وہ کہیں گے ہاں (اے اللہ تبلیغ کردی تھی) پھر ان کو کہا جائے گا تمہارا گواہ کون ہے وہ کہیں محمد ﷺ اور ان کی امت۔ نبی کریم ﷺ کی امت سے پوچھا جائے گا کیا اس نبی نے اپنی امت کو رب تعالیٰ کا پیغام پہنچا دیا تھا؟ وہ کہیں گے ہاں انہوں نے پیغام پہنچا دیا تھا پھر ان سے پوچھا جائے گا تمہیں کیسے علم حاصل ہے وہ کہیں گے ہمارے نبی کریم ﷺ ہمارے پاس تشریف لائے انہوں نے ہمیں خبر دی کہ بیشک رسولوں نے اپنی اپنی امتوں کو رب تعالیٰ کے احکام پہنچا دیئے تھے۔

اللہ تعالیٰ کے ارشاد گرامی

لِتَكُونُوا شُهَدَاءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُونَ الرَّسُولُ عَلَيْكُمْ شَهِيدًا ۚ

کا یہی مطلب ہے۔

امت مصطفی ﷺ کی گواہی کا ایک اور مطلب

نبی کریم ﷺ کی امت کے لوگ جب کسی شخص کے نیک اعمال کی گواہی دے دیں تو وہ گواہی اس کے حق میں قبول ہو جاتی ہے اور جب کسی شخص کے برے اعمال کی گواہی دے دیں تو وہ اسی طرح قبول کر لی جاتی ہے۔

عن جابر بن عبد الله قال شهد رسول الله ﷺ جنازة في بني مسلمة وكنت الى جانب رسول الله ﷺ فقال بعضهم والله يا رسول الله لنعم المرء كان لقد كان عفيفا مسلما وكان واثنوا عليه خيرا فقال رسول الله ﷺ انت بما تقول فقال الرجل الله اعلم بالسرائر فاما الذي بدالنا منه فذاك فقال النبي ﷺ وجبت ثم شهد جنازة في بني حارثة وكنت الى جنب رسول الله ﷺ فقال بعضهم يا رسول الله بئس المرء كان ان كان لفظا غليظا فاثنوا عليه شرا فقال رسول الله ﷺ لبعضهم انت بالذي تقول فقال الرجل الله اعلم بالسرائر فاما الذي بدالنا منه فذاك فقال رسول الله ﷺ وجبت قال مصعب بن ثابت فقال لنا عند ذلك محمد بن كعب صدق رسول الله ﷺ ثم قرأ ﴿وَكَذَٰلِكَ جَعَلْنَاكُمْ أُمَّةً وَسَطًا لِّتَكُونُوا شُهَدَاءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُونَ الرَّسُولُ عَلَيْكُمْ شَهِيدًا﴾ قال الحاكم هذا حديث صحيح الاسناد ولم يخرجاه (مستدرک حاکم)

حضرت جابر بن عبداللہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ بنی سلمہ کے جنازہ میں تشریف لے گئے اور میں بھی نبی ﷺ کے ساتھ ہی ایک جانب تھا بعض لوگوں نے کہا قسم ہے اللہ تعالیٰ کی یا رسول اللہ یہ شخص بہت پاک دامن تھا، کامل مسلمان تھا، عام لوگ اسے بہت اچھے الفاظ سے یاد کر رہے تھے اس کی بہت اچھی نیکیوں سے تعریف کر رہے تھے نبی کریم ﷺ نے ایک شخص کو فرمایا کیا واقعی یہ شخص نیک تھا؟ تو اس شخص نے عرض کیا یا رسول اللہ چھپے ہوئے بھید تو اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے جو ہمیں ظاہر طور پر معلوم ہے وہ یہی ہے کہ یہ شخص بہت نیک تھا رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "وجبت" ثابت ہوگئی (یعنی تمہاری گواہی

اس کے حق میں قبول ہوگئی جنت اس کے لئے ثابت ہوگئی) پھر آپ بنی حارثہ کے جنازہ میں تشریف لے گئے میں رسول اللہ ﷺ کے ساتھ ہی ایک جانب تھا بعض حضرات نے کہا یا رسول اللہ یہ بہت برا انسان تھا، بڑا بدمزاج بدخلق تھا ان لوگوں نے اس کی برائیوں کو ہی بیان کیا۔ رسول اللہ ﷺ نے ان میں سے ایک شخص سے پوچھا کیا واقعی وہ ایسا ہی تھا جو تم کہہ رہے ہو تو اس شخص نے عرض کیا کہ چھپی ہوئی باتوں کو تو اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتا ہے لیکن ظاہر طور پر ایسا ہی تھا جیسا ہم کہہ رہے ہیں تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا" وجبت " ثابت ہوگئی (یعنی تمہاری گواہی قبول ہوگئی وہ رب تعالیٰ کی گرفت میں آ گیا) مصعب بن ثابت نے کہا کہ حضرت جابر کی اس روایت کو محمد بن کعب نے بیان کرنے کے بعد فرمایا رسول اللہ کا ارشاد گرامی سچا ہے پھر انہوں نے یہی آیۃ کریمہ تلاوت کی۔ حاکم نے بیان فرمایا کہ یہ حدیث صحیح ہے اگرچہ بخاری و مسلم نے بیان نہیں فرمائی اس سے یہ بھی واضح ہوگیا کہ حدیث کے صحیح ہونے کے لئے کسی خاص کتاب میں حدیث کا واقع ہونا ضروری نہیں۔

☆ "عن ابی الاسود انه قال اتیت المدینة فوافقتها وقد وقع بها مرض فهم یموتون موتا ذریعا فجلست الی عمر بن الخطاب فمرت به جنازة فاثنی علی صاحبها خیر فقال وجبت ثم مربأخری فاثنی علیها شر فقال عمر وجبت فقال ابو الاسود ما وجبت یا امیر المؤمنین قال قلت کما قال رسول الله ﷺ ایما مسلم شهدله اربعة بخیر ادخله الله الجنة قال فقلنا وثلاثة قال فقال وثلاثة قال فقلنا واثنان قال واثنان ثم لم نسأله عن واحد "

(مسند احمد وکذا رواه البخاری والترمذی والنسائی)

ابوالاسود کہتے ہیں کہ میں مدینہ طیبہ میں آیا وہاں اتفاقاً عام بیماری پھیلی ہوئی تھی جس کی وجہ سے لوگ جلدی جلدی فوت ہو رہے تھے میں حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے پاس بیٹھا ہوا تھا وہاں سے ایک جنازہ گزرا لوگوں نے اس کی خیریت کی تعریف کی یعنی اس کی خوبیاں، نیکیاں بیان کیں تو آپ نے فرمایا " وجبت " ثابت ہوگئی۔ کچھ دیر کے بعد دوسرے جنازہ کا گزر ہوا تو اس کی برائیوں کو بیان کیا گیا کہ یہ شخص تو بہت برا تھا تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا " وجبت " ثابت ہوگئی ابوالاسود کہتے ہیں میں نے پوچھا اے امیر المؤمنین " ما وجبت " کیا چیز ثابت ہوگئی آپ نے فرمایا میں نے وہی کہا جو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جب کسی مسلمان کے لئے چار آدمی گواہی دے دیں کہ وہ نیک

شخص تھا تو اللہ تعالیٰ اسے جنت میں داخل کرے گا ہم نے پوچھا اگر تین شخص گواہی دیں تو آپ نے فرمایا تین کی گواہی بھی اسی طرح قبول ہوگی ہم نے کہا اگر دو گواہی دیں تو آپ نے فرمایا دو کی گواہی بھی اسی طرح قبول ہوگی ابوالاسود کہتے ہیں کہ پھر ہم نے ایک کے متعلق سوال نہیں کیا۔

☆ " عن ابی بکر بن ابی زهیر الثقفی عن ابیه قال سمعت رسول الله ﷺ بالنباوة یقول یوشک ان تعلموا خیارکم من شرارکم قالوا بم یا رسول الله بالثناء الحسن والثناء السیئ انتم شهداء الله فی الارض " (ابن مردویه)

ابوبکر بن زہیر ثقفی اپنے باپ سے بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے لوگوں کے کلام کے انتقال کے متعلق سنا آپ ارشاد فرما رہے تھے کہ تمہیں خود ہی پتہ چل جائے گا کہ نیک لوگ کون ہیں اور برے کون صحابہ کرام نے پوچھا یا رسول اللہ وہ کیسے آپ نے فرمایا اچھی تعریف سے (نیکوں کا پتہ چل جائے گا) اور بری تعریف سے (برے لوگوں کا پتہ چل جائے گا) تم لوگ زمین میں اللہ کے گواہ ہو۔

(ماخوذ از ابن کثیر)

چار گواہیوں کا بیان: ایک گواہی ان فرشتوں کی ہوگی جو بندوں کے اعمال پر مقرر ہیں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ﴿ وجاءت کل نفس معها سائق وشهید ﴾ (ق ۲۱) اور ہر جان یوں حاضر ہوئی کہ اس کے ساتھ ایک ہانکنے والا اور ایک گواہ۔ یعنی گناہ گار، کفار کو ہانک کر جہنم میں لے جانے والا فرشتہ ان کے ساتھ ہوگا اور لوگوں کے اعمال کی گواہی دینے والا فرشتہ بھی ان کے ساتھ ہوگا۔ اور رب تعالیٰ کا ارشاد گرامی ہے:

﴿ مَا يَلْفِظُ مِنْ قَوْلٍ اِلَّا لَدَيْهِ رَقِيْبٌ عَتِيْدٌ ﴾ (ق ۱۸)

''کوئی بات وہ زبان سے نہیں نکالتا کہ اس کے پاس ایک محافظ تیار نہ بیٹھا ہو''

اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی ہے:

﴿ وَاِنَّ عَلَيْكُمْ لَحَافِظِيْنَ كِرَامًا كَاتِبِيْنَ يَعْلَمُوْنَ مَا تَفْعَلُوْنَ ﴾ (الانفطار ۱۰ تا ۱۲)

''اور بیشک تم پر کچھ نگہبان ہیں، معزز لکھنے والے، جانتے ہیں جو تم کرتے ہو''

دوسری گواہی انبیاء کرام کی ہے اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسٰی علیہ السلام کی گواہی کا ذکر فرمایا:

﴿ وَكُنْتُ عَلَيْهِمْ شَهِيْدًا مَّا دُمْتُ فِيْهِمْ ﴾ (المائدہ ۱۱۷) اور میں ان پر گواہ رہا جب تک

میں ان میں موجود رہا اور نبی کریم ﷺ کا اپنی امت کے حق میں گواہی دینے کا ذکر ان الفاظ مبارکہ سے فرمایا:

﴿ وَيَكُونَ الرَّسُولُ عَلَيْكُمْ شَهِيدًا ﴾ ''اور ہوں گے رسول تم پر گواہ و نگہبان''

تیسری گواہی امت محمد مصطفیٰ ﷺ کی ہوگی خصوصی طور پر یعنی یہ گواہی کسی اور امت کو حاصل نہیں ہوگی اس آیۂ کریمہ میں ذکر فرمایا ﴿ لِتَكُونُوا شُهَدَاءَ عَلَى النَّاسِ ﴾ کہ تم لوگوں پر گواہ بنو اور فرمایا ﴿ وَجِيءَ بِالنَّبِيِّينَ وَالشُّهَدَاءِ ﴾ (الزمر ۶۹) اور لائے جائیں گے انبیاء اور یہ نبی اور اس کے امت کے ان پر گواہ ہوں گے۔

چوتھی گواہی انسان کے اعضاء کی ہوگی یہ گواہی اقرار کے درجہ میں ہوگی بلکہ اس سے بڑھ کر تعجبناک ہوگی رب تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ يَوْمَ تَشْهَدُ عَلَيْهِمْ أَلْسِنَتُهُمْ وَأَيْدِيهِمْ وَأَرْجُلُهُم بِمَا كَانُوا يَعْمَلُونَ ﴾ (النور ۲۴)

''اس دن ان پر گواہی دیں گی ان کی زبانیں اور ان کے ہاتھ اور ان کے پاؤں جو کچھ وہ کرتے رہے''

(ماخوذ از کبیر)

﴿ وَيَكُونَ الرَّسُولُ عَلَيْكُمْ شَهِيدًا ﴾ ''اور یہ رسول تمہارے نگہبان و گواہ''

یہ مندرجہ بالا ترجمہ اعلیٰ حضرت مولنا احمد رضا خان بریلوی رحمہ اللہ کا ہے آپ نے لفظ نگہبان زیادہ کیا ہے اس کی کیا وجہ ہے؟ راقم نے اپنی کتاب تسکین الجنان فی محاسن کنز الایمان میں تراجم کا تقابلی جائزہ پیش کرتے ہوئے یوں بیان کیا۔

☆ اور ہووے پیغمبر او پر تمہارے گواہ (شاہ رفیع الدین صاحب)

☆ اور رسول ہو تم پر بتانے والا (شاہ عبدالقادر صاحب)

☆ اور پیغمبر آخر الزمان تم پر گواہ بنیں (فتح محمد صاحب)

☆ اور ہو رسول تم پر گواہی دینے والا (محمود الحسن صاحب)

☆ اور رسول تم پر گواہ ہو (مودودی صاحب)

☆ اور رسول گواہ ہیں تم پر (عبدالماجد صاحب)

☆ اور تمہارے لئے رسول اللہ ﷺ گواہ ہو (اشرف علی صاحب)

☆ اور یہ رسول تمہارے نگہبان و گواہ (اعلیٰ حضرت مولنا احمد رضا خان)

نبی کریم ﷺ کی امت لوگوں پر گواہی دے گی اور آپ اپنی امت کی صداقت کی گواہی دیں گے اور ان کے نگہبان ہوں گے دیگر تراجم نے صرف گواہ ذکر کیا جب کہ اعلیٰ حضرت نے نگہبان وگواہ ذکر کیا ہے۔ اس معنی پر مدارک دال ہے "**لما کان الشھید کالرقیب جئی بکلمة استعلاء کقوله تعالی کنت انت الرقیب علیھم**" چونکہ گواہ نگہبان کی طرح ہوتا ہے اسی وجہ سے جس طرح "الرقیب" (نگہبان) کے بعد کلمہ علی آتا ہے اسی طرح یہاں بھی لایا گیا ہے۔

بیضاوی نے بھی اسی طرح بیان کیا ہے کہ جب پہلی امتیں تبلیغ انبیاء کا انکار کردیں گی تو رب تعالیٰ باوجود علم کے منکرین پر حجت قائم کرنے کے لئے تبلیغ پر گواہ طلب کرے گا انبیاء کرام امت محمد ﷺ کو گواہ پیش کریں گے پہلی امتیں کہیں گی تم ہمیں کیسے پہچانتے ہو؟ تو یہ کہیں گے کہ ہمیں اپنے سچے نبی کریم ﷺ نے اللہ کا کلام اس کی کتاب کے ذریعے پہنچایا، جس سے ہمیں علم حاصل ہوا۔ پھر ان کے حق میں گواہی کے لئے نبی کریم ﷺ کو لایا جائے گا آخر مقصودی عبارت ملاحظہ ہو:

"**فیؤتی بمحمد ﷺ فیسأل عن حال امته فیشھد بعد التھم وھذه الشھادة وان کانت لھم لکن لما کان الرسول علیه السلام کالرقیب المھیمن علی امته عدی بعلی**"

نبی کریم ﷺ کو لایا جائے گا آپ اپنی امت کی عدالت کی گواہی دیں گے، آگے علامہ بیضاوی نے ایک سوال کا جواب دیا ہے کہ شہادت کے بعد "علیٰ" آئے تو یہ شہادت کسی کے خلاف ہوتی ہے جب کسی کے حق میں شہادت دینی ہو تو شہادت کے بعد "لام" آتا ہے اس کا جواب علامہ نے دیا کہ اگرچہ نبی کریم ﷺ کی شہادت ان کے حق میں ہوگی لیکن آپ چونکہ ان کے لئے رقیبوں (نگہبانوں) کی طرح ہیں۔ اسی وجہ سے "علیٰ" سے متعدی کیا ہے چونکہ آپ نگہبان ہیں نہ کہ یہ مراد ہے کہ ان کے خلاف گواہی دیں گے۔ اسی سوال وجواب کو اعلیٰ حضرت نے ترجمہ میں "نگہبان" کا لفظ بڑھا کر مندفع کردیا جس کی حقیقت سے دیگر مترجمین بے خبر ہے۔

تنبیه: ﴿**لتکونوا شھداء علی الناس**﴾ میں بھی لفظ "**علی**" استعمال ہے۔ لیکن اس کے ترجمہ میں "نگہبان" کو نہیں لایا گیا اس لئے کہ نبی کریم ﷺ کی امت کی گواہی جہاں انبیاء کرام کے حق میں ہوگی وہاں ان کی امتوں کے خلاف بھی ہوگی۔ لیکن نبی کریم ﷺ کی گواہی اپنی امت کے حق

میں فقط ہوگی کسی کے خلاف نہیں ہوگی۔

فائدہ جلیلہ :

" ان الشهادة والمشاهدة والشهود هو الرؤية يقال شاهدت كذا اذا رأيته وابصرته ولما كان بين الابصار بالعين وبين المعرفة بالقلب مناسبة شديدة لا جرم قد تسمى المعرفة التى فى القلب مشاهدة وشهودا والعارف بالشئى شاهدا ومشاهدا ثم سميت الدلالة على الشئى شاهدا على الشئى لانها هى التى بها صار الشاهد شاهدا ولما كان المخبر عن الشئى والمبين لحاله جار يا مجرى الدليل على ذلك سمى ذلك المخبر ايضا شاهدا "

شہادت اور مشاہدہ اور شہود کا معنی ہے دیکھنا جب کوئی شخص کسی کو دیکھے تو وہ کہتا ہے " شاهدت كذا " میں نے اس طرح دیکھا۔ جبکہ آنکھوں سے دیکھنے اور دل کی معرفت کے درمیان مناسبت شدیدہ پائی گئی تو یقیناً دل کی معرفت کو مشاہدہ اور شہود کہا جائے گا اور عارف کو شاہد اور مشاہد کہا جائے گا۔ اسی طرح کسی چیز پر دلالت کرنا ''شاہد'' کہلاتا ہے اسی طرح کسی چیز کی خبر دینے والے اور کسی چیز کے حال کو بیان کرنے والے کو بھی شاہد کہا جاتا ہے۔ (از کبیر)

شہود کے لغوی اور مجازی معانی کو سمجھنے کے بعد تفسیر عزیزی کو دیکھیں کہ نبی کریم ﷺ کیسے شہود سے متصف تھے تو سارے جھگڑے ہی ختم ہو جائیں آیئے دیکھیں شاہ صاحب نے کیا خوب بیان فرمایا:

﴿ وَيَكُونَ الرَّسُولُ عَلَيْكُمْ شَهِيدًا ﴾ ، یعنی وباشد رسول شما بر شما گواہ زیرا کہ او مطلع ست بہ نور نبوت بہ رتبہ ہر متدین بدین خود کہ در کدام درجہ از دین من رسیدہ وحقیقت ایمان او چیست وحجابی کہ بدان از ترقی محجوب ماندہ است کدام است پس او میشناسد گناہان شمارا درجات ایمان شمارا واعمال نیک وبد شمارا واخلاص ونفاق شمارا ولہذا شہادت او در دنیا بحکم شرع درحق امت مقبول وواجب العمل است "

نبی کریم ﷺ تمہارے حق میں گواہی دیں گے کیونکہ آپ نور نبوت کی وجہ سے ہر دیندار کے دین کو جانتے ہیں کہ یہ دین کے کس درجہ پر ہے اور اس کے ایمان کی حقیقت کیا ہے اور اس کی ترقی میں کس درجہ کے حجاب پائے گئے ہیں۔ نبی کریم ﷺ تمہارے گناہوں کو پہچانتے ہیں اور تمہارے ایمان کے

درجات کو جانتے ہیں اور تمہارے نیک اور برے اعمال کا آپ کو علم ہے اور تمہارے اعمال میں تمہارے اخلاص اور نفاق کو جانتے ہیں اسی وجہ سے آپ کی شہادت دنیا میں بحکم شرع امت کے حق میں مقبول ہے اور واجب العمل ہے۔ اسی وجہ سے نبی کریم ﷺ نے جو خبریں دی ہیں وہ سب سچی ہیں کچھ واقع ہو چکی ہیں کچھ واقع ہو کر رہیں گی انشاء اللہ۔

اس بیان کے بعد شاہ صاحب فرماتے ہیں:

" در روایات آمده که هر نبی رابر اعمال امتیان خود مطلع میسازند که فلانے امروز چنین می کند وفلانے چناں تاروز قیامت ادای شهادت تواند کرد "

تمام انبیاء کرام کو ان کی امتوں کے اعمال پر مطلع کیا گیا ہے کہ فلاں آج اس طرح کر رہا ہے اور دوسرا شخص اس طرح کر رہا ہے ان کو مطلع کرنے کی یہ وجہ ہے کہ وہ بھی قیامت کے دن گواہی دے سکیں۔

(از عزیزی)

۞ وَمَا جَعَلْنَا الْقِبْلَةَ الَّتِیْ كُنْتَ عَلَیْهَاۤ اِلَّا لِنَعْلَمَ مَنْ یَّتَّبِعُ الرَّسُوْلَ مِمَّنْ یَّنْقَلِبُ عَلٰی عَقِبَیْهِ ۞

اور نہیں بنایا ہم نے قبلہ جس پر تم تھے سوائے اس کے کہ ہم آزمائیں کون تابعداری کرتا ہے رسول کی اور کون پھر جاتا ہے الٹے پاؤں۔

یعنی قبلہ کو تبدیل کرنے کی وجہ دراصل لوگوں کا امتحان لینا مقصود تھا کہ کون رسول اللہ ﷺ کی تابعداری کرتا ہے اور کون الٹے پاؤں پھر جاتا ہے یعنی کون تابعداری نہیں کرتا۔

تنبیہ : راقم نے شیخ زادہ کی اس توجیہ کے مطابق ذکر کیا ہے:

" وتقديره وما جعلنا قبلتك بيت المقدس الا لنعلم بصرفك عنها الى الكعبة من يتبعك فى امر تحويل القبلة بان يترك التوجه الى بيت المقدس ويتوجه الى الكعبة وممن لا يتبعك فى ذلك "

حاصل کلام یہ ہے کہ ہم نے نہیں بنایا آپ کا قبلہ بیت المقدس سوائے اس کے کہ ہم آزمائیں اس سے آپ کو پھیر کر کعبہ کی طرف متوجہ ہونے کا حکم دے کر کہ تحویل قبلہ کے حکم سے کہ کون بیت المقدس کی طرف منہ کرنا چھوڑتا ہے اور کعبہ کی طرف منہ کرنے پر عمل کرتا ہے اور کون آپ کی

اس معاملہ میں یعنی تحویل قبلہ میں تابعداری نہیں کرتا۔ (از شیخ زادہ)

اس میں ایک اور وجہ یہ بھی مذکور ہے:

"یجوز ان یکون قولہ ﴿ اَلَّتِیْ کُنْتَ عَلَیْهَا ﴾ لسانا للحکمة فی جعل بیت المقدس قبلة یعنی ان اصل امرک ان تستقبل الکعبة وان استقبالک بیت المقدس کان امرا عارضا نعرض وانما جعلنا القبلة الجهة التی کنت علیها قبل وقتک هذا وهی بیت المقدس لنمتحن الناس وننتظر من یتبع الرسول ومن لا یتبع وینفر عنه" (کبیر)

ہوسکتا ہے کہ ﴿ اَلَّتِیْ کُنْتَ عَلَیْهَا ﴾ کا مطلب یہ ہو کہ بیت المقدس کو قبلہ بنانے کی حکمت کا ذکر ہو کہ اصل میں آپ کو کعبہ شریف کی طرف ہی منہ کرنے کا حکم تھا لیکن بیت المقدس کی طرف منہ کر کے نماز ادا کرنے کا حکم عارضی تھا جس کا مقصد یہ تھا کہ کعبہ شریف سے پہلے بیت المقدس کو قبلہ مقرر کر کے لوگوں کا امتحان لیا جائے کہ کون سے لوگ آپ کی تابعداری میں بیت المقدس کی طرف منہ کرتے ہیں اور کون سے تابعداری نہیں کرتے اور نفرت کرتے ہیں اس معنی کے لحاظ پر یہ امتحان تحویل قبلہ سے پہلے ہے۔

اعتراض: رب تعالیٰ نے فرمایا ﴿ اِلَّا لِنَعْلَمَ ﴾ اور نہیں بنایا ہم نے قبلہ جس پر آپ تھے مگر یہ کہ ہم جانیں کہ کون تابعداری کرتا ہے رسول کی اور کون الٹے پاؤں پھر جاتا ہے۔

اس سے تو ان بے دین لوگوں کے مذہب کو تائید مل رہی ہے جو یہ کہتے ہیں " ان اللہ تعالی لم یعلم تلک الا شیاء قبل وقوعها " کہ اللہ تعالیٰ کو چیزوں کے واقع ہونے سے پہلے علم حاصل نہیں ہوتا۔ کیونکہ اس آیۃ میں بھی یہی ذکر ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تحویل قبلہ کو اپنے علم کا ذریعہ بنایا کہ اس سے لوگوں کا علم حاصل ہو جائے۔

جواب: " الا لنعلم معناه الا لنری ومجاز هذا ان العرب تضع العلم مکان الرؤیة والرؤیة مکان العلم " یہاں آیۃ کریمہ میں علم بمعنی رؤیت استعمال ہے معنی یہ ہے "مگر یہ کہ ہم دیکھ لیں" (اعلیٰ حضرت نے یہی ترجمہ کیا ہے) یہ مجازی معنی ہے عرب حضرات عام طور پر علم کا معنی رؤیت لیتے رہتے ہیں اور رؤیت کو علم کے معنی میں استعمال کرتے ہیں۔

دوسرا جواب: ﴿ اِلَّا لِنَعْلَمَ ﴾ نعاملکم معاملة المختبر، مگر یہ کہ ہم تمہارے ساتھ وہ معاملہ کریں جو امتحان لینے والا کرتا ہے یعنی ہم آزمائیں (راقم نے یہی ترجمہ کیا ہے) (از کبیر)

تسکین الجنان سے اقتباس:

﴿ وَمَا جَعَلْنَا الْقِبْلَةَ الَّتِیْ كُنْتَ عَلَیْهَا اِلَّا لِنَعْلَمَ ﴾

☆ اور جس قبلے پر تم (پہلے) تھے اس کو ہم نے اس لئے مقرر کیا تھا کہ معلوم کریں (فتح محمد صاحب)

☆ اور جس سمت قبلہ پر آپ رہ چکے ہیں وہ تو محض اس کے لئے تھا کہ ہم کو معلوم ہو جاوے۔
(اشرف علی صاحب)

☆ نہیں مقرر کیا تھا ہم نے وہ قبلہ جس پر تو پہلے تھا مگر اس واسطے کہ معلوم کریں۔
(شاہ عبد القادر صاحب)

☆ اور نہیں کیا تھا ہم نے قبلہ جو تھا تو اوپر اس کے مگر تا کہ جانیں ہم۔ (شاہ رفیع الدین صاحب)

☆ اور اے محبوب تم پہلے جس قبلہ پر تھے ہم نے وہ اسی لئے مقرر کیا تھا کہ دیکھیں۔
(اعلیٰ حضرت مولنا احمد رضا خان)

یہاں تحویل قبلہ کا ذکر ہے نبی کریم ﷺ کا پہلے قبلہ کعبہ تھا (یعنی بیت المقدس کی طرف بھی منہ رہتا اور کعبہ کی طرف بھی) مدینہ طیبہ میں آ کر سولہ، سترہ ماہ تک بیت المقدس قبلہ بنایا گیا پھر نبی کریم ﷺ کی مرضی کے مطابق کعبہ کو قبلہ بنا دیا گیا۔ اس واقعہ کو رب تعالیٰ نے ذکر فرمایا کہ تحویل قبلہ کا مقصد یہ تھا کہ مسلمان اور کافر میں فرق ہو جائے کہ کون نبی کریم ﷺ کی تابعداری کرتا ہے اور کون شک کرتا اور روگردانی کرتا ہے۔

اب اس تمہید کے بعد واضح ہوا کہ عام تراجم میں یہ معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قبلہ کو اس لئے تبدیل کیا کہ اسے متبعین اور منکرین کا علم ہو جائے۔ اس میں ایک وہم ہوتا ہے جو تفاسیر نے ذکر کیا ہے اس کا ازالہ نہیں ہوتا بلکہ اس وہم کو تقویت ملتی ہے وہ وہم جو تفاسیر میں ہے وہ دیکھیں۔

" فان قیل کیف یکون علمه تعالیٰ غایة الجعل وهو لم یزل عالما " (بیضاوی)

اعتراض کیا جاتا ہے کہ علم کو جعل کی غایۃ بنانا صحیح نہیں کہ قبلہ اس لئے بنایا کہ ہم جانیں کیونکہ اللہ تعالیٰ تو ازلاً عالم ہے۔ جواب اس طرح دیا گیا:

" قلت هذا و اشباهه باعتبار التعلق الحالی الذی هو مناط الجزاء و المعنی لیتعلق علمنا به موجودا "
(بیضاوی)

یعنی یہاں جزاء کا تعلق موجود کے علم سے ہے اسی جواب کو مدارک میں زیادہ واضح طور پر بیان کیا گیا ہے:

" قال الشیخ ابو منصور معنی قوله لنعلم کائنا موجودا ما قد علمناه انه یکون و یوجد فالله تعالٰی عالم فی الازل بکل ما اراد وجوده انه یوجد فی الوقت الذی شاء وجوده فیه ولایوصف بانه عالم فی الازل بانه موجود کائن لانه لیس بموجود فی الازل فکیف یعلمه موجودا فاذا صار موجودا یدخل تحت علمه الازلی فیصیر معلوماله موجودا کائنا و التغیر علی المعلوم لا علی العلم " (مدارک)

اس عبارت کا خلاصہ یہ ہے کہ شیخ ابومنصور فرماتے ہیں کہ اگرچہ اللہ تعالٰی کو علم ازلی حاصل ہے کہ فلاں چیز نے موجود ہونا ہے لیکن پہلے علم معدوم سے ہوگا جس نے بعد میں موجود ہونا ہے۔ اور جب وہ چیز موجود ہو جائے گی اب موجود سے تعلق ہوگا یہاں علم میں تبدیلی نہیں بلکہ معلوم میں تبدیلی ہے۔ یعنی پہلے علم وہ تھا کہ معلوم مقام ظہور میں نہیں تھا اب علم ہے کہ معلوم مقام ظہور میں ہے۔ اب آپ تراجم میں فرق دیکھیں کہ یہ کہا جائے تا کہ ہم معلوم کریں تو یہ اعتراض مندفع ہوگا یا یہ کہا جائے کہ " ہم دیکھیں " تو اعتراض مندفع ہوگا۔ یہ ہے مولنا احمد رضا خان رحمہ اللہ کی علمی بصیرت جس میں صاحب نظر کو اعتراف کرنے میں کوئی کلام نہیں۔ (تسکین الجنان ص ۵۲ ، ۵۳)

﴿ مِمَّنْ يَّنْقَلِبُ عَلٰى عَقِبَيْهِ ﴾ : " استعارة ومعناه من یکفر بالله ورسوله " اس میں استعارہ پایا گیا ہے معنی اس کا یہ ہے کہ " کون اللہ تعالٰی اور اس کے رسول ﷺ سے کفر کرتا ہے "۔

وجہ تشبیہ یہ ہے کہ ایڑیوں کے بل پلٹ جانے والا، یعنی الٹے پاؤں پھرنے والا اپنے سامنے والی چیز کو چھوڑ دیتا ہے اور اس سے منہ پھیر لیتا ہے جب انہوں نے بھی ایمان کو چھوڑ دیا اور دلائل کو چھوڑ دیا تو وہ اپنے سامنے والی چیزوں کو چھوڑنے والے ہو گئے۔ اسی وجہ سے رب تعالٰی نے ان کا ذکر ان الفاظ مبارکہ سے کیا ہے " ثم ادبر واستکبر " پھر پیٹھ پھیر لی اور تکبر کیا۔ (کبیر)

﴿ وَاِنْ كَانَتْ لَكَبِيْرَةً اِلَّا عَلَى الَّذِيْنَ هَدَى اللّٰهُ ﴾

اور بیشک یہ بھاری تھی سوائے ان لوگوں کے جن کو اللہ نے ہدایت دی۔ " کانت " میں ضمیر

ماقبل کلام سے حاصل ہونے والے مضمون کی طرف لوٹ رہی ہے اس لئے ضمیر کا مرجع " الجعلة " یا " التولية " یا "التحويلة " یا " القبلة " ہے یہ سب مؤنث ہیں اس لئے ضمیر بھی مؤنث کی ہے مفہوم یہ ہے کہ قبلہ کو بدلنا منافقین پر بھاری تھا لیکن مخلصین مؤمنین جن کو اللہ تعالیٰ نے ہدایت سے نواز رکھا تھا ان پر کوئی بھاری نہیں تھا۔

طلباء کرام توجہ فرمائیں: لفظ ''ان'' کا استعمال چار طرح ہوتا ہے۔

(۱) ان شرطیہ جس کے بعد جزاء آتی ہے۔ (۲) ان زائدہ جس کا کوئی معنی نہیں ہوتا۔

(۳) ان نافیہ جو نفی کے معنی میں استعمال ہوتا ہے (۴) **ان مخففه من المثقلة**

یعنی یہ حرف مشبہ بالفعل ہوتا ہے جس کی تشدید کو ختم کر کے مخفف بنالیا جاتا ہے یہ مخفف ہونے کے باوجود معنی تحقیق کا ہی دیتا ہے اس کی خبر پر لام آتا ہے تاکہ ان نافیہ اور **مخففه من المثقله** میں فرق ہو جائے اسی وجہ سے " لَكَبِيْرَةٌ " پر لام آیا ہوا ہے۔ بعض نحویوں نے اس آیہ کریمہ میں " ان نافیه " کہا ہے اور " لام " جو کہ ''لكبيرة ''میں ہے اسے " الا " کے معنی میں لیا ہے لیکن یہ قول درست نہیں۔ (از کبیر وروح المعانی)

﴿ وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُضِيعَ اِيمَانَكُمْ ﴾ اور نہیں اللہ ضائع کرتا تمہاری نمازوں کو۔

''ایمان کا ایک مجازی معنی لیا گیا ہے یعنی نماز۔ اس معنی کے لحاظ پر مطلب یہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ تمہاری نمازیں جو منسوخ قبلہ کی طرف منہ کر کے ادا کی گئیں ہیں ان کو ضائع نہیں کرتا۔

" **ففی الصحيح انه لما وجه رسول الله ﷺ الی القبلة قالوا یا رسول الله فكيف بالذين ماتوا و هم يصلون الى بيت المقدس فنزلت** "

حدیث شریف میں ہے کہ جب نبی کریم ﷺ نے کعبہ شریف کی طرف منہ پھیر لیا تو صحابہ کرام نے عرض کیا یارسول اللہ ان لوگوں کا کیا ہوگا جو بیت المقدس کی طرف منہ کر کے نماز ادا کرتے رہے اور فوت بھی ہو چکے ہیں۔ تو اس وقت اس آیہ کریمہ کا نزول ہوا کہ اللہ تعالیٰ تمہاری نمازوں کو ضائع نہیں کرتا۔ اس معنی کے لحاظ پر لازم کا اطلاق ملزوم پر ہے یعنی اطلاق ایمان کا مراد نماز ہے۔ تاہم ''ایمان'' حقیقی معنی میں بھی استعمال ہے یعنی " **ثباتكم على الايمان** " تمہارے ایمان پر ثابت رہنے کو اللہ تعالیٰ ضائع

نہیں کرتا اسی طرح یہ معنی بھی مراد لیا گیا ہے " ایمانکم بالقبلة المنسوخة " بیشک اللہ تعالیٰ منسوخ قبلہ پر تمہارے ایمان کو ضائع نہیں کرتا۔

(از روح المعانی)

خیال رہے کہ علامہ آلوسی رحمہ اللہ نے مجازی معنی کو راجح قرار دیا ہے کہ "ایمان" بمعنی نماز مراد لینا بہتر ہے راقم نے یہی معنی ذکر کیا تا کہ طلباء کو دونوں معانی ذہن نشین ہو جائیں۔

﴿ اِنَّ اللّٰهَ بِالنَّاسِ لَرَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ﴾ بیشک اللہ لوگوں پر بہت مہربان رحم کرنیوالا ہے

اللہ تعالیٰ نے اپنی ان دو صفات کا خصوصی طور پر ذکر کر کے ثابت کر دیا کہ " ان الله لا يضيع اجورهم ولا يدع ما فيه صلاحهم " بیشک اللہ تعالیٰ ان کے اجر و ثواب کو ضائع نہیں کرے گا اور ان کے لئے بہتری کو نہیں چھوڑے گا۔ اس کی وجہ یہ کہ " لان رأفة بالناس واضاعته ما كان منهم من العبادات التى افضلها الايمان متنافيان " اللہ تعالیٰ کا لوگوں پر مہربان ہونا اور ان کی عبادات کو خصوصاً افضل العبادات ایمان کو ضائع کرنا یہ دو متنافی چیزیں ہیں چونکہ یہ قانون ہے کہ دو متنافی چیزوں میں جب ایک پائی جائے تو دوسری کا نہ پایا جانا ضروری ہے جب رب تعالیٰ اپنے بندوں پر رؤف (مہربان) ہے تو یقیناً ان کی عبادات کو ضائع نہیں فرماتا۔ رؤف کو پہلے ذکر کیا اور رحیم کو بعد میں "لان الرأفة بمعنى الرحمة الا انها اشد وابلغ من الرحمة " اس لئے کہ رأفة بھی اگرچہ رحمت کے معنی میں استعمال ہے لیکن رأفۃ میں بنسبت رحمۃ کے اشد اور ابلغ رحمت پائی گئی ہے۔ اس لئے خاص کو ذکر کیا اور عام کو بعد میں۔

رأفة میں رفع المكروه وازالة الضرر (مکروہ چیز کو اٹھانا اور ضرر کو دور کرنا) پایا گیا ہے اور رحمت میں حصول منافع پایا گیا ہے۔ اس لئے افضال (فضیلت دینا) اور دفع ضرر اہم چیزیں ہیں بنسبت حصول منافع کے اسی وجہ سے رؤف کو رحیم سے پہلے ذکر کیا گیا ہے اور وجہ یہ ہے کہ رب تعالیٰ کی صفت رأفۃ کا تعلق اپنے خاص مؤمنین بندوں سے ہے لیکن صفت رحمۃ عام ہے بنسبت رأفۃ کے لہذا صفات کی ترتیب متعلقین کے شرف وقدر کا اعتبار کرتے ہوئے رکھی گئی ہے۔

(از شیخ زادہ روح المعانی)

﴿ قَدْ نَرٰی تَقَلُّبَ وَجْهِکَ فِی السَّمَآءِ فَلَنُوَلِّیَنَّکَ قِبْلَةً تَرْضٰهَا فَوَلِّ وَجْهَکَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ وَحَیْثُ مَا کُنْتُمْ فَوَلُّوْا وُجُوْهَکُمْ شَطْرَهٗ وَاِنَّ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْکِتٰبَ لَیَعْلَمُوْنَ اَنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّهِمْ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا یَعْمَلُوْنَ ﴾

۱) ''ہم دیکھ رہے ہیں بار بار تمہارا آسمان کی طرف منہ کرنا تو ضرور ہم تمہیں پھیر دیں گے اس قبلہ کی طرف جس میں تمہاری خوشی ہے ابھی اپنا منہ پھیر دو مسجد حرام کی طرف اور اے مسلمانو تم جہاں کہیں ہو اپنا منہ اسی کی طرف کرو اور وہ جنہیں کتاب ملی ہے ضرور جانتے ہیں کہ یہ ان کے رب کی طرف سے حق ہے اور اللہ ان کے کوتکوں سے بے خبر نہیں''۔

۲) ''تحقیق ہم دیکھ رہے ہیں پھیرنا تمہارا منہ آسمان کی طرف، تو ضرور ہم پھیر دیں گے تمہیں اس قبلہ کی طرف جس میں تمہاری رضاء ہے تو پھیر لو اپنا منہ مسجد حرام کی طرف اور جہاں بھی (اے مسلمانو) تم ہو پھیر لو اپنے منہ اسی کی طرف اور بیشک وہ لوگ جن کو کتاب دی گئی وہ ضرور جانتے ہیں بیشک یہ حق ہے انکے رب کی طرف سے اور نہیں اللہ غافل اس سے جو وہ عمل کرتے ہیں''۔

شان نزول: نبی کریم ﷺ نے مدینہ طیبہ میں سولہ، سترہ ماہ بیت المقدس کی طرف منہ کر کے نماز ادا کی۔ لیکن دل میں تمنا تھی کہ قبلہ کعبہ شریف ہو جائے تو اسی خواہش پر وحی کے انتظار میں بار بار آپ اپنا منہ آسمانوں کی طرف پلٹ رہے تھے تو رب تعالیٰ نے اس آیۃ کریمہ کو نازل فرمایا کہ اے محبوب ہم آپ کے بار بار چہرہ کو آسمانوں کی طرف اٹھانے کو دیکھ رہے ہیں ہم آپ کو اسی قبلہ کی طرف پھیر دیں گے جو آپ کو پسند ہے پھر ساتھ ہی حکم دے دیا کہ آپ اپنا منہ مسجد حرام کی طرف کر لیں۔

'' ذکر الامام القرطبی ان العلماء قالوا ھذہ الآیة متقدمة فی النزول علی قوله تعالیٰ (سَیَقُوْلُ السُّفَهَآءُ) الخ ''

علامہ قرطبی رحمہ اللہ نے بیان فرمایا ہے کہ علماء نے یہی بیان فرمایا کہ یہ آیۃ نزول کے لحاظ پر

(سَیَقُوْلُ السُّفَهَاءُ) آیۃ سے پہلے ہے " وفی الکواشی ان قوله تعالیٰ (قد نری) مستقبل لفظا و ماضی معنی ومتأخر تلاوة متقدم معنی لان رأس القصة " تفسیر کواشی میں ہے بیشک اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی " قد نری " لفظاً مستقبل ہے اور معنی ماضی ہے اور تلاوت کے لحاظ سے متأخر ہے اور معنی کے لحاظ سے مقدم ہے کیونکہ یہی واقعہ کی بنیاد اور اصل ہے تاہم "سیقول السفهاء" آیۃ کی وضاحت میں معتبر قول یہ ہے کہ وہ تحویل قبلہ سے پہلے نازل ہوئی۔ جیسا کہ پہلے ذکر کیا جا چکا ہے۔ آیۃ کریمہ کی وضاحت سے پہلے احادیث کو ذکر کیا جاتا ہے جس سے واقعہ کی تفصیل واضح ہو جائے گی۔

تحویل قبلہ کے متعلق احادیث مبارکہ:

بیہقی نے سنن میں اور ابوداؤد نے ناسخ ومنسوخ میں اور ابن ابی شیبہ نے حضرت عبداللہ بن عباس سے روایت کیا ہے کہ " کان رسول الله ﷺ یصلی وهو بمکة نحو بیت المقدس والکعبة بین یدیه وبعد ما تحول الی المدینة ستة عشر شهرا ثم صرف الی الکعبة " رسول اللہ ﷺ مکہ میں بیت المقدس کی طرف منہ کر کے نماز پڑھتے جبکہ کعبہ آپ کے سامنے ہوتا اور پھر مدینہ طیبہ میں قبلہ بیت المقدس مقرر کر دیا گیا پھر سولہ ماہ بعد کعبہ کی طرف منہ کرنے کا حکم دے دیا گیا۔ (حقانی)

☆ " عن البراء قال کان رسول الله ﷺ یصلی نحو بیت المقدس ویکثر النظر الی السماء ینتظر امر الله فانزل الله (قد نری تقلب وجهک فی السماء فلنولینک قبلة ترضها فول وجهک شطر المسجد الحرام) فقال رجال من المسلمین وددنا لو علمنا علم من مات منا قبل ان نصرف الی القبلة و کیف بصلاتنا نحو بیت المقدس فانزل الله (وما کان الله لیضیع ایمانکم) وقال السفهاء من الناس وهم اهل الکتاب ما و لا هم عن قبلتهم التی کانوا علیها فانزل الله (سَیَقُوْلُ السُّفَهَاءُ مِنَ النَّاسِ) الخ "

حضرت براء رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ بیت المقدس کی طرف منہ کر کے سولہ، سترہ ماہ نماز ادا فرماتے رہے اور آپ زیادہ نظر آسمانوں کی طرف کرتے کیونکہ آپ اللہ تعالیٰ کے حکم کی انتظار فرماتے تو اللہ تعالیٰ نے اس آیۃ ﴿قَدْ نَرٰی تَقَلُّبَ وَجْهِکَ فِی السَّمَاءِ فَلَنُوَلِّیَنَّکَ قِبْلَةً تَرْضٰهَا

فَوَلِّ وَجْهَکَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ﴾ کو نازل فرمایا مسلمانوں میں سے کچھ حضرات نے کہا کہ ہم چاہتے ہیں کہ ہمیں یہ معلوم ہو جائے کہ جو لوگ ہم میں سے قبلہ کے تبدیل کرنے کے حکم سے پہلے فوت ہو گئے ان کی نمازوں کا حکم کیا ہے اور جو ہم نے بیت المقدس کی طرف منہ کر کے نمازیں ادا کی ہیں ان کا حکم کیا ہے؟ تو اللہ تعالیٰ نے نازل فرمایا ﴿ وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُضِيعَ اِيْمَانَكُمْ ﴾ اور اللہ تمہاری نمازوں کو ضائع نہیں فرماتا اور بیوقوف لوگ اہل کتاب کہنے لگے کہ ان لوگوں کو اس قبلہ سے کس چیز نے پھیر دیا ہے۔ جس پر یہ تھے تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیۃ کریمہ ﴿سَيَقُوْلُ السُّفَهَاءُ ﴾ الخ نازل فرمائی۔

(مسلم)

☆ " عن ابن عباس ان رسول الله ﷺ لما هاجر الى المدنية امره الله ان يستقبل بيت المقدس ففرحت اليهود فاستقبلها رسول الله ﷺ بضعة عشر شهرا و كان رسول الله ﷺ يحب قبلة ابراهيم فكان يدعو الله وينظر الى السماء فانزل الله عزوجل ﴿ فَوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ شَطْرَه ﴾ اى نحوه ، فارتاب من ذلك اليهود وقالوا ما ولا هم عن قبلتهم التى كانوا عليها فانزل الله ﴿ قُلْ لِلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ يَهْدِىْ مَنْ يَّشَاءُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴾

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں بیشک رسول اللہ ﷺ نے جب مدینہ طیبہ کی طرف ہجرت فرمائی تو اللہ تعالیٰ نے آپ کو حکم فرمایا کہ بیت المقدس کی طرف منہ کر کے نماز ادا کریں۔ یہود اس پر خوش ہوئے آپ نے سولہ، سترہ ماہ بیت المقدس کی طرف منہ کر کے نماز ادا کی آپ پسند فرماتے تھے کہ ابراہیم علیہ السلام کا قبلہ (کعبہ) ہمارا بھی قبلہ ہو جائے آپ اللہ تعالیٰ سے دعا فرماتے اور آسمانوں کی طرف دیکھتے تو اللہ تعالیٰ نے ﴿ فَوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ شَطْرَه ﴾ "تم اپنے منہ مسجد حرام کی طرف پھیر لو" نازل فرمایا۔ یہود کو اس پر شک ہوا وہ بے وقوف کہنے لگے کس نے ان کو اس قبلہ سے پھیر دیا جس پر تھے تو اللہ تعالیٰ نے ﴿قُلْ لِلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ يَهْدِىْ مَنْ يَّشَاءُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴾ "فرما دو اللہ کے لئے ہی مشرق و مغرب ہے ہدایت دیتا ہے جسے چاہے سیدھی راہ کی" کو نازل فرمایا۔

☆ " عن البراء ان النبى ﷺ صلى قبل بيت المقدس ستة عشر شهرا او سبعة عشر شهرا و كان يعجبه قبلته قبل البيت وانه صلى صلوة العصر وصلى معه قوم فخرج رجل ممن كان يصلى معه فمر على اهل المسجد وهم راكعون فقال اشهد بالله لقد صليت مع رسول الله ﷺ قبل مكة فدا روا كما هم قبل البيت " (ابو نعيم)

حضرت براء فرماتے ہیں بیشک نبی کریم ﷺ نے بیت المقدس کی طرف سولہ، سترہ ماہ منہ کر کے نماز ادا فرمائی آپ کو پسند یہ تھا کہ آپ کا قبلہ کعبہ شریف ہو جائے۔ بیشک آپ عصر کی نماز ادا فرمار ہے تھے اور قوم نے بھی آپ کے ساتھ نماز ادا کی (جس میں قبلہ کے تبدیل کرنے کا حکم آیا) ایک شخص جو آپ کے ساتھ نماز ادا کرنے میں شریک تھے وہ نماز ادا کرنے کے بعد اپنے قبیلہ کی طرف گئے تو دیکھا کہ لوگ نماز ادا کر رہے ہیں جو رکوع میں تھے انہوں نے کہا میں اللہ کی گواہی دیتا ہوں کہ تحقیق میں نے رسول اللہ ﷺ کے ساتھ نماز ادا کی آپ نے نماز کعبہ کی طرف منہ کر کے ادا کی وہ لوگ نماز میں ہی کعبہ شریف کی طرف پھر گئے۔

اعتراض : جو حدیث تم نے ابھی بیان کی اس سے تو پتہ چلتا ہے کہ تحویل قبلہ کا حکم عصر کی نماز میں آیا اور دوسری حدیث میں ظہر کی نماز کا ذکر ہے دونوں حدیثوں میں تطبیق کیسے ہے؟ وہ حدیث جس میں ظہر کا ذکر ہے وہ یہ ہے:

☆ " عن ابن عمر ان اول صلوة صلاها رسول الله ﷺ الى الكعبة صلوة الظهر وانها الصلوة الوسطى "

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں بیشک پہلی نماز جو رسول اللہ ﷺ نے کعبہ شریف کی طرف منہ کر کے ادا کی وہ ظہر کی تھی بیشک وہ نماز وسطی ہے۔

جواب: " والمشهور ان اول صلوة صلاها الى الكعبة صلوة العصر ولهذا تأخر الخبر عن اهل قباء الى صلوة الفجر " (ماخوذ از کبیر)

مشہور یہی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے سب سے پہلے جو نماز کعبہ شریف کی طرف منہ کر کے ادا کی وہ عصر کی نماز تھی۔ اسی وجہ سے قباء والے حضرات کو دوسرے دن صبح کی نماز میں تحویل قبلہ کے متعلق پتہ چلا۔

راقم کے نزدیک جس حدیث میں ظہر کا ذکر ہے اس سے مراد بھی عصر کی نماز ہے کیونکہ اسے صلوۃ وسطی کہا گیا ہے جب کہ مشہور یہی ہے کہ صلوۃ وسطی عصر کی نماز ہے۔ پھر ظہر کا اطلاق عصر پر اور عشاء کا اطلاق مغرب پر کئی احادیث میں مذکور ہے۔

☆ " عن ابن عمر قال بينهما الناس فى صلوة الصبح بقباء اذ جاء هم رجل فقال ان رسول الله ﷺ قد انزل عليه قرآن وامر ان يستقبل الكعبة الا فاستقبلوها

فاستداروا کهیئتهم الی الکعبة و کان وجه الناس الی الشام"

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ لوگ صبح کی نماز قبا میں ادا کر رہے تھے ان کے پاس ایک شخص آیا اس نے کہا بیشک رسول اللہ ﷺ پر قرآن نازل ہوا آپ کو کعبہ شریف کی طرف منہ کرنے کا حکم دے دیا گیا۔ خبردار تم بھی کعبہ کی طرف منہ کرلو سب لوگ نماز میں ہی پھر گئے، کعبہ کی طرف منہ کرلیا حالانکہ پہلے وہ شام (بیت المقدس) کی طرف منہ کر کے نماز ادا کر رہے تھے۔ (احکام القرآن للجصاص)

تحویل قبلہ کس ماہ میں ہوا:

نبی کریم ﷺ نے پانچ ربیع الاول پیر کے دن مکہ مکرمہ سے ہجرت فرمائی اور بارہ ربیع الاول پیر کے دن مدینہ طیبہ پہنچے اور قبلہ شریف کی تبدیلی کا حکم دوسرے سال بدر کے واقعہ سے دو ماہ پہلے پندرہ رجب زوال کے بعد آیا۔ (مظھری)

ایک قول علامہ قرطبی رحمہ اللہ نے بھی یہی بیان کیا اور اس کے بعد دوسرا قول یہ بیان کیا ابو حاتم بستی رحمہ اللہ نے فرمایا نبی کریم ﷺ مدینہ طیبہ میں بارہ ربیع الاوّل پیر کو پہنچے اور قبلہ شریف کی تبدیلی کا حکم بدھ نصف شعبان کو ہوا۔ اسی وجہ سے بعض روایات میں سولہ ماہ کا ذکر ہے اور بعض میں سترہ ماہ کا ذکر ہے دراصل عرب حضرات اس وقت کسور کا اعتبار نہیں کرتے تھے۔ سولہ ماہ سے کچھ دن اوپر ہونے پر کچھ حضرات سولہ ماہ ہی کہتے تھے اور کچھ سترہ ماہ کہہ لیتے تھے اسی طرح پندرہ ماہ سے کچھ دن زائد ہونے پر بھی سولہ ماہ کہہ لیا جاتا تھا۔ اس پر حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول دلیل ہے۔

" رواه الحاكم بسند صحيح عن ابن عباس فمن اعتبر الايام شهرا كاملا عد سبعة عشر والا فستة عشر "

حاکم نے سند صحیح سے روایت کی کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا جن حضرات نے چند دنوں کو ایک ماہ مکمل شمار کر لیا انہوں نے سترہ ماہ کہہ لیا۔ اور جنہوں نے زائد دنوں کا اعتبار نہیں کیا انہوں نے سولہ ماہ کہہ لیا۔ (از مظھری)

خیال رہے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے قول اور ابو حاتم بستی رحمہ اللہ کے قول میں اتفاق نظر آتا ہے۔

کس مسجد میں قبلہ کی تبدیلی کا حکم آیا:

" وقیل نزل ذلک علی النبی ﷺ فی مسجد بنی سلمة وھو فی صلوٰة الظھر بعد رکعتین منھا فتحول فی الصلوٰة فسمی ذلک المسجد مسجد القبلتین "

بیان یہ کیا گیا ہے کہ قبلہ کی تبدیلی کا حکم مسجد بنی سلمہ میں نازل ہوا جب کہ آپ ظہر کی نماز ادا فرما رہے تھے دو رکعت بیت المقدس کی طرف منہ کر کے ادا کی جا چکی تھیں، جب حکم آیا تو آپ نماز میں ہی پھر گئے اسی وجہ سے اس مسجد کو ذو قبلتین کہا جاتا ہے۔ اب بھی اس مسجد کے دو محراب بنائے گئے ہیں ایک بیت المقدس کی جانب اور دوسرا کعبہ شریف کی جانب تاہم بورڈ آویزاں ہیں عربی میں تحریر ہے کہ نماز صرف کعبہ شریف کی طرف منہ کر کے ادا کی جائے بعض جاہل حضرات بیت المقدس کی طرف بھی منہ کر کے نماز ادا کرتے ہیں جو ناجائز ہے۔

راقم جیسے گنہگار کو بھی اس مسجد میں نفل ادا کرنے کی سعادت حاصل ہوئی راقم کے ساتھ برادر محترم مولنا فضل دین نقشبندی مدرس جامعہ رضویہ ضیاء العلوم راولپنڈی بھی تھے۔

" قال عباد بن بشر بن قیظی ان رسول اللہ ﷺ قد استقبل القلبة او قال البیت الحرام فتحول الرجال مکان النساء وتحول النساء مکان الرجال "

عباد بن بشر نے بیان فرمایا کہ بیشک رسول اللہ ﷺ نے جب قبلہ یعنی مسجد حرام کی طرف منہ پھیرا تو مرد عورتوں کی جگہ آ گئے اور عورتیں مردوں کی جگہ آ گئیں (اور خود نبی کریم ﷺ کعبہ کی جانب آگے تشریف لے گئے)۔ **(قرطبی)**

مکہ مکرمہ میں نبی کریم ﷺ کا قبلہ کیا تھا؟

اس میں ایک قول پہلے بیان کیا جا چکا ہے کہ مکہ مکرمہ میں بھی آپ کا قبلہ بیت المقدس ہی تھا البتہ آپ اس طرح کھڑے ہوتے کہ کعبہ شریف بھی آپ کے سامنے ہوتا مدینہ طیبہ میں چونکہ کعبہ شریف جنوبی جانب ہے اور بیت المقدس شمالی جانب ہے دونوں مختلف سمتوں میں ہونے کی وجہ سے بیک مرتبہ سامنے نہیں ہو سکتے تھے اس لئے سولہ، سترہ ماہ فقط بیت المقدس کی طرف منہ کر کے نماز ادا کرنے کا حکم جاری رہا پھر قبلہ تبدیل کر کے کعبہ شریف بنا دیا گیا۔

دوسرا قول یہ ہے کہ مکہ مکرمہ میں قبلہ کعبہ شریف تھا مدینہ طیبہ میں بیت المقدس کی طرف منہ کر کے نماز ادا کرنے کا حکم دیا گیا اور سولہ سترہ ماہ کے بعد قبلہ کو تبدیل کر کے پھر کعبہ شریف کو قبلہ بنا دیا گیا۔

اس قول کے متعلق علامہ قرطبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں " قال ابو عمر وهذا اصح القولين عندى " ابو عمر کہتے ہیں دونوں قولوں میں سے میرے نزدیک یہی قول زیادہ صحیح ہے۔ (از قرطبی)

راقم کا بھی پہلے یہی موقف رہا اب تفاسیر کے مطالعہ سے اور فتح الباری، نووی، عمدۃ القاری، مرقاۃ کو دیکھنے سے پہلا قول زیادہ راجح نظر آیا............ واللہ اعلم بالصواب۔

مسئلہ : بیت المقدس کی طرف منہ کر کے نماز ادا کرنے کا صراحۃً ذکر قرآن پاک میں نہیں بلکہ حدیث پاک میں ہے اس سے ایک بات تو یہ سمجھ آئی کہ قرآن پاک کو سمجھنے کے لئے حدیث پاک کا سمجھنا ضروری ہے۔ حدیث پاک کے بغیر قرآن پاک پر عمل ممکن ہی نہیں۔ دوسری بات یہ سمجھ آئی کہ قرآن پاک سے حدیث پاک کو منسوخ کرنا جائز ہے۔ (ماخوذ از قرطبی)

شان صحابہ کرام: تحویل قبلہ کے حکم سے صحابہ کرام کی شان واضح طور پر سمجھ آتی ہے کہ انہوں نے نبی کریم ﷺ کو نماز کی حالت میں پھرتا ہوا دیکھ کر ہی اپنے اپنے رخ پھیر لئے کسی نے اس میں کوئی حجت بازی نہیں کی۔ پھر جہاں جہاں خبر پہنچتی رہی وہاں وہاں بلا چون وچرا لوگ اپنا قبلہ بدلتے رہے۔ سبحان اللہ وہ کتنے ہی شریعت کے پابند تھے اور کتنے ہی زیادہ نبی کریم ﷺ سے محبت کرنیوالے تھے۔

آیۃ کریمہ کی قدرے وضاحت:

" (قَدْ نَرٰى) ربما نرى (تَقَلُّبَ وَجْهِكَ فِى السَّمَاءِ) تردد وجهک فى جهة السماء تطلعا للوحى " ہم بار بار آپ کا منہ آسمانوں کی طرف پلٹتے ہوئے دیکھ رہے ہیں وحی کی انتظار میں نبی کریم ﷺ اپنا رخ بار بار آسمانوں کی طرف اٹھاتے۔

" قد نرى " کا معنی " ربما نرى " کیا گیا ہے یہ بتانا مقصود ہے کہ " قد فى قوله تعالىٰ قد نرى للتكثير ومعناها كثرة الرؤية " لفظ " قد " اللہ تعالیٰ کے ارشاد گرامی " قد نرى " میں کثرت کے معنی میں استعمال ہے معنی اس کا کثرت رؤیت ہے یعنی ہم بار بار دیکھ رہے ہیں۔ اگرچہ

"قد" مضارع پر داخل ہو تو تقلیل کے معنی میں آتا ہے لیکن کبھی کبھی مجازی طور پر تکثیر کے لئے بھی آتا ہے۔ جس طرح "رب" تقلیل کے لئے آتا ہے لیکن کبھی کبھی تکثیر کے لئے بھی آتا ہے۔ وجہ اس کی یہ ہوتی ہے کہ دو چیزیں جو ایک دوسری کی ضد ہیں ان میں مناسبت برقرار رہے۔ (از بیضاوی و شیخ زادہ)

نبی کریم ﷺ پسند کرتے تھے کہ آپ کا قبلہ کعبہ ہو جائے کیونکہ یہود کہتے تھے "یخالفنا محمد فی دیننا ویتبعنا قبلتنا" محمد ہمارے دین کی مخالفت کرتے ہیں اور ہمارے ہی قبلہ کی تابعداری کرتے ہیں۔ تو نبی کریم ﷺ نے ایک دن جبریل کو کہا کہ میں یہ پسند کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ ہمارا قبلہ کعبہ کر دے کیونکہ وہ قبلہ ہی میرے باپ ابراہیم کا ہے تو حضور کی خدمت میں جبریل نے عرض کیا۔

"انما انا عبد مثلک وانت کریم علی ربک فاسئل انت ربک فانک عند المکان"

میں تو آپ کی طرح اللہ تعالیٰ کا بندہ ہوں البتہ آپ اللہ تعالیٰ کے ہاں مکرم ہیں اور آپ کا اللہ تعالیٰ کے ہاں خاص مقام ہے اس لئے آپ اپنے رب سے سوال کرو۔ تو رسول اللہ ﷺ اللہ تعالیٰ سے کثیر دعاء فرماتے اور بار بار آسمانوں کی طرف نظر اٹھاتے اس انتظار میں کہ اللہ تعالیٰ کا حکم کب آتا ہے تو اللہ تعالیٰ نے اس آیۃ کریمہ کو نازل فرمایا۔ (از مظہری)

جبریل سے کہنے میں حکمت: نبی کریم ﷺ نے قبلہ کی تبدیلی کا ذکر پہلے جبریل سے کیا کہ آپ چاہتے ہیں کہ قبلہ تبدیل کر دیا جائے "فاخبره جبریل بان الله تعالیٰ قد اذن له فی هذا الدعاء" تو جبریل نے آپ کو خبر دی کہ بیشک اللہ تعالیٰ آپ کو قبلہ کے تبدیل کرنے کے لئے دعاء کرنے کی اجازت دیتا ہے:

"وذلک لان الانبیاء لا یسألون الله تعالیٰ شیأ الا باذن منه لئلا یسألوا مالا صلاح فیه فلا یجابوا الیه فیفضي ذلک الی تحقیر شأنهم"

اس کی وجہ دراصل یہ تھی کہ انبیاء کرام اللہ تعالیٰ کی اجازت کے بغیر کوئی سوال نہیں کرتے کہ ایسا نہ ہو کہ وہ ایسا سوال کر دیں جو بہتر نہ ہو اور ان کی دعاء کو قبول نہ کیا جائے کہ ان کی تحقیر شان لازم آئے۔

واضح ہوا کہ انبیاء کرام کوئی ایسا سوال نہیں کرتے جو قبول نہ ہو۔ بلکہ رب تعالیٰ سے اجازت لے کر سوال کرتے ہیں یا پھر رب تعالیٰ کی طرف سے انبیاء کرام کو پہلے ہی منع کر دیا جاتا ہے کہ فلاں چیز کی

دعاء نہ کرنا۔

" فلما اذن اللہ تعالیٰ لہ فی الاجابة علم انه یستجاب الیه فکان یقلب وجهه فی السماء ینتظر مجئی جبریل علیه السلام بالوحی فی الاجابة "

جب اللہ تعالیٰ نے آپ کو دعاء کرنے کی اجازت دے دی کہ آپ کی دعاء کو قبول کیا جائے گا آپ دعاء کی قبولیت کے یقین پر آسمانوں کی طرف بار بار چہرہ اٹھا کر دیکھتے کہ کب جبریل قبولیت کی وحی لاتے ہیں۔ (از کبیر)

اعتراض : بیت المقدس جب رب تعالیٰ کے حکم سے قبلہ بنایا گیا تھا تو نبی کریم ﷺ اس کے خلاف خواہش کرنا تو رب تعالیٰ کی منشأ کے خلاف ہو گیا۔ گویا کہ رب تعالیٰ کی مرضی پر اپنی مرضی کو ترجیح دینا لازم آ گیا یہ کس طرح صحیح ہے؟

جواب : نبی کریم ﷺ کے دل میں رب تعالیٰ نے ہی ڈالا۔ خواہش کے مطابق کام اس وقت ہوتا جب رب تعالیٰ کے حکم کے بغیر ہوتا۔ جب تمنا یہ تھی کہ رب تعالیٰ اجازت دے دے تو یہ تمنا دراصل رب تعالیٰ کی رضاء کے مطابق ہے " وای بعد فی ان یمیل طبع الرسول الی شئی فیتمنی فی قلبه ان یاذن اللہ لہ فیه " اس میں کون سی خرابی ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی طبیعت ایک چیز کی طرف مائل ہو، اور آپ کے دل میں یہ تمنا ہو کہ رب تعالیٰ اسی کا حکم دے دے۔ (از کبیر)

کعبہ کی تمنا کی وجوہ:

(۱) اس میں ایک وجہ تو وہی تھی جس کا ذکر پہلے ہوا کہ یہود کہتے تھے کہ بیشک یہ ہمارے دین کی مخالفت کرتے ہیں اور ہمارے قبلہ کی تابعداری کرتے ہیں " ولو لا نحن لم یدر این یستقبل " اور اگر ہم نہ ہوتے انہیں معلوم ہی نہ ہوتا کہ نماز میں کدھر متوجہ ہونا ہے۔ تو نبی کریم ﷺ کے دل میں خواہش پیدا ہوئی کہ قبلہ بدل جائے، کعبہ شریف کو قبلہ کا حکم آ جائے۔

(۲) " ان الکعبة کانت قبلة ابراهیم " دوسری وجہ یہ تھی کہ کعبہ چونکہ ابراہیم علیہ السلام کا قبلہ تھا اس لئے آپ چاہتے تھے کہ میرے جد امجد ابراہیم علیہ السلام کا قبلہ ہی میرا قبلہ بھی ہو جائے۔

(۳) "انه علیه السلام کان یقدر ان یصیر ذلک سببا لا ستمالة العرب ولدخولهم فی الاسلام" بیشک نبی کریم ﷺ کعبہ شریف کے قبلہ ہو جانے کی تمنا اس لئے کر رہے تھے کہ عرب لوگ اس کی طرف مائل ہو جائیں اور اسلام قبول کرلیں۔ کیونکہ ان کا پہلے سے ہی میلان کعبہ کی طرف ہی تھا کیونکہ وہ ابراہیم علیہ السلام کی اولاد میں سے تھے۔

(۴) "انه علیه السلام احب ان یحصل هذا الشرف للمسجد الذی فی بلدته ومنشئه" چوتھی وجہ یہ تھی کہ آپ یہ چاہتے تھے کہ یہ شرافت اس مسجد کو حاصل ہو جائے جو آپ کے پیدائش والے شہر میں ہے۔ آپ کا اپنے آبائی گاؤں کی طرف اس لئے میلان کہ اسے عظیم منصب ہو جائے فطرتی امر تھا۔ (از کبیر)

فَلَنُوَلِّيَنَّكَ قِبْلَةً تَرْضَاهَا : کا مطلب یہ ہے کہ ہم تمہیں قبلہ کی طرف توجہ کرنے کی قدرت عطاء کردیں گے جو قبلہ آپ کو پسند ہے "ترضاها" میں چند وجوہ ہیں" احدها ترضاها تحبها وتمیل الیها لان الکعبة کانت احب الیه من غیرها بحسب میل الطبع " ان میں سے ایک یہ ہے کہ "ترضاها" کا معنی یہ ہے کہ جس سے آپ محبت کرتے ہیں اور جس کی طرف آپ میلان کرتے ہیں کیونکہ کعبہ شریف کی طرف آپ کا طبعی طور پر میلان زیادہ تھا۔" وثانیها (قبلة ترضاها) ای تحبها بسبب اشتمالها علی المصالح الدینیة " اور دوسرا مطلب یہ ہے کہ ہم ضرور بضرور پھیر دیں گے اس قبلہ کی طرف جسے تم پسند کرتے ہو کیونکہ اس میں کئی دینی مصلحتیں پائی گئی ہیں " وثالثها قال الاصم ای کل جهة وجهک الله الیها فهی لک رضا لا یجوز ان تسخط کما فعل من انقلب علی عقبیه من العرب الذین کانوا قد اسلموا فلما تحولت القبلة ارتدوا "

اور تیسری وجہ جو اصم رحمہ اللہ نے بیان کی وہ یہ ہے کہ رب تعالیٰ کے ارشاد گرامی کا مطلب یہ ہے کہ ہم آپ کا قبلہ تبدیل کر رہے ہیں لیکن آپ کو تو جس طرف متوجہ ہونے کا حکم دے دیا گیا آپ تو اسی پر راضی رہیں گے آپ سے ناراض ہونے کا تصور تو ممکن نہیں، جس طرح عرب حضرات میں سے بعض اسلام لانے کے باوجود قبلہ کی تبدیلی کے حکم کے بعد (العیاذ باللہ) مرتد ہو گئے تھے۔

" ورابعها (ترضاها) ای ترضی عاقبتها لأنک تعرف بها من یتبعک للاسلام ممن

یتبعک لغیر ذلک من دنیا یصیبھا او من یکتسبه "

اور چوتھی وجہ یہ ہے کہ آپ قبلہ کی تبدیلی کے انجام پر راضی ہیں کیونکہ آپ کو تو معلوم ہے کہ کون آپ کی تابعداری صرف اسلام سے محبت کی وجہ سے کر رہا ہے، اور کون آپ کی تابعداری اس کے بغیر دنیاوی اغراض اور مال حاصل کرنے کے لئے کر رہا ہے۔ یعنی قبلہ کی تبدیلی کے بعد یہ دونوں فریق نمایاں طور پر علیحدہ علیحدہ نظر آئیں گے، جو اسلام کی وجہ سے آپ کی تابعداری کر رہے ہیں وہ تو پھر بھی تابعداری کرتے رہیں گے اور جو دنیاوی اغراض و مقاصد کی وجہ سے تابعداری کر رہے ہیں وہ پھر جائیں گے۔ (از کبیر)

خیال رہے کہ " ترضاها " میں یہ وجوہ ذکر کرنے کی ضرورت اس لئے در پیش آئی کہ در حقیقت ایک سوال کو مندفع کرنا مقصود تھا وہ سوال یہ تھا کہ " رضا " بمقابلہ "سخط" استعمال ہوتا تھا "سخط" کا معنی ناراض ہونا اور "رضا" کا معنی ناراض نہ ہونا۔ نبی کریم ﷺ کا بیت المقدس کی طرف منہ کرنے پر ناراض ہونے کا کیا مطلب؟ واضح کر دیا کہ یہاں "رضا" کے اور مطالب ہیں۔ ناراض نہ ہونے والا معنی نہیں لیا گیا۔

فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ: " فا " تعقیب مع الوصل کو چاہتی ہے۔ جس سے پتہ چلا کہ " فَلَنُوَلِّيَنَّكَ " ارشاد فرما کر ساتھ ہی حکم دے دیا کہ اب آپ کعبہ کی طرف منہ پھیر لیں۔

وجھک سے مراد: ذکر "وجہ" ہے لیکن مراد اس سے تمام بدن ہے کیونکہ انسان پر واجب ہے کہ اپنے تمام بدن سے قبلہ کا استقبال کرے، صرف چہرہ کو قبلہ کی طرف کرنا اور باقی بدن کو قبلہ سے پھیر لینا جائز نہیں۔ چونکہ "وجہ" (چہرہ) تمام اعضاء سے اشرف ہے اسی سے ایک دوسرے انسان کے درمیان تمیز ہوتی ہے۔ " فلهذا السبب قد يعبر عن كل الذات بالوجه " اسی وجہ سے کبھی "وجہ" کا ذکر کر کے مراد کل ذات لے لی جاتی ہے۔ (کبیر)

شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ: یہاں " شطر " کا معنی طرف ہے اگرچہ " شطر " کا اصل میں معنی ہے "جدا ہونا" کہا جاتا ہے " شطر " جب وہ جدا ہو جائے جو گھر دوسرے گھروں سے علیحدہ ہوا سے "دار شطور " کہتے ہیں پھر ایک جانب طرف کو شطر کہہ لیا جاتا ہے خواہ جدا ہو یا نہ ہو۔

" والحرام المحرم ای محرم فيه القتال او ممنوع عن الظلمة ان يتعرضوه "

مسجد حرام کو حرام کہنے کی وجہ یہ ہے کہ وہاں قتال کرنا حرام ہے اور ظالمین کو وہاں ظلم کرنے کی اجازت نہیں۔(تفصیل پہلے گزر چکی ہے)

مسجد کا ذکر کیا کعبہ کا نہیں، کیا وجہ؟ جب قبلہ کی تبدیلی کا حکم ہوا اس وقت نبی کریم ﷺ مدینہ طیبہ میں تھے جو مکہ مکرمہ سے دور ہے "والبعید یکفیه مراعاة الجهة لان استقبال عینها حرج علیه بخلاف القریب" اور دور والے کے لئے کعبہ کی جہت کی طرف منہ کرنا کافی ہے قریب والے کے لئے یعنی جسے کعبہ شریف نظر آ رہا ہو اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ عین کعبہ کی طرف متوجہ ہو دور والے کے لئے عین کعبہ کی طرف توجہ کرنے کی قید لگانا حرج عظیم ہے۔ (از بیضاوی)

تنبیہ : پہلے پارہ میں " قُلْ لِلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ " کی وضاحت کرتے ہوئے کافی حد تک مسئلہ واضح کر دیا گیا، یہاں اتنا سمجھا جائے کہ یہ ضروری نہیں کہ قبلہ کی سمت معین کرنے میں علم ریاضی اور علم ہیئت اور موجودہ سائنسی آلات سے جو سمت معین ہو گی اسی کی طرف منہ کرکے نماز پڑھی جائے تو نماز صحیح ہو گی ورنہ صحیح نہیں ہو گی، یہ کہنا سراسر غلط ہے۔

" ویدل علیه ان الناس من عهد رسول الله ﷺ بنوا المساجد فی جمیع بلاد الاسلام ولم یحضروا قط مهندسا عند تعیین جهة القبلة "

اس پر واضح دلیل یہ موجود ہے کہ نبی کریم ﷺ کے زمانہ میں مختلف شہروں میں مسلمانوں نے مساجد تعمیر کیں انہوں نے قبلہ کی سمت مقرر کرنے کے لئے کسی ریاضی دان اور سائنس دان کو نہیں بلایا۔

" وحیث اجتمعت الامة من الصحابة والتابعین ومن بعدهم علی صحة ما وقع فیها من الصلوة علمنا ان محاذاة عین الکعبة لیست بشرط "

اور اس میں صحابہ کرام اور تابعین اور بعد میں آنے والے علماء اور صلحاء کا اجماع کہ ان مساجد میں نماز صحیح ہے جو علم ہندسہ وغیرہ والے لوگوں کے بغیر ہی سمت مقرر کر کے بنائی گئی پتہ چلا کہ دور والوں کے لئے کعبہ کی جہت کی طرف منہ کر کے نماز ادا کرنا ضروری ہے عین کعبہ کا تعین ضروری نہیں۔

" لو کان استقبال عین الکعبة واجب لکان تعلم الدلائل لهندسیة واجبا علی کل احد لان استقبال العین لا سبیل الیه الا بتلک الدلائل ولما کان غیر واجب علمنا ان استقبال العین غیر واجب "

اگر عین کعبہ کا استقبال واجب ہوتا تو ہر شخص پر علم ہندسہ کا پڑھنا واجب ہوتا کیونکہ اس کے بغیر عین کعبہ کا تعین ممکن نہیں جب علم ہندسہ، علم ہیئت، علم سائنس کا پڑھنا ہر شخص پر واجب نہیں تو پتہ چلا دور والوں کے لئے صرف جہت کی طرف توجہ کرنا کافی ہے۔ (از شیخ زادہ)

نبی کریم ﷺ کی حدیث پاک بھی " شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ " کی وضاحت کر رہی ہے۔

☆ " عن ابی هريرة قال قال رسول الله ﷺ ما بين المشرق والمغرب قبلة "

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا مشرق ومغرب کے درمیان قبلہ ہے۔ (ترمذی)

آپ کا یہ ارشاد مدینہ طیبہ والے لوگوں کے لئے تھا جن کا قبلہ مشرق اور مغرب کے درمیان جنوبی طرف واقع ہے اس حدیث پاک سے بھی سمت کا تعین کافی سمجھ آتا ہے۔ اس لئے وہ لوگ ضال اور مضل ہیں جن کو نماز تو آتی نہیں، مسائل سے ناواقف ہوتے ہیں لیکن قطب نما اٹھائے پھرتے ہیں۔ اور مساجد کے قبلہ پر معترض ہوتے رہتے ہیں اور صدیوں سے ان مساجد میں نماز پڑھنے والے حضرات کی نمازوں کو باطل قرار دیتے ہیں وہ خود باطل راہ پر ہیں۔

48 ڈگری تک سمت کے معین کرنے کے لئے وسعت ہے اس لئے بنی ہوئی مساجد میں پانچ، سات ڈگری کے فرق سے اعتراض کی ضرورت نہیں۔ البتہ نئی مساجد کے لئے قبلہ کی سمت کو معین کرنے کے لئے آلات سے کام لے لیا جائے تو بہتر ہے۔

اسی وجہ سے علامہ غزالی رحمہ اللہ نے علم ہندسہ، علم ہئیت وغیرہ کو ضرورت کے مطابق سیکھنے کو محمود کہا اور حد سے زیادہ ان علوم میں عمر گنوا دینے کو مذموم کہا لیکن قرآن وحدیث کا زیادہ سے زیادہ علم حاصل کرنا محمود ہے۔

افسوس آجکل یہود ونصاریٰ کو فکر لاحق ہے کہ قرآن وحدیث کا علم مسلمانوں سے کیسے چھڑایا جائے انہوں نے اپنے یار بنا رکھے ہیں، جو بے دینوں کو دیندار بنانے کی فکر تو نہیں کر رہے البتہ دینداروں کو بے دین بنانے کی فکر میں لگے ہوئے ہیں آٹھویں صدی ہجری کے مشہور معروف عالم ابن رجب حنبلی اسی بناء پر سمت قبلہ میں آلات رصدیہ اور تدقیقات ریاضیہ میں پڑنے کو منع فرماتے ہیں۔

" واما علم التيسير فاذا تعلم منه ما يحتاج اليه للاستهداء ومعرفة القبلة والطرق كان

جائزا عند الجمهور وما زاد علیه فلاحاجة الیه وهو یشغل عما هو اهم منه وربما ادی التدقیق فیه الی اساءة الظن بمحاریب المسلمین فی امصارهم کما وقع فی ذلک کثیر من اهل هذا العلم قدیما وحدیثا وذلک یفضی الی اعتقاد خطأ الصحابة والتابعین فی صلواتهم فی کثیر من الامصار وهو باطل وقد انکر الامام احمد الاستدلال بالجدی وقال انما ورد ما بین المشرق والمغرب قبلة "

لیکن علم تیسیر کا اتنی قدر جمہور کے نزدیک حاصل کرنا جائز ہے جس سے راہ حاصل کر سکے اور قبلہ کی سمت متعین کر سکے اور راستوں کا پتہ چلا سکے۔ اس سے زیادہ کی ضرورت نہیں کیونکہ اس قسم کے علوم میں زیادہ مشغول رہنا ضروری علوم سے اسے غافل کر دے گا بلکہ بسا اوقات تدقیقات فلسفہ میں پڑنے سے مسلمانوں کے شہروں میں واقع مساجد کے محرابوں کو دیکھ کر بدگمانی پیدا ہوتی ہے جیسا کہ قدیم فلاسفہ یا نئے فلاسفہ اس قسم کی بدگمانی کا شکار ہوتے رہے۔ یہ بدگمانیاں انسان کو یہاں تک پہنچا دیتی ہیں کہ وہ صحابہ کرام اور تابعین مکرمین کی نمازوں کو غلط سمت کی طرف سمجھنے لگ جاتا ہے یہی باطل راہ ہے (یہی مسلمانوں کے زوال کا سبب بنا) حضرت امام احمد رحمہ اللہ نے ستارہ جدی (قطبی ستارہ) سے کعبہ کی تعیین میں دلیل پکڑنے کو منع کیا اور فرمایا کہ قبلہ مشرق اور مغرب کے درمیان ہے۔

نتیجہ واضح ہوا: کعبہ شریف سے مشرق کی طرف رہنے والوں کے لئے موسم گرما اور موسم سرما کے غروب ہونے کے درمیان قبلہ ہے ریاضی کے قواعد کے مطابق ان کے درمیان 48 ڈگری کا فاصلہ ہے 48 ڈگری ہی شرح چغمینی باب رابع ص ٦٦ میں بھی مذکور ہے۔ لہذا 24 ڈگری تک دائیں بائیں ہونے سے نماز درست ہوگی (از معارف) اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ نے بہت طویل بحث کی ہے آپ کا مختار یہ ہے کہ زاویہ قائمہ 90 ڈگری ہے 45 ڈگری سے کم فرق پر نماز صحیح ہوگی۔ (از فتاوی رضویہ)

ابھی جو 24 ڈگری کا ذکر کیا ہے اس قول کو علامہ رازی رحمہ اللہ علیہ کے اس بیان سے تائید ملتی ہے " شطر " کا ایک معنی نصف ہے کہا جاتا ہے " شطرت الشئی ای جعلته نصفین " میں نے فلاں چیز کے دو حصے بنائے۔

" ان المصلی خارج المسجد لو وقف بحیث یکون متوجها الی المسجد ولکن لا یکون متوجها الی منتصف المسجد الذی هو موضع الکعبة لا تصح صلوته "

نمازی جب مسجد حرام سے باہر ہو اور مسجد کی طرف متوجہ ہو لیکن کعبہ کے مقام کے نصف مسجد کی طرف توجہ نہ کرے تو اس کی نماز نہیں ہوگی۔ (از کبیر)

خیال رہے کہ "شطر" کا معنی جانب کرنا زیادہ بہتر قرار دیا گیا تاہم جب "شطر" میں نصف والے معنی کا بھی احتمال ہے تو احتیاط اسی میں ہے کہ 24 ڈگری سے زائد انحراف کی صورت میں نماز کے نہ ہونے کا قول کیا جائے اگرچہ بعض مفسرین نے 45 ڈگری تک بھی جواز کا قول کیا ہے۔

وَحَيْثُ مَا كُنْتُمْ فَوَلُّوا وُجُوهَكُمْ شَطْرَهُ :

''اور جہاں بھی تم ہو تو پھیر لو اپنے مونہوں کو اسی طرف''

پہلا خطاب فقط رسول اللہ ﷺ کو کیا گیا ﴿ فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ﴾ اس لئے کہ آپ کو علیحدہ خطاب میں آپ کی عظمت شان کو ذکر کیا گیا۔ اور ساتھ ساتھ آپ کی رغبت کے مطابق قبلہ کو تبدیل کرنے کی دعا کی قبولیت کو بیان کیا گیا۔ اب تمام لوگوں کو خطاب ہے خواہ وہ اس وقت نبی کریم ﷺ کے ساتھ موجود تھے، یا موجود نہیں تھے یعنی پہلے خطاب سے ضمناً سمجھ آیا تھا کہ جو حکم نبی کریم ﷺ کو دیا گیا وہی آپ کی امت کے لئے ہے لیکن اس میں امت کو صراحۃً حکم دیا گیا کہ وہ بھی مسجد حرام کی طرف ہی اپنے اپنے منہ کر لیں۔ (از بیضاوی و شیخ زادہ)

وَاِنَّ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ لَيَعْلَمُوْنَ اَنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّهِمْ :

اور بیشک وہ لوگ جو کتاب دیئے گئے وہ جانتے ہیں کہ بیشک یہ حق ہے ان کے رب کی طرف سے

یعنی یہود کو تورات کے ذریعے یہ علم تھا کہ آخری نبی کے یہ اوصاف ہوں گے "وانه يصلى الى القبلتين" اور وہ دو قبلہ کی طرف استقبال کر کے نماز ادا کریں گے ان کا پہلا قبلہ بیت المقدس ہوگا، اور دوسرا قبلہ کعبہ شریف ہوگا۔ اور ان کے علم کی یہ وجہ بھی تھی: "انهم كانوا يعلمون ان الكعبة هى البيت العتيق الذى جعله الله تعالىٰ قبلة لابراهيم واسمعيل عليهما السلام" کہ بیشک وہ جانتے تھے کہ بیشک کعبہ شریف ہی دنیا میں پہلا گھر ہے اور اسی کو قدر و منزلت حاصل ہے اسی کو اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم اور حضرت اسمٰعیل علیہما السلام کا قبلہ بنایا تھا۔ اور وجہ ان کے علم کی یہ تھی کہ وہ نبی کریم ﷺ کی نبوت کو جانتے تھے آپ کے معجزات کو وہ دیکھ چکے تھے:

" ومتی علموا نبوته فقد علموا لا محالة ان کل ما اتی به فهو حق فکان هذا التحویل حقا "
اور جب ان کو آپ کی نبوت کا علم یقینی طور پر حاصل ہو چکا تھا تو یقینا ان کو یہ بھی پتہ چل گیا تھا کہ یہ قبلہ کی تبدیلی حق ہے۔ (از کبیر)

وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا يَعْمَلُوْنَ: اور نہیں ہے اللہ تعالیٰ غافل اس سے جو وہ عمل کرتے ہیں۔

ان الفاظ مبارکہ میں مسلمانوں کے لئے وعد بھی ہے، اور یہود کے لئے وعید بھی اگر خطاب مسلمانوں کو ہو تو ان کے لئے وعدا اور بشارت ہے " لا یخفی علی جدکم واجتهاد کم فی قبول الدین فلا اخل بثوابکم " یعنی تمہارا اپنے نیک اعمال میں کوشش کرنا اور اس میں محنت کرنا رب تعالیٰ سے پوشیدہ نہیں اس لئے تمہارے اعمال کو وہ دین میں قبول فرمائے گا اور تمہارے ثواب میں کوئی کمی نہیں کرے گا۔ (از کبیر)

قبلہ مقرر کرنے میں حکمتیں:

(۱) اللہ تعالیٰ نے انسان میں قوۃ عقلیہ کو پیدا کیا جس سے وہ مجردات اور معقولات کا ادراک کرتا ہے اور قوۃ خیالیہ کو پیدا فرمایا جو عالم اجسام میں تصرف کرتی ہے قوۃ عقلیہ اور قوۃ خیالیہ ایک دوسری کے ساتھ ہی رہتی ہیں کم ہی ایک دوسری سے جدا ہوتی ہیں۔ انسان جب امر عقلی مجرد کو ذہن میں حاضر کرنا چاہتا ہو تو ضروری ہے کہ اس کی ایک صورۃ خیالیہ کو ذہن میں منقش کرے پھر قوۃ عقلیہ سے اس کا ادراک کرے۔

اسی سے واضح ہو گیا کہ قوۃ خیالیہ اور قوۃ عقلیہ ساتھ ساتھ پائی جاتی ہیں ایک دوسری سے جدا نہیں ہوتیں علم ہیئت والا شخص جب ارادہ کرتا ہے مقادیر کے احکام میں سے کسی حکم کو ادراک کرنے کا تو اس کے لئے شکل وصورت کو معین کر کے ذہن میں لاتا ہے۔ تو اس کو عقل میں لانے کے لئے حس اور خیال کو بھی معین کیا جاتا ہے پھر اس کا ادراک کیا جاتا ہے یعنی کسی چیز کے ادراک کے لئے اس کی طرف کامل توجہ کی ضرورت ہوتی ہے۔

اس تمہید کے بعد بلا تشبیہ وتمثیل مسئلہ کو یوں سمجھا جائے کہ جب انسان جو کہ عبد ضعیف ہے اللہ تعالیٰ کے دربار میں حاضری دیتا ہے تو اس کے لئے ضروری ہو جاتا ہے کہ وہ اس ذات کا استقبال

کرے اس سے اعراض نہ کرے اور اپنی زبان سے اس کی تعریف زیادہ سے زیادہ کرے، اور اس کی خدمت اور عجز کے اظہار میں زیادہ سے زیادہ کوشش کرے۔ چونکہ رب تعالیٰ مکان اور جہت سے پاک ہے اس لئے قبلہ کی طرف توجہ کرنے کا حکم دے کر گویا کہ ذات کی طرف متوجہ ہونے کا حکم دے دیا گیا، اسی حکم سے یہ ثابت ہو جائے گا کہ بندہ رب تعالیٰ سے اعراض نہیں کر رہا۔ پھر قراءت اور تسبیحات اللہ تعالیٰ کی تعریف ہیں اور رکوع وسجود رب تعالیٰ کی خدمت کے قائم مقام ہیں۔

(۲) مقصود نماز میں دل کا حاضر رکھنا ہے اور دل کا حضور اس وقت تک نہیں حاصل ہو سکتا جب تک سکون حاصل نہ ہو اور حرکت اور ادھر ادھر توجہ کو چھوڑ نہ دے " **وهذا لا يتاتى الا اذا بقى فى جميع صلوته مستقبلا لجهة واحدة على التعين** " اور یہ کیفیت اسی وقت حاصل ہو سکتی ہے جب ایک جہت کی طرف توجہ کی جائے پھر کعبہ شریف کی خصوصی فضیلت کی وجہ سے رب تعالیٰ نے اسی کو نماز میں توجہ کرنے کے لئے منتخب فرما دیا۔

(۳) قبلہ مقرر کرنے کی اور وجہ یہ ہے کہ رب تعالیٰ یہ پسند فرماتا ہے کہ مومن آپس میں ایک دوسرے سے محبت کریں اور ایک دوسرے سے اتفاق واتحاد رکھیں اللہ تعالیٰ نے مؤمنین کے درمیان اتفاق واتحاد کو مقام احسان میں ذکر فرمایا ارشاد باری تعالیٰ ہوتا ہے:

﴿ وَاذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ كُنْتُمْ اَعْدَاءً فَاَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِكُمْ فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهٖ اِخْوَانًا ﴾
(آل عمران: ۱۰۳)

" اور اللہ کا احسان اپنے اوپر یاد کرو جب تم میں دشمنی تھی اس نے تمہارے دلوں میں الفت ڈال دی تو اس کے فضل سے تم آپس میں ایک دوسرے کے بھائی بھائی بن گئے"۔ اگر ہر شخص نماز میں اپنی مرضی سے جدھر چاہتا منہ کر لیتا تو مومنین کا آپس میں اختلاف ظاہر ہوتا " **فعين الله تعالىٰ لهم جهة معلومة وامرهم جميعا بالتوجه نحوها ليحصل لهم الموافقة بسبب ذلك** " تو اللہ تعالیٰ نے سب کے لئے ایک ہی قبلہ معین فرما دیا اور سب کو اسی کی طرف متوجہ ہونے کا حکم دے دیا تا کہ ان کے درمیان اتفاق واتحاد رہے۔

" **وفيه اشارة الى ان الله يحب الموافقة بين عباده فى اعمال الخير** "

اسی سے ایک اور مسئلہ سمجھ آ گیا کہ کسی نیکی کے کام میں بندوں کا متفق ہونا اللہ تعالیٰ کو پسند ہے۔

کعبہ کو قبلہ بنانے میں حکمتیں:

(۱) اللہ تعالیٰ نے کعبہ کو اپنی طرف منسوب کر کے اسے خصوصیت وفضیلت عطاء کی رب تعالیٰ نے "بیتی" ذکر فرمایا کہ یہ میری طرف منسوب ہونے کی وجہ سے میرا گھر ہے۔ اور مؤمنین کو اللہ تعالیٰ نے صفت عبودیت سے خاص فرمایا اور اپنی طرف منسوب کیا گویا کہ یوں فرمایا:

" یا مؤمنین انت عبدی والکعبة بیتی والصلوة خدمتی فاقبل بوجهک فی خدمتی الی بیت وبقلبک الی "

اے مومن تو میرا بندہ ہے، اور کعبہ میرا گھر ہے، اور نماز میری خدمت ہے لہذا میری خدمت میں تو میرے گھر کی طرف توجہ کر اور اپنے دل کو کامل طور پر میری طرف متوجہ کر۔

(۲) یہود کا استقبال قبلہ کی غربی جانب تھا یعنی (بیت المقدس کی غربی جانب) کیونکہ موسیٰ علیہ السلام کے پاس نداء غربی جانب سے آئی اور نصاریٰ کا مشرقی جانب تھا کہ جبریل حضرت مریم کے پاس مشرقی جانب سے آئے۔ اور مؤمنین کا قبلہ کعبہ شریف مقرر کیا گیا" **لانها قبلة خلیل الله ومولد حبیب الله وهی موضع حرم الله**" کیونکہ یہ حضرت ابراہیم خلیل اللہ کا قبلہ ہے اور اللہ کے حبیب حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کا پیدائشی شہر ہے اور یہ مقام اللہ تعالیٰ کا حرم ہے۔

(۳) " **استقبلت النصاری مطلع الانوار وقد استقبلنا مطلع سید الانوار وهو محمد ﷺ فمن نوره خلقت الانوار جمیعا** "

نصاریٰ کا قبلہ انوار کے طلوع ہونے کا مقام (سورج کا مطلع) اور ہمارا قبلہ سب نوروں کے سردار حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کے طلوع ہونے کا مقام ہے آپ کے نور سے تمام نور پیدا کئے گئے۔

(۴) کعبہ چونکہ زمین کے وسط اور مرکز میں ہے اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے زمین کے وسط کو قبلہ مقرر فرمایا:

" وهو اشارة الی انه یجب العدل فی کل شئی ولاجله جعل وسط الارض قبلة للخلق "

اس سے یہ مسئلہ واضح کیا کہ ہر چیز میں عدل واجب ہے اسی وجہ سے زمین کے وسط کو مخلوق کا قبلہ بنایا گیا۔

(۵) " انه تعالیٰ اظهر حبه لمحمد علیه الصلوة والسلام بواسطة امره باستقبال الکعبة "

بیشک اللہ تعالیٰ نے کعبہ شریف کی طرف توجہ کرنے کا حکم دے کر واضح کر دیا کہ مجھے

محمد مصطفیٰ ﷺ سے محبت ہے کیونکہ نبی کریم ﷺ یہود کی مخالفت کی وجہ سے چاہتے تھے کہ قبلہ بدل جائے تو رب تعالیٰ نے آپ کی تمنا کے مطابق جب قبلہ تبدیل فرمادیا تو نبی کریم ﷺ کا رب تعالیٰ کا محبوب ہوناواضح ہوگیا:

" فاللہ تعالی قد حول لاجل حبیبہ محمد علیہ الصلوۃ والسلام علی جھۃ التحقیق "

یہ بات تحقیق سے ثابت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے حبیب محمد مصطفیٰ ﷺ کی تمنااور خواہش پر قبلہ کوتبدیل فرمایااس پردلیل یہ ہے کہ رب تعالیٰ نے یہ فرمایا ﴿ فلنولینک قبلۃ ترضاھا ﴾ ہم ضرور برضرور آپ کو پھیر دیں گے اس قبلہ کی طرف جسے آپ پسند کرتے ہیں۔ یہ نہیں فرمایا " قبلۃ ارضاھا " کہ آپ کو اس قبلہ کی طرف پھیر دوں گا جو مجھے پسند ہے اس میں اشارہ ہے اس طرف گویا کہ رب تعالیٰ یہ فرماتا ہے " یا محمد کل احد یطلب رضای وانا اطلب رضاک فی الدارین " اے محمد ہر ایک میری رضاء طلب کرتا ہے اور میں دونوں جہانوں میں تمہاری رضاء طلب کرتا ہوں۔ دنیا میں آپ کی رضاء کی طلب تو اسی آیۃ کریمہ سے سمجھ آ گئی اور آخرت میں رب تعالیٰ کا ارشادگرامی ﴿ وَلَسَوْفَ يُعْطِيكَ رَبُّكَ فَتَرْضَىٰ ﴾ (آپ کو آپ کا رب اتنا دے گا کہ آپ راضی ہوجائیں گے) اسی پردلالت کررہا ہے۔

(۶) کعبہ شریف کو قبلہ مقرر فرما کر فقراء کی شان کو بیان فرمادیا کیونکہ رب تعالیٰ نے فقراء کے متعلق فرمایا " فَتَطْرُدَهُمْ فَتَكُونَ مِنَ الظَّالِمِينَ " اے مخاطب کے باشد اگر تم نے ان فقراء کو اپنی مجالس سے نکال دیا تو تم ظالم ہوجاؤ گے۔ اور کعبہ شریف کے متعلق فرمایا:

" ولئن اتبعت اھوائھم من بعد جاءک من العلم انک اذا لمن الظالمین "

اور اگر تم نے ان کی خواہشات کی تابعداری کی اس کے بعد جب تمہارے پاس علم آ گیا تو بیشک تم ظالموں سے ہوجاؤ گے گویا کہ رب تعالیٰ نے مومنین کو یہ فرمایا:

" الکعبۃ قبلۃ وجھک والفقراء قبلۃ رحمتی فاعراضک عن قبلۃ وجھک یوجب کونک ظالما فالاعراض عن قبلۃ رحمتی کیف یکون "

کہ کعبہ تمہارے چہروں کواس کی طرف متوجہ کرنے کا قبلہ بنایا۔لیکن فقیر لوگ میری رحمت کا قبلہ ہیں۔تمہارا اپنے چہرہ کو متوجہ کرنے کے قبلہ سے اعراض جب تمہیں ظالم بنا دیتا ہے تو تمہارا کیا خیال ہے کہ تم میری رحمت کے قبلہ سے اعراض کر کے کتنے ہی مجھ سے دور ہو گے، کتنے ہی بڑے ظالم ہو گے۔

۷) " العرش قبلة الحملة و الكرسى قبلة البررة ، و البيت المعمور قبلة السفرة و الكعبة قبلة المؤمنين و الحق قبلة المتحيرين من المؤمنين قال الله تعالىٰ (فاينما تولوا فثم وجه الله) "

حاملین عرش فرشتوں کا قبلہ عرش ہے، بررہ فرشتوں کا قبلہ کرسی ہے سفرہ فرشتوں کا قبلہ البیت المعمور ہے مؤمنین کا قبلہ کعبہ ہے اور مؤمنین جو متحیر ہوں ان کا قبلہ حق تعالیٰ ہے اسی لئے رب تعالیٰ نے فرمایا " فاينما تولوا فثم وجه الله " جدھر تم منہ کرو اسی طرف اللہ کی ذات ہے۔

اور ثابت ہوا کہ عرش نور سے پیدا کیا گیا اور کرسی موتی سے، اور البیت المعمور یاقوت سے، اور کعبہ شریف پانچ پہاڑوں سے طور سینا، طور زیتا، جودی، لبنان اور حراء سے بنایا گیا گویا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

" ان كانت عليك ذنوب بمثقال هذه الجبال فاتيت الكعبة حاجا او
توجهت نحوها مصليا كفرتها عنك و غفرتها لك "

اگر تجھ پر ان پہاڑوں کے برابر بھی گناہ ہوئے تو حج کرنے کی غرض سے کعبہ کے پاس آ گیا یا نماز پڑھنے کے لئے کعبہ کی طرف متوجہ ہو گیا (یعنی سچے دل سے تائب ہو کر میرے حضور آ گیا) تو میں تیرے گناہ مٹا دوں گا اور تیری مغفرت کر دوں گا۔ (از کبیر)

تنبیه : تفاسیر کے حوالے تقدیماً و تاخیر ذکر کئے گئے ہیں اس لئے " سيقول السفهاء " سے لے کر اس زیر بحث آیات کریمہ تک کی تفاسیر سے حوالے تلاش کئے جائیں۔

مسئله : استقبال قبلہ کے لئے نیت کرنے کی ضرورت نہیں، کیونکہ آیۃ کریمہ میں قبلہ کی طرف استقبال کرنے کا حکم دیا گیا جب قبلہ کا استقبال کر لیا تو عمل ہو گیا مزید نیت کی ضرورت نہیں جس طرح ستر عورت، طہارت مکان اور کپڑوں کی طہارت میں نیت کی ضرورت نہیں۔ (کبیر)

☆☆☆☆☆

﴿ وَلَئِنْ اَتَيْتَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتَابَ بِكُلِّ آيَةٍ مَّا تَبِعُوْا قِبْلَتَكَ وَمَا اَنْتَ بِتَابِعٍ قِبْلَتَهُمْ وَمَا بَعْضُهُمْ بِتَابِعٍ قِبْلَةَ بَعْضٍ وَلَئِنِ اتَّبَعْتَ اَهْوَاءَ هُمْ مِّنْ بَعْدِ مَا جَاءَكَ مِنَ الْعِلْمِ اِنَّكَ اِذًا لَّمِنَ الظَّالِمِيْنَ ﴾

۱) ''اور اگر تم ان کتابیوں کیلئے ہر نشانی لے کر آؤ وہ تمہارے قبلہ کی پیروی نہ کریں گے اور نہ تم ان کے قبلہ کی پیروی کرو اور وہ آپس میں بھی ایک دوسرے کے قبلہ کے تابع نہیں اور (اے سننے والے کسے باشد) اگر تو اس کی خواہشوں پر چلا بعد اس کے کہ تجھے علم مل چکا تو اس وقت تو ضرور ستمگار ہوگا''۔

۲) ''اور اگر لاؤ تم'' ان لوگوں کے پاس جو کتاب دیئے گئے'' ہر قسم کی نشانی۔ نہیں تابعداری کریں گے وہ تمہارے قبلہ کی اور نہ تم تابعداری کرو ان کے قبلہ کی اور وہ آپس میں بھی ایک دوسرے کے قبلہ کی تابعداری کرنے والے نہیں اور (اے سننے والے کسے باشد) اگر تم تابعداری کرو ان کی خواہشات کی اس کے بعد جو تمہیں علم حاصل ہو چکا تو بیشک تم ظالموں سے ہوگے''۔

اللہ تعالیٰ نے پہلی آیۃ کریمہ میں بیان فرمایا ﴿ وَاِنَّ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتَابَ لَيَعْلَمُوْنَ اَنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّهِمْ ﴾ اور بیشک اہل کتاب البتہ جانتے ہیں بیشک یہ (تحویل قبلہ) حق ہے ان کے رب کی طرف سے۔

اس آیۃ کریمہ میں بیان فرمایا کہ آپ ان کے پاس ہر قسم کے دلائل لے آؤ وہ پھر بھی تمہارے قبلہ کی تابعداری نہیں کریں گے " لان صفتهم لا تتغير فى الاستمرار على المعاندة " کیونکہ ان کی صفت نہیں بدلے گی، ان کی فطرت میں ہی یہ داخل ہے کہ انہوں نے نبی کریم ﷺ اور مؤمنین سے عناد رکھنا، اور ہمیشہ اسی پر قائم رہنا ہے۔ پھر ان سے کیا توقع کی جا سکتی ہے کہ وہ آپ کے قبلہ کی تابعداری کریں گے یعنی ان کے اسلام لانے کی آپ امید نہ رکھیں وہ عناد کی وجہ سے اس نعمت سے محروم

رہیں گے۔ (از کبیر)

﴿ وَلَئِنْ اَتَيْتَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتَابَ بِكُلِّ آيَةٍ مَّا تَبِعُوْا قِبْلَتَكَ ﴾

''اور اگر لاؤ تم ہر قسم کی نشانی اہل کتاب کے پاس تو وہ تمہارے قبلہ کی تابعداری نہیں کریں گے''

'' اتی '' کے بعد '' با '' تعدیہ کے لئے آئی ہوئی ہے اس لئے اس کا معنی لانا۔ '' آية '' فعلة کے وزن پر ہے اصل میں یاء مشدد ہے '' آية '' لیکن تشدید میں ثقل تھا اس لئے پہلے یا ساکن ما قبل فتحہ، سے الف سے بدل دیا گیا۔ آیۃ کا معنی حجت اور علامت، اور کہا جاتا ہے '' آية الرجل '' جس کا معنی انسان کی ذات اور تشخص اسی طرح کہا جاتا ہے '' خرج القوم بآيتهم '' قوم اپنی جماعت سے نکل گئی۔

قرآن پاک کی آیۃ کو آیۃ کہنے کی وجہ:

ایک وجہ یہ ہے کہ قرآن پاک کی آیۃ میں کئی حروف جمع ہوتے ہیں حروف کی جماعت کو آیۃ کہہ دیا گیا۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ آیۃ کا معنی علامت ہے یہ بھی بعد والے کلام کے منقطع ہونے کی علامت بنتی ہے اور اس پر بھی دلیل اور علامت ہے کہ یہ اللہ کا کلام ہے مخلوق سے منقطع ہے یعنی مخلوق نہیں (از کبیر)

'' ولئن '' میں لام موطئہ للقسم ہے '' بكل آية '' کا مطلب ہے '' حجة قطعية دالة على حقيقة التحويل '' کہ آپ ان کے پاس قبلہ کی تبدیلی کے حق ہونے پر ہر قسم کے قطعی دلائل لے آئیں وہ اسے تسلیم نہیں کریں گے اس کی وجہ یہ ہے '' انهم ما تركوا قبلتك لشبهة تزيلها الحجة وانما خالفوك مكابرة وعنادا '' کہ انہوں نے آپ کے قبلہ کو اس لئے نہیں چھوڑا کہ ان کو اس میں کوئی شبہات حاصل تھے کہ وہ دلائل سے زائل ہو جائیں تو یہ ایمان لے آئیں اور آپ کے قبلہ کو تسلیم کر لیں۔ ان کی مخالفت تو صرف حسد، عناد اور تکبر کی وجہ سے ہے لہٰذا نہ ان سے عناد نے زائل ہونا ہے اور نہ ہی انہوں نے آپ کے قبلہ کی تابعداری کرنی ہے۔ (ابوالسعود)

وَمَا اَنْتَ بِتَابِعٍ قِبْلَتَهُمْ : اور نہ تم ان کے قبلہ کی پیروی کرو۔

یہ ترجمہ اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ کا ہے راقم نے بھی اسی کے مطابق ترجمہ کیا ہے۔ علامہ قرطبی رحمہ اللہ

کے اس قول سے اسے تائید حاصل ہے " لفظ خبر ویتضمن الامر ای فلا ترکن الی شئی من ذلک " کہ اگرچہ الفاظ کے لحاظ پر تو یہ جملہ خبر یہ ہے لیکن معنی کے لحاظ سے جملہ انشائیہ ہے معنی یہ ہے کہ آپ ان کے قبلہ کی تابعداری نہ کرو۔ تاہم اگر معنی ہی خبر والا کر دیا جائے کہ '' آپ تابعداری کرنے والے نہیں ان کے قبلہ کی'' تو یہ معنی بھی درست ہے۔

اس ایک جملہ سے پانچ مسائل بیان کردیئے:

"الاول ، انه دفع لتجويز النسخ وبيان ان هذه القبلة لا تصير منسوخة"

ایک یہ کہ قبلہ کی پھر منسوخی کے احتمال کو ختم کر دیا یہ ثابت کر دیا کہ اب آپ کا یہی قبلہ تا قیامت رہے گا اب یہ حکم پھر منسوخ نہیں ہوگا آپ ان کے قبلہ کی کبھی بھی تابعداری کرنے والے نہیں۔

" والثانی حسما لا طماع اهل الكتاب فانهم قالوا ، لو ثبت على قبلتنا لكنا نرجو ان تكون صاحبنا الذى ننتظره وطمعوا فى رجوعه الى قبلتهم "

اور دوسرا یہ ثابت ہوا کہ اہل کتاب یہ کہتے تھے کہ اگر یہ نبی ہمارے قبلہ پر قائم رہیں تو ہم امید رکھیں گے کہ یہ وہی نبی ہوں گے جن کی انتظار کی جارہی ہے اور وہ یہ طمع کر رہے تھے کہ یہ ہمارے قبلہ کی طرف رجوع کرلیں گے۔ ان کے اس طمع کو ختم کر دیا گیا کہ اے محبوب آپ تو ان کے قبلہ کی تابعداری کرنے والے نہیں ان کا طمع کرنا بے مقصد ہے اور ان کا یہ کہنا بھی لغو ہے کہ اگر یہ ہمارے قبلہ پر قائم رہیں تو ہم ان کے آخری نبی ہونے کی امید کریں گے۔ اگر یہ سچے ہوتے تو سولہ، سترہ ماہ آپ ان کے قبلہ کی طرف منہ کر کے نماز ادا کرتے رہے وہ آپ کو نبی تسلیم کر لیتے جب انہوں نے ایمان نہیں لایا تو یہ جھوٹے ہیں۔

" الثالث ، المقابلة يعنى ما هم بتاركى باطلهم وما انت بتارك حقك "

تیسرا مسئلہ یہ بیان کیا گیا کہ جب وہ اپنے باطل راستہ کو چھوڑنے والے نہیں تو یقیناً آپ بھی اپنی حق راہ کو چھوڑنے والے نہیں۔ اسی مسئلہ کو ابن کثیر رحمہ اللہ نے واضح الفاظ سے بیان فرمایا:

وقوله تعالىٰ " وما انت بتابع قبلتهم " اخبار عن شدة متابعة الرسول ﷺ لما امره الله تعالىٰ به وانه كما هم مستمسكون بآرائهم

واھوانھم فھو ایضا مستمسک بامر اللہ وطاعتہ واتباع مرضاتہ وانہ لا یتبع اھوانھم فی جمیع احوالہ ولا کونہ متوجھا الی بیت المقدس"

اللہ تعالیٰ نے اپنے اس ارشادِ گرامی " وما انت بتابع قبلتھم " سے خبر دی ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے حکم کی بہت زیادہ تابعداری کرنے والے ہیں۔ جب کہ اہل کتاب اپنی آراء اور اپنی خواہشات کے مطابق عمل کرتے ہیں اور اپنے نظریات کو نہیں چھوڑتے تو رسول اللہ ﷺ جو کہ اللہ تعالیٰ کے حکم کو تسلیم کرنے والے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی اطاعت کرنے والے ہیں اور اللہ تعالیٰ کی رضا مندی کے متبع ہیں تو وہ یقیناً یہود و نصاریٰ کی خواہشات کی تابعداری کسی چیز میں نہیں کریں گے اور تحویل قبلہ کے بعد بیت المقدس کی طرف کبھی بھی منہ نہیں کریں گے:

" الرابع اراد انہ لا یجب علیک استصلاحھم باتباع قبلتھم لان ذلک معصیۃ "

چوتھا مسئلہ یہ سمجھ آیا کہ رب تعالیٰ نے اس کی خبر دی کہ میرے محبوب ان کی خواہش کے مطابق کبھی ان کے قبلہ کی تابعداری نہیں کریں گے کہ وہ کہیں کہ تم ہمارے قبلہ کی تابعداری کرو تو ہم تمہیں نبی مان لیں گے۔ ایسا ہرگز نہیں ہوگا کہ نبی کریم ﷺ ان کی اصلاح کے لئے خود اللہ تعالیٰ کے حکم پر عمل چھوڑ دیں۔ ایسا کرنا تو معصیت ہے جب تمام انبیاء کرام معصیت سے پاک ہیں تو سید الانبیاء ﷺ سے معصیت کے ارتکاب کا تصور کیسے ممکن ہے۔

" الخامس وما انت بتابع قبلۃ جمیع اھل الکتاب من الیھود والنصاری لان قبلۃ الیھود مخالفۃ لقبلۃ النصاری فللیھود بیت المقدس وللنصاری المشرق فالزم قبلتک ودع اقوالھم "

اور پانچواں مسئلہ یہ بیان کیا گیا کہ اے محبوب آپ تمام اہل کتاب کے قبلہ کی تابعداری کر ہی نہ سکتے، یہود چاہتے ہیں آپ ان کے قبلہ کی تابعداری کریں حالانکہ ان کا قبلہ بیت المقدس کی غربی جانب ہے اور نصاریٰ چاہتے ہیں کہ آپ ان کے قبلہ کی تابعداری کریں حالانکہ ان کا قبلہ بیت المقدس کی شرقی جانب ہے۔ اس لئے اے محبوب آپ اپنے قبلہ پر ہی قائم رہیں ان کے اقوال کو چھوڑ دیں۔ (ازی)

اعتراض : آیۃ کریمہ سے یہ ثابت ہو رہا ہے کہ یہود و نصاریٰ کبھی کعبہ کی طرف متوجہ نہیں ہوں گے حالانکہ یہود میں سے حضرت عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ اور ان کے ساتھی ایمان لے آئے اور کعبہ

کو ہی انہوں نے قبلہ مانا۔اس طرح حضرت نجاشی اور ان کے کچھ ساتھی نصاری میں سے ایمان لے آئے اور کعبہ کی طرف منہ کر کے انہوں نے نمازیں ادا کیں تو آیۃ کریمہ میں نفی کا کیا مطلب ہے؟

جواب اول: "الذین اوتوا الکتاب" سے مراد تمام اہل کتاب ہیں یعنی تمام کے تمام اہل کتاب نہ ایمان لائیں گے اور نہ ہی آپ کے قبلہ کے تابعداری کریں گے۔بعض کے ایمان لانے اور قبلہ کی تابعداری ثابت ہو جائے تو آیۃ کریمہ کے منافی نہیں۔

جواب دوم: آیۃ کریمہ میں مراد یہ ہے کہ یہود و نصاری اپنے مذہب پر قائم رہتے ہوئے آپ کے قبلہ کی تابعداری نہیں کریں گے، ہاں جن کی قسمت میں ایمان کی نعمت کا حصول ہوگا وہ ایمان لانے پر یقیناً آپ کے قبلہ کی تابعداری کریں گے۔ (ازعزیزی)

وَمَا بَعْضُهُمْ بِتَابِعٍ قِبْلَةَ بَعْضٍ : اور وہ آپس میں بھی ایک دوسرے کے قبلہ کی تابعداری کرنے والے نہیں۔یعنی یہود نصاری کے قبلہ کی تابعداری کرنے والے نہیں اور نصاری یہود کے قبلہ کی تابعداری کرنے والے نہیں۔وہ آپس میں ایک دوسرے کے مخالف ہیں وہ ایک دوسرے سے پیٹھ پھیرنے والے ہیں۔اور ایک دوسرے کو گمراہ کہتے ہیں۔

یہود کا قبلہ بیت المقدس میں صخرہ (چٹان) جو غربی جانب ہے اور نصاری کا قبلہ بیت المقدس کی "مطلع الشمس" (سورج کے طلوع ہونے کی) مشرقی جانب ہے وہ آپس میں بھی کبھی اتفاق نہیں کر سکتے اور نہ ہی وہ آپ کے ساتھ متفق ہو کر آپ کے قبلہ کی تابعداری کریں گے۔

ولئن اتبعت اهواء هُمْ مِّنْ بَعْدِ مَا جَاءَكَ مِنَ الْعِلْمِ اِنَّكَ اِذًا لَّمِنَ الظّٰلِمِيْنَ : اور (اے سننے والے کسے باشد) اگر تم تابعداری کرو ان کی خواہشات کی اس کے بعد جو تمہیں علم حاصل ہو چکا تو بیشک تم ظالموں سے ہو گے۔

مسلمانوں کو خطاب ہے کہ قبلہ کی تبدیلی کا جب تمہیں علم حاصل ہو چکا ہے اب اگر تم نے یہود و نصاری کی خواہش کے مطابق ان کے قبلہ کی طرف رخ کیا تو تم ظالم ہو گے۔

واضح ہوا کہ ہر معاملہ میں یہود و نصاری کی خواہشات کے مطابق عمل کرنے والا، ان کے ہر حکم پر سر جھکانے والا بزدل بلی کی طرح کا شیر، بدترین ظالم ہے، خونخوار درندہ ہے لیکن مسلمانوں کے لئے،

دینداروں کے لئے ،علماء کے لئے ، کافروں کے سامنے بلی ہی ہے وہ وقت کا یزید ہے کاش کہ میں اپنی زندگی میں اس یزید کو ذلیل ہوتے ہوئے دیکھ لوں۔

تسکین الجنان سے اقتباس:

﴿ وَلَئِنِ اتَّبَعْتَ اَهْوَاءَ هُمْ مِنْ بَعْدِ مَا جَاءَ كَ مِنَ الْعِلْمِ اِنَّكَ اِذًا لَّمِنَ الظّٰلِمِيْنَ ﴾

☆ اور اگر تم باوجود اس کے کہ تمہارے پاس دانش (یعنی وحی خدا) آ چکی ہے ان کی خواہشوں کے پیچھے چلو گے تو ظالموں میں داخل ہو جاؤ گے۔ (فتح محمد صاحب)

☆ اور کبھی تو چلا ان کی پسند پر بعد علم کے جو تجھ کو پہنچا تو بیشک تو بھی ہے بے انصافوں میں (شاہ عبدالقادر صاحب)

☆ اور اگر آپ ان کے نفسانی خیالات کو اختیار کر لیں اور (اور وہ بھی) آپ کے پاس علم (وحی) آئے پیچھے یقیناً آپ ظالموں میں شمار ہونے لگیں۔ (اشرف علی صاحب)

☆ اگر تو چلا ان کی خواہشوں پر بعد اس علم کے جو تجھ کو پہنچا تو بے شک تو بھی ہوا بے انصافی میں (محمود الحسن صاحب)

☆ اور اگر تم نے اس علم کے بعد جو تمہارے پاس آ چکا ہے ان کی خواہشات کی پیروی کی تو یقیناً تمہارا شمار ظالموں میں ہوگا۔ (مودودی صاحب)

☆ اور اگر (کہیں) آپ ان کی خواہشوں کی پیروی کرنے لگیں بعد اس کے کہ آپ کے پاس علم آ چکا ہے تو یقیناً آپ (بھی) ظالموں میں (شمار) ہوں گے۔ (عبدالماجد صاحب)

☆ اگر تو پیروی کرے گا خواہشوں ان کی کہ پیچھے اس چیز کے کہ آئی تیرے پاس علم سے تحقیق تو اس وقت ظالموں سے ہے۔ (شاہ رفیع الدین صاحب)

☆ اور (اے سننے والے کسے باشد) اگر تو ان کی خواہشوں پر چلا بعد اس کے کہ تجھے علم مل چکا تو اس وقت تو ضرور ستم گار ہوگا۔ (اعلیٰ حضرت مولانا احمد رضا خان)

یہاں دیگر تراجم میں " انک من الظالمین " کی نسبت نبی کریم ﷺ کی طرف کی گئی جس میں " ولئن اتیت " کے ساتھ کوئی بالفرض کی قید کا اضافہ نہیں ہوا۔ بظاہر عام تراجم سے یہ سمجھ آتا ہے کہ نبی کریم ﷺ سے یہود و نصاریٰ کی خواہشات کی تابعداری ممکن ہے۔ اور اگر آپ نے تابعداری

کرلی تو معاذ اللہ آپ بے انصافوں، ظالموں سے ہوں گے حالانکہ یہ تصور بھی ممکن نہیں۔

اسی وجہ سے جلالین میں ذکر کیا گیا" انک اذا ان اتبعتهم فرضا لمن الظالمین " یعنی کلام بالفرض محال پر مبنی ہے (مطلب یہ ہے کہ اگر آپ نے بالفرض ان کی خواہشات کی تابعداری کی تو ظالموں سے ہو جاؤ گے) صاحب مدارک فرماتے ہیں:

" وفی ذلک لطف للسامعین وتهیج للثبات علی الحق وتحذیر لمن یترک الدلیل بعد انارته ویتبع الهوی وقیل الخطاب فی الظاهر للنبی ﷺ والمراد امته "

اس میں سامعین پر مہربانی ہے اور حق پر ثابت رہنے کے لئے برانگیختہ کیا گیا ہے اور جو شخص دلیل کے روشن ہونے کے بعد اللہ کے حکم کو چھوڑتا ہے اور خواہشات کے درپے ہوتا ہے اس کو ڈرایا گیا ہے۔

اور یہ کہا گیا ہے کہ یہ خطاب بظاہر نبی کریم ﷺ کو ہے لیکن مراد امت ہے۔

اسی وجہ سے اعلیٰ حضرت نے اپنے ترجمہ میں (اور اے سننے والے کسے باشد) کا اضافہ کیا ہے تا کہ تفاسیر کا مفہوم ترجمہ سے ہی واضح ہو جائے۔ بیضاوی نے بھی علی سبیل الفرض والتقدیر ذکر کیا ہے محشی نے کہا کہ یہ سوال کا جواب ہے۔

" اتباع اهواء المخالفین لیس بمحتمل فی حقه علیه السلام للقطع بعصمة من المعاصی "

نبی کریم ﷺ سے مخالفین کی خواہشات کی اتباع کا احتمال قطعی طور پر منتفی ہے کیونکہ آپ تو معاصی سے معصوم ہیں۔ بیضاوی نے " علی سبیل الفرض والتقدیر " کے الفاظ ذکر کر کے جواب دیا ہے کہ یہ کلام بالفرض ہے نہ کہ حقیقت۔ محشی نے اس کا جواب بھی نقل کیا ہے:

" وفی عادة الناس ان یوجهوا امرهم ونهیهم الی من هو اعظم منزلة عندهم ارشادا للغیر وتاکیدا "

کہ عام لوگوں کی عادت ہے اوامر ونواہی کو بڑے شخص کی طرف متوجہ کر دیتے ہیں اگر چہ مقصود اس سے غیروں کو ہدایت دینی ہوتی ہے اس مقام پر یہی صورت ہے جس کو اعلیٰ حضرت نے اختیار کیا ہے۔

(تسکین الجنان ص ۵۳ تا ص ۵۵)

علامہ قرطبی رحمہ اللہ نے بہت واضح بہت خوب بیان فرمایا:

"الخطاب للنبی ﷺ والمراد امته ممن یجوز ان یتبع هواه فیصیر باتباعه ظالما ، ولیس یجوز ان یفعل النبی ﷺ ما یکون به ظالما ، فهو محمول علی ارادة امته لعصمة النبی ﷺ وقطعنا ان ذلک لا یکون منه وخوطب النبی ﷺ تعظیما للامر ولانه المنزل علیه"

یہ خطاب (ولئن اتبعت میں خطاب) نبی کریم ﷺ کو ہے اور مراد آپ کی امت ہے کیونکہ کسی امتی سے تو یہ ہوسکتا ہے کہ وہ یہود ونصاری کی خواہشات پر چل کر اور ان کی اتباع کر کے ظالم ہو جائے۔لیکن نبی کریم ﷺ یہود ونصاری کی خواہشات کی تابعداری کر کے (معاذ اللہ) ظالم ہو جائیں یہ تصور کرنا ممکن ہی نہیں لہٰذا ہم قطعی طور پر یہ کہتے ہیں کہ اس خطاب سے مراد آپ کی امت ہے آپ خود تو معصوم ہیں لہٰذا اس خطاب سے مراد آپ خود نہیں۔

البتہ خطاب بظاہر آپ کو کیوں ہے؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ بتانا مقصود ہے کہ یہ امر بہت عظیم ہے اور دوسری وجہ یہ ہے کہ قرآن پاک نازل چونکہ حضور ﷺ پر ہوا اس لئے بظاہر خطاب آپ کو ہی ہونا ہے۔

(قرطبی)

☆☆☆☆☆

﴿اَلَّذِیْنَ اٰتَیْنٰهُمُ الْكِتٰبَ یَعْرِفُوْنَهٗ كَمَا یَعْرِفُوْنَ اَبْنَآءَهُمْ وَاِنَّ فَرِیْقًا مِّنْهُمْ لَیَكْتُمُوْنَ الْحَقَّ وَهُمْ یَعْلَمُوْنَ﴾

۱) ''جنہیں ہم نے کتاب عطاء فرمائی وہ اس نبی کوایسا پہچانتے ہیں جیسے آدمی اپنے بیٹوں کو پہچانتا ہے اور بے شک ان میں سے ایک گروہ جان بوجھ کر حق چھپاتے ہیں''

۲) ''وہ لوگ جن کو عطاء کی ہم نے کتاب، وہ پہچانتے ہیں آپ کو جیسا پہچانتے ہیں اپنے بیٹوں کو اور بیشک ایک فریق (کے لوگ) ان میں سے البتہ چھپاتے ہیں حق کو حالانکہ وہ جانتے ہیں''

پہلی آیۂ کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے نبی کریم ﷺ کی امت کو یہود و نصاریٰ کی خواہشات کی پیروی سے ڈرایا اور اس آیۂ کریمہ میں مومنین کو نبی کریم ﷺ کے حالات کی خبر دی گویا کہ یوں فرمایا:

"اعلموا یا معاشر المؤمنین ان علماء اهل الکتاب یعرفون محمدا وما جاء به وصدقه ودعوته وقبلته لا یشکون فیه کما لا یشکون فی ابنائهم"

اے مومنو جان لو کہ بیشک اہل کتاب کے علماء محمد ﷺ کو پہچانتے ہیں آپ نے جو اللہ کا کلام پیش فرمایا اور دین اسلام پیش کیا اسے وہ لوگ جانتے ہیں آپ کی صداقت کو جانتے ہیں آپ کی دعوت کے برحق ہونے کو وہ جانتے ہیں آپ کے قبلہ کو وہ جانتے ہیں اس میں انہیں کوئی شک نہیں، جس طرح اپنے بیٹوں کو پہچاننے میں انہیں کوئی شک نہیں۔ (از کبیر)

واضح ہوا کہ یہود و نصاریٰ کے علماء کا نبی کریم ﷺ پر ایمان نہ لانا اس وجہ سے نہیں تھا کہ وہ آپ کو جانتے نہیں تھے بلکہ ضد اور حسد و عناد کی وجہ سے انہوں نے ایمان قبول نہ کیا۔

اَلَّذِیْنَ اٰتَیْنٰهُمُ الْكِتٰبَ : سے مراد یہود کے علماء ہیں، یعنی ذکر عام مراد خاص ہے جب کوئی قرینہ موجود ہو تو ذکر عام مراد خاص لینا جائز ہے۔

یَعْرِفُوْنَهٗ : ضمیر منصوب رسول اللہ ﷺ کی طرف لوٹ رہی ہے، اگرچہ پہلے صراحۃً آپ کا ذکر نہیں، لیکن کلام کی دلالت اس پر موجود ہے یعنی وہ رسول اللہ ﷺ کو پہچانتے ہیں جس طرح اپنے

بیٹوں کو پہچانتے ہیں۔ بعض حضرات نے کہا کہ ضمیر علم کی طرف لوٹ رہی ہے کہ وہ علم کو پہچانتے ہیں۔ اور بعض حضرات نے کہا کہ ضمیر قرآن کی طرف لوٹ رہی ہے کہ وہ قرآن کو پہچانتے ہیں اور بعض نے کہا کہ ضمیر تحویل قبلہ کی طرف لوٹ رہی ہے کہ وہ تحویل قبلہ کو پہچانتے ہیں۔ لیکن ضمیر نبی کریم ﷺ کی طرف لوٹانا بہتر ہے کیونکہ اگر ضمیر " من بعد ما جاء ک من العلم " میں علم کی طرف لوٹے تو علم سے مراد بھی نبوت ہی ہے۔ اب مطلب یہ ہوگا" انهم يعرفون ذلک العلم (ای علم النبوة) كما يعرفون ابناء هم " بیشک وہ اس علم نبوت کو ایسے پہچانتے ہیں جیسا کہ اپنے بیٹوں کو پہچانتے ہیں۔ نبوت سے مراد نبی کریم ﷺ کا علم ہی ہوا کہ وہ نبی کریم ﷺ کا علم ایسے رکھتے ہیں جیسا کہ اپنے بیٹوں کا علم رکھتے ہیں۔

تحویل قبلہ کی طرف ضمیر لوٹے تو مطلب یہ ہوگا کہ قرآن پاک میں جو تحویل قبلہ کا ذکر ہے وہ توراۃ وانجیل میں بھی مذکور ہے اور یہ خبر بھی دی گئی کہ نبی کریم ﷺ کی نبوت بھی توراۃ وانجیل میں مذکور ہے " فكان صرف هذه المعرفة الى امر النبوة اولى " لہذا امر نبوت کی معرفت اولی (بہتر) ہے۔ اور وجہ یہ ہے کہ معجزات پہلے نبی کریم ﷺ کی صداقت پر دلالت کرتے ہیں۔ لیکن قبلہ کی معرفت تو موقوف ہے اس پر کہ پہلے حضور کی نبوت کو تسلیم کرے پھر یہ تسلیم کرے کہ قبلہ کی تحویل کا حکم بھی آپ نے لایا ہے لہذا یہ بھی برحق ہے یعنی دل سے تو وہ حقانیت کو بھی تسلیم کرتے تھے اگر چہ بظاہر نہیں مانتے تھے واضح ہوا کی ضمیر ہر حال میں نبی کریم ﷺ کی طرف ہی لوٹانی بہتر ہے۔ (از کبیر)

" يعرفونه باوصافه " وہ نبی کریم ﷺ کو آپ کے اوصاف کے ذریعے پہچانتے تھے کہ یہ نبی برحق ہیں یہی وہ نبی ہیں جن کے آنے کا وعدہ کیا گیا کیونکہ نبی کریم ﷺ کے اوصاف ان کی کتب میں موجود تھے خصوصاً جب انہوں نے نبی کریم ﷺ کے معجزات کا مشاہدہ کر لیا تو ان کو اس طرح پہچان حاصل ہوگئی جس طرح اپنے بیٹوں کو انسان دوسرے لڑکوں سے واضح طور پر پہچانتا ہے۔

تنبیه : ابھی تک بیٹوں کی پہچان سے مراد ان کی ذاتوں اور ان کے تشخص، شکل وصورت کو پہچاننا لیا گیا اور اگر ہر ایک کی پہچان صفات کے ذریعے مراد ہو، کہ وہ نبی کریم ﷺ کو صفات کے ذریعے ایسے پہچانتے ہیں جیسے بیٹوں کو صفات کے ذریعے پہچانتے ہیں تو اس صورت میں علامہ نسفی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ مطلب یہ ہوگا " يعرفونه بالرسالة والنبوة كما يعرفون ابناء هم بالنسب

والنبوۃ " وہ رسول اللہ ﷺ کو رسالت ونبوت سے ایسے پہچانتے ہیں جیسا کہ اپنے بیٹوں کو نسب اور بیٹا ہونے سے پہچانتے ہیں۔

اس پر حضرت عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ کا قول واضح طور پر دلالت کرتا ہے آپ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو بتاتے ہیں:

" **یا عمر لقد عرفته حین رأیته کما عرفت ابنی ومعرفتی بمحمد ﷺ اشد من معرفتی بابنی فقال عمر کیف ذلک فقال انی لست اشک فی محمد ﷺ انه هو النبی الموعود من حیث ان نعوته مبینة فی کتابنا واما ولدی فلا ادری ما صنعت والدته فلعلها خانت فقبل عمر رأسه فقال رفعک الله یا ابن سلام فقد صدقت** "

اے عمر میں نے جب نبی کریم ﷺ کو دیکھا اسی وقت آپ کو پہچان لیا جیسا کہ میں اپنے بیٹے کو پہچانتا ہوں بلکہ حضرت محمد ﷺ کو اپنے بیٹے سے بھی زیادہ پہچان لیا تھا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا وہ کیسے تو آپ نے کہا بیشک مجھے حضرت محمد ﷺ کے نبی موعود ہونے میں کسی قسم کا کوئی شک نہیں ہوا کیونکہ آپ کے اوصاف ہماری کتب میں مذکور ہیں۔ لیکن اولاد کے متعلق مجھے معلوم نہیں کہ ان کی ماں نے کیا کیا ہے ہوسکتا ہے کہیں خیانت نہ کر دی ہو تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان کے سر کو چوما اور کہا اے ابن سلام تم نے سچ کہا ہے اللہ تعالیٰ تمہارے درجات بلند فرمائے۔ (ماخوذ از بیضاوی وشیخ زادہ)

وَاِنَّ فَرِيْقًا مِّنْهُمْ لَيَكْتُمُوْنَ الْحَقَّ وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ:

"اور بے شک ایک فریق (کے لوگ) ان میں سے حق کو چھپاتے ہیں حالانکہ وہ جانتے ہیں۔

پہلے یہود ونصاریٰ کے تمام علماء کا ذکر کیا کہ وہ نبی کریم ﷺ کو پہچانتے ہیں اس میں معاندین (عناد رکھنے والے) اور مؤمنین تمام کا ذکر تھا لیکن یہاں صرف معاندین کا ذکر ہے جو علم رکھنے کے باوجود جاننے کے باوجود حق کو چھپاتے تھے۔ (از شیخ زادہ)

یہاں سے ان کی زیادہ مذمت بیان کی گئی کیونکہ علم کے بعد عمل نہ کرنا زیادہ قبیح ہے گویا کہ اللہ تعالیٰ نے بیان فرمایا: " **لیکتمون ای الناس ما فی کتبهم من صفة النبی ﷺ وهم یعلمون** " یعنی یہود ونصاریٰ نے نبی کریم ﷺ کے اوصاف کو چھپایا حالانکہ وہ جانتے تھے کیونکہ ان کی کتب میں وہ اوصاف مذکور تھے۔ (ابن کثیر)

﴿ اَلْحَقُّ مِنْ رَّبِّکَ فَلَا تَکُوْنَنَّ مِنَ الْمُمْتَرِیْنَ ﴾

۱) ''(اے سننے والے) یہ حق ہے تیرے رب کی طرف سے (یا حق وہی ہے جو تیرے رب کی طرف سے ہو) تو خبردار تو شک نہ کرنا''

۲) ''(اے سننے والے) یہ حق ہے تمہارے رب کی طرف سے تو ہرگز نہ ہو شک کرنے والوں میں سے''

اعلیٰ حضرت نے دو ترجمے کئے ہیں ان کو علامہ رازی رحمہ اللہ کی اس بحث میں دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ نے ترجمہ کرتے وقت کتنی محنت کی اور تفاسیر کا نچوڑ پیش کیا۔

" الالف واللام فی قوله (الحق) فیه وجهان ، الاول ان یکون للعهد والاشارة الی الحق الذی علیه رسول الله ﷺ او الی الحق الذی فی قوله (لیَکْتُمُوْنَ الْحَقَّ) ای هذا الذی یکتمونه هو الحق من ربک "

اس مقام میں " اَلْحَقُّ " پر الف لام عہد خارجی ہو تو اس لحاظ سے معنی ہوگا ''یہ حق ہے تیرے رب کی طرف سے'' یا تو اشارہ ہوگا اس حق کی طرف جس پر رسول اللہ ﷺ قائم ہیں۔ اب تفصیلی مطلب یہ ہوگا یہ حق ہے جس پر رسول ﷺ قائم ہیں تیرے رب کی طرف سے اور یا اشارہ ہوگا اس حق کی طرف جو " لَیَکْتُمُوْنَ الْحَقَّ " میں مذکور ہے اب تفصیلی ترجمہ یہ ہوگا یہ حق جس کو یہود و نصاریٰ چھپاتے ہیں یہ حق ہے تمہارے رب کی طرف سے " وان یکون للجنس علی معنی الحق من الله تعالی لامن غیره " اور یا الف لام جنس کے لئے ہو تو اب معنی یہ ہوگا حق وہی ہے جو تیرے رب کی طرف سے ہے جو اس کے غیروں کی طرف سے ہے وہ حق نہیں۔ یعنی حق ہے وہ جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ثابت ہے اور جس پر آپ قائم ہیں۔ اور وہ جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے نہیں بلکہ یہود و نصاریٰ کے اپنے من گھڑت نظریات ہیں جن پر وہ قائم ہیں وہ باطل راہ ہے۔ (از کبیر)

وَلَا تَکُوْنَنَّ مِنَ الْمُمْتَرِیْنَ : ای من الشاکین والخطاب للنبی ﷺ والمراد امته "

" ممترین " کا معنی شک کرنے والے " ولا تکونن " میں خطاب بظاہر نبی کریم ﷺ کو ہے مراد آپ کی امت ہے " امتری فلان " اس وقت بولتے ہیں جب کسی کو کبھی یقین ہو اور کبھی شک ہو

ایک چیز کو دوسرے سے زائل کرے۔ یعنی شک اس کے یقین کو زائل کردے یا یقین اس کے شک کو زائل کر دے " المراء " جب کوئی شخص دوسرے کے قول میں شک کرے۔ الامتراء کا معنی بھی شک کرنا ہے۔
(از قرطبی)

راقم کی ابتدائی تصنیفی کاوش کو دیکھئے:

﴿ اَلْحَقُّ مِنْ رَّبِّکَ فَلَا تَکُوْنَنَّ مِنَ الْمُمْتَرِیْنَ ﴾

☆ تو وہی ہے جو تیرا رب کہے پھر تو نہ ہو شک لانے والا۔ (محمود الحسن صاحب)

☆ حق ہے پروردگار تیرے کی طرف سے پس مت ہو شک لانے والوں سے۔
(شاہ رفیع الدین صاحب)

☆ (اے پیغمبر یہ نیا قبلہ) تمہارے پروردگار کی طرف سے حق ہے تو تم ہرگز شک کرنے والوں میں نہ ہونا۔ (فتح محمد صاحب)

☆ حق وہی جو تیرا رب کہے پھر تو نہ ہو شک لانے والا۔ (شاہ عبدالقادر صاحب)

☆ یہ قطعی ایک امر حق ہے تمہارے رب کی طرف سے لہٰذا اس کے متعلق تم ہرگز کسی شک میں نہ پڑو۔
(مودودی صاحب)

☆ یہ امر حق ہے تمہارے پروردگار کی طرف سے تو کہیں شک کرنے والوں میں ہرگز نہ ہو جانا۔
(عبد الماجد صاحب)

☆ سو ہرگز شک وشبہ کرنے والوں میں شمار نہ ہونا۔ (اشرف علی صاحب)

☆ (اے سننے والے) یہ حق تیرے رب کی طرف سے (یا حق وہی ہے جو تیرے رب کی طرف سے ہو)۔ (اعلیٰ حضرت مولانا احمد رضا خانؒ)

اس مقام پر مترجمین نے شک کی نسبت نبی کریم ﷺ کی طرف کی اور یہ ترجمہ کیا کہ تو نہ ہو شک لانے والا۔ لیکن اعلیٰ حضرت نے اس نازک مقام کو تفاسیر پر نظر رکھتے ہوئے اپنے ترجمہ سے حل فرمایا (اے سننے والے) لفظ کا اضافہ کیا تا کہ نہی میں مخاطب نبی کریم نہ ہوں بلکہ عام امتی ہو۔ اعلیٰ حضرت کے ترجمہ پر بیضاوی کی عبارت بطور تائید دیکھئے:

" ولیس المراد نهی الرسول ﷺ عن الشک فیه لانه غیر متوقع ولیس بقصد واختیار بل اما تحقیق الامر وانه بحیث لا یشک فیه ناظر

او امر الامة باکتساب المعارف المزيحة للشک علی وجه الا بلغ "

اس پر محشی کی عبارت یہ ہے:

" فان الانسان کما لا ینهی عما لا یتوقع منه ولا ینهی ایضا عما لا مدخل فیه للقصد والاختیار کالشک والجهل والجوع والعطش فاذا اوردت صورة النهی فی مثل هذه المواضع لا یراد بها حقیقة النهی بل یقصدبها شئی آخر فقوله تعالیٰ فلا تکونن من الممترین من قبیل الخطاب العام الوارد علی صورة النهی والمقصود منه اخبار کافة الناس بان المقام لیس بمظنة لان یرتاب فیه عن الانام "

دونوں عبارتوں کا خلاصہ کلام یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ کو شک سے نہیں روکا گیا کیونکہ آپ سے تو شک کی توقع بھی نہیں کی جاسکتی کیونکہ جس مقام پر نہی کی توقع نہ کی جاسکے وہاں نہی نہیں پائی جاسکتی اس طرح جہاں قصد واختیار نہ پایا جاسکے وہاں بھی نہی نہیں پائی جاسکتی۔ لہٰذا یہاں حقیقۃً نہی نہیں پائی گئی، بلکہ یہاں عام خطاب ہے جو صورۃً نہی ہے مقصد یہاں عام لوگوں کو خبر دینا ہے کہ یہ مقام ایسا ہے کہ اس میں کسی ایک کو شک نہیں کرنا چاہئے، حقیقت یہ ہے کہ جس طرح اعلیٰ حضرت کا ترجمہ ایمان افروز ہے اس کا کوئی ثانی نہیں جس میں علمی بصیرت سے تفاسیر ولغات پر نظر ہوتی ہے محبت رسول اللہ ﷺ کا ایک درس ہے۔

(تسکین الجنان ص ۵۵، ۵۶)

☆☆☆☆☆

﴿ وَلِكُلٍّ وِّجْهَةٌ هُوَ مُوَلِّيهَا فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرَاتِ أَيْنَ مَا تَكُونُوا يَأْتِ بِكُمُ اللَّهُ جَمِيعًا إِنَّ اللَّهَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ﴾

1: ''اور ہر ایک کے لئے توجہ کی ایک سمت ہے وہ اسی کی طرف منہ کرتا ہے تو یہ چاہو کہ نیکیوں میں اوروں سے آگے نکل جائیں تم کہیں ہو اللہ تم سب کو اکٹھا لے آئیگا بیشک اللہ جو چاہے کرے''۔

2: ''اور ہر ایک کے لئے ایک جہت ہے وہ منہ پھیرتا ہے اسی کی طرف، تم جلدی کرو نیکیوں میں، جہاں بھی تم ہو گے لے آئے گا تم تمام کو اللہ جمع کر کے، بیشک اللہ ہر چیز پر قادر ہے''

وَلِكُلٍّ وِّجْهَةٌ هُوَ مُوَلِّيهَا : اور ہر ایک کیلئے ایک جہت ہے وہ منہ پھیرتا ہے اسکی طرف۔

'' ولکل '' تنوین عوض مضاف الیہ ہے یعنی اس کا معنی یہ ہے '' ولکل امة قبلة '' ہر گروہ کے لئے ایک قبلہ ہے اس سے مراد یہ نہیں کہ ہر گروہ کا قبلہ رب تعالیٰ نے مقرر کر رکھا بلکہ مطلب یہ ہے کہ ہر گروہ کا کوئی نہ کوئی قبلہ ہے خواہ وہ اللہ تعالیٰ نے مقرر فرمایا ہے یا انہوں نے خود مقرر کر رکھا ہے۔ کیونکہ مؤمنین کا قبلہ تو اللہ تعالیٰ نے کعبہ مقرر فرمایا۔ لیکن مشرکین اور یہود و نصاری نے اپنی اپنی مرضی سے قبلے مقرر کئے ہوئے ہیں۔ مشرکین کے معبود بھی بت تھے اور ان کی توجہ کا مرکز بھی بت تھے:

'' لان فی المشرکین من کان یعبد الاصنام ویتقرب بذلک الی اللہ تعالیٰ کما حکی اللہ تعالیٰ عنهم فی قوله هؤلاء شفعاؤنا عند الله ''

کیونکہ مشرکین بتوں کی عبادت کرتے تھے اور انکے ذریعے ہی اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل کرتے تھے جیسا کہ رب تعالیٰ نے فرمایا کہ وہ کہتے ہیں کہ یہ بت اللہ تعالیٰ کے ہاں ہمارے شفیع ہوں گے۔

ہاں یہ بھی خیال رہے کہ مشرکین بتوں کو معبود سمجھ کر شفاعت کرنے والے مانتے تھے جو باعث شرک تھا لیکن مؤمنین اللہ تعالیٰ کے انبیاء کرام اور اولیاء کرام کو اللہ کی مخلوق مانتے ہیں ہاں اللہ تعالیٰ کا مقرب سمجھ کر ان کو شفیع مانتے ہیں جو عین ایمان ہے۔

یہود نے اپنا قبلہ مقرر کر رکھا ہے اور نصاری نے اپنا قبلہ مقرر کر رکھا ہے۔ البتہ مؤمنین کے لئے

اللہ تعالیٰ نے ان کا قبلہ مقرر فرمایا ہے۔

" وَلِكُلٍّ وِّجْهَةٌ " کا اور مطلب یہ ہے:

" لكل قوم من المسلمين وجهة اى جهة من الكعبة يصلي اليها ، جنوبية او شمالية او شرقية او غربية "

مسلمانوں کی ہر قوم کے لئے کعبہ میں سے ہی ایک جہت ہے جس کی طرف وہ منہ کر کے نماز ادا کرتے ہیں۔ شمال میں رہنے والے کعبہ کی اس جانب منہ کرتے ہیں جنوب والے کعبہ کی اس جانب، اسی طرح کوئی مشرقی جانب منہ کر رہا ہے اور کوئی غربی جانب منہ کر رہے ہیں۔ (از کبیر و بیضاوی)

هُوَ مُوَلِّيهَا : " هو عائد على لفظ كل لا على معناه لانه لو كان على المعنى لقال هم مولوها وجوهم "

" هو " ضمیر کا مرجع لفظ " كل " ہے نہ کہ " كل " کا معنی اگر " كل " کا معنی معتبر ہوتا تو جمع کے صیغے اور ضمائر ہونی چاہئیں تھیں پھر " هم مولوها وجوهم " ہوتا۔ اب اس صورت میں معنی یہ ہو گیا " ولكل صاحب ملة قبلة ، صاحب القبلة موليها وجهه " کہ ہر ملت کے ہر صاحب کا قبلہ ہے وہ صاحب قبلہ اپنے قبلہ کی طرف ہی منہ کرتا ہے۔

لیکن زجاج نے کہا کہ اس میں ایک احتمال یہ بھی ہے کہ " هو " ضمیر اللہ تعالیٰ کی طرف لوٹے، اب معنی یہ ہو گا " لكل صاحب ملة قبلة الله موليها اياه " ہر صاحب ملت کا اپنا قبلہ ہے اللہ تعالیٰ اسے اس قبلہ کی طرف ہی پھیر دیتا ہے۔

لیکن یہاں یہ خیال رکھنا اشد ضروری ہو گا کہ جب مراد یہ ہو کہ مشرکین، یہود، نصاریٰ اور مؤمنین کا اپنا اپنا قبلہ ہے تو اللہ تعالیٰ کے اس طرف پھیرنے کا مطلب یہ ہو گا کہ اللہ تعالیٰ نے ہر ایک کو قدرت واختیار دے رکھا ہے وہ ادھر ہی منہ پھیر لیتا ہے۔ ہاں اگر " ولكل " سے مسلمان ہی فقط مراد ہوں کہ کعبہ کی مختلف سمتوں میں رہنے والے مسلمان اپنی اپنی سمت میں منہ کرتے ہیں وہی سمت ان کا قبلہ ہوتا ہے۔ اب اللہ تعالیٰ کے پھیرنے کا مطلب بھی واضح ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہر طرف رہنے والوں مسلمانوں کو اجازت دے رکھی ہے کہ وہ کعبہ کی جس طرف بھی ہوں، کعبہ کی طرف ہی منہ کریں کیونکہ اللہ تعالیٰ ان

کو اسی طرف پھیر دیتا ہے۔ (قرطبی باوضاحت)

فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرَاتِ : " یعنی بادروا بامتثال کلما امرکم الله وان کان قد امرکم فی بعض الاحیان بالاستقبال الی بیت المقدس وفی بعضها الی الکعبة فانه تعالیٰ یحکم ما یشاء فلا تنازعوا فی امر القبلة "

یعنی اللہ تعالیٰ تمہیں جو حکم دے اسے تسلیم کرنے کے لئے جلدی کرو، جب رب تعالیٰ نے بعض اوقات میں بیت المقدس کی طرف منہ کرنے کا حکم دیا تو اسی کو جلدی ماننا ضروری تھا اور اب جب کعبہ کا حکم دے دیا تو اسی حکم کو جلدی سے ماننا ضروری ہے اللہ تعالیٰ جو چاہے حکم فرماتا ہے، تم قبلہ کے معاملہ میں کسی قسم کا تنازع نہ کرو۔ (مظہری)

اَيْنَ مَا تَكُوْنُوْا يَاْتِ بِكُمُ اللّٰهُ جَمِيْعًا : جہاں بھی تم ہو لے آئے گا تمہیں اللہ جمع کر کے۔

اس کا ایک مطلب یہ ہے کہ تم جہاں بھی ہو کہ تمہارا منہ اس قبلہ کی طرف ہو جو رب تعالیٰ کو پسند ہے یا اس قبلہ کی طرف منہ ہو جو رب تعالیٰ کو ناپسند ہو۔ " یأت بکم الله جمیعا " کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ تمہاری روحوں کو قبض کرلے گا پھر تمہیں جزاء کے لئے جمع کرے گا اور تمہارے اعمال کے مطابق تمہیں جزاء دے گا۔ اور اگر تمہاری موت تمہاری نماز کے دوران ہی آجائے، یا واجب کو اپنے ذمہ سے ادا کرنے کے بعد آجائے تو بہت بڑی سعادت ہوگی۔

آیۃ کریمہ کا ایک مطلب یہ بھی ہے، کہ تمام مسلمانوں کا قبلہ کعبہ کی جانب ہے اگر قبلہ معلوم ہو تو اسی جانب وہ منہ کرے اور قبلہ معلوم نہ ہو تو تحری (کوشش) کرے اور اگر نفل پڑھنے والا ہو اور شہر سے باہر سواری پر ہو تو جس جہت کی طرف اس کی سواری متوجہ ہو وہی اس کا قبلہ ہے یعنی اللہ تعالیٰ اسے اس کی طرف ہی پھیر دیتا ہے۔ نیکیوں کی طرف جلدی کرو یعنی قبلہ کے مشتبہ ہونے کی صورت میں نماز میں تاخیر نہ کرو بلکہ تحری کر کے نماز اپنے وقت مستحب میں جلدی ادا کردو۔ جس طرف بھی تمہارا رخ ہوا اللہ تعالیٰ تم تمام کو قبلہ کی طرف متوجہ ہونے کا حکم ہی عطا فرمائے گا۔ (از مظہری)

" اَيْنَ مَا تَكُوْنُوْا " کا مطلب علامہ آلوسی رحمہ اللہ بیان فرماتے ہیں کہ تم جس جگہ بھی ہو خواہ وہ طبیعت کے موافق ہو جیسے زمین یا تمہاری طبیعت کے موافق نہ ہو جیسے تم آسمان پر ہو۔ پھر تمہارے

اجزاء چٹان کی طرح جمع ہوں یا ریت کے ذرات کی طرح مختلف جگہ پر بکھرے ہوئے ہوں اللہ تعالیٰ تم تمام کو ایک جگہ جمع کردے گا پھر تمہیں جزاء دے گا اگر بہتر عمل ہوئے تو بہتر جزاء دے گا اور اگر برے عمل ہوئے تو ان کے مطابق ہی جزاء بھی دے گا۔ (از روح المعانی)

اِنَّ اللّٰہَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ : ''بیشک اللہ ہر چیز پر قادر ہے''

" ای علی الاعادة بعد الموت والاثابة لاھل الطاعة والعقاب لمستحق العقوبة "

یعنی اللہ تعالیٰ موت کے بعد زندہ کرنے پر قادر ہے اور نیک لوگوں کو ثواب عطاء کرنے اور جو لوگ عذاب کے مستحق ہوں گے ان کو عذاب دینے پر قادر ہے۔ (خازن)

پہلے پارہ کے دوسرے رکوع میں اس جملہ کی وضاحت کافی تفصیل سے بیان کردی گئی۔

آیۃ کریمہ سے حاصل ہونے والا فائدہ:

اگرچہ آیۃ کریمہ کا تعلق استقبال قبلہ سے ہے لیکن اس میں مطلقاً یہ ثابت ہوتا ہے:

" (فَاسْتَبِقُوا الْخَیْرَاتِ) ای بادروا بالطاعة وقبول الاوامر وفیه حث علی المبادرة الی الاولویة والافضلية "

''بھلائی کی طرف جلدی کرو'' یعنی نیکی کی طرف جلدی کرو، اور اوامر کو قبول کرنے میں جلدی کرو اس میں اس چیز کی طرف برانگیختہ کیا گیا ہے کہ ہر وہ کام کیا جائے جو بہتر اور افضل ہو''۔ (خازن)

نماز کس وقت ادا کی جائے:

امام شافعی رحمہ اللہ فرماتے ہیں جب بھی نماز کا وقت شروع ہو اسی وقت جتنا جلدی ہو سکے نماز ادا کرنا افضل ہے۔

امام اعظم ابوحنیفہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ جماعت کے لئے جو وقت مستحب ہو اس مستحب وقت میں جلدی نماز ادا کرنا افضل ہے آپ کے اس موقف کے خلاف کوئی حدیث نہیں۔ آپ کا مسلک حدیث پاک کے مطابق ہے۔

اس مسئلہ کو تفصیل سے دیکھیں: راقم نے غیر مقلدین کی جانب سے وقتاً فوقتاً جاری ہونے والے اشتہارات کو دیکھ کر ایک کتاب ترتیب دی جس میں نماز کے مختلف مسائل احادیث مبارکہ سے ثابت کئے اس کتاب کا نام "نماز حبیب کبریاء" ہے وجہ تصنیف صرف یہ ہے کہ اپنے مسلک کے لوگ اگر اپنے مسلک پر قائم رہ سکیں تو یہ بھی غنیمت ہے کسی سے نہ مخالفت نہ مقابلہ۔

راقم بہت معتدل طبیعت کا ہے جسے اپنے کام سے کام ہے۔ نماز حبیب کبریاء میں راقم نے نماز کے اوقات پر تفصیلی بحث کی ہے پہلے وہ دیکھیں۔

نمازوں کے اوقات:

نماز کے وقت میں غیر مقلدین اور احناف میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ غیر مقلدین کہتے ہیں جب نماز کا وقت شروع ہو جائے اسی وقت نماز ادا کی جائے دیر نہ کی جائے۔

احناف کے نزدیک اس مسئلہ میں تفصیل ہے۔ یعنی وقت میں تین حال پائے جاتے ہیں۔

ایک ہے: کل وقت، یعنی نماز کا وقت کب ختم ہوتا ہے۔ وقت کے شروع ہونے سے لیکر وقت کے ختم ہونے تک تمام وقت کہلائے گا۔

دوسرا ہے: مکروہ وقت۔ نماز کے بعض اوقات وہ ہیں جن میں نماز مکروہ ہوگی اگر چہ وہ نماز کا وقت کہلائے گا۔

تیسرا ہے: مستحب وقت جن وقتوں میں نماز ادا کرنا یا جماعت کرانا افضل ہوتا ہے اسے مستحب وقت کہا جاتا ہے۔ دونوں مذہبوں کے دلائل اور مسئلہ پر وضاحت سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ حق مذہب کونسا ہے۔

غیر مقلدین کا مذہب:

آئمہ مساجد کی خدمت میں ہماری درخواست ہے کہ نبی کریم ﷺ کے ارشاد پاک کے مطابق وہ نمازیں اول وقت پر پڑھایا کریں، اس سے خدا خوش ہوگا اور سنت کی پیروی کے سبب رحمۃ اللعالمین

حشر میں شفاعت فرمائیں گے۔ (صلوۃ الرسول ص ۱۴۸)

سبحان اللہ کبھی نبی کریم علیہ السلام کی شفاعت کا انکار اور کبھی دھوکہ دینے کیلئے اقرار کبھی آپ کی رحمت کو تسلیم نہ کرنا اور کبھی تمام جہانوں کیلئے رحمت مان لینا یہی ان کے باطل مذہب کا بیان کافی ہے۔ بہر حال ان کے مذہب کے دلائل بیان کرنے کے بعد احناف کے مذہب کی وضاحت ہوگی۔

غیر مقلدین کے دلائل:

نماز عصر کا وقت : حضرت بریدہ روایت کرتے ہیں

"فاقام العصر والشمس مرتفعة بیضا نقیة" (رواہ مسلم)

یعنی رسول اللہ علیہ السلام نے قائم کی نماز عصر درحالیکہ آفتاب تھا بلند سفید صاف (یعنی زرد نہ تھا)

"وعن انس قال کان رسول اللہ ﷺ یصلی العصر والشمس مرتفعة حیة" (متفق علیہ)

روایت ہے حضرت انس سے وہ کہتے ہیں کہ رسول خدا نماز عصر پڑھتے اور آفتاب ہوتا تھا بلند، زندہ، (یعنی روشن بغیر زردی کے)

منافق کی نماز: حضرت انس روایت کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ رسول خدا نے فرمایا

" تلک صلوة المنافق یجلس یرقب الشمس حتی اذا اصفرت وکانت بین قرنی الشیطن قام فنقر اربعا لا یذکر اللہ فیھا الاقلیلا" (رواہ مسلم)

یہ منافق کی نماز عصر ہے (جو اخیر وقت پڑھی جائے) کہ بیٹھ رہتا ہے، انتظار کرتا ہے آفتاب کا یہاں تک کہ جب ہو جاتا ہے زرد، اور ہوتا ہے درمیان دو سینگوں شیطان کے (یعنی غروب کے وقت) کھڑا ہوتا (نماز کیلئے) پھر ٹھونگیں مارتا ہے چار، نہیں یاد کرتا اس میں اللہ کو مگر تھوڑا۔ (صلوۃ الرسول ص ۱۴۴)

غیر مقلدین اپنا دعوی ثابت کرنے میں ناکام ہو گئے:

دعوی یہ کہ نماز عصر اول وقت میں پڑھی جائے، گرمیوں میں بھی ساڑھے تین بجے۔ اور جو احادیث بیان کی ہیں، ان سے یہ دعوی کیسے ثابت ہے۔ احادیث سے جو ثابت ہو رہا ہے وہ تو احناف کا مذہب ہے۔

پہلی جو دو حدیثیں پیش کی ہیں ان سے یہ ثابت ہو رہا ہے کہ رسول اللہ علیہ السلام نے عصر کی نماز ادا

کی جب کہ سورج روشن، چمکدار تھا۔

تیسری حدیث جو پیش کی اس سے یہ ثابت ہو رہا ہے کہ عصر کی نماز میں اتنی تاخیر کر دینا کہ سورج زردی مائل ہو جائے۔ بلکہ غروب کے قریب ہو جائے (کیونکہ غروب کے وقت ہی شیطان سورج کے آگے اپنے بازو پھیلا کر کھڑا ہو جاتا ہے تاکہ سورج کی عبادت کرنے والے دراصل مجھے سجدہ کریں) اور نماز پڑھنے والے کو سورج کے غروب ہونے کا خطرہ ہو وہ بے اطمینانی سے نماز ادا کرے تو یہ علامت نفاق ہے۔

یہ بھی خیال رہے کہ ''منافق کی نماز'' کا عنوان بھی غلط ہے اور ظلم عظیم ہے کسی مومن کو منافق کہنا دراصل اپنے آپ کو کافر بنانا ہے۔ احادیث میں جہاں بھی اس قسم کے الفاظ ہیں وہاں منافقت کی علامت مراد ہوتا ہے، بعینہ منافق نہیں کہا گیا اور نہ ہی یہ کہنا درست ہے۔

اب ذرا ٹھنڈے دل سے غور کیجئے کہ مثال کے طور پر راولپنڈی، اسلام آباد میں گرمیوں کا آخری وقت غروب شمس (سورج کے غروب ہونے کا وقت) کا سات بج کر تیئس منٹ ہے۔ سورج کے غروب ہونے سے بیس یا پچیس منٹ پہلے سورج زردی مائل ہوتا ہے اگر کوئی شخص سات بجے یا اس کے بعد نماز ادا کرے تو وہ مکروہ وقت ہوگا۔ اور اگر کوئی غروب کے وقت نماز ادا کرے یعنی جب سورج غروب ہو رہا ہو تو یہ علامت نفاق ہوگی۔

یہی مذہب اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے احناف کا ہے کہ وہ ساڑھے پانچ بجے یا زیادہ سے زیادہ پونے چھ بجے نماز ادا کر لیتے ہیں، جب سورج خوب چمک رہا ہوتا ہے، آب و تاب میں ہوتا ہے۔

ذرا انصاف کیجئے کہ احناف کیا اس وقت نماز نہیں ادا کر رہے ہوتے جو حضور ﷺ کی نماز کا وقت ہوتا ہے۔ یقیناً وہی وقت احناف کی نماز کا ہے جو وقت رسول اللہ ﷺ کی نماز کا ہے۔

عصر کا وقت فقہ حنفی سے:

" واول وقت العصر اذا خرج وقت الظهر على القولين وآخر وقتها مالم تغرب الشمس " **(هداية)**

عصر کا وقت اس وقت شروع ہوگا جب ظہر کا وقت امام اعظم رحمہ اللہ اور صاحبین کے قول کے

مطابق ختم ہو جائے گا۔ یعنی سایہ چیز کا دو مثل ہو جائے اور عصر کا وقت ختم اس وقت ہوگا جب سورج غروب ہوگا۔

خیال رہے کہ عصر کا جو وقت بیان کیا گیا ہے یہ کل وقت ہے۔ جس میں مکروہ اور غیر مکروہ دونوں شامل ہیں۔

" ثلاثة اوقات لا يصح فيها شئي من الفرائض والواجبات التي لزمت في الذمة قبل دخولها عند طلوع الشمس الى ان ترتفع وعند استوائها الى ان تزول وعند اصفرارها الى ان تغرب ويصح اداء ماوجب فيها مع الكراهة " (نورالایضاح)

تین وقتوں میں کوئی فرائض ونوافل ادانہیں ہوں گے، جو اس کے ذمہ اس سے پہلے ہیں، ایک طلوع شمس (سورج کے نکلتے) کے وقت یہاں تک کہ سورج (ایک دو نیزے کے برابر) اوپر آ جائے۔ اور جب سورج درمیان میں ہو یہاں تک کہ ڈھل جائے۔ اور جب سورج زردی مائل ہو جائے البتہ اسی دن کی عصر جو اس وقت اس پر لازم ہوئی بوجہ تاخیر کے وہ ادا ہوگی لیکن مکروہ ہوگی۔

اس فقہی قول کو حدیث پاک سے لیا گیا:

" ولذا استدل بحديث عقبة بن عامر الثابت في مسلم وغيره ثلاث ساعات كان رسول الله ﷺ نهانا ان نصلي فيهن او نقبر فيهن موتانا حين تطلع الشمس بازغة حتى ترتفع وحين يقوم قائم الظهيرة حين تميل الشمس وحين تضيف للغروب حتى تغرب " (فتح القدير)

ان تین اوقات میں نماز کی ممانعت پر اس حدیث پاک سے دلیل پکڑی گئی ہے جو مسلم وغیرہ میں مذکور ہے۔

حضرت عقبہ بن عامر کہتے ہیں۔ تین وقتوں میں رسول اللہ ﷺ ہمیں نماز پڑھنے سے منع کرتے تھے اور فوت ہونے والے لوگوں پر نماز جنازہ پڑھنے سے منع فرماتے تھے، جب سورج طلوع ہو رہا ہو یہاں تک کہ بلند ہو جائے اور جب دوپہر کے وقت سورج درمیان میں ہو یہاں تک کہ سورج ڈھل جائے اور غروب ہونے کی طرف مائل ہو یہاں تک کہ غروب ہو جائے۔

سورج کے زردی مائل ہونے اور غروب کے قریب ہونے پر فقہاء کا استدلال:

" قوله ﷺ ان الشمس تطلع بين قرني شيطان فاذا ارتفعت فارقها ثم اذا استوت قارنها فاذا زالت فارقها فاذا دنت للغروب قارنها واذا غربت فارقها ونهى عن الصلوة في تلك الساعات رواه مالک في الموطأ والنسائي فانه افاد كون المنع لما اتصل بالوقت مما يستلزم فعل الاركان فيه التشبيه بعبادة الكفار وهذا المعنى بنقصان الوقت والافالوقت لانقص فيه نفسه بل هو وقت كسائر الاوقات "

(فتح القدير)

نبی کریم ﷺ کا ارشاد کہ بے شک سورج شیطان کے دو سینگوں (یعنی بازوؤں) کے درمیان طلوع ہوتا ہے، پھر جب سورج بلند ہو جاتا ہے وہ ہٹ جاتا ہے، پھر جب سورج درمیان میں آتا ہے پھر اس کے سامنے آ جاتا ہے۔ پھر جب سورج ڈھل جاتا ہے وہ بھی ہٹ جاتا ہے۔ پھر جب سورج غروب ہونے کے قریب ہوتا ہے وہ پھر اس کے سامنے آ جاتا ہے۔ اور جب غروب ہو جاتا ہے جدا ہو جاتا ہے۔ اور تین اوقات میں نبی کریم ﷺ نے نماز ادا کرنے سے منع فرمایا۔

(مؤطا امام مالک نسائی)

اس حدیث سے یہ فائدہ حاصل ہوا کہ نبی کریم ﷺ نے ان اوقات میں نماز پڑھنے سے اسلئے منع فرمایا کہ کافروں کی عبادت کی مشابہت حاصل ہوتی ہے ورنہ وقت میں ذاتی طور پر کوئی نقص نہیں۔ بلکہ یہ بھی دوسری وقتوں کی طرح ہی وقت ہیں۔ نقصان عبادات میں ہوگا تو ضمناً اوقات میں بھی نقص آ گیا۔

فقہاء کرام کی عبارات اور دلائل کو دیکھ کر انصاف سے فیصلہ کریں، کیا یہ سچ نہیں، یہ حق نہیں کہ فقہ قرآن وحدیث کے مسائل کی وضاحت کرنیوالے علم کا نام ہے؟ ہاں ہاں یہ حقیقت ہے اسکا انکار ممکن نہیں۔ عوام کو دھوکہ دینا یہ مسئلہ تو فقہ کا ہے ہم تو حدیث بیان کر رہے ہیں فقہ کوئی حدیث کے مطابق علم کا نام نہیں۔ فقہ تو اماموں کا من گھڑت علم ہے، یہ سب جھوٹ اور فریب ہے، دھوکہ دہی کے بغیر کچھ نہیں۔

ظہر کی نماز کا وقت اور غیر مقلدین:

گرمی میں ظہر ٹھنڈے وقت: حضرت ابوہریرہ روایت کرتے ہیں کہتے ہیں۔ کہ رسول خدا نے فرمایا

" اذا اشتد الحر فابردوا بالصلوۃ " (متفق علیہ)

جب گرمی سخت ہوتو نماز ٹھنڈے وقت میں پڑھو۔

ملاحظہ : ٹھنڈے وقت کا یہ مطلب نہیں چار بجادو بلکہ یہ مراد ہے کہ شدت کی گرمی میں سورج ڈھلتے ہی فوراً نہ پڑھو۔تھوڑی دیر کرو۔

اور نسائی میں حضرت انس سے روایت ہے۔" واذا کان البرد عجل "یعنی جب سردی ہوتی تو حضور ظہر پڑھنے میں جلدی کرتے۔ (صلوۃ الرسول ص ۱۴۴)

غیر مقلدین کی اس دلیل میں بھی ناکامی:

چار بجے نماز پڑھنے کا بہتان ہے،گرمیوں میں نماز ہمارے علاقہ میں ڈیڑھ بجے سے لے کر اڑھائی بجے تک ہوتی ہے۔سردیوں میں نماز ایک بجے سے لے کر دو بجے تک ہوتی ہے۔

حدیث شریف کی یہ توجیہ بیان کرنا" کہ شدت گرمی میں سورج ڈھلتے ہی فوراً نہ پڑھو،تھوڑی دیر کرو "غلط ہے۔اس پر کوئی دلیل نہیں قائم کی گئی۔صرف زبانی دعوی قابل قبول نہیں۔

اگر اپنی مرضی سے ہی وجہ گھڑنی ہوتو یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ حدیث کا مطلب یہ ہے کہ شدت گرمی میں زوال کے وقت نماز نہ پڑھو بلکہ سورج ڈھلتے ہی جلدی پڑھ لو۔

احناف کا مذہب فقہ سے:

" ووقت الظهر من زوال الشمس الی ان یصیر ظل کل شئی مثلیه او مثله سوی ظل الاستواء " (نور الایضاح)

ظہر کا وقت سورج کے ڈھل جانے سے شروع ہوا ہے اور ہر چیز کا سایہ اصلی سایہ کے بغیر دو مثل ہو جائے یا ایک مثل ہو جائے۔

ظہر کا یہ کل وقت ہے۔یعنی ظہر کے وقت کی ابتداء کو بیان کیا گیا ہے،اور ظہر کے وقت کی انتہاء کو بیان کیا گیا ہے۔

ظہر کا مستحب وقت:

" والابراد بالظهر في الصيف وتعجيله في الشتاء الافي يوم غيم فيؤخر فيه " (نورالایضاح)

گرمیوں میں ظہر کو ٹھنڈا کر کے پڑھا جائے، سردیوں میں جلدی، ہاں اگر بادل ہو تو تاخیر کرے یہ ضرورت اس وقت تھی جب گھڑیوں کا نظام نہیں تھا، دیر کا حکم اس لئے تھا کہ ایسا نہ ہو کہ وقت سے پہلے ہی نماز پڑھ لی جائے۔

احناف کے دلائل احادیث سے:

" عن ابی هريرة عن النبی ﷺ انه قال اذا اشتد الحر فابردوا بالصلوة فان شدة الحر من فيح جهنم "

(بخاری ج ۱ ص ۷۶ باب الابراد بالظهر، مسلم ج ۱ ص ۲۲۴ باب استحباب الابراد بالظهر، ابوداؤد ج ۱ ص ۵۸ باب وقت صلوة الظهر ترمذی ج ۱ ص ۴۰ باب ماجاء فی تاخير الظهر، نسائی ج ۱ ص ۸۷ باب الابراد بالظهر، ابن ماجه ج ۱ ص ۴۹ باب الابراد بالظهر)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نبی کریم ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ بیشک آپ نے فرمایا جب گرمی سخت ہو تو نماز کو ٹھنڈا کر کے پڑھو، بے شک سخت گرمی جہنم کے سانس لینے سے ہے۔

" عن انس قال كان رسول الله ﷺ اذا كان الحر ابرد بالصلوة واذا كان البرد عجل " (بخاری، نسائی حواله مذکور)

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے رسول اللہ ﷺ فرماتے تھے جب گرمی ہو تو نماز کو ٹھنڈا کر کے پڑھو۔ اور جب سردی ہو تو جلدی پڑھو۔

" عن ابی ذر الغفاری قال كنا مع رسول الله ﷺ فی سفر فاراد المؤذن ان يؤذن للظهر فقال النبی ﷺ ابرد ثم اراد ان يؤذن فقال له ابرد حتى رأينا فيء التلول فقال النبی ﷺ ان شدة الحر من فيح جهنم فاذا اشتد الحر فابردوا بالصلوة "

(بخاری باب الابراد بالظهر فی السفر، مسلم باب استحباب الابراد بالظهر)

حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں ہم رسول اللہ ﷺ کے ساتھ سفر میں تھے۔ مؤذن نے اذان دینے کا ارادہ کیا تو نبی کریم ﷺ نے فرمایا ٹھنڈا کرو، کچھ دیر کے بعد مؤذن نے پھر اذان دینے کا ارادہ کیا تو آپ نے فرمایا ٹھنڈا کرو یہاں تک کہ ٹیلوں کے سائے (پھیلے ہوئے) ہم دیکھ رہے تھے۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا بے شک سخت گرمی جہنم کے سانس لینے کی وجہ سے

ہوتی ہے۔ پس جب سخت گرمی ہو تو نماز کو ٹھنڈا کرو۔

اس حدیث پاک میں لفظ ''ثم'' سے بھی پتہ چل رہا ہے کہ ایک مرتبہ نبی کریم ﷺ کے روکنے کے بعد کچھ وقت گذر گیا تو مؤذن نے دوبارہ اذان دینے کا ارادہ فرمایا تو آپ نے پھر روک دیا۔

''فئی التلول'' سے بھی پتہ چلا کہ ٹیلوں کے سائے کافی مقدار میں پھیل چکے تھے جو دور سے دکھائی دے رہے تھے اگر مطلقاً ''سایہ'' ہی معنی لیا جائے تو وہ کسی طرح بھی درست نہیں، کیونکہ جب تک سایہ ڈھلے نہیں اس وقت تک تو ظہر کا وقت شروع ہی نہیں ہوتا۔

اصلی سایہ کے سواء ایک مثل ہونے سے پہلے ظہر ادا کر لیجائے:

اگر چہ ظہر کے وقت میں مکروہ وقت نہیں، لیکن امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ اور صاحبین کے درمیان اختلاف ہے کہ ظہر کا وقت کب ختم ہوتا ہے ہر چیز کے اصلی سایہ کے بغیر ایک مثل سایہ ختم ہونے تک وقت ختم ہو جاتا ہے یا کہ دو مثل تک پہنچنے تک۔

یہی اختلاف عصر کے وقت کی ابتداء میں ہے کہ ایک مثل کے بعد شروع ہوتا ہے یا دو مثل کے بعد، زیادہ صحیح اور معتبر اور مفتی بہ قول امام اعظم رحمہ اللہ کا دو مثل والا ہے۔

اس لئے بہتر یہ ہے کہ ظہر ایک مثل تک سایہ پہنچنے سے پہلے پہلے ادا ہو جائے اور دو مثل تک سایہ پہنچنے کے بعد ہی عصر کی نماز پڑھی جائے۔

اس فقہی ضابطہ کو بھی بفضلہٖ تعالیٰ حدیث پاک سے ہی لیا گیا ہے۔ آیئے حدیث پاک کو دیکھیں۔

"عن عبداللہ بن رافع مولی ام سلمۃ زوج النبی ﷺ انہ سأل اباھریرۃ عن وقت الصلوۃ فقال ابوھریرۃ انا اخبرک صل الظھر اذا کان ظلک مثلک والعصر اذا کان ظلک مثلیک"

(مؤطا امام مالک کتاب و قوت الصلوۃ)

حضرت عبداللہ بن رافع جو نبی کریم ﷺ کی زوجہ مطہرہ حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا کے غلام ہیں وہ روایت کرتے ہیں۔ کہ بے شک انہوں نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے نماز کے وقت کے متعلق سوال کیا تو حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ میں تمہیں خبر دیتا ہوں کہ

ظہر کی نماز ادا کرلو جب تمہارا سایہ ایک مثل ہو جائے اور عصر کی نماز ادا کرو جب تمہارا سایہ دو مثل ہو جائے۔

بہت واضح ہوا کہ ظہر کے وقت کی انتہاء شے کے ایک مثل سایہ پر نہیں ہوتی ورنہ وہاں سے ہی عصر کا وقت شروع ہو جاتا ہے البتہ شے کے ایک مثل سایہ کے ختم ہونے تک ظہر کو ادا کرلینا بہتر ہے۔

راقم عام طور دو بجے ہی ظہر کی نماز ادا کرتا ہے۔ میرے خیال میں یہ وقت تقریباً تمام سال راولپنڈی، اسلام کے علاقوں میں بہتر ہے۔ تعجیل وتاخیر دونوں پر بیک وقت عمل ہو جاتا ہے۔

فجر کی نماز کے متعلق غیر مقلدین کا بیان:

" عن عائشة قالت كان رسول الله ﷺ ليصلى الصبح فتنصرف النساء متلفعات بمروطهن ما يعرفن من الغلس " (متفق عليه)

حضرت عائشہ روایت کرتے ہوئے کہتی ہیں کہ رسول خدا (جب) نماز صبح پڑھتے تھے۔ پس پھرتیں عورتیں (مسجد سے آپ کے ساتھ نماز پڑھ کر) اپنی چادروں میں لپٹی ہوئی نہ پہچانی جاتی تھیں، بسبب اندھیرے کے۔ (بخاری و مسلم)

ملاحظہ: معلوم ہوا کہ حضور اندھیرے میں اوّل وقت نماز پڑھا کرتے تھے

(صلوۃ الرسول ص ۱۴۵)

فجر کی نماز کے وقت کے متعلق فقہ حنفی سے:

" وقت الصبح من طلوع الفجر الصادق الى قبيل طلوع الشمس " (نور الايضاح)

صبح کا وقت صبح صادق سے لیکر سورج کے نکلنے سے تھوڑا پہلے تک۔

صبح کا یہ وقت ہے، یعنی اس کی ابتداء صبح صادق (پو پھٹنے) سے ہی ہے اور انتہاء سورج کے نکلنے کے وقت کے قریب تک ہے۔

صبح کی جماعت کا مستحب وقت فقہ حنفی سے

میں نے نورالایضاح کے عربی حاشیہ "ذریعۃ النجاح" میں درمختار، شامی، مراقی الفلاح سے

ترتیب دیا،اور اس میں اپنی طرف سے وضاحت بھی کی۔ اسے دیکھیں۔

متن کی عبارت یہ ہے:

"ویستحب الاسفار بالفجر للرجال" مردوں کیلئے فجر کی نماز روشنی میں پڑھنا مستحب ہے۔

اس پر راقم کا ترتیب دیا ہوا حاشیہ یہ ہے۔

"الاسفار بالفجر للرجال الی التاخیر للاضائة والابتداء باسفار والختم به وهو المختار بحیث یرتل اربعین اية ثم یعیده بطهارة ولو فسد لقوله علیه السلام اسفروا بالفجر فانه اعظم للاجر ،والاسفار بالفجر مستحب سفرا وحضرا للرجال الافی مزدلفه للحاج فان التغلیس لهم افضل لوجوب الوقوف بعده بها كما هو فی حق النساء دائما لانه اقرب للستر .والفائده فی الاسفار تكثیر الجماعة وفی التغلیس تقلیلها وما یؤدی الی التكثیر افضل

اقول باعث الافضلية بالاسفار تكثیر الجماعة وان كان تكثیر الجماعة فی التغلیس فالافضل التغلیس وان الذین یعملون فی المعامل والمصانع والمكاتب یرضون التعجیل والتاخیر باعث لحرجهم وتقلیل الجماعة والله اعلم بالصواب "

(ذریعة النجاح)

مردوں کیلئے فجر کی نماز میں اسفار کا یہ مطلب ہے کہ وقت کے روشن ہونے کیلئے تاخیر کرے ،ابتداء بھی روشنی میں ہواور ختم بھی روشنی میں ہو۔مختار یہ ہے کہ امام ترتیل سے چالیس آیتیں پڑھے، پھر اگر نماز میں کوئی فساد لازم آ جائے تو دوبارہ وضوء کر کے اسی مقدار میں قراءت سے نماز وقت میں ادا ہو سکے۔اس لئے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا فجر کو روشنی میں ادا کرو کہ اس میں زیادہ اجر ہے۔ فجر کی نماز کو مردوں کے لئے روشنی میں ادا کرنا مستحب ہے خواہ سفر میں ہو یا حضر میں۔سوائے مزدلفہ کے، کیونکہ وہاں اندھیرے میں نماز افضل ہے حاجیوں کے لئے،اس لئے کہ بعد میں وہاں دعاء کے لئے ٹھہرنا ہے تا کہ زیادہ وقت مل سکے، جیسا کہ عورتوں کو ہمیشہ ہی اندھیرے میں نماز پڑھنا افضل ہے، کیونکہ اس میں ان کا پردہ ہے۔روشنی میں نماز ادا کرنے کا فائدہ یہ ہے کہ جماعت میں لوگ زیادہ مل سکیں گے اور اندھیرے میں نمازی کم ہوں گے۔تکثیر جماعت افضل ہے۔

اس پر راقم کی وضاحت یہ ہے کہ جب مقصد روشنی میں پڑھنے کا تکثیر جماعت ہے تو یقیناً اگر

اندھیرے میں نماز پڑھنا نمازیوں کے زیادہ ہونے کا سبب ہو تو اندھیرے میں نماز پڑھنا زیادہ ثواب ہوگا۔ جیسا کہ کارخانوں، فیکٹریوں اور دفاتر میں ملازمت کرنے والے صبح کی نماز جلدی پڑھنا بہتر سمجھتے ہیں ایسی صورت میں صبح کی نماز اندھیرے میں پڑھنا بہتر ہے، کیونکہ اگر دیر سے نماز ادا کی جائے تو یا ان لوگوں کے کاموں میں حرج واقع ہوگی۔ یا وہ نماز جماعت سے پہلے ادا کر کے چلے جائیں گے اس لئے نمازیوں کا اعتبار کرنا ضروری ہے۔

احناف کا استدلال احادیث سے:

"عن رافع بن خدیج ان رسول اللہ ﷺ قال اسفروا لصلوۃ الفجر فان ذلک اعظم للاجر او قال لاجورکم"

(مسند حمیدی ج ۱ ص ۱۹۹، ابوداؤد ج ۱ ص ۶۱ باب وقت الصبح، ترمذی ج ۱ ص ۹۴ باب الاسفار، نصب الرایۃ ج ۱ ص ۲۳۸)

رافع ابن خدیج رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں بے شک رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ فجر کو روشنی میں ادا کرو، بے شک اس میں عظیم اجر ہے

اعتراض: نبی کریم ﷺ نے سفیدی میں نماز پڑھنے کا جو حکم دیا ہے، اس کا مطلب تو یہ ہو سکتا ہے کہ صبح صادق کے وقت نماز ادا کرو، کیونکہ صبح کاذب کے بعد اندھیرا ہو جاتا ہے۔

جواب: صبح صادق مراد نہیں ہو سکتی، کیونکہ صبح صادق سے پہلے تو نماز ہو ہی نہیں سکتی، پھر روشنی میں نماز پڑھنے کا حکم اور عظیم اجر کے پائے جانے کا کیا مقصد ہو سکتا ہے؟۔

ایک اور حدیث پاک کو دیکھیں تو اور واضح ہو جائے گا کہ اس سفیدی سے مراد روشنی ہی ہے، صبح صادق نہیں،

"عن هریر بن عبدالرحمن بن رافع بن خدیج قال سمعت جدی رافع بن خدیج یقول قال رسول اللہ ﷺ لبلال نوّر بصلوۃ الصبح حتی یبصر القوم مواقع نبلهم من الاسفار" (المعجم الکبیر للطبرانی ص ۲۷۸ رقم الحدیث ۴۴۱۴)

هریر بن عبدالرحمن بن رافع بن خدیج کہتے ہیں کہ میں نے اپنے دادا رافع بن خدیج کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت بلال رضی اللہ عنہ کو فرمایا کہ صبح کی نماز کو روشن کر کے

پڑھو، یہاں تک کہ اس روشنی میں قوم اپنے تیروں کے گرنے کے مقامات کو دیکھ لے۔

اس حدیث پاک سے واضح طور پر معلوم ہو گیا کہ ''اسفار'' سے مراد صبح صادق نہیں بلکہ روشنی مراد ہے۔

" عن علی بن ربیعة قال سمعت علیا یقول لمؤذنه اسفر اسفر "

(مصنف عبدالرزاق ج ۱ ص ۵۶۹ باب وقت الصبح) مصنف ابن ابی شیبه ج ۱ ص ۳۲۱ باب من کان ینور بها ، طحاوی ج ۱ ص ۱۲۳ باب وقت الفجر)

حضرت علی بن ربیعہ کہتے ہیں میں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے سنا کہ وہ اپنے مؤذن (ابن نباح) کو کہہ رہے تھے اور روشنی ہونے دو، اور روشنی ہونے دو

" عن عبدالرحمن بن یزید قال کنا نصلی مع ابن مسعود فکان یسفر بصلوة الصبح "

(طحاوی ج ۱ ص ۱۲۵ باب وقت الفجر ، مصنف عبدالرزاق ج ۱ ص ۵۶۹ ، مصنف ابن ابی شیبه ج ۱ ص ۳۲۱ باب من کان ینور بها)

عبدالرحمٰن بن یزید کہتے ہیں کہ ہم حضرت عبداللہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ کے ساتھ نماز پڑھتے تھے وہ صبح کی نماز روشنی میں پڑھتے تھے۔

جن احادیث کو ذکر کیا گیا ہے ان سے یہ بات واضح ہو گئی کہ جب تکثیر جماعت روشنی میں ہو تو روشنی میں نماز ادا کرنا مستحب ہے۔ اس پر عمل رسول اللہ ﷺ کا بھی بیان کیا جا چکا ہے۔ اور صحابہ کرام کا بھی

غیر مقلدین کی دلیل کا جواب:

" والحدیث القولی مقدم ای اسفروا بالفجر فانه اعظم للاجر واما ثبوت الغلس فلا ننکره ایضا فانه ایضا جائز فان الخلاف فی الافضلیة فصار الترجیح لمذهب الاحناف " (حاشیه ترمذی)

صبح کی نماز کو روشنی میں پڑھنے والی حدیث قولی ہے۔ اور اندھیرے میں نماز پڑھنے والی حدیث فعلی ہے۔ قانون یہ ہے کہ جب قولی اور فعلی حدیث میں تعارض ہو تو قولی حدیث کو ترجیح دی جاتی ہے۔

اور اصل میں یہ نزاع ہی نہیں کہ اندھیرے میں صبح کی نماز نہیں ہوتی، بلکہ نزاع تو صرف فضلیت میں ہے کہ افضل کیا ہے۔ روشنی والی نماز میں عظیم اجر کا ذکر ہے لہذا یہ افضل ہوگی۔ اندھیرے والی نماز میں صرف پڑھنے کا ذکر ہے لہذا وہ جائز رہے گی۔

اندھیرے میں نماز فجر ادا کرے یا روشنی میں جائز ہے۔لیکن جب روشنی میں نمازی زیادہ ہوں تو روشنی میں افضل ہے۔اور جب اندھیرے میں نماز پڑھنے سے نمازی زیادہ ہوں تو اندھیرے میں افضل ہے۔

راقم جہاں امام ہے وہاں کے لوگ دفتری ملازم ہیں۔دفتر میں جانے سے پہلے سیر کرنا، ناشتہ کرنا غسل کرنا، کپڑے بدلنا ان کے کئی معمولات ہیں سردیوں مین وقت کم ہونیکی وجہ سے راقم صبح کی نماز اندھیرے میں پڑھاتا ہے اور گرمیوں میں وقت زیادہ ہونے کی وجہ سے اور رات کے چھوٹا ہونے اور دیر سے جاگ آنے کی وجہ سے صبح کی نماز اجالے میں پڑھاتا ہے۔ یہ دونوں صورتیں نمازیوں کی سہولت کے مدنظر ہیں۔ورنہ راقم خود گرمیوں اور سردیوں میں جلدی جاگنے کا عادی ہے، ہمیشہ اندھیرے میں نماز پڑھنے یا اجالے میں نماز پڑھنے سے راقم کو کوئی فرق نہیں پڑتا لیکن فقہی نقطہ کو مدنظر رکھ کر بفضلہ تعالیٰ راقم کا عمل ہے۔ضد یا عناد کسی کو نہ ہو تو بفضلہ تعالیٰ راقم کے طریقہ پر کوئی اعتراض نہیں کر سکے گا۔

جلدی نماز پڑھنے پر غیر مقلدین کی ایک اور دلیل:

ترمذی شریف میں حضرت علی روایت کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

" یاعلی ثلاث لاتؤخرھا الصلوۃ اذاانت والجنازۃ اذاحضرت والایم اذا وجدت لھا کفوا "

اے علی تین چیزیں (ایسی) ہیں کہ نہ دیر کرنا ان کو (پہلی) نماز جب کہ آئے وقت اس کا (دوسری) جنازہ جب کہ تیار ہو (تیسری) عورت بن خاوند کے جبکہ پائے تو اس کیلئے کفو۔

(صلوۃ الرسول ص-۱۴۰)

اس حدیث کو غیر مقلدین نے دلیل بنایا ہے کہ نماز کا جب وقت آ جائے اسی وقت نماز ادا کی جائے دیر نہ کی جائے۔

اس دلیل کا جواب:

حدیث شریف میں تین چیزوں کا ذکر ہے، جنازہ جب حاضر ہو تو اس میں دیر نہ کرو۔کیا کوئی غیر مقلد اس کے ظاہر پر عمل کرتا ہے۔کہ ایک شخص فوت ہوا، ادھر قبر تیار ہوئی اور بغیر دیر کے اسے دفن کر دیا؟ نہیں اس پر کوئی عمل نہیں کر رہا، ابھی چند دن ہوئے علامہ عبدالقادر روپڑی فوت ہوئے، ان کی وفات

کے بعد تقریباً سولہ یا اٹھارہ گھنٹے بعد جنازہ ہوا۔

اسی طرح حدیث شریف میں ہے کہ لڑکی غیر شادی شدہ کو جب کفو مل جائے تو اس کی شادی میں دیر نہ کی جائے۔

کیا ایسا کوئی غیر مقلد ہے کہ اپنی بیٹی کی شادی بالغ ہوتے ہوئے کفو ملنے پر کر دیتا ہے کفو تو تقریباً ہر خاندان کو مل ہی جاتی ہے جب ان دونوں پر عمل نہیں تو نماز کے وقت شروع پر نماز ادا کرنے پر زور کیوں؟

بات واضح ہے کہ حدیث پاک کا مطلب یہ ہے کہ نماز کا مستحب وقت ہو جائے تو نماز پڑھنے میں اتنی دیر نہ کر دو کہ مکروہ وقت آ جائے۔ جب کوئی شخص فوت ہو جائے جنازہ پڑھنے والے چالیس آدمی آ جائیں تو جنازہ ادا کرنے مین بہت دیر نہ کرو کہ جسم سے بدبو آنے لگ جائے یا میت کو برف خانہ میں رکھنا پڑھے لڑکی جوان ہو جائے، کفو مل جائے تو بہت دیر نہ کرو جہاں فتنہ کا خوف ہو۔

یہ مطلب جو راقم نے بیان کیا ہے، یہی تقریباً منصف مزاج علماء کرام کرتے ہیں۔ اور اسی پر عمل بھی ہو رہا ہے۔ نبی کریم ﷺ نے تین چیزوں کا ذکر کیا ہے ان میں دو پر غیر مقلدین بھی اسی طرح عمل کرتے ہیں جس طرح میں نے بیان کیا ایک پر وہ جلدی جلدی عمل کر کے بظاہر اہل حدیث بننے کی ناکام کوشش کرتے ہیں لیکن در حقیقت وہ وقت مستحب اور مطلق وقت فرق کو سمجھنے کی کوشش نہیں کرتے یا سمجھنے کی صلاحیت نہیں رکھتے۔

غیر مقلدین کا حدیث پر عمل یا حدیث سے انحراف:

غیر مقلدین نے اوقات کے متعلق جو احادیث بیان کی ہیں (ان کا جواب دیا چکا ہے) ان سے انہوں نے نتیجہ نکالتے ہوئے بظاہر نصیحت ان الفاظ سے کی ہے (جو در حقیقت فضیحت ہے)
بھائیو اور بہنو ! غور کرو رسول اللہ ﷺ نے اپنی ساری زندگی میں پانچوں نمازیں اول وقت پڑھیں۔

(صلوۃ الرسول ص ۱۴۶)

یہ سراسر غلط ہے، گرمیوں میں دیر سے ظہر کی نماز پڑھنے کا ذکر احادیث مبارکہ سے ثابت کیا

جا چکا ہے۔ اور فجر کی نماز نمازیوں کے زیادہ ہونے کی غرض سے روشنی میں ادا کرنے کی فضیلت کو بھی ذکر کیا چکا ہے۔

آیئے اب عشاء کی نماز کی تاخیر کا مستحب ہونا احادیث مبارکہ سے دیکھیں۔ پھر اندازہ کریں کہ غیر مقلدین کی یہ نصیحت واقعی نصیحت ہے یا فضیحت ہے۔ کیا حدیث پر عمل ہے یا حدیث سے انحراف ہے۔

"عن ابی سعید قال انتظرنا رسول الله ﷺ لیلة لصلوة العشاء حتی ذهب نحو من شطر اللیل قال فجاء فصلی بنا ثم قال خذوا مقاعدکم فان الناس قد اخذوا مضاجعهم وانکم لم تزالوا فی صلوة منذ انتظرتموها ولو لا ضعف الضعیف وسقم السقیم وحاجة ذی الحاجة لأخرت هذه الصلوة الی شطر اللیل"

(نسائی ج ۱ ص ۹۳ باب ما یستحب من تاخیر العشاء، ابن ماجه ج ۱ ص ۵۰ باب وقت صلوة العشاء، ابوداؤد ج ۱ ص ۶۱ باب وقت صلوة العشاء الاخرة، مسند احمد ج ۳ ص ۵)

حضرت ابوسعید (خدری) رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں ہم ایک رات عشاء کی نماز کیلئے رسول اللہ ﷺ کی انتظار کرتے رہے۔ یہاں تک کہ رات کا تقریباً نصف حصہ گذر گیا تو آپ تشریف لائے، پھر ہمیں نماز پڑھائی۔ پھر آپ نے فرمایا اپنی اپنی جگہ پر قائم رہو (اس کے بعد آپ نے ہمیں خطاب کرتے ہوئے فرمایا) بے شک لوگ اپنی اپنی آرامگاہ میں سو گئے ہیں بیشک تم جتنی دیر نماز کی انتظار میں رہے ہو نماز میں ہی تھے۔ اگر بوڑھوں کے بڑھاپے۔ بیماروں کی بیماری، صاحب حاجت کی حاجت کا خیال نہ ہوتا تو میں اس نماز کو نصف رات تک مؤخر کر دیتا۔

اس حدیث پاک سے واضح ہوا کہ نماز کی انتظار میں بیٹھنا، دیر کرنا، نہ سونا، نماز پڑھنا ہے۔ یعنی نماز کے پڑھنے کا ثواب حاصل ہوتا رہے گا۔

نبی کریم ﷺ نے عشاء کی نماز کو دیر سے ادا کرنے کو پسند فرمایا صرف بوڑھے، بیماروں، ضرورتمندوں کا لحاظ کرتے ہوئے آدھی رات تک دیر نہیں کی۔ لیکن رات کے تہائی حصہ تک دیر کرنا مستحب ہے۔

"عن ابی هریرة قال قال رسول الله ﷺ لو لا ان اشق علی امتی لأمرتهم ان یؤخروا العشاء الی ثلث اللیل او نصفه"

(مسند احمد ج ۲ ص ۲۵۰، ترمذی ج ۱ ص ۲۳ باب ماجاء فی تاخیر العشاء الاخرة، ابن ماجه ج ۱ ص ۵۰ باب وقت العشاء)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اگر میں اپنی امت کے لئے مشکل نہ سمجھتا تو حکم دیتا کہ عشاء کی نماز کو رات کے تہائی حصہ تک مؤخر کردو۔

اس حدیث پاک میں شارحین کا اتفاق ہے کہ نبی کریم ﷺ کے ارشاد کا مطلب یہ ہے کہ اگر میں امت کی مشکل کو خیال میں نہ لاتا تو عشاء کی نماز کو رات کے تہائی حصہ تک مؤخر کرنے کو واجب کر دیتا۔ یعنی وجوبی حکم دیتا نبی کریم ﷺ نے اگر چہ عشاء کی نماز کو دیر سے پڑھنا واجب تو نہیں قرار دیا، لیکن رات کے تہائی حصہ تک دیر کرنا پسند فرمایا۔ مستحب یہی ہے کہ عشاء کی نماز دیر سے پڑھی جائے۔

جب عشاء کی نماز کو دیر سے پڑھنا رسول اللہ ﷺ نے پسند فرمایا تو جلدی نماز پڑھنے پر زور دینا یقیناً حدیث پاک سے انحراف ہے خدرا غور کریں حدیث پر عمل کرنے سے انحراف کرنے پر کوئی شخص اہل حدیث ہوتا ہے یا کہ عمل کرنے سے؟ حقیقت یہی ہے کہ ہمارا نام تو حنفی ہے لیکن ہم حقیقی معنی میں اہل حدیث ہیں۔ غیر مقلدوں نے اپنا نام ہی صرف اہل حدیث رکھا ہوا ہے، ورنہ وہ اہل حدیث کہلانے کے حقدار نہیں۔

ابھی تک نمازوں کے اوقات کی جو تفصیل بیان کی ہے اسی سے واضح ہو گیا کہ امام اعظم ابو حنیفہ رحمہ اللہ کا مذہب احادیث کے مطابق ہے جس میں تمام احادیث میں تطابق پایا جاتا ہے۔ امام اعظم رحمہ اللہ بھی نماز کو اول وقت میں ادا کرنے کے قائل ہیں لیکن اول وقت سے وقت مستحب کی اولیت مراد ہے، نہ کہ کل وقت کی اولیت۔

اب امام اعظم کے مذہب اعظم کو دیکھئے اور آپ کے اعظم دلائل کو دیکھنے کے بعد تفسیر قرطبی اور تفسیر کبیر میں اول وقت کی افضلیت کی ابحاث کو دیکھیں تو انشاء اللہ امام رحمہ اللہ کا مذہب ان دلائل کے مطابق آپ کو نظر آئے گا کیونکہ آپ بھی وقت مستحب کی اولیت کے قائل ہیں۔

☆ " عن ابی هريرة رضی الله عنه ان رسول الله ﷺ قال انما مثل المهجر الی الصلوة كمثل الذی يهدی البدنة ثم الذی علی اثره كالذی يهدی البقرة ثم الذی علی اثره كالذی يهدی الكبش ثم الذی علی اثره كالذی يهدی الدجاجة ثم الذی علی اثره كالذی يهدی البيضة "

(نسائی)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں بیشک رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جو شخص نماز (جمعہ) میں جلدی جائے وہ ایسے ہے جیسے اللہ تعالیٰ کی راہ میں اونٹ قربان کردے اور اس کے بعد جانے والا ایسا ہے جیسے وہ اللہ کی راہ میں گائے قربان کردے اور اس کے بعد جانے والا ایسے ہے جیسا کہ اللہ کی راہ میں بکری قربان کردے اور اس کے بعد جانے والا ایسا ہے جیسے اللہ کی راہ میں کوئی مرغی ذبح کردے) یعنی کسی فقیر کو مرغی ذبح کر کے دے دے)۔ اور اس کے بعد جانے والا ایسا ہے جیسے اللہ کی راہ میں (کسی غریب کو) انڈا دے دے۔

☆ " عن ابی هريرة رضی الله عنه قال قال رسول الله ﷺ ان احدكم ليصلی الصلوة لوقتها وقد ترک من الوقت الاول ما هو خير له من اهله وما له " (دار قطنی)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا بیشک تم میں سے کوئی شخص نماز وقت میں ادا کرتا ہے لیکن اول وقت جو اس کے مال وعیال سے بہتر ہے اسے چھوڑ دیتا ہے۔

☆ " عن ابن عمر قال قال رسول الله ﷺ خير الاعمال الصلوة فی اول وقتها " (دار قطنی)

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اعمال میں بہتر عمل نماز اول وقت میں ادا کرنا ہے۔

☆ " قوله عليه السلام فی خطبة له " وبادروا بالاعمال الصالحة قبل ان تشتغلوا "

نبی کریم ﷺ نے دوران خطبہ ارشاد فرمایا نیک اعمال کی طرف جلدی کرو (دنیاوی کاموں میں) مشغول ہونے سے پہلے۔ (ماخوذ از قرطبی و کبیر)

بفضلہ تعالیٰ امام اعظم رحمہ اللہ ان تمام احادیث پر عمل ہے آخری حدیث سے جلدی کی وضاحت بھی سمجھ آ رہی ہے کہ اور کاموں میں مشغول ہو کر کہیں نیک کاموں کو فوت نہ کر دو۔

فائدہ : " وَلِكُلٍّ وِّجْهَةٌ " سے ایک فائدہ یہ بھی حاصل ہوا کہ:

" ولكل واحد من الرسل واصحاب الشرائع جهة قبلة فقبلة المقربين العرش، وقبلة الروحانين الكرسی وقبلة الكروبيين البيت المعمور وقبلة الانبياء الذين قبلک بيت المقدس وقبلتک الكعبة "

تمام رسولوں اور اصحاب شرائع کا قبلہ ہے۔ مقربین کا قبلہ عرش، روحانیین کا قبلہ کرسی، کروبین کا قبلہ البیت المعمور، آپ سے پہلے انبیاء کرام کا قبلہ بیت المقدس اور آپ کا قبلہ کعبہ ہے۔ (کبیر)

" فاستبقوا الخیرات " ای فالزموا معاشر المسلمین قبلتکم فانکم علی خیرات من ذلک فی الدنیا والآخرة اما فی الدنیا فلشرفکم بقبلة ابراهیم واما فی الآخرة فللثواب العظیم الذی تاخذونه علی انقیادکم لا وامره "

یعنی " فَاسْتَبِقُوا الْخَیْرَاتِ " کا ایک مفہوم یہ ہے کہ اے مسلمانوں کی جماعت اپنے قبلہ کو لازم پکڑو کیونکہ یہ تمہارے لئے دنیا میں بہتر اور آخرت میں بھی۔ دنیا میں تمہارے لئے خیر اس لئے ہے کہ یہ ابراہیم علیہ السلام کا قبلہ ہے جب تم بھی اس کی طرف منہ کر کے نماز ادا کرو گے تو تمہیں ابراہیم علیہ السلام کے قبلہ سے شرف حاصل ہوگا۔ آخرت میں تمہارے لئے خیر اس لئے ہے کہ تمہیں اللہ تعالیٰ کا حکم ماننے کی وجہ سے عظیم ثواب حاصل ہوگا۔ (کبیر)

☆☆☆☆☆
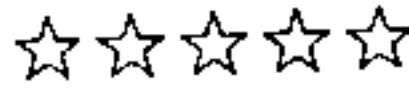
﴿ وَمِنْ حَيْثُ خَرَجْتَ فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ وَإِنَّهُ لَلْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُونَ ☆ وَمِنْ حَيْثُ خَرَجْتَ فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ وَحَيْثُ مَا كُنْتُمْ فَوَلُّوا وُجُوهَكُمْ شَطْرَهُ لِئَلَّا يَكُونَ لِلنَّاسِ عَلَيْكُمْ حُجَّةٌ إِلَّا الَّذِينَ ظَلَمُوا مِنْهُمْ فَلَا تَخْشَوْهُمْ وَاخْشَوْنِي وَلِأُتِمَّ نِعْمَتِي عَلَيْكُمْ وَلَعَلَّكُمْ تَهْتَدُونَ ﴾

۱) ''اور جہاں سے آؤ اپنا منہ مسجد حرام کی طرف کرو اور وہ ضرور تمہارے رب کی طرف سے حق ہے اور اللہ تمہارے کاموں سے غافل نہیں۔ اور محبوب تم جہاں سے آؤ اپنا منہ مسجد حرام کی طرف کرو اور اے مسلمانو تم جہاں کہیں ہو اپنا منہ اسی کی طرف کرو کہ لوگوں کو تم پر کوئی حجت نہ رہے مگر جو ان میں ناانصافی کریں تو ان سے نہ ڈرو اور مجھ سے ڈرو اور یہ اس لئے ہے کہ میں اپنی نعمت تم پر پوری کروں اور کسی طرح تم ہدایت پاؤ''۔

۲) ''اور جہاں سے نکلو تو پھیر لو اپنا منہ مسجد حرام کی طرف اور بیشک یہ حق ہے تمہارے رب کی طرف سے اور نہیں اللہ غافل اس سے جو تم عمل کرتے ہو۔ اور جہاں سے تم نکلو تو پھیر لو اپنا منہ مسجد حرام کی طرف اور جہاں تم ہو پھیر لو اپنے مونہوں کو اسی کی طرف، تا کہ نہ ہو لوگوں کو تم پر حجت سوائے ان لوگوں کے جو ظالم ہیں ان میں سے تو تم نہ ڈرو ان سے اور ڈرو مجھ سے اور تا کہ میں پوری کروں اپنی نعمتیں تم پر اور تا کہ تم ہدایت پر قائم رہو''۔

تکرار میں فوائد: بظاہر آیات میں تکرار نظر آتا ہے کہ تین مرتبہ منہ کو پھیرنے کا حکم دینے کا کیا مقصد ہے؟ لیکن جب غور کیا جائے تو واضح ہو جاتا ہے کہ حقیقت میں تکرار ہے ہی نہیں بلکہ علیحدہ علیحدہ مطالب ہیں۔

پہلا فائدہ : نماز ادا کرنے والا کبھی مسجد حرام میں ہوتا ہے اور کبھی مسجد حرام سے باہر لیکن مکہ مکرمہ میں ہوتا ہے اور کبھی مکہ مکرمہ سے باہر دور و دراز علاقہ میں ہوتا ہے۔ مسجد حرام میں نماز ادا کرنے والے کو کعبہ کی طرف منہ کرنے کا حکم پہلی آیۃ میں ﴿ وحیث ما کنتم فولوا وجوھکم شطرہ ﴾ سے دیا۔ اور دوسری آیۃ میں مسجد حرام سے باہر لیکن مکہ مکرمہ میں ساکن حضرات کو حکم دیا۔ دوسری آیۃ سے مراد زیر بحث دو آیتوں سے پہلی آیۃ ہے۔ اور تیسری آیۃ میں مکہ مکرمہ سے باہر والوں کو مسجد حرام کی طرف منہ کرنے کا حکم دیا۔ درحقیقت یہ وہم ہوسکتا تھا کہ شائد قریب والوں کے لئے یہ حکم ہو بعید والوں کے لئے نہ ہو تو تمام قریب و بعید والوں کے لئے حکم بیان کر دیا گیا۔ البتہ وضاحت پہلے کر دی گئی کہ کعبہ شریف سامنے ہو تو کیا حکم ہے سامنے نہ ہو تو کیا حکم ہے۔

دوسرا فائدہ : تین مرتبہ ذکر کر کے علیحدہ علیحدہ مقاصد بیان کئے گئے۔ پہلی مرتبہ بیان کرنے کے بعد فرمایا:

﴿ وَاِنَّ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْکِتَابَ لَیَعْلَمُوْنَ اَنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّهِمْ ﴾

''بیشک اہل کتاب جانتے ہیں کہ یہ حق ہے ان کے رب کی طرف سے''

یعنی اہل کتاب توراۃ وانجیل میں مشاہدہ کرنے کی وجہ سے جانتے ہیں کہ حضرت محمد مصطفی ﷺ کی نبوت برحق ہے اور تحویل قبلہ برحق ہے

دوسری مرتبہ حکم دینے کے بعد فرمایا ﴿ وَاِنَّهٗ لَلْحَقُّ مِنْ رَّبِّکَ ﴾ ''بیشک یہ حق ہے تمہارے رب کی طرف سے'' یعنی اللہ تعالیٰ نے اپنی شہادت کا ذکر فرمایا کہ میں اس پر شہادت دیتا ہوں کہ میرے محبوب کی نبوت اور تحویل قبلہ حق امور ہیں۔

تیسری مرتبہ حکم دینے کے بعد فرمایا: ﴿ لِئَلَّا یَکُوْنَ لِلنَّاسِ عَلَیْکُمْ حُجَّةٌ ﴾ ''تاکہ لوگوں کی تم پر حجت نہ ہو'' ''فلما اختلفت هذه الفوائد حسنت اعادتها'' جب تینوں مقاموں میں مختلف فوائد پائے گئے ہیں تو ان کا اعادہ اچھا ہے اسی وجہ سے علیحدہ علیحدہ ذکر کیا۔

تیسرا فائدہ : جب پہلی آیۃ میں ذکر فرمایا ﴿ فَلَنُوَلِّیَنَّکَ قِبْلَةً تَرْضَاهَا ﴾ ''ہم ضرور بضرور پھیر دیں گے آپ کو اس قبلہ کی طرف جس کو آپ پسند کرتے ہیں'' تو اس سے وہم ہوسکتا

تھا کہ شائد یہ حکم صرف نبی کریم ﷺ کو ہو اور لوگوں کو نہ ہو تو ﴿ فَوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ شَطْرَهٗ ﴾ ارشاد فرما کر ہر جگہ رہنے والوں کو کعبہ کی طرف متوجہ ہونے کا حکم دیا تو دوسری آیۃ میں ﴿ وَمِنْ حَيْثُ خَرَجْتَ فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ وَاِنَّهٗ لَلْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ ﴾ کہہ کر حکم کو عام فرما دیا اور ساتھ ہی بتا دیا کہ یہ تمہارے رب کی طرف سے حق ہے۔ اور تیسری آیۃ میں بیان فرما دیا کہ تم کعبہ کو قبلہ بنالو۔ بیت المقدس کا قبلہ ہونا منسوخ ہو چکا ہے اب یہ ہمیشہ کیلئے تمہارا قبلہ رہے گا، منسوخ نہیں ہوگا۔

" والحاصل ان الآیة السالفة امر بالدوام فی جمیع الامکنة والثانیة امر بالدوام فی جمیع الازمنة والامکنة والثالثة امر بالدوام فی جمیع الازمنة واشعار بان هذا لا یصیر منسوخا البتة "

حاصل کلام یہ ہے کہ پہلی آیۃ میں حکم دیا گیا کہ تم جہاں کہیں بھی ہو تمہارا قبلہ کعبہ ہے اور دوسری آیۃ میں حکم دیا گیا تم جس وقت نماز ادا کرو کہیں بھی ہو نماز میں منہ کعبہ کی طرف ہی کرنا۔ تیسری آیۃ میں یہ حکم دیا گیا کہ یہ حکم تمہارے لئے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ہے یہ کبھی منسوخ نہیں ہوگا۔

چوتھا فائدہ : پہلی آیۃ میں نبی کریم ﷺ کے اکرام کا ذکر فرمایا کہ کعبہ کو قبلہ نبی کریم ﷺ کی تمنا کے مطابق بنایا جا رہا ہے اور ساتھ ہی آپ کی امت کو بھی حکم دے دیا کہ یہ وہ قبلہ ہے جو ابراہیم علیہ السلام کا بھی تھا اور تمہارے نبی کریم ﷺ کا مطلوب بھی ہے۔

دوسری آیۃ کریمہ میں ذکر فرمایا " وَلِكُلٍّ وِّجْهَةٌ " یعنی ہر صاحب دعوت اور ہر صاحب ملت کا قبلہ ہے جس کی طرف وہ متوجہ ہوتے ہیں " فتوجهوا انتم الی اشرف الجهات التی یعلم الله تعالی انها حق " تو تم تمام جہات میں سے اشرف جہت کی طرف متوجہ ہو اللہ تعالیٰ جانتا ہے کہ وہی حق ہے۔ اور تیسری آیۃ میں قبلہ کے معاملہ میں یہود کی طرف سے مخاصمت کا رد کرتے ہوئے فرمایا کہ تم مسجد حرام کی طرف منہ کر لو تا کہ ان کی حجت بازیاں ختم ہو جائیں۔

پانچواں فائدہ : اسلام میں منسوخ ہونے والا سب سے پہلا حکم قبلہ کا ہی تھا اس لئے تکرار میں تاکید پائی گئی اور بات کو پختہ کیا گیا۔ اور شبہات کو زائل کیا گیا اور دلائل واضح طور پر بیان کئے گئے۔ (ماخوذ از کبیر)

وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ : اور اللہ تعالیٰ نہیں ہے غافل اس سے جو تم عمل

کرتے ہو۔ یعنی وہ لوگ جو عناد کی وجہ سے آپ کو پہچاننے کے باوجود حق کو چھپاتے ہیں اور لوگوں کے دلوں میں شبہات ڈالتے ہیں اور کہتے ہیں " مَا وَلّٰهُمْ عَنْ قِبْلَتِهِمُ الَّتِیْ كَانُوْا عَلَیْهَا " کس چیز نے ان کو قبلہ سے پھیر دیا جس پر وہ تھے اور یہ کہتے ہیں کہ یہ نبی اپنے آبائی شہر اور آبائی دین کا مشتاق ہو گیا (معاذ اللہ) ان کو خطاب کرتے ہوئے رب تعالیٰ نے فرمایا کہ اللہ تمہارے اعمال سے غافل نہیں۔ (از کبیر)

تنبیہ : علامہ آلوسی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ایک قراءت میں " یعلمون " (بالیاء) ہے اس میں کفار کو وعید ہے۔ اور ایک قراءت میں " تعلمون " ہے اس میں مؤمنین کے لئے وعدہ ہے اس صورت میں معنی یہ ہوگا " فیجازیکم بذلک احسن الجزاء " وہ تمہیں اچھی جزاء دے گا کیونکہ وہ تمہارے اچھے اعمال سے بے خبر نہیں۔ (روح المعانی)

خیال رہے کہ اعلیٰ حضرت کا ترجمہ روح المعانی کے اسی قول کے مطابق ہے کیونکہ آپ نے ترجمہ کیا۔ ''اللہ تمہارے کاموں سے غافل نہیں'' اگر کفار کے لئے وعید ہوتی تو آپ کا ترجمہ ہوتا ''اللہ تمہارے کوتکوں سے غافل نہیں''۔

لِئَلَّا یَكُوْنَ لِلنَّاسِ عَلَیْكُمْ حُجَّةٌ . ''تا کہ نہ ہو لوگوں کو تم پر حجت'' پہلے یہ دیکھنا ہے کہ ان کی حجتیں کیا تھیں جو تحویل قبلہ کے بعد ختم ہو گئیں، آہستہ آہستہ خود ہی ان کے منہ بند ہوتے چلے گئے۔ ان کی حجتیں مختلف قسم کی تھیں:

(۱) " احدها ان الیهود قالوا تخالفنا فی دیننا وتتبع قبلتنا " ان میں سے ایک یہ تھی کہ یہود نے کہا یہ شخص ہمارے دین کی مخالفت کرتا ہے اور ہمارے قبلہ کی تابعداری کرتا ہے۔

(۲) " وثانیها قالوا الم یدر محمد این یتوجه فی صلاته حتی هدیناه " دوسری حجت یہود کی یہ تھی کہ وہ کہتے تھے کیا ایسا نہیں کہ محمد کو یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ وہ نماز میں کس طرف منہ کرے یہاں تک کہ ہم نے اسے یہ سکھایا ہے۔

(۳) " ان العرب قالوا انه کان یقول انا علی دین ابراهیم والآن ترک التوجه الی الکعبة ومن ترک التوجه الی الکعبة فقد ترک دین ابراهیم علیه السلام "

تیسری حجت ان کی (یعنی مشرکین عرب کی) یہ تھی کہ وہ یہ کہتے تھے کہ یہ شخص کہتا تھا کہ میں

ابراہیم علیہ السلام کے دین پر ہوں لیکن اب مدینہ میں جا کر اس نے کعبہ کی طرف نماز میں منہ کرنا چھوڑ دیا ہے بلکہ بیت المقدس کو قبلہ بنالیا ہے جو شخص کعبہ کی طرف متوجہ ہونے کو ترک کردے اس نے ابراہیم علیہ السلام کے دین کو بھی ترک کر دیا۔ اللہ تعالیٰ نے قبلہ کو تبدیل فرما کر ان کی تمام حجتوں کو ختم کر دیا ان کے منہ بند کر دیئے۔

اِلَّا الَّذِیْنَ ظَلَمُوْا : ہاں تحویل قبلہ کے بعد بھی ظالموں کی حجتیں قائم رہیں گی۔ یہی وجہ تھی کہ تحویل قبلہ کے بعد مشرکین کہنے لگے " ان محمدا (علیه الصلوة والسلام) عاد الی دیننا فی الکعبة وسیعود الی دیننا بالکلیة " بیشک محمد ﷺ کعبہ کو قبلہ بنانے کے مسئلہ میں تو ہمارے دین کی طرف لوٹ آئے ہیں عنقریب مکمل طور پر ہمارے دین کی طرف لوٹ آئیں گے۔ ان کا یہ کہنا ان کی جہالت اور ان کے کفر پر دلالت کر رہا ہے اور ان کا یہ کہنا اپنے آپ پر ظلم کرنا تھا رب تعالیٰ نے فرمایا ﴿ اِنَّ الشِّرْکَ لَظُلْمٌ عَظِیْمٌ ﴾ بیشک شرک ظلم عظیم ہے۔ اسی طرح یہودیوں میں سے بے وقوف تحویل قبلہ کے بعد بھی کہتے رہے ﴿ مَا وَلّٰهُمْ عَنْ قِبْلَتِهِمُ الَّتِیْ کَانُوْا عَلَیْهَا ﴾ ان کو کس نے پھیر دیا ہے اس قبلہ سے جس پر تھے۔

اعتراض : ظالموں کے شبہات کو حجت نہیں کہا جاتا حجت تو دلیل کو کہا جاتا ہے تو ظالموں کے شبہات کو ﴿ لِئَلَّا یَکُوْنَ لِلنَّاسِ عَلَیْکُمْ حُجَّةٌ ﴾ سے استثناء کرنا کیسے صحیح ہے؟

پہلا جواب : حجت کبھی صحیح ہوتی ہے اور کبھی باطل، جیسا کہ رب تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ حُجَّتُهُمْ دَاحِضَةٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ ﴾ (الشوریٰ ۱۶)

''ان کی دلیل محض بے ثبات (باطل) ہے ان کے رب کے ہاں''

ان کی پہلی حجتیں بھی باطل تھیں اور تحویل قبلہ کے بعد بھی باطل ہی رہیں اس لئے استثناء صحیح ہے۔

دوسرا جواب : جب یہود اور مشرکین نے اپنے شبہات کا نام حجت (دلیل) رکھا تو رب تعالیٰ نے بھی ان کی بیوقوفی کو ظاہر کرنے کے لئے حجت ہی ذکر کر دیا کہ علم و عقل والے لوگ ذرا ان کے دلائل کو دیکھیں تو خود ہی سمجھ جائیں گے کہ وہ کتنے ہی بے وقوف اور جاہل لوگ تھے۔

تیسرا جواب : " اراد بالحجة المحاجة والمجادلة" اس مقام پر حجت کا معنی

جھگڑا کرنا، کج روی، یعنی مطلب یہ ہوا کہ تم جہاں بھی ہو مسجد حرام کی طرف منہ کرلو تاکہ لوگوں کی حجت بازیاں اوران کے مجادلے اور مباحثے ختم ہو جائیں ہاں البتہ ضد اور عناد رکھنے والے پھر حجت بازیاں کرتے ہی رہیں گے۔ (از کبیر)

سبحان اللہ کیا خوب مسئلہ ثابت ہوگیا کہ بلاوجہ حجت بازی، بلاوجہ مجادلہ، بلاوجہ مباحثہ، کج روی کبھی شان صحابہ کی تنقیص، کبھی انبیاء کرام کی شان میں گھٹیا الفاظ کبھی اولیاء کرام پر مشرکین کے حق میں نازل ہونے والی آیات کو چسپاں کرنا، بتوں والی آیات انبیاء کرام اور اولیاء کرام پر چسپاں کرنا، بیوقوفی نادانی ہے اپنے منہ سے اپنے احمق ہونے کا اعلان ہے۔ طلباء کرام اس قسم کے احمقوں سے ہوشیار رہیں کہیں وہ گمراہ تمہیں بھی گمراہ نہ کردیں۔

فَلَا تَخْشَوْهُمْ وَاخْشَوْنِيْ : تو ان سے نہ ڈرو اور مجھ سے ہی ڈرو۔

یعنی یہود ونصاریٰ اور مشرکین کی طعنہ بازی، حجت بازی اور مجادلہ سے اے مومنو نہ ڈرو، وہ تمہیں قبلہ کے معاملہ میں طعنہ دیں یا تمہارے دین میں کسی قسم کا اعتراض کریں تو ان سے نہ ڈرو کیونکہ وہ تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتے۔ ﴿ وَاخْشَوْنِيْ ﴾ اور مجھ سے ڈرو، یعنی جن احکام کو میں نے تم پر لازم کیا ہے اور جو امور تم پر فرض ہیں اگر تم نے ان پر عمل نہ کیا، حکم عدولی کی تو میں تمہیں عذاب دوں گا لہٰذا تم میرے عذاب سے ڈرو۔

اس آیۃ سے یہ فائدہ حاصل ہوا کہ انسان پر واجب ہے کہ وہ اپنے افعال یا ترک افعال میں صرف رب تعالیٰ کی رضاء کو دیکھے اور رب تعالیٰ کے عذاب سے ڈرتا رہے۔

" وان يعلم انه ليس في يد الخلق شئى البتة وان لا يكون مشتغل القلب بهم ولا ملتفت الخاطر اليهم "

''اور انسان کو یہ علم حاصل ہونا چاہئے کہ مخلوق کے ہاتھ میں کچھ نہیں رب کو چھوڑ کر مخلوق کی طرف توجہ کرنا اور رب تعالیٰ سے دور ہو کر مخلوق سے دل لگانا منع ہے۔ (از کبیر)

ہاں البتہ اللہ تعالیٰ کے مقبول بندوں سے محبت کہ یہ رب تعالیٰ کی مخلوق اور رب تعالیٰ کے عبادت گزار ہیں لیکن اسکے مقبول بندے ہیں ان سے محبت در حقیقت رب تعالیٰ سے محبت ہے یہ عقیدہ اور یہ عمل عین ایمان ہے۔

خشیت اور خوف میں فرق:

" الخشية اصلها طمانينة فی القلب تبعث علی التوقی "

خشیت کا اصل معنی دل میں اطمینان ہونا جس کی وجہ سے انسان برائیوں سے بچ سکے

" والخوف فزع القلب تخف له الاعضاء ولخفة الاعضاء سمی خوفا "

دل میں گھبراہٹ کا طاری ہونا جس کی وجہ سے اعضاء پر خفت طاری ہونا خوف ہے۔

(از قرطبی)

مجازی طور پر خشیت کبھی خوف کے معنی میں اور خوف خشیت کے معنی میں استعمال ہوتے رہتے ہیں۔

وَلِأُتِمَّ نِعْمَتِي عَلَيْكُمْ : "تاکہ میں پوری کروں اپنی نعمتیں تم پر"۔

لام کے تعلق میں ایک احتمال یہ ہے کہ اس کا تعلق ﴿ لِئَلَّا يَكُونَ لِلنَّاسِ عَلَيْكُمْ حُجَّةٌ ﴾ سے ہو۔ اس صورت میں مطلب یہ ہوگا کہ تم جہاں کہیں ہو نماز میں منہ قبلہ کی طرف کرو تاکہ لوگوں کی تم پر کوئی حجت نہ رہے اور میں اپنی نعمتیں تم پر مکمل کروں۔ یعنی کعبہ شریف کی طرف منہ کر کے نماز ادا کرنے کی دو حکمتیں بیان فرمادیں ایک یہ کہ لوگوں کی حجت بازیاں ختم ہو جائیں اور دوسری یہ کہ ان پر نعمتوں کی تکمیل ہو جائے۔

لام کے تعلق میں دوسرا احتمال یہ ہے کہ اس کا تعلق محذوف سے ہو معنوی طور پر اسے یوں بیان کیا جائے گا "ولا تمام النعمة عليكم وارادتی اهتداء كم امرتكم بذلك " میں نے تم پر اپنی نعمتیں مکمل کرنے کے لئے اور تمہیں ہدایت دینے کے لئے کعبہ شریف کی طرف منہ کرنے کا حکم دیا۔

تیسرا احتمال اس میں یہ ہے کہ اس کا عطف علۃ مقدرہ پر ہو تقدیر عبارت کی یہ ہو ﴿واخشونی لاوفقكم ولاتم نعمتی علیكم﴾ اور مجھ سے ڈرو کہ میں تمہیں توفیق دوں اور اپنی نعمتیں تم پر مکمل کروں۔

نعمت سے مراد کیا ہے؟

" عن معاذ قال قال رسول الله ﷺ تمام النعمة دخول الجنة والفوز من النار رواه البخاری فی الادب المفرد والترمذی "

" حضرت معاذ رضی اللہ عنہ نے فرمایا رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ تمام نعمت جنت میں

داخل ہونا اور جہنم سے نجات حاصل کرنے میں کامیابی حاصل کرنا ہے''۔

☆ " وعن علی رضی اللہ عنہ اتمام النعمة الموت علی الاسلام "

حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں تمام نعمت اسلام پر موت کا آنا ہے۔ (از مظہری)

☆ " قال سعید بن جبیر ولم تتم نعمة اللہ علی عبد حتی یدخله الجنة "

حضرت سعید بن جبیر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی نعمت اس وقت تک بندے پر مکمل نہیں ہوگی جب تک اسے جنت میں داخل نہیں فرمائے گا۔

☆ "واتمام النعمة الهدایة الی القبلة" اتمام نعمت کا ایک معنی قبلہ کی ہدایت بھی ہے۔ (از قرطبی)

☆ تمام ہی نعمتیں مراد ہیں خواہ وہ وہبی ہوں یا کسبی۔ وھبی نعمتیں جیسے صحت بدن اور سلامتی اعضاء وغیرہ اور کسبی نعمتیں جیسے ایمان اور اعمال صالحہ اوامر کو تسلیم کرنا اور نواہی سے اجتناب کرنا یہ تمام نعمتیں انسان کے لئے سعادت دارین کا ذریعہ ہے۔ (شیخ زادہ) راقم نے اسی وجہ سے ترجمہ ''نعمتیں'' کیا ہے۔

اعتراض : اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ ﷺ کے وصال سے چند دن پہلے اس آیۃ کریمہ کو نازل فرمایا

﴿ اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ ﴾

''آج میں نے مکمل کر دیا ہے تمہارے لئے تمہارے دین کو اور مکمل کر دیا ہے تم پر اپنی نعمتوں کو''

جواب : " اجیب بان اتمام النعمة فی کل وقت بما یلیق به فتدبر "

ہر وقت ہر زمانہ میں جن نعمتوں کی بندوں کو ضرورت رہی اللہ تعالیٰ اپنی مہربانی سے ان کی تکمیل فرماتا رہا قرب وصال دین کی تکمیل فرما کر عظیم نعمت کی تکمیل فرمادی۔ (از روح المعانی)

وَلَعَلَّکُمْ تَھْتَدُوْنَ : ''تاکہ تم ہدایت پر قائم رہو'' جب اس سے آگے الفاظ ﴿ للصراط المستقیم ﴾ ہوں تو مطلب ہوگا ''تاکہ تم سیدھی راہ پر قائم رہو'' کیونکہ صحابہ کرام پہلے ہی ہدایت پر تھے اس لئے راقم نے ترجمہ کیا ''تاکہ تم ہدایت پر قائم رہو'' تاہم اعلیٰ حضرت نے ترجمہ کیا ہے ''اور کسی طرح تم ہدایت پاؤ''۔ اس پر مدارک کی یہ عبارت شاہد ہے ﴿ وَلَعَلَّکُمْ تَھْتَدُوْنَ ﴾ ولکی تھتدوا الی قبلة ابراھیم '' تاکہ ابراہیم علیہ السلام کے قبلہ کی ہدایت پا جاؤ۔

﴿ کَمَآ اَرۡسَلۡنَا فِیۡکُمۡ رَسُوۡلًا مِّنۡکُمۡ یَتۡلُوۡا عَلَیۡکُمۡ اٰیٰتِنَا وَیُزَکِّیۡکُمۡ وَیُعَلِّمُکُمُ الۡکِتٰبَ وَالۡحِکۡمَۃَ وَیُعَلِّمُکُمۡ مَّا لَمۡ تَکُوۡنُوۡا تَعۡلَمُوۡنَ ﴾

۱) ''جیسا ہم نے تم میں بھیجا ایک رسول تم میں سے کہ تم پر ہماری آیتیں تلاوت فرماتا ہے اور تمہیں پاک کرتا اور کتاب اور پختہ علم سکھاتا ہے اور تمہیں وہ تعلیم فرماتا ہے جس کا تمہیں علم نہ تھا''۔

۲) ''جیسا ہم نے بھیجا تم میں رسول تم میں سے، تلاوت فرماتا ہے تم پر ہماری آیتیں اور تمہیں پاک کرتا ہے اور سکھاتا ہے تمہیں کتاب اور حکمت اور سکھاتا ہے تمہیں وہ جو تم نہیں جانتے تھے''۔

کَمَآ اَرۡسَلۡنَا فِیۡکُمۡ رَسُوۡلًا مِّنۡکُمۡ : جیسا ہم نے بھیجا تم میں رسول تم میں سے

''کاف'' کا تعلق ماقبل سے ہے یا مابعد سے، جتنے احتمال ''کاف'' کے تعلق میں ہوں گے وہ تمام ہی اس کے مطالب ہوں گے۔

(۱) ایک مطلب یہ ہے کہ اس کا تعلق ﴿ وَلِاُتِمَّ نِعۡمَتِیۡ ﴾ سے ہو۔ مطلب یہ ہو کہ میں اپنی نعمتیں دنیا میں تم پر پوری کروں کہ تمہیں شرافت حاصل ہو۔ اور آخرت میں تمہیں بہت بڑا ثواب عطاء کر کے کامیابی سے سرفراز کروں ''**کما اتممتها علیکم فی الدنیا بارسال الرسول**'' جیسا کہ میں نے تم پر دنیا میں رسول بھیج کر اپنی نعمتوں کی تکمیل کی۔

(۲) ابراہیم علیہ السلام نے دعاء کی ﴿ رَبَّنَا وَابۡعَثۡ فِیۡهِمۡ رَسُوۡلًا مِّنۡهُمۡ یَتۡلُوۡا عَلَیۡهِمۡ اٰیٰتِکَ وَیُزَکِّیۡهِمۡ ﴾ ''اے ہمارے رب مبعوث فرما ان میں رسول ان میں سے جو ان پر تلاوت کرے تیری آیات اور ان کا تزکیہ کرے اور ساتھ یہ دعاء بھی کی ﴿ وَمِنۡ ذُرِّیَّتِنَآ اُمَّۃً مُّسۡلِمَۃً لَّکَ وَاَرِنَا مَنَاسِکَنَا ﴾ اور ہماری اولاد سے ایک گروہ کو اپنا مطیع بنا اور ہمیں دکھا عبادت کے طریقے۔

اب مطلب یہ ہوگا کہ ''میں تم پر شریعت کے احکام کے بیان سے اور دین کی تمہیں ہدایت دے کر اپنی نعمتوں کی تکمیل کروں کہ ابراہیم علیہ السلام کی دعاء میں کامل طور پر قبولیت ہو جائے جیسا کہ میں ''تم میں اپنے رسول کو بھیج کر ان کی دعاء کو قبول کر چکا ہوں۔ گویا کہ اس آیہ کریمہ میں ابراہیم علیہ السلام

کی دعاء کی قبولیت کو واضح طور پر بیان کر دیا گیا۔

(۳) اس کا تعلق ﴿ وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا ﴾ سے ہو جائے۔ اب مطلب یہ ہوگا کہ جس طرح ہم نے تم میں باکمال رسول کو مبعوث فرمایا اسی طرح تمہیں باکمال امت بنایا۔ جس طرح ہم نے تم میں بہت بڑی شان والے رسول کو بھیجا اسی طرح ہم نے تمہیں بہت شان والی امت بنایا اور جس طرح تم میں ہم نے بہت صفات والے عظیم منصب والے رسول کو مبعوث فرمایا اسی طرح ہم نے تمہیں کامل صفات والی امت بنایا۔

(۴) یا اس کا تعلق مابعد سے ہو یعنی ﴿ فَاذْكُرُوْنِیْٓ اَذْكُرْكُمْ ﴾ سے اب اس صورت میں مطلب یہ ہوگا کہ تم کتاب کو نہیں جانتے تھے اور نہ ہی تم رسول کو جانتے تھے اور محمد ﷺ تم میں سے ہی ہیں جن کے پاس کوئی کتاب نہیں تھی۔ پھر انہوں نے تم پر وہ کتاب پیش کی جو " اعجب الآیات " (عجیب آیات والی) ہے وہ تم پر تمہاری زبان میں ہی تلاوت کرتے ہیں اور اس میں ان چیزوں کا ذکر ہے جن کا پہلی آسمانی کتابوں میں ذکر ہے اور اس کتاب میں پہلے انبیاء کرام کا ذکر موجود ہے اور رب تعالیٰ کی وحدانیت پر دلائل موجود ہیں اور قیامت کا ذکر اس میں ہے اور اخلاق شریفہ پر اس میں متنبہ کیا گیا ہے اور بے وقوفوں کے اخلاق سے اس میں منع کیا گیا ہے یہ تمام نبی کریم ﷺ کی صداقت پر دلائل ہیں۔ تو گویا کہ رب تعالیٰ نے یہ فرمایا کہ جس طرح میں نے تمہیں یہ نعمتیں عطاء کی ہیں اور تمہارے لئے یہ دلائل قائم کئے ہیں تو تم مجھے شکر سے یاد کرو میں تمہیں اپنی رحمت اور ثواب سے یاد کروں گا۔ (از کبیر)

فِيْكُمْ : سے مراد عرب ہیں یعنی خطاب عرب حضرات کو ہے "جس طرح ہم نے بھیجا تم میں رسول تم میں سے"

مِنْكُمْ : یعنی وہ رسول محمد ﷺ تم میں سے ہیں اس مقام میں " رسولا " مفعول صریح کو ظرف سے پہلے ذکر کیا تا کہ جلدی فرح وسرور پر دلالت کرے اور "رسول" کی صفات کا ذکر تھا گویا کہ ان میں سے ہونا بھی ایک صفت تھی اس لحاظ پر بھی صفات کو اکٹھا ذکر کیا۔

يَتْلُوْا عَلَيْكُمْ اٰيٰتِنَا : "تلاوت فرماتا ہے تم پر ہماری آیات" یہ رسول اللہ ﷺ کی صفت بیان کی گئی ہے اس میں نبی کریم ﷺ کی نبوت کے ثبوت کی طرف اشارہ ہے:

" لان تلاوة الامی الخارجة عن طوق البشر باعتبار بلاغتها واشتمالها علی الاخبار

بالمغیبات والمصالح التی ینتظم بھا امر المعاد والمعاش اقوی دلیل علی نبوتہ "

کیونکہ وہ نبی جوامی ہیں (جنہوں نے کسی انسان کو اپنا استاذ نہیں بنایا) ان کا ایسی آیات تلاوت کرنا جو بلاغت کے لحاظ سے انسانی طاقت سے خارج ہوں اور غیبی خبروں پر مشتمل ہوں، اور دنیا وآخرت کی مصلحتوں پر مشتمل ہوں یہ آپ کی نبوت پر قوی دلیل ہے۔ (روح المعانی)

قرآن پاک کی تلاوت کرنا نبی کریم ﷺ کا عظیم معجزہ ہے " لانہ معجزۃ باقیۃ " اس وجہ سے کہ آپ کا یہ معجزہ باقی رہنے والا معجزہ ہے۔ " ولانہ یتلی فیتأدی بہ العبادات " کیونکہ قرآن پاک کی تلاوت سے عبادات ادا ہوتی ہیں۔ یعنی قرآن پاک کی تلاوت سے ہی نماز، زکواۃ، حج اور روزہ کی فرضیت کا پتہ چلتا ہے بلکہ ایمان بھی قرآن سے ہی حاصل ہوتا ہے " ولانہ یتلی فیستفاد منہ جمیع العلوم " اور قرآن پاک کی تلاوت سے ہی تمام علوم حاصل ہوتے ہیں۔ کیونکہ علم صرف ہو یا نحو خواہ علم معانی ہو یا بیان ہو یا بدیع، خواہ علم کلام ہو یا تصوف، خواہ فقہ ہو یا اصول فقہ، خواہ علم لغت ہو یا ادب تمام علوم ہی قرآن پاک سے حاصل ہوئے ہیں۔ ان کو پڑھنے کا مقصد ہی یہ ہوتا ہے کہ قرآن پاک سمجھ میں آجائے۔ " ولانہ یتلی فیستفاد منہ مجامع الاخلاق الحمیدۃ " قرآن پاک کی تلاوت سے ہی تمام کے تمام اخلاق حمیدہ حاصل ہوتے ہیں یعنی قرآن پاک نیک اعمال، اچھے اخلاق، بھائی چارہ، اخوت، مروت، عدل واحسان کا سبق دیتا ہے۔

" فکانہ یحصل من تلاوتہ کل خیرات الدنیا والآخرۃ "

گویا کہ قرآن پاک کی تلاوت سے دنیا اور آخرت کی ہر قسم کی بھلائیاں حاصل ہوتی ہیں۔ (از کبیر)

وَيُزَكِّيكُمْ : " اور تمہارا تزکیہ فرماتے ہیں " ای یطھرکم من الشرک " یعنی وہ تمہیں شرک سے پاک کرتے ہیں تلاوت کے بعد تزکیہ کا ذکر کیا کیونکہ یہ بھی آپ کا معجزہ ہے کہ اللہ تعالیٰ جسے توفیق دینے کا ارادہ فرماتا ہے کہ اسے ایمان کی توفیق حاصل ہو جائے اسے آپ کے ذریعے توفیق عطاء کرتا ہے گویا کہ ایک معجزہ کے بعد دوسرے معجزہ کا ذکر ہے۔ (از روح المعانی)

اور مطلب یہ ہے " انہ علیہ الصلوۃ والسلام یعلمھم ما اذا تمسکوا بہ صاروا ازکیاء " بیشک نبی کریم ﷺ تمہیں وہ تعلیم دیتے ہیں جس پر عمل کر کے تم پاکیزہ ہو جاتے ہو۔ یعنی آپ کی تعلیم کے ذریعے وہ لوگ شرک کی نجاست، گناہوں کی نحوست، بداخلاقی کی آلودگی سے پاک ہو گئے۔ اور

مطلب یہ ہے:

" ویزکیکم بالثناء والمدح ای یعلم ما انتم علیه من محاسن الاخلاق فیصفکم به "

کہ وہ مدح اور ثناء کے ذریعے تمہارا تزکیہ فرماتے ہیں یعنی تمہیں محاسن اخلاق سکھائے، جن پر عمل کرنے کی وجہ سے تم قابل تعریف ہوئے خود نبی کریم ﷺ نے بھی اپنے صحابہ کرام کی تعریف کی اور جہاں میں بھی وہ قابل تعریف ہوئے سبحان اللہ تعلیمات مصطفویہ کے اثرات تا قیامت جگمگاتے رہیں گے۔

اور مطلب یہ ہے " ان التزکیة عبارة عن التنمیة " یعنی تزکیہ کا معنی بڑھانا بھی آتا ہے اب مطلب یہ ہوگا کہ وہ تمہیں بڑھاتا ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ﴿ اِذْ کُنْتُمْ قَلِیْلًا فَکَثَّرَکُمْ ﴾ "جب تم قلیل تھے تو اللہ تعالیٰ نے تمہیں کثیر کیا"۔ یعنی وہ رسول تمہیں حق پر جمع کرتے ہیں تمہیں ایک دوسرے کے ساتھ مل کر رہنے اور بھائی بھائی بن کر رہنے کی تعلیم دیتے ہیں جو تمہارے روز بروز بڑھنے کا ذریعہ ہے۔

" وھذہ الوجوہ غیر متنافیة فلعله تعالیٰ یفعل بالمطیع کل ذلک "

اور یہ تمام وجوہ متنافی نہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ اپنے مطیع لوگوں کو ان تمام نعمتوں سے نوازتا ہے۔

(از کبیر)

وَیُعَلِّمُکُمُ الْکِتَابَ وَالْحِکْمَةَ : "اور سکھاتا ہے تمہیں کتاب اور حکمت"

پہلے ﴿یَتْلُوْا عَلَیْکُمْ اٰیَاتِنَا﴾ ذکر کیا ہے لیکن تکرار نہیں اس لئے اس میں آیات کی تلاوت کا ذکر ہے یعنی صرف آیات کا سنانا اور ﴿ وَیُعَلِّمُکُمُ الْکِتَابَ وَالْحِکْمَةَ ﴾ میں اللہ کی کتاب کی تعلیم کا ذکر ہے "والحکمة" سے مراد " العلم بسائر الشریعة التی یشتمل القرآن علی تفصیلها " تمام شرعی مسائل کا علم جن کی تفصیل پر قرآن پاک مشتمل ہے۔

اسی لئے امام شافعی رحمہ اللہ نے فرمایا

"الحکمة ھی سنة الرسول ﷺ" حکمت رسول اللہ ﷺ کی سنت کو کہا جاتا ہے۔ (از کبیر)

تعلیم کتاب اللہ اور اس میں پائے جانے والے اسرار ربانیہ اور کتاب اللہ میں حکمت الٰھیہ کو مؤخر ذکر کیا اور تزکیہ کا ذکر پہلے کیا اس لئے کہ شرک کی میل سے پاک ہونا، اور شک کی نجاست سے پاک ہونا پہلے ضروری ہے اس کے بعد ہی انسان کتاب اللہ کے احکام کی تابعداری کرتا ہے جو پاکیزگی کا سبب بنتا ہے " وما قبل ذلک فالکفر حجاب " لیکن اس سے پہلے کفر حجاب ہے جس کی وجہ سے

انسان کتاب اللہ کی اطاعت سے دور رہتا ہے لہٰذا وہ شرک کی نجاست میں مبتلاء رہتا ہے۔

نکتہ : حضرت ابراھیم علیہ السلام کی دعاء میں تزکیہ کا ذکر بعد میں ہے اور تعلیم کا ذکر پہلے اسلئے کہ تزکیہ کا مطلب یہ ہے کہ قوۃ عملیہ کے لحاظ سے تکمیل نفس اور قوۃ نظریہ کے لحاظ سے تکمیل تہذیب۔

● تزکیہ ہر لحاظ سے ایک عظیم نعمت ہے تزکیہ پہلے ہو تعلیم زیادہ اثر انداز ہو یا تعلیم کے بعد کامل طور پر تزکیہ پایا جائے ویسے اسے علۃ غائیہ کی حیثیت بھی حاصل ہے جو تصور کے لحاظ سے پہلے ہوتی ہے اور وجود کے لحاظ پر بعد میں اس لئے ایک مقام پر مقدم ذکر کر دیا اور دوسرے مقام پر مؤخر۔ (از روح المعانی)

وَيُعَلِّمُكُم مَّا لَمْ تَكُونُوا تَعْلَمُونَ : ''اور سکھاتا ہے تمہیں جو تم نہیں جانتے تھے''

یعنی تمہیں ہر وہ چیز سکھاتے ہیں جو تم نہیں جانتے تھے اور وہ وحی کے بغیر حاصل بھی نہیں ہوسکتیں اس میں اس مسئلہ پر تنبیہ پائی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ ﷺ کو اس زمانہ میں مبعوث فرمایا جسے '' فترۃ'' کا زمانہ کہا جاتا ہے یعنی رسولوں کی آمد منقطع تھی اور امتیں جہالت میں مبتلاء تھیں، مخلوق متحیر (حیران) تھی اور دین کے معاملہ میں وہ بھٹکے ہوئے تھے۔'' فبعث اللہ تعالٰی محمدا بالحق حتی علمهم ما احتاجوا الیہ فی دینهم وذلک من اعظم النعم '' تو اللہ تعالیٰ نے محمد ﷺ کو حق سے مبعوث فرمایا یہاں تک کہ لوگ دین میں جن چیزوں کے محتاج تھے انکی آپ نے ان لوگوں کو تعلیم دی۔ نبی کریم ﷺ کا تشریف لانا اور تعلیم دینا لوگوں کے لئے سب نعمتوں سے عظیم نعمت تھی۔ (از کبیر و روح المعانی)

فائدہ جلیلہ : '' تکرار الفعل یدل علی ان هذا التعلیم من جنس آخر ولعل المراد بہ العلم اللدنی الماخوذ من بطون القرآن ومن مشکوۃ صدر النبی ﷺ الذی لا سبیل الی درکہ الا الانعکاس ''

یعنی فعل دو مرتبہ (وَيُعَلِّمُكُم) ذکر کیا جو اس بات پر دلالت کر رہا ہے کہ پہلی تعلیم ظاہری ہے اور دوسری تعلیم بنسبت پہلی کے علیحدہ ہے شائد اس سے مراد علم لدنی ہو جو قرآن پاک کے باطنی معانی سے اور مصطفیٰ کریم ﷺ کے سینہ مبارک کے علوم سے حاصل ہوتا ہے۔ اس علم لدنی کا ادراک ظاہر سے نہیں ہوسکتا صرف قرآن پاک کے انوار اور مصطفیٰ کریم ﷺ کے باطنی علوم کے انوار کی شعاؤں سے حاصل ہوسکتا ہے '' واما درک درکہ فبعید عن القیاس '' اس علم کے ادراک کا تصور بھی قیاس سے بعید ہے۔

رئیس الصدیقین حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں '' العجز عن درک

الادراک ادراک "ادراک کے درک سے عاجز ہونے کا نام بھی ادراک ہے۔ یعنی جب یہ معلوم ہو کہ علم لدنی کو عام طریقہ سے حاصل کرنا ممکن نہیں تو یہ بھی ایک علم ہے۔

☆ حضرت حنظلہ بن ربیع اسیدی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں مجھے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ ملے تو آپ نے مجھ سے پوچھا اے حنظلہ تمہارا کیا حال ہے؟ میں نے کہا " نافق حنظلة " حنظلہ تو منافق ہوگیا۔ آپ نے فرمایا سبحان اللہ یہ تم کیا کہہ رہے ہو:

" قلت نکون عند رسول الله ﷺ یذکرنا بالنار والجنة کانا رأی عین فاذا خرجنا من عند رسول الله ﷺ عافسنا الازواج والاولاد والضیعات نسینا کثیرا "

میں نے کہا ہم رسول اللہ ﷺ کے پاس ہوتے ہیں تو آپ ہمارے سامنے جنت ودوزخ کا ذکر کرتے ہیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ ہمارے سامنے ہیں جب ہم نبی کریم ﷺ سے نکل کر اپنی بیبیوں اولاد اور مال وغیرہ میں مشغول ہوتے ہیں تو ہم بہت کچھ بھول جاتے ہیں۔

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے فرمایا حال تو ہمارا بھی اسی طرح ہے آپ کہتے ہیں میں اور ابوبکر چلے یہاں تک کہ نبی کریم ﷺ کے پاس گئے میں نے نبی کریم ﷺ کی خدمت میں عرض کیا " نافق حنظلة یا رسول الله " یارسول اللہ حنظلہ منافق ہوگیا۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا " وما ذاک " یہ کیا؟ (کہہ رہے ہو) میں نے عرض کیا یارسول اللہ ہم آپ کے پاس ہوتے ہیں تو آپ جنت ودوزخ کا ذکر کرتے ہیں تو ہم یہی سمجھتے ہیں کہ ہم جنت ودوزخ کو اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں لیکن جب آپ (کی محفل) سے نکلتے ہیں اور اپنی بیبیوں اور اولاد اور مال وغیرہ میں مشغول ہو جاتے ہیں تو بہت کچھ بھول جاتے ہیں۔

" فقال رسول الله ﷺ والذی نفسی بیده لو تدومون علی ما تکونون عندی وفی الذکر لصافحتکم الملائکة علی فرشکم وفی طرقکم ولکن یا حنظلة ساعة وساعة ثلث مرات "
(رواہ مسلم)

تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہء قدرت میں میری جان ہے اگر تم ہمیشہ اس حال پر رہو جو تمہیں میرے پاس ذکر کے وقت حاصل ہوتا ہے تو فرشتے تمہارے بستروں پر

آ کر تمہارے ساتھ مصافحہ کریں اور راستے میں تمہیں آ کر ملیں لیکن اے حنظلہ یہ وقت وقت کی بات ہے تین مرتبہ آپ نے یہ ارشاد فرمایا۔

نبی کریم ﷺ نے گویا کہ اس طرف اشارہ فرمادیا کہ میرے پاس بھی یہ کیفیت کبھی کبھی تمہیں حاصل ہوتی ہے جب کہ خصوصی توجہ اور علم لدنی کی تعلیم جاری ہوتی ہے۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کا ارشاد گرامی اور زیادہ اس مضمون کو واضح کر رہا ہے۔

" عن ابی ھریرۃ قال حفظت رسول اللہ ﷺ وعائین فاما احدھما فبثثتہ فیکم واما الآخر فلو بثثتہ لقطع ھذا البلعوم یعنی مجری العطام " (رواہ البخاری)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں میں نے رسول اللہ ﷺ سے (علم کے) دوخزانے حاصل کئے ہیں۔ ایک میں نے تم پر پھیلا دیا (ظاہر کر دیا) ہے اور اگر میں دوسرا تم پر ظاہر کر دوں تو میری رگِ طعام کٹ جائے۔

اس سے مراد بھی وہ خصوصی باطنی علم لدنی ہے جسے عام لوگوں پر ظاہر کرنا منع تھا وہ کیا علوم آپ نے حاصل کئے وہ تو عطاء کرنے والے جانیں یا حاصل کرنے والے جانیں ان دو ہستیوں کے بغیر صرف اللہ تعالیٰ جانتا ہے۔ تاہم ان علوم میں سے غیبی علوم بھی ہو سکتے ہیں۔

اس کی ایک مثال دیکھئے۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ یزید کی حکومت کی طرف اشارہ کر کے فرماتے " اعوذ باللہ من رأس الستین وامارۃ الصبیان " میں اللہ کی پناہ مانگتا ہوں ساٹھ سال کے اختتام اور کم عمر لوگوں کی حکومت سے۔

ساٹھویں ہجری کے اختتام پر سینتیس سال کی عمر میں یزید پلید قانون کی دھجیاں بکھیر کر غاصبانہ انداز پر برسر اقتدار آ گیا جس کے بھیانک دور کو حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے پہلے ہی بھانپ لیا۔ یہ ان خصوصی علوم کا ہی ایک حصہ ہے سبحان اللہ لوگ مصطفیٰ کریم ﷺ کے علم میں شک کرتے ہیں کتنے نادان ہیں جن کو یہ پتہ ہی نہیں کہ آپ نے تو اپنے صحابہ کو بھی غیبی علوم عطاء فرما دیئے۔ (از مظہری)

☆☆☆☆☆

﴿ فَاذْكُرُوْنِیْ اَذْكُرْكُمْ وَاشْكُرُوْا لِیْ وَلَا تَكْفُرُوْنِ ﴾

۱) ''تو میری یاد کرو میں تمہارا چرچا کروں گا اور میرا حق مانو اور میری ناشکری نہ کرو۔

۲) تو یاد کرو تم مجھے میں یاد کروں گا تمہیں اور تم شکریہ ادا کرو میرا اور میری ناشکری نہ کرو۔

فَاذْكُرُوْنِیْ اَذْكُرْكُمْ: " فاء " ماقبل سے رابطہ کے لئے ہے جیسا کہ ﴿ كَمَا اَرْسَلْنَا ﴾ میں ایک قول پہلے بیان کیا جاچکا ہے۔

" الذکر " (بکسر الذال) یاد کرنا، ذکر کرنا شہرت کہتے ہیں۔ "له ذکر فی الناس "اس کی لوگوں میں شہرت ہے۔

" الذکر " (بضم الذال) یاد رکھنا (المنجد) دل سے یاد کرنا بھی اس کا معنی آتا رہتا ہے۔

ذکر کی تین قسمیں: زبان سے ذکر کرنا، دل سے ذکر کرنا، اعضاء سے ذکر کرنا۔

ذکر باللسان :" فذکرهم اياه باللسان ان يحمدوه ويسبحوه ويمجدوه ويقرؤا كتابه "

مومنوں کا رب تعالیٰ کو زبان سے ذکر کرنے کا مطلب یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی حمد بیان کریں اور رب تعالیٰ کی تسبیحات بیان کریں اور اس کی بزرگی کا ذکر کریں اور اس کی کتاب (قرآن پاک) کی تلاوت کریں۔

ذکر بالقلب : دل سے ذکر کرنے کی پھر تین قسمیں ہیں:

(۱) ان دلائل میں فکر کریں جو اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات پر دلالت کریں اگر ان دلائل پر کوئی اعتراض وارد ہونے کا گمان ہو تو اس کے جواب کو سوچیں۔

(۲) ان دلائل میں فکر کریں جو انسان کو مکلف بنانے کی تکالیف کی کیفیت پر دلالت کرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کے احکام، اوامر اور نواہی اور وعدہ وعید پر دلالت کرتے ہوں۔

" فاذا عرفوا كيفية التكليف وعرفوا ما فى الفعل من الوعد وفى الترک من الوعيد سهل فعله عليهم "

جب کیفیت تکلیف کا انہیں علم حاصل ہو جائے گا اور رب تعالیٰ کے اوامر کے مطابق عمل کرنے پر اس کی طرف سے ثواب کے وعدہ کو جان لیں گے اور رب تعالیٰ کی نواہی سے اجتناب نہ کرنے پر اس کی طرف سے سزا کی وعید کا جب پتہ چل جائے گا تو ان لوگوں پر عمل کرنا آسان ہوگا۔

(۳) اللہ تعالیٰ کی مخلوقات کے اسرار میں تفکر کرے یہاں تک کہ مخلوقات کے ذرات میں سے ہر ذرہ اس پر ایسے روشن ہو جائے جیسے کہ صاف وشفاف آئینہ کو عالم قدس کے مقابل رکھ دیا جائے۔

" فاذا نظر العبد الیها انعکس شعاع بصره منها الی عالم الجلال وهذا المقام مقام لا نهایة له "

جب بندہ مخلوقات کے ذرات میں تفکر کرتا ہے تو اس کی نظر کا عکس عالم جلال کا علم اسے عطاء کرتا ہے اس منزل کی کوئی انتہاء نہیں۔ تفکر کرنے والوں کے مدارج کے لحاظ سے ان کے علم ذات باری تعالیٰ میں بھی اسی قسم کے مدارج ہوتے ہیں۔

ذکر بالجوارح : اعضاء سے ذکر کرنے کا مطلب یہ ہے " تکون جوارحهم مستغرقة فی الاعمال التی امروا بها وخالیة عن الاعمال التی نهوا عنها " کہ ان کے اعضاء ان اعمال میں مستغرق ہوں جن کا ان کو حکم دیا گیا ہے اور ان اعمال سے اعضاء کو دور رکھیں جن سے ان کو منع کیا گیا ہے۔ (از کبیر)

نماز تینوں ذکروں کا مجموعہ: رب تعالیٰ نے فرمایا: ﴿فَاسْعَوْا اِلٰی ذِکْرِ اللّٰهِ﴾ تو اللہ کے ذکر کی طرف دوڑو۔ اس مقام میں "ذکر" سے مراد نماز جمعہ ہے۔

جلالین میں مذکور ہے (فاذکرونی) بالصلوة والتسبیح ونحوه " تم مجھے نماز اور تسبیح وغیرہ سے یاد کرو۔ اس پر صاوی میں ہے:

" ونحوه کالتهلیل والتحمید وانما قال بالصلوة لان الذکر اما باللسان او بالجوارح او بالجنان ولا شک ان الصلوة جامعة لکل ذکر فالقراءة والتکبیر والتسبیح والدعاء ذکر لسانی والرکوع والسجود ذکر بالجوارح والخشوع والخضوع والمراقبة ذکر قلبی "

" ونحوه " سے مفسر رحمہ اللہ کا مطلب تہلیل وتحمید ہے مفسر رحمہ اللہ نے ذکر بالصلوة بیان کیا

ہے کیونکہ ذکر کی تین قسمیں ہیں، زبان سے ذکر، اعضاء سے ذکر اور دل سے ذکر۔ بلا شک وشبہ نماز ہر قسم کے ذکر پر مشتمل ہے کیونکہ نماز میں قراءت اور تکبیر اور تسبیح اور دعاء زبان کا ذکر ہے اور رکوع وسجود اعضاء کا ذکر ہے اور خشوع وخضوع اور مراقبہ دل کا ذکر ہے۔ (ماخوذ از کبیر، جلالین، صاوی)

سب سے اعلیٰ ذکر: " وقال اهل الحقيقة حقيقة ذكر الله تعالىٰ ان ينسى كل شئى سواه " اہل حقیقت کے نزدیک اللہ تعالیٰ کا حقیقی ذکر یہ ہے کہ اللہ کے سوا ہر چیز کو بھول جائے (روح المعانی) یعنی ہر وقت توجہ کا مرکز صرف اللہ تعالیٰ کی ذات ہو۔ مقصد عظیم اللہ تعالیٰ کی رضاء کا حصول ہو اور تقرب الٰہی مقصود ہو اس مقصد میں کامیابی پر جنت کا حصول اور جہنم سے بچاؤ خود بخود حاصل ہوں گے۔

جمیع اذکار پر مشتمل ذکر: " روى عن سعيد بن جبير انه قال اذكروني بطاعتي " حضرت سعید بن جبیر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رب تعالیٰ کے ارشاد ﴿ اذكروني ﴾ "تم مجھے یاد کرو" کا مطلب یہ ہے کہ تم میری طاعت کرو۔

" فصار الامر بقوله (اذكروني) متضمنا جميع الطاعات " لہٰذا ﴿ اذكرُونيْ ﴾ کا حکم تمام طاعات کو مشتمل ہے یعنی رب تعالیٰ کے اس ارشاد کا مطلب یہ ہے کہ تم میری ہر قسم کی طاعت کرو۔ ہر طاعت جب ذکر میں آ گئی تو ذکر بمعنی طاعت کے لینا تمام اذکار پر مشتمل ہو گیا۔ (ماخوذ از کبیر)

اَذْكُرْكُمْ : امر کے جواب میں مضارع واقع ہے اس لئے مجزوم ہے ﴿ اَذْكُرْكُمْ ﴾ کا مطلب بیان کرتے ہوئے علامہ آلوسی رحمہ اللہ فرماتے ہیں " اجازكم بالثواب وعبر عن ذلك للمشاكلة ولانه نتيجته ومنشأه " میں تمہیں ثواب عطاء کر کے جزاء دوں گا ذکر کی جزاء کو مشاکلت کے طور پر ذکر سے تعبیر کر دیا کیونکہ درحقیقت جزاء خیر ہی ذکر کا نتیجہ اور منشاء ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے حدیث قدسی بیان فرمائی " من ذكرني في نفسه ذكرته في نفسي ومن ذكرني في ملأ ذكرته في ملأ خير من ملائه " اللہ تعالیٰ فرماتا ہے جو مجھے دل میں یاد کرے میں اسے دل میں یاد کرتا ہوں اور جو مجھے اشراف کی جماعت میں یاد کرے میں اس سے بہتر اشراف کی جماعت میں اسے یاد کروں گا " الملأ بالقصر الجماعة الاشراف " الملاء (بالقصر) ایسی جماعت کو کہتے ہیں جو اشراف پر مشتمل ہو۔

اعتراض : نبی کریم ﷺ کی محفل میں صحابہ کرام رب تعالیٰ کا ذکر کرتے رہے اس سے بہتر اور اشرف کون سی محفل ہو سکتی ہے؟

پہلا جواب : " ان الشئی یشرف بما نسب الیه فان المجلس ینسب لکبیره وفرق بین حضرة الله وملائکته وبین حضرة النبی واصحابه "

کسی چیز کو شرافت جو نسبت کی وجہ سے حاصل ہوتی ہے وہ منسوب الیہ (جس کی طرف نسبت ہو) کی وجہ سے حاصل ہوتی ہے جس مجلس کی نسبت کبیر ذات کی طرف ہو وہ مجلس بھی اعلیٰ ہوگی اس لئے فرق واضح ہے کہ جس محفل میں رب تعالیٰ کے حضور ملائکہ ہوں گے وہ اعلیٰ ہوگی کیونکہ اس کی نسبت رب تعالیٰ کی طرف ہے اس محفل سے یقیناً اس محفل کا درجہ کم ہوگا جو نبی کریم ﷺ کے پاس صحابہ کرام کا حاضر ہونا ہے۔

دوسرا جواب، عظیم جواب:

" کون النبی ﷺ فی حضرة الله اشرف من نفسه فی حضرة اصحابه فمعنی قوله خیر من ملئه ذکرته فی حضرة النبی والملائکة المقربین فی الملأ الاعلی "

نبی کریم ﷺ کا رب تعالیٰ کے حضور ہونا اشرف اور اعلیٰ ہے بنسبت نبی کریم ﷺ کے محفل میں صحابہ کرام کے ہونے کے رب تعالیٰ کے ارشاد کا مطلب یہ ہے کہ میں اس شخص کو بہتر مجلس میں یاد کروں گا جس میں نبی کریم ﷺ اور ملائکہ مقربین ہوں گے سبحان اللہ وہ کیسی عظیم محفل ہوگی جو رب تعالیٰ کے حضور ہوگی اور اس میں سید الانبیاء بھی موجود ہوں گے اور ملائکہ مقربین بھی ہوں گے۔ اللہ کا ذکر کرنے والا کتنا خوش قسمت ہوگا جس کا ذکر اس عظیم محفل میں ہوگا۔ (ماخوذ از صاوی)

" وقیل معنی اذکرونی تذللوا لجلالی اذکرکم اکشف الحجب عنکم وافیض علیکم رحمتی واحسانی واحبکم وارفع ذکرکم فی الملأ الاعلی "

اور معنی یہ ذکر کیا گیا ہے کہ گویا کہ رب تعالیٰ نے فرمایا تم مجھے یاد کرو کہ میرے جلال کے سامنے اپنے عجز کا اظہار کرو میں تمہیں یاد کروں گا کہ تم سے حجابات کو اٹھا دوں گا، اور تم پر اپنے احسان اور رحمت کا فیضان کروں گا اور تم سے محبت کروں گا اور ملأ اعلیٰ (ملائکہ کی جماعت) میں

تمہارا ذکر بلند کروں گا۔ (صاوی)

اعلیٰ حضرت کا ترجمہ اسی ﴿ ارفع ذکرکم ﴾ ''میں تمہارا چرچا کروں گا'' کا ہے کیا خوب نظر تفاسیر پر تھی۔

اللہ تعالیٰ کا ذکر زیادہ سے زیادہ کرے:

رب تعالیٰ کا ارشاد گرامی ہے " والذاکرین اللہ کثیرا والذاکرات اعد اللہ لهم مغفرة واجرا عظیما " اللہ تعالیٰ کا زیادہ ذکر کرنے والے مردوں اور عورتوں کے لئے اللہ نے مغفرت اور اجر عظیم تیار کر رکھا ہے۔

کسی ملامت کرنے والے کی ملامت سے خوف نہ کرے:

یا مبتغی طرق اهل اللہ والتسلیک دع عنک اهل الهوی تسلم عن التشکیک

اللہ تعالیٰ کی راہ تلاش کرنے والے اور راہ سلوک اختیار کرنے والے خواہشات پر چلنے والے اور شک ڈالنے والوں کی کوئی پرواہ نہ کر۔

اس راہ میں بڑی دشواریاں ہیں۔ لوگ مجنون بھی کہتے ہیں، طرح طرح کی بیہودہ گفتگو اہل اللہ کے بارے میں اوباش لوگ کرتے ہیں، جو شخص ان پر غصہ کرے دل تنگی اختیار کرے وہ اس راہ میں کامیاب نہیں ہوسکتا۔ صابر وشاکر شخص ہی اس راہ میں کامیاب ہوسکتا ہے۔ (از صاوی)

دل حاضر نہ ہوتو پھر بھی زبان سے ذکر نہ چھوڑے:

شیخ عارف احمد صاوی رحمہ اللہ کیا خوب فرماتے ہیں " ولا تترک الذکر لعدم حضورک مع اللہ فیه فر بما ذکر مع الغفلة یجر لذکر مع حضور "

اگر انسان کو ذکر کرتے وقت اللہ تعالیٰ کے ہاں حضور قلب حاصل نہ ہو اور غفلت کے ساتھ صرف زبانی ذکر کرے تو پھر بھی اللہ تعالیٰ کے ذکر کو نہ چھوڑے، کیونکہ بسا اوقات غفلت سے کئے ہوئے ذکر کی برکتوں سے انسان کو حضور قلب حاصل ہو جاتا ہے۔

زبان سے کئے ہوئے ذکر کی مثال چقماق کی ہے جس طرح چقماق کو ایک مرتبہ ماریں تو صرف چمک پیدا ہوتی ہے اس سے آگ نہیں سلگائی جاتی، لیکن رگڑتے رہیں تو اس سے آگ سلگائی جاسکتی ہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ کا ذکر زبان سے کرتے رہیں اگر ابتدائی طور پر حضور قلب حاصل نہیں ہوگا تو آخر کچھ دیر کے بعد حضور قلب حاصل ہوگا، جس سے تمام اعضاء روشن ہو جائیں گے۔

" فلا یقدر الشیطان علی وسوسته " تو شیطان اسے وسوسہ نہیں ڈال سکے گا۔ اللہ تعالیٰ کا ارشادِ گرامی ہے:

﴿ اِنَّ الَّذِیْنَ اتَّقَوْا اِذَا مَسَّهُمْ طَآئِفٌ مِّنَ الشَّیْطٰنِ تَذَكَّرُوْا ﴾ (الاعراف ۲۰۱)

''بیشک وہ لوگ جو ڈر رکھتے ہیں جب ان کو شیطانی خیال کی ٹھیس پہنچتی ہے تو وہ ذکر کرتے ہیں''۔

اللہ کے ذکر سے انسان پر اللہ تعالیٰ کی عبادت آسان ہو جاتی ہے اسے کوئی تکلیف محسوس نہیں ہوتی کسی عارف باللہ نے کیا خوب کہا:

اذا رفع الحجاب فلا ملاله   بتکلیف الا له ولا مشقة

جب حجابات اٹھ جاتے ہیں تو نہ کوئی ملال ہوتا ہے اللہ کی طرف سے دی ہوئی تکلیف پر اور نہ کوئی مشقت (ماخوذ از صاوی)

☆ " وسئل ابو عثمان فقیل له نذکر الله ولا نجد فی قلوبنا حلاوة ، فقال احمدوا الله تعالیٰ علی ان زین جارحة من جوارِ حکم بطاعته "

ابو عثمان رحمہ اللہ کی خدمت میں کچھ لوگوں نے ذکر کیا کہ ہم اللہ تعالیٰ کا ذکر کرتے ہیں لیکن اپنے دلوں میں اس کی حلاوت نہیں پاتے تو آپ نے فرمایا تم اللہ کی حمد بیان کرو، ذات باری تعالیٰ کا شکر ادا کرو جس نے تمہارے اعضاء میں سے ایک عضو (زبان) کو تو اپنی طاعت میں مزین کر رکھا ہے۔ (از قرطبی)

سبحان اللہ بزرگان دین کی کیا تعلیمات تھیں کہ وہ یہ نہیں فرماتے تھے کہ اگر ذکر سے حضور قلب حاصل نہیں تو اللہ کا ذکر ہی چھوڑ دو، بلکہ وہ فرماتے تھے یہ بھی مقام شکر ہے کہ رب تعالیٰ نے تمہاری زبان کو اپنی طاعت سے زینت عطاء کر رکھی ہے۔ ذکر کرتے رہو ایک دن وہ بھی آئے گا جب تمہیں حضور قلب کی عظیم نعمت سے نواز دیا جائے گا۔ ہاں جب یہ کیفیت حاصل ہو جاتی ہے اس کے بعد ہی

صوفیاء کرام فرماتے ہیں " قال رابگذار بندۂ حال شو " قال کو چھوڑ کر حال کو اختیار کر۔

علامہ رازی رحمہ اللہ کا خوبصورت بیان:

آپ فرماتے ہیں ﴿ فَاذْكُرُوْنِیْ اَذْكُرْكُمْ ﴾ کے بیان میں مفسرین کرام نے مختلف عبارات پیش کی ہیں یقیناً ان کو دیکھنے سے عظمت قرآن سمجھ آئے گی کہ ایک جملہ میں معانی و مطالب کا کس قدر دریا موجزن ہے۔

" اذکرونی بطاعتی اذکرکم برحمتی " تم مجھے میری طاعت سے یاد کرو میں تمہیں اپنی رحمت سے یاد کروں گا۔

" اذکرونی بالدعاء اذکرکم بالاجابة والاحسان " تم مجھے دعاء سے یاد کرو میں دعاء کو قبول کرنے اور احسان سے تمہیں یاد کروں گا۔

اس کا مطلب تقریباً یہ ہو گیا " ادعونی استجب لکم " تو مجھ سے دعاء کرو تو میں تمہاری دعاء کو قبول کروں گا۔ ابو مسلم رحمہ اللہ فرماتے ہیں۔

امر الخلق بأن یذکروہ راغبین راھبین وراجین خائفین ویخلصوا
الذکر له عن الشرکاء فاذا ھم ذکروہ بالاخلاص فی عبادته وربوبیته
وذکرھم بالاحسان والرحمة والنعمة فی العاجلة والآجلة "

کہ اللہ تعالیٰ نے گویا کہ حکم دیا ہے مخلوق کو کہ وہ اس کا ذکر کریں اس کی طرف رغبت کرتے ہوئے اور اس سے ڈرتے ہوئے اور اس کی رحمت کی طرف امید کرتے ہوئے اور اس کے عذاب سے ڈرتے ہوئے، اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہراتے ہوئے خلوص سے اس کا ذکر کریں۔ جب لوگ اللہ تعالیٰ کی عبادت کرتے ہوئے، اس کی ربوبیت کو مانتے ہوئے خلوص سے اس کا ذکر کریں گے تو وہ ان کو احسان اور رحمت سے یاد کرے گا اور وہ ان کو دنیا اور آخرت میں نعمتیں عطاء کر کے یاد کرے گا۔

" اذکرونی بالثناء والطاعة اذکرکم بالثناء والنعمة "

تم مجھے یاد کرو میری حمد و ثناء بیان کر کے اور میری طاعت کر کے، میں تمہیں یاد کروں گا تمہاری

تعریف کر کے اور تمہیں نعمتیں عطاء کر کے۔
" اذکرونی فی الدنیا اذکرکم بالآخرۃ "تم مجھے دنیا میں یاد کرو میں تمہیں آخرت میں یاد کروں گا۔
" اذکرونی فی الخلوات اذکرکم فی الفلوات "تم مجھے خلوتوں میں یاد کرو میں تمہیں جنگلوں میں یاد کروں گا
" اذکرونی فی الرخاء اذکرکم فی البلاء "تم مجھے آسانی میں یاد کرو میں تمہیں مصیبتوں میں یاد کروں گا۔
" اذکرونی بطاعتی اذکرکم بمعونتی "تم مجھے طاعت سے یاد کرو میں تمہیں معاونت سے یاد کروں گا۔
" اذکرونی بمجاھدتی اذکرکم بھدایتی "تم مجھے مجاہدہ سے یاد کرو میں تمہیں ہدایت سے یاد کروں گا۔
" اذکرونی بالصدق والاخلاص اذکرکم بالخلاص ومزید الاختصاص "

تم مجھے یاد کرو صدق واخلاص سے میں تمہیں یاد کروں گا خلاص (آگ سے چھٹکارا) اور مزید اختصاص (خاص انعامات) سے۔

فضائل ذکر احادیث مبارکہ سے:

" عن ابی ھریرۃ وابی سعید قالا قال رسول اللہ ﷺ لا یقعد قوم یذکرون اللہ الا حفتھم الملائکۃ وغشیتھم الرحمۃ ونزلت علیھم السکینۃ وذکرھم اللہ فیمن عندہ " (رواہ مسلم)

حضرت ابو ہریرہ اور ابو سعید رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کوئی قوم اللہ تعالیٰ کے ذکر کے لئے نہیں بیٹھتی سوائے اس کے کہ فرشتے ان کا احاطہ کر لیتے ہیں اور رحمت ان کو ڈھانپ لیتی ہے اور سکینت ان پر نازل ہوتی ہے اور رب تعالیٰ ان کا مقربین میں ذکر فرماتا ہے۔

وضاحت حدیث: اگر " قعود " سے مراد "قیام" کی ضد یعنی بیٹھنا مراد ہو تو مطلب یہ ہوگا کہ اس انداز پر بیٹھ کر اللہ تعالیٰ کا ذکر کرے کہ تمام حواس اطمینان سے اپنا اپنا کام کریں خواہ وہ حواس ظاہرہ ہوں یا باطنہ ہوں۔ کہ رب تعالیٰ کا ذکر کرتے ہوئے کسی اور کی طرف توجہ مبذول نہ ہو۔
" وان کان کنایۃ عن الاستمرار ففیہ ایماء الی مداومۃ الاذکار " اگر قعود سے مراد اشارۃ استمرار (ہمیشہ جاری رکھنا) ہو تو مطلب یہ ہوگا کہ ذکر ہمیشہ جاری رکھیں۔

حضرت ابن حجر رحمہ اللہ نے یہی معنی مختار قرار دیا ہے کہ غالب مقصد یہی ہوتا ہے کہ انسان ذکر

کرنے والوں کے ساتھ بیٹھ کر ذکر جاری رکھے تا کہ ان سے برکت حاصل کرے اور ان سے محبت کر کے اپنے بگڑی سنوارے۔

یہ معنی بہتر کیوں ہے؟ اسلئے کہ " فلاینا فیه قیامه لطاعة "رب تعالیٰ کی طاعت کیلئے اس کا ذکر کھڑے ہو کر اس حدیث کے مخالف نہیں۔ کیونکہ طواف کرنا اور دوران طواف ذکر کرنا اور مقامات مقدسہ کی زیارت کے وقت رب تعالیٰ کا ذکر کرنا، اور نماز جنازہ میں رب تعالیٰ کی ثناء اور علم کی طلب کیلئے جانا اور رب تعالیٰ کو یاد کرنا اور نصیحت سنتے وقت قیام کی حالت میں ذکر کرنا سب ہی محمود ہیں۔

الاحفتهم الملائكة :

"ای احاطت بهم الملائكة الذين يطوفون فی الطرق يلتمسون اهل الذكر"

یعنی وہ ملائکہ جو مختلف راستوں میں پھرتے رہتے ہیں ذکر والوں کو تلاش کرتے رہتے ہیں وہ ان ذکر کرنے والوں کا اپنی رحمت سے احاطہ کر لیتے ہیں۔

وغشيتهم الرحمة :

" ای غطتهم الرحمة الالهية الخاصة بالذاكرين الله كثيرا والذاكرات "

اور رب تعالیٰ کی خصوصی رحمت ان مردوں اور عورتوں کو ڈھانپ لیتی ہے اور اپنی لپیٹ میں لے لیتی ہے جو اس کا ذکر کرتے ہیں۔

ونزلت عليهم السكينة : یعنی ذکر کرنے والوں کو اللہ تعالیٰ سکینت اور وقار عطاء کرتا ہے جیسا کہ رب تعالیٰ نے خود ہی فرمایا:

﴿ اَلَا بِذِكْرِ اللهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ ﴾ خبردار اللہ تعالیٰ کے ذکر سے دلوں کو اطمینان حاصل ہوتا ہے۔

اور ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

﴿ هُوَ الَّذِیْ اَنْزَلَ السَّكِيْنَةَ فِیْ قُلُوْبِ الْمُؤْمِنِيْنَ لِيَزْدَادُوْا اِيْمَانًا مَّعَ اِيْمَانِهِمْ ﴾

"وہ ذات جس نے مومنوں کے دلوں میں سکینت (چین) نازل کی تا کہ ان کے ایمان میں اور زیادہ پختگی ہو"

وذكرهم الله : اللہ تعالیٰ ان لوگوں کا فخر کے طور پر ذکر فرماتا ہے اور ان کا ذکر جمیل فرماتا ہے اور ان کو جزاء جزیل دینے کا وعدہ فرماتا ہے کہ یہ میرا ذکر کر رہے ہیں۔

فيمن عنده : " ای من الملائكة المقربين وارواح الانبياء والمرسلين "

یعنی اللہ تعالیٰ مقرب فرشتوں اور انبیاء کرام اور مرسلین کے سامنے ذکر کرنے والوں کی تعریف فرماتا ہے۔ یہاں " عنده " کا یہی مطلب ہے کیونکہ رب تعالیٰ زمان اور مکان سے پاک ہے بلکہ ہر وہ چیز جس میں حدوث ہو اور نقصان ہو اس سے رب تعالیٰ پاک ہے۔

(مسلم ، ترمذی ، ابن ماجه ، مشکوۃ باب ذکر الله ، مرقاۃ)

☆ " عن ابی هریرة قال کان رسول الله ﷺ یسیر فی طریق مکة فمر علی جبل یقال له جمدان فقال سیروا هذا جمدان سبق المفردون قالوا وما المفردون یا رسول الله قال الذاکرون الله کثیرا والذاکرات " (رواه مسلم)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ مکہ کے راستہ میں چل رہے تھے آپ کا ایک پہاڑ کے قریب سے گزر ہوا جسے جمدان کہا جاتا ہے آپ نے فرمایا چلو یہ جمدان ہے مفردون سبقت لے گئے صحابہ کرام نے پوچھا یا رسول اللہ "مفردون" کون ہیں آپ نے فرمایا وہ مرد اور عورتیں ہیں جو اللہ تعالیٰ کو زیادہ سے زیادہ یاد کرتے ہیں۔

حدیث پاک کا مفہوم واضح ہے البتہ خیال رہے "جمدان" (بضم الجیم وسکون المیم وفی آخره نون) اور " مفردون " بتشدید الراء المکسورة وتخفیفها " مراد اس سے وہ لوگ ہیں جن کو اللہ تعالیٰ کے ذکر کے بغیر اطمینان حاصل نہ ہو وہ تمام دوستوں کو چھوڑ کر، وطن کی پرواہ کیے بغیر، تمام اسباب کو منقطع کر کے، شہوات کو چھوڑ کر، اور تمام چیزوں کی لذات کو چھوڑ کر صرف رب تعالیٰ کی رحمت کے دروازہ کو لازم پکڑیں، صرف رب تعالیٰ کے ذکر کی لذت حاصل کریں۔

☆ " عن ابی موسیٰ قال قال رسول الله ﷺ مثل الذی یذکر ربه والذی لا یذکر مثل الحی والمیت " (رواه البخاری ومسلم)

حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جو شخص اللہ تعالیٰ کا ذکر کرتا ہے اور وہ جو ذکر نہیں کرتا ان کی مثال زندہ اور مردہ کی ہے۔

یعنی اللہ تعالیٰ کا ذکر کرنے والا زندہ شخص کی طرح ہے جس طرح انسان کی ظاہری زینت نور حیات اور تصرف تام ہے اور باطنی زینت نور علم اور ادراک ہے اسی طرح ذکر کرنیوالے کو ظاہری زینت نور طاعت سے حاصل ہوتی ہے اور باطنی زینت نور معرفت سے حاصل ہوتی ہے۔ اور جو اللہ تعالیٰ

کا ذکر نہیں کرتا " ظاهره عاطل وباطنه باطل " اس کا ظاہر بھی معطل ہے اور باطن بھی بیکار ہے۔

فائدہ جلیلہ: حدیث شریف میں اس طرف بھی اشارہ پایا گیا ہے:

" ان مداومة ذكر الحي الذي لا يموت تورث الحياة الحقيقية التي لافناء لها كما قيل اولياء الله لا يموتون ولكن ينتقلون من دار الى دار "

کہ اللہ تعالیٰ کا ذکر ہمیشگی سے کرنے والے کو زندگی حاصل ہوتی ہے وہ مرتا نہیں یعنی حیات حقیقیہ اسے حاصل ہو جاتی ہے جس میں فنا نہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ کے ذکر کرنے والے کو مقام ولایت حاصل ہو جاتا ہے اور اللہ تعالیٰ کے ولی مرتے نہیں بلکہ ایک جہان سے دوسرے جہان کی طرف منتقل ہو جاتے ہیں۔

خیال رہے کہ مسلم شریف میں یہ الفاظ مبارکہ ہیں " البيت الذي يذكر الله فيه والبيت الذي لا يذكر الله فيه مثل الحي والميت " یعنی اس میں لفظ " البيت " ذکر ہے البیت سے مراد دل ہے یعنی اللہ تعالیٰ کا ذکر کرنے والے کا دل اللہ تعالیٰ کا گھر ہے " فطوبى لمن احياه وعمره ويا حسرتي على من اخربه " کتنی خوشی اور برکت کا مقام ہے اس شخص کے لئے جو اللہ تعالیٰ کے ذکر سے اپنے دل کو زندہ کرتا ہے اور اسے اللہ تعالیٰ کی رحمت سے آباد کرتا ہے اور کتنا بدقسمت ہے وہ شخص جو اللہ تعالیٰ کا ذکر نہ کر کے اپنے دل کو مردہ کرتا ہے اور رب تعالیٰ کی رحمت سے محروم کر کے برباد کر لیتا ہے۔

☆ " عن ابی هريرة قال قال رسول الله ﷺ يقول الله تعالىٰ انا عند ظن عبدی بی وانا معه اذا ذكرنى فى نفسه ذكرته فى نفسى وان ذكرنى فى ملأ ذكرته فى ملأ خير منهم "

(رواه البخاری ومسلم)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ تعالیٰ فرماتا ہے میں اپنے بندے کے گمان کے مطابق ہوتا ہوں اور میں اس کے ساتھ ہوتا ہوں جب وہ مجھے دل میں یاد کرتا ہے میں اسے دل میں یاد کرتا ہوں اور اگر وہ مجھے جماعت (مجلس) میں یاد کرے تو میں اسے بہتر اشراف کی جماعت میں یاد کرتا ہوں۔

وضاحت حدیث: مطلب یہ ہوا " انا اعامله على حسب ظنه بی وافعل به ما يتوقعه منى من خير اوشر " کہ میں اپنے بندے سے وہی معاملہ کرتا ہوں جیسا وہ میرے متعلق

گمان رکھتا ہے اگر وہ مجھ سے خیر کی توقع رکھے (یعنی ایسے عمل کرے جو ذریعہ خیر ہوں) تو میں اس سے خیر سے درپیش آتا ہوں اور اگر وہ مجھ سے شر کی توقع رکھے تو میں بھی اس کی توقع کے مطابق اس سے سلوک رکھتا ہوں۔

" **لامانع لما اعطیت و لا معطی لما منعت** " یعنی رب تعالیٰ کے ذکر کرنے والے پر رب تعالیٰ کی رحمت ہوتی ہے اور نہ ذکر کرنے والا اس سے محروم رہتا ہے۔ گویا کہ رب تعالیٰ فرماتا ہے جسے میں عطاء کروں اس کو کوئی اس سے منع نہیں کرسکتا اور جسے میں محروم کردوں اسے کوئی عطاء نہیں کرسکتا۔

جب بندے کا مقام توحید میں راسخ عقیدہ ہو جائے، اور ایمان اس کے دل میں جاگزیں ہوجائے اور اللہ تعالیٰ پر اسے کامل بھروسہ ہوجائے " **قرب منه ورفع له الحجاب بحيث اذا دعاه اجاب و اذا سأله استجاب** " تو اسے اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل ہوجاتا ہے اس سے حجاب اٹھا لئے جاتے ہیں اس لحاظ پر کہ جب وہ دعاء کرتا ہے تو اس کی دعاء کو قبول کرلیا جاتا ہے اور جب سوال کرتا ہے تو اسے پورا کردیا جاتا ہے۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا رب تعالیٰ کہتا ہے " **اذا علم عبدی ان له ربا يغفر الذنب** " جب میرا بندہ جانتا ہے کہ میں اس کا رب ہوں تو میں اس کی مغفرت کردیتا ہوں۔

و انا معه : اى بالتوفيق والحفظ والمعونة " یعنی اللہ تعالیٰ فرماتا ہے میں اسے توفیق عطاء کرتا ہوں اور اس کی حفاظت کرتا ہوں اور اس کی امداد کرتا ہوں اور اس کے کلام کو سنتا ہوں اور اس کے حال کو جانتا ہوں خواہ وہ مجھے زبان سے یاد کرے یا دل سے یاد کرے۔

فان ذكرنی فی نفسه ذكرته فی نفسی : اگر بندہ مجھے یاد کرے دل میں، پوشیدگی سے، آہستہ طور پر اور خلوص سے تو میں بھی اسے آہستہ طور پر خود اپنے دست قدرت سے ثواب عطاء کروں گا وہ ثواب فرشتوں کے سپرد نہیں کروں گا کہ وہ ذکر کرنے والے کو عطاء کریں۔

وان ذكرنی فی ملأ ذكرته فی ملأ خير منهم : یعنی رب تعالیٰ فرماتا ہے اگر بندہ مجھے مومنوں کی جماعت میں یاد کرے اور مومنوں کے سامنے یاد کرے تو میں اسے ملائکہ مقربین اور

رواح مرسلین میں یاد کروں گا اور اس کے ذکر کو شرف قبولیت عطاء کروں گا اس کی تعریف کروں گا اور سے بہت بڑا انعام عطاء کروں گا۔

تنبیہ: " ان خواص البشر کالانبیاء خیر من خواص الملائکة کجبریل واما عوام البشر فلیسوا بخیر من الملائکة اصلا"

انسانوں میں سے خاص لوگ یعنی انبیاء کرام بہتر ہیں خاص ملائکہ سے جیسے جبریل وغیرہ۔لیکن عام بشر ملائکہ سے بہتر نہیں لہذا عام مؤمنین کی محفل میں بندے کا رب تعالیٰ کو یاد کرنے سے رب تعالیٰ کا ملائکہ مقربین اور ارواح مرسلین میں یاد کرنا یقیناً بہتر ہے۔

☆ " عن ابی ذر قال قال رسول الله ﷺ یقول الله تعالیٰ من جاء بالحسنة فله عشر مثالها وأزید ومن جاء بالسیئة فجزاء سیئة مثلها او اغفر ومن تقرب منی شبرا تقربت منه ذراعا ومن تقرب منی ذراعا تقربت منه باعا ومن اتانی یمشی اتیته هرولة ومن لقینی بقراب الارض خطیئة لا یشرک بی شیئا لقیته بمثلها مغفرة " (رواہ مسلم)

حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا رب تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے جو شخص نیکی کرے اس کے لئے دس گنا بلکہ اس سے بھی زائد اجر وثواب ہے اور جو شخص برائی کا عمل کرے تو اسے اس کی مثل ہی گناہ حاصل ہوگا یا میں اسے (اپنی رحمت) سے بخش دوں۔اور جو شخص ایک بالشت میرے قریب ہوگا میں ایک ذراع اس کے قریب ہوں گا اور جو شخص ایک ذراع میرے قریب ہوگا میں دونوں بازوؤں کے پھیلانے کی مقدار فاصلے کی مقدار قریب ہوں گا اور جو شخص میرے پاس چل کر آئیگا میں اس کے پاس تیز چل کر آؤں گا اور جو شخص زمین کے قریب گناہ میرے پاس لائے سوائے شرک کے (مجھے میری رحمت کی امید سے ملے) تو میں اسی کے مطابق اسے مغفرت سے ملوں گا۔

وضاحت حدیث: من حاء بالحسنة ای غیر مبطلة ، جو شخص نیکی لائے لیکن وہ نیکی اس کی مقبول ہو مردود نہ ہو، ریاء کاری نہ ہو اور کوئی وجہ اس نیکی کو برباد کرنے والی نہ ہو تو اسے ایک نیکی کے بدلے دس نیکیوں کا ثواب حاصل ہوگا بلکہ نیکی کرنے والے کا جتنا خلوص بڑھتا چلا جائے گا، اسی قدر اس کے ثواب میں بھی زیادتی ہوتی چلی جائے گی وہ سات سو گنا، ایک لاکھ گنا بلکہ اس سے بھی زیادہ ثواب دیا جائے گا۔

ومن جاء بالسیئة فجزاء سیئة مثلها:

جوشخص برائی کرے گا اسے ایک برائی کا ہی گناہ حاصل ہوگا۔

نکات:(۱) الحسنۃ فرمایا گیا یہ نہیں فرمایا گیا " من فعل الحسنة " اس سے اشارہ کیا گیا کہ الحسنة سے معہودہ نیکی مراد ہے یعنی وہ مقبول ہو، مردود نہ ہو۔

(۲) الحسنۃ کے ساتھ جزاء کا ذکر نہیں اور السیئۃ کے ساتھ جزاء کا ذکر ہے اس میں وجہ فرق کیا ہے؟ علامہ طیبی رحمہ اللہ نے اس کی وجہ یہ بیان فرمائی:

" ما یقابل العمل الصالح کله افضال واکرام من الله وما یقابل السیئة فهو عدل وقصاص فلا یکون مقصودا بالذات کالثواب فخص بالجزاء "

نیک اعمال پر ثواب اور وہ بھی کئی گنا زیادہ عطاء کرنا یہ صرف اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے حاصل ہوتا ہے لیکن گناہوں کے بدلے عذاب کا دیا جانا عدل وقصاص کی وجہ سے ہوگا۔ ثواب کی طرح عذاب مقصود بالذات نہیں ہوتا اسی لئے گناہوں کے بدلے عذاب کو "جزاء" سے تعبیر کر دیا گیا ہے۔

(۳) سیئۃ کو دوبارہ نکرہ ذکر کیا گیا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ پہلے معرفہ میں مطلق ذکر کیا گیا پھر نکرہ ذکر کر کے تنوین وحدت کی ذکر کر کے اس مبہم کی وحدت پر نص قائم کی گئی (یعنی اسے ظاہر کیا گیا ہے) کہ ایک گناہ پر سزا ایک گناہ کی ہی ہوگی، زیادہ نہیں ہوگی۔ یہ بھی اللہ تعالیٰ کی خصوصی رحمت اور خصوصی انعام واکرام اپنے بندوں پر ہوگا کہ اس کے انعامات تو زیادہ ہوں گے لیکن اس کی طرف سے سزائیں کم ہوں گی۔

(۴) " فله عشر امثالها وازید " میں "واؤ" کو ذکر کرنے کے فوائد یہ ہیں کہ یا مراد " ازید " سے اللہ تعالیٰ کی زیارت سے مشرف ہونا ہے جیسا کہ " لِلَّذِيْنَ اَحْسَنُوا الْحُسْنٰى وَزِيَادَةٌ " میں " وزیادة " سے مراد رؤیۃ باری تعالیٰ ہے۔

اور " أزید " سے مراد کئی گنا نیکیوں کے ثواب کی زیادتی جب مراد ہو تو " واؤ " بمعنی "او" کے ہوگی جو نوع پر دلالت کرتا ہے جس طرح اسی حدیث میں " او اغفر " میں "او" تنویع کے لئے استعمال ہے:

" والاظهر ما قاله ابن حجر من ان العشر والزیادة یمکن اجتماعهما

بخلاف جزاء مثل السیئة و مغفرتها فانه لا یمکن اجتماعهما فوجب ذکر او الدال علی ان الواقع احدهما فقط "

زیادہ ظاہر قول ابن حجر رحمہ اللہ کا ہے کہ ایک نیکی پر دس گنا اور اس سے بھی زیادہ ثواب حاصل ہوتا ہے یہاں دس گنا اور اس سے زیادہ کو جمع کرنا ممکن ہے اس لئے ''واؤ'' اپنے حقیقی ''اجتماع'' کے معنی میں استعمال ہے لیکن برائی کی جزاء میں ''او'' ذکر کرنا ضروری ہے کیونکہ اس میں اجتماع ممکن نہیں بلکہ یا ایک گنا عذاب ہو جائے یا مغفرت ہو جائے۔

اس سے آگے حدیث پاک کے مجازی معانی معتبر ہیں " ومن تقرب منی شبرا تقربت منه ذراعا " کا مطلب یہ ہے کہ جو شخص میرا قرب حاصل کرنے کے لئے تھوڑی مقدار میں میری طاعت کرتا ہے تو میں اپنی رحمت اسے زیادہ مقدار میں پہنچاتا ہوں۔

درحقیقت بندے کو اللہ تعالیٰ کی عبادت اور اس کا ذکر کرنے کی توفیق حاصل ہونا بھی اللہ تعالیٰ کی رحمت اور مہربانی ہے، معنی یہ ہو گیا "من تقرب الی بطاعتی تقربت الیه برحمتی " جو شخص میری طاعت سے میرے قریب ہوتا ہے میں اپنی رحمت سے اس کے قریب ہوتا ہوں۔

" ومن تقرب منی ذراعا تقربت منه باعا " اگرچہ ''باعا'' کا مطلب دونوں ہاتھوں کو پھیلانے سے جو فاصلہ ہوتا ہے اسے کہا جاتا ہے لیکن یہاں اس تمام جملے کا معنی یہ ہے " کلما زاد العبد قربة من الله تعالیٰ زاد الله رحمته " کہ بندہ جتنا زیادہ اللہ تعالیٰ کی طاعت سے قرب حاصل کرتا ہے اللہ تعالیٰ بھی اپنی رحمت اتنی ہی زیادہ کرتا ہے۔

" ومن اتانی یمشی اتیته هرولة " اگرچہ " هرولة " کا معنی تیز چلنا ہے، دوڑنا نہیں لیکن یہاں بھی مجازی معنی ہی مراد ہے کہ جو میری طاعت اور زیادہ کرے گا " صببت علیه الرحمة " میں اپنی رحمت کا اس پر اور ہی زیادہ فیضان کروں گا یا یوں کہا جائے " من تقرب منی بسهولة وصل الیه رحمتی بسرعة " جو شخص آسانی سے میرے قریب ہوا میری رحمت جلدی ہی اسے حاصل ہو گئی۔

" ومن لقینی بقراب الارض خطینة لا یشرک بی شیئا لقیته بمثلها مغفرة " اس

میں ''قراب'' لفظ استعمال ہوا ہے یہ ''قاف'' کے ضمہ اور کسرہ سے پڑھا گیا ہے ''قرب'' سے ماخوذ ہے معنی اس کا یہ ہے '' بما یقرب ملأها من الصغائر والکبائر '' کہ زمین میں جتنی چیزیں ہیں ان کے قریب صغیرہ اور کبیرہ گناہ کر کے میرے قریب آ جائے تو میری طرف سے اسی کے مطابق اسے رحمت حاصل ہوگی۔

حدیث پاک کا آخری حصہ قرآن پاک کے ان الفاظ مبارکہ کا ترجمان ہے ﴿ اِنَّ اللّٰهَ لَا یَغْفِرُ اَنْ یُّشْرَکَ بِهٖ وَیَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِکَ لِمَنْ یَّشَآءُ ﴾ بیشک اللہ تعالیٰ شرک کی مغفرت نہیں فرمائے گا، اس کے بغیر جو چاہے گا معاف فرما دے گا۔

حدیث پاک میں اس مقصد عظیم کو بھی واضح کیا گیا ہے ''دفع الیأس بکثرۃ الذنوب فلا ینبغی ان یغتر فی الاستکثار من الخطایا '' کہ زیادہ گناہوں سے ناامید بھی نہ ہو اور بہت زیادہ گناہوں میں مبتلاء ہو کر دھوکہ میں بھی مبتلاء نہ ہو۔

چونکہ اللہ تعالیٰ کے ارشاد کا مطلب یہ ہے '' فانه یغفر لمن یشاء ویعذب من یشاء ولا یعلم انه من ایهم '' کہ وہ جس کی چاہے مغفرت فرمائے اور جسے چاہے عذاب دے چونکہ انسان کو معلوم تو نہیں کہ وہ کن لوگوں سے ہوگا اس کی مغفرت ہونی ہے یا عذاب میں مبتلاء ہونا ہے یہ حدیث کے آخری حصہ کا مطلب ہے۔

حدیث کے اول حصہ میں ترغیب پائی گئی ہے طاعت میں مجاہدہ پر برانگیختہ کیا گیا ہے اور چستی سے عبادت کرنے کا حکم دیا گیا ہے سستی اور کوتاہی کو چھوڑنے کا حکم دیا گیا ہے۔

'' فالحدیث معجون مرکب نافع لا مراض قلوب السالکین ومحرک شوق الطالبین ومقولصدور المذنبین ''۔

گویا کہ حدیث مرکب معجون کی طرح ہے جو راہ سلوک پر چلنے والوں کے دلوں کی امراض کیلئے نفع مند ہے اور طالبین کے شوق کو حرکت دینے کا ذریعہ ہے اور گناہگاروں کے سینوں کیلئے مقوی ہے۔

نتیجہ واضح ہوا '' ینبغی ان یکون المؤمن بین الخوف والرجاء '' کہ مومن کے لئے

لائق یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے عذاب کا خوف بھی رکھے اور اللہ تعالیٰ کی رحمت کی امید بھی رکھے۔

☆ " وعن ابی هریرة قال قال رسول الله ﷺ ان الله تعالیٰ قال من عادی لی ولیا فقد آذنته بالحرب وما تقرب الی عبدی بشئی احب الی مما افترضت علیه وما یزال عبدی یتقرب الی بالنوافل حتی احببته فاذا احببته فکنت سمعه الذی یسمع به وبصره الذی یبصر به ویده التی یبطش بها ورجله التی یمشی بها وان سألنی لا عطینه ولئن استعاذنی لاعیذ له وما ترددت عن شئی انا فاعله ترددی عن نفس المؤمن یکره الموت وانا اکره مساء ته ولا بدله منه " (رواه البخاری)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا بیشک اللہ تعالیٰ فرماتا ہے جو شخص میرے ولی سے دشمنی رکھے میں اسے لڑائی کی اطلاع دیتا ہوں اور میرا بندہ میرے قریب ہوتا ہے اس چیز سے جو مجھے پسند ہے یعنی جو میں نے اس پر فرض کیا ہے اور ہمیشہ میرا بندہ نوافل کے ذریعے میرے قریب ہوتا ہے یہاں تک کہ میں اس سے محبت کرتا ہوں جب میں اس سے محبت کرتا ہوں تو میں اس کی سمع بن جاتا ہوں جس سے وہ سنتا ہے اور میں اس کی بصر بن جاتا ہوں جس سے وہ دیکھتا ہے اور میں اس کے ہاتھ بن جاتا ہوں جس سے وہ پکڑتا ہے اور میں اس کے پاؤں بن جاتا ہوں جس سے وہ چلتا ہے اور اگر وہ مجھ سے سوال کرے تو میں اسے عطاء کرتا ہوں اور اگر وہ مجھ سے پناہ طلب کرے تو میں اسے پناہ دیتا ہوں۔ اور مومن شخص جو موت کو مقام تردد میں سمجھتا ہے میں اس کے تردد کو زائل کرتا ہوں اور جو اس کے لئے ضروری ہے جس سے اس کا چھٹکارا نہیں اس میں اسے تکلیف دینے کو میں ناپسند کرتا ہوں۔

وضاحت حدیث: من عادی لی ولیا :

یعنی جو میرے ولیوں میں سے کسی ایک ولی کو ایذاء پہنچائے "ولی" فعیل کا وزن ہے بمعنی مفعول ہے:

" وهو من یتولی الله امره فلا یکله الی نفسه لحظة قال الله تعالیٰ وهو یتولی الصالحین "

یہ وہ شخص ہوتا ہے جو اپنے تمام امور کو اللہ تعالیٰ کے سپرد کر دے ایک لحظہ بھر بھی اپنے امور کو اپنے سپرد نہ کرے اللہ تعالیٰ نے فرمایا "وہ نیک لوگوں کا والی ہے"

اور یہ بھی ہو سکتا ہے "فعیل" فاعل کے معنی میں ہو اور اس میں مبالغہ پایا گیا ہو " وهو

المتولی عبادة الله وطاعته علی التوالی بلا تخلل عصیان " کہ ولی وہ ہوتا ہے جو اللہ تعالیٰ کی عبادت کا متولی ہو اور اس کی طاعت توالی (لگاتار) طور پر کرے عبادت کرنے میں گناہوں سے خلل نہ پیدا کرے۔

''ولی'' جب مفعول کے معنی میں ہو تو مراد اور مجذوب اور سالک کے درجہ میں ہوتا ہے اور جب فاعل کے معنی میں ہو تو مرید اور سالک اور مجذوب کے درجہ میں ہوتا ہے۔

تاہم یہ فرق ابتداء وانتہاء کے لحاظ سے ہے اور عنایت ورعایت کے لحاظ سے ہے کہ پہلے مرید ہوتا ہے اور وہ حق رکھتا ہے کہ اس کی رعایت کی جائے پھر وہ درجہ مراد میں پہنچ جاتا ہے پھر وہ دوسروں پر عنایت ومہربانی کرتا ہے۔

وما تقرب الی عبدی: عبدی سے مراد مومن بندہ ہے ''عبد'' اس لئے ذکر کیا کہ جس طرح غلام اپنے مالک کی رضامندی حاصل کرنے کے لئے مختلف قسم کی خدمت بجالاتا ہے اور ہر قسم کی طاعت کرتا ہے تو بندے کو بھی چاہئے کہ وہ اپنے مالک کی ہر قسم کی طاعت کرے۔

بشئی احب الی مما افترضت علیه : یعنی انسان اللہ تعالیٰ کی عبادت کر کے اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل کرے جو عبادت اللہ تعالیٰ نے فرض کی اس پر عمل کرنے سے اللہ تعالیٰ کے حکم کو بجالایا گیا اور اللہ تعالیٰ کے نواہی سے اجتناب پایا گیا۔ اور ''احب'' کے قول سے پتہ چلا کہ اللہ تعالیٰ کے تقرب کے مختلف ذریعے ہیں ان میں سے اللہ تعالیٰ کو زیادہ پسند یہی ہے کہ فرائض کو ادا کیا جائے۔ مومن کا طریقہ یہ ہے کہ وہ فرائض کے ادا کرتے وقت نوافل بھی ادا کرتا ہے اسی وجہ سے ارشاد فرمایا گیا ''وما یزال عبدی یتقرب الی بالنوافل حتی احببته '' یعنی انسان جب فرائض سے زائد عبادت نوافل کے ذریعے اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ بھی اس سے محبت کرتا ہے۔

فکنت سمعه : کے مختلف مطالب ہیں۔

(ا) '' یسرت علیه افعاله المنسوبة الی هذه الحالات ووفقته فیها حتی کانی نفس هذه الحالات ''

یعنی بندہ جب رب تعالیٰ کا قرب حاصل کر لیتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کے کانوں اور اس کی آنکھوں

اوراس کے ہاتھوں اوراس کے پاؤں پرآسان کردیتا ہےاوران کوتوفیق دیتا ہے کہ وہ حق بات کو سنتے ہیں، حق راہ کود یکھتے ہیں اور ہاتھوں سے وہی کام کرتے ہیں۔ جس سے رب تعالیٰ راضی ہوتا ہے اور پاؤں سے نیکی کی راہ پر چلتے ہیں۔تو ان آلات کودرست راہ پرلگانے کو مالک الملک نے اپنی طرف منسوب کردیا گویایوں سمجھا جائے کہ نیک بندے کےکان اورآنکھیں اور ہاتھ اور پاؤں میں خودہی ہوتاہوں۔

(۲) اللہ تعالیٰ اپنے مقرب بندے کےحواس اورآلات کواپنی رضاء کاوسیلہ اور ذریعہ بنادیتا ہےتو وہ صرف وہی سنتا ہےجس میں رب تعالیٰ کی رضاء ہواورصرف وہی دیکھتا ہے جسے رب تعالیٰ پسند کرتا ہے اوروہی کام ہاتھ سے کرتا ہےجس میں رب تعالیٰ راضی ہو۔اور پاؤں سے چل کراسی طرف جاتا ہے جو رب تعالیٰ کی پسند کے مطابق ہو۔تو مطلب یہ ہواکہ وہ رب تعالیٰ کے ذریعےسن رہا ہےاوردیکھ رہا ہے اورپکڑرہاہےاورچل رہاہے۔

(۳) اللہ تعالیٰ اپنے مقرب بندے پراپنی محبت اتنی زیادہ غالب کردیتا ہے کہ وہ کسی چیزکودیکھتاہی نہیں سوائے اس کے کہ اس میں اللہ تعالیٰ کی محبت ہو۔وہ کسی چیزکورب تعالیٰ کی محبت کے بغیرسنتاہی نہیں۔وہ کسی چیزکورب تعالیٰ کی محبت کے بغیر پکڑتاہی نہیں وہ رب تعالیٰ کی محبت کے بغیرکسی راہ پر چلتانہیں۔

"ویکون اللہ سبحانہ فی ذلک لہ یدا وعونا ووکیلا یحمی سمعہ وبصرہ ویدہ ورجلہ عما لا یرضاہ" گویا کہ اللہ تعالیٰ اس کے ہاتھ بن جاتا ہےاس کامددگاراورکارساز بن جاتا ہے جواس کے کانوں اورآنکھوں اور ہاتھوں اور پاؤں کی حفاظت کرتا ہے۔جس کی وجہ سے اس کے اعضاءرب تعالیٰ کی رضاء کے بغیرکوئی کام نہیں کرتے۔

(۴) اورمعنی یہ ہے کہ گویا کہ اللہ تعالیٰ یہ فرماتا ہے:

"کنت اسرع الی قضاء حوائجہ من سمعہ فی الاستماع وبصرہ فی النظر ویدہ فی اللمس ورجلہ فی المشی"

کہ جب میرابندہ میرا قرب حاصل کرلیتا ہےتواس کی حاجات کومیں جلدی پوراکردیتاہوں اگر وہ کہیں دور کی بات کوسنناچاہتا ہےتو اسے سنادیتاہوں اورکہیں دوردیکھناچاہتا ہےتو اسے دکھادیتاہوں اورجہاں ہاتھ کوپہنچاناچاہےتواس کے ہاتھ کوپہنچادیتاہوں اورجہاں چل کرجاناچاہے وہاں پہنچادیتاہوں۔

(۵) جب انسان فرائض کی ادائیگی کے ذریعے اللہ تعالیٰ کا تقرب حاصل کرتا ہے اور نوافل کے ذریعے فرائض کی تکمیل کر کے جب اور زیادہ قرب حاصل کرنا چاہے تو اسی قرب کے حصول کے ذرائع میں سے اللہ تعالیٰ کا ذکر بھی ہے:

" والذکر الموصل الی حضور الوصول وسرور الحصول ومقام الفناء عن نفسه والبقاء بربه ظهر له آثار محبته الازلية وانكشف له انوار قربته الابدية فرأى ان ما به الكمال من السمع والبصر وقوة القوى انما هو من آثار سمعه وبصره وقدرته وقوته "

اور وہ ذکر رب تعالیٰ کے حضور پہنچانے کا ذریعہ ہے اور اسی سے سرور حاصل ہوتا ہے اور انسان اپنے آپ کو مقام فنا میں سمجھتا ہے اور اسے معلوم ہوتا ہے کہ صرف رب تعالیٰ کی ذات باقی ہے تو اس پر ازلی محبت کے آثار ظاہر ہوتے ہیں اور قربت ابدیہ کے انوار اس پر منکشف ہوتے ہیں پھر وہ اپنی سمع اور بصر اور ہر آلہ میں جو قوت دیکھتا ہے وہ درحقیقت رب تعالیٰ کی قدرت کے آثار ہی اس کی سمع وبصر وقدرت اور قوت میں پائے جاتے ہیں۔

(۶) علامہ ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں گویا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے میرا مقرب بندہ کسی چیز کو سنتا نہیں اور کسی چیز کو دیکھتا نہیں اور کسی چیز کو پکڑتا نہیں اور کہیں چل کر جاتا نہیں مگر وہ یہ شہادت دیتا ہے کہ یہ سب رب تعالیٰ کے انعامات ہیں پھر وہ تمام اعضاء کو میری طاعت میں لگا لیتا ہے کسی عضو سے کوئی کام میری رضاء کے بغیر نہیں لیتا۔ تو میں اس کے کان، آنکھ، ہاتھ اور پاؤں بن جاتا ہوں جن سے وہ سنتا، دیکھتا، پکڑتا اور چلتا ہے " **کما هو جلى عندائمة العرفان دون غيرهم** " جس طرح یہ مسئلہ صرف اہل معرفت پر ظاہر ہے ان کے بغیر اسے حقیقۃً کوئی نہیں سمجھ سکتا۔

وان سألنى لا عطينه : اور اگر مجھ سے سوال کرے تو میں ضرور بر ضرور اسے عطاء کروں گا۔

نکتہ : یہاں " ان " سے کلام کو ذکر کیا جس سے اس طرف اشارہ کیا گیا " **قد يصل الى مقام يترک فيه السوال اتكالا على علمه بالحال او لانه لا يطلب غير الملک المتعال** " کہ اللہ کا مقرب بندہ کبھی اس مقام پر پہنچ جاتا ہے کہ وہ رب تعالیٰ سے سوال نہیں کرتا اس لئے کہ اسے

بھروسہ ہوتا ہے اس پر کہ جب وہ میرے حال کو جانتا ہے تو مجھے سوال کی ضرورت ہی کیا ہے وہ خود ہی مہربانی فرمائے گا۔

دوسری وجہ یہ ہوسکتی ہے کہ " ان مخففه " ہوجائے، تو مطلب یہ ہوگا کہ وہ سوال ہی جب مجھ سے کرتا ہے تو میں اسے ضرور بضرور اپنی رحمت عطاء کروں گا۔

ولئن استعاذنی لاعیذنه : اور اگر وہ مجھ سے پناہ پکڑے تو میں اسے ضرور پناہ دوں گا۔
یعنی اگر اللہ تعالیٰ کا مقرب بندہ کسی چیز سے دور رہنے کے لئے اللہ تعالیٰ سے دعاء کرتا ہے رب تعالیٰ کی اس چیز سے پناہ طلب کرے تو رب تعالیٰ اسے ضرور بضرور پناہ دے گا۔

" وما ترددت عن شئی انا فاعله ترددی عن نفس المؤمن یکره الموت وانا اکره مساء ته ولا بدله منه "

ان الفاظ مبارکہ کی وضاحت میں اہل علم کے مختلف قول ہیں کیونکہ " وما ترددت " کا ظاہری معنی مراد لینا ممکن نہیں تھا اس لئے تاویل کی ضرورت درپیش آئی، ابن حجر رحمہ اللہ نے فرمایا:

" التردد هو التحیر بین امرین لا یدری ایهما اصلح وهو محال علی الله سبحانه فاولوه علی تردید الاسباب والوسائط "

تردد کا معنی دو چیزوں کے درمیان حیران ہونا ہے یہ معلوم نہ ہو ان میں سے بہتر کیا ہے؟ یہ معنی اللہ تعالیٰ کی شان کے لائق نہیں اسی وجہ سے اس کی تاویل یہ کی گئی ہے کہ اسباب ووسائط میں تردد پایا گیا ہے۔

" وقیل المراد من لفظ التردد ازالة کراهة الموت عن المومن بما یبتلیه الله به من المرض والفاقة وغیرهما فاخذه المؤمن عما تشبث به من حب الحیاة شیئا فشیئا بالاسباب التی ذکرنا یشبه فعل المتردد من حیث الصفة فعبر عنه بالتردد "

اور بیان کیا گیا ہے کہ لفظ تردد سے مراد مومن سے موت کے مکروہ سمجھنے کا زوال ہے جب کہ اللہ تعالیٰ مومن کو آزماتا ہے مرض اور فاقہ (بھوک) وغیرہ سے، مومن بھی چونکہ حیات کو پسند کرتا ہے اسی سے آہستہ آہستہ سہارا لگاتا ہے اسباب میں تردد کو فعل متردد سے بیان کردیا گیا (راقم نے اسی کے مطابق ترجمہ کیا ہے) آسان مفہوم یہ ہے کہ مؤمن اگرچہ موت کو ناپسند کرتا ہے اور اس میں متردد ہوتا ہے کہ

کہیں مجھ پر موت نہ آجائے لیکن میں اس کے تردد کو ناپسند سمجھتا ہوں اور اسے زائل کر دیتا ہوں۔

اعتراض : "ان نفس الموت تحفة المؤمن یوصله الی لقاء الله فکیف یکره المؤمن"
موت تو مومن کے لئے تحفہ ہے جو اللہ تعالیٰ کی ملاقات کا ذریعہ ہے تو مومن کس طرح موت کو ناپسند کرتا ہے۔

جواب : "المراد انه یکره شدة الموت بمقتضی طبعه البشری"
بعض اوقات انسان سے غیر ارادی طور پر بشری تقاضا کے مطابق کوئی نہ کوئی فعل سرزد ہوتا ہے موت بھی انسان کو بشری تقاضا کے مطابق تلخ معلوم ہوتی ہے ورنہ مومن خاص کر کے رب تعالیٰ کا مقرب بندہ کب چاہتا ہے کہ میری ملاقات رب ذوالجلال سے نہ ہو۔ اسلئے کہ مومن کی شان ہی یہ ہے "فانه لا ینبغی ان یکره الموت بل یحبه فان من احب لقاء الله احب الله لقاءه ومن کره لقاء الله کره الله لقاءه" کہ وہ موت کو ناپسند نہ کرے بلکہ موت سے محبت کرے جو شخص اللہ تعالیٰ کی ملاقات کو پسند کرتا ہے اللہ تعالیٰ اس سے ملاقات کو پسند کرتا ہے اور جو شخص رب کو ملنا پسند نہیں کرتا رب بھی اس سے ملنا پسند نہیں کرتا۔

☆ "عن ابی هریرة قال قال رسول الله ﷺ ان لله ملائکة یطوفون فی الطرق یلتمسون اهل الذکر فاذا وجدوا قوما یذکرون الله تنادوا هلموا الی حاجتکم قال فیحفونهم باجنحتهم الی السماء الدنیا قال فیسالهم ربهم وهو اعلم بهم ما یقول عبادی قال یقولون یسبحونک ویکبرونک ویحمدونک ویمجدونک قال فیقول هل رئونی قال فیقولون لا والله ما رأوک قال فیقول کیف لو راونی قال فیقولون لو رأوک کانوا اشد لک عبادة واشد لک تمجیدا واکثر لک تسبیحا قال فیقول فما یسئلون قال یسالونک الجنة قال یقول وهل رأوها فیقولون لا والله یا رب ما رأوها قال یقول فکیف لو رأوها قال یقولون لو انهم راوها کانوا اشد علیها حرصا واشد لها طلبا واعظم فیها رغبة قال فهم یتعوذون قال یقولون من النار قال یقول فهل رأوها قال یقولون لا والله یا رب ما رأها قال یقول فکیف لو رأوها قال یقولون لو رأوها کانوا اشد منها فرارا واشد لها مخافة قال فیقول فاشهدکم انی قد غفرت لهم قال یقول ملک من الملائکة فیهم فلان لیس منهم انما جاء لحاجة قال هم الجلساء لا یشقی جلیسهم" (رواه البخاری)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا بیشک اللہ تعالیٰ کے فرشتے راستوں میں پھرتے رہتے ہیں ذکر کرنے والوں کو تلاش کرتے رہتے ہیں جب وہ کسی قوم کو اللہ کا ذکر کرتے ہوئے پاتے ہیں تو ایک دوسرے کو پکارتے ہیں یہاں آجاؤ تمہیں مقصد حاصل ہوگا نبی کریم ﷺ نے فرمایا وہ فرشتے آسمان دنیا تک ان کے اوپر پروں سے رحمت کا سایہ کر لیتے ہیں آپ نے فرمایا ان کا رب جاننے کے باوجود فرشتوں سے ان کے متعلق پوچھتا ہے میرے بندے کیا کہہ رہے تھے؟ آپ نے فرمایا وہ فرشتے کہتے ہیں وہ تیری تسبیح بیان کر رہے اور تیری تحمید کر رہے تھے اور تیری بزرگی بیان کر رہے تھے آپ نے فرمایا رب تعالیٰ کہتا ہے کیا انہوں نے مجھے دیکھا ہے؟ آپ فرماتے ہیں فرشتے کہتے ہیں قسم ہے اللہ تعالیٰ کی انہوں نے تجھے دیکھا تو نہیں، آپ فرماتے ہیں رب تعالیٰ کہتا ہے اگر وہ مجھے دیکھ لیتے؟ آپ فرماتے ہیں فرشتے کہتے ہیں اگر وہ تجھے دیکھ لیتے تو اور ہی زیادہ تیری عبادت کرتے، اور ہی زیادہ تیری بزرگی بیان کرتے، اور ہی زیادہ تیری تسبیح بیان کرتے، آپ فرماتے ہیں رب تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے وہ کسی چیز کا سوال کر رہے تھے؟ تو کہا کہ وہ جنت کا سوال کر رہے تھے حضور نے فرمایا اللہ تعالیٰ کہتا ہے کیا انہوں نے جنت کو دیکھا ہے؟ وہ کہتے ہیں قسم ہے اللہ کی اے ہمارے رب انہوں نے جنت کو نہیں دیکھا آپ فرماتے ہیں رب تعالیٰ فرمائے گا اگر وہ جنت کو دیکھ لیتے تو وہ کہتے ہیں اگر وہ جنت کو دیکھ لیتے تو اور حرص کرتے اور زیادہ اس کی طلب کرتے اور زیادہ اس میں رغبت کرتے رب تعالیٰ پوچھتا ہے وہ کس چیز سے پناہ طلب کر رہے تھے؟ آپ نے فرمایا وہ کہتے ہیں آگ سے پھر فرمایا رب کہتا ہے کیا انہوں نے آگ کو دیکھا ہے؟ فرشتے کہتے ہیں قسم ہے اللہ کی اے رب انہوں نے دیکھا تو نہیں، فرمایا رب کہتا ہے اگر وہ آگ کو دیکھ لیتے تو کیسے ہوتے؟ فرشتے کہتے ہیں اگر وہ دیکھ لیتے تو اور زیادہ اس سے دور بھاگتے اور زیادہ اس سے خوف رکھتے، فرمایا رب تعالیٰ کہتا ہے میں تمہیں گواہ بنا رہا ہوں کہ میں نے ان کی مغفرت کر دی، فرمایا ان فرشتوں میں سے ایک فرشتہ کہتا ہے فلاں شخص ان میں نہیں تھا (وہ ذکر کرنے کی غرض سے نہیں آیا تھا) وہ اپنے کام کے لئے آیا تھا۔ رب تعالیٰ فرماتا ہے وہ ان کے ساتھ بیٹھا تو تھا میرا ذکر کرنے والے بندوں کے ساتھ بیٹھنے والا بدبخت نہیں ہو سکتا۔

مختصر وضاحت:

حدیث پاک کا مفہوم ترجمہ سے ہی واضح ہے تاہم بعض الفاظ کو طلباء کرام ذہن نشین کر لیں۔

یلتمسون اهل الذکر : فرشتے ذکر کرنے والوں کو تلاش کرتے ہیں تا کہ ان کی زیارت کریں اور ان کے ذکر کو سنیں۔ ذکر سے مراد تسبیح، تکبیر، تحمید اور تمجید ہے جس کا ذکر آگے واضح طور پر آ رہا ہے۔ تنادوا، بعض بعض کو پکارتے ہیں هلموا، جلدی آ جاؤ، الی حاجتکم، یعنی ذکر سننے اور ذکر کرنے والوں کی زیارت کے لئے۔ قال کا لفظ جہاں بھی ذکر ہے راقم نے ترجمہ کیا "فرمایا" اس کا فاعل نبی کریم ﷺ ہیں فیحفونهم باجنحتهم یعنی وہ ذکر کرنے والوں کے اردگرد اپنے پروں کو پھیرتے ہیں قال هم الجلساء لا یشقی جلیسهم رب تعالیٰ فرماتا ہے وہ کامل طور پر میرا ذکر کرنے والے ہیں ان کی محفل میں بیٹھنے والا ان کی برکات سے محروم نہیں رہ سکتا۔

"قال الطیبی ای هم جلساء لا یخیب جلیسهم عن کراماتهم فیشقی" علامہ طیبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس جملہ کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ وہ لوگ خالص میرا ذکر کرنے والے ہیں ان کے پاس بیٹھنے والا ان کی کرامات اور برکات سے محروم نہیں رہ سکتا کہ بدبخت ہی رہے۔

حدیث پاک میں ذکر والے حضرات کی محافل میں بیٹھنے کی رغبت دلائی گئی رب تعالیٰ نے بھی ارشاد فرمایا:

﴿ یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَکُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِیْنَ ﴾

"اے ایمان والو اللہ تعالیٰ سے ڈرو اور سچوں کے ساتھ ہو جاؤ"

فائدہ جلیلہ :

" قال بعض العارفین اصحبوا مع الله فان لم تقدروا فاصحبوا مع من یصحب مع الله "

عارفین حضرات فرماتے ہیں تم اللہ تعالیٰ کے مصاحب ہو جاؤ۔ اگر یہ قدرت تمہیں حاصل نہیں تو اللہ والوں کی محفل میں بیٹھو ان کے فیوض و برکات کو حاصل کرو۔

تنبیه : "انهم زائدون علی الحفظة وغیرهم لا وظیفة لهم الا حلق الذکر"

یہ فرشتے کراماً کاتبین کے علاوہ ہوتے ہیں ان کی عبادت ہی یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے بندوں کی ذکر کی محافل کو تلاش کریں اور اس میں شریک ہوں پھر رب تعالیٰ کے حضور جا کر اس کی خبر دیں۔

سوال عدم علم کی دلیل نہیں:

" فیسألهم الله وهو اعلم " اللہ تعالیٰ جاننے کے باوجود اپنے بندوں کا حال فرشتوں سے پوچھتا ہے اس کا یہ مطلب نہیں کہ اسے علم نہیں ہوتا بلکہ رب تعالیٰ اپنے بندوں کی شان اپنے فرشتوں پر واضح کرتا ہے کہ میرے بندے کس شان سے میرا ذکر کر رہے ہیں۔

☆ " عن ابی الدرداء قال قال رسول الله ﷺ الا انبئکم بخیر اعمالکم وازکاها عند ملیککم وارفعها فی درجاتکم وخیرلکم من انفاق الذهب والورق وخیرلکم من ان تلقوا عدوکم فتضربوا اعناقهم ویضربوا اعناقکم قالوا بلی قال ذکر الله "

(رواه مالک واحمد والترمذی وابن ماجه الا ان مالکا وقفه علی ابی الدرداء)

حضرت ابوالدرداء رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کیا میں تمہیں بہتر عمل اور تمہارے حاکم (اللہ تعالیٰ) کے پاکیزہ عمل اور تمہارے درجات کے بلند کرنے والا عمل اور تمہارا سونا اور چاندی خرچ کرنے سے بہتر عمل اور تمہاری دشمن سے ملاقات کہ تم ان کی گردنیں اڑاؤ اور وہ تمہاری گردنیں اڑائیں اس سے بہتر عمل کی خبر نہ دوں؟ صحابہ کرام نے عرض کیا ہاں یارسول اللہ آپ خبر دیں آپ نے فرمایا وہ عمل اللہ تعالیٰ کا ذکر ہے۔

وضاحت حدیث: اس حدیث کی وضاحت میں ابن الملک رحمہ اللہ نے فرمایا" المراد الذکر القلبی " کہ جس ذکر کی تعریف رسول اللہ ﷺ نے فرمائی اس سے مراد' دل کا ذکر ہے' کیونکہ اسی ذکر کو مال اور جان کے قربان کرنے سے زیادہ فضیلت حاصل ہے کیونکہ یہ نفس کا عمل ہے "وفعل القلب الذی هو اشق من عمل الجوارح بل هو الجهاد الاکبر " اور دل کا عمل ہی ظاہری اعضاء کے عمل سے زیادہ شاق ہے بلکہ جہاد اکبر سے بھی زیادہ شاق ہے۔ لیکن اس کے بعد ذکر لسانی (زبانی ذکر) کے متعلق جو الفاظ آپ نے ذکر فرمائے ان کو علامہ علی قاری رحمہ اللہ نے پسند نہیں فرمایا۔ ابن الملک رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

" لا الذکر باللسان المشتمل علی صیاح وانزعاج وشدة تحریک العنق واعوجاج کما یفعله بعض الناس زاعمین ان ذلک جالب للحضور وموجب للسرور حاشا لله بل موجب للغیبة والغرور "

جس ذکر کی تعریف نبی کریم ﷺ نے فرمائی اس سے زبانی ذکر جو بلند آواز سے کیا جائے جس میں زور زور سے چلایا جائے گردن کو پھیرا جائے مراد نہیں جیسا کہ بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ یہ رب تعالیٰ کے ہاں حضوری کا سبب ہے اور اس سے سرور حاصل ہوتا ہے " حاشا لله " خدارا ایسا نہیں بلکہ یہ تو رب سے دوری اور دھوکا کا سبب ہے۔ علامہ علی قاری رحمہ اللہ اس کا رد فرماتے ہیں:

" ولا شک ان الذکر یطلق علی الجنانی وعلی اللسانی وان المدار علی القلب الذی یتقلب بسبب ذکر المذکور من الغیبة الی الحضور وانما اللفظی وسیلة "

یہ شک وشبہ سے بالاتر ہے کہ ذکر کا اطلاق دل اور زبان کے دونوں ذکروں پر ہے قلب کا مطلب ہی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا ذکر دل کو پھیر دے اور رب تعالیٰ سے دوری کو قریب کر دے یہ کیفیت اسی وقت حاصل ہوگی جب پہلے زبانی ذکر حاصل ہوگا کیونکہ ہر وہ چیز جو مقصد تک پہنچنے کا ذریعہ ہے اسے پہلے حاصل کرنا ضروری ہے خصوصاً راہ سلوک میں ابتدائی طور پر قدم رکھنے والا پہلے زبانی ذکر ہی کرے گا پھر ذکر اور اہل ذکر کی برکات کی وجہ سے قلبی ذکر اسے خود بخود حاصل ہو جائے گا۔

تنبیه: اصل میں دل سے رب تعالیٰ کو یاد کرنے کی وجہ سے ہی انسان رب تعالیٰ کی راہ میں مال خرچ کرتا ہے اور جہاد کرتا ہے اس لئے قلبی ذکر درحقیقت تمام عبادات کا ذریعہ ہے اور باقی عبادات اس پر موقوف ہیں اس لئے یہ ان سے اعلیٰ اور ارفع ہے اور یہ بھی واضح بات ہے کہ عبادات میں اصل مقصود تقرب الٰہی ہے " والذکر انما هو المقصود الاسنی والمطلوب الاعلی " اور اس میں ذکر اعلیٰ مقصود اور اعلیٰ مطلوب ہے۔

رب تعالیٰ کا ارشاد ﴿ فَاذْكُرُونِيْ اَذْكُرْكُمْ ﴾ "تم مجھے یاد کرو میں تمہیں یاد کروں گا"

اور حدیث قدسی میں ارشاد باری تعالیٰ ہے " وانا جلیس من ذکرنی " جو مجھے یاد کرے میں اس کے ساتھ ہی ہوتا ہوں۔

اور رب تعالیٰ کا ارشاد حدیث قدسی میں ہے " وانا معه اذا ذکرنی " اس شخص کو میری معیت (قربت) حاصل ہوتی ہے جو مجھے یاد کرتا ہے۔

افضل الذکر : " فان قراء ۃ القرآن من کل ذکر افضل ومن جملۃ الاذکار والادعیۃ والاستغفار "

بیشک قرآن پاک کا پڑھنا ہر قسم کے ذکر سے افضل ہے تمام اذکار، تمام دعاؤں اور ہر قسم کی استغفار سے افضل ہے۔

" وفیه دلیل علی الاجتماع علی الذکر مزیة ومرتبة " ذکر کی محافل قائم کرنا جمع ہو کر ذکر کرنا افضل واعلیٰ ہے۔ (مرقاۃ ج ۵ ص ۵۲)

" لا ارتیاب ان افضل الذکر قول لا اله الا الله وهی القاعدة التی بنی علیها ارکان الدین وهی الکلمة العلیا وهی القطب الذی یدور علیها رحی الاسلام وهی الشعبة التی اعلی شعب الایمان " (مرقاۃ ج ۵ ص ۶۳)

اس میں کوئی شک نہیں افضل ذکر کلمہ " لا الـــه الا الله " ہے کیونکہ یہ دین کے ارکان کی بنیاد ہے یہی بلند مرتبہ کلمہ ہے اور یہی قطب (چکی کا کیل) ہے جس پر اسلام کی چکی چلتی ہے یہی ایمان کے شعبوں سے اعلیٰ شعبہ ہے۔ تمام عارفین اور ارباب قلوب ویقین اسی کلمہ کو تمام اذکار پر ترجیح دیتے رہے ان کو اسی طریقہ سے وجدان اور ذوق حاصل ہوتا رہا۔

حکایت : سید علی بن میمون مغربی کے ایک مدرس اور مفتی شیخ علوان حموی مرید ہوئے اور ان کے زیر تصرف آئے تو انہوں نے اپنے اس مرید کو تمام کام چھڑا کر ذکر باری تعالیٰ پر لگا دیا۔

" فطعن الجهال فیه بانه اضل شیخ الاسلام ومنعه عن نفع الانام " عام جاہل لوگوں نے اس پر طعنہ زنی شروع کی کہ شیخ نے مفتی کو راہ راست سے بھٹکا دیا ہے وہ جو لوگوں کو نفع پہنچا رہے تعلیم وافتاء سے اسے دور کر دیا۔ پھر شیخ کو معلوم ہوا کہ مفتی صاحب کبھی کبھی قرآن پاک کی تلاوت کرتے ہیں شیخ نے قرآن پاک پڑھنے کی بجائے ذکر کرنے کا ہی حکم دیا" فقال الناس انه زندیق یمنع من تلاوة القرآن الذی هو قطب الایمان وغوث الایقان " لوگوں نے کہا شیخ بے دین ہو گیا جو قرآن پاک کی تلاوت سے منع کرتا ہے وہ قرآن جو ایمان کا قطب ہے اور یقین کا غوث ہے۔

لیکن مرید جو مفتی اور مدرس بھی تھے وہ اپنے شیخ کی بات کو تسلیم کرتے رہے یہاں تک کہ

"حصل له المزید وانجلت مرآة قلبه وحصل له مشاهدة ربه" انہیں زیادہ رب تعالیٰ کا فضل وکرم حاصل ہوگیا ان کے دل کا آئینہ روشن ہوگیا، اوران کو رب تعالیٰ کی تجلیات کا مشاہدہ حاصل ہوگیا۔اب شیخ نے ان کوقرآن پاک پڑھنے کی اجازت دے دی:

" فلما فتح المصحف فتح علیه الفتوحات الازلیة والابدیة وظهر له کنوز المعارف والعوارف الظاهریة والباطنیة "

جب انہوں نے قرآن پاک کوکھولا تو ان پر ازلی اور ابدی فتوحات کھل گئیں اور ظاہری اور باطنی معرفت کے خزانے ان پر ظاہر ہوگئے۔اب شیخ نے بتایا کہ میں نے قرآن پاک کی تلاوت سے منع نہیں کیا تھا

" وانما کنت امنعک عن لقلقة اللسان والغفلة عما فیه من البیان فی هذا الشان والله المستعان " میں اس لئے منع کرتا تھا کہ صرف زبان چلتی رہے قرآن پاک کے رموز سے انسان بے خبر رہے کہ قرآن پاک کی شان کیا ہے یہ نفع مند نہیں بلکہ ذکر الٰہی سے دل کو آئینہ کی طرح صاف کرکے رب تعالیٰ سے امداد طلب کرے۔

راقم کا موقف: راقم کے نزدیک درود شریف پڑھنا سب سے افضل ذکر ہے کیونکہ ذکر خدا بھی ہے اور ذکر مصطفی بھی ہے اور دعا بھی ہے۔درود شریف کے فضائل تو اپنی جگہ پر آئیں گے ایک حدیث پاک کو دیکھئے تو راقم کی عقیدت سے آپ کو اتفاق نہ بھی ہو تو طعنہ زنی کی گنجائش بھی آپ کو نہیں مل سکے گی۔

☆ " عن ابی بن کعب قال قلت یا رسول الله انی اکثر الصلوة علیک فکم اجعل لک من صلاتی فقال ما شئت قلت الربع قال ما شئت فان زدت فهو خیرلک قلت النصف قال ما شئت فان زدت فهو خیرلک قلت فالثلثین قال ما شئت فان زدت فهو خیرلک قلت اجعل لک صلاتی کلها قال اذا تکفی همک ویکفرلک ذنبک "

(رواه الترمذی)

حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں میں نے عرض کی کہ یارسول اللہ بیشک میں آپ پر زیادہ سے زیادہ درود شریف پڑھنے کا ارادہ رکھتا ہوں تو میں اپنے درود شریف پڑھنے میں کتنا وقت صرف کروں؟ تو آپ نے فرمایا جتنا وقت چاہتے ہو اتنا ہی صرف کرو۔ میں نے عرض کیا کیا (اپنے اذکار

وغیرہ کے اوقات سے) چوتھا حصہ وقت صرف کرلیا کروں؟ آپ نے فرمایا جو چاہتے ہو اگر زیادہ کرلو تو تمہارے لئے بہتر ہے میں نے عرض کیا آدھا وقت صرف کرلیا کروں؟ آپ نے فرمایا جو چاہتے ہو اگر زیادہ کرلو تو تمہارے لئے بہتر ہے میں نے عرض کیا دو تہائی وقت صرف کرلیا کروں؟ آپ نے فرمایا جتنا وقت چاہو صرف کرلو اگر اس سے بھی تم زیادہ کرلو تو تمہارے لئے بہتر ہے میں نے عرض کیا میں آپ پر درود تمام اوقات میں پڑھ لیا کروں؟ آپ نے فرمایا یہ تمہارے ارادہ کے لئے کافی ہے اور تمہارے گناہوں کو مٹادے گا۔ (مشکوۃ باب الصلوۃ علی النبی ﷺ)

مختصر وضاحت: " معنى الحديث كم اجعل لك من دعائى الذى ادعو به لنفسى ولم يزل يفاوضه ليوقفه على حد من ذلك ولم ير النبى ﷺ ان يحد له ذلك لئلا تلتبس الفضيلة بالفريضة اولا ثم لا يغلق عليه باب المزيد ثانيا "

جب صحابی نے پوچھا کہ میں اپنی دعاؤں اور اذکار میں سے کتنا وقت آپ پر دورد شریف پڑھوں وہ وقت کا تعین چاہتے تھے لیکن نبی کریم ﷺ نے وقت کا تعین نہیں فرمایا کہ صرف کچھ وقت کے لئے درود پاک معین اور فرض نہ ہو جائے۔ بلکہ آپ رغبت دلاتے رہے یہاں تک کہ صحابی کو دعاؤں اور اذکار کے تمام اوقات درود شریف پڑھنے کا حکم دیا جب صحابی نے آپ پر تمام اوقات درود شریف پڑھنے کے متعلق عرض کی تو آپ نے ارشاد فرمایا:

(اذن تكفى همك) اى ما اهمك من امر دينك ودنياك وذلك لان الصلوة عليه مشتملة على ذكر الله وتعظيم الرسول ﷺ والاشتغال باداء حقه عن اداء مقاصد نفسه وايثاره بالدعاء على نفسه ما اعظمه من خلال جليلة الاخطار واعمال كريمة الآثار "

کہ اگر تم اپنی دعاء اور ذکر کے تمام اوقات درود شریف مجھ پر پڑھو گے تو تمہیں تمہارے دین اور دنیا کے امور کے ارادوں کے لئے کافی ہے وجہ درحقیقت اس کی یہ ہے کہ درود پاک اللہ تعالیٰ کے ذکر اور رسول اللہ ﷺ کی تعظیم اور آپ کے حقوق کو اداء کرنے میں مشغول ہونا اور انسان کا اپنے حقوق کو اداء کرنے میں مشغول ہونا اور اپنے لئے دعاء کرنے کی بجائے عظیم الشان ذکر میں مشغول ہونا ہے اور اعلیٰ آثار مرتب ہونے والے اعمال میں مشغول ہونا ہے۔ (مرقاۃ ج ۲ ص ۳۴۴)

سبحان اللہ کیا خوب ذکر ہے کیا شاندار کسی نے اپنا عقیدہ بیان کیا وہی راقم کا بھی عقیدہ ہے۔

کھلے آنکھ صل علی محمد کہتے کہتے
میں سو جاؤں یا مصطفےٰ کہتے کہتے

☆ " عن عبد اللہ بن بسر قال جاء اعرابی الی النبی ﷺ فقال ای الناس خیر قال طوبی لمن طال عمرہ وحسن عملہ قال یا رسول اللہ ای الا عمال افضل قال ان تفارق الدنیا ولسانک رطب من ذکر اللہ " (روہ احمد والترمذی)

حضرت عبداللہ بن بسر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں ایک اعرابی نبی کریم ﷺ کے پاس آئے تو اس نے عرض کی تمام لوگوں سے بہتر کون شخص ہے؟ آپ نے فرمایا وہ شخص اچھا ہے جس کی عمر زیادہ لمبی ہو اور اعمال اچھے ہوں پھر وہ اعرابی عرض کرنے لگے یا رسول اللہ عمل کون سے افضل ہیں؟ آپ نے فرمایا کہ دنیا سے جاؤ تو تمہاری زبان اللہ کے ذکر سے تر ہو۔

وضاحت حدیث: (ای الناس خیر) ای افضل حالا و اطیب مالا "لوگوں میں سے کون سا شخص وہ ہے جس کا حال افضل ہو اور پاکیزہ مال والا ہو؟ آپ نے فرمایا" طوبی لمن طال عمرہ وحسن عملہ " اس مقام میں " طوبی " ذکر فرمایا جو " الطیب " سے ماخوذ ہے فعلی کا وزن ہے، اس سے مراد اس شخص کی تعریف ہے، اور دونوں جہانوں میں اس کے اچھے حال کا ذکر فرمایا اور اس سے مراد جنت کا درخت طوبی بھی ہو سکتا ہے اور جنت میں بھلائی کا حصول بھی ہو سکتا ہے۔ نبی کریم ﷺ نے خبر دی، بیان فرمایا کہ لوگوں میں سے اچھے کون لوگ ہیں؟ وہ لوگ ہیں جن کی عمر لمبی ہو اور اعمال اچھے ہوں" اور "طوبی" ذکر فرما کر ان کیلئے سعادت دارین کی خبر بھی دے دی۔ پھر جب رسول اللہ ﷺ نے خبر دی کہ اچھے اعمال میں سے اچھا اور بہتر عمل یہ ہے کہ تم دنیا سے جا رہے ہو تو تمہاری زبان اللہ کے ذکر سے تر ہو، اس ذکر سے مراد کون سا ذکر ہے؟

" والذکر یشمل الجلی والخفی واللسان یحتمل القلبی والقالبی ولا منع من الجمع بل ھو ادعی الی مقام الجمع "

ذکر جلی اور خفی دونوں کو شامل ہے کیونکہ حدیث شریف میں " لسانک " استعمال ہے جس سے مراد لسان قلبی (دل کی زبان) اور لسان قالبی (جسم کی زبان) دونوں ہی مراد ہو سکتے ہیں دونوں ذکر جمع کرنے میں کوئی ممانعت نہیں بلکہ زیادہ بہتر یہی ہے کہ حدیث شریف میں دونوں ذکروں کو جمع

کرنا ہی مراد ہے۔

اور حدیث پاک سے یہ فائدہ حاصل ہوا " **افضل الاعمال ما یختم به الاحوال** " افضل اعمال یہ ہیں کہ انسان کا خاتمہ بالخیر ہو۔

فائدہ جلیلہ : فارق الدنیا سے مراد " **زهد الدنیا** " بھی ہوسکتا ہے اور " **رطب اللسان** " سے مراد اللہ تعالیٰ کا دل سے ذکر کرنا ہے " **فان الاناء يترشح بما فيه ومن احب شيأ اكثر ذكره بفيه** " یہ یقینی بات ہے جو چیز برتن میں ہوتی ہے وہی ٹپکتی ہے۔ جس سے محبت ہو اسی کا انسان اپنے منہ سے بھی ذکر کرتا ہے۔

سبحان اللہ کیا خوب مسئلہ حاصل ہوا کہ جس کے دل میں نور معرفت ہوگا وہ رسول اللہ ﷺ کے فضائل بیان کرے گا۔ اور جس کے دل میں کدورت ہوگی وہ (معاذ اللہ) نقائص بیان کرے گا۔

ذرا غور کریں وہ شخص خوش قسمت ہے جو اپنی تمام عمر اپنے پیارے حبیب پاک ﷺ کے کمالات وفضائل تلاش کرنے اور بیان کرنے میں گزار دے یا وہ شخص جو اپنی عمر نبی کریم ﷺ کے کمالات اور فضائل کو کم کرنے کی تلاش میں رہے، نقائص بیان کرنے میں عمر گزار دے، یہ فیصلہ قارئین کرام خود فرمائیں۔

علامہ طیبی رحمہ اللہ نے فرمایا کہ " **رطب اللسان** " سے مراد سہولت سے ادا کرنا۔ جس طرح "**یبس اللسان**" کا معنی اس کی ضد ہے یعنی مشکل سے ادا کرنا۔

اب معنی یہ ہوگا " **افضل الذكر مداومة الذكر فان الذكر هو المقصود وسائر الاعمال وسائل اليه** " کہ افضل ذکر وہ ہے جو ہمیشگی سے جاری رکھے بیشک ذکر ہی مقصود ہے بلکہ تمام اعمال ذکر کے وسائل ہی ہیں کیونکہ مقصد عظیم اللہ تعالیٰ کو یاد کرنا ہی ہے۔

ابن حبان، طبرانی اور بزار نے روایت حضرت معاذ رضی اللہ عنہ سے ذکر فرمائی کہ آپ کو جب نبی کریم ﷺ نے یمن کا حاکم بنا کر بھیجا تو یہ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے جدا ہوتے وقت سوال کیا " **ای الاعمال احب الی الله قال ان تموت ولسانک رطب من ذکر الله** " اللہ تعالیٰ کو کون سے عمل زیادہ پسند ہیں؟ تو آپ نے فرمایا کہ تمہاری موت اس حال میں آئے کہ تمہاری زبان اللہ تعالیٰ کے ذکر سے تر ہو۔ طبرانی میں یہ الفاظ بھی زائد ہیں۔

" قلت یا رسول اللہ اوصنی قال علیک بتقوی اللہ ما استطعت واذکر اللہ عند کل حجر وشجر وما عملت من سوء فاحدث للہ فیہ توبۃ السر بالسر والعلانیۃ بالعلانیۃ "

حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں میں نے عرض کیا یا رسول اللہ مجھے نصیحت فرمائیں آپ نے فرمایا جب تک تم طاقت رکھو اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہو (تقوی رکھو) اور ہر شجر وحجر کے پاس اللہ تعالیٰ کا ذکر کرو اور تم سے اگر کوئی غلطی ہو جائے تو اللہ تعالیٰ سے توبہ کرو، پوشیدہ طور پر غلطی ہو تو پوشیدہ طور پر توبہ کرو اور اگر ظاہر طور پر کوئی غلطی سرزد ہو تو ظاہر طور پر ہی اللہ تعالیٰ سے توبہ کرو۔

☆ " عن انس قال قال رسول اللہ ﷺ اذا مررتم بریاض الجنۃ فارتعوا قالوا وما ریاض الجنۃ قال حلق الذکر " (رواہ الترمذی)

حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جب تمہارا جنت کے باغات سے گزر ہو تو ان سے نفع حاصل کر لیا کرو صحابہ کرام نے عرض کیا وہ جنت کے باغات کیا ہیں؟ تو آپ نے فرمایا ذکر کے حلقے۔

وضاحت حدیث: "حلق" (بکسر الحاء وفتح اللام) جمع ہے حلقہ کی، ذکر کے حلقوں کو جنت کے باغات کہا گیا ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ذکر جنت میں پہنچانے کا ذریعہ ہے۔

" حاصل المعنی اذا مررتم بجماعۃ یذکرون اللہ تعالیٰ فاذکروہ انتم موافقۃ لھم فانھم فی ریاض الجنۃ " مطلب یہ ہے کہ جب تمہارا اس جماعت سے گزر ہو جو اللہ تعالیٰ کا ذکر کر رہے ہوں تو تم بھی ان کے ساتھ مل کر اللہ تعالیٰ کا ذکر کرو کیونکہ وہ جنت کے باغات میں ہیں

علامہ نووی رحمہ اللہ فرماتے ہیں " واعلم انہ کما یستحب الذکر یستحب الجلوس فی حلق اھلہ " یہ بات یقین سے جان لو کہ جس طرح ذکر کرنا مستحب ہے اسی طرح ذکر کے حلقوں میں بیٹھنا بھی مستحب ہے۔

" وھو قد یکون بالقلب وقد یکون باللسان وافضل منھما ما کان بالقلب واللسان جمیعا " ذکر کبھی دل سے ہوتا ہے اور کبھی زبان سے ہوتا ہے لیکن افضل ذکر وہ ہے جو دل سے بھی ہو اور زبان سے بھی ہو۔

اگر دل سے ذکر حاصل نہیں تو زبان سے ذکر کو نہ چھوڑے۔ پہلے ذکر ہو چکا ہے تاہم مرقاۃ کے حوالہ کو بھی ذہن نشین کر لیں۔

مریدین میں سے کسی نے اپنے شیخ کی خدمت میں عرض کیا "انا اذکر اللہ وقلبی غافل" میں اللہ تعالیٰ کا ذکر کرتا ہوں لیکن میرا دل غافل رہتا ہے" شیخ نے ارشاد فرمایا" اذکرو اشکر ان شغل عضوا منک بذکرہ واسألہ ان یحضر قلبک" اللہ کا ذکر کرتے رہو اور رب تعالیٰ کا شکریہ ادا کرو کہ اس نے آپ کے ایک عضو (یعنی زبان) کو اپنے ذکر میں مشغول رکھا ہوا ہے اور اس سے اپنے دل کے حضور کی بھی دعاء کرتے رہو۔

ایک اور حدیث حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مرفوع طور پر مروی ہے:

"اذا امررتم بریاض الجنۃ فارتعوا قلت وما ریاض الجنۃ قال المساجد قلت وما الرتع یا رسول اللہ قال سبحان اللہ والحمد للہ ولا الہ الا اللہ واللہ اکبر"

جب تمہارا جنت کے باغات سے گزر ہو تو وہاں سے نفع حاصل کر لیا کرو میں نے عرض کی وہ جنت کے باغات کیا ہیں؟ آپ نے فرمایا وہ مساجد ہیں میں نے عرض کی ان میں نفع مند چیزیں کیا ہیں؟ آپ نے فرمایا" سبحان اللہ والحمد للہ ولا الہ الا اللہ واللہ اکبر"

☆ "عن ابی ھریرۃ رضی اللہ عنہ قال قال رسول اللہ ﷺ من قعد مقعدا لم یذکر اللہ فیہ کانت علیہ من اللہ ترۃ ومن اضطجع مضجعا لا یذکر اللہ فیہ کانت علیہ من اللہ ترۃ"

(رواہ ابو داؤد)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جو شخص کسی بیٹھنے کی جگہ پر بیٹھتا ہے اللہ کا ذکر نہیں کرتا اس پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے خسارا ہے اور جو شخص کسی لیٹنے کی جگہ میں لیٹتے ہوئے اللہ تعالیٰ کا ذکر نہیں کرتا ہے اس پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے نقصان ہے۔

وضاحت حدیث: "مقعدا" کا معنیٰ" مجلسا او قعودا" یعنی یا ظرف ہے معنیٰ بیٹھنے کی جگہ یا مصدر ہے معنیٰ اس کا بیٹھنا ہے۔

"لم یذکر اللہ فیہ" لفظ فیہ میں ضمیر کا مرجع "مقعدا" ہی ہے یعنی مجلس یا بیٹھنے میں اللہ تعالیٰ کا ذکر نہ کیا۔

علیہ ، ای علی القاعد بیٹھنے والے پر۔ "من اللہ ای من جهة حكمه وامره وقضائه وقدره" اللہ تعالیٰ کے حکم اور اس کے امر اور اس کی قضاء وقدر سے۔

ترة ، مصدر ہے "عدة" کی طرح اصل مادہ وتر یتر ہے اور اس کا معنی ہے "تبعة ومعاتبة او نقصان وحسرة" پیچھا کرنا، عتاب کرنا، نقصان دینا، حسرت وندامت۔

جس طرح کہا جاتا ہے "وتر حقه" اس نے اپنے حق کو نقصان پہنچایا جو حسرت کا سبب ہے۔ اسی معنی کے مطابق رب تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿ وَلَنْ يَتِرَكُمْ اَعْمَالَكُمْ ﴾ "اور وہ ہرگز تمہیں تمہارے اعمال میں نقصان نہیں دے گا" (سورۃ محمد ۳۵)

حدیث شریف کا مطلب واضح ہے کہ انسان بیٹھتے اور سوتے وقت جب اللہ تعالیٰ کو یاد نہ کرے وہ رب تعالیٰ کے انعام واکرام سے محروم رہ کر خسارہ میں رہتا ہے۔

☆ "عن ابی هريرة قال قال رسول الله ﷺ ما من قوم يقومون من مجلس لا يذكرون الله فيه الا قاموا عن مثل جيفة الحمار وكان عليهم حسرة" (رواه احمد وابو داؤد)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کوئی ایسی قوم نہیں جو کسی مجلس سے اللہ تعالیٰ کے ذکر کے بغیر ہی اٹھ پڑیں سوائے اس کے کہ وہ مردار گدھے کی مثل سے اٹھے اور ان پر حسرت وندامت ہے۔

وضاحت حدیث: قیام کے بعد "عن" آئے تو تجاوز اور دوری کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔

اس لئے "قاموا عن مثل جيفة الحمار" کا معنی یہ ہے:

"لا يوجد منهم قيام عن مجلسهم الا كقيام المتفرقين عن اكل الجيفة التى هى غاية فى القذر والنجاسة"

جو لوگ کسی محفل سے بغیر اللہ تعالیٰ کے ذکر کے اٹھ کھڑے ہوتے ہیں وہ ایسے ہی ہیں جیسے مردہ گدھے کا گوشت کھا کر اٹھ پڑیں جو نہایت گندا اور نجس ہوتا ہے۔

"وقال ابن الملك وتخصيص جيفة الحمار بالذكر لانه ادون الجيف من بين الحيوانات التى تخالطنا ، او لكونه ابلد الحيوانات او لكونه مخالطا للشيطان ولهذا يتعوذ نهيقه بالرحمن"

ابن الملک رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ مردہ گدھے کا ذکر خصوصی طور پر کرنے کی وجہ یہ ہے کہ یہ باقی حیوانوں کی بنسبت گھٹیا جانور ہے اور اسی لئے اس کا مردار ہونا بھی گھٹیا ہے اور یہ تمام حیوانوں سے بے وقوف بھی ہے اور یہ وجہ بھی ہے کہ یہ شیطان سے ملتا ہے اسی لئے اس کے ہینگنے پر اللہ تعالیٰ کی پناہ مانگنے کا حکم دیا گیا۔

یہی حدیث جس کی وضاحت ذکر کی جارہی ہے۔ اسی مضمون کی حدیث نسائی اور ابن حبان نے بھی بیان فرمائی وہ اس طرح ہے:

"ما من قوم جلسوا مجلسا وتفرقوا منه ولم يذكروا الله فيه الا كانما تفرقوا عن جيفة حمار وكان عليهم حسرة يوم القيامة وما مشى احد ممشى لم يذكر الله فيه الا كان عليه ترة وما اوى احد الى فراشه ولم يذكر الله فيه الا كان عليه ترة"

کوئی قوم ایسی نہیں جو کسی مجلس میں بیٹھیں اور اس سے متفرق ہوں کہ اس میں انہوں نے اللہ تعالیٰ کا ذکر نہ کیا ہو مگر یہ کہ وہ ایسے ہی ہیں جیسے مردار گدھے سے متفرق ہوئے ہوں اور ان پر قیامت کے دن حسرت ہے اور جو شخص چلتے ہوئے اللہ تعالیٰ کا ذکر نہ کرے وہ نہیں سوائے نقصان اٹھانے والوں کے۔ اور جو شخص اپنے بستر پر آرام کرے اور اللہ کا ذکر نہ کرے وہ نہیں سوائے نقصان اٹھانے والوں کے۔

☆ **"وعن ابى هريرة قال قال رسول الله ﷺ ما جلس قوم مجلسا لم يذكروا الله فيه ولم يصلوا على نبيهم الا كان عليهم ترة فان شاء عذبهم وان شاء غفرلهم"**

(رواہ الترمذی)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کوئی قوم کسی مجلس میں نہیں بیٹھتی کہ اس میں وہ اللہ تعالیٰ کا ذکر نہ کریں اور اپنے نبی (ﷺ) پر درود نہ پڑھیں مگر یہ کہ وہ خسارہ میں ہوتے ہیں، پس اگر اللہ تعالیٰ چاہے تو ان کو عذاب دے اور چاہے تو ان کی مغفرت فرمائے۔

حدیث شریف کا مضمون بہت واضح ہے کہ ہر مجلس میں اللہ تعالیٰ کا ذکر کیا جائے اور نبی کریم ﷺ پر درود شریف پڑھا جائے اگر مجلس اللہ تعالیٰ کے ذکر اور اس کے حبیب پاک ﷺ پر درود شریف پڑھنے سے خالی ہو تو وہ بے برکت اور باعث نقصان ہوتی ہے۔ ایسی محفل والوں کے لئے اللہ تعالیٰ کی طرف سے بخشش کا کوئی وعدہ نہیں ہوتا بلکہ رب تعالیٰ کی مشیت پر موقوف ہے چاہے تو ان کو عذاب دے اور

چاہے تو ان کی مغفرت فرمائے۔

☆ " عن ام حبیبة قالت قال رسول الله ﷺ کل کلام ابن آدم علیه لا له الا امر بمعروف او نهی عن المنکر او ذکر الله" (رواہ الترمذی و ابن ماجه وقال الترمذی هذا حدیث غریب)

حضرت ام حبیبہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ابن آدم کا ہر کلام بے فائدہ ہے، اس کا اسے کوئی فائدہ نہیں سوائے ،امر بالمعروف کے یا نهی عن المنکر یا اللہ کے ذکر کے۔

وضاحت حدیث: علی ، ضرر کے لئے آتا ہے اور " لام "نفع کے لئے آتا ہے حدیث شریف میں "کل کلام ابن آدم علیه لا له " کا ظاہری معنی تو یہ ہے کہ ابن آدم (آدمی) کا ہر کلام اس کے لئے نقصان دہ ہے نفع مند نہیں۔

حدیث پاک کا یہ ظاہری معنی تو مراد ہو نہیں سکتا ، کیونکہ انسان ہر وقت کلام کا محتاج ہے کتنے کلام وہ ہیں جو مباح ہیں ان تین کے علاوہ ہیں جو اس حدیث میں مذکور ہیں تو یہ کس طرح درست ہے؟

تو اس کا جواب یہ ہے " کل کلام ابن آدم حسرة علیه لا منفعة له فیه الا المذکورات وامثا لها " کہ حدیث پاک سے مراد یہ ہے کہ انسان کو ہر کلام پر حسرت ہوگی کوئی فائدہ نہیں ہوگا سوائے ان تین کلاموں کے جن کا ذکر حدیث پاک میں ہے اور اسی طرح کا اور کلام جو خیر پر مبنی ہو۔ یہ حدیث پاک دراصل قرآن پاک کی اس آیت کا اقتباس ہے:

﴿ لَا خَيْرَ فِيْ كَثِيْرٍ مِّنْ نَّجْوٰىهُمْ اِلَّا مَنْ اَمَرَ بِصَدَقَةٍ اَوْ مَعْرُوْفٍ اَوْ اِصْلَاحٍ بَيْنَ النَّاسِ ﴾

"ان کے اکثر مشوروں میں کچھ بھلائی نہیں مگر جو حکم دے خیرات یا اچھی بات یا لوگوں میں صلح کرنے کا" (النساء ۱۱۴)

یہ مسئلہ واضح ہو گیا کہ اس حدیث میں مفید کلام اور غیر مفید کلام کا ذکر ہے نقصان دہ اور نفع مند کا ذکر نہیں۔

امر بالمعروف : "مما فیه نفع الغیر من الاوامر الشریعة"

امر بالمعروف سے مراد یہ ہے کہ وہ کلام جس میں غیر کا نفع ہو وہ یہ ہے کہ شریعت کے احکام کا حکم دے کہ لوگ ان پر عمل کر کے نجات حاصل کر سکیں۔

نهی عن منکر : " مما فیه موعظة الخلق من الامور المنهیة "

یعنی نهی عن منکر سے مراد یہ ہے کہ مخلوق کو برے کاموں سے روکنے کی نصیحت کریں کہ

لوگ ان سے اجتناب کر کے رب تعالیٰ کا تقرب حاصل کرلیں۔

ذکر اللہ : "ای ما فیه رضاء الله من الاذکار الالهیة کالتلاوة والصلوة علی النبی ﷺ والتسبیح والتهلیل والدعاء للوالدین وما اشبه ذلک"

اللہ کے ذکر سے مراد وہ ذکر ہے جس میں اللہ تعالیٰ کی رضاء پائی جائے، وہ اذکار الھیہ عام ہیں۔ تلاوت قرآن پاک ہو نبی کریم ﷺ پر درود شریف پڑھا جائے اور تسبیح (سبحان اللہ) پڑھنا اور تہلیل (لا الہ الا اللہ) پڑھنا اور والدین کے لئے دعاء کرنا اور اس کے مشابہ تمام قسم کے اوراد اور وظائف۔

حضرت علامہ قاری رحمہ اللہ نے کیا خوب مسئلہ حل کر دیا کہ والدین کے لئے دعاء کرنا بھی اللہ کا ذکر ہے اور لطف کی بات یہ ہے کہ اس کے ساتھ "فی الحیاۃ" کی قید نہیں لگائی بلکہ مطلق حکم بیان کیا جس سے واضح ہو رہا ہے کہ والدین کے لئے دعاء کرنا ان کی زندگی میں اور ان کی وفات کے بعد اللہ تعالیٰ کا ذکر ہی ہے۔

"وما اشبه ذلک" سے اور واضح ہو رہا ہے کہ تمام مسلمان اقرباء کے لئے بلکہ تمام مسلمانوں کے لئے ان کی زندگی میں اور ان کی موت کے بعد دعاء کرنا اللہ تعالیٰ کا ذکر ہے، جب اللہ تعالیٰ کا ذکر انسان کے لئے نفع مند ہے اور اللہ تعالیٰ کو پسند ہے تو یقیناً والدین کے لئے اور دوسرے اقرباء اور مسلمانوں کے لئے دعاء کرنا نفع مند بھی ہے اور رب تعالیٰ کو پسند بھی ہے۔

☆ "وعن ابن عمر قال قال رسول الله ﷺ لا تکثروا الکلام بغیر ذکر الله فان کثرة الکلام بغیر ذکر الله قسوة للقلب وان ابعد الناس من الله القلب القاسی" (رواه الترمذی)

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ تعالیٰ کے ذکر کے بغیر زیادہ کلام نہ کرو بیشک اللہ تعالیٰ کے ذکر کے بغیر زیادہ کلام کرنا دل کو سخت کر دیتا ہے بیشک اللہ تعالیٰ کی رحمت سے اور لوگوں کی بنسبت زیادہ دور ہونے والا وہی شخص ہوگا جس کا دل سخت ہو۔

وضاحت حدیث: جب حدیث شریف میں زیادہ کلام سے منع کیا گیا ہے تو اسی سے واضح ہوا کہ دنیا کی کلام مطلقاً منع نہیں، بے مقصد، بے فائدہ کلام سے گریز کیا جائے، اچھا اور خیر پر مبنی کلام کیا جائے، جب بیہودہ کلام دل کو سخت کرتا ہے تو بیہودہ قہقہہ لگا کر ہنسنا قساوت قلب کا سبب کیوں نہیں، کیا دینی مدارس

کے طلباء نے کبھی سوچا کہ ہمارا اور کالجز کے طلباء کا امتیاز ہی متانت اور بیہودگی کا ہے، ہاں دین کے طلباء کرام! بیہودہ قہقہے لگانے کی عادت کبھی نہ ڈالنا ورنہ دینی طلباء کی شرافت کا بھرم برباد ہو کر رہ جائے گا۔

قساوۃ قلب کیا ہے؟

" وھی النبو عن سماع الحق والمیل الی مخالطة الخلق وقلة الخشية وعدم الخشوع والبكاء وكثرة الغفلة عن دار البقاء"

قساوت قلب یہ ہے کہ انسان حق بات سننے سے دور ہو جائے اور مخلوق سے میل جول زیادہ رکھے، رب تعالیٰ کا خوف دل میں کم ہو جائے اور خشوع نہ پایا جائے، دل کی نرمی اور رب تعالیٰ کے خوف کے نہ پائے جانے کی وجہ سے رونا نہ آئے اور آخرت سے بہت زیادہ غافل ہو جائے۔

قساوت قلب کو رب تعالیٰ کے اس ارشاد سے سمجھا جائے:

﴿ ثُمَّ قَسَتْ قُلُوْبُكُمْ مِنْ بَعْدِ ذٰلِكَ فَهِيَ كَالْحِجَارَةِ اَوْ اَشَدُّ قَسْوَةً ﴾ (البقرة ۷۴)

"پھر اس کے بعد تمہارے دل سخت ہو گئے تو وہ پتھروں کی مثل ہیں بلکہ ان سے بھی زیادہ سخت"

﴿ اَلَمْ يَأْنِ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْ تَخْشَعَ قُلُوْبُهُمْ لِذِكْرِ اللّٰهِ وَمَا نَزَلَ مِنَ الْحَقِّ وَلَا يَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلُ فَطَالَ عَلَيْهِمُ الْاَمَدُ فَقَسَتْ قُلُوْبُهُمْ وَكَثِيْرٌ مِّنْهُمْ فٰسِقُوْنَ ﴾ (الحدید ۱۶)

"کیا ایمان والوں کے لئے ابھی وقت نہ آیا کہ ان کے دل جھک جائیں اللہ کی یاد اور اس کے حق کیلئے جو اترا، اور ان جیسے نہ ہوں جن کو پہلے کتاب دی گئی پھر ان پر مدت دراز ہوئی تو ان کے دل سخت ہو گئے اور ان میں بہت فاسق ہیں"۔

☆ " وعن ثوبان قال لما نزلت (والذين يكنزون الذهب والفضة) كنا مع النبی ﷺ فی بعض اسفاره فقال بعض اصحابه نزلت فی الذهب والفضة لو علمنا ای المال خير فنتخذه فقال افضله لسان ذاكر وقلب شاكر وزوجة مؤمنة تعينه عن ايمانه "
(رواه احمد والترمذی وابن ماجه)

حضرت ثوبان رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں جب یہ آیۃ کریمہ ﴿ وَالَّذِيْنَ يَكْنِزُوْنَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ ﴾ نازل ہوئی تو ہم نبی کریم ﷺ کے ساتھ کسی سفر میں تھے تو بعض صحابہ کرام کہنے لگے کہ یہ آیۃ تو سونے اور چاندی (کی مذمت) کے بارے میں نازل ہوئی کاش ہمیں یہ معلوم ہو جائے کون سا

مال بہتر ہے تو ہم وہی حاصل کرلیں تو نبی کریم ﷺ نے فرمایا تمام اموال سے بہتر چیز یہ ہے کہ ذکر کرنے والی زبان حاصل ہو اور شکر کرنے والا دل حاصل ہو اور ایمان دار زوجہ حاصل ہو اور وہ اس کے ایمان کی معاون ہو یعنی وہ شخص ایمان پر قائم ہو۔

وضاحت حدیث: نبی کریم ﷺ کے ساتھ سفر میں کچھ صحابہ کرام تھے اسی سفر کی حالت میں یہ آیۃ کریمہ نازل ہوئی۔ ﴿ وَالَّذِيْنَ يَكْنِزُوْنَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ وَلَا يُنْفِقُوْنَهَا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ ﴾ ''اور وہ جو جمع کر کے رکھتے ہیں سونا اور چاندی اور اسے اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے انہیں خوشخبری سناؤ دردناک عذاب کی''

تو صحابہ کرام میں سے بعض نے کہا کہ یہ تو ہمیں معلوم ہو چکا ہے کہ سونے اور چاندی کی مذمت میں یہ آیۃ کریمہ نازل ہوئی کاش کہ ہمیں یہ بھی معلوم ہو جائے کہ انسان کیلئے افضل کیا چیز ہے؟ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ انسان کیلئے افضل ذکر کرنے والی زبان، شکر کرنے والا دل، اور ایمان دار زوجہ ہیں اور آپ نے فرمایا وہ عورت اس کے ایمان کی معاون ہو، یعنی اسے دین پر قائم رہنے، نماز ادا کرنے، روزہ رکھنے کی یاد دلاتی ہے، تاکہ وہ ان پر عمل کرے اور تمام عبادات کو بجالائے اور تمام گناہوں سے اجتناب کرے۔

صحابہ کرام کے سوال پر نبی کریم ﷺ نے جواب مال کے متعلق نہیں دیا ''لان المال لا ينفعه ولاشئی للرجل انفع مما ذکر'' اس لئے کہ مال انسان کے لئے نفع مند نہیں جن چیزوں کا ذکر فرمایا وہی نفع مند ہیں۔ ہاں البتہ یہ بھی خیال رہے کہ ان چیزوں پر عمل کرنے والے کم ہی ہیں۔ کیونکہ رب تعالیٰ کا ارشاد گرامی اس پر واضح دلیل ہے '' وقليل من عبادی الشكور '' اور میرے بندوں سے تھوڑے ہی شکر گزار ہیں۔

☆ '' عن ابی سعید قال خرج معاوية على حلقة فی المسجد فقال ما اجلسكم قالوا جلسنا لذكر الله قال آلله ما اجلسكم الا ذلک قالوا آلله ما اجلسنا غيره قال اما انی لم استحلفكم تهمة لكم وما كان احد بمنزلتی من رسول الله ﷺ اقل عنه حديثا منی وان رسول الله ﷺ خرج على حلقة من اصحابه فقال ما اجلسكم ههنا قالوا جلسنا نذكر الله ونحمده على ما هدانا للاسلام ومن به علينا قال آلله ما اجلسكم الا ذلک قالوا آلله ما اجلسنا الا ذلک قال اما انی لم استحلفكم تهمة لكم ولكنه اتانی جبريل فاخبرنی ان الله

عزوجل يباهي بكم الملائكة" (رواه مسلم)

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ فرماتے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ مسجد کے ایک حلقہ میں تشریف لائے تو آپ نے فرمایا تمہیں یہاں کس چیز نے بٹھا رکھا ہے؟ انہوں نے کہا ہم اللہ تعالیٰ کے ذکر کے لئے بیٹھے ہیں، آپ نے فرمایا کیا تم اللہ تعالیٰ کی قسم اٹھا کر کہتے ہو تمہیں اس چیز کے بغیر کسی اور چیز نے نہیں بٹھایا؟ انہوں نے کہا ہاں اللہ تعالیٰ کی قسم ہے ہمارے بیٹھنے کی صرف یہی وجہ ہے، پھر آپ نے فرمایا میں نے تم سے قسم بدگمانی کے طور پر نہیں لی (بلکہ اس کی وجہ یہ ہے) کوئی ایک بھی میری طرح رسول اللہ ﷺ کے قریب رہ کر کم حدیثیں بیان کرنے والا نہیں۔

بیشک رسول اللہ ﷺ صحابہ کرام کے ایک حلقہ پر تشریف لائے تو آپ نے فرمایا تم یہاں کیوں بیٹھے ہو؟ انہوں نے عرض کیا ہم یہاں بیٹھ کر اللہ تعالیٰ کا ذکر کر رہے ہیں ہمیں جو اس نے اسلام کی ہدایت دے رکھی ہے، اور ہم پر جو اس نے احسان کیا ہوا ہے، ہم اس کی حمد کر رہے ہیں، آپ نے فرمایا کیا اللہ کی قسم تمہارے یہاں بیٹھنے کی صرف یہی وجہ ہے؟ انہوں نے عرض کیا قسم ہے اللہ تعالیٰ کی ہمارے یہاں بیٹھنے کی صرف یہی وجہ ہے، نبی کریم ﷺ نے فرمایا میں نے تم سے قسم کسی بدگمانی کی وجہ سے نہیں لی۔ میرے پاس ابھی جبریل آئے جنہوں نے خبر دی کہ اللہ تعالیٰ تمہاری وجہ سے فرشتوں پر فخر کر رہا ہے۔

وضاحت حدیث: **حلقة في المسجد**، حلقۃ کے لام پر فتحہ بھی پڑھا گیا ہے اور سکون بھی۔ مطلب یہ ہے کہ وہ لوگ مسجد میں ایک دوسرے کے سامنے دائرہ بنا کر بیٹھے ہوئے تھے۔

ما اجلسكم، میں "ما" استفہامیہ ہے سوال یہ کیا گیا کہ تمہیں کس سبب نے یہاں بٹھا رکھا ہے یعنی یہاں اس ہیئت پر اس طریقہ پر تمہارے بیٹھنے کی وجہ کیا ہے؟

آللہ، پہلے جو سوال میں ہے اس میں " **همزة الاستفهام وقعت بدلا عن حرف القسم ويجب الجر معها** " ہمزہ استفہام کے لئے ہے اور حرف قسم کا بدل ہے، اس کے بعد جر (زیر) ہے، تقریباً قسم اور استفہام کے دونوں معنی مراد ہیں کیا اللہ کی قسم ہے کہ تمہارے یہاں بیٹھنے کی اور کوئی وجہ نہیں؟

اورجواب میں جو " آللہ " استعمال ہے اس کا مطلب یہ ہے "وقع الھمزۃ موقعھا مشاکلۃ وتقریرا لذلک وتقدیرہ ای او نعم قسم اللہ "

کہ ہمزہ استفہام کے لئے ہے مشاکلت کے طور پر استعمال ہوا ہے استفہام تقریری ہے معنی یہ ہے کہ ہاں اللہ کی قسم ہے کہ ہمارے بیٹھنے کی اور کوئی وجہ نہیں۔

" قال اما انی لم استحلفکم تھمۃ لکم وما کان احد بمنزلتی من رسول اللہ ﷺ اقل عنہ حدیثا منی "

" اما " تنبیہ کے لئے ہے یا " حقا " کے معنی میں ہے آپ کے ارشاد کا مطلب یہ تھا کہ میں نے تم سے جو قسم لی ہے اس کی وجہ یہ نہیں کہ مجھے تم پر کوئی بدگمانی تھی کہ تم جھوٹ بول رہے ہو در حقیقت میں اس کلام کے مشابہ کلام کرنا چاہتا ہوں جو نبی کریم ﷺ نے اپنے صحابہ کرام سے ارشاد فرمایا تھا۔

" وقدم بیان قربہ منہ علیہ الصلوۃ والسلام وقلۃ نقلہ من احادیثہ الکرام دفعا لتھمۃ الکذب عن نفسہ فیما ینقلہ من الکلام "

آپ نے پہلے اپنا مقام بیان فرمایا جو آپ کو نبی کریم ﷺ کا قرب رہا، اور اپنے قلیل حدیث بیان کرنے کی وجہ بیان کی۔ تا کہ کوئی آپ کی روایت کو جھوٹا نہ کہہ سکے۔

سبحان اللہ صحابہ کرام کا کیا مقام کشف ہے کہ آپ کو معلوم ہے کہ کئی بے دین اور بے ایمان میرے متعلق لوگوں میں بدگمانیاں پیدا کریں گے، خود بھی گمراہ ہوں گے دوسروں کو بھی گمراہ کریں گے۔

آیئے ذرا دیکھیں آپ اپنی شان کیا بیان کر رہے ہیں "وما کان احد بمنزلتی من رسول اللہ ﷺ" تمام حاضرین کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا تم میں سے کوئی ایک بھی رسول اللہ ﷺ کے اتنا قریب نہیں جتنا میں ہوں۔ علامہ علی قاری رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

" لکونہ محرما لام حبیبۃ اختہ من امھات المؤمنین ولذا عبر عنہ المولوی فی المثنوی بخال المؤمنین ولکونہ من اجلاء کتبۃ الوحی "

آپ کو اس لئے نبی کریم ﷺ سے قرب حاصل تھا کہ آپ ام المؤمنین رسول اللہ ﷺ کی زوجہ مطہرہ کے بھائی تھے چونکہ حضور کی تمام بیبیاں مومنوں کی مائیں ہیں۔ قرآن پاک میں فرمایا

﴿وَاَزْوَاجُـهٗ اُمَّهَاتُهُمْ﴾ اورآپ کی ازواج ان (مومنوں) کی مائیں ہیں، ماں کا بھائی ماموں ہوتا ہے اسی لئے مولنا روم رحمہ اللہ نے آپ کو مومنوں کا ماموں قرار دیا

اور حدیث پاک سے یہ بھی ثابت ہے کہ ماموں کو باپ کا مقام حاصل ہوتا ہے تو اس لحاظ سے حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ مومنوں کے ماموں اور باپ کے درجہ میں ہیں لیکن جب نبی کریم ﷺ کی ازواج کافروں کی مائیں نہیں تو یقینی بات ہے حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کا ان سے کوئی رشتہ نہیں۔

اقل عنه حديثا منی : آپ فرماتے ہیں مجھے حضور ﷺ سے قرابت بھی حاصل ہے لیکن پھر بھی میں آپ سے احادیث کم روایت کرتا ہوں اس کی وجہ یہ ہے:

" لا حتياطی فی الحديث والا كان مقتضی منزلته ان يكون كثير الرواية ولعله كان ممن لم يجوز نقل الرواية بالمعنی "

کہ آپ احتیاط فرماتے تھے کہ کہیں حدیث بیان کرتے ہوئے حضور کے الفاظ نہ بدل جائیں ورنہ آپ قرابت کے لحاظ سے زیادہ احادیث بیان فرماتے لیکن کئی حضرات صحابہ کرام حدیث کا مفہوم اپنے الفاظ میں بیان کرنا جائز نہیں سمجھتے تھے کہ آپ کے الفاظ بدلنے نہ پائیں اسی ڈر سے ان کی روایات بہت کم واقع ہیں۔

اس کے بعد حدیث پاک کا مضمون واضح ہے اور صحابہ کرام کا یہ عرض کرنا کہ ہمارے یہاں بیٹھنے کی صرف وجہ یہ ہے کہ ہم اللہ تعالیٰ کے احسان اور اس نے ہمیں جو ہدایت عطاء کر رکھی ہے اس پر اس کی حمد کریں اور اس کا ذکر کریں۔

یہ ایسے ہی ہے جیسا کہ جنت والے حضرات کہیں گے " اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ هَدَانَا لِهٰذَا وَمَا كُنَّـا لِـنَهْتَدِیَ لَوْ لَا اَنْ هَدَانَا اللّٰه " سب تعریفیں اللہ تعالیٰ کے لئے ہیں جس نے ہمیں ہدایت دی اس کی اگر اللہ تعالیٰ ہمیں ہدایت نہ فرماتا تو ہم ہدایت حاصل نہ کر پاتے۔

ان الله عزوجل يباهی بكم الملا ئكة : اس کا معنی یہ ہے:

" ان الله تعالىٰ يقول لملائكته انظروا الی عبيدی هؤلاء كيف سلطت عليهم نفوسهم وشهواتهم، واهويتهم والشيطان وجنوده ومع ذلك

قویت همتهم علی مخالفة هذه الدواعی القویة الی البطالة وترک العبادة والذکر فاستحقوا ان یمدحوا اکثر منکم لانکم لا تجدون للعبادة مشقة بوجه"

بے شک اللہ تعالیٰ فرشتوں سے فرمائے گا میرے ان بندوں کو دیکھو کس طرح میں نے ان پر ان کے نفوس کو، ان کی خواہشات کو اور ان کی قلبی محبتوں کو اور شیطان کو اور شیطانی لشکر کو مسلط کر رکھا ہے جو ان کو باطل راہ کی طرف لگانے والے ہیں عبادات اور ذکر سے روکنے والے ہیں لیکن یہ پھر بھی کتنی قوی ہمت والے لوگ ہیں کہ تمام سازشوں اور رکاوٹوں کا مقابلہ کرتے ہوئے میرا ذکر کر رہے ہیں لہذا اے فرشتو یہ لوگ تم سے زیادہ مدح کے مستحق ہیں کیونکہ تمہیں عبادت سے روکنے والے کوئی ذرائع نہیں تمہارا عبادت کرنا آسان ہے۔

سبحان اللہ اے انسان اللہ تعالیٰ کے ذکر کی وجہ سے تیرا مقام کتنا بلند ہے کہ فرشتوں کے سامنے رب ذوالجلال تیری تعریف کر رہا ہے۔

☆ "عن عبد اللہ بن بسر ان رجلا قال یا رسول اللہ ان شرائع الاسلام قد کثرت علی فاخبرنی بشئی اتشبث بہ قال لا یزال لسانک رطبا من ذکر اللہ"

(رواہ الترمذی وابن ماجہ وقال الترمذی هذا حدیث حسن غریب)

حضرت عبداللہ بن بسر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں بیشک ایک شخص نے عرض کیا یا رسول اللہ بیشک شرائع اسلام مجھ پر کثیر ہو گئے آپ مجھے کسی ایسی چیز کی خبر دیں جس کے ساتھ میں سہارا پکڑوں (یعنی جس پر میں عمل کروں) آپ نے فرمایا تم اپنی زبان کو ہمیشہ ذکر سے تر رکھو۔

وضاحت حدیث: شریعت کا لغوی معنی یہ ہے "اونٹوں کو جاری پانی پر پیش کرنا" لیکن اصطلاح میں وہ کام جو اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کیلئے مشروع قرار دیئے یعنی فرائض اور واجبات پر شریعت کا اطلاق زیادہ ہے "والظاهر ان المراد بها هنا النوافل" لیکن ظاہر یہی ہے کہ اس مقام پر مراد نوافل ہیں۔ صحابی کے عرض کرنے کا مقصد یہ تھا کہ نفلی عبادات کثیر ہیں تمام پر عمل کرنا تو میرے لئے مشکل ہے تو آپ مجھے کسی قلیل عبادت کی خبر دے دو جس پر ثواب زیادہ مرتب ہو "معناه اخبرنی بشئی یسیر مستجلب لثواب کثیر" یعنی ایسی عبادت ہو جو آسان بھی ہو اور اس کا ثواب بھی زیادہ ہو۔

"التشبث ای اتعلق به من عبادة جامعة غیر شاقة ما نعة فی مکان دون مکان وزمان دون زمان وحال دون حال من قیام وقعود واکل وشرب ومخالطة واعتزال وشباب وهرم وغیر ذلک ویکون جابرا عن بقیتها مشتملا علی کلتیهما"

مقصد یہ تھا کہ میں ایسی عبادت سے تعلق رکھوں ایسی عبادت پر عمل کروں جو کئی نفلی عبادات کو جامع اور شامل ہو اور اس عبادت کا تعلق کسی خاص مکان اور کسی خاص زمان اور کسی خاص حال سے نہ ہو نہ وہ عبادت کھڑے ہو کر کرنے سے مختص ہو اور نہ ہی بیٹھنے سے، وہ ایسی عبادت ہو جو کھانے اور پینے کے وقت بھی جاری رہ سکے اور وہ ایسی عبادت ہو جو لوگوں کی محفل میں بھی جاری رکھی جا سکے اور اکیلے بھی اس پر عمل ہو سکے جوانی میں بھی اس پر عمل جاری رہے اور بڑھاپے میں بھی اور باقی نفلی عبادات کی کمی بھی اس سے پوری کی جا سکے اور جتنی دو دو چیزوں کا ذکر ہے ان تمام میں اس پر عمل کیا جا سکے؟ وہ عظیم عبادت نبی کریم ﷺ نے بیان فرمائی " لا یزال لسانک رطبا من ذکر الله " ہمیشہ تمہاری زبان اللہ تعالیٰ کے ذکر سے تر رہے۔ ''لسان'' سے مراد اس حدیث میں قلبی اور قالبی دونوں ہی ہیں یعنی زبان اور دل سے اللہ تعالیٰ کو یاد کرو۔

☆ " وعن ابی سعید ان رسول الله ﷺ سئل ای العباد افضل وارفع درجة عندالله یوم القیامة قال الذاکرون الله کثیرا والذاکرات قیل یا رسول الله ومن الغازی فی سبیل الله قال لو ضرب بسیفه فی الکفار والمشرکین حتی ینکسر ویختضب دما فان الذاکر لله افضل درجة " (رواه احمد والترمذی وقال هذا حدیث غریب)

حضرت ابو سعید رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ سے سوال کیا گیا کون سے بندے قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کے ہاں افضل اور بلند درجہ رکھتے ہوں گے؟ آپ نے فرمایا اللہ تعالیٰ کا ذکر کرنے والے خواہ مرد ہوں یا عورتیں، پھر آپ سے پوچھا گیا کیا یہ اللہ تعالیٰ کی راہ میں جہاد کرنے والوں سے بھی افضل ہوں گے؟ آپ نے فرمایا ہاں اگر ان کی تلوار کفار و مشرکین پر چلاتے ہوئے ٹوٹ بھی جائے اور وہ شخص اور اس کی تلوار خون آلود بھی ہو جائے تو پھر بھی اللہ تعالیٰ کے ذکر کرنے والوں کا درجہ بلند رہے گا۔

وضاحت حدیث: ذکر سے مراد اس پر ہمیشگی کرنا۔ خیال رہے کہ وہی ذکر قابل تعریف ہے جب کہ

فرائض اور واجبات کو ادا کیا جائے اور نا جائز کاموں سے اجتناب کیا جائے۔ جہاد چونکہ فرض کفایہ ہے اس لئے فرائض کی تکمیل اور ان کے بعد ذکر جہاد سے افضل ہوگا۔ لیکن جب جہاد فرض عین کے درجہ میں ہو تو اب مسجد میں بیٹھ کر اللہ اللہ کرنا کافی نہیں ہوگا بلکہ جہاد کرنا ضروری ہوگا۔

☆ "عن ابن عباس قال قال رسول الله ﷺ الشيطان جاثم على قلب ابن آدم فاذا ذكر الله خنس واذا غفل وسوس" (رواه البخاري تعليقا)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا شیطان انسان کے دل سے چمٹا رہتا ہے جب وہ اللہ تعالیٰ کا ذکر کرتا ہے تو شیطان ہٹ جاتا ہے اور جب وہ اللہ تعالیٰ کے ذکر سے غافل رہتا ہے تو اسے وسوسہ ڈالتا ہے۔

وضاحت حدیث: "جاثم ای لازم الجلوس ودائم اللصوق" حدیث شریف میں جو لفظ "جاثم" استعمال ہوا ہے اس کا معنی ساتھ بیٹھے رہنا، اور ہمیشہ ساتھ چمٹے رہنا۔ خنس: ای انقبض الشيطان وتأخر عنه" یعنی انسان جب اللہ تعالیٰ کا ذکر کرتا ہے تو شیطان غم کی وجہ سے مرجھا جاتا ہے اور اس سے دور ہو جاتا ہے اور چھپ جاتا ہے اور اس کا وسوسہ کم پڑ جاتا ہے اور اس کا ضرر کم ہو جاتا ہے۔ اور جب انسان اللہ تعالیٰ کے ذکر سے غافل ہو جاتا ہے تو شیطان وسوسہ ڈالنے پر قادر ہو جاتا ہے۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مرفوع حدیث ثابت ہے:

"ان الشيطان واضع خرطومه على ابن آدم فان ذكر الله خنس وان نسي التقم قلبه، (اخرجه ابن ابی الدنیا ابو یعلی والبیهقی)"

کہ بے شک شیطان اپنا سونڈ انسان پر رکھتا ہے اگر وہ اللہ تعالیٰ کا ذکر کرے تو شیطان اس سے ہٹ جاتا ہے اور اگر وہ اللہ تعالیٰ کے ذکر کو ترک کر دے تو وہ اس کے دل کو لقمہ بنا لیتا ہے (یعنی اس کے دل پر اثر انداز ہو کر وسوسہ ڈالتا ہے)

اللہ تعالیٰ کے نیک بندوں میں سے ایک نے رب تعالیٰ کے حضور عرض کیا کہ مجھ پر منکشف فرما کہ شیطان کس طرح لوگوں کے دلوں پر اثر کرتا ہے تو رب تعالیٰ نے اس پر منکشف کر دیا:

" فرآہ جاثما تحت غضروف الکتف الا یسر کالبعوض له خرطوم طویل یدسه ثم الی ان یصل القلب فان رآہ ذاکرا خنس وکف عنه او غافلا مد خرطومه الیه والقی فیه من جنایته ما اراد الله ثم لا یزال کذلک الی ان لا یبقی فی القلب خیرقط "

اس نے دیکھا کہ شیطان بائیں کندھے کے نیچے پٹھے سے چمٹا ہوا ہے جس طرح مچھر چمٹ جاتا ہے اس کی لمبی سونڈ ہے جو چبھو رہا ہے یہاں تک کہ وہ دل تک پہنچ جاتی ہے پھر دیکھا کہ اگر انسان اللہ تعالیٰ کا ذکر کرتا ہے تو وہ اس سے دور ہٹ جاتا ہے اور اگر انسان اللہ تعالیٰ کے ذکر سے غافل رہے تو وہ اپنی سونڈ کو بڑھا دیتا ہے اور انسان کی بدقسمتی میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو گناہ لازم آنے ہوتے ہیں وہ اس کے دل میں ڈال دیتا ہے یہاں تک کہ اس کے دل میں نیکی کی کوئی جگہ نہیں رہتی۔

☆ "وعن مالک قال بلغنی ان رسول الله ﷺ کان یقول ذاکر الله فی الغافلین کالمقاتل خلف الفارین وذاکر الله فی الغافلین کغصن اخضر فی شجر یابس وفی روایة مثل الشجرة الخضراء فی وسط الشجر وذاکر الله فی الغافلین مثل مصباح فی بیت مظلم وذاکر الله فی الغافلین یریه الله مقعده من الجنة وهو حی وذاکر الله فی الغافلین یغفر له بعدد کل فصیح واعجم والفصیح بنو آدم والاعجم البهائم" (رواہ رزین)

حضرت مالک رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں مجھے خبر ملی ہے کہ بیشک رسول اللہ ﷺ فرمایا کرتے تھے کہ غافل لوگوں میں اللہ تعالیٰ کا ذکر کرنے والا شخص ایسا ہے جیسا کہ میدان جنگ میں کچھ لوگ بھاگ جائیں لیکن ان کے پیچھے کوئی کافروں کے مقابل جہاد میں ثابت قدم رہے۔ اور اللہ تعالیٰ کا ذکر کرنے والا غافلوں میں ایسا ہے جیسا کہ خشک درختوں میں سرسبز وشاداب درخت پایا جائے، ایک روایت میں صرف اتنا ہے کہ درختوں کے درمیان سبز درخت پایا جائے اور غافل لوگوں میں اللہ تعالیٰ کا ذکر کرنے والا ایسا ہے جیسے تاریک گھر میں چراغ پایا جائے اور غافل لوگوں میں اللہ تعالیٰ کے ذکر کرنے والے کو اللہ تعالیٰ جنت میں اس کا مقام اس کی زندگی میں ہی دکھا دیتا ہے۔ اور غافلین میں اللہ تعالیٰ کا ذکر کرنے والے شخص کے گناہ ہر فصیح اور اعجم کی تعداد کے برابر معاف کر دیئے جاتے ہیں فصیح سے مراد انسان اور اعجم سے مراد حیوان ہیں یعنی انسانوں اور حیوانوں کی تعداد کے برابر گناہ معاف کر دیئے جاتے ہیں۔

وضاحت حدیث: میدان جنگ سے بھاگنے والوں کی شدید مذمت بیان کی گئی ہے اور جب دوسرے لوگ بھاگ جائیں اس وقت ثابت قدمی سے جنگ کرنا عظیم مرتبہ ہے اسی طرح اللہ تعالیٰ کے ذکر سے غافل رہنے والوں میں اللہ تعالیٰ کا ذکر کرنے والے حضرات کا بلند و بالا مرتبہ ہے۔

بار بار لفظ " ذاکر اللہ "کو صراحۃ ذکر کیا صرف ضمیر کو نہیں لوٹا دیا:

" وکررہ لینیط بہ فی کل مرۃ غیر ما اناط بہ فی الاخری اعلاما بانہ امر عظیم لہ فوائد متعددۃ مستقلۃ "

اس لئے کہ یہ بتانا مقصود ہے کہ ہر مرتبہ علیحدہ ذکر کرنے میں خصوصی فوائد ہیں جو متعدد اور مستقل ہیں۔

" فی الغافلین " کو ظرف مستقر کے طور پر ذکر فرمایا خاص متعلق بہ ذکر نہیں فرمایا، اشارہ کیا ہے کہ غافل لوگ کہیں بھی ہوں مسجد میں یا بازار میں ہوں، گھر میں ہوں یا باہر، سفر میں ہوں یا حضر میں ان میں فضیلت رکھنے والا وہی شخص ہوگا جو اللہ تعالیٰ کا ذکر کرنے والا ہی ہوگا۔

غافل لوگوں میں اللہ تعالیٰ کا ذکر کرنے والا ایسے ہے جیسے خشک درختوں میں سرسبز و شاداب درخت ہو " وھو معنی مثل الحی والمیت " یہی مطلب ہے زندہ اور مردہ ہونے کی طرح یعنی ذکر نہ کرنے والے غافلین کے دل مردہ ہیں جیسے خشک درختوں پر مردگی چھائی ہوتی ہے اور اللہ تعالیٰ کا ذکر کرنے والوں کے دل اس طرح زندہ ہیں جس طرح سبز ہرا ابھرا درخت زندہ ہوتا ہے۔ غافلین میں اللہ تعالیٰ کا ذکر کرنے والا ایسے ہے جیسے تاریک گھر میں چراغ ہو اس کی وجہ یہ ہے۔ " فان الذکر نور وحضور وسرور والغفلۃ ظلمۃ وغیبۃ ونفور " کہ اللہ تعالیٰ کا ذکر نور ہے جس سے دل منور ہو جاتا ہے اور اللہ تعالیٰ کے ذکر سے رب تعالیٰ کے ہاں حضوری حاصل ہوتی ہے، حضور قلب حاصل ہوتا ہے، اللہ تعالیٰ کا تقرب حاصل ہوتا ہے اور اللہ تعالیٰ کے ذکر میں سرور ہے۔ لیکن اس کے برخلاف اللہ تعالیٰ کے ذکر سے غافل رہنے میں دل سیاہ ہو جاتا ہے اور رب تعالیٰ سے دوری حاصل ہوتی ہے اور دل میں نفرت و کدورت پیدا ہوتی ہے۔

" یریہ اللہ مقعدہ من الجنۃ ای ما اعدلہ " غافلین میں اللہ تعالیٰ کا ذکر کرنے والا ایسے ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کے لئے جنت میں جو مقام تیار کر رکھا ہے اسے اس کی زندگی میں ہی دکھا دیا جاتا ہے۔ زندگی میں اسے جنت کا مقام کیسے دکھا دیا جاتا ہے؟

" لعل الاراء ة بالمکاشفة او بنزول الملائکة عند النزع لقوله تعالیٰ " ﴿ اِنَّ الَّذِیْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰہُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا تَتَنَزَّلُ عَلَیْھِمُ الْمَلٰٓئِکَةُ اَلَّا تَخَافُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَبْشِرُوْا بِالْجَنَّةِ الَّتِیْ کُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ ﴾ (حم السجدة ۳۰)

اس کی دو وجہ ہیں ایک تو یہ کہ بعض بزرگوں کو کشف کے ذریعے ان کی زندگی میں جنت میں ان کا مقام دکھا دیا جاتا ہے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ جن کا مقام اتنا بلند نہیں ہوتا ان کو جان کنی (جان کے نکلنے) کے وقت دکھا دیا جاتا ہے۔ جیسا کہ رب تعالیٰ نے فرمایا (ترجمہ) بیشک وہ جنہوں نے کہا ہمارا رب اللہ ہے پھر اس پر قائم رہے ان پر فرشتے اترتے ہیں کہ نہ ڈرو اور نہ غم کرو اور خوش ہو اس جنت پر جس کا تمہیں وعدہ دیا جاتا ہے۔

غافلین میں اللہ تعالیٰ کا ذکر کرنے والوں کے گناہ مٹا دیئے جاتے ہیں یعنی اللہ تعالیٰ کے ذکر نے انہیں صدق دل سے توبہ کرنے کی توفیق عطاء فرما دی تو تمام صغیرہ اور کبیرہ گناہ معاف ہو گئے۔ اور اگر ابھی تک زبان تک ذکر محدود ہے دل پر کامل طور پر اثر انداز نہیں ہوا تو پھر بھی صغیرہ گناہ معاف ہوتے ہیں۔ رب تعالیٰ کا ارشاد گرامی ہے:

﴿ فَاِنَّ الْحَسَنَاتِ یُذْھِبْنَ السَّیِّاٰتِ ﴾ ''بیشک نیکیاں گناہوں کو مٹا دیتی ہیں''۔

☆ " عن معاذ بن جبل قال ما عمل العبد عملا انجی له من عذاب الله من ذکر الله " (رواہ مالک والترمذی وابن ماجه)

حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ انسان کا کوئی عمل اللہ تعالیٰ کے عذاب سے زیادہ نجات دینے والا نہیں بنسبت اللہ تعالیٰ کے ذکر کے۔

وضاحت حدیث: یہ حدیث حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کے قول پر موقوف ہے لیکن ضابطہ یہ ہے " ومثله لا یقال من قبل الرأی فھو فی حکم المرفوع " کہ اس قسم کے اقوال انسان اپنی رائے سے تو قائم نہیں کر سکتا جو قول رائے سے پیش نہ کیا جا سکے اور صحابی کا وہ قول ہو وہ مرفوع حدیث کے حکم میں ہوتا ہے۔ بلکہ مسند احمد اور طبرانی اور مصنف ابن ابی شیبہ کی مرفوع حدیث اس کی تائید کر رہی ہے جس کے الفاظ مبارکہ یہ ہیں " ما عمل آدمی عملا انجی له من عذاب الله من ذکر الله " الخ مطلب وہی جو بیان ہو چکا ہے۔

☆ " وعن ابی ھریرۃ قال قال رسول اللہ ﷺ ان اللہ تعالیٰ یقول انا مع عبدی اذا ذکرنی وتحرکت بی شفتاہ "
(رواہ البخاری)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا بیشک اللہ تعالیٰ فرماتا ہے میں اپنے بندے کے ساتھ ہوتا ہوں جب وہ مجھے یاد کرتا ہے اور میرے ذکر سے اپنے ہونٹوں کو حرکت دیتا ہے۔

وضاحت حدیث: انا مع عبدی ، بالاعانۃ والتوفیق والرحمۃ والرعایۃ "
یعنی رب تعالیٰ فرماتا ہے کہ میرا بندہ جب میرا ذکر کرتا ہے تو اسے میری طرف سے امداد حاصل ہوتی ہے اور اسے میں ہی اپنی عبادت وذکر کی توفیق عطاء کرتا ہوں اسے اپنی رحمت سے نوازتا ہوں اس پر اپنی مہربانیوں کی نوازش کرتا ہوں۔

" وقیل المعیۃ کنایۃ عن الشرف والقربۃ لما ورد انا جلیس من ذکرنی کما یقال فلان جلیس السلطان ای مقرب مشرف عندہ "

اور اس کا مطلب یہ ہے کہ رب تعالیٰ کی معیت حاصل ہوگی یعنی اس انسان کو رب تعالیٰ کی قربت حاصل ہوگی اور شرافت حاصل ہوگی۔ جس طرح کہا جاتا ہے " فلان جلیس السلطان " تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ فلاں شخص کو بادشاہ کا قرب حاصل ہے اور وہ بادشاہ کا مقرب ہے۔

کیا ہی خوب: " والحدیث ابلغ حیث لم یقل ھو جلیس " اے اللہ تعالیٰ کا ذکر کرنے والے، رب تعالیٰ نے کیا خوب تیری شان بیان فرمائی یہ ارشاد فرمایا " انا مع عبدی " یعنی انا جلیس مع عبدی میں اپنے بندے کے قریب ہوں گا، اسے اپنا مقرب بناؤں گا، اسے تقرب کی وجہ سے مشرف بناؤں گا۔ یہ نہیں فرمایا " وھو معی " یعنی ھو جلیس کہ وہ شخص جو میرا ذکر کرے گا وہ میرے پاس آئے گا وہ میرا مقرب بنے گا۔

سبحان اللہ کسی کا بننا اور ہے جب خود کوئی کسی کو بنائے وہ اور ہے رب تعالیٰ کا بننا بھی نعمت عظمی ہے۔ لیکن رب تعالیٰ جب کسی کو اپنا بنالے وہ کتنا ہی خوش بخت انسان ہے جو بے نظیر و بے مثال ہے۔

اذا ذکرنی وتحرکت بی شفتاہ: جب " وتحرکت " میں واؤ حال کیلئے ہو تو " ذکرنی " میں " ذکر باللسان والقلب " (زبان اور دل سے ذکر کرنا) مراد ہوگا۔ اور اگر واؤ عطف کے لئے ہو تو " ذکرنی " سے مراد 'دل سے یاد کرنا' اور " وتحرکت بی شفتاہ " سے مراد 'زبان سے یاد کرنا' ہوگا، زبان اور دل سے یاد کرنا مراد لینا بہتر ہے " لان المؤثر النافع ھو

الذکر باللسان مع حضور القلب " اسلئے کہ مؤثر اور نفع دینے والا وہی ذکر ہے جو زبان سے کیا جائے اور ساتھ ہی حضور قلب بھی حاصل ہو۔

" واما الذکر باللسان والقلب لاہ فھو قلیل الجدوی " زبان سے ذکر کرنا جب کہ دل لہو ولعب میں مشغول ہو، یعنی دل غافل ہو تو اس میں نفع کم ہے۔ لیکن پہلے تفصیل سے ذکر کیا جا چکا ہے کہ صرف زبان سے بھی ذکر نفع سے مکمل خالی نہیں۔ بلکہ مقام شکر ہے کہ رب تعالیٰ نے زبان کو اپنے ذکر میں لگا دیا ہے۔

☆ " وعن عبد اللہ بن عمر عن النبی ﷺ انہ کان یقول لکل شئی صقالة وصقالة القلوب ذکر اللہ وما من شئی انجی من عذاب اللہ من ذکر اللہ قالوا ولا الجھاد فی سبیل اللہ قال ولا ان یضرب بسیفه حتی ینقطع "

(رواہ البیھقی فی الدعوات الکبیر)

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں نبی کریم ﷺ فرمایا کرتے تھے کہ ہر چیز کی صفائی ہے اور دلوں کی صفائی اللہ تعالیٰ کا ذکر ہے اور اللہ تعالیٰ کے ذکر سے بڑھ کر کوئی چیز اللہ تعالیٰ کے عذاب سے نجات دینے والی نہیں۔ صحابہ کرام نے پوچھا کیا اللہ کی راہ میں جہاد بھی (اس درجہ کا) نہیں؟ آپ نے فرمایا جہاد بھی نہیں یہاں تک کہ جہاد کرتے کرتے اس کی تلوار بھی کیوں نہ ٹوٹ جائے۔

وضاحت حدیث: ہر چیز زنگ آلود ہوتی ہے حقیقۃً یا حکماً صقالة مصدر ہے جس کا معنی " تجلیة وتخلیة وتزکیة وتصفیة " صاف کرنا (جلاء عطاء کرنا) اور زنگ اور میل کو دور کرنا، پاک کرنا اور صاف کرنا۔ تاہم علامہ ابن حجر عسقلانی رحمہ اللہ نے " صقالة " کو آلہ بنایا ہے یعنی صفائی کا آلہ۔

وصقالة القلوب ذکر اللہ : اور دلوں کی صفائی اللہ تعالیٰ کا ذکر ہے۔ " فانه بذکرہ ینجلی غبار الاغیار ویصیر القلب مرآة لمطالعة الآثار " بیشک اللہ تعالیٰ کے ذکر سے دل اغیار (غیروں) کے غبار سے پاک وصاف ہو جاتا ہے کیونکہ اس کی توجہ صرف اللہ تعالیٰ کی طرف ہوتی ہے کسی اور کی طرف نہیں ہوتی اور ان کا دل احادیث اور اقوال صحابہ کے اثر انداز ہونے کیلئے آئینہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ علامہ طیبی رحمہ اللہ نے فرمایا " وصدأ القلوب الرین کما فی قوله تعالیٰ كَلَّا بَلْ رَانَ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ مَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ " کہ دلوں پر زنگ کو ہی قرآن پاک میں "رین" کہا گیا (ترجمہ) کوئی نہیں بلکہ ان کے دلوں پر زنگ چڑھا دیا ہے ان چیزوں نے جو وہ کسب کرتے تھے۔

ان کے دل پر زنگ چڑھنے کی وجہ ان کی خواہشات ہوتی ہیں۔ رب تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ اَفَرَأَیْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰھَہٗ ھَوٰاہُ ﴾ ''بھلا دیکھو تو وہ جس نے اپنی خواہش کو اپنا خدا ٹھہرا لیا''

(الجاثیہ : ۲۳)

" فکلمة لا اله تخليها و كلمة الا الله تجليها " " لا اله " پڑھنے سے دل سے خواہشات نکلتی ہیں اور " الا الله " پڑھنے سے دل منور ہو جاتا ہے۔ ابو علی دقاق فرماتے ہیں:

" اذا قال العبد لا اله صفا قلبه وحضر سره فيكون ورود قوله الا الله على قلب منقى وسر مصفى "

کہ انسان جب " لا اله " پڑھتا ہے تو اس کا دل گناہوں اور اغیار کی طرف توجہ سے صاف ہو جاتا ہے اور اس کے روح وقلب میں حضور آ جاتا ہے، پھر جب " الا الله " پڑھتا ہے تو وہ کامل طور پر اثر انداز ہوتا ہے کیونکہ اس کا ورود ایسے دل پر ہو رہا ہے جو پہلے ہی " لا اله " سے صاف ہو چکا ہے اور روح وقلب کو پہلے سے جب جلاء حاصل ہے تو اب اور زیادہ جلاء حاصل ہو جائے گی۔

جہاد سے ذکر کو کب فضیلت حاصل ہوتی ہے اس کی تفصیل پہلے ذکر ہو چکی ہے۔

نوٹ: فضیلت ذکر کے متعلق جن احادیث اور ان کی وضاحت کا ذکر کیا گیا اور ان کا حوالہ مذکور نہ ہو تو وہ " مشكوة باب ذكر الله عزوجل والتقرب اليه " میں دیکھیں اور ان کی وضاحت مرقاۃ ج ۵ میں اسی باب میں ان احادیث کے ضمن میں ہی دیکھیں۔

☆ " عن السدى فى قوله تعالىٰ (فاذكرونى اذكركم) قال ليس من عبد يذكر الله الا ذكره الله لا يذكر الله مومن الا ذكره برحمة ولا يذكره كافر الا ذكره الله بعذاب "

(ابن جریر بحوالہ در منثور)

سدی رحمہ اللہ نے اللہ تعالیٰ کے ارشاد گرامی ﴿ فَاذْکُرُوْنِیْٓ اَذْکُرْکُمْ ﴾ کی تفسیر میں ذکر کیا ہے اللہ تعالیٰ کا بندہ جب اللہ کو یاد کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ بھی اسے یاد کرتا ہے۔ جب مومن اللہ تعالیٰ کو یاد کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اسے رحمت سے ہی یاد کرتا ہے اور کافر جب (کفر سے) رب تعالیٰ کو یاد کرتا ہے تو رب بھی اسے عذاب سے ہی یاد کرتا ہے۔

☆ " اخرج ابن ابی الدنیا عن ابی المخارق قال قال النبی ﷺ مررت لیلة اسری برجل فی نور العرش قلت من هذا ملک ؟ قیل لا قلت نبی ؟ قیل لا قلت من هذا ؟ قال هذا رجل کان فی الدنیا لسانه رطب من ذکر الله وقلبه معلق بالمساجد ولم یستسب لوالدیه " (در منثور)

ابوالمخارق کہتے ہیں رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں معراج کی رات عرش کے نور میں ایک شخص سے میرا گزر ہوا میں نے کہا یہ کون سا فرشتہ ہے؟ جواب دیا گیا یہ فرشتہ نہیں میں نے کہا کیا یہ نبی ہے؟ جواب دیا گیا یہ نبی بھی نہیں میں نے کہا یہ شخص کون ہے؟ جواب دیا گیا یہ وہ شخص ہے جس کی زبان اللہ تعالیٰ کے ذکر سے تر رہتی تھی۔ اور دل اس کا مساجد سے معلق (لٹکا رہنا، چمٹا رہنا) رہتا تھا اور اپنے والدین کو گالی دینے کا سبب نہیں بنتا تھا۔ یعنی دوسروں کے والدین کو گالی نہیں دیتا تھا کہ وہ اس کے والدین کو اس کے بدلے میں گالی دیں۔

☆ " اخرج ابن ابی الدنیا عن ابی ذر عن النبی ﷺ قال ما من یوم ولیلة الا ولله عزوجل فیه صدقة من بها علی من یشاء من عباده وما من الله علی عبد بافضل من ان یلهمه ذکره " (درمنثور)

حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کوئی دن اور رات ایسا نہیں مگر اللہ تعالیٰ اپنے بندوں میں سے جن پر احسان فرماتا ہے وہ اللہ تعالیٰ کے لئے صدقہ کرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کا اپنے بندوں پر سب سے زیادہ فضل یہ ہے کہ وہ ان کو ذکر کی توفیق عطاء فرماتا ہے۔

☆ " اخرج ابن حبان عن ابی سعید الخدری ان رسول الله ﷺ قال لیذکرن الله اقوام فی الدنیا علی الفرش الممهدة یدخلهم الله الدرجات العلی " (در منثور)

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں بیشک رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ کچھ قومیں اللہ تعالیٰ کا ذکر اپنے سونے کے بستروں پر کریں گے (یعنی سوتے وقت اللہ تعالیٰ کا ذکر کریں گے) اللہ تعالیٰ ان کو بلند درجات میں داخل کرے گا۔ (در منثور)

☆ " اخرج احمد والبزار وابو یعلی والطبرانی عن انس عن رسول الله ﷺ قال ما من قوم اجتمعوا یذکرون الله لا یریدون بذلک الا وجهه الا ناداهم مناد من السماء ان قوموا مغفورا لکم قد بدلت سیاتکم حسنات "

حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جب بھی کوئی قوم اللہ تعالیٰ کے ذکر کے لئے جمع ہوتی ہے ان کا مقصد صرف اللہ تعالیٰ کی رضامندی کا حصول ہوتا ہے، تو ان کو ضرور آسمان سے نداء دینے والا نداء دیتا ہے کہ تمہارے اس ذکر کی محفل سے کھڑے ہونے پر تمہاری مغفرت ہو چکی ہوگی تحقیق میں نے تمہارے گناہوں کو معاف کر کے نیکیاں عطاء کر دی ہیں۔

☆ " اخرج الطبرانی عن ابی الدرداء قال قال رسول الله ﷺ لیبعثن الله اقواما یوم القیامة فی وجوهم النور علی منابر اللؤلؤ یغبطهم الناس لیسوا بانبیاء ولا شهداء فقال اعرابی یا رسول الله حلهم لنا نعرفهم قال هم المتحابون فی الله من قبائل شتی وبلاد شتی یجتمعون علی ذکر الله یذکرونه " (در منثور)

حضرت ابو الدرداء رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ تعالیٰ ضرور بضرور قیامت کے دن بعض قوموں کو موتیوں کے منبروں پر بٹھائے گا ان لوگوں کے چہروں پر نور ہوگا لوگ ان پر رشک کر رہے ہوں گے حالانکہ وہ انبیاء کرام اور شہداء نہیں ہوں گے ایک اعرابی نے عرض کیا یا رسول اللہ آپ ہمیں ان کے بارے میں بتائیں تاکہ ہم ان کو پہچان لیں آپ نے فرمایا وہ لوگ اللہ تعالیٰ کی رضاء کی خاطر ایک دوسرے سے محبت کرنے والے ہیں جو مختلف قبائل سے ہوں گے اور مختلف شہروں سے آ کر ایک جگہ اللہ تعالیٰ کے ذکر کے لئے جمع ہو کر اللہ کا ذکر کرنے والے ہیں۔

سبحان اللہ بزرگان دین کے آستانے کتنے بابرکت ہیں کہ اس گئے گزرے دور میں بھی لوگ مختلف شہروں سے آ کر جمع ہوتے ہیں اور اللہ کا ذکر کرتے ہیں ان محافل میں کیا ہی خوب وجدانی کیفیت طاری ہوتی ہے۔

وَاشْكُرُوْلِیْ وَلَا تَكْفُرُوْنِ : "اور میرا شکر کرو اور میری ناشکری نہ کرو۔

" وَاشْكُرُوْلِیْ " اور " وَاشْكُرُوْنِیْ " کا معنیٰ ایک ہی ہے کہ " میرا شکر کرو " تاہم " وَاشْكُرُوْلِیْ " فصیح ہے۔

ذکر کو شکر سے پہلے ذکر فرمایا کیونکہ ذکر میں انسان رب تعالیٰ کی ذات میں مشغول ہوتا ہے اور شکر میں اس کی نعمتوں کی طرف مشغول ہوتا ہے " والاشتغال بذاته تعالیٰ اولی من الاشتغال

بنعمته" رب تعالیٰ کی ذات میں مشغولیت بہتر ہے بنسبت اس کی نعمتوں میں مشغول ہونے کے۔
وَلَا تَكْفُرُوْنِ: (واوٌ) برائے عطف (لا) برائے نہی۔ مضارع کا نون اعرابی محذوف۔ یہ موجودہ نون وقایہ ہے مکسور ہے یائے متکلم محذوف ہے یعنی میری نعمتوں کا انکار نہ کرو اور میرے حکم کی نافرمانی نہ کرو اور اس کا تعلق جمیع زمانوں سے ہے کہ کسی وقت بھی میری ان گنت نعمتوں کا کفران (انکار) نہ کرنا۔
(از روح المعانی)

شکر کیا ھے :

"الشکر تصور النعمة و اظهارها" شکر نعمت کے تصور اور اس کے اظہار کو کہتے ہیں۔
شکر کو کشر سے مقلوب (الٹ کر کے بنانا) بھی تسلیم کیا گیا جس کا معنی ہے کشف یعنی کھولنا اور واضح کرنا۔ اس کی ضد کفر ہے۔ جس کا معنی کفران نعمت ہے یعنی نعمت کو چھپانا اور بھول جانا اور انکار کرنا۔
شکر کا ایک معنی یہ بھی ہے کہ منعم کے ذکر سے بھرا ہوا رہنا۔ یعنی ہر وقت اللہ تعالیٰ کا شکریہ ادا کرتے رہنا۔

شکر کی تین قسمیں ہیں:

۱) شکر القلب ،دل سے شکر ادا کرے یعنی یہ تصور رکھے کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے اتنی نعمتیں عطاء کر رکھی ہیں جو شمار سے بھی باہر ہیں۔
۲) شکر اللسان ،زبان سے شکر ادا کرنا " وهو الثناء على المنعم " وہ اللہ تعالیٰ جو انعام عطاء کرنے والا ہے اس کی تعریف کرنا۔
۳) شکر سائر الجوارح ،تمام اعضاء سے اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرنا یعنی ہاتھوں سے نیکی کا کام کرنا۔ نیکی کے لئے پاؤں سے چل کر جانا، آنکھوں سے نیکی والی چیزوں کو دیکھنا وغیرہ۔ اسی طرح تمام اعضاء کو نیکی کی طرف لگانا اعضاء کا شکر ہے۔

ہر منعم کا شکریہ ادا کرے:
اسی لئے تو رب تعالیٰ نے فرمایا﴿ اُشْكُرْلِیْ وَلِوَالِدَيْكَ ﴾ میرا شکر ادا کرو اور اپنے

والدین کا شکریہ ادا کرو۔

شکر کا فائدہ شکر کرنے والے کو حاصل ہوتا ہے:

رب تعالیٰ نے فرمایا﴿ وَسَنَجْزِی الشّٰاکِرِیْنَ ﴾ اور ہم عنقریب شکر کرنے والوں کو جزاء دیں گے اور فرمایا ﴿ وَمَنْ شَکَرَ فَاِنَّمَا یَشْکُرُ لِنَفْسِہٖ ﴾ اور جو شکر کرے گا وہ شکر اپنے لئے ہی کریگا۔

شکر گزار تھوڑے ناشکرے زیادہ ہیں:

" وَقَلِیْلٌ مِّنْ عِبَادِیَ الشَّکُوْر " رب تعالیٰ نے فرمایا میرے بندوں میں شکر کرنے والے تھوڑے ہیں۔ (از مفردات راغب)

ہم اس آیۃ کریمہ کی طرف توجہ نہ کرنے کی وجہ سے بعض اوقات دل تنگ ہوتے ہیں لیکن جب رب تعالیٰ کے شکر گزار تھوڑے ہیں تو بندوں کا شکریہ نہ ادا کرنے والے تھوڑے ہوں تو اس پر کیا تعجب ہے؟ جس پر مہربانیاں کریں وہی بے وفا نظر آتا ہے لیکن یہ قانون قدرت ہے ایسا ہی ہونا چاہئے۔

شکر کی فضیلت میں احادیث و آثار:

" عن ابن مسعود قال قال رسول الله ﷺ من اعطی اربعا اعطی اربعا وتفسیر ذلک فی کتاب الله من اعطی الذکر ذکره الله لان الله یقول اذکرونی اذکرکم ومن اعطی الدعاء اعطی الاجابة لان الله یقول ادعونی استجب لکم ومن اعطی الشکر اعطی الزیادة لان الله یقول لئن شکرتم لازیدنکم ومن اعطی الاستغفار اعطی المغفرة لان الله یقول استغفروا ربکم انه کان غفارا " (طبرانی ، ابن مردویہ ، بیہقی ، در منثور)

حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس شخص کو چار چیزیں عطاء ہوں اسے ان پر چار اور عطاء کی جاتی ہیں ان تمام کی تفاسیر کتاب اللہ میں موجود ہے جس کو ذکر کی توفیق عطاء کی جائے اللہ تعالیٰ اس کا ذکر کرتا ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا﴿ فَاذْکُرُوْنِیْ اَذْکُرْکُمْ ﴾ تم

مجھے یاد کرو میں تمہیں یاد کروں گا۔اور جس شخص کو دعاء کرنے کی توفیق عطاء کی جائے اسے قبولیت عطاء کی جاتی ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ﴿ اُدْعُوْنِیْ اَسْتَجِبْ لَکُمْ ﴾ تم مجھ سے دعاء کرو میں تمہاری دعاء کو قبول کروں گا۔جس شخص کو شکر عطاء کیا گیا اسے زیادتی عطاء کی جاتی ہے کیونکہ رب تعالیٰ نے فرمایا ﴿لَئِنْ شَکَرْتُمْ لَاَزِیْدَنَّکُمْ ﴾ اگر تم شکرادا کرو تو میں تمہیں زیادہ عطاء کروں گا۔اور جس شخص کو استغفار کی توفیق عطاء کی جائے اسے مغفرت عطاء کی جاتی ہے کیونکہ رب تعالیٰ نے فرمایا﴿ اِسْتَغْفِرُوْا رَبَّکُمْ اِنَّہٗ کَانَ غَفَّارًا﴾ اپنے رب تعالیٰ سے مغفرت طلب کرو بیشک وہ بخشنے والا ہے۔

☆ ''عن زید بن اسلم ان موسی علیہ السلام قال یا رب اخبرنی کیف اشکرک قال تذکرنی ولا تنسانی فاذا ذکرتنی شکرتنی و اذا نسیتنی فقد کفرتنی''

(ابن ابی الدنیا ، ابو حاتم ، بیہقی ، درمنثور)

حضرت زید بن اسلم رضی اللہ عنہ کہتے ہیں موسیٰ علیہ السلام نے عرض کیا اے میرے رب مجھے بتاؤ کہ میں تمہارا شکر کیسے ادا کروں ،رب تعالیٰ نے فرمایا تم مجھے یاد کرو،میرے ذکر کو نہ چھوڑو جب تم نے میرا ذکر کرلیا تو میرا شکریہ ادا کردیا اور جب تم نے میرے ذکر کو چھوڑ دیا تو میری ناشکری کی۔

☆ '' عن ابن عباس ان النبی ﷺ قال اربع من اعطیھن فقد اعطی خیر الدنیا والآخرۃ قلب شاکر ولسان ذاکر وبدن علی البلاء صابرو زوجۃ لا تبغیہ خونا فی نفسھا وما لہ'' (ابن ابی الدنیا ، طبرانی ، بیہقی ، در منثور)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں بیشک نبی کریم ﷺ نے فرمایا چار چیزیں جسے عطاء کی گئیں اسے دنیا اور آخرت کی بہتر چیزیں عطاء کی گئیں (وہ یہ ہیں)شکر کرنے والا دل،اور ذکر کرنے والی زبان اور مصیبت کے وقت صبر کرنے والا بدن اور زوجہ جو اپنے نفس اور خاوند کے مال میں خیانت نہ کرنے والی ہو۔

☆ '' عن ابی ھریرۃ ان رسول اللہ ﷺ قال لھم اتحبون ایھا الناس ان تجتھدوا فی الدعاء قالوا نعم قال قولوا اللھم اعنا علی ذکرک وحسن عبادتک''

(بیہقی ، در منثور)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں بیشک رسول اللہ ﷺ نے صحابہ کرام کو فرمایا کیا تم پسند

کرتے ہوائے لوگو کہ تم اپنی دعاء میں کوشش کرو، انہوں نے کہا ہاں، آپ نے فرمایا تم یہ کہو " اللھم اعنا علی ذکرک وشکرک وحسن عبادتک " اے اللہ اپنے ذکر اور اپنے شکر اور اپنی اچھی عبادت کے لئے ہماری امداد فرما۔

☆ " عن ابی جعفر قال ما من شئی احب الی اللہ من الذکر والشکر " (ابن ابی شیبہ ، در منثور)

حضرت ابو جعفر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں اللہ تعالیٰ کو ذکر اور شکر سے زیادہ کوئی چیز پسند نہیں۔

☆ " عن ابن المنکدر قال کان من دعاء رسول اللہ ﷺ اللھم اعنی علی ذکرک وشکرک وحسن عبادتک " (ابن ابی الدنیا ، بیھقی ، درمنثور)

ابن منکدر فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ دعاء فرماتے تھے " اے اللہ اپنے ذکر اور اپنے شکر اور اپنی اچھی امداد پر میری امداد فرما۔

☆ " عن ابی الجلد قال قرأت فی مساء لۃ موسیٰ علیہ السلام انہ قال یا رب کیف لی ان اشکرک واصغر نعمتک وضعتھا عندی من نعمک لا یجازی بھا عملی کلہ فاتاہ الوحی ان یا موسی الآن شکرتنی " (اخرج احمد فی الزھد وابن ابی الدنیا والبیھقی ، درمنثور)

ابو الجلد کہتے ہیں موسیٰ علیہ السلام نے رب تعالیٰ کے حضور عرض کیا اے میرے رب میں تیرا شکریہ کیسے ادا کروں تیری نعمتوں کو چھوٹا (تھوڑا) کیسے سمجھوں تو نے تو مجھے اتنی نعمتیں عطاء کر رکھی ہیں کہ میرا کوئی عمل بھی ان کا بدل نہیں بن سکتا۔ تو آپ کے پاس وحی آئی اے موسیٰ تم نے اب میرا شکر ادا کر دیا۔ یعنی رب تعالیٰ کی نعمتوں کو ان گنت سمجھنا، اور رب تعالیٰ کی نعمتوں کا اعتراف کرنا اور اپنے آپ کو عاجز سمجھنا کہ میں کس طرح شکر کروں یہ بھی دل سے شکر ہے بلکہ یہ شکر بہت ہی کامل ہے۔

☆ " عن سلیمان التیمی قال ان اللہ عزوجل انعم علی العباد علی قدرہ وکلفھم الشکر علی قدرھم " (ابن ابی الدنیا ، بیھقی ، در منثور)

حضرت سلیمان التیمی فرماتے ہیں بیشک اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں پر ان کی قدر کے مطابق انعام فرمایا ہے اور ان کی قدر کے مطابق ہی ان کو شکر کرنے کا مکلف بنایا۔

☆ عن اسحاق بن عبد اللہ بن ابی طلحۃ ان رجلا کان یاتی النبی ﷺ فیسلم علیہ فیقول النبی ﷺ یدعولہ فجاء یوما فقال لہ النبی ﷺ کیف انت یا فلان قال بخیر ان

شکرت فسکت النبی ﷺ فقال الرجل یا نبی اللہ کنت تسألنی وتدعولی وانک سألتنی الیوم فلم تدع لی قال انی کنت اسألک فتشکر اللہ دانی سألتک الیوم فشککت فی والشکر " (ابن ابی الدنیا ، بیھقی ، در منثور)

اسحاق بن عبداللہ بن طلحہ فرماتے ہیں کہ ایک شخص نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے اور آپ کو سلام کرتے تھے حضور ان کے سلام کا جواب دینے کے بعد ان کیلئے دعا فرماتے تھے۔ایک دن وہ حاضر ہوئے نبی کریم ﷺ نے ان سے پوچھا اے فلاں تمہارا کیا حال ہے؟ انہوں نے عرض کیا بہتر حال ہے میں اس پر شکر گزار ہوں حضور خاموش ہو گئے وہ شخص عرض کرنے لگے اے اللہ کے نبی آپ مجھ سے سوال کرتے تھے اور میرے لئے دعا کرتے تھے آج آپ نے سوال کیا ہے دعا نہیں فرمائی؟ آپ نے فرمایا میں تم سے سوال کرتا تھا یعنی حال پوچھتا تھا تاکہ تم اللہ تعالیٰ کا شکریہ ادا کرسکو (دعا بھی اسی وجہ سے کرتا تھا) لیکن آج میں نے اسی وجہ سے تمہارا حال پوچھا تھا کہ میں دیکھ سکوں کیا واقعی تم اللہ تعالیٰ کے شکر گزار بندے بن گئے ہو۔

☆ " عن ابی بکر الصدیق رضی اللہ عنہ کان یقول فی دعائہ اسألک تمام النعمة فی الاشیاء کلھا والشکر لک علیھا حتی ترضی وبعد الرضاء " (ابن ابی الدنیا ، درمنثور)

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اپنی دعا میں عرض کرتے تھے اے اللہ میں تجھ سے تیری نعمتوں کی تمام اشیاء میں تکمیل طلب کرتا ہوں اور ان پر شکر گزار رہنے کی دعا کرتا ہوں تاکہ تو راضی ہو جائے اور تیری رضاء کے بعد بھی میں شکر گزار رہوں۔

☆" عن عامر قال الشکر نصف الایمان والصبر نصف الایمان والیقین الایمان کلہ " (ابن ابی الدنیا ، بیھقی، درمنثور)

حضرت عامر کہتے ہیں شکر نصف ایمان ہے اور صبر نصف ایمان ہے اور یقین کامل ایمان ہے۔

☆ " عن سفیان بن عیینة قال قیل للزھری ما الزاھد قال من لم یغلب الحرام صبرہ ولم یمنع الحلال شکرہ " (ابن ابی الدنیا ، بیھقی ، درمنثور)

سفیان بن عیینہ کہتے ہیں حضرت زہری سے پوچھا گیا زاہد کی صفات کیا ہیں؟ تو آپ نے فرمایا وہ شخص جس کے صبر پر حرام غالب نہ آجائے اور حلال چیزیں اس کے شکر میں رکاوٹ نہ بنیں۔

☆ "عن ابی عبد الرحمن السلمی قال سئل الاستاذ ابو سهل محمد بن سلیمان الصعلوکی عن الشکر والصبر ایهما افضل فقال هما فی الاستواء فالشکر وظیفة السراء والصبر فریضة الضراء" (بیهقی ، در منثور)

ابوعبدالرحمٰن سلمی فرماتے ہیں استاذ ابوسہل محمد بن سلیمان صعلوکی سے سوال کیا گیا کہ شکر افضل ہے یا صبر؟ تو آپ نے فرمایا دونوں ہی اپنے اپنے مقام پر افضل ہیں کیونکہ نعمتوں کے حصول پر اور خوشی کے وقت شکر کرنا ضروری ہے اس وقت یقیناً شکر افضل ہوگا اور مصیبت کے وقت صبر کرنا ضروری ہے اس وقت یقینی بات ہے کہ صبر کرنا ہی افضل ہوگا۔

☆ "عن صهیب قال قال رسول الله ﷺ عجبا لامر المؤمن ان امر المؤمن کله خیر ان اصابته سراء فشکر کان خیرا وان اصابته ضراء فصبر کان خیرا" (مسلم ، بیهقی ، درمنثور)

حضرت صہیب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا مومن کا ہر کام باعث تعجب ہے اگر اسے خوشی حاصل ہو تو وہ شکر ادا کرے تو یہ بھی اس کے لئے خیر ہے اور اگر مصیبت پہنچے تو صبر کرے تو یہ بھی اس کے لئے خیر ہے۔

☆ "عن محمد بن کعب القرظی قال یا هؤلاء احفظوا ثنتین شکر النعمة واخلاص الایمان" (الخرائطی ، در منثور)

محمد بن کعب قرظی کہتے ہیں اے لوگو دو چیزوں پر ہمیشہ عمل جاری رکھو نعمت پر شکر کرنا اور ایمان میں خلوص۔

☆☆☆☆☆

﴿ يَآ اَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اسْتَعِيْنُوا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصَّابِرِيْنَ ﴾

۱) ''اے ایمان والوصبر اور نماز سے مدد چاہو بے شک اللہ صابروں کے ساتھ ہے''

۲) اے ایمان والومدد طلب کروصبر اور نماز سے بیشک اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے''

يَآ اَيُّهَا الَّذِيْنَ : (اے ایمان والو)

" وصفهم بالايمان اثر تعداد ما يوجبه ويقتضيه تنشيطالهم وحثا على مراعاة ما يعقبه من الامر " (ابو السعود)

ایمان والے کہہ کر پکارنے کی وجہ یہ ہے کہ جب مشکل احکام کا حکم دیا جاتا ہے تو ان کو پیار سے ''ایمان والو'' کہہ کر اس کام کو خوشی سے ادا کرنے پر چست کیا جاتا ہے اور احکام پر عمل کرنے کے لئے برانگیختہ کیا جاتا ہے۔

اِسْتَعِيْنُوْا : امداد طلب کرو " فی كل ما تأتون وما تذرون " امداد طلب کرو ہر اس کام میں جس کے کرنے کا حکم دیا گیا ہے اور ہر اس کام میں جس کے چھوڑنے کا حکم دیا گیا......(ابوالسعود)

یہ عام معنی ان تمام خصوصی معانی کو شامل ہے:

" استعينوا بالصبر على الذكر والشكر وسائر الطاعات من الصوم والجهاد وترک المبالاة بطعن المعاندين فی امر القبلة "

صبر سے امداد طلب کرو ذکر و شکر پر اور تمام طاعات پر خواہ روزہ ہو یا جہاد اور قبلہ کی تبدیلی کے معاملہ میں معاندین (مخالفین، عناد رکھنے والے) کے طعنوں کی کچھ پرواہ نہ کرتے ہوئے صبر سے امداد طلب کرو۔ (روح المعانی)

صبر کیا ہے: " الصبر الامساک فی ضيق " مشکلات میں، تنگی میں رک جانا۔

اصطلاح میں صبر کا معنی یہ ہے " والصبر حبس النفس على ما يقتضيه العقل والشرع " اپنے آپ کو ان کاموں پر روکنا (یعنی وہ کام کرنا) جو عقل اور شریعت کے مطابق ہوں۔ (از مفردات راغب)

لیکن یہ خیال رہے کہ عقل شریعت کے تابع ہے شریعت کے خلاف عقل کے مطابق کام کرنا زندیقیت، یہودیت ونصرانیت ہے۔

صبر کی تین قسمیں ہیں:

(۱) "صبر علی ترک المحارم والمآثم" حرام کاموں اور گناہوں سے رکنے اور ان سے باز رہنے کو صبر کہا جاتا ہے سب سے پہلے اسی کا مقام بھی ہے کیونکہ ترک کفر پہلے ہے ایمان بعد میں۔

(۲) "صبر علی فعل الطاعات والقربات" نیکی اور قربت کے کاموں میں صبر کرنا یعنی نیکی کے کاموں میں مشقت کو برداشت کرنا یہی صبر عظیم ہے یہی مقصود ہے اسی پر اجر عظیم مرتب ہوتا ہے۔

(۳) "الصبر علی المصائب والنوائب" مصیبتوں اور تنگیوں میں صبر سے کام لینا اور برداشت کرنا۔ (ابن کثیر)

صبر صرف انسانوں کے ساتھ خاص کیوں؟

جانوروں کو صبر کا حکم اس لئے نہیں دیا گیا کہ وہ صرف شہوت رکھتے ہیں عقل نہیں رکھتے، اور فرشتوں کو صبر کا حکم اس لئے نہیں دیا گیا کہ وہ صرف عقل رکھتے ہیں شہوت نہیں۔

انسان چونکہ ابتداء میں حیوانوں کی طرح ہی ہوتا ہے اسے صرف کھانے، پینے کی خواہش ہوتی ہے تھوڑا بڑا ہوا تو کھیلنے کی خواہش پیدا ہوئی، بالغ ہوا تو خواہشات نفسانیہ (جماع وغیرہ کی خواہشات) کا غلبہ ہو جاتا ہے۔ جس طرح انسان آہستہ آہستہ عمر کے مدارج طے کرتا جاتا ہے اسی طرح عقل میں بھی ترقی ہوتی چلی جاتی ہے اگرچہ بڑھاپے میں پھر اس میں کمی آجاتی ہے۔

بالغ ہونے کے بعد خواہشات کا تقاضہ یہ ہوتا ہے وہ جلدی سے لذات کو حاصل کرے خواہ وہ ناجائز طریقہ سے ہی کیوں نہ حاصل ہوں۔ اس وقت عقل سے کام لینے کی ضرورت ہے کہ ان خواہشات سے باز رہ کر سعادت مندی حاصل کرے عقل کو خواہشات پر غلبہ حاصل ہو گیا تو صبر خود بخود حاصل ہو گیا اگر خواہشات عقل پر غالب آگئیں تو اسی کا نام بے صبری ہے۔ (از عزیزی)

صبر کی تقسیم کا خوبصورت انداز:

صبر کی دو قسمیں ہیں بدنی اور نفسانی۔ بدنی کی پھر دو قسمیں ہیں فعلی اور انفعالی۔

صبر فعلی یہ ہے کہ مشکل کاموں پر عمل کرنا، یعنی اعمال شاقہ کو برداشت کرنا، اور ان پر عمل کرنا۔

صبر انفعالی یہ ہے کہ دکھ، درد، مصائب و آلام اور تکالیف کو برداشت کرنا اور ان پر صابر رہنا۔

صبر نفسانی یہ ہے کہ نفس کو اس کی طبیعت کے تقاضا سے دور رکھنا نفسانی خواہشات کا تقاضا ہی برائی کا ہوتا ہے اگر پیٹ اور فرج کو بری خواہشات سے روک رکھے تو اسے عفت کہا جاتا ہے۔ اگر زیادہ مال جمع کرنے کی حرص اور لالچ سے انسان اپنے آپ کو روک رکھے تو اسے زہد اور قناعت کہا جاتا ہے اگر جزع و فزع، آہ و فغان، چیخ و پکار اور منہ پر طمانچے مارنے اور گریبان چاک کرنے اور کپڑے پھاڑنے سے مصیبت کے وقت باز رہے تو اسے عرف عام میں صبر کہا جاتا ہے جس کا نام صبر عرفی ہے۔

اگر غنی ہونے اور دولت مند ہونے کی صورت میں اپنے آپ کو تکبر سے بچا کر رکھے دوسروں کو پست سمجھنے اور اپنے آپ کو بلند سمجھنے سے بچا کر رکھے تو اس صبر کو فراخی حوصلہ کہتے ہیں۔

اگر میدان جنگ سے اپنے آپ کو بھاگنے سے بچا کر رکھے اور ثابت قدم رہے تو اس صبر کو شجاعت کہتے ہیں۔

اگر غیظ و غضب کی حالت میں کسی کو مارنے اور گالی دینے سے اپنے آپ کو روک کر رکھے تو اس صبر کو حلم کہتے ہیں۔

اگر کسی اہم کام میں اضطرار اور حیرانگی سے بچ کر رہے تو اس صبر کو بھی وسعت حوصلہ کہتے ہیں۔

اگر انسان کسی کے راز کو دوسروں پر ظاہر کرنے سے رک جائے تو اسے رازداری کہتے ہیں۔ صبر کی تمام قسمیں اللہ تعالیٰ کی نعمتیں ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں پر شکر کرنا اور زیادہ نعمتوں کے حصول کا ذریعہ ہے۔

(عزیزی)

حقیقت صبر کیا ہے؟ حقیقت میں اسے صبر نہیں کہا جا سکتا کہ آدمی کو کسی مکروہ چیز کی کدورت حاصل نہ ہو یا مکروہ چیز حاصل ہو لیکن یہ مکروہ نہ سمجھے۔ بلکہ حقیقت میں صبر یہ ہے کہ انسان باوجود کدورت اور طبعی کراہیت کے جو عقل اور شرع کے منافی ہے اس پر جزع و فزع، چیخ و پکار سے اپنے آپ کو روک

رکھے۔ ہاں اگر تکالیف اور دکھ درد میں انسان کے بے اختیار آنسو نکل آئیں چہرے کا رنگ بے اختیار بدل جائے تو یہ صبر کے منافی (مخالف) نہیں۔ کیونکہ نبی کریم ﷺ کے اپنے بیٹے ابراہیم کی وفات کے وقت آنسو جاری تھے اور آپ یہ فرمارہے تھے " واللہ انا بفراقک یا ابراھیم لمحزونون " قسم ہے اللہ تعالیٰ کی اے ابراہیم ہم تیرے فراق (موت) پر غمناک ہیں۔

اور آپ یہ فرمارہے تھے "ان العین تدمع و القلب یحزن و لا نقول الا ما یرضی ربنا " بیشک آنکھ آنسو بہارہی ہے اور دل غمناک ہے اور ہم وہی بات کہتے ہیں جس پر ہمارا رب راضی ہو۔ ہم رب تعالیٰ کی رضامندی کے خلاف کوئی بات نہیں کرتے۔

صرف غم اور ملال کا حاصل ہونا صرف آنسو بہانا لیکن جزع وفزع نہ کرنا اللہ تعالیٰ کی رحمت ہے اسی قسم کی حالت کو یوں بیان کیا گیا ہے " وانما یرحم اللہ من عبادہ الرحماء "اللہ تعالیٰ اپنے رحم کرنے والے بندوں پر رحم فرماتا ہے اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ غم اور پریشانی کا لاحق ہونا اور آنسو بہنا انسانی طاقت سے باہر ہے لہٰذا ان سے روکنا تکلیف مالایطاق ہے۔ رب تعالیٰ نے فرمایا ﴿لایُکَلِّفُ اللہُ نَفۡسًا اِلَّا وُسۡعَھَا﴾ اللہ تعالیٰ کسی نفس کو تکلیف نہیں دیتا سوائے اس کی طاقت کے"

(ماخوذ از عزیزی)

فضیلت صبر:

" الصابر علی البلاء یرفعه الله ثلا ثمائة درجة بین کل درجتین کما بین السماء والارض مرة والصابر علی دوام الطاعة یرفعه الله ستمائة درجة بین کل درجتین کما بین السماء والارض مرتین والصابر عن المعصیة یرفعه الله تسعمائة درجة بین کل درجتین کما بین السماء والارض ثلاث مرات "

مصیبت پر صبر کرنے والے شخص کے اللہ تعالیٰ تین سو درجات بلند فرماتا ہے ہر دو درجہ میں اتنی بلندی ہوتی ہے جیسے زمین وآسمان میں ایک مرتبہ کا فاصلہ ہے۔ اور طاعت پر ہمیشہ صبر کرنے والے کے اللہ تعالیٰ چھ سو درجات بلند فرماتا ہے ہر دو درجہ میں اتنی بلندی ہوتی ہے جتنی زمین وآسمان میں فاصلہ کی دو مرتبہ بلندی پائی جاتی ہے اور گناہوں سے رک کر صبر کرنے والے کے اللہ تعالیٰ نو سو درجات بلند فرماتا ہے ہر دو

درجہ کے درمیان اتنا فاصلہ اور بلندی ہوتی ہے جتنا زمین و آسمان کے درمیان فاصلہ

تین مرتبہ پایا جائے۔ (صاوی)

اسی سے واضح ہو گیا کہ سب سے اعلیٰ درجہ گناہوں سے رکنا ہے کیونکہ اس کے اوپر نیکیوں کا عمل مرتب ہے اور سب سے کم درجہ مصیبت پر صبر کرنا ہے۔ خیال رہے کہ ابن کثیر نے نیکیوں پر عمل کرنے کی فوقیت کا ذکر کیا ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

تاہم یہ خیال رہے کہ لوگوں کے ذہنوں میں صرف ایک صبر ہے جو سب سے کم درجہ کا صبر ہے اور جو اعلیٰ درجہ کے صبر ہیں ان کو بھولے ہوئے ہیں۔

☆ " قال عبد الرحمن بن زید بن اسلم الصبر فی بابین الصبر لله بما احب وان ثقل علی الانفس والابدان والصبر لله عما کره وان نازعت الیه الا هواء فمن کان هذا فهو من الصابرین الذی یسلم علیهم ان شاء الله " (ابن کثیر)

عبدالرحمٰن بن زید بن اسلم کہتے ہیں صبر کی دو قسمیں عظیم درجہ رکھتی ہیں اللہ تعالیٰ کی رضاء کے لئے صبر کرے اس چیز پر جو رب تعالیٰ کو پسند ہے یعنی طاعت پر صبر کرے اگرچہ اس کے نفس اور بدن پر بوجھ بھی محسوس ہو۔ اور اللہ تعالیٰ کی رضاء کے حصول کے لئے ان چیزوں سے جو رب تعالیٰ کو ناپسند ہیں یعنی معصیت سے باز رہے اگرچہ اس کی خواہشات ان گناہوں سے رکنے پر رکاوٹ ہی کیوں نہ بنیں۔ جس شخص میں یہ دونوں قسم کے صبر پائے جائیں گے وہی صابرین سے ہوگا اور ان کو سلام کرے گا اگر اللہ نے چاہا۔

☆ " قال علی بن الحسین زین العابدین اذا جمع الله الاولین والآخرین ینادی مناد این الصابرون لیدخلوا الجنة قبل الحساب قال فیقوم عنق من الناس فتتلقاهم الملائکة فیقولون الی این یا بنی آدم فیقولون الی الجنة فیقولون وقبل الحساب قالوا نعم قالوا ومن انتم قالوا نحن الصابرون قالوا وما کان صبر کم قالوا صبرنا علی طاعة الله وصبرنا عن معصیة الله حتی توفانا الله قالوا انتم کما قلتم ادخلوا الجنة فنعم اجر العاملین " (ابن کثیر)

حضرت علی بن حسین زین العابدین فرماتے ہیں جب اللہ تعالیٰ اولین و آخرین کو جمع فرمائے گا تو نداء دینے والا نداء دے گا صبر کرنے والے کہاں ہیں کہ وہ حساب سے پہلے ہی جنت میں داخل

ہو جائیں آپ فرمائے کچھ لوگ کھڑے ہوں گے فرشتے ان کو ملیں گے ان سے پوچھیں گے اے لوگو کہاں جارہے ہو؟ وہ کہیں گے جنت میں جارہے ہیں فرشتے کہیں گے کیا حساب سے پہلے ہی جنت میں جارہے ہو؟ وہ کہیں گے ہاں فرشتے ان سے پوچھیں گے تم کون ہو؟ وہ کہیں گے ہم صبر کرنے والے ہیں فرشتے ان سے پوچھیں گے تمہارا صبر کیا ہے؟ وہ کہیں گے ہم اللہ تعالیٰ کی طاعت پر صبر کرتے رہے اور گناہوں سے صبر کرتے رہے یعنی گناہوں سے بچتے رہے ہم اسی حال میں رہے یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں فوت کردیا فرشتے کہیں گے ہاں واقعی تم ایسے ہی تھے جیسے کہہ رہے ہو لہٰذا اب تم جنت میں داخل ہو جاؤ۔ پس اچھا عمل کرنے والوں کا اجر اچھا ہے۔ ابن کثیر کہتے ہیں کہ حضرت زین العابدین رحمہ اللہ کی اس روایت کو رب تعالیٰ کے اس ارشاد گرامی سے تائید حاصل ہے:

﴿ اِنَّمَا یُوَفَّی الصّٰبِرُوْنَ اَجْرَھُمْ بِغَیْرِ حِسَابٍ ﴾

''صبر کرنے والوں کو اجر بغیر حساب کے دیا جائے گا'' (ابن کثیر)

وَالصَّلٰوۃِ : اور نماز (سے امداد طلب کرو) ابھی تک صبر کی جو بحث کی گئی اس میں تمام طاعات کا ذکر ہو چکا ہے لیکن پھر نماز کا اس کے بعد ذکر کرنا اس وجہ سے ہے " **خصها بعد التعميم لرفعة شانها فانها ام العبادات جامعة للطاعات معراج للمؤمن** " کہ یہ تخصیص بعد از تعمیم ہے (عمومی طور پر اگرچہ پہلے نماز کا ذکر ہو چکا ہے لیکن اب خصوصی طور پر ذکر کیا جارہا ہے) تا کہ نماز کی شان کی بلندی واضح ہو جائے کیونکہ یہ تمام عبادات کی اصل ہے اور تمام طاعات کی جامع ہے اور مومن کی معراج ہے۔

☆ " **عن علی مرفوعا الصلوة عماد الدين** " (رواه صاحب مسند الفردوس)

حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مرفوع حدیث مروی ہے کہ نماز دین کا ستون ہے۔

☆ " **وعن انس مرفوعا الصلوة نور المؤمن** " (رواه ابن عساكر)

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مرفوع حدیث مروی ہے کہ نماز مومن کا نور ہے۔

" **قال المجدد رضی الله عنه غاية مقامات العابدين حقيقة الصلوة والترقي هناک بكثرة الصلوة** "

''مجدد رحمہ اللہ نے فرمایا عابدین کے مقام کی انتہاء حقیقت نماز ہے اور کثرت نماز سے

اس مقام سے ترقی حاصل ہوتی ہے''۔ (مظہری)

اِنَّ اللّٰہَ مَعَ الصَّابِرِیْنَ : ''بیشک اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے''۔

اللہ تعالیٰ تو ہر شخص کے ساتھ ہے تو صبر کرنے والوں کے ساتھ ہونے کا کیا مطلب ہے؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ یہاں مراد معیت (سنگت) خاصہ ہے یعنی **بالعون والنصر والاجابة** ''یعنی معاونت اور نصرت اور دعا کی قبولیت کی معیت اللہ تعالیٰ کی صبر کرنے والوں کو حاصل ہے۔

قاضی محمد ثناء اللہ مظہری رحمہ اللہ فرماتے ہیں۔

'' قلت بل معية غير متكيفة يتضح على العارفين ولا يدرك كنهه غير احسن الخالقين ''

اس معیت کی کیفیت بیان نہیں کی جاسکتی یہ تو صرف عارفین، اولیاء اللہ یعنی اللہ والے ہی جانتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے بلکہ اللہ والوں کی پہچان بھی ظاہری ہے اس معیت کی حقیقت کا ادراک سوائے اللہ تعالیٰ احسن الخالقین کے کوئی نہیں جانتا۔ (مظہری)

جب پہلے دو چیزوں کا ذکر ہے ''صبر اور نماز'' تو صرف ﴿اِنَّ اللّٰہَ مَعَ الصَّابِرِیْنَ﴾ کہا گیا ہے لیکن '' ان اللہ مع المصلین '' نہیں کہا گیا اس کی کیا وجہ ہے؟ تو اس کا جواب یہ ہے '' **لانه اذا كان مع الصابرين كان مع المصلين من باب اولى لاشتمال الصلوة على الصبر** '' کہ بیشک جب اللہ تعالیٰ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے تو نماز ادا کرنے والوں کے ساتھ بھی ہے یقینی طور پر، چونکہ نماز کا ذکر صبر میں آچکا تھا کہ نماز صبر اور تمام عبادات پر مشتمل ہے۔ (سورۃ فاتحہ کی وضاحت میں نجوم الفرقان کو دیکھیں) تو علیحدہ ذکر نہیں کیا۔ (از روح المعانی)

طلباء کرام یہ نہ سمجھیں کہ اس جواب میں تو تعارض ہے کہ امداد طلب کرنے میں تو صبر اور نماز کو علیحدہ ذکر کردیا گیا تو معیت کے ذکر میں علیحدہ ذکر نہیں کیا اس کی وجہ کیا ہے؟ وجہ واضح ہے کہ نماز کی اہمیت کے لحاظ سے علیحدہ ذکر کیا گیا لیکن جب ایک مرتبہ ذکر کردیا دوبارہ جب صبر سے نماز کا ذکر سمجھ آرہا تھا تو علیحدہ ذکر نہیں کیا۔

﴿ وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ يُّقْتَلُ فِىْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتٌ بَلْ اَحْيَآءٌ وَّلٰكِنْ لَّا تَشْعُرُوْنَ ﴾

۱) ''اور جو خدا کی راہ میں مارے جائیں انہیں مردہ نہ کہو، بلکہ وہ زندہ ہیں ہاں تمہیں خبر نہیں''

۲) ''اور نہ کہو جو اللہ کی راہ میں شہید کر دیئے گئے ان کو مردہ بلکہ وہ زندہ ہیں اور لیکن تمہیں شعور نہیں''

شان نزول: حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا ارشاد گرامی یہ ہے کہ " نزلت الآیة فی قتلی بدر " یہ آیۃ بدر میں شہید ہونے والوں کے حق میں نازل ہوئی۔ بدر میں چودہ مسلمان شہید ہوئے چھ مہاجرین سے اور آٹھ انصار سے۔

مہاجرین شہداء کے اسماء گرامی: عبیدہ بن حارث بن عبد المطلب اور عمرو بن ابی وقاص اور ذو الشمالین اور عمرو بن نفیلہ اور عامر بن بکر اور مہجع بن عبد اللہ۔

انصار شہداء کے اسماء گرامی: سعید بن خیثمہ اور قیس بن عبد المنذر اور زید بن حارث اور تمیم بن حمام اور رافع بن معلٰی اور حارثہ بن سراقہ اور معوذ بن عفراء اور عوف بن عفراء۔

لوگ جب ان شہداء کا تذکرہ کرتے تو یہ کہتے ''مات فلان، مات فلان'' فلاں فوت ہو گیا فلاں فوت ہو گیا۔ اسی طرح کافر اور منافق لوگ کہنے لگے " ان الناس یقتلون انفسھم طلبا لمرضاۃ محمد من غیر فائدۃ " کہ یہ مسلمان بغیر کسی مقصد اور فائدہ کے صرف محمد کو راضی کرنے کے لئے اپنے آپ کو قتل کرا رہے ہیں "فنزلت ھذہ الآیة " تو یہ آیۃ کریمہ نازل ہوئی کہ تم ان کو مردہ نہ کہو وہ تو اللہ تعالیٰ کی راہ میں جان قربان کر کے حیات جاودانی (ہمیشہ کی زندگی) پا گئے۔ (از کبیر)

اور یہ بھی واضح ہو گیا کہ نبی کریم ﷺ کی رضاء کو حاصل کرنے والوں کو بے فائدہ کام کرنے والے کہنا کافروں اور منافقوں کا کام ہے۔

فضیلت شہادت:

"عن ابی قتادۃ عن رسول اللہ ﷺ انہ قام فیھم فذکر لھم ان الجھاد

فی سبیل اللہ و الایمان باللہ افضل الاعمال فقام رجل فقال یا رسول اللہ ارأیت ان قتلت فی سبیل اللہ اتکفر عنی خطایای فقال رسول اللہ ﷺ نعم ان قتلت فی سبیل اللہ وانت صابر محتسب مقبل غیر مدبر الا الدین فان جبرئیل علیہ السلام قال لی ذلک "

(مسلم ج ۲ ص ۱۴۳ باب من قتل فی سبیل اللہ کفرت خطایاہ الا الدین)

حضرت ابوقتادہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ ایک مرتبہ صحابہ کرام میں کھڑے ہوئے ان کے سامنے اللہ تعالیٰ کی راہ میں جہاد کرنے اور رب تعالیٰ پر ایمان لانے کی فضیلت بیان فرمائی۔ ایک صحابی کھڑے ہوئے عرض کیا یا رسول اللہ آپ کیا فرماتے ہیں کہ اگر میں اللہ کی راہ میں شہید ہو جاؤں کیا میرے گناہ مٹا دیئے جائیں گے؟ نبی کریم ﷺ نے فرمایا ہاں اگر تمہیں اللہ کی راہ میں شہید کر دیا گیا ایسے حال میں کہ تم نے صبر اور خلوص سے جہاد کیا دشمن کے سامنے رہے پیٹھ پھیر کر نہ بھاگے (تو تمہارے تمام گناہ مٹا دیئے جائیں گے) سوائے قرض کے بیشک جبریل نے مجھے ابھی آ کر بتایا۔

وضاحت حدیث: " فیہ ھذہ الفضیلۃ العظیمۃ للمجاھد وھی تکفیر خطایاہ کلھا الا حقوق الآدمیین "

اس حدیث پاک میں اللہ کی راہ میں جہاد کرنے والے کی عظیم فضیلت ذکر کی گئی کہ اس کے تمام گناہ مٹا دیئے جائیں گے لیکن لوگوں کے حقوق معاف نہیں ہوں گے۔

لیکن یہ فضیلت ان شرائط سے مشروط ہے ایک تو یہ کہ وہ جہاد کرنے میں صابر ہو مضطرب ہو کر ادھر ادھر بھاگتا نہ پھرے۔

اور دوسری شرط یہ ہے کہ وہ محتسب ہو۔ اس مقام پر محتسب کا معنی یہ بیان کیا گیا ہے " ھو المخلص للہ تعالیٰ " کہ وہ صرف اللہ تعالیٰ کی رضاء حاصل کرنے کے لئے خلوص سے جہاد کرے۔

اسی سے یہ مسئلہ خود بخود واضح ہو گیا کہ " فان قاتل لعصبیۃ او لغنیمۃ او لصیت او نحو ذلک فلیس لہ ھذا الثواب ولا غیرہ " اگر کسی شخص نے خاندانی تعصب کے طور پر جہاد میں حصہ لیا۔ یا مال غنیمت حاصل کرنے کے لئے جہاد میں شریک ہوا۔ یا شہرت اور چرچا حاصل کرنے کے لئے یا اور اس قسم کے مقاصد حاصل کرنے کے لئے جہاد میں شریک ہوا جن میں خلوص نہیں پایا گیا تو

وہ ثواب سے محروم رہے گا۔

نبی کریم ﷺ نے فرمایا " اِلاَّ الدَّینَ "(سوائے قرض کے) ففیه تنبیه علی جمیع حقوق الآدمیین وان الجهاد والشهادة وغیرهما من اعمال البر لا یکفر حقوق الآدمیین وانما تکفر حقوق الله تعالیٰ " اس سے آپ نے اس مسئلہ کی طرف متنبہ کیا کہ انسانوں کے تمام حقوق کسی عبادت سے معاف نہیں ہوتے خواہ جہاد ہو اللہ کی راہ میں، خواہ شہادت حاصل کرلے خواہ اور نیکی کا کوئی کام کرے ہاں البتہ اللہ تعالیٰ اپنے حقوق معاف فرما دیتا ہے۔

صحابی کے سوال میں ابتدائی طور پر مطلقاً "نعم" (ہاں تمام گناہ مٹ جائیں گے) فرمایا لیکن رب تعالیٰ نے جبریل کو بھیج کر بتایا کہ یا رسول اللہ آپ انکو بتا دیں کہ حقوق العباد میں کسی عبادت سے معاف نہیں کروں گا۔ وہ حقوق ادا کر کے میرے پاس آئیں نہیں تو پھر ایک اور حدیث میں بیان کر دیا گیا ہے کہ حساب کے وقت قیامت کے دن اس شخص کی نیکیاں اسے دی جائیں گی جس کا حق اس نے ادا نہیں کیا تھا اگر نیکیاں دینے سے بھی حق ادا نہ ہوا تو اس شخص کے گناہ اس پر ڈال دیئے جائیں گے جس نے حق دبایا ہوا تھا۔

☆ "عن مسروق قال سألنا عبد الله عن هذه الآية ﴿ ولا تحسبنّ الّذين قُتلُوا في سبيل الله امواتا بل احيآء عند ربهم يُرزقُون ﴾ قال اما انا قد سألنا عن ذلک فقال ارواحهم فی جوف طیر خضرلها قناديل معلقة بالعرش تسرح من الجنة حيث شاء ت ثم تاوی الی تلک القناديل فاطلع اليهم ربهم اطلاعة فقال هل تشتهون شيأ قالوا ایّ شئی نشتهی ونحن نسرح من الجنة حيث شئنا ففعل ذلک بهم ثلاث مرات فلما رأوا انهم لن يتركوا من ان يسألوا قالوا يا رب ان ترد ارواحنا فی اجسادنا حتی نقتل فی سبيلک مرة اخری فلما رأی ان ليس لهم حاجة تركوا " (مسلم ج ۲ ص ۱۳۳ باب فی بیان ارواح شهداء فی الجنة الخ)

حضرت مسروق کہتے ہیں ہم نے سوال کیا حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے اس آیۃ کریمہ کے متعلق (ترجمہ) (اور ہرگز ہرگز گمان نہ کروان لوگوں کو جو اللہ کی راہ میں شہید کر دیئے گئے کہ وہ مردہ ہیں بلکہ وہ زندہ ہیں اپنے رب کے ہاں ان کو رزق دیا جاتا ہے) انہوں نے کہا بیشک ہم نے اس کا سوال (نبی کریم ﷺ سے) کیا تھا تو آپ نے فرمایا ان کی روحیں سبز رنگ کے پرندوں کے قالب میں رکھی

جائیں گے جن کی قنادیل عرش سے معلق ہوں گی وہ جنت کے پھل کھانے کے لئے جہاں چاہیں گے سیر کریں گے پھر وہ اپنی قندیلوں میں آجائیں گے تو رب تعالیٰ ان پر جلوہ گری فرمائے گا اور ارشاد فرمائے گا کیا تم کسی چیز کی خواہش رکھتے ہو تو وہ کہیں گے ہمیں اب کسی اور چیز کی خواہش کیا ہونی ہے جب کہ جنت سے منافع ہم حاصل کررہے ہیں جہاں چاہتے ہیں ہم جاتے ہیں اسی طرح ان سے تین مرتبہ سوال وجواب ہوتا ہے۔ جب وہ دیکھیں گے کہ ہم سے بار بار سوال کیا جارہا ہے ہمیں جواب دینا ہی چاہئے تو وہ عرض کریں گے اے اللہ ہماری روحوں کو ہمارے جسموں میں لوٹا دے تا کہ ہم تیری راہ میں پھر شہید ہو جائیں۔ جب رب تعالیٰ دیکھے گا کہ ان کو کسی چیز کی اب کوئی حاجت نہیں تو ان کو اسی حال میں چھوڑ دیا جائے گا۔

وضاحت حدیث: مسلم شریف کے بعض نسخوں میں ''عبداللہ بن مسعود'' ہے یعنی مسروق نے سوال عبداللہ بن مسعود سے کیا اسی طرح بعض نسخوں میں ہے '' **انا قد سألنا عن ذلک فقال یعنی النبی** ﷺ '' بیشک ہم نے اس کے متعلق سوال کیا تھا یعنی نبی کریم ﷺ سے (راقم نے اسی وجہ سے ترجمہ اسی کے مطابق کیا)

'' وفیہ بیان ان الجنۃ مخلوقۃ موجودۃ وھو مذھب اھل السنۃ وھی التی اھبط منھا آدم وھی التی ینعم فیھا المؤمنون فی الآخرۃ ھذا اجماع اھل السنۃ ''

اس حدیث پاک سے یہ روز روشن کی طرح عیاں ہوا کہ بیشک جنت کی تخلیق ہو چکی ہے اور وہ اب بھی موجود ہے یہی مذہب اہل سنت کا ہے اور یہی وہ جنت ہے جس سے آدم علیہ السلام کو اتارا گیا اور یہی وہ جنت ہے جس میں مومن لوگوں کو آخرت میں نعمتوں سے نوازا جائے گا اسی پر اہل سنت کا اجماع ہے۔

معتزلہ اور بعض بدعتی لوگوں نے کہا کہ جنت اب موجود نہیں وہ جنت جو مومنوں کو حاصل ہونی ہے وہ قیامت کے بعد پیدا کی جائے گی اور جس جنت سے آدم علیہ السلام کو نکالا گیا وہ اور ہے۔ ''وظواھر القرآن والسنۃ تدل لمذھب اھل الحق'' قرآن پاک کی ظاہر اور روشن آیات اور

احادیث مبارکہ اہل حق کے مذہب پر دلالت کر رہی ہیں۔ ان شاء اللہ حق کا ہی بول بالا رہے گا باطل مٹ کر رہے گا۔ معتزلہ اور بدعتی لوگوں سے بھی چند قدم آگے یہود ونصاریٰ کے پروردہ لوگ نکل گئے معتزلہ اور بدعتی لوگوں نے دنیاوی زندگی تک شہداء کے مرتبہ کو کم کرنے کی کوشش کی نہ ابھی تک کوئی جنت ہے اور نہ ہی شہداء کو قیامت سے پہلے جنت سے کوئی فائدہ حاصل ہونا ہے۔ یہ قول بھی احادیث مبارکہ کا صریح طور پر انکار ہے لیکن یہودیوں اور نصرانیوں کے یاروں نے مکمل طور پر جنت کا انکار کر دیا۔ انہوں نے آخرت کے تصور کو ہی (معاذ اللہ) باطل قرار دیا۔ اور قبر کے عذاب کا بھی انکار کیا تاکہ مسلمانوں کے دلوں سے جذبہ جہاد کو نکال دیا جائے اور شوق شہادت سے مومنوں کے دلوں کو خالی کر دیا جائے جب آخرت اور قبر کے عذاب کا ڈر کسی کو حاصل نہیں ہوگا تو وہ من مانیاں کرتا رہے گا اس کو عیاشی کا کھلا موقع مل جائے گا یہی لوگ ملک وملت کے دشمن ہیں۔

قیامت سے پہلے عذاب وثواب: " وفیه اثبات مجازاة الاموات بالثواب والعقاب قبل القیامة " اسی حدیث پاک سے یہ سمجھ آ گیا کہ مردہ لوگوں کو قیامت سے پہلے بھی ثواب عطا ہوگا اور اسی طرح قیامت سے پہلے کچھ لوگوں کو عذاب ہوگا۔ ثواب پر تو رب تعالیٰ کا ارشاد گرامی جس کا ذکر اس حدیث میں ہے ﴿ بَلْ اَحْیَآءٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ یُرْزَقُوْنَ ﴾ دلالت کر رہا ہے۔

" واما غیرهم فانما یعرض علیه مقعده بالغداة والعشی کما جاء فی حدیث ابن عمرو کما قال فی آل فرعون النار یعرضون علیها غدوا وعشیا "

لیکن مومنین کے بغیر کفار کو ان کا جہنم والا مقام صبح وشام قیامت سے پہلے پیش کیا جائے گا جیسا کہ حدیث ابن عمرو میں واضح ہے اور صریح طور پر اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی جو کہ آل فرعون کے متعلق ہے دلالت کر رہا ہے ﴿ اَلنَّارُ یُعْرَضُوْنَ عَلَیْهَا غُدُوًّا وَّعَشِیًّا ﴾ ان پر صبح وشام آگ کو پیش کیا جائے گا۔ کیونکہ قیامت کے بعد کا ذکر ان الفاظ مبارکہ کے بعد ہے ﴿ وَیَوْمَ تَقُوْمُ السَّاعَةُ اَدْخِلُوْا آلَ فِرْعَوْنَ اَشَدَّ الْعَذَابِ ﴾ اور جس دن قیامت قائم ہوگی (فرشتوں سے کہا جائے گا) آل فرعون کو سخت عذاب میں داخل کر دو۔ (نووی زیر حدیث مذکور)

تنبیہ: اسی مضمون کی احادیث میں الفاظ مختلف ہیں مسلم میں ہے " فی جوف

طیر خضر " اور مسلم کے بغیر باقی احادیث کی کتب میں بعض جگہ " لطیر خضر " اور بعض احادیث میں "بحواصل طیر" ہے " جوف " کا معنی پیٹ" حواصل " کا معنی پوٹے ان تمام کا معنی صدرالافاضل حضرت مولنا نعیم الدین مرادآبادی رحمہ اللہ نے خوبصورت کیا (سبز پرندوں کے قالب میں ہوں گی) البتہ حدیث قتادہ میں " فی صورۃ طیر ابیض " ہے سفید پرندے کی صورت میں۔ ممکن ہے بعض روحیں سفید پرندوں کی شکل کے قالب میں ہوں اور بعض سبز پرندوں کی شکل کے قالب میں ہوں۔

اعتراض: یہ تو تناسخ ہے کہ اچھی صورتوں میں روحوں کو منتقل کرنا اور ان کو نعمت و راحت پہنچانا۔ اور بری صورتوں میں منتقل کرنا اور ان کو عذاب دینا جب یہ مذہب ملحدین کا ہے اور باطل ہے تو حدیث شریف کا مطلب کیا ہے۔

جواب اول: تناسخ یہاں کیسے لازم ہے جب کہ حدیث شریف میں صراحۃً یہ بھی موجود ہے "حتی یرجعه الله الی جسده یوم یبعثه یعنی یوم یجئی بجمیع الخلق و الله اعلم " کہ اللہ تعالیٰ قیامت کے دن جب سب مخلوق کو اٹھائے گا تو شہداء کی ارواح اپنے اپنے جسموں سے مل جائیں گی۔

جواب دوم: موطا امام مالک میں ہے " انما نسمة المؤمن طیر " مومن کے نسمہ کو پرندے کی شکل دے دی جائے گی " والنسمة تطلق علی ذات الانسان جسما وروحا وتطلق علی الروح مفردة وهو المراد بها " نسمہ انسان کے جسم اور روح کے مجموعہ کو بھی کہتے ہیں اور فقط روح کو بھی کہا جاتا یہاں فقط روح مراد ہے موطأ امام مالک کی حدیث اور علامہ نووی کی وضاحت کے بعد واضح ہوا کہ شہداء کی ارواح کو ہی سبز رنگ کے پرندوں کی شکل دے دی جائے گی جو جنت کی سیر کریں گی بظاہر یوں محسوس ہوگا کہ شہداء کی روحیں پرندوں کے قالب میں ہیں اس جواب سے تمام احادیث میں تطبیق ہو جائے گی۔ (ماخوذ از نووی بتغیر)

جواب سوم: معترضین کا اعتراض ہی غلط ہے کیونکہ وہ تناسخ کے معنی کو ہی نہیں سمجھے کہ تناسخ والوں کا کہنا کیا ہے؟ " من قالوا بالتناسخ فیقولون ان نفس زید مثلا اذا مات زید تنتقل بعینه الی بدن المولود کعمرو " (حاشیہ میر زاہد ص ۱۱۷) تناسخ کا مذہب رکھنے والے یہ کہتے ہیں کہ زید کی روح جب تک زید میں ہے اس وقت تک اسے زندہ رکھی ہوئے ہے اور اس کی نشوونما کا سبب ہے جب

زید مر جائے گا تو زید کے بدن سے روح کا تعلق ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ختم ہو جائے گا پھر وہ روح زید کی طرف نہیں لوٹے گی بلکہ وہ روح عمرو کے پیدا ہونے پر عمرو کے جسم کی طرف منتقل ہو جائے گی اس طرح ایک روح ہزاروں بدنوں کی طرف منتقل ہوتی رہے گی ۔ یہ بھی ضروری وہ نہیں سمجھتے کہ روح انسان کسی دوسرے انسان کی طرف ہی منتقل ہو جائے بلکہ ان کے نزدیک عام ہے کہ روح انسان کسی گدھے یا کتے یا خنزیر کے بدن میں منتقل ہو جائے ۔ یہ لوگ ملحدین ہیں جن کے نزدیک قیامت نے نہ آنا ہے اور نہ ہی کوئی حساب و کتاب ہے اور نہ ہی کوئی ثواب و عذاب ہے ان کے نزدیک انسان کی روح انسان میں منتقل ہو جائے تو یہی ثواب ہے اور انسان کی روح کتے یا خنزیر میں منتقل ہو جائے تو یہی عذاب ہے ۔

تناسخ کا معنی سمجھنے کے بعد حدیث پاک کا مطلب واضح ہو گیا کہ شہداء کی روحوں کو سبز پرندوں کی شکل دی جائے گی ۔ یا ان کے قالب میں بطور اعزاز منتقل کیا جائے گا وہ حقیقی پرندے نہیں ہوں گے ان کی کیفیت کو رب تعالیٰ ہی بہتر جانتا ہے پھر ہر ایک شہید کی روح قیامت کے دن اسی کے جسم سے منتقل ہو جائے گی ۔

راقم کی وضاحت کو علامہ نووی کی اس عبارت میں دیکھیں جو اسی حدیث کے ضمن میں ہے :

" وشبهه بعض الملحدة القائلين بالتناسخ وانتقال الا رواح وتنعيمها في الصور الحسان المرفهة وتعذيبها في الصور القبيحة المسخرة وزعموا ان هذا هو الثواب والعقاب وهذا ضلال بين وابطال لما جاء ت به الشرائع من الحشر والنشر والجنة والنار " (نووی)

بعض ملحد (بے دین) لوگوں نے حدیث پاک کو تناسخ سے تشبیہ دی ہے حالانکہ ان کے نزدیک تناسخ روح کا انتقال اور اچھی صورت میں منتقل ہونا اسے راحت و نعمت دیا جانا ثواب ہے اور روح کا بری اور مسخر صورتوں میں منتقل ہونا عذاب ۔

لیکن یہ ان کا قول واضح طور پر گمراہی ہے کیونکہ اس میں حشر و نشر اور جنت و دوزخ کو باطل کرنا اور انکار کرنا لازم آتا ہے جس کا ثبوت شریعت سے روز روشن کی طرح واضح ہے ۔

☆ " عن جابر قال رجل اين انا يا رسول الله ان قتلت قال في الجنة فالقى تمرات كن في يده ثم قاتل حتى قتل وفي حديث سويد قال رجل للنبي ﷺ يوم احد "

(مسلم ج ۲ ص ۱۳۹ باب ثبوت الجنة للشهيد)

حضرت جابر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں ایک شخص نے عرض کیا یارسول اللہ اگر میں شہید کردیا جاؤں تو کہاں ہوں گا؟ آپ نے فرمایا جنت میں تو اس صحابی نے اپنے کے ہاتھ سے کھجوروں کو ڈال دیا، قتال (جہاد) کیا یہاں تک کہ شہید ہوگئے حضرت سوید کی روایت کردہ حدیث میں ہے کہ یہ واقع احد کا ہے۔

فوائد: " فیہ ثبوت الجنة للشهيد " اس حدیث پاک سے ثابت ہوا کہ شہید کے لئے جنت ثابت ہے جو اسے شہید ہوتے ہی حاصل ہو جائے گی۔ ابتدائی طور پر روح جنت میں سیر کرے گی اور اسے جنت کے منافع حاصل ہوں گے لیکن روح کا تعلق جسم سے بھی برقرار رہے گا جس طرح سورج کی شعاعوں کا تعلق زمین سے ہوتا ہے۔

" وفیہ مبادرة بالخیر " اور فائدہ یہ حاصل ہوا کہ نیکی کے کام میں جلدی کرنی چاہئے کیونکہ صحابی جنت کا ذکر سنتے ہی بغیر کسی تاخیر کے میدان قتال میں پہنچ گئے۔ " وانه لا يشتغل عنه بحظوظ النفس " اور یہ سمجھ آیا کہ انسان نیکی کے مقابل اپنے ذاتی منافع کو چھوڑ دے، کیونکہ وہ صحابی کھجوریں کھا رہے تھے لیکن نبی کریم ﷺ سے شہادت کی فضیلت سن کر کھجوریں ہاتھ سے نکال دیں۔ گویا کہ یہ کہتے ہوئے میدان جنگ میں کود پڑے کہ منصب عظیم اگر حاصل ہو گیا تو بہتر لیکن اگر شہادت جیسا عظیم منصب نہ حاصل ہوا تو کھجوریں کھانے کا وقت بہت ہے۔

جنت تلواروں کے سایہ میں:

" عن ابی بکر بن عبد الله بن قيس عن ابيه قال سمعت ابی وهو بحضرة العد ويقول قال رسول الله ﷺ ان ابواب الجنة تحت ظلال السيوف فقام رجل رث الهيئة فقال ياابا موسى انت سمعت رسول الله ﷺ يقول هذا قال نعم قال فرجع الى اصحابه فقال اقرأ عليكم السلام ثم كسر جفن سيفه فالقاه ثم مشى بسيفه الى العدو فضرب به حتى قتل "

(مسلم ج ۲ ص ۱۴۷ باب ثبوت الجنة للشهيد)

ابوبکر بن عبداللہ بن قیس اپنے باپ سے روایت کرتے ہیں کہ میں نے اپنے باپ سے یہ کہتے ہوئے سنا جب وہ دشمن کے سامنے حاضر تھے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا بیشک جنت کے دروازے تلواروں کے سائے میں ہیں (یعنی شہید ہونا جنت میں جانے کا ذریعہ ہے) ایک شخص کھڑے ہوئے جو

پراگندہ حال میں تھے (یعنی پھٹے پرانے کپڑے، بال بکھرے ہوئے) وہ کہنے لگے اے موسیٰ واقعی تم نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا۔ انہوں نے کہا ہاں تو وہ شخص اپنے اصحاب کے پاس آئے اور کہا کہ میں تمہیں سلام کہتا ہوں پھر تلوار کے نیام کو توڑ کر پھینک دیا۔ پھر اپنی تلوار لے کر دشمن میں گھس گئے ان کو مارا یہاں تک کہ شہید ہو گئے۔

سبحان اللہ صحابہ کرام کا کتنا پختہ ایمان تھا کتنی زیادہ محبت تھی رسول اللہ ﷺ سے ادھر فرمان مصطفوی کی آواز کانوں میں پہنچی ادھر جان کی بازی لگا دی۔ جان قربان کرنے سے کفار کو سرنگوں کیا جا سکتا ہے آجکل کافر کی ذرا سی دھمکی پر مسلمانوں کے حکام کانپنا شروع ہو جاتے ہیں۔

☆ "عن قتادة قال سمعت انس بن مالک یحدث عن النبی ﷺ قال ما من احد یدخل الجنة یحب ان یرجع الی الدنیا و ان له ما علی الارض من شئی غیر الشهید فانه یتمنی ان یرجع فیقتل عشر مرات لما یری من الکرامة"

(مسلم ج ۲ ص ۱۴۲ باب فضل الشهادة فی سبیل الله)

حضرت قتادہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں میں نے حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے نبی کریم ﷺ کی حدیث بیان کرتے ہوا سنا آپ نے فرمایا کوئی شخص جنت میں داخل ہو کر دنیا میں لوٹنا پسند نہیں کرے گا اور نہ ہی زمین میں کسی چیز کو پسند کرے گا سوائے شہید کے، وہ تمنا کرے گا کہ میں دنیا میں لوٹ جاؤں پھر شہید کر دیا جاؤں اس طرح دس مرتبہ مجھے شہادت حاصل ہو جائے کیونکہ وہ شہادت کی وجہ سے کرامت (عزت) دیکھ چکا ہوگا۔

نبی کریم ﷺ کی تمنائے شہادت:

"عن ابی هریرة قال قال رسول الله کل کلم یکلمه المسلم فی سبیل الله ثم تکون یوم القیامة کهیئتها اذا طعنت تفجر دما اللون لوم دم و العرف (بالفتح) عرف المسک وقال رسول الله ﷺ والذی نفس محمد بیده لو لا ان اشق علی المؤمنین ما قعدت خلف سریة تغزو فی سبیل الله ولکن لا اجد سعة فاحملهم ولا یجدون سعة فیتبعونی ولا تطیب انفسهم ان یقعدوا بعدی"

(مسلم ج ۲ ص ۱۴۱ باب فضل الجهاد والخروج فی سبیل الله)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہر وہ زخم جو مسلمان کو اللہ تعالیٰ

کی راہ میں آئے قیامت کے دن اس کو ایسی ہیئت (شکل) حاصل ہوگی جیسے اس پر نیزہ چلایا گیا ہو اور خون بہہ رہا ہو۔ رنگ خون کی طرح ہوگا، خوشبو کستوری کی طرح ہوگی اور نبی کریم ﷺ نے فرمایا قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ قدرت میں محمد کی جان ہے اگر میں مومنوں پر مشکل نہ سمجھتا تو اللہ تعالیٰ کی راہ میں کی جانے والی کسی جنگ میں، میں پیچھے نہ رہتا لیکن اس میں مشکل یہی ہے کہ میرے جانے پر صحابہ بھی میری تابعداری کریں گے ان کو یہ پسند نہیں آئے گا کہ وہ پیچھے رہیں لیکن تمام کو شریک ہونے کی وسعت بھی حاصل نہیں ہوگی۔

فوائد : حدیث پاک سے حاصل ہوا: " ان الشهيد لا يزول عنه الدم بغسل ولا والحكمة في مجيئه يوم القيامة على هيئته ان يكون معه شاهد فضيلته وبذله نفسه في طاعة الله تعالى " شہید کے خون کو غسل وغیرہ سے زائل نہیں کیا جائے گا اس میں یہ حکمت ہے کہ قیامت کے دن وہ اسی حالت پر اٹھایا جائے گا اس کی یہ حالت اس کی فضیلت اور اللہ کی اطاعت میں اس کے اپنی جان کو قربان کرنے پر گواہ بن جائے۔

اور فائدہ یہ حاصل ہوا کہ کسی بات کو پختہ کرنے کے لئے سچی قسم اٹھانا جائز ہے جس طرح اس حدیث میں نبی کریم ﷺ نے قسم اٹھائی ارشاد فرمایا " والذی نفس محمد بيده " قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے۔

اور اس حدیث پاک سے یہ فائدہ حاصل ہوا کہ نبی کریم ﷺ مسلمانوں پر شفقت اور مہربانی فرماتے تھے یعنی آپ شفیق اور رؤف تھے " وانه كان يترك بعض ما يختاره للرفق للمسلمين " کہ آپ مسلمانوں پر رحمت اور نرمی فرماتے ہوئے بعض کام جو آپکو پسند ہوتے ان کو چھوڑ دیتے۔

فرض کفایہ جہاد میں شریک ہونے سے بہتر یہ ہے کہ مسلمانوں کو مشقت سے بچانے کے فرض عین پر عمل کیا جائے۔

" وانه اذا تعارضت المصالح بدأ باهمها " اور فائدہ یہ حاصل ہوا کہ جب نیکی کیلئے دو کام آمنے سامنے ہوتے تو آپ اسے اختیار فرماتے جس کی زیادہ ضرورت اور اہمیت ہوتی۔

اور مسئلہ یہ ہے کہ " مراعة الرفق بالمسلمين والسعي في زوال المكروه والمشقة

عنھم " مسلمانوں کے معاملات میں ان سے رعایت کرنا اور مسلمانوں کی مشقت کو زائل کرنے میں اور مسلمانوں کی تکالیف کو دور کرنے کی مکمل کوشش کرنا رسول اللہ ﷺ کی سنت ہے۔

اور یہ فائدہ حاصل ہوا " وفیہ فضیلة الشھادة والغزو " کہ شہادت اور جہاد میں شریک ہونے سے بہت بڑی فضیلت حاصل ہوتی ہے۔

" وفیہ تمنی الشھادة والخیر " اور یہ فائدہ حاصل ہوا کہ شہادت کی تمنا کرنا اور نیکی کے کاموں کی تمنا کرنا نبی کریم ﷺ کی سنت ہے " وفیہ تمنی ما لا یمکن فی العادة من الخیرات " اور حدیث پاک سے یہ فائدہ حاصل ہوا کہ جو چیز بظاہر عادت کے مطابق ممکن نہیں لیکن وہ بہتر ہو تو اس کی تمنا کرنا بھی ثواب ہے جیسا کہ نبی کریم ﷺ سے اللہ تعالیٰ کا وعدہ ہے ﴿ واللہ یعصمک من الناس ﴾ اور اللہ آپ کو بچائے گا لوگوں سے۔ لیکن نبی کریم ﷺ پھر بھی شہادت کی تمنا کرتے رہے۔ (انشاء اللہ مزید تفصیل بعد میں ذکر ہو رہی ہے)۔

شہید کو شہید کہنے کی وجوہ:

(۱) نضر بن شمیل رحمہ اللہ نے فرمایا کہ شہید کو شہید کہنے کی وجہ یہ ہے:

" لانہ حی فان ارواحھم شھدت وحضرت دار السلام وارواح غیرھم انما تشھدھا یوم القیامة "

کہ اسے زندگی حاصل ہوتی ہے اور شہداء کی روحیں ان کی شہادت کے ساتھ ہی جنت میں داخل ہو جاتی ہیں اور اس سے منافع حاصل کرتی ہیں۔ لیکن دوسرے لوگوں کی روحیں قیامت کو جنت میں منافع حاصل کریں گی اگرچہ نیک لوگوں کی روحیں اعلیٰ علیین میں ہوتی ہیں وہ مقام بھی جنت میں ہی ہے۔

(۲) ابن انباری رحمہ اللہ نے فرمایا کہ شہید کو شہید کہنے کی یہ وجہ بھی ہے کہ " لان اللہ تعالی وملائکتہ علیھم الصلوة والسلام یشھدون لہ بالجنة " اللہ تعالیٰ اور اس کے فرشتے شہداء کے لئے جنت کی گواہی دیتے ہیں۔ سبحان اللہ شہید کا کیا ہی خوب مقام ہے جس کے گواہ عظمت والے فرشتے اور خود مالک الملک ہو اس کی شان کی عظمت کیا ہوگی۔

(۳) " وقیل لانه شهد عند خروج روحه ما اعده الله تعالیٰ له من الثواب والکرامة "
اور وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے شہید کے لئے ثواب اور مقام عزت وتکریم جو تیار کر رکھا ہے اس کی روح کے نکلنے پر ہی اس کے پاس حاضر کر دیا جاتا ہے اس لئے اسکو شہید کہا جاتا ہے۔

(۴) " وقیل لان ملائکة الرحمة یشهدونه فیأخذون روحه " شہید کو شہید کہنے کی اور وجہ یہ ہے کہ رحمت کے خاص فرشتے اس کے پاس اس کی روح کو حاصل کرنے کے لئے حاضر ہوتے ہیں۔

(۵) " وقیل لانه شهد له بالایمان وخاتمة الخیر بظاهر حاله " شہید کو شہید کہنے کی اور وجہ یہ ہے اس کا ظاہری حال اس کے مؤمن ہونے پر اور اس کے خاتمہ بالخیر پر دلالت کرتا ہے۔

(۶) " وقیل لان علیه شاهدا بکونه شهیدا وهو الدم " اور بعض حضرات نے کہا کہ شہید کو اس وجہ سے شہید کہا جاتا ہے کہ قیامت کے دن اس کا خون اس کے شہید ہونے کی گواہی دے گا۔

(۷) " وقیل لانه ممن یشهد علی الامم یوم القیامة بابلاغ الرسل الرسالة الیهم " اور وجہ شہید کو شہید کہنے کی یہ ہے کہ وہ پہلی امتوں پر گواہی دے گا کہ انبیاء کرام نے اللہ تعالیٰ کا پیغام ان تک پہنچا دیا تھا۔ اگرچہ اس آخری وجہ پر علامہ نووی رحمہ اللہ نے فرمایا " وعلی هذا القول یشارکهم غیرهم فی هذا الوصف " اس قول کے مطابق شہداء کے ساتھ اس وصف میں دوسرے نیک لوگ بھی شریک ہوں گے کیونکہ امت کے تمام نیک لوگوں کو یہ مقام حاصل ہوگا۔
تاہم راقم کے نزدیک یہ کہنا بھی ممکن ہے کہ شہداء کو رفیع درجات حاصل ہونے کی وجہ سے ان کو شہادت خصوصیہ کا درجہ حاصل ہوا۔ واللہ اعلم بالصواب۔ (نووی بر مسلم ج ۲ ص ۱۴۲)

شہید کی زندگی:

" فذهب کثیر من السلف الی انها حقیقیة بالروح والجسد ولکنا لا ندرکها فی هذه النشأة "

کثیر سلف صالحین (گزرے ہوئے بزرگ علماء کرام) کا مذہب یہ ہے کہ شہید کو حقیقی زندگی حاصل ہوتی ہے جو روح اور جسم سے متعلق ہوتی ہے البتہ ہم اس زندگی کو سمجھ نہیں سکتے۔ اس پر ﴿ عِنْدَ رَبِّهِمْ

یُرْزَقُوْنَ ﴿ "ان کو رب کے ہاں رزق دیا جاتا ہے" ارشاد باری تعالیٰ واضح طور پر دلالت کر رہا ہے۔

" وبان الحياة الروحانية التي ليست بالجسد ليست من خواصهم فلا
يكون لهم امتياز بذلك على من عداهم ،،

اور کثیر سلف صالحین نے اپنے موقف پر محکم دلیل قائم کی ہے کہ اگر یہ کہا جائے کہ شہداء کو صرف روحانی زندگی حاصل ہے تو اس میں ان کی تخصیص کیسے ثابت ہو سکتی ہے کیونکہ روحانی زندگی تو تمام مومنین کو حاصل ہے بلکہ کفار کو بھی حاصل ہے اسی لئے کفار کو برزخ میں عذاب ہوتا ہے۔ (از روح المعانی)

ان الله تعالى يعطى لا رواحهم قوة الاجساد فيذهبون من الارض
والسماء والجنة حيث يشاء ون وينصرون اولياء هم ويدمرون
اعدائهم ان شاء الله تعالىٰ "

بیشک اللہ تعالیٰ شہداء کی روحوں کو جسموں کی قوت عطاء فرماتا ہے وہ زمین و آسمان اور جنت میں جہاں چاہیں جاتے ہیں اور اپنے دوستوں کی امداد کرتے ہیں اور اپنے دشمنوں کو ہلاک کرتے ہیں ان شاء اللہ تعالیٰ۔

" ومن اجل ذلك الحياة لا تأكل الارض اجسادهم ولا اكفانهم " شہداء کرام کو جب رب تعالیٰ زندگی عطاء فرماتا ہے تو اسی وجہ سے زمین ان کے جسموں اور کفنوں کو نہیں کھا سکتی۔

" قال البغوى قيل ان ارواحهم تركع وتسجد كل ليلة تحت العرش الى يوم القيامة"
علامہ بغوی بیان کرتے ہیں کہ یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ بیشک شہداء کی روحیں ہر رات کو عرش کے نیچے رکوع اور سجدہ کرتی ہیں یہ سلسلہ قیامت تک جاری رہے گا۔ (مظهرى ، بغوى)

اعتراض : شہید کی زندگی کس طرح ثابت ہے جب کہ ہم ظاہر طور پر دیکھتے ہیں کہ شہید بے حس و حرکت ہوتا ہے ہم اسے غسل دیتے ہیں اور اس کے جنازہ کو اٹھا کر لے جاتے ہیں۔

جواب : اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے "بَلْ اَحْيَاءٌ وَّلٰكِنْ لَّا تَشْعُرُوْنَ ،، (بلکہ وہ زندہ ہیں لیکن تمہیں شعور نہیں) فرمایا ہے اگر ہماری عقل میں آتا تو یہ کہنے کی ضرورت ہی نہیں تھی آیئے تفسیر مظہری کو دیکھئے:

" فيه تنبيه على ان حياتهم ليست من جنس ما يحسه كل احد وانما
هى امر لا يدرك بالعقل ولا بالحس بل بالوحى او الفراسة الصحية
المقتبسة من الوحى "

رب تعالیٰ نے ﴿ وَلٰكِنْ لَّا تَشْعُرُوْنَ ﴾ کہہ کراس پر متنبہ کر دیا کہ بیشک ان کی زندگی وہ نہیں جو ہر شخص کو محسوس ہو سکے اور نہ ہی یہ عقل میں آنے والی ہے اور نہ حواس میں بلکہ شہداء کی زندگی وحی سے حاصل ہوتی ہے یا اللہ تعالیٰ جن لوگوں کو وحی سے فیضان حاصل کرنے کی توفیق عطاء فرما دے اور اپنا مقرب بنالے وہ اپنی کامل فراست سے وحی سے اقتباس حاصل کر لیتے ہیں۔ (مظہری)

زندگی کے لئے حس وحرکت کا ہونا بھی ضروری نہیں " لان العضو المفلوج حی حیث تتحقق قوة الحیاة فیه وان لم یترتب علیها الحس والحرکة لمانع الفلج " کیونکہ جو عضو مفلوج ہے وہ حس وحرکت نہیں کرتا اگرچہ زندگی اس میں پائی جاتی ہے (از شیخ زادہ)

اور یہ بہت واضح ہے کہ اگر مفلوج عضو کو مردہ کہا جائے وہ گل سڑ جائے بد بودار ہو جائے حالانکہ ایسا نہیں۔

نفی قول سے مراد نفی اعتقاد: رب تعالیٰ نے ارشاد فرمایا

﴿ وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ يُّقْتَلُ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتٌ ﴾

''جو اللہ کی راہ میں شہید کر دیئے گئے ان کو مردہ نہ کہو''

اصل مقصد یہ ہے کہ تم عقیدہ یہ رکھو وہ زندہ ہیں صرف زبان سے زندہ کہہ دینا اور عقیدہ اس کے خلاف رکھنا بلا مقصد ہے ہاں جب انسان کا عقیدہ یہ ہو کہ شہداء زندہ ہیں لیکن عام محاورہ کے مطابق وہ شہید کے متعلق کہہ دے کہ وہ فوت ہو گیا تو وہ شخص گنہگار نہیں ہوگا۔ پھر بھی اللہ تعالیٰ کا فضل ہے مسلمانوں پر کہ وہ کہتے بھی یہی ہیں کہ فلاں شخص شہید ہو گیا یہ کہتے ہی نہیں کہ وہ فوت ہو گیا۔

راقم نے یہ مسئلہ روح المعانی کی اس بحث سے استنباط کیا ہے ﴿ بَلْ اَحْيَآءٌ ﴾ کا مفہوم یہ ہے ﴿ بَلْ هُمْ اَحْيَآءٌ ﴾ بلکہ وہ زندہ ہیں یہ جملہ معطوفہ ہے اس کا عطف ﴿ لَا تَقُوْلُوْا ﴾ پر ہے اور اسی سے اضراب (پھیرنا) ہے کیونکہ ﴿ بَلْ ﴾ اضراب کے لئے آتا ہے۔ عطف مفرد کا مفرد پر نہیں کہ حیز قول میں ہو اور مقصد یہ ہو کہ بلکہ تم کہو کہ وہ زندہ ہیں:

" لان المقصود اثبات الحیاة لهم لا امرهم بان یقولوا فی شانها انهم احیاء وان کان ذلک صحیحًا "

کیونکہ مقصد ان کے لئے حیات ثابت کرنا ہے لوگوں کو یہ حکم دینا مقصود نہیں کہ تم ان کو ضرور ہی زندہ کہو اگر چہ ان کو زبان سے زندہ کہنا بھی صحیح ہے ...... واللہ اعلم بالصواب...... (از روح المعانی)

اعتراض : بیان یہ کیا جاتا ہے کہ شہداء کے جسم بھی زندہ ہوتے ہیں حالانکہ کئی مرتبہ مشاہدہ کیا جاتا ہے کہ ان کے جسم گل سڑ جاتے ہیں راکھ بن جاتے ہیں تو کس طرح کہنا صحیح ہے کہ ان کے جسموں کو زمین پر کھانا حرام کر دیا گیا ہے؟

اجمالی جواب: اگر چہ مفتی محمد شفیع صاحب دیوبندی معارف القرآن میں اس کا جواب یہ دیتے ہیں کہ ہوسکتا ہے ان کے جسموں کو زمین کے ذرات نقصان نہ پہنچائیں لیکن دوسری دھاتیں جن کی زمین میں آمیزش ہوتی ہے وہ نقصان پہنچائیں۔ یہ جواب بھی ممکن ہے تاہم زیادہ صحیح اور مختصر جواب یہ ہے کہ جو شہداء خلوص دل سے صرف رب تعالیٰ کی رضاء کی خاطر اپنی جان قربان کرتے ہیں یہ مرتبہ صرف ان شہداء کو حاصل ہوتا ہے، جن کی نیت میں کسی قسم کا فتور لازم آ جائے ان کو یہ مرتبہ حاصل نہیں ہوتا اگر چہ ہمیں کسی کی نیت کا علم حاصل نہیں ہوتا اس لئے ہم تو ہر اس شخص کو شہید کہیں گے جس نے بظاہر اللہ تعالیٰ کی راہ میں جان قربان کی جیسا کہ ہم ہر اس شخص کو مسلمان کہتے ہیں جو بظاہر ایمان رکھتا ہو ہم اس پر مسلمانوں والے احکام ہی جاری کرتے ہیں حقیقت میں اللہ تعالیٰ کے ہاں بھی وہ مومن ہے یا دل میں منافقت رکھتا ہے وہ صرف اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتا ہے۔

تفصیلی جواب: شہید کی تین قسمیں ہیں ایک وہ شہید ہیں جو صرف دنیا میں شہید کہلاتے ہیں آخرت میں نہیں، دوسرے وہ شہید ہیں جو دنیا اور آخرت دونوں میں شہید کہلاتے ہیں، اور تیسرے وہ ہیں جو آخرت کے لحاظ سے شہید ہیں دنیا میں ان پر احکام شہادت جاری نہیں ہوتے۔ (نووی برمسلم ج ۲ ص ۱۵۱)

دنیا میں شہید ہو آخرت میں نہ ہو:

" وهو من غل في الغنيمة او قتل مدبرا " یہ وہ شخص ہے جس نے غنیمت میں خیانت کی ہو یا پیٹھ پھیر کر بھاگتے ہوئے قتل کر دیا جائے۔ اسے دنیا میں تو شہید سمجھا جائے گا ظاہری طور پر احکام شہادت بھی جاری کر دیئے جائیں گے لیکن اسے شہادت کی وجہ سے خصوصی مرتبہ اور درجہ حاصل نہیں ہوگا یقینی بات

ہے کہ جو اللہ تعالیٰ کے ہاں شہید نہیں ہوں گے ان کے جسموں کا زمین سے محفوظ رہنا بھی ضروری نہیں۔

احادیث مبارکہ جن سے بہت واضح ہے کہ فقط دنیاوی شہید درجات سے محروم رہتا ہے کیونکہ وہ اللہ تعالیٰ کے ہاں شہید نہیں کہلاتا۔

"عن ابی موسی الاشعری ان رجلا اعرابیا اتی النبی ﷺ فقال یا رسول اللہ الرجل یقاتل للمغنم والرجل یقاتل لیذکر والرجل یقاتل لیری مکانہ فمن فی سبیل اللہ فقال رسول اللہ ﷺ من قاتل لتکون کلمۃ اللہ اعلی فھو فی سبیل اللہ"

(مسلم ج ۲ ص ۱۴۷ باب من قاتل لتکون کلمۃ اللہ ھی العلیا فھو فی سبیل اللہ

حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں ایک اعرابی نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے عرض کیا یا رسول اللہ ایک شخص جہاد کرتا ہے کہ اسے مال غنیمت حاصل ہو جائے اور ایک شخص جہاد کرتا ہے کہ اس کا چرچا ہو جائے اور ایک شخص جہاد کرتا ہے کہ اس کا مقام دیکھا جائے (یعنی اس کی بہادری کا لوگوں کو پتہ چل جائے) ان میں سے کون سا وہ شخص ہے جس کے جہاد کو جہاد فی سبیل اللہ (اللہ کی راہ میں جہاد) کہا جائے؟ نبی کریم ﷺ نے فرمایا اللہ کی راہ میں اس شخص کا جہاد ہے جو اللہ تعالیٰ کے کلمہ کی بلندی کے لئے جہاد کرے۔

☆ "عن ابی موسی قال سئل رسول اللہ ﷺ عن الرجل یقاتل شجاعۃ ویقاتل حمیۃ ویقاتل ریاء ای ذلک فی سبیل اللہ فقال رسول اللہ ﷺ من قاتل لتکون کلمۃ اللہ ھی العلیا فھو فی سبیل اللہ" (مسلم ج ۲ ص ۱۴۸)

حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ سے ایک شخص کے متعلق سوال کیا گیا کہ وہ بہادری دکھانے کے لئے جہاد کرتا ہے اور ایک شخص خاندانی رقابت یا غیرت کی وجہ سے جہاد کرتا ہے اور ایک شخص دکھلاوے کے طور پر جہاد کرتا ہے ان میں سے کون سا جہاد اللہ کی راہ میں ہوا؟ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس شخص نے اللہ تعالیٰ کے کلمہ کو بلند کرنے کے لئے جہاد کیا وہی اللہ کی راہ میں جہاد ہے۔

وضاحت: نبی کریم ﷺ کا جواب کیسا خوب حکمت بھرا مختصر تھا چونکہ جوامع الکلم (بات مختصر مطالب زیادہ) آپ کی خصوصیت تھی ایک ایک کو علیحدہ کر کے یہ نہیں فرمایا یہ بھی جہاد نہیں، یہ بھی جہاد نہیں، بلکہ فرمایا جہاد تو یہ ہے، یعنی صرف مقصود کو ذکر فرمایا غیر مقصود کی خود بخود نفی ہو گئی۔

" یقاتل لیذکر " کا مطلب ہے " لیذکرہ الناس بالشجاعۃ " تا کہ لوگ اس کی شجاعت کا ذکر کریں چرچا کریں " ویقاتل حمیۃ " ھی الانفۃ والغیرۃ والمحامۃ عن عشیرتہ " یعنی ایک شخص اپنی ذاتی مخالفت، غیرت اور خاندانی رقابت یعنی خاندان کے دشمن سے خاندان کی حمایت کے لئے لڑائی کرتا ہے۔

نبی کریم ﷺ کے جواب کا مطلب یہ ہے کہ آپ نے گویا کہ بیان فرمادیا:

" انما الاعمال انما تحسب بالنیات الصالحۃ وان الفضل الذی ورد فی المجاھدین فی سبیل اللہ یختص بمن قاتل لتکون کلمۃ اللہ ھی العلیا "

اعمال کی دارومدار نیک نیات پر ہے بیشک فضیلت جس کا ذکر کیا جاتا ہے اس کا تعلق ان مجاہدین سے ہے جو صرف اللہ تعالیٰ کی رضامندی کے لئے اور دین کی بلندی کے لئے جہاد کرتا ہے۔ (از نووی)

☆ " عن ابی ھریرۃ قال سمعت رسول اللہ ﷺ یقول اول الناس یقضی یوم القیامۃ علیہ رجل استشھد فاتی بہ فعرفہ نعمتہ فعرفھا قال فما عملت فیھا قال قاتلت فیک حتی استشھدت قال کذبت ولکنک قاتلت لان یقال جرئی فقد قیل ثم امر بہ فسحب علی وجھہ حتی القی فی النار، ورجل تعلم العلم وعلمہ وقرأ القرآن فاتی بہ فعرفہ نعمہ فعرفھا قال فما عملت فیھا قال تعلمت العلم وعلمتہ وقرأت فیک القرآن قال کذبت ولکنک تعلمت العلم لیقال عالم وقرأت القرآن لیقال ھو قارئ فقد قیل ثم امر بہ فسحب علی وجھہ حتی القی فی النار، ورجل وسع اللہ علیہ واعطاہ من اصناف المال کلہ فاتی بہ فعرفہ نعمہ فعرفھا قال فما عملت فیھا قال ما ترکت من سبیل تحب ان ینفق فیھا الا انفقت فیھا لک قال کذبت ولکنک فعلت لیقال ھو جواد فقد قیل ثم امر بہ فسحب علی وجھہ ثم القی فی النار " (مسلم ج ۲ ص ۱۴۹ باب من قاتل للریا)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا کہ قیامت کے دن سب سے پہلے اس شخص کو فیصلہ کے لئے لایا جائے گا جو شہید کر دیا گیا تھا جب اسے لایا جائے گا تو اللہ تعالیٰ اسے اپنی نعمتوں کی پہچان کرائے گا وہ پہچان لے گا (یعنی اقرار کرلے گا) رب تعالیٰ فرمائے گا تو نے ان نعمتوں کے حق میں عمل کیا کیا؟ وہ کہے گا تیرے لئے لڑائی کی یہاں تک کہ مجھے شہید کر دیا گیا رب تعالیٰ فرمائے گا تو نے جھوٹ کہا ہے لیکن تو نے تو قتال کیا کہ تجھے بہادر کہا جائے وہ کہہ دیا

گیا، پھر حکم دیا جائے گا اسے چہرے کے بل گھسیٹ کر آگ میں ڈال دیا جائے گا۔ اور ایک شخص نے علم حاصل کیا ہوگا اور پڑھایا ہوگا اور قرآن پڑھا، اسے لایا جائے گا اللہ تعالیٰ اسے اپنی نعمتوں کی پہچان کرائے گا وہ پہچان لے گا رب تعالیٰ فرمائے گا تو نے ان کی وجہ سے عمل کیا کیا؟ وہ کہے گا علم سیکھا اور سکھایا اور تیرے لئے قرآن پڑھا، رب تعالیٰ فرمائے گا تو نے جھوٹ کہا، لیکن تو نے علم حاصل کیا تھا کہ تجھے عالم کہا جائے اور قرآن پڑھا تھا تاکہ تجھے قاری کہا جائے وہ کہہ دیا گیا، پھر حکم دیا جائے گا اسے منہ کے بل گھسیٹ کر آگ میں ڈال دیا جائے گا۔ ایک شخص کو اللہ تعالیٰ نے وسعت عطاء کی ہوگی اور اسے ہر قسم کا حال عطاء کیا ہوگا اسے رب تعالیٰ کے حضور لایا جائے گا تو رب تعالیٰ اسے اپنی نعمتوں کی پہچان کرائے گا وہ پہچان لے گا رب تعالیٰ فرمائے گا تو نے ان نعمتوں کے شکریہ میں کیا عمل کئے وہ کہے گا میں نے کوئی ایسا راستہ نہیں چھوڑا جسے تو پسند کرتا تھا کہ اس میں مال خرچ کیا جائے میں نے وہاں تیرے لئے مال خرچ کیا رب تعالیٰ فرمائے گا تو نے جھوٹ کہا لیکن تو نے مال خرچ کیا تھا کہ تجھے جواد (سخی) کہا جائے وہ تو کہہ دیا گیا پھر حکم دیا جائے گا اسے منہ کے بل گھسیٹ کر آگ میں ڈال دیا جائے گا۔

واضح ہوا کہ جن شہداء کی قرآن پاک اور احادیث مبارکہ میں تعریف کی گئی ان کی فضیلت بیان کی گئی اور ان کے مدارج اور منازل رفیعہ کا ذکر کیا گیا یہ وہ شہداء ہیں جو صرف اللہ تعالیٰ کی رضاء کے لئے جہاد کرتے ہوئے شہید ہو جائیں اور ان کا مقصد صرف دین کی بلندی ہو ان کو ہی وہ زندگی حاصل ہوتی ہے جس سے روح اور جسم دونوں ہی زندہ رہتے ہیں۔ اور جن کی نیت میں فتور ہو ان کو فضیلت کیا حاصل ہونی ہے بلکہ وہ تو اللہ تعالیٰ کی گرفت میں آئیں گے لہذا قرآن پاک اور احادیث مبارکہ کے فیصلے پکے اور سچے ہیں۔

"قوله ﷺ فی الغازی والعالم والجواد وعقابهم علی فعلهم ذلک لغیر الله وادخالهم النار دلیل علی تغلیظ تحریم الریاء وشدة عقوبته وعلی الحث علی وجوب الاخلاص فی الاعمال کما قال الله تعالیٰ وما امروا الا لیعبدوا الله مخلصین له الدین وفیه ان العمومات الواردة فی فضل الجهاد وانما هی لمن اراد الله تعالیٰ بذلک مخلصا وکذلک الثناء علی العلماء وعلی المنفقین فی وجوه الخیرات کله

محمول علی من فعل ذلک للہ تعالٰی مخلصا "

نبی کریم ﷺ کا ارشاد گرامی غازی اور عالم اور سخی کے متعلق کہ ان کو عذاب ہوگا اگر ان کے یہ افعال اللہ تعالٰی کی رضاء کی خاطر نہ پائے گے بلکہ ان میں دکھلاوا مقصود ہوا تو یہ آگ میں ڈال دیئے جائیں گے یہ دلیل ہے کہ ریاء کاری سخت حرام ہے اور اس میں شدید عذاب ہوگا اور حدیث پاک میں اعمال میں اخلاص کے وجوب پر برانگیختہ کیا گیا ہے جیسا کہ اللہ تعالٰی نے فرمایا (ترجمہ) اور ان کو نہیں حکم دیا گیا مگر یہ کہ اللہ تعالٰی کی عبادت کریں اور دین کو اسی کے لئے خالص کریں۔

اور حدیث پاک سے یہ ثابت ہوا کہ جہاد کی فضیلت میں جو آیات واحادیث وارد ہیں ان سے یہی ثابت ہے کہ اللہ تعالٰی یہی چاہتا ہے کہ وہ جہاد صرف اس کی رضاء کے لئے کیا جائے اور اس میں خلوص پایا جائے۔

اسی طرح علماء اور سخی حضرات کی تعریف جو کی گئی اس سے مراد بھی وہی ہیں جو علم اور سخاوت میں خلوص رکھتے ہیں صرف اللہ تعالٰی کی رضا مندی کے لئے کام کریں۔ نام ونمود نہ پایا جائے فقط دنیاوی اغراض نہ ہوں۔

اخروی شہید: وہ شہید جس کو " شہید فی الآخرۃ " کہا گیا ہے یعنی دنیا میں تو ان کو شہید نہیں کہا جاتا لیکن ثواب ان کو شہداء والا حاصل ہوگا۔ جب ان میں خلوص پایا جائے گا تو یقینی طور پر ان کو قرب الٰہی حاصل ہوتا ہے۔

اخروی شہید پر احادیث مبارکہ:

☆ "عن انس قال قال رسول اللہ ﷺ من طلب الشھادۃ صادقا اعطیھا و لو لم تصبہ "

(مسلم ج ۲ ص ۱۴۹ باب استحباب طلب الشھادۃ فی سبیل اللہ)

حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس شخص نے سچے دل سے شہادت کو طلب کیا (یعنی شہادت کے حاصل ہونے کی سچی تمنا کی) تو اسے شہادت کا ثواب عطاء کر دیا جائے گا اگرچہ بظاہر اسے شہادت حاصل نہ ہوئی۔

☆ "عن سھل بن حنیف ان النبی ﷺ قال من سأل اللہ الشھادۃ بصدق بلغہ اللہ

منازل الشہداء وان مات علی فراشہ " (مسلم ج ۲ ص ۱۴۹)

سہل بن حنیف رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں بیشک نبی کریم ﷺ نے فرمایا جس شخص نے سچے دل سے شہادت طلب کی اللہ تعالیٰ اس کو شہداء کے مراتب تک پہنچا دے گا اگر چہ اس کی موت بستر پر ہی کیوں نہ آئے۔

دوسری حدیث پہلی کی تفسیر بیان کر رہی ہے کیونکہ اس میں زیادہ وضاحت موجود ہے بنسبت پہلی حدیث کے " ومعناهما جميعا انه اذا سأل الشهادة بصدق اعطى من ثواب الشهداء وان كان على فراشه ، وفيه استحباب سوال الشهادة واستحباب نية الخير " دونوں احادیث کا معنی یہی ہے کہ جب کوئی شخص سچے دل سے شہادت طلب کرتا ہے تو اسے شہادت کا ثواب عطاء کر دیا جاتا ہے اگر چہ اس کی موت بستر پر ہی کیوں نہ آئے۔ اور حدیث پاک سے یہ فائدہ حاصل ہوا کہ شہادت کی تمنا اور شہادت کی طلب صدق دل سے کرنا مستحب ہے اور یہ ثابت ہوا کہ نیکی کے کاموں کی نیت مستحب ہے۔ (از نووی)

☆ " عن جابر قال كنا مع النبی ﷺ فی غزاة فقال ان بالمدينة لرجالا ماسرتم مسيرا ولا قطعتم واديا الا كانوا معكم حبسهم المرض " (مسلم ج ۲ ص ۱۴۹)

حضرت جابر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں ہم نبی کریم ﷺ کی معیت میں جہاد میں شریک تھے آپ نے فرمایا کہ مدینہ طیبہ میں کئی لوگ وہ ہیں جو تمہارے ساتھ چل تو نہیں رہے اور نہ ہی کسی وادی کو طے کر رہے ہیں لیکن وہ تمہارے ساتھ ہی شریک ہیں کیونکہ ان کو مرض نے روک رکھا ہے " وفی رواية الاشركوكم فی الاجر " ایک روایت میں ہے کہ وہ تمہارے ساتھ اجر و ثواب میں شریک ہیں۔

" وفی هذا الحديث فضيلة النية فی الخير وان من نوى الغزو او غيره من الطاعات فعرض له عذر منعه حصل له ثواب نيته وانه كلما اكثر من التأسف على فوات ذلك وتمنى كونه مع الغزاة ونحوهم كثر ثوابه والله اعلم "

اس حدیث پاک سے واضح ہوا کہ نیکی کے کام کی نیت کرنا باعث فضیلت ہے اور جس شخص نے جہاد میں شرکت کی نیت کی یا اس کے بغیر نیکی کے کاموں کی نیت کی اسے کوئی عذر درپیش آ گیا جس کی

وجہ سے وہ اس میں شریک نہ ہو سکا تو اس کے سچے دل سے نیت کرنے کا اسے ثواب حاصل ہوگا اور خاص کر کے نیک کام میں شرکت رہ جانے پر جتنا افسوس کرے گا کہ کاش میں ان کے ساتھ شریک ہوتا اتنا ہی زیادہ اسے ثواب حاصل ہوگا۔ (نووی)

سبحان اللہ نبی کریم ﷺ غزوہ میں مدینہ طیبہ کے لوگوں کے دلوں کی تمنا اور تڑپ کا تذکرہ فرما رہے ہیں کاش کہ نور بصیرت حاصل ہو تو شان مصطفیٰ کریم ﷺ سمجھ آجائے۔

☆ **"عن ابی هريرة قال قال رسول الله ﷺ ما تعدون الشهيد فيكم قالوا يا رسول الله من قتل في سبيل الله فهو شهيد قال ان شهداء امتى اذا لقليل قالوا فمن هم يا رسول الله قال من قتل في سبيل الله فهو شهيد ومن مات في سبيل الله فهو شهيد ومن مات في الطاعون فهو شهيد ومن مات في البطن فهو شهيد قال ابن المقسم اشهد على ابيك في هذا الحديث انه قال والغريق شهيد"** (مسلم ج ۲ ص ۱۵۱ باب بيان الشهداء)

حضرت سہیل اپنے باپ سے اور وہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تم اپنے اندر کن لوگوں کو شہید شمار کرتے ہو۔ صحابہ کرام نے عرض کیا یا رسول اللہ جو شخص اللہ کی راہ میں جان قربان کردے وہ شہید ہے تو آپ نے فرمایا اس طرح تو میری امت کے شہید بہت کم ہو جائیں گے اللہ کی راہ میں مقتول شہید ہے اللہ کی راہ میں فوت ہونے والا شہید ہے۔ طاعون سے فوت ہونے والا شہید ہے جو شخص پیٹ کی بیماری سے فوت ہو جائے وہ بھی شہید ہے۔

ابن مقسم نے سہیل کو کہا میں گواہی دیتا ہوں کی آپ کے باپ نے اس حدیث کو بیان کیا تھا کہ غرق ہونے والا بھی شہید ہے۔

"من مات في سبيل الله فهو فشهيد" سے مراد عام ہے دوران حج وعمرہ کوئی فوت ہو جائے طالب علم دینی علم حاصل کرتے ہوئے فوت ہو جائے کوئی عالم دین رب تعالیٰ کے دین کا کام کرتے ہوئے فوت ہو جائے وہ شہید ہے اس طرح کے نیکی کے کام کرتے ہوئے فوت ہو جانے والے شہید ہیں۔

(راقم) یہ تمام حضرات وہ ہیں جن کو دنیا میں تو شہید نہیں کہا جاتا ہے لیکن آخرت میں ان کو درجہ

شہادت حاصل ہوتا ہے۔

تنبیہ : جن اموات کا ذکر کیا گیا ہے ان کے متعلق علامہ نووی رحمہ اللہ نے ذکر فرمایا "**وانما کانت هذه الموتات شهادة بتفضل الله تعالىٰ بسبب شدتها و کثرة المها**" کہ یہ موتیں صرف اللہ تعالیٰ کے فضل کی وجہ سے شہادت کا درجہ رکھتی ہیں کیونکہ ان میں شدت اور درد کی کثرت شہادت کا سبب ہے۔

یہ بھی خیال رہے کہ شہادت کا مرتبہ صرف جن اموات کا ذکر یہاں کیا گیا ہے ان میں بند نہیں بلکہ دوسری احادیث میں اور بھی مذکور ہیں۔ دیوار وغیرہ گرنے سے نیچے آ کر فوت ہونے والا، نمونیہ کی مرض سے فوت ہونے والا، آگ میں قدرتی طور پر جل جانے والا، حاملہ عورت حمل کی تکلیف سے فوت ہو جائے یہ سب شہید ہیں۔

اسی طرح ایک حدیث میں آتا ہے "**من قتل دون ماله فهو شهيد ومن قتل دون اهله فهو شهيد**" جو شخص اپنے مال کی حفاظت کرتے ہوئے قتل کر دیا جائے وہ شہید ہے جو شخص اپنی اہل کی حفاظت کرتے ہوئے قتل کر دیا جائے وہ شہید ہے۔

ایک اور حدیث میں ہے "**ومن قتل دون دينه فهو شهيد**" جو شخص دین کی حفاظت کرتے ہوئے قتل کر دیا جائے وہ شہید ہے۔

دنیوی اور اخروی شہید: "**واما شهيد فى الدنيا والآخرة فهو المقتول فى حرب الكفار**" جو شخص دنیا میں بھی شہید کہلائے اور آخرت میں بھی شہید کا درجہ اسے حاصل ہے جو اپنے خلوص اور صدق دل سے اور صرف اللہ تعالیٰ کی رضاء کیلئے اور دین کی بلندی کیلئے قتل کر دیا جائے۔

(نووی بر مسلم ج ۲ ص ۱۵۱)

پھر اس قسم کے شہداء کی دو قسمیں ہیں فقہی شہید، اور غیر فقہی شہید۔ اس کی تفصیل انشاء اللہ بعد میں ذکر کی جائے گی۔ پہلے ان شہداء کے جسموں کے محفوظ رہنے اور ان کی مزید فضیلت کا ذکر کیا جاتا ہے "**ان اجساد الانبياء والشهداء وبعض الصلحاء لا ياكلها الارض**" بیشک انبیاء کرام اور شہداء کرام اور بعض نیک لوگوں کے جسموں کو زمین نہیں کھاتی۔

☆ "**عن اوس ابن اوس قال قال رسول الله ﷺ ان الله حرم على الارض ان تأكل**

اجساد الانبیاء " (مستدرک حاکم ، ابو داؤد ، واخرج ابن ماجه عن ابی الدرداء نحوه)

حضرت اوس بن اوس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا بیشک اللہ تعالیٰ نے زمین پر حرام کردیا ہے کہ وہ انبیاء کرام کے جسموں کو کھائے۔

☆ **" واخرج مالک عن عبد الرحمن ابن صعصة انه بلغه ان عمرو بن الجموح وعبد اللہ بن جبیر الانصاری کان قد حفر السیل قبرهما وکان قبرهما مما یلی السیل وکانا فی قبر واحد وهما ممن استشهد یوم احد ،فحفرا لیغیرا من مکانهما فوجدا لم یتغیرا کانهما ماتا بالامس وکان بین احد وبین حفر عنها ست واربعون سنة "**

عبدالرحمٰن بن صعصہ کہتے ہیں کہ عمرو بن جموح اور عبداللہ بن جبیر انصاری کی قبر کو پانی کی ندی نے گرانا شروع کردیا کیونکہ وہ پانی کی گزرگاہ کے ساتھ تھیں اور دونوں ایک ہی قبر میں دفن تھے یہ دونوں احد میں شہید ہوئے تھے ان کی قبر کو کھودا گیا تا کہ ان کو دوسری جگہ منتقل کردیا جائے تو ان دونوں کو اسی حال میں پایا گیا جیسا کہ ان دونوں کا وصال کل ہی ہوا ہے ان میں ذرا بھی تبدیلی نہیں آئی تھی۔ حالانکہ ان کی قبر کو کھودنے کے واقعہ اور احد کے درمیان چھیالیس سال گزر چکے تھے۔

☆ **" واخرج البیهقی ان معاویة لما اراد ان یجری کظامة نادی من کان له قتیل باحد فلیشهد فخرج الناس الی قتلاهم فوجد وهم رطابا ینبتون فاصابت المسحات رجل رجل منهم فانبعث دما ولقد کانوا یحفرون التراب فحفروا نثرة من تراب فاح علیهم ریح المسک هکذا اخرج الواقدی عن شیوخه واخرج ابن ابی شیبة نحوه واخرج البیهقی عن جابر وفیه فاصابت المسحات قدم حمزة فانبعث دما "**

بیہقی نے بیان کیا ہے کہ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے جب ارادہ فرمایا کہ پانی کی گزرگاہ (چھوٹی نہر، نالی) بنائی جائے تو آپ نے اعلان فرمایا کہ جن لوگوں کے رشتہ دار احد میں شہید ہو گئے تھے وہ حاضر ہوں لوگوں نے اپنے شہداء کرام کو نکالنا شروع کیا تو ان کو تر و تازہ حالت میں پایا۔

ایک شخص کے پاؤں پر کندال لگ گئی تو خون جاری ہوگیا۔ جب مٹی کھودتے تو مٹی کو باہر نکالنے سے اس طرح خوشبو اٹھتی جیسے کستوری کی خوشبو ہو۔ اسی طرح واقدی رحمۃ اللہ نے اپنے شیوخ سے بھی بیان کیا اور ابن ابی شیبہ نے بھی اسی طرح بیان کیا۔ اور بیہقی نے ایک روایت حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت کی

جس میں یہ ذکر ہے کہ حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کے قدم مبارک پر کندال لگ گئی تو خون جاری ہو گیا۔

☆ " واخرج الطبرانی عن ابن عمر قال قال رسول اللہ ﷺ المؤذن المحتسب کالشھید المتشخط فی دمه اذا مات لم یدود فی قبره "

طبرانی نے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت بیان کی وہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا وہ مؤذن جو اللہ تعالیٰ کی رضاء کے لئے خلوص سے اذان کہتا ہے اس کا ایسا درجہ ہے جیسا کہ شہید خون میں لتھڑا ہوا ہو۔ جب وہ فوت ہو جائے تو اس کی قبر میں کیڑے نہیں پڑتے۔

☆ " واخرج ابن ابی مندة عن جابر عن عبد اللہ قال قال ﷺ اذا مات حامل القرآن اوحی اللہ الی الارض ان لا تاکل لحمه فیقول الارض ای رب کیف آکل لحمه وکلامک فی جوفه "

ابن ابی مندہ رحمہ اللہ نے حضرت جابر بن عبد اللہ سے روایت بیان کی کہ رسول اللہ ﷺ نے بیان فرمایا جب حافظ قرآن فوت ہوتا ہے تو اللہ تعالیٰ زمین کی طرف وحی کرتا ہے (یعنی زمین کو کہتا ہے) اس شخص کے گوشت کو نہ کھانا۔ زمین عرض کرتی ہے اے میرے رب میں کیسے اس کے گوشت کو کھا سکتی ہوں جب کہ اس کے سینہ میں تیرا کلام ہے۔ سبحان اللہ کیا مقام ہے حافظ قرآن کا جس کے سینہ میں قرآن ہونے کی برکت سے اللہ تعالیٰ اس کے جسم کو محفوظ رکھتا ہے زمین اسے نہیں کھاتی۔

☆ " واخرج المروزی عن قتادة قال بلغنی ان الارض لا تسلط علی جسد الذی لم یعمل خطیئة "

مروزی رحمہ اللہ نے بیان کیا ہے کہ حضرت قتادہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا مجھے یہ خبر ملی ہے کہ بیشک زمین اس شخص کے جسم پر مسلط نہیں ہو سکتی جس نے گناہ کا کوئی عمل نہ کیا ہو۔

یعنی نیک لوگوں کے جسم بھی محفوظ رہتے ہیں زمین ان کو بھی نہیں کھا سکتی۔ یہ بھی خیال رہے کہ صحابی کا وہ قول جو عقل سے نہ بیان کیا جا سکے وہ حدیث مرفوع کے درجہ میں ہوتا ہے کہ صحابی نے یقیناً رسول اللہ ﷺ سے سنا ہوگا۔ قاضی محمد ثناء اللہ مظہری فرماتے ہیں:

" قلت لعل المراد بالذی لم یعمل خطیئة الصالحون من عباد اللہ اعنی الاولیاء لما کانوا محفوظین من الخطایا و مغفورین حتی صلحت

قلوبھم و اجسادھم واللہ اعلم"

میں کہتا ہوں کہ جن لوگوں کا ذکر ہے کہ انہوں نے گناہ نہ کئے ہوں ان سے مراد اللہ کے بندوں سے نیک لوگ ہیں یعنی اللہ تعالیٰ کے ولی جو گناہوں سے محفوظ ہیں۔ اور بخشے ہوئے ہیں یہاں تک کہ ان کے دل اور ان کے جسم درست ہوتے ہیں ان میں خاص صلاحیت پائی جاتی ہے۔ (از مظہری)

فقہی شہید: یعنی وہ شہید جسے "شھید فی الدنیا والآخرۃ" کہا گیا ہے اس کی ایک قسم فقہی شہید ہے جو دنیا اور آخرت میں شہید ہے اور اس پر ظاہری طور پر کئی احکام جاری ہیں جو غیر فقہی شہید پر جاری نہیں۔ فقہی شہید وہ ہے جو عاقل، بالغ، مسلمان اور طاہر ہوا سے ظلماً قتل کر دیا جائے۔

جس قتل سے قصاص لازم آ سکتا ہو اگر ایسا قتل ہو جس سے مال لازم آئے تو اس قتل سے شہادت والے فقہی احکام جاری نہیں ہوں گے۔ اور اس نے دنیا کی زندگی کا کوئی نفع بھی حاصل نہ کیا ہو۔ اسی طرح جس شخص کو حربی کفار یا ڈاکو یا باغی قتل کر دیں خواہ کسی آلہ سے بھی قتل کریں۔ یا کسی مسلمان کی لاش میدان جنگ سے ملی ہے اس پر آثار قتل ہوں وہ فقہی شہید ہے۔

فقھی شھید کے احکام: اسے غسل نہیں دیا جائے گا۔ اور جو کپڑے اس نے پہن رکھے ہیں ان میں ہی اسے دفن کیا جائے گا اگر کفن سے زائد کپڑے ہیں، چمڑے یا اون وغیرہ کی کوٹی وغیرہ پہن رکھی ہیں تو اتار دیئے جائیں۔ جوتے، ٹوپی وغیرہ اتار دیئے جائیں۔ اگر کفن سے کم کپڑے ہوں تو مکمل کر لئے جائیں عام حالات میں شلوار قمیص (کپڑوں کا جوڑا) پہنے ہوئے انسان شہید ہوتا ہے ایسی حالت میں بڑی چادر (لفافہ) پہنا دی جائے۔ شہید کی نماز جنازہ پڑھی جائے گی اگرچہ شہید کے گناہ معاف ہو گئے لیکن نماز جنازہ میں اس کی تکریم پائی گئی ہے اور مدارج کی بلندی پائی گئی۔

غیر فقہی شہید کو غسل دیا جائیگا اور کفن بھی پہنایا جائے گا اور نماز جنازہ بھی پڑھی جائے گی۔ غیر فقہی شہید کی وضاحت سے فقہی شہید کی وضاحت بھی ہو جائے گی جس کو اجمالی طور پر ذکر کیا ہے۔ فقہی شہید میں ذکر کیا تھا۔ عاقل ہو، بالغ ہو لہٰذا نابالغ اور مجنون (پاگل) غیر فقہی ہوں گے ان کو غسل دیا جائے کیونکہ تلوار گناہوں کو مٹاتی ہے اور یہ گناہوں سے پاک ہوتے ہیں۔

خیال رہے مجنون جب نابالغ ہو تو وہ عام نابالغ کے حکم میں ہے بالغ ہو تو پھر بھی اسے غسل دیا جائے گا یعنی مجنون خواہ نابالغ ہو یا بالغ ہو اس کا حکم ایک ہی ہے۔

فقہی شہید کے متعلق ذکر کیا گیا تھا کہ وہ مسلمان ہو کیونکہ کافر کو اگر چہ کوئی شخص ظلماً قتل کر دے وہ شہید نہیں۔ نہ اسے فقہی شہید کہیں گے اور نہ ہی غیر فقہی ہاں اگر اس کا کوئی مسلمان رشتہ دار ہے تو اسے اس طرح غسل دے دے جس طرح ناپاک کپڑا دھویا جاتا ہے اور گڑھا کھود کر اسے دفن کر دے۔

فقہی شہید کے ساتھ پاک ہونے کی قید ذکر کی تھی کیونکہ اگر عورت حیض یا نفاس میں شہید کر دی گئی تو اسے غسل دیا جائے گا کیونکہ وہ غیر فقہی شہید ہے۔

اسی طرح جنبی آدمی نے غسل نہیں کیا تھا وہ اسی حال میں شہید ہو گیا تو اسے غسل دیا جائے گا وہ بھی غیر فقہی شہید کہلائے گا۔

اس پر دلیل یہ ہے کہ جب حضرت حنظلہ بن ابی عامر ثقفی شہید ہو گئے تو نبی کریم ﷺ نے فرمایا "ان صاحبکم حنظلة تغسله الملائكة فسألوا زوجته فقالت خرج وهو جنب" بیشک تمہارے دوست حنظلہ کو فرشتے غسل دے رہے ہیں جب صحابہ کرام نے ان کی زوجہ سے پوچھا تو انہوں نے بتایا کہ یہ جنبی تھے۔ (کیونکہ یہ شادی کی پہلی رات کے بعد ہی صبح صبح اعلان جنگ سنتے ہی اسی طرح شریک ہو گئے تھے)۔

فقہی شہید میں ذکر کیا تھا کہ اس کے قتل پر قصاص لازم آتا ہو (جو ظلماً قتل کیا گیا) تو پھر وہ فقہی شہید ہو گا، یعنی اسے غسل نہیں دیا جائے گا یعنی ایسے آلہ سے قتل کیا جائے جو عام قتل کے لئے استعمال کیا جاتا ہو، تلوار، چھری وغیرہ سوئی وغیرہ سے قتل کر دیا تو وہ شبہ عمد ہے جس پر قصاص نہیں، دیت لازم ہے۔

ہاں اگر قصاص تو لازم ہونا تھا صلح کر لی گئی یا باپ نے بیٹے کو قتل کر دیا تو اس سے قصاص کو اٹھا لیا گیا تو وہ فقہی شہید ہی ہو گا یعنی غسل نہیں دیا جائے گا۔

فقہی شہید میں یہ بیان کیا گیا تھا کہ اس نے کوئی نفع نہ حاصل کیا ہو۔ مطلب یہ ہے کہ وہ زخمی ہونے کے بعد کچھ دیر زندہ رہ گیا یعنی ہوش میں رہا اور دوا حاصل کر لی یا اس پر نماز کا وقت گزر گیا یا کوئی

وصیت کر لی تو وہ فقہی شہید نہیں کہلائے گا بلکہ اسے غسل دیا جائے گا۔

اس کا تعلق میدان جنگ سے فقط نہیں بلکہ یہ حکم عام ہے۔ظلماً زخمی ہونے کے بعد زندہ رہا یا میدان جنگ سے جب اٹھایا گیا تو زندہ تھا:

"لما قتل عمر وعلی غسلا لانهما ارتثا وعثمان اجهز علیه فی مصرعه ولم یرتث فلم یغسل کما فی البدائع"

جب حضرت عمر اور حضرت علی رضی اللہ عنہما کو شہید کر دیا گیا تو ان کو غسل دیا گیا تھا کیونکہ وہ زخمی ہونے کے بعد کچھ وقت کیلئے زندہ رہے تھے، وصیتیں وغیرہ فرمائی تھیں لیکن حضرت عثمان رضی اللہ عنہ زخمی ہونے کے ساتھ ہی شہید ہو گئے تھے اس لئے آپ کو غسل نہیں دیا گیا تھا۔لہٰذا حضرت عثمان رضی اللہ عنہ فقہی شہید ہوئے اور حضرت علی اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما غیر فقہی شہید ہوئے۔

تنبیہ: جس شخص کو ظلماً قتل کیا گیا اس میں تو آلہ قتل کی قید تھی لیکن جو شخص میدان جنگ میں شہید ہو گیا اس کے ساتھ آلہ قتل کی قید نہیں وہ جس آلہ سے قتل کر دیا گیا ہو وہ فقہی شہید ہوگا اسے غسل نہیں دیا جائیگا۔

مسئلہ: میدان جنگ سے مسلمان کی لاش ملی اگر یہ معلوم ہو جائے کہ اس پر آثار قتل پائے گئے تو وہ فقہی شہید ہے اسے غسل نہیں دیا جائے گا اور اگر یہ شک ہو کہ ہو سکتا ہے اپنی موت سے فوت ہوا ہو گا تو وہ غیر فقہی شہید ہوگا اسے غسل دیا جائے گا۔جیسا کہ آنکھ یا کان یا حلق سے صاف خون (یعنی منجمد خون نہ ہو) نکل رہا ہو تو یہی سمجھا جائے گا کہ اسے قتل کیا گیا ہے اور اگر ناک یا آلہ تناسل یا دبر یا حلق سے منجمد خون نکلا ہوا ہے تو اس میں شک ہے کیونکہ اس طرح خون عام موت کی حالت میں بھی نکل آتا ہے (قتل کرتے ہوئے کسی کو دیکھا نہیں صرف لاش میدان جنگ سے ملی ہے) تو اسے احتیاطی طور پر غسل دیا جائے گا غیر فقہی شہید تصور کیا جائے گا۔

مقام توجہ: اصل میں احد کے شہداء کو غسل نہیں دیا گیا تھا بلکہ ان کے متعلق رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "زملوهم بکلومهم ودمائهم" (مسند احمد) ان کو زخموں اور خون میں ہی لپیٹ دو۔مطلب یہ تھا کہ ان کو غسل نہ دو اس وقت ان شہداء کی جو حالت تھی اس سے ہٹ کر جو صورتیں در پیش ہو سکتی ہیں جن کا ذکر

کیا جاچکا ہے ان میں احتیاطاً غسل دیا جائے گا۔

مسئلہ : فقہی شہید ہو یا غیر فقہی شہید ہو کفار کے ساتھ لڑائی میں شہید ہو یا باغی اور ڈاکو شہید کر دیں یا ظلماً قتل کر دیا جائے سب ہی کامل شہید ہیں البتہ مدارج میں فرق ہوسکتا ہے۔
(از درمختار وشامی باب الشهيد)

تنبیہ : جب دو مسلمان لڑیں ہر ایک چاہتا ہو کہ میں دوسرے کو قتل کر دوں تو وہ دونوں جہنمی ہیں ان میں سے قتل ہونے والا ظلماً قتل نہیں کیا گیا ان کے متعلق ہی رسول اللہ ﷺ نے فرمایا " القاتل والمقتول هما فی النار " قاتل اور مقتول دونوں ہی جہنمی ہیں۔

شہید کے خون کا مسئلہ:

" ودم مسفوح من سائر الحيوانات الادم شهيد ای ولو مسفوحا اقتضاه كلامه وكلام البحر ما دام عليه فلو حمله المصلى جازت صلاته الا اذا اصابه منه لانه زال عن المكان الذی حكم بطهارته حموی ونحوه فی الحلية "
(در مختار وشامی باب الانجاس)

تمام حیوانوں کا دم مسفوح یعنی بہنے والا خون، خواہ ذبح کرتے وقت وہ نکلے یا کسی انسان اور جانور کے زخمی ہونے سے وہ خون نکلے وہ نجاست غلیظہ ہے لیکن شہید کا خون خواہ دم مسفوح ہی کیوں نہ ہو وہ پاک ہے لیکن شرط یہ ہے کہ وہ خون شہید پر جب تک ہے اس وقت تک پاک ہے لیکن اگر وہ خون اس سے منتقل ہو جائے تو ناپاک ہو جائے گا کیونکہ جس مکان کو پاک ہونے کا حکم دیا گیا تھا اس سے منتقل ہو گیا اسی لئے خون آلود شہید کو اٹھائے ہوئے کوئی شخص نماز ادا کرے تو اس کی نماز ادا ہو جائے گی لیکن اگر شہید کا خون منتقل ہو کر اٹھانے والے تک پہنچ گیا تو اس شخص کو نجاست لاحق ہوگی۔ (از شامی)

اسی سے واضح ہو گیا کہ شہید کا خون کسی کنوئیں میں گر جائے یا شہید کے خون آلود کپڑے کنوئیں میں گر جائیں تو وہ کنواں ناپاک ہو جائے گا۔

<u>انبیاء کرام اور اولیاء کرام زندہ ہیں:</u> نبی کریم ﷺ کی زندگی کو مفتی اعزاز علی دیوبندی

حاشیہ نورالایضاح پر ان الفاظ سے پیش کرتے ہیں:

" مثلہ ﷺ بعد وفاتہ کمثل شمع فی حجرۃ اغلق بابھا فھو مستور عمن ھو خارج الحجرۃ ولکن نورہ کما کان بل ازید وھذا حرم نکاح ازواجہ بعدہ ﷺ لم یجر احکام المیراث فیما ترکہ لانھما من احکام الموت "

نبی کریم ﷺ کی مثال دنیا سے رخصت ہو جانے کے بعد اس طرح ہے جس طرح ایک شمع کو باہر سے کمرہ میں لے جائیں اور اس کا دروازہ بند کر دیا جائے اگرچہ وہ شمع کمرے سے باہر والوں سے چھپ گئی لیکن اس کی روشنی اس طرح ہے بلکہ پہلے سے بھی زیادہ کیونکہ باہر روشنی کم تھی اندر جا کر زیادہ ہوگئی (اسی طرح نبی کریم ﷺ قبر شریف میں اگرچہ باہر والے لوگوں سے مستور ہیں لیکن آپ کی زندگی پہلے سے بھی زیادہ ارفع وبلند ہے)۔ اسی وجہ سے آپ کے دنیا سے رخصت ہو جانے کے باوجود آپ کی ازواج مطہرات سے نکاح کرنا حرام ہے اور آپ کے ترکہ پر وراثت کے احکام جاری نہیں ہوتے کیونکہ یہ دونوں کام مردوں سے تعلق رکھتے ہیں آپ تو زندہ ہیں۔ تقریباً یہی مضمون مفتی محمد شفیع صاحب دیوبندی اپنی تفسیر معارف القرآن میں ذکر فرماتے ہیں آپ نے اسی زیر بحث آیۃ کریمہ کی تفسیر میں صالحین کی زندگی کا قول بھی کیا ہے۔

علامہ علی قاری رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

فان اللہ تعالیٰ قال فی حق الشھداء من امتہ بل احیاء عند ربھم یرزقون فکیف سیدھم بل رئیسھم لانہ حصل لھا ایضا مرتبۃ الشھادۃ مع مزید السعادۃ "

بیشک اللہ تعالیٰ نے نبی کریم ﷺ کی امت کے شہداء کے متعلق کہا کہ وہ اپنے رب کے پاس زندہ ہیں روزی پاتے ہیں ان کے سردار اور رئیس کو یہ مقام کیسے حاصل نہ ہو آپ کو بھی مرتبہ شہادت حاصل ہے بلکہ امت کے شہداء سے زیادہ سعادت حاصل ہے۔

چونکہ نبی کریم ﷺ کو خیبر میں ایک یہودیہ نے زہر آلود بکری کا گوشت جو دیا تھا اگرچہ ایک دو لقمہ تناول فرمانے پر ہی خود گوشت نے نبی کریم ﷺ کو بتایا تھا کہ مجھے زہر آلود کیا گیا ہے تاہم آپ کے وصال کے وقت وہ زہر لوٹ کر آ گیا تھا جو (ایک دو لقمہ تناول کرنے پر مؤثر ہوا تھا وہی) اثر انداز ہوگیا

جس سے آپ کو شہادت حاصل ہوئی۔

اسی مقام پر علامہ علی قاری رحمہ اللہ فرماتے ہیں" اولیاء اللہ لا یموتون ولکن ینتقلون من دار الفناء الی دار البقاء " اللہ کے ولی نہیں مرتے بلکہ فانی دنیا سے باقی رہنے والے مقام کی طرف انتقال کرتے ہیں۔ (مرقاۃ باب الجمعۃ)

نبی کی زندگی شہید کی زندگی سے اعلیٰ ہے:

شہید کی زندگی نص قطعی سے ثابت ہے لیکن نبی کی زندگی سے کم درجہ ہے شہید کی بیوہ کو عدت گزارنے کے بعد نکاح کرنے کی اجازت ہے لیکن نبی کی زوجہ کو نکاح کرنے کی اجازت نہیں کیونکہ شہید زندہ ہونے کے باوجود دنیاوی احکام کے لحاظ سے اس پر مردہ ہونے والے احکام جاری ہو جاتے ہیں لیکن نبی کی زندگی اتنی کامل اور ارفع ہے کہ نبی کی زوجہ بیوہ نہیں ہوتی اور اس سے نکاح کرنے کی ممانعت فرمادی ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَلَا اَنْ تَنْكِحُوْا اَزْوَاجَهٗ مِنْ بَعْدِهٖ اَبَدًا ﴾ "اور ان کے بعد کبھی ان کی بیبیوں سے نکاح نہ کرو"

یہ نکاح کی ممانعت صرف نبی کریم ﷺ کی زندگی کی وجہ سے ہے آپ کی ازواج مطہرات کا مومنوں کی ماں ہونے کی وجہ سے نہیں اس لئے کہ مومنوں کی ماں ہونے کا شرف تمام ازواج مطہرات کو حاصل ہے، لیکن یہ صرف رتبہ کی وجہ سے، ورنہ حقیقی ماں کے تمام احکامات ان پر جاری نہیں ہوتے کیونکہ جس طرح ماں سے نکاح حرام ہے اسی طرح ماں کی بیٹی سے بھی نکاح حرام ہے حالانکہ حضرت علی، حضرت عثمان اور حضرت ابو العاص رضی اللہ عنہم کے آپ کی بیٹیوں سے نکاح تھے جو تمام حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا کی بیٹیاں ہیں۔

شہید کی زندگی سے نبی کی زندگی اس وجہ سے بھی بلند ہے کہ شہید کی باوجود زندہ ہونے کے وراثت تقسیم ہوتی ہے لیکن نبی کی وراثت تقسیم نہیں ہوتی اس سے یہ نتیجہ حاصل ہوتا ہے کہ شہید پر دنیا کے لحاظ سے فوت شدہ حضرات کے احکام جاری ہوتے ہیں اگر چہ اسے برزخی زندگی حاصل ہے۔

انبیاء کرام کی وراثت تقسیم نہ ہونے کی وجہ حدیث پاک میں ہے " انا معاشر الانبیاء لانرث ولا نورث ما ترکناه صدقة" ہم انبیاء کرام نہ کسی کے وارث ہوتے ہیں اور نہ ہمارا کوئی وارث ہوتا ہے ہم جو مال چھوڑتے ہیں وہ صدقہ ہوتا ہے۔

علامہ جلال الدین سیوطی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

آپ نے انبیاء کرام کی حیات پر ایک رسالہ تحریر فرمایا جس کا نام انباء الاذکیاء بحیاۃ الانبیاء ہے الحاوی للفتاوی میں یہ رسالہ شامل ہے جس سے مختصر طور پر کچھ بحث میں نقل کر رہا ہوں:

" حیاة النبی ﷺ فی قبره هو وسائر الانبیاء معلومة عندنا علما قطعیا "

نبی کریم ﷺ کی قبر شریف میں زندگی اور باقی انبیاء کرام کی زندگی ہمیں قطعی طور پر معلوم ہے اس میں دلائل موجود ہیں اور خبریں تواتر کے درجے تک موجود ہیں اسی وجہ سے بیہقی نے انبیاء کرام کی قبروں کی زندگی پر ایک باب تالیف کیا ہے۔

انبیاء کرام اپنی قبروں میں نماز پڑھتے ہیں:

" اخرجه مسلم عن انس ان النبی ﷺ لیلة اسری به مر بموسی علیه السلام وهو یصلی فی قبره "

مسلم شریف میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ معراج کی رات موسیٰ علیہ السلام کی قبر سے گزرے تو آپ اپنی قبر شریف میں نماز ادا کر رہے تھے۔ اسی طرح ابونعیم نے بھی اس حدیث شریف کو کچھ مختلف الفاظ سے ذکر کیا ہے۔ بیہقی کتاب حیاۃ الانبیاء میں ذکر ہے " عن انس ان النبی ﷺ قال الانبیاء احیاء فی قبورهم یصلون " حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت بیان کی گئی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا ہے کہ تمام انبیاء کرام اپنی اپنی قبروں میں زندہ ہیں وہ نماز ادا کرتے ہیں۔

نبی کریم ﷺ درود پاک سنتے ہیں:

" عن ابی هریرة قال قال رسول الله ﷺ من صلی علی عند قبری سمعته ومن صلی علی نائیا بلغته "

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں نبی کریم ﷺ نے فرمایا جو شخص میری قبر کے پاس درود شریف پڑھتا ہے میں اسے سنتا ہوں اور جو شخص مجھ پر دور سے درود پاک پڑھتا ہے وہ مجھ تک پہنچایا جاتا ہے۔

تنبیہ : اس حدیث پاک سے یہ مطلب لینا'' کہ آپ دور سے نہیں سنتے بلکہ آپ کے پاس فرشتے پہنچاتے ہیں'' درست نہیں۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ سمیع وبصیر بھی ہے لیکن پھر بھی فرشتے اللہ تعالیٰ کے پاس بندوں کے اعمال پہنچاتے ہیں دوسری حدیث جس میں انشاء اللہ تفصیل سے بحث آئے گی اس میں قریب اور بعید کا کوئی ذکر نہیں بلکہ آپ ہر جگہ سے درود وسلام سنتے ہیں اور سلام کا جواب دیتے ہیں۔

'' ما من احد یسلم علی الا رد الله روحی حتی ارد علیه السلام ''

جو شخص مجھ پر سلام بھیجتا ہے اللہ تعالیٰ میری توجہ اس کی طرف کر دیتا ہے یہاں تک کہ میں اس کے سلام کا جواب دیتا ہوں۔

نبی کریم ﷺ کا علم موت کے بعد ایسے ہی ہے جیسے زندگی میں تھا:

اصبہانی ترغیب میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں:

'' قال رسول الله ﷺ من صلی علی مائة فی یوم الجمعة ولیلة الجمعة قضی الله له مائة حاجة سبعین من حوائج الآخرة وثلاثین من حوائج الدنیا ثم وکل الله بذلک ملکا یدخله علی فی قبری کما یدخل علیکم الهدایا ان علمی بعد موتی کعلمی فی الحیوة ''

نبی کریم ﷺ نے فرمایا جو شخص مجھ پر جمعہ کے دن اور جمعہ کی رات میں ایک سو مرتبہ درود پاک پڑھتا ہے اللہ تعالیٰ اس کی ایک سو حاجتیں پوری کرتا ہے ستر حاجات آخرت کی اور تیس حاجات دنیا کی۔ پھر اللہ تعالیٰ اس پر ایک فرشتہ مقرر کر دیتا ہے جو میری قبر میں میرے پاس اس درود کو اس طرح پیش کرتا ہے جس طرح تمہارے پاس تحائف لائے جاتے ہیں بیشک میرا علم میری موت کے بعد ایسے ہی ہے جیسے میرا علم میری زندگی میں ہے۔

مقام توجہ: اس حدیث پاک میں مطلقا درود شریف کو فرشتوں کے پہنچانے کا ذکر ہے خواہ درود پاک پڑھنے والا قریب ہو یا بعید۔

ان تمام احادیث کے مجموعی مضامین سے یہ واضح ہوا کہ درود پاک پڑھنے والے شخص کا درود پاک تحفہ کی طرح فرشتے نبی کریم ﷺ کے پاس پہنچاتے ہیں اور نبی کریم ﷺ خود بھی سنتے ہیں۔

کیونکہ فرشتوں کا کوئی عمل پہنچانا اپنے سننے سے مانع نہیں۔ جب کہ اللہ تعالیٰ خود سنتا بھی ہے اور فرشتے بندوں کے اعمال اس تک پہنچاتے بھی ہیں جس طرح وہاں فرشتوں کا پہنچانا اللہ تعالیٰ کے سننے کے منافی نہیں اسی طرح نبی کریم ﷺ کے پاس فرشتوں کا درود پاک پہنچانا آپ کے سننے کے منافی نہیں۔

نبی کریم ﷺ کی قبر سے اذان کا آواز آنا:

ابن سعد نے طبقات میں سعید ابن میسب سے روایت کیا ہے وہ فرماتے ہیں:

انہ کان یلازم المسجد ایام الحرۃ والناس یقتتلون قال فکنت اذا حانت الصلوۃ اسمع اذانا یخرج من قبل القبر الشریف"

سعید بن میسب کہتے ہیں کہ میں مسجد نبوی میں ہی ہوتا تھا جب ایام حرہ کا واقعہ در پیش آیا (یزیدی دور میں جب مدینہ طیبہ پر حملہ کیا گیا ظلم وستم ہوا مسجد نبوی میں تین دن تک اذانیں نمازیں بند رہیں اس واقعہ کو ایام حرہ سے تعبیر کیا گیا ہے) لوگ جنگ کرنے میں مشغول ہوتے میں قبر شریف سے نماز کے وقت اذان کی آواز سنتا تھا یہ حدیث کچھ مختلف الفاظ سے زبیر ابن بکار نے اخبار مدینہ میں سعید بن میسب سے روایت کی اور دارمی نے بھی اپنی مسند میں سعید بن میسب سے ہی روایت کی ہے۔

بیہقی نے کتاب الاعتقاد میں ذکر کیا ہے " **الانبیاء بعد ما قبضوا ردت الیھم ارواحھم فھم احیاء بھم کالشھداء** " انبیاء کرام کی وفات کے بعد ان کے ارواح لوٹا دیئے جاتے ہیں وہ اسی طرح زندہ ہیں جس طرح شہداء کو زندگی حاصل ہے علامہ سیوطی رحمہ اللہ فرماتے ہیں انبیاء کرام زندہ ہیں، موجود ہیں البتہ ہم ان کو دیکھ نہیں سکتے۔

اسی طرح جس طرح فرشتے زندہ ہیں موجود ہیں لیکن ہم میں سے کوئی انہیں دیکھ نہیں سکتا یہ ممکن ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے اولیاء کرام میں سے کسی کو خصوصی کرامت سے نواز دے تو وہ فرشتوں کو دیکھ سکے۔ (اسی طرح اولیاء کرام کو اپنے مزارات میں زندہ نماز پڑھتے دیکھ لیں تو یہ عقل سے بعید نہیں)۔

نبی کریم ﷺ اپنی امت کے اعمال کو جانتے ہیں: استاد ابو منصور عبد القاہر کہتے ہیں:

" المتکلمون المحققون من اصحابنا ان نبینا ﷺ حی بعد وفاته وان یسر بطاعات امته ویحزن بمعاصی العصاة منهم"

ہمارے اصحاب میں سے متکلمین محققین کہتے ہیں کہ ہمارے نبی کریم ﷺ اپنی وفات کے بعد زندہ ہیں اپنی امت کی نیکیوں پر خوش ہوتے ہیں اور اپنی امت کے نافرمانوں کے گناہوں سے پریشان ہوتے ہیں۔ علامہ قسطلانی شارح بخاری مواہب اللدنیہ میں فرماتے ہیں

" لا فرق بین موته وحیاته ﷺ فی مشاهدته لامته ومعرفته باحوالهم ونیاتهم وعزائمهم وخواطرهم وذلک جلی عنده لا خفاء به" (مواهب اللدنیه مع زرقانی جلد ۸ ص ۳۰۵)

نبی کریم ﷺ کی موت وحیات میں کوئی فرق نہیں آپ ہر حال میں اپنی امت کا مشاہدہ فرما رہے ہیں اور ان کے احوال کو پہچانتے ہیں اور ان کی نیتوں کو جانتے ہیں اور ان کے ارادوں پر مطلع ہیں اور ان کے دل پر کھٹکنے والے واقعات سے باخبر ہیں اور یہ بہت واضح ہے اس میں کوئی خفاء نہیں۔ تقریباً یہی مضمون حضرت عبد اللہ بن مبارک رضی اللہ عنہ نے حضرت سعید بن میسب رضی اللہ عنہ سے نقل فرمایا ہے صاحب مواہب لدنیہ نقل فرماتے ہیں:

" عن عبد الله بن المبارک عن سعید بن المسیب رضی الله عنه لیس من یوم الا ویعرض علی النبی ﷺ اعمال امته غدوة وعشیة فیعرفهم بسیماهم واعمالهم فلذلک یشهد علیهم" (مواهب لدنیه ج ۵ ص ۳۳۷)

حضرت سعید بن میسب رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ کوئی دن ایسا نہیں جس میں صبح وشام نبی کریم ﷺ کی خدمت میں امت کے اعمال پیش نہ ہوتے ہوں نبی کریم ﷺ اپنی امت کو اشکال وصورت اور ان کے اعمال کے ساتھ جانتے ہیں اسی لئے وہ ان پر گواہ ہوں گے قیامت کے دن۔
(وکذا فی الملهم ج ۱ ص ۲۱۳ بحواله جلاء الصدور)

اعتراض: مسند امام احمد، ابوداؤد اور بیہقی شریف میں ایک حدیث حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے " ان رسول الله ﷺ قال ما من احد یسلم علی الا رد الله روحی حتی ارد علیه السلام " بیشک نبی کریم ﷺ نے فرمایا جو شخص مجھ پر سلام پیش کرتا ہے اللہ تعالیٰ میرے روح کو

لوٹاتا ہے میں اس کے سلام کا جواب دیتا ہوں۔

اس حدیث پاک سے پتہ چلتا ہے کہ آپ کا روح آپ کے بدن سے کبھی جدا ہوتا ہے اور کبھی لوٹ کر آتا ہے تمام وقت آپ کی زندگی ثابت نہیں ہوتی کیونکہ تمام وقت روح موجود نہیں ہوتا اس اعتراض کے کئی جواب علامہ سیوطی رحمہ اللہ نے دیئے جن میں سے کچھ نقل کئے جا رہے ہیں۔

پہلا جواب: حدیث شریف میں " رد اللہ " جو جملہ واقع ہے یہ جملہ حالیہ ہے جب فعل ماضی حال واقع ہو اس پر لفظ "قد" داخل ہوتا ہے ظاہر ہو یا مقدر جس طرح " او جاء وکم حصرت صدورھم" میں "قد" مقدر ہے اصل میں " قد حصرت " ہے۔

جملہ ماضیہ سلام پیش کرنے والے کے سلام سے پہلے واقع ہوگا اور حدیث شریف میں جو لفظ حتی ہے وہ تعلیلیہ نہیں بلکہ فقط عطف کیلئے ہے اب حدیث پاک کا مطلب ان الفاظ سے پیش کیا جائے گا۔

" ما من احد یسلم علی الا قد رد اللہ علی روحی قبل ذلک فا رد علیہ السلام "

مجھ پر جب بھی کوئی سلام پیش کرتا ہے میں اس کا جواب دیتا ہوں کیونکہ اللہ تعالیٰ نے میرے روح کو پہلے ہی لوٹا دیا ہے۔

یعنی روح سلام کی بعد نہیں لوٹا بلکہ پہلے سے ہی جاودانی زندگی عطاء فرما دی ہے۔

غلطی کی وجہ یہ ہے کہ " رد اللہ " کو حال یا استقبال کے معنی میں لیا گیا ہے اور حتی کو تعلیلیہ بنایا گیا ہے اور ترجمہ اس طرح کیا گیا ہے " کہ جب بھی کوئی شخص مجھ پر سلام پیش کرے گا اللہ تعالیٰ میرے روح کو لوٹائے گا یہاں تک کہ میں اس کے سلام کا جواب دوں گا"۔

حالانکہ صحیح ترجمہ ضابطہ کے مطابق وہ ہے جو اوپر پیش کیا جا چکا ہے۔

اگر حال اور استقبال کا معنی لیا جائے تو لازم یہ آئے گا بار بار مسلمان درود پاک پڑھیں گے بار بار نبی کریم ﷺ کے روح کو لوٹایا جائے گا بار بار روح کو لوٹانے میں چار قسم کی رکاوٹیں موجود ہیں۔

(۱) روح کا کئی مرتبہ نکلنا اور لوٹنا جسم کو درد پہنچاتا ہے اس میں نبی کریم ﷺ کی عزت وتکریم نہیں ہوگی بلکہ درد پہنچانا لازم آئے گا جو آپ کی شان کے مخالف ہے۔

(۲) تمام لوگوں یعنی شہداء وغیرہ کی مخالفت لازم آتی ہے کسی کے متعلق قبر میں یعنی برزخی زندگی میں بار بار روح کا جدا ہونا پھر لوٹنا ثابت نہیں۔ نبی کریم ﷺ کے روح کا ہمیشہ رہنا بہت ضروری ہے کیونکہ آپ اعلیٰ مرتبہ والے ہیں۔

(۳) یہ قرآن پاک کے مخالف ہے کیونکہ قرآن پاک سے صرف دو موتیں اور دو زندگیاں ثابت ہیں اس تکرار سے تو کئی موتیں اور کئی زندگیاں ثابت ہوں گی۔ حالانکہ یہ باطل ہے۔

(۴) اس کا تکرار والا معنی لینا احادیث متواترہ کے مخالف ہے جن کا ذکر پہلے ہو چکا ہے جن سے ہمیشہ کی زندگی ثابت ہے۔ قانون یہ ہے جو حدیث احادیث متواترہ یا قرآن پاک کے مخالف ہو اس کی تاویل ضروری ہے اگر تاویل نہ ہو سکے تو اس پر عمل نہیں ہو سکتا اس کی تاویل جب ہو سکتی ہے تو ظاہری معنی مراد نہیں بلکہ تاویل کے مطابق ہوگا۔

دوسرا جواب: ''عـــود'' اور ''رد'' کا معنی عام طور پر لوٹنا اور لوٹانا ہوتا ہے لیکن کبھی ان کا معنی لوٹنا نہیں ہوتا بلکہ آ جانا، ہو جانا، موجود ہونا، اس قسم کے معانی ہوتے ہیں۔ جس طرح حضرت شعیب علیہ السلام کی قوم کے کافر سرداروں نے آپ کو کہا یا تو آپ ہمارے دین میں آ جائیں ورنہ ہم تمہیں اپنی بستیوں سے نکال دیں گے آپ نے ان کے جواب میں یہ کہا '' **قد افترینا علی اللہ کذبا ان عدنا فی ملتکم** '' ضرور ہم اللہ پر جھوٹ باندھیں گے اگر ہم تمہارے دین میں لوٹ آئیں۔ یہ معنی اس وقت درست ہو سکتا ہے جب معاذ اللہ حضرت شعیب علیہ السلام پہلے ان کے دین میں ہوتے پھر ان کے دین کو چھوڑا ہوتا پھر ان کے مطالبے پر کہتے اگر میں تمہارے دین میں لوٹ آؤں حالانکہ آپ ان کے دین پر تھے ہی نہیں اب اس آیۃ کا صحیح ترجمہ یہ ہوگا ''ضرور ہم اللہ پر جھوٹ باندھیں گے اگر ہم تمہارے دین میں آ جائیں''۔

اسی طرح حدیث پاک کا ترجمہ یہ ہوگا اگر کوئی شخص مجھ پر سلام پیش کرے تو میں اس کے سلام کا جواب دوں گا کیونکہ اللہ تعالیٰ نے مجھے روح عطا فرمائی ہے۔

تیسرا جواب: رد روح سے مراد روح کا بدن سے جدا ہو کر لوٹنا مراد نہیں۔ نبی کریم ﷺ قبر شریف

میں احوال ملکوت میں مشغول ہیں اور اپنے رب کے مشاہدہ میں مستغرق ہوتے ہیں۔ جب کوئی سلام پیش کرے تو آپ اس استغراقی حالت سے جب اس انسان کی طرف متوجہ ہوتے ہیں اس توجہ کو روح کے لوٹنے سے تعبیر فرمایا ہے۔ اس پر ایک اور حدیث شاہد ہے جس کا تعلق واقعہ معراج سے ہے وہ یہ ہے "فاستیقظت وانا بالمسجد الحرام" اس کا ظاہری معنی یہ ہے جب میں بیدار ہوا تو میں مسجد حرام میں تھا حالانکہ معراج شریف خواب کا واقعہ نہیں بلکہ جاگتے ہوئے در پیش آیا۔ اس حدیث کا مطلب بھی یہ ہے کہ آپ معراج کی رات ملکوت کے عجائب وغرائب دیکھنے کی وجہ سے وجدانی کیفیت میں تھے اس حالت سے واپس لوٹے اور مسجد حرام تشریف لائے اس حالت کو جاگنے سے تعبیر فرمایا۔

چوتھا جواب: **" ان الرد یستلزم الاستمرار لان الزمان لا یخلو من مصل علیه فی اقطار الارض فلا یخلو من کون الروح فی بدنه "**

اس مقام پر " رد " کا لفظ خود ہمیشگی کا تقاضا کرتا ہے کیونکہ کوئی ایسا زمانہ نہیں ہوگا جس میں اطراف زمین میں درود پاک پڑھنے والا نہ ہو لہذا کوئی ایسا وقت نہیں ہوسکتا جس میں روح بدن میں موجود نہ ہو یعنی ہر زمانہ، ہر وقت، ہر آن میں کوئی نہ کوئی شخص زمین کے کسی نہ کسی حصے میں درود پاک پڑھنے والا ہوتا ہے جب بھی کوئی شخص درود پڑھے تو آپ کی روح کا موجود ہونا ضروری ہوتا ہے۔ تو معلوم ہوا کہ آپ کی روح مبارک بدن میں ہمیشہ ہی موجود ہے۔

پانچواں جواب: **" لیس المراد بالروح روح الحیاة بل الارتیاح کما فی قوله تعالیٰ (فروح وریحان) فانه قرئ فروح بضم الراء والمراد انه ﷺ یحصل له بسلام المسلم علیه ارتیاح وفرح وهشاشه لحبه ذلک فیحمله ذلک علی ان یرد علیه "**

روح سے مراد روح حیات نہیں بلکہ راحت محسوس کرنا جس طرح اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے (فروح وریحان) ایک قرأت راء کی پیش ہے مراد یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ کو مسلمان کے سلام سے راحت اور خوشی حاصل ہوتی ہے اور اس کی محبت پر آپ خوش ہوتے ہیں۔ حدیث شریف میں روح کے لوٹانے کا یہی مطلب ہے۔ (از الحاوی للفتاوی)

شہید کی زندگی پر روح البیان کا بیان:

انسان میں دو روحیں ہیں ایک روح سلطانی جس کا مقام دل ہے اسی سے زندگی قائم ہے دوسری روح حیوانی جس کا مقام دماغ ہے جس سے ہوش وحواس برقرار رہتے ہیں روح حیوانی سونے کی حالت میں نکل جاتی ہے اور روح سلطانی بروقت موت خارج ہوتی ہے۔ یعنی روح حیوانی کے نکلنے کا نام نیند ہے اور روح سلطانی کے نکلنے کا نام موت ہے پھر جیسے نیند کی حالت میں روح حیوانی جسم سے نکل کر عالم کی سیر کرتی ہے اسی سیر کا نام خواب ہے مگر جسم سے اس کا تعلق رہتا ہے کیونکہ جونہی کسی نے جسم کو ہاتھ لگایا یا پکارا فوراً ہی روح کو خبر ہوئی اور آناً فاناً آ کر جسم میں داخل ہوگئی اور سونے والا جاگ گیا۔

ایسے بعد موت روح سلطانی کا کچھ تعلق جسم سے باقی رہتا ہے کہ جو کوئی قبر پر فاتحہ کے لئے آئے روح کو خبر ہو جاتی ہے اس سے اتنا معلوم ہوا کہ موت نہ تو روح کی فنا کا نام ہے نہ جسم کی۔ صرف جسم سے تعلق کے ضعیف ہونے کا نام ہے اب یہ روح اس جسم کی پرورش نہیں کرتی جسم گل سڑ جاتا ہے۔

(ماخوذ از نعیمی)

لیکن انبیاء کرام کے اجسام سے ان کی ارواح کا تعلق بہت زیادہ قوی ہوتا ہے اس کے بعد شہداء کے اجسام سے اسی لئے ان کے جسم محفوظ رہتے ہیں پھر صلحاء کے جسموں سے بھی ایسا تعلق رہتا ہے کہ ان کے جسم محفوظ رہتے ہیں۔ راقم کے پردادا قاضی غلام نبی رحمہ اللہ کی قبر بارشوں کی وجہ سے جب نقصان میں آئی تو اٹھارا سال کے بعد بھی آپ کا جسم صحیح سلامت تھا۔ یوں محسوس ہو رہا تھا جیسا کہ آج ہی دفن کیا گیا آپ کی داڑھی مبارک میں غسل کے وقت کے پانی کے قطرات تک موجود تھے۔ (راقم)

﴿ وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوْعِ وَنَقْصٍ مِّنَ الْاَمْوَالِ وَالْاَنْفُسِ وَالثَّمَرَاتِ وَبَشِّرِ الصَّابِرِيْنَ ☆ الَّذِيْنَ اِذَا اَصَابَتْهُمْ مُّصِيْبَةٌ قَالُوْا اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّا اِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ ﴾

۱) ''اور ضرور ہم تمہیں آزمائیں گے کچھ ڈر اور کچھ بھوک سے اور کچھ مالوں اور جانوں اور پھلوں کی کمی سے اور خوشخبری سنا ان صبر والوں کو کہ جب ان پر کوئی مصیبت پڑے تو کہیں ہم اللہ کے مال ہیں اور ہم کو اسی کی طرف پھرنا''

۲) ''اور ضرور بر ضرور ہم آزمائیں گے تمہیں کسی نہ کسی چیز سے یعنی خوف اور بھوک سے اور کمی کر کے مالوں اور جانوں اور پھلوں میں سے اور آپ خوشخبری سنائیں صبر کرنے والوں کو وہ لوگ جب ان کو پہنچے کوئی مصیبت تو کہیں بیشک ہم اللہ کے لئے ہیں اور بیشک ہم اسی کی طرف لوٹنے والے ہیں''

پہلی آیت کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے حکم فرمایا کہ نماز اور صبر سے امداد طلب کرو اب بتایا جا رہا ہے کہ اللہ تعالیٰ تمہاری ضرور بر ضرور آزمائش کرے گا اس وقت کامیابی تب ہی تم حاصل کرو گے جب صبر کرو گے۔

اعتراض: رب تعالیٰ نے پہلے ذکر فرمایا ﴿ وَاشْكُرُوْا لِيْ وَلَا تَكْفُرُوْنِ ﴾ ''اور میرا شکر کرو اور میری نعمتوں کا انکار نہ کرو''

اور ارشاد فرمایا ﴿ لَئِنْ شَكَرْتُمْ لَاَزِيْدَنَّكُمْ ﴾ ''اگر تم نے شکر کیا تو البتہ تمہیں زیادہ عطا کروں گا'' اس کے بعد ﴿ وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ ... الخ ﴾ کا کیا مطلب ہے۔

شکر کرنے اور مزید نعمتیں عطا کرنے کے بعد خوف اور بھوک سے آزمانا اور مالوں اور جانوں اور پھلوں میں کمی کر کے آزمانا بظاہر عقل میں نہ آنے والی بات ہے۔

جواب اول: اللہ تعالیٰ نے خبر دی شرائع کو کامل کرنے سے نعمت کی تکمیل ہوگی۔ یعنی اگر تم نے شریعت کے مطابق عمل کر کے میری نعمتوں کا شکر کیا تو تم پر میری طرف سے اور نعمتوں کا فیضان ہوگا۔

'' ثم اخبر ان القيام بتلك الشرائع لا يمكن الا بتحمل المحن

فلاجرم امر فیها بالصبر "

پھر خبر دی کہ احکام شرع پر اس وقت تک بھی عمل کرنا کامل طور پر ممکن نہیں جب تک وہ مصائب وآلام میں آزمایا نہ جائے اس وقت آزمائش کے وقت صبر کرنا ضروری ہے۔

جواب دوم: اللہ تعالیٰ نے انعام عطاء فرما کے شکر کرنے کا حکم دیا پھر آزمائش میں مبتلاء ہونے پر صبر کا حکم دیا " **لینال الرجل درجة الشاكرين والصابرين معا فيكمل ايمانه** " تاکہ انسان شکر کرنے والے اور صبر کرنے والوں کا درجہ حاصل کرلے اور اس کا ایمان مکمل ہو جائے۔ اس لئے کہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد گرامی ہے " **الايمان نصفان نصف صبر ونصف شكر** " ایمان کے دو حصے ہیں نصف ایمان صبر ہے اور نصف ایمان شکر ہے۔

صبر سے امداد طلب کرنے کے بعد آزمائش کے ذکر کے فوائد:

(۱) پہلے حکم دیا صبر سے امداد طلب کرو تاکہ صبر کرنے کی جب عادت ہو جائے گی اور صبر ان کے نفسوں میں جگہ پکڑ جائے گا پھر جب ان پر آزمائش آئے گی " **فيكون ذلك ابعدلهم عن الجزع واسهل عليهم بعد الورود** " تو ان سے جزع وفزع دور رہے گی اور آزمائشوں پر پورا اترنا ان کے لئے آسان ہوگا۔

(۲) جب ان کو معلوم ہو جائے گا کہ ان کو شدید قسم کے امتحانات سے گزرنا پڑے گا تو ان پر خوف شدید ہو جائے گا " **فيصير ذلك الخوف تعجيلا للابتلاء فيستحقون به مزيد الثواب** " تو یہ جلدی حاصل ہونے والا خوف بھی امتحان کا ہی ایک حصہ ہے گویا کہ امتحان سے پہلے ہی امتحان کے مزید (زیادہ) ثواب کے وہ مستحق ہو جائیں گے۔

(۳) کفار نے جب نبی کریم ﷺ اور آپ کے صحابہ کرام کو دیکھا کہ یہ لوگ بہت بڑی آزمائشوں میں مبتلاء ہونے کے باوجود اپنے دین پر قائم ہیں " **يعلمون ان القوم انما اختاروا هذا الدين لقطعهم بصحته فيدعوهم ذلك الى مزيد التامل فى دلائله** " تو وہ یقین کرنے لگے کہ یہ لوگ اتنی بڑی آزمائشوں میں مبتلاء ہونے کے باوجود جب دین پر قائم ہے تو یہ دین صحیح ہے اس طرح

وہ لوگ دین کی حقانیت کو سمجھنے کے لئے دلائل میں غور وفکر کرنے لگے۔

اور یہ بھی یقینی بات ہے کہ جب وہ ہستی جو دین اسلام کی دعوت دے رہی تھی وہ خود بڑی بڑی تکالیف برداشت کر رہے تھے تو آپ کے متبعین کو تکالیف برداشت کرنی آسان ہوگئیں اور مخالفین کو سوچنے اور ایمان لانے کی توفیق ملنے لگی۔

(۴) رب تعالیٰ کے حکم کو نبی کریم ﷺ نے پہلے ہی بیان فرما دیا کہ تمہیں ضرور بضرور آزمائش میں مبتلاء کیا جائے گا جب آپ کی خبر کے مطابق ہی واقعات رونما ہوئے " **فکان ذلک اخبارا عن الغیب فکان معجزا** " تو یہ غیب کا علم ہے جو نبی کریم ﷺ کا معجزہ ہے۔

سبحان اللہ عظیم مفسر، عظیم محقق علامہ رازی رحمہ اللہ نے کیا خوب بیان فرمایا کہ علم غیب نبی کریم ﷺ کا معجزہ ہے۔ یہ بھی خیال رہے کہ یہ ایسا معجزہ ہے کہ ایسا علم کسی اور کو حاصل ہونا تو دور کی بات ہے لوگوں کی عقلیں علم غیب کو سمجھنے سے بھی عاجز آ گئیں۔

(۵) بیشک منافقین نے نبی کریم ﷺ کی تابعداری کو ظاہر کیا جس کی وجہ سے مال و دولت کے حاصل کرنے کی طمع و لالچ اور رزق میں وسعت حاصل کرنے کی حرص تھی۔ لیکن جب ان کو پتہ چلا کہ اس دین میں قائم رہنے پر تو بہت بڑی آزمائشوں سے گزرنا پڑے گا:

" **فعند ذلک یتمیز المنافق عن الموافق لان المنافق اذا سمع ذلک نفر منہ و ترک دینہ فکان فی ھذا الاختبار ھذہ الفائدۃ** "

تو اس کا یہ فائدہ حاصل ہوا کہ منافقین اور موافقین میں فرق نمایاں ہوگیا کیونکہ منافقین نے جب یہ سنا کہ اس دین میں رہنے سے تو خوف اور بھوک میں مبتلاء ہونا پڑے گا اور جان و مال اور پھلوں کی کمی کی آزمائش سے گزرنا پڑے گا تو انہوں نے دین کو چھوڑ کر بھاگنا شروع کر دیا۔

(۶) " **ان اخلاص الانسان حالۃ البلاء و رجوعہ الی باب اللہ تعالیٰ اکثر من اخلاصہ حال اقبال الدنیا علیہ فکانت الحکمۃ فی ھذا الابتلاء ذلک** "

بیشک انسان کو آزمائش کی حالت میں زیادہ خلوص حاصل ہوتا ہے اور وہ دنیا کی طرف توجہ کرنے کی بجائے اللہ تعالیٰ کے در اقدس کی طرف رجوع کرتا ہے اور عبادات خلوص سے ادا کرتا ہے۔

بشئی : " شیئی " واحد ذکر کیا ہے جمع (اشیاء) ذکر نہیں کیا اس کی کیا وجہ ہے؟ اس کی دو وجہ ہیں:

" الاول لئلا یوھم باشیاء من کل واحد فیدل علی ضروب الخوف والتقدیر بشی من کذا وشئی من کذا "

اس کا ایک مطلب تو یہ ہے کہ جمع اس لئے نہیں ذکر فرمایا تا کہ یہ وہم نہ ہو کہ خوف کی تمام قسمیں مسلط کر کے آزمایا جائے گا فلاں خوف سے اور فلاں خوف سے آزمایا جائے گا۔ بلکہ پہلے " شئی " ذکر کیا کہ کسی نہ کسی چیز سے آزمایا جائے گا پھر " من " بیانیہ ذکر کیا یعنی آزمائش خواہ خوف سے ہو یا بھوک وغیرہ سے (خیال رہے راقم کا ترجمہ اسی کے مطابق ہے)

" والثانی معناہ بشی قلیل من ھذہ الاشیاء " دوسرا مطلب یہ ہے کہ " شئی " واحد ہے اور نکرہ ہے تنوین تقلیل پر دلالت کرتی ہے اب معنی یہ ہوگا کہ ہم ضرور بر ضرور تمہیں آزمائیں گے ان مذکورہ اشیاء میں سے تھوڑی تھوڑی چیزوں سے (اعلیٰ حضرت کا ترجمہ اس قول کے مطابق ہے)۔

مِنَ الْخَوْفِ : (خوف سے) اس مقام پر خوف سے مراد کیا ہے؟ اس مسئلہ کو سمجھنے کے لئے علامہ رازی رحمہ اللہ کی اس خوبصورت بحث کو مدنظر رکھیں آپ فرماتے ہیں:

انسان کو یا مکروہ (ناپسندیدہ) چیزوں سے واسطہ پڑتا ہے یا محبوب (پسندیدہ) چیزوں سے پھر ان کا تعلق ماضی سے ہوگا یا حال سے، یا استقبال سے

" فاذا خطر ببالک موجود فیما مضی سمی ذکرا وتذکرا " ماضی کی چیزیں جب دل پر کھٹکیں تو ان کو ذکرا اور تذکر کہا جاتا ہے یعنی وہ انسان کے لئے نصیحت کا سبب ہے۔

" وان کان موجودا فی الحال یسمی ذوقا ووجدا وانما سمی وجدا لانہا حالۃ تجدھا "

اور اگر وہ حال میں موجود ہوں تو ان کو ذوق اور وجد کہا جاتا ہے وجد کہنے کی وجہ ہی یہ ہے کہ انسان اس حالت کو پا رہا ہے۔

" وان کان قد خطر ببالک وجود شئی فی الاستقبال وغلب ذلک علی قلبک سمی انتظارا وتوقعا "

اگر تمہارے دل پر مستقبل میں کسی چیز کے واقع ہونے کا کھٹکا ہو اور وہ تمہارے دل پر غالب طور پر واقع ہو تو اسے انتظار اور توقع کہا جاتا ہے۔

" **فان کان المنتظر مکروها حصل منه الم فی القلب یسمی خوفا و اشفاقا** " اگر کسی ناپسندیدہ، پریشان کن چیز کے واقع ہونے کا خطرہ ہو جس سے دل میں درد ہو تو اسے خوف اور اشفاق کہا جاتا ہے۔

" **وان کان محبوبا سمی ذلک ارتیاحا والارتیاح رجاء** " اور اگر مستقبل میں کسی محبوب چیز کے واقع ہونے کی انتظار ہو تو اسے ارتیاح کہا جاتا ہے اور ارتیاح (راحت حاصل کرنا) کو رجاء (امید کرنا) بھی کہا جاتا ہے۔

حاصل کلام یہ ہوا کہ جب دل کو درد اور تکلیف ہو کسی پریشان کن چیز کے واقع ہونے کے خطرہ سے تو اسے خوف کہا جائے گا۔ اور اگر دل میں خوشی ہو کہ مستقبل میں فلاں محبوب چیز حاصل ہونے والی ہے تو اس خوشی اور سرور کو ارتیاح اور رجاء کہا جاتا ہے۔

شدید خوف مسلمانوں کو نبی کریم ﷺ کے زمانہ میں دین کے معاملہ میں کفار سے مختلف مواقع پر حاصل ہوتا رہا لیکن سب سے زیادہ خوف اس وقت لاحق ہوا جب تمام اقوام عرب یہود و نصاریٰ اور مشرکین جمع ہو کر اپنے ناپاک ارادے لے کر مدینہ طیبہ کو معاذ اللہ تباہ کرنے کی غرض سے آ گئے ان کا دفاع خندق کھود کر کیا گیا رب تعالیٰ نے ان کو ذلیل کیا اسی کو غزوۂ احزاب اور غزوۂ خندق سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

تاہم مسلمانوں کو بہت شدید خوف سے آزمایا گیا اس آزمائش کو رب تعالیٰ نے ان الفاظ مبارکہ سے بیان فرمایا ﴿ هُنَالِكَ ابْتُلِيَ الْمُؤْمِنُونَ وَزُلْزِلُوا زِلْزَالًا شَدِيدًا ﴾ وہ جگہ تھی کہ مسلمانوں کی جانچ ہوئی اور خوب سختی سے جھنجوڑے گئے۔ (ماخوذ از کبیر)

خوف سے اور آزمائش: " وعن الشافعی رضی الله عنه الخوف خوف الله "

امام شافعی رحمہ اللہ فرماتے ہیں خوف سے مراد اللہ تعالیٰ کا خوف ہے۔ (بیضاوی)

یعنی اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو اپنے اوامر ونواہی سے آزماتا ہے کہ یہ اپنے دلوں میں میرا خوف رکھتے ہوئے ان پر کتنا عمل کرتے ہیں یقیناً جس کے دل میں خوف الٰہی ہوگا وہی اس آزمائش میں کامیاب ہوگا۔

وَالْجُوْعِ : اور بھوک سے، یعنی رب تعالیٰ کی طرف سے انسانوں کو بھوک سے آزمایا جائے گا بھوک سے آزمانے کا کیا مطلب؟ اس کا ایک مطلب تو یہ ہے جو امام شافعی رحمہ اللہ نے بیان فرمایا "والجوع صوم رمضان" بھوک سے مراد رمضان کے روزے ہیں یعنی اللہ تعالیٰ نے رمضان کے روزوں کی فرضیت سے پہلے ہی خبر دے دی کہ ہم تمہیں ضرور بضرور آزمائیں گے بھوکا رہنے کا حکم دے کر کہ اس میں کون کامیاب ہوتا ہے۔ (از بیضاوی)

بھوک سے آزمائش کا اور مطلب:

" والمراد من الجوع القحط اقامة للمسبب مقام السبب "

بھوک سے آزمانے کا مطلب یہ ہے کہ قحط سالی سے رب تعالیٰ بندوں کو آزماتا ہے۔

اس مقام پر ذکر بھوک کا لیکن مراد اس کا سبب ہے یعنی قحط سالی مسبب کو سبب کی جگہ رکھا جسے مجاز مرسل کہا جاتا ہے۔ (روح المعانی)

تنبیہ : قحط سالی سے آزمائش بعض قوموں کی ہوتی ہے اور بعض علاقوں میں قحط سالی سے تو رب تعالیٰ اپنے بندوں کو آزماتا ہے لیکن ایسا نہیں کہ تمام مسلمان قحط سالی سے تباہ و برباد ہو جائیں کیونکہ نبی کریم ﷺ رحمۃ للعلمین ﷺ کی دعا پر عام قحط سے رب تعالیٰ نے محفوظ رکھنے کا وعدہ فرما دیا۔

☆ " عن ثوبان قال قال رسول الله ﷺ ان الله زوى لى الارض فرأيت مشارقها ومغاربها وان امتى سيبلغ ملكها مازوى لى منها واعطيت الكنزين الاحمر والابيض وانى سالت ربى لامتى ان لا يهلكها بسنة عامة وان لا يسلط عليهم عدوا من سوى انفسهم فيستبيح بيضتهم وان ربى قال يا محمد انى اذا قضيت قضاء فانه لا يرد وانى اعطيتك لامتك انا لا اهلكهم بسنة عامة ولا اسلط عليهم عدوا من سوى انفسهم يستبيح بيضتهم ولو اجتمع عليهم من باقطارها حتى يكون بعضهم يهلك بعضا ويسبنى بعضهم بعضا "

(مسلم ج ۲ ص ۳۹۸ کتاب الفتن)

حضرت ثوبان رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا بیشک اللہ تعالیٰ نے میرے لئے زمین کو سمیٹ دیا میں نے اس کے مشارق و مغارب کو دیکھ لیا بیشک میری امت کی بادشاہت وہاں تک پہنچ جائے گی جہاں تک میرے لئے زمین کو سمیٹا گیا۔ اور دو خزانے دے دیئے گئے سرخ اور سفید۔ اور بیشک میں نے اپنے رب سے اپنی امت کے لئے سوال کیا کہ اسے عام قحط سالی سے ہلاک نہ کرنا۔ اور ان پر ان کے اپنے ہی نفسوں کے سوا ان کے دشمن کو مسلط نہ کرنا جو ان کی بادشاہی کو برباد کردے اور بیشک میرے رب نے کہا اے محمد بیشک جب میں کوئی فیصلہ کر لیتا ہوں تو بیشک میں اسے رد نہیں کرتا۔ اور تحقیق میں نے آپ کی امت کو عطا کر دیا ہے کہ ان کو عام قحط سالی سے ہلاک نہیں کروں گا اور ان کے اپنے نفسوں کے سوا ان پر کسی دشمن کو مسلط نہیں کروں گا جو ان کی بادشاہی کو برباد کردے اگرچہ وہ زمین کی ہر طرف سے کیوں نہ جمع ہو جائیں یہاں تک کہ بعض لوگ بعض کو ہلاک کریں گے اور بعض لوگ بعض کو قید کریں گے۔

وضاحت حدیث: " ان اللہ زوی لی الارض " زویت الشئی کا معنی ہے " میں نے جمع کیا اور قبض کیا " اس سے مراد کسی چیز کو دور سے قریب کر دینا تا کہ اسے دیکھ لے اور مطلع ہو جائے حاصل کلام یہ ہے " طوی لاجلی الارض " کہ میرے لئے رب تعالیٰ نے زمین کو سمیٹ دیا دور کو قریب کر دیا۔ " وجعلها مجموعة کھیئة کف فی مرآة نظره " اور اس زمین کے مجموعہ کو اس طرح نبی کریم ﷺ کے قریب کر دیا جیسے کسی کی ہتھیلی اس کی نظر کے آئینہ کے سامنے ہو۔

" ولذا قال فرأیت مشارقها ومغاربها " اور اسی وجہ سے کہا میں نے اس کے مشارق و مغارب کو دیکھ لیا " ای جمیعها " یعنی زمین کے تمام حصہ کو دیکھ لیا۔

سبحان اللہ رب تعالیٰ نے اپنے حبیب پاک ﷺ کو کتنا عظیم علم دیا۔ پتہ نہیں لوگ آپ کے علم کو پیمانہ سے کیوں ناپتے ہیں کم علم لوگو وہ تمہارے پیمائش میں آنے والے علوم نہیں " وان امتی سیبلغ ملکها ما زوی لی منها " بیشک میری امت کی بادشاہی وہاں تک پہنچ جائے گی جہاں تک میرے لئے زمین کو سمیٹ دیا گیا۔

علامہ خطابی کہتے بعض لوگوں نے گمان کیا کہ " منها " میں " من " تبعیضہ ہے جس کا مطلب ہے کہ زمین کے بعض حصوں پر مسلمانوں کی حکومت قائم ہوگی۔

" ولیس ذلک کما توهمه بل هی للتفصیل للجملة المتقدمة " یہ کہنا صحیح نہیں کہ " من " تبعیضیہ ہے بلکہ " من " بیانیہ ہے پہلے جملہ کی تفصیل ہے مطلب اس کا یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ پر تو زمین ایک مرتبہ ہی لپیٹ دی گئی۔ لیکن آپ کی امت پر آہستہ آہستہ زمین فتح ہوگی اور ان کی حکومت قائم ہوگی۔ علامہ علی قاری رحمہ اللہ فرماتے ہیں شائد " من " تبعیضیہ کہنے والوں کی وجہ یہ ہو "فالمراد بالارض ارض الاسلام" کہ زمین سے مراد اسلام کی زمین ہو یعنی اسلام تو ہر جگہ پہنچ جائے گا البتہ مسلمانوں کی بادشاہت بعض علاقوں میں قائم ہوگی۔

راقم کے نزدیک محاکمہ یہی ہے کہ یوں بیان کیا جائے کہ جہاں تک زمین کو میرے لئے سمیٹ دیا گیا وہاں تک اسلام کی حکومت قائم ہوگی یعنی اسلام پہنچ جائے گا اس سے مراد ظاہری حکومت نہیں۔

واعطیت الکنزین الاحمر والابیض ، یہ ماقبل سے بدل ہے یعنی میری امت کو دو خزانے سرخ اور سفید عطا کر دیئے گئے۔

سرخ اور سفید خزانوں سے مراد سونا اور چاندی بھی ہو سکتا ہے جس سے واضح ہوا کہ نبی کریم ﷺ نے جو خبر دی وہی ہوا کہ آپ کی امت آج کل سونے اور چاندی کی مالک ہے۔ اور سرخ و سفید سے مراد کسری اور قیصر کی بادشاہی بھی ہو سکتی ہے کہ میری امت کو فارس اور روم کی بادشاہی حاصل ہو جائے گی آپ کی یہ خبر بھی حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں واقع ہو چکی ہے۔

" وانی سألت ربی لامتی ان لا یهلکها بسنة عامة " السنة، سے مراد قحط اور خشک سالی ہے مطلب یہ ہے کہ میں نے اپنے رب سے اپنی امت کے لئے سوال کیا کہ ان کے تمام شہروں میں قحط نہ پڑے۔ " ای لا اهلکم بقحط یعمهم بل ان وقع قحط فیکون فی ناحیة یسیرة" یعنی میں نے اپنے رب تعالیٰ سے سوال کیا کہ میری امت کو عام قحط سے ہلاک نہ کرنا کہیں کہیں مختلف علاقوں میں قحط سے آزما لیا جائے۔

وان لا یسلط علیهم عدوا من سوی انفسهم فیستبیح بیضتهم ، "عدوا" سے مراد کفار ہیں جو مسلمانوں کے دشمن ہیں۔ " من سوی انفسهم " یعنی اے اللہ تعالیٰ میری امت پر

کفار دشمنوں کو مسلط نہ کرنا سوائے ان کے اپنے نفسوں کے جوان کو تباہ و برباد کر دیں۔

سوائے ان کے اپنے نفسوں کے آپ نے کیوں فرمایا۔ اس لئے کہ نبی کریم ﷺ اس سے پہلے یہ دعا کر چکے تھے۔

" عن سعد ان رسول ال ﷺ مر بمسجد بنی معاویة دخل فرکع فیه رکعتین وصلینا معه ودعا ربه طویلا ثم انصرف فقال سالت ربی ثلاثا فاعطانی ثنتین ومنعی واحدة سالت ربی ان لا یهلک امتی بالسنة فاعطانیها وسالت ان لا یهلک امتی بالغرق فاعطانیها وسالته ان لا یجعل باسهم بینهم فمنعنیها " (رواه مسلم)

حضرت سعد رضی اللہ عنہ سے مروی ہے بیشک رسول اللہ ﷺ بنی معاویہ کی مسجد سے گزرے اس میں داخل ہوئے دو رکعت ادا فرمائیں ہم نے بھی آپ کے ساتھ نماز ادا کی آپ نے اپنے رب تعالیٰ سے لمبی دعاء کی پھر آپ وہاں سے پھرے تو آپ نے فرمایا میں نے اپنے رب سے تین چیزوں کا سوال کیا تو دو چیزیں رب تعالیٰ نے مجھے عطاء کیں اور ایک سے مجھے منع فرما دیا گیا۔ میں نے اپنے رب سے سوال کیا میری امت کو عام قحط سے ہلاک نہ کرنا تو رب تعالیٰ نے مجھے یہ عطاء کر دیا (یعنی اس دعاء کو قبول کر لیا) اور میں نے سوال کیا "میری تمام امت کو غرق کر کے ہلاک نہ کرنا" تو رب تعالیٰ مجھے یہ بھی عطاء کر دیا اور میں نے اپنے رب سے یہ سوال کیا کہ میری امت کو آپس میں ایک دوسرے سے لڑنے والا نہ بنانا تو رب تعالیٰ نے مجھے اس سے منع فرما دیا کہ یہ دعا نہ کرنا۔ اس لئے دوبارہ جب آپ نے دعاء فرمائی تو " من سوی انفسهم " کہہ کر خود ہی اس کو مستثنیٰ کر دیا۔

فیستبیح بیضتهم ، بیضہ، انڈے کو کہا جاتا ہے انڈے سے تشبیہ دی اس لئے کہ کہ انڈا ٹوٹ جائے تو مکمل تباہ ہو جاتا ہے بظاہر معنی تو یہ ہے کہ کفار ان کے انڈے کو مباح نہ سمجھیں لیکن اس سے مراد یہ ہے " یستاصلهم ویهلکهم جمیعا " کہ دشمن میری امت کو مکمل طور پر تباہ و برباد نہ کر دیں ان کو جڑوں سے اکھاڑ نہ پھینکیں " فیفهم انه قد یسلط علیهم عدو " اسی سے یہ سمجھ آ گیا کہ مسلمانوں پر کبھی دشمن مسلط تو ہو جائیں گے لیکن مسلمانوں کو مکمل طور پر تباہ و برباد نہیں کر سکیں گے۔

وجہ واضح ہے کہ اللہ تعالیٰ نے نبی کریم ﷺ کی دعاء کو قبول فرمالیا اور ساتھ ہی وعدہ فرمالیا کہ یہ ایسا فیصلہ ہے جو مبرم ہے معلق نہیں یعنی اس میں کوئی تبدیلی نہیں ہونی۔ اور مسئلہ یہ واضح ہوا کہ مسلمان آپس میں لڑ کر اپنی طاقت کو کمزور کر کے یا غدار مسلمان کافروں کے ساتھ مل کر مسلمانوں کو جو نقصان پہنچا سکتا ہے وہ کفار نہیں پہنچا سکتے۔ (ماخوذ از نووی، ومرقاۃ شرح مشکوۃ ج ۱۱ ص ۵۱ باب فضائل سید المرسلین ﷺ)

بھوک سے آزمانے کی ایک اور وجہ: کچھ لوگ اپنے آپ کو دین کے لئے وقف کر دیں ذریعہ معاش نہ ہو تو وہ بعض اوقات رب تعالیٰ کی طرف سے اس آزمائش میں مبتلاء ہوتے ہیں کہ بھوک ان پر مسلط ہوتی ہے لیکن اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو سخت آزمائش میں پورا اترنے کی توفیق بھی عطا فرماتا ہے۔

☆ "عن ابی هریرة قال خرج رسول الله ﷺ ذات یوم او لیلة فاذا هو بابی بکر وعمر فقال ما اخرجکما من بیوتکما هذه الساعة قالا الجوع یا رسول الله قال انا والذی نفسی بیده لاخرجنی الذی اخرجکما قوموا فقاموا معه فاتی رجلا من الانصار فاذا هو لیس فی بیته فلما رأته المرأة قالت مرحبا واهلا فقال لها رسول الله ﷺ این فلان قالت ذهب یستعذب لنامن الماء اذ جاء الانصاری فنظر الی رسول الله ﷺ وصاحبیه ثم قال الحمد لله ما احد الیوم اکرم اضیافا منی قال فانطلق فجاء هم بعذق فیه بسر وتمر ورطب فقال کلوا من هذه واخذ المدیة فقال له رسول الله ﷺ ایاک والحلوب فذبح لهم فاکلوا من الشاة ومن ذلک العذق وشربوا فلما ان شبعوا ورووا قال رسول الله ﷺ لابی بکر وعمر والذی نفسی بیده لتسئلن عن هذا النعیم یوم القیامة اخرجکم من بیوتکم الجوع ثم لم ترجعوا حتی اصابکم هذا النعیم" (مسلم ج ۲ ص ۱۸۵ باب جواز اشباعه غیره ..... الخ)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک دن رسول اللہ ﷺ (گھر سے باہر) نکلے تو آپ کی ملاقات ابوبکر اور عمر رضی اللہ عنہما سے ہوگئی تو آپ نے فرمایا تمہیں تمہارے گھروں سے اس گھڑی کس چیز نے نکالا ہے؟ انہوں نے عرض کیا بھوک نے یارسول اللہ، حضور ﷺ نے فرمایا قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے اسی چیز نے مجھے بھی نکالا جس نے تمہیں نکالا۔ اٹھو (چلو) وہ آپ کے ساتھ چلے۔ ایک انصاری صحابی کے گھر تشریف لائے وہ اس وقت گھر میں نہیں تھے جب ان کی زوجہ نے حضور کو دیکھا تو خوش آمدید کہا تو حضور ﷺ نے اس عورت سے پوچھا فلاں

شخص (تمہارے خاوند) کہاں گئے ہیں؟ اسنے کہاوہ ہمارے پینے کے لئے پانی لینے گئے ہیں اسی بات کے دوران انصاری صحابی بھی پہنچ گئے تو انہوں نے نبی کریم ﷺ اور آپ کے دونوں ساتھیوں کو دیکھا پھر کہا الحمد للہ آج کے دن کے مہمانوں سے بڑھ کر میرے نزدیک کوئی اور مکرم نہیں پھر وہ گئے اور کھجوروں کا خوشہ لے کر آئے جس میں خشک اور پکی اور کچھ کچی کھجوریں تھیں آپ کی خدمت میں پیش کیں اور عرض کیا آپ تناول فرمائیں پھر انہوں نے (بکری ذبح کرنے کے لئے) چھری لی۔

نبی کریم ﷺ نے فرمایا دودھ والی سے اپنے آپ کو دور رکھنا۔ انہوں نے بکری ذبح کی حضور ﷺ اور آپ کے ساتھیوں نے گوشت اور کھجوریں کھائیں اور پانی پیا جب آپ نے سیر ہو کر کھانا کھالیا اور پانی پی لیا تو نبی کریم ﷺ نے حضرت ابوبکر اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما کو فرمایا قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے قیامت کے دن ضرور بر ضرور تم سے ان نعمتوں کے بارے میں سوال کیا جائے گا کہ تمہیں گھروں سے بھوک نے نکالا پھر تم گھروں میں لوٹ کر نہیں گئے کہ تمہیں یہ نعمتیں عطا فرمادیں۔

وضاحت حدیث: اس حدیث پاک سے واضح ہوا کہ نبی کریم ﷺ اور آپ کے بڑے بڑے صحابہ کرام کے پاس دنیا کا مال تھوڑا رہا اور بھوک سے رب تعالیٰ نے ان کو آزمایا۔ ہاں یہ خیال رہے کہ نبی کریم ﷺ کے پاس کبھی مال آجاتا اور آپ کو آسانی حاصل ہو جاتی اور کبھی مال ختم ہو جاتا اور مشکل پیدا ہو جاتی اس کی اصل وجہ یہ تھی کہ آپ کو مال سے محبت نہیں تھی بلکہ جلدی ہی آپ مال خرچ کر دیتے تھے:

"فکان النبی ﷺ فی وقت یوسر ثم بعد قلیل ینفد ما عندہ لا خراجہ فی طاعۃ اللہ من وجوہ البر وایثار المحتاجین وضیافۃ الطارقین وتجھیز السرایا وغیر ذلک"

نبی کریم ﷺ کو کبھی مال حاصل ہوتا اور آسانی حاصل ہوتی تو آپ جلدی ہی وہ مال ختم کر دیتے تھے کیونکہ اللہ تعالیٰ کی طاعت میں نیکی کے مختلف کاموں میں وہ مال خرچ کر دیتے کبھی محتاج لوگوں کو مال عطاء فرماتے اور باہر سے آنے والے مہمانوں خصوصا رات کو پہنچنے والوں کی مہمان نوازی اور دشمن کے مقابل لشکر کی تیاری میں اور اس قسم کے نیکی کے کاموں میں آپ مال خرچ کر دیا کرتے تھے خود پھر

حالت فقر میں آجاتے " وهكذا كان خلق صاحبيه بل اكثر اصحابه " اسی طرح آپ کے یار حضرت ابوبکر اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما کا طریقہ بھی تھا بلکہ آپ کے اکثر صحابہ کرام اسی طریقہ پر عمل کرتے تھے:

" كما ثبت في الصحيح عن ابی هريرة خرج رسول الله ﷺ من الدنيا ولم يشبع من خبز الشعير "

جس طرح صحیح بخاری شریف میں ہے کہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ دنیا سے تشریف لے گئے لیکن آپ نے سیر ہو کر جو کی روٹی بھی نہیں کھائی۔

" وعن عائشة ما شبع آل محمد ﷺ مذ قدم المدينة من طعام ثلاث ليال تباعا حتى قبض وتوفي ﷺ ودرعه مرهونة على شعير استدانة لاهله "

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں نبی کریم ﷺ جب سے مدینہ طیبہ میں تشریف لائے آپ نے اور آپ کے اہل وعیال نے تین دن مسلسل سیر ہو کر کھانا نہیں کھایا یہاں تک کہ اسی حال میں آپ دنیا سے تشریف لے گئے۔ بلکہ جب آپ کا وصال ہوا تو آپ کی زرہ رہن رکھی ہوئی تھی کیونکہ آپ نے اس رہن کی ضمانت پر اپنے اہل وعیال وغیرہ کے لئے جو قرض کے طور پر لئے ہوئے تھے۔

فوائد: حضرت ابوبکر اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما رب تعالیٰ کی طاعت میں رہتے اور عبادات میں مشغولیت کی وجہ سے اور مال کو اللہ کی راہ میں خرچ کر دینے کی وجہ سے خود بھوک میں مبتلاء ہو گئے۔

ان دونوں حضرات کا گھر سے نکلنا بے صبری کی وجہ سے نہیں تھا بلکہ عبادت میں ضعف کی وجہ سے کمی آرہی تھی صرف اس خیال سے نکلے تھے کہ کوئی دوست کھانا کھلا دے تاکہ عبادت دل جمعی سے ادا کی جائے۔

مسئلہ یہی ہے کہ اگر پیشاب، پاخانہ کی شدید حاجت ہو تو فارغ ہو کر نماز ادا کرے تاکہ نماز میں اضطراب نہ ہو اسی طرح اگر بھوک غالب ہو جو نماز میں خلل انداز ہو تو کھانا پہلے کھائے اور نماز بعد میں ادا کرے۔

نبی کریم ﷺ کا یہ ارشاد کہ قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے مجھے بھی اسی چیز نے گھر سے نکالا ہے جس نے تمہیں نکالا ہے۔ اسی سے یہ واضح ہو گیا۔

" فيه جواز ذكر الانسان ماينالہ من الم ونحوه لا علی سبیل التشکی وعدم الرضا بل للتسلية والتصبر کفعلہ ﷺ هنا "

کہ انسان کے لئے یہ جائز ہے کہ وہ اپنے درد، تکلیف کو ذکر کرے، اس ذکر کرنے میں بے صبری اور ناراضگی نہ پائی جائے بلکہ دل کو تسلی دینا اور صبر کرنا مقصود ہو جیسا کہ نبی کریم ﷺ نے اس مقام میں ذکر فرمایا۔

انصاری کی زوجہ نے نبی کریم ﷺ اور آپ کے ساتھیوں کو " مرحبا واهلا " کہا اس سے واضح ہو گیا کہ مہمانوں کے آنے پر ان کا خوشدلی سے استقبال کرنا اور ان کو خوش آمدید کہنا مستحب ہے۔ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے " من کان یؤمن باللہ والیوم الآخر فلیکرم ضیفه " جو شخص اللہ تعالیٰ اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتا ہو اسے چاہئے کہ وہ مہمان کی عزت کرے۔

انصاری صحابی نے نبی کریم ﷺ اور آپکے ساتھیوں کو دیکھ کر خوشی سے " الحمد لله " کہا اس سے واضح ہوا " استحباب اظهار البشر والفرح بالضيف في وجهه وحمد الله تعالى وهو يسمع " مہمان کی آمد پر اس کے سامنے خوشی کا اظہار کرنا مستحب ہے اور " الحمد لله " کہنا مستحب ہے جب کہ وہ مہمان سن بھی رہا ہو۔ اصل وجہ یہی ہے کہ مہمان کی عزت کرنے کا حکم خود نبی کریم ﷺ نے دیا۔ صحابی نے پہلے کھجوریں پیش کیں " وفيه دليل على استحباب تقديم اكل الفاكهة على الخبز واللحم وغيرهما " اور اس میں یہ دلیل پائی گئی ہے کہ مستحب ہے کہ پھل، روٹی اور گوشت وغیرہ سے پہلے پیش کرنا مستحب ہے۔

اسی طرح مستحب یہ ہے کہ جب معلوم ہو کہ مہمان کو ضرورت درپیش ہے کہ اسے کھانے اور پینے کی کوئی چیز جلدی دی جائے تو جو چیز بھی میسر ہو وہی پیش کر دی جائے۔

اور حدیث پاک سے یہ فائدہ حاصل ہوا کہ دودھ والے جانور کو بلا ضرورت اور بغیر کسی عذر کے ذبح نہ کیا جائے تا کہ اس سے جو دودھ حاصل ہو رہا ہے اس سے محروم نہ ہو جائے۔

نبی کریم ﷺ اور آپ کے ساتھیوں نے کھانا سیر ہو کر کھایا:

" فيه دليل على جواز الشبع وما جاء في كراهة الشبع فمحمول على

المداومة علیه لانه یقسی القلب وینسی امر المحتاجین"

اس میں یہ دلیل پائی گئی ہے کہ سیر ہو کر کھانا جائز ہے ہاں البتہ ہمیشہ ہی سیر ہو کر کھانے کی عادت بنانا مکروہ ہے کیونکہ اس سے دل میں قساوت (سختی) پیدا ہوتی ہے اور محتاج لوگوں کا خیال دل میں نہیں آتا۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ تم سے ان نعمتوں کا سوال کیا جائے گا اس کا مطلب یہ ہے "**المراد السوال عن القیام بحق شکرہ**" کہ یہ سوال کیا جائے گا کہ کیا تم نے میری نعمتوں کا شکریہ ادا کیا ہے۔

لیکن یہ خیال رہے کہ یہ ارشاد گرامی امت کی تعلیم کیلئے تھا اور نہ یہ ممکن ہی نہیں کہ ایسے جلیل القدر حضرات رب تعالیٰ کی نعمتوں کا شکریہ ادا نہ کریں اسی وجہ سے قاضی عیاض رحمہ اللہ نے بیان فرمایا:

"والذی نعتقدہ ان السوال ھنا سوال تعداد النعم واعلام بالامتنان بھا واظھار الکرامة باسباغھا لا سوال توبیخ وتقریع ومحاسبة واللہ اعلم"

اس میں ہمارا عقیدہ یہ ہے کہ سوال ان دونوں صاحبوں سے اپنی متعدد نعمتوں اور کامل احسان کرنے کے متعلق علم عطا کرنے اور کامل کرامت کو ظاہر کرنے کے لئے ہوگا اس میں ان کو توبیخ (ڈانٹ وغیرہ) اور کسی قسم کا محاسبہ کرنا مقصود نہیں ہوگا۔ (از نووی)

☆ "**عن ابن عمر ان رسول اللہ ﷺ سمع رجلا یتجشا فقال اقصر من جشاء ک فان اطول الناس جوعا یوم القیامة اطولھم شبعا فی الدنیا**"

(رواہ فی شرح السنة وروی الترمذی نحوہ، مشکوٰۃ کتاب الرقاق)

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں بیشک رسول اللہ ﷺ نے ایک شخص کو ڈکار مارتے ہوئے سنا تو آپ نے فرمایا تھوڑے ڈکار مارو جو شخص دنیا میں زیادہ بھوکا رہے گا قیامت کے دن وہ دنیا میں سیر ہو کر کھانے والوں میں سے زیادہ شان والا ہوگا۔

اس حدیث پاک سے واضح ہوا کہ سیر ہو کر کھانا تو جائز ہے لیکن ہمیشہ سیر ہو کر کھانے کی عادت نہ بنائے اور حد سے زیادہ نہ کھائے جس سے ڈکار آتے رہیں۔

☆ "**عن ابی طلحة قال شکونا الی رسول اللہ ﷺ الجوع فرفعنا عن بطوننا عن حجر حجر فرفع رسول اللہ ﷺ عن بطنہ عن حجرین، رواہ الترمذی وقال ھذا حدیث غریب**" (مشکوٰۃ باب فضل الفقر)

حضرت ابوطلحہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں ہم نے رسول اللہ ﷺ سے بھوک کی شکایت کی اور اپنے پیٹوں پر ایک ایک پتھر بندھا ہوا دکھایا تو رسول اللہ ﷺ نے ہمیں اپنے پیٹ پر دو پتھر بندھے ہوئے دکھائے۔

کتنا شدید امتحان تھا نبی کریم ﷺ کا اور آپ کے صحابہ کرام کا سبحان اللہ اتنے بڑے امتحان میں کامیاب ہونا بھی ان عظیم ہستیوں کا کام ہی تھا۔

پتھر باندھنے کی ایک حکمت تو راقم کو یہ سمجھ آتی ہے کہ جب پیٹ خالی ہو تو ہوا کی گردش سے اضطرابی کیفیت زیادہ ہوتی ہے اور جب اوپر سے پتھر وغیرہ رکھ کر دبا دیا جائے تو سکون ملتا ہے۔

اور وجہ علامہ علی قاری رحمہ اللہ نے اسی حدیث کے تحت مرقاۃ میں بیان فرمائی۔

" من اشتد جوعه وخمص بطنه ان يشتد على بطنه حجرا ليتقوم به صلبه "

صحابہ کرام کی عادت یہ تھی کہ جس شخص کو بہت شدید بھوک میں مبتلاء ہونا پڑتا اور خالی پیٹ ہوتا وہ پیٹ پر پتھر باندھ لیتا تاکہ اس کی پیٹھ سیدھی رہے۔

وَنَقْصٍ مِّنَ الْاَمْوَالِ وَالْاَنْفُسِ وَالثَّمَرَاتِ :

''اور کمی کر کے مالوں اور جانوں اور پھلوں میں''۔

مالوں میں کمی سے آزمانے سے مراد " هلاک المواشی " مویشیوں کو ہلاک کر کے مومنوں کو آزمایا جائے کہ وہ اس آزمائش میں پورے اترتے ہیں یا نہیں۔ (از روح المعانی)

" ﴿ وَنَقْصٍ مِّنَ الْاَمْوَالِ ﴾ بسبب الاشتغال بقتال الکفار وقیل الجوائح المتلفة "

(قرطبی)

مالوں میں کمی کر کے آزمانے کا ایک مطلب یہ بھی ہے کہ کفار سے جہاد میں مشغول ہونے کی وجہ سے ان کے مالوں میں کمی واقع ہوگی۔ اسی طرح آفات و بلیات کی وجہ سے مالوں میں کمی آجائے۔

اس صورت میں مال سے مراد عام ہے خواہ مویشی ہوں یا سونا، چاندی، روپے وغیرہ میں کمی کر کے آزمایا جائے۔ امام شافعی رحمہ اللہ نے فرمایا " والنقص من الاموال الزکوات والصدقات " کہ مال کی کمی سے مراد زکواۃ اور صدقات سے آزمانا یعنی اگرچہ زکوۃ وصدقات مال میں خیر و برکت کا ذریعہ ہیں لیکن انسان کو بظاہر مال میں کمی نظر آتی ہے اس لئے رب تعالیٰ نے فرمایا کہ ہم تمہیں زکوۃ

فرض کر کے اور صدقات واجبہ سے آزمائیں گے کیا تم اس میں کامیابی حاصل کرتے ہو اور صبر واستقلال سے اس پر عمل کرتے ہو یا نہیں۔ (از روح المعانی)

جانوں میں کمی: " وقد يكون النقص في النفس بموت بعض الاخوان والاقارب " یعنی تمہارے بعض بھائیوں اور رشتہ داروں کو فوت کر کے تمہیں آزمائیں گے کہ تم صبر کرتے ہو یا نہیں۔

یہاں " ونقص من (الانفس) " کا استعمال ایسے ہی ہے جیسا کہ ﴿ وَلَا تَقْتُلُوْا اَنْفُسَكُمْ ﴾ کا ہے جس کا ظاہری معنی ہے تم اپنے آپ کو قتل نہ کرو لیکن مراد یہ ہے کہ تم اپنے بھائیوں کو قتل نہ کرو اسی طرح یہاں بھی مراد ہے کہ تمہارے بھائیوں اور رشتہ داروں کی جانوں میں کمی کر کے تمہیں آزمائیں گے۔ (کبیر)

وَالْاَنْفُسِ : " قال ابن عباس بالقتل والموت في الجهاد " حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا جانوں سے آزمانے کا مطلب یہ ہے کہ جہاد میں تمہیں موت (طبعی طور پر آنے والی) یا شہید کر کے آزمایا جائے گا کہ تم اپنی موت کے آثار دیکھ کر یا آثار شہادت دیکھ کر کتنا صبر کرتے ہو؟ (از قرطبی)

امام شافعی رحمہ اللہ فرماتے ہیں " ونقص من ﴿ اَلْاَنْفُسِ ﴾ " کا مطلب ہے " ونقص من ﴿ اَلْاَنْفُسِ ﴾ بالامراض " کہ ہم تمہیں بیمار کر کے جسمانی طور پر کمزور کر کے آزمائیں گے کہ تم اس میں کتنا صبر کرتے ہو۔ (روح المعانی ۲)

وَالثَّمَرَاتِ : ''اور پھلوں میں کمی سے'' اس سے مراد یہ ہے:

" واما نقص من الثمرات فقد يكون بالجدب وقد يكون بترك عمارة الضياع للاشتغال بجهاد الاعداء "

کبھی خشک سالی کی وجہ سے پھلوں میں کمی کر کے آزمایا جاتا ہے اور کبھی دشمنوں کے ساتھ جہاد کرنے کا حکم دے کر جہاد میں مشغول رکھ کر کھیتی باڑی اور باغات میں کام نہ کر سکنے کی وجہ سے پھلوں میں کمی کر کے آزمایا جاتا ہے کہ اس میں پورے اترتے ہیں یا نہیں۔ (کبیر)

" ومن نقص ﴿ اَلثَّمَرَاتِ ﴾ تلفها بالجوائح " اور پھلوں میں کمی کرنے کا یہ مطلب بھی ہے کہ آفات وبلیات سے ان میں کمی کر دی جائے جیسا کہ کثیر بارشوں، آندھیوں، ژالہ باری، گرم لو کی

وجہ سے پھلوں میں نقصان پیدا کر دیا جائے اسی طرح کیڑے مکوڑے کچے پھلوں کو کھا جائیں یہ سب آفات وبلیات ہیں۔ (از روح المعانی)

امام شافعی رحمہ اللہ فرماتے ہیں " ومن (الثمرات) موت الاولاد واطلاق الثمرة على الولد مجاز مشهور " ثمرات میں کمی کر کے آزمانے کا یہ مطلب بھی ہے کہ تمہاری اولاد کو فوت کر کے تمہیں آزمایا جائے گا ثمرہ کا معنی ولد (بچہ، بچی) لینا بہت مشہور ہے یہ مجازی معنی ہے کیونکہ ثمرہ (پھل) سے فائدہ حاصل ہوتا ہے اولاد سے بھی فائدہ حاصل ہوتا ہے اس لئے ثمرات کا اطلاق اولاد پر ہے اسی معنی کی مناسبت سے کہا جاتا ہے " ثمرة العلم العمل " علم کا ثمرہ عمل ہے یعنی علم کے اوپر مرتب ہونے والا نفع عمل ہے۔ اس مجازی معنی پر ترمذی شریف کی حدیث شاہد ہے جو حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے اور حدیث حسن ہے نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

" اذا مات ولد العبد قال الله تعالیٰ للملائكة " اقبضتم ولد عبدی ؟ فيقولون : نعم ، فيقول ، اقبضتم ثمرة قلبه ؟ فيقولون : نعم ، فيقول الله تعالیٰ : ماذا قال عبدی ؟ فيقولون : حمدک واسترجع ، فيقول الله تعالیٰ ، ابنوا لعبدی بيتا فی الجنة وسموه بيت الحمد "

جب کسی بندے کا بچہ یا بچی فوت ہو جائے تو اللہ تعالیٰ فرشتوں کو کہتا ہے کیا تم نے میرے بندے کے ولد (بچہ، بچی) کی روح کو قبض کر لیا ہے؟ فرشتے کہتے ہیں ہاں (اے اللہ) رب تعالیٰ فرماتا ہے کیا تم نے اس کے دل کے ثمرہ کو قبض کر لیا ہے؟ وہ کہتے ہیں ہاں تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے میرے بندے نے کیا کہا؟ فرشتے کہتے ہیں اس نے " اَلْحَمْدُلِلّٰه " پڑھا اور " اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّا اِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ " پڑھا تو رب تعالیٰ فرماتا ہے میرے اس بندے کے لئے جنت میں گھر بنا دو اور اس کا نام ' بیت الحمد ' رکھ دو۔

اس حدیث پاک سے واضح ہوا کہ ثمرہ کا اطلاق ولد پر مجازی طور پر عام اور مشہور ہے۔

اعتراض: اگر چہ یہ آیۂ کریمہ روزے اور زکوۃ کی فرضیت سے پہلے نازل ہوئی لیکن اللہ تعالیٰ کے خوف سے مومنوں کے دل پہلے ہی بھرے ہوئے تھے پھر آزمانے کا مفہوم سمجھ نہیں آتا۔ اسی طرح امراض اور اولاد کی موت تو پہلے سے واقع ہو رہی تھیں پھر آزمانے کا وعدہ کیسے صحیح ہو سکتا ہے؟ اسی طرح ' زکوٰۃ ' کا معنی ہی جب بڑھنا اور زیادتی ہے تو اس پر مال کی کمی سے آزمانے کا کیا مطلب؟

جواب : یہ بات قابل تسلیم ہے کہ مومنوں کے دل پہلے سے ہی اللہ تعالیٰ کے خوف سے بھرپور تھے لیکن " لاینافی ابتلاء هم فی الاستقبال بخوف آخر ، فان الخوف یتضاعف بنزول الآیات " یہ مستقبل میں اور خوف لاحق کر کے آزمانے کے منافی نہیں کیونکہ مومنوں کا خوف آیات کے نازل ہونے سے بڑھتا ہی رہا۔

" و کذا الامراض وموت الأولاد امور متجددة یصح الابتلاء بها فی الآتی من الازمان "

اور اسی طرح امراض اور اولاد کی موت اگرچہ پہلے سے آرہی تھیں لیکن آنے والے زمانہ میں ان سے آزمائش کو جاری رکھنے کے ارشاد سے اور زیادہ خوف لاحق ہوتا ہے اس حال میں صبر کرنے سے کامیابی حاصل ہوتی ہے اور صبر نہ کرنے کی وجہ سے ناکامی حاصل ہوتی ہے۔

" والتعبیر عن الزکوة بالنقص لکونها نقصا صورة وان کانت زیادة معنی فعند الابتلاء سماها نقصا وعند الامر بالاداء سماها زکوة لیسهل اداؤها "

زکوۃ کو مال کی کمی سے تعبیر کرنے کا مقصد یہ ہے کہ انسان ظاہر طور پر یہ سمجھتا ہے کہ زکوٰۃ ادا کرنے سے میرا مال کم ہو جائے گا حالانکہ زکواۃ کا معنی بھی بڑھنا ہے اور برکت سے مال بھی بڑھتا ہے۔ اس لئے آزمائش کے وقت زکوۃ کو نقص مال سے تعبیر کر دیا گیا اور زکواۃ ادا کرنے کا جو حکم دیا گیا اس میں زکواۃ کا معنی بڑھنا ہی لیا جائے گا تاکہ زکوۃ ادا کرنا آسان ہو۔ (از روح المعانی)

سبحان اللہ قرآن پاک کی کیا ہی عظمت ہے کہ ایک ایک لفظ کتنے کتنے معانی پر مشتمل ہے۔

آزمائش کا مقصد: " والابتلاء من اللہ لاظهار المطیع من المعاصی لا لیعلم شیئا مما لم یکن عالما به " (معالم التنزیل)

اللہ تعالیٰ کی طرف سے آزمائش کا مطلب یہ ہے کہ رب تعالیٰ کی اطاعت کرنے والا اور نافرمان ایک دوسرے سے ممتاز ہو جائیں نیک لوگ اور گنہگار لوگ ایک دوسرے سے علیحدہ علیحدہ ہو جائیں۔ دراصل لوگوں پر یہ فرق ظاہر کرنا مقصود ہے یہ مقصد نہیں کہ اللہ تعالیٰ کو پہلے علم حاصل نہیں ہوتا تو وہ آزمائش کر کے علم حاصل کرتا ہے۔

وَبَشِّرِ الصَّابِرِيْنَ : ''اور بشارت دو صبر کرنے والوں کو'' **علی البلاء بالجنة** ''یعنی اللہ تعالیٰ جب اپنے بندوں کو آزمائش میں مبتلاء کرے تو وہ اس پر پورے اتریں تو ان کو جنت کی بشارت دے دو۔ (جلالین)

''بشر'' میں خطاب کسے ہے؟ **خطاب للنبی ﷺ اولکل من تتأتی منه البشارة** '' یہ خطاب نبی کریم ﷺ کو ہے کہ آپ صبر کرنے والوں کو بشارت دے دیں۔ یا ہر اس شخص کو ہے جس سے بھی بشارت دینے کی توقع ہو سکتی ہے۔ (روح المعانی)

راقم کے نزدیک پہلے خطاب تو نبی کریم ﷺ کو ہی ہے لیکن اس کے بعد '' **العلماء ورثة الانبیاء** '' علماء انبیاء کرام کے وارث ہیں۔ کے مطابق یہ خطاب علماء کرام کو ہے اس سے یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ علماء کرام جب انبیاء کرام کے بشیر ہونے کے وارث ہیں تو نذیر ہونے کے بھی وارث ہیں نیک لوگوں کو خوشخبری بھی دیں اور گنہگاروں کو ڈرائیں بھی صرف ایک رخ اختیار نہ کیا جائے۔

علامہ قرطبی رحمہ اللہ نے فرمایا ﴿وَبَشِّرِ الصَّابِرِيْنَ﴾ **ای بالثواب علی الصبر** '' صبر کرنے والوں کو ثواب کی بشارت دے دو '' **وثوابه غیر مقدر** '' ثواب کی کوئی حد ذکر نہیں فرمائی اس لئے کہ عطاء کرنے والا کریم ہے وہ اپنی شان کریمی کے مطابق بے حد و بے حساب ثواب عطاء فرماتا ہے۔

ہاں یہ بھی خیال رہے کہ صبر وہ ہے جو پہلے پہلے صدمہ پہنچے تو انسان صبر کرے پہلے تو جزع وفزع کرتا رہے پھر صبر کرنے کا کیا فائدہ کچھ دیر کے بعد تو بڑی سے بڑی مصیبتیں برداشت کر لی جاتی ہیں۔ اسی پر بخاری شریف کی حدیث جو حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے دلالت کر رہی ہے نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا '' **انما الصبر عند الصدمة الاولی** '' بیشک صبر وہی معتبر ہے جو پہلے صدمہ کے وقت حاصل ہو۔ حدیث شریف کا مطلب یہ ہے '' **انما الصبر الشاق علی النفس الذی یعظم الثواب علیه انما هو عند هجوم المصیبة وحرارتها** '' بیشک صبر کرنا نفس کیلئے مشقت آمیز کام ہے اسی لئے اس پر عظیم ثواب حاصل ہوتا ہے لیکن یہ وہی صبر معتبر ہوگا جو مصیبت کے ہجوم کے وقت کیا جائے جب وہ مصیبت بے قرار کر رہی ہو دل میں حرارت پائی جائے۔ کیونکہ اس وقت صبر کرنا انسان کی قوت قلب پر دلالت کرتا ہے اور صبر کرنے میں اسکی ثابت قدمی پر دلالت کرتا ہے '' **واما اذا بردت حرارة المصیبة فکل احد یصیر اذ ذاک** '' جب مصیبت کی حرارت ٹھنڈی پڑ جائے تو

ہر ایک شخص اس وقت صبر کر لیتا ہے۔ (قرطبی)

غیر ممکن صبر کا حکم نہیں: قفال رحمہ اللہ نے بیان فرمایا:

" لیس الصبر ان لا یجد الانسان الم المکروہ ولا ان لا یکرہ ذلک لان ذلک غیر ممکن "

صبر اس چیز کا نام نہیں کہ انسان کو کسی تکلیف اور مصیبت پر درد بھی لاحق نہ ہو یا انسان تکلیف کو تکلیف ہی نہ سمجھے کیونکہ ایسا صبر انسان کے لئے ناممکن ہے۔

" انما الصبر ھو حمل النفس علي ترک اظھار الجزع فاذا کظم الحزن و کف النفس عن ابراز آثارہ کان صاحبہ صابرا وان ظھر دمع عین او تغیر لون "

صبر یہ ہے کہ انسان مصیبت کو برداشت کرے جزع وفزع نہ کرے، غم کو برداشت کر لے اور اپنے نفس کو اس کے ظاہر کرنے سے روک کر رکھے جو شخص اس پر عمل کر لے گا وہ صابر کہلائے گا اگر چہ اس کی آنکھوں سے آنسو جاری ہوں یا اس کا رنگ زرد پڑ جائے۔ (کبیر)

اَلَّذِیْنَ اِذَآ اَصَابَتْهُمْ مُّصِیْبَةٌ قَالُوْٓا اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَیْهِ رٰجِعُوْنَ :

'' وہ لوگ جب پہنچے ان کو مصیبت تو کہیں بیشک ہم اللہ کے لئے ہیں اور بیشک ہم اسی کی طرف لوٹنے والے ہیں۔

طلباء کرام کی توجہ کے لئے: جلالین میں " الذین " سے پہلے " ھم " نکالا گیا ہے یعنی خبر ہے مبتداء محذوف کی اور اس میں ترکیب یہ ہے کہ یہ تمام جملہ مقام مدح میں منصوب ہو۔ ایک اور ترکیب یہ ہے کہ "اولئک " اس کی خبر محذوف ہو جو مقدم ہو اور یہ جملہ مبتدا ہو۔

" وقیل ان الذین نعت للصابرین وھو احسنھا " اور یہ بیان کیا گیا ہے کہ " الذین " والا جملہ صفت ہے " صابرین " کی یعنی مجرور محلا ہے یہی ترکیب سب سے بہتر ہے (از صاوی)

اعلیٰ حضرت کا ترجمہ اسی ترکیب کے مطابق ہے اور راقم نے اپنا ترجمہ گول مول کر دیا ہے تا کہ جس ترکیب پر آپ محمول کرنا چاہیں کر سکیں۔

"مصیبة" اصل میں "مصوبة" ہے اس کی جمع "مصائب" ہے وہ بھی اصل میں "مصاوب" ہے "المصیبة کل ما یؤذی المؤمن ویصیبه" مصیبت ہر اس چیز کو کہا جاتا ہے جو مؤمن کو ایذاء پہنچائے۔ (از قرطبی)

مصیبت عام ہے جس سے انسان کو تکلیف ہو خواہ اس تکلیف کا تعلق نفس سے ہو یا مال سے ہو، یا اہل سے ہو خواہ وہ تکلیف تھوڑی ہو یا زیادہ چھوٹی ہو یا بڑی۔ (از روح المعانی)

اللہ تعالیٰ نے مصیبت کو اپنی طرف منسوب نہیں فرمایا کہ میری طرف سے جب ان کو مصیبت پہنچے بلکہ عام مصیبت کا ذکر کیا:

"فالظاهر انه یدخل تحتها کل مضرة ینالها من قبل الله تعالی وینالها من قبل العباد"

ظاہر بات یہ ہے کہ مصیبت سے مراد ہر وہ چیز ہے جو ضرر پہنچائے خواہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے پہنچے یا بندوں کی طرف سے پہنچے۔

دونوں صورتوں میں انسان کو تکلیف ہوتی ہے انسان کو جو تکلیف اللہ تعالیٰ کی طرف سے پہنچے "یجب ان یعتقد فیه انه حکمة وصواب وعدل وخیر وصلاح وان الواجب علیه الرضا به وترک الجزع" تو اس پر واجب ہو جاتا ہے کہ وہ اس میں عقیدہ یہ رکھے کہ بیشک اس میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے حکمت پائی گئی ہے اور رب تعالیٰ کا میرے حق میں یہ فیصلہ درست ہے اور انصاف پر مبنی ہے رب تعالیٰ کا ہر کام خیر اور صلاح پر مبنی ہے لہٰذا بندے کے لئے ضروری ہے کہ وہ اس پر رضامندی کا اظہار کرے اور جزع وفزع نہ کرے۔ اس لئے کہ جب انسان "انا لله" کہہ رہا ہے تو عبودیت کا اقرار کر رہا ہے تمام امور اللہ تعالیٰ کے سپرد کر رہا ہے تو اب اس پر ضروری ہو چکا ہے وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے آزمائش کے فیصلہ میں رضامندی کا اظہار کرے اور اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کے مطابق ﴿ وَاللّٰهُ يَقْضِىْ بِالْحَقِّ ﴾ "اور اللہ تعالیٰ حق فیصلہ فرماتا ہے" ایمان رکھے کہ رب تعالیٰ کا کوئی فیصلہ ناحق نہیں ہوتا۔ اگر کوئی تکلیف اللہ تعالیٰ کے غیر یعنی بندوں کی طرف سے آئے تو اسے بھی رب تعالیٰ کی طرف سے ہی سمجھے غیظ وغضب کی صورت میں برداشت سے کام لے یہ بھی "انا لله" میں

داخل ہے کیونکہ تمام امور درحقیقت اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہی حاصل ہوتے ہیں۔جس تکلیف کے حاصل ہونے میں کسی بندے کا دخل نہ ہو جیسے مریض ہونا اور کسی عزیز وقریبی رشتہ دار کا فوت ہو جانا وغیرہ اس کے متعلق انسان یہ کہے "انا للّٰہ یدبر فینا کیف یشاء" بیشک ہم اللہ تعالیٰ کے لئے ہیں وہی ہم میں جیسے چاہے تدبیر فرماتا ہے۔اور وہ تکلیف جو بظاہر بندوں کی طرف سے حاصل ہے اس کے متعلق یہ کہے "انا للّٰہ ینتصف لنا کیف یشاء" بیشک ہم اللہ تعالیٰ کے لئے ہیں وہ جیسے چاہے ہم میں انصاف کرے۔

"اِنَّا لِلّٰہِ" کہہ کر ہم یہ اقرار کرتے ہیں کہ بادشاہی صرف رب تعالیٰ کی ہے اور "اِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ" کہہ کر ہم یہ تسلیم کرتے ہیں کہ ہم نے فوت ہونا ہے اور رب تعالیٰ کے حضور حاضر ہونا ہے۔

جب انسان کو یہ دونوں چیزوں کا علم ہو تو یقیناً وہ کامل طور پر صبر کر سکے گا اللہ تعالیٰ کے ہر فیصلہ پر صابر وشاکر رہے گا اور اسے ثواب اور عذاب حاصل ہونے کا بھی یقین ہو جائے گا۔یعنی اسی سے قیامت پر یقین حاصل ہو جاتا ہے اور انسان کو جب اس چیز کا یقین ہو جائے کہ اللہ تعالیٰ نے صبر کرنے والوں کو اچھی جزاء عطا کرنی ہے کیونکہ "ولا یضیع عندہ اجر المحسنین" اس کے ہاں اچھا کام کرنے والوں کا اجر ضائع نہیں ہوتا تو یقیناً انسان کامل طور پر صبر کرے گا۔ (ماخوذ از کبیر)

استرجاع پر احادیث مبارکہ: استرجاع کا مطلب ہے "اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ" پڑھنا چھوٹی مصیبت ہو یا بڑی یہ کلمات مبارکہ پڑھے خواہ کانٹا چبھ جائے، یا مچھر کاٹ جائے یا تسمہ ٹوٹ جائے یا چراغ بجھ جائے۔ (روح المعانی)

☆ انقطع نعال النبی ﷺ فاسترجع فقالوا مصیبۃ یا رسول اللہ فقال رسول اللہ ﷺ ما اصاب المومن مما یکرہ فھو مصیبۃ"

(رواہ الطبرانی فی الکبیر من حدیث ابی امامۃ ولہ شواھد مرفوعۃ وموقوفۃ)

نبی کریم ﷺ نے نعلین کے ٹوٹنے پر "اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن" پڑھا۔صحابہ کرام نے عرض کیا یا رسول اللہ کیا یہ بھی مصیبت ہے؟ تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا مومن کو جو چیز بھی ناپسند پہنچے وہ اس کے لئے مصیبت ہی ہے۔

☆ " عن ابی هریرة قال قال رسول اللہ ﷺ اذا انقطع شسع احد کم فلیسترجع فانه المصاب "

(رواہ البیهقی فی شعب الایمان)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جب تم میں سے کسی ایک کے جوتے کا تسمہ ٹوٹ جائے تو وہ " اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّا اِلَيْهِ رَاجِعُوْن " پڑھے کیونکہ یہ بھی مصیبت ہے

☆ " وفی الحدیث من استرجع عند المصیبة خیر اللہ مصیبته واحسن عقباہ وجعل له خلفا صالحا یرضاہ "

حدیث شریف میں ہے جس نے مصیبت کے وقت " اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّا اِلَيْهِ رَاجِعُوْن " پڑھا اللہ تعالیٰ اس کی مصیبت کو خیر بنادے گا اور اس کا انجام اچھا کردے گا اور اس کے پیچھے اسے بہتری عطا کردے گا جسے وہ پسند کرے گا۔ (از مظهری)

☆ " قال ابو سنانٗ دفنت ابنی سنان وابو طلحة الخولانی علی شفیر القبر ، فلما اردت الخروج اخذ بیدی فانشطنی وقال الا ابشرک یا ابا سنان حدثنی الضحاک عن ابی موسیٰ ان النبی ﷺ قال اذا مات ولد العبد قال اللہ لملائکته اقبضتم ولد عبدی فیقولون نعم فیقول اقبضتم ثمرة فوادہ فیقولون نعم فیقول فما ذا قال عبدی فیقولون حمدک واسترجع فیقول اللہ تعالیٰ ابنوا لعبدی بیتا فی الجنة وسموہ بیت الحمد "

حضرت ابو سنان رحمہ اللہ فرماتے ہیں میں نے اپنے بیٹے سنان کو جب دفن کیا (یعنی قبر کی لحد میں اتار کر پتھر رکھ لئے) تو مجھے ضحاک نے حدیث بیان فرمائی کہ حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ نے فرمایا بیشک نبی کریم ﷺ نے فرمایا جب کسی بندے کی اولاد میں سے کوئی فوت ہو جائے تو اللہ تعالیٰ اپنے فرشتوں کو کہتا ہے کیا تم نے میرے بندے کے ولد (بچہ ، بچی) کی روح کو قبض کرلیا ہے۔ وہ کہتے ہیں ہاں (اے اللہ) پھر اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کیا تم نے اس کے دل کے ثمرہ کو قبض کرلیا؟ فرشتے کہتے ہیں ہاں (اے اللہ) تو رب تعالیٰ فرماتا ہے پھر میرے بندے نے کیا کہا؟ وہ کہتے ہیں اس نے " اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ" پڑھا اور " اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّا اِلَيْهِ رَاجِعُوْن " پڑھا۔ تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے میرے اس بندے کے لئے جنت میں ایک مقام بنادو اور اس کا نام بیت الحمد رکھ دو۔ (قرطبی)

تنبیہ : یہی حدیث پہلے ایک اور مسئلہ بیان کرنے کے لئے ذکر کی یہاں اور مسئلہ بیان کیا گیا ہے

احادیث کی کتب کا مطالعہ کرنے والے جانتے ہیں ایک ایک حدیث کئی جگہ مختلف مسائل بیان کرنے کے لئے آتی ہے۔

☆ " عن ام سلمة قالت اتانی ابو سلمة یوما من عند رسول الله ﷺ فقال لقد سمعت من رسول الله ﷺ قولا سررت به قال ولا یصیب احدا من المسلمین مصیبة فیسترجع عند مصیبته ثم یقول اللهم اجرنی فی مصیبتی اخلف لی خیرا منها الا فعل ذلک به قالت ام سلمة فحفظت ذلک منه فلما توفی ابو سلمة استرجعت وقلت اللهم اجرنی فی مصیبتی واخلف خیرا منها ثم رجعت الی نفسی فقلت من این لی خیر من ابی سلمة ؟ فلما انقضت عدتی استاذن علی رسول الله ﷺ وانا ادبغ اهابالی فغسلت بیدی من القرظ واذنت له فوضعت له وسادة ادم حشوها لیف فقعد علیها فخطبنی الی نفسی ، فلما فرغ من مقالته قلت یا رسول الله مالی ان لا یکون بک الرغبة ولکنی امرأة فی غیرة شدیدة فاخاف ان تری منی شیأ یعذبنی الله به وانا امرأة قد دخلت فی السن وانا ذات عیال فقال اماما ذکرت من الغیرة فسوف یذهبها الله عزوجل عنک واما ما ذکرت من السن فقد اصابنی مثل الذی اصابک واما ما ذکرت من العیال فانما عیالک عیالی قالت فقد سلمت لرسول الله ﷺ فتزوجها رسول الله ﷺ فقالت ام سلمة بعد ابدلنی الله بابی سلمة خیر امنه رسول الله ﷺ " (مسند احمد)

حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں میرے پاس ایک دن ابوسلمہ (ان کے خاوند) رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوکر آئے تو انہوں نے کہا میں نے رسول اللہ ﷺ سے ایسا قول سنا جس سے میں خوش ہوگیا نبی کریم ﷺ نے فرمایا کسی ایک شخص کو مصیبت نہیں پہنچتی کہ وہ مصیبت کے وقت "اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن" پڑھے اوراس کے بعد یہ پڑھے "اللّٰھم اجرنی فی مصیبتی واخلف لی خیرا منھا" اے اللہ مجھے مصیبت میں اپنی حفاظت میں رکھ اوراس مصیبت کے بدلے مجھے بھلائی عطا فرما۔ مگر یہ کہ اللہ تعالیٰ اسے مصیبت کے بعد بھلائی عطا فرما دیتا ہے۔ ام سلمہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں میں نے رسول اللہ ﷺ کے ارشاد گرامی کو یاد کرلیا۔ جب ابوسلمہ رضی اللہ عنہ فوت ہو گئے تو میں نے "اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن" پڑھا پھر میں نے یہ پڑھا "اللھم اجرنی فی مصیبتی واخلف لی خیرا منھا" پھر میرے دل میں خیال آیا میں نے کہا ابوسلمہ سے میرے لئے اور بہتر کون

ہوگا؟ جب میری عدت ختم ہوئی رسول اللہ ﷺ (تشریف لائے اور آپ) نے مجھ سے (گھر میں داخل ہونے کی) اجازت طلب کی میں اس وقت چمڑا رنگ رہی تھی میں نے کیکر کی چھال والے ہاتھ دھوئے اور آپ کو اجازت دی (آپ تشریف لائے) میں نے آپ کے لئے چمڑے کا تکیہ رکھا جس میں کھجور کے پتے بھرے ہوئے تھے آپ تکیہ سے سہارا لگا کر بیٹھے تو آپ نے مجھے خطبہ کیا (یعنی اپنی ذات سے نکاح کرنے کے لئے مجھے ارشاد فرمایا) جب آپ اپنے کلام سے فارغ ہوئے تو میں نے عرض کیا یا رسول اللہ یہ بات تو نہیں کہ مجھے آپ کی طرف رغبت نہ ہو لیکن (میری مجبوریاں یہ ہیں) کہ میں غیرت والی عورت ہوں ہوسکتا ہے کہ (غیرت کی وجہ سے آپ کی دوسری ازواج سے کوئی ایسی ویسی بات ہوجائے) آپ مجھ میں کسی چیز کو دیکھ کر ناراض ہوجائیں تو رب تعالیٰ مجھے عذاب دے دے۔

(دوسری مجبوری یہ ہے کہ) میں عمر رسیدہ ہوں (مجھے نکاح کی خواہش نہیں)

(اور تیسری مجبوری یہ ہے) کہ میں عیال دار ہوں (میرے بچے بیکس ہوجائیں گے۔

آپ نے فرمایا ’’جو تم نے غیرت (دوسرے کو دیکھ کر جلنا، پریشان ہونا) کا ذکر کیا ہے اسے اللہ تعالیٰ لے جائے گا‘‘ (یعنی یہ کیفیت اللہ تعالیٰ کے فضل اور میری دعا اور میری زوجیت میں آنے کی برکت کی وجہ سے جاتی رہے گی) اور جو تم نے عمر کا ذکر کیا ہے میری بھی ایسی ہی عمر ہے جیسی تمہاری ہے اور جو تم نے بچوں کا ذکر کیا ہے بیشک تمہارے بچے میرے بچے ہیں (یعنی نکاح کی خواہش مجھے بھی نہیں میں بھی ایک بیوہ اور یتیم بچوں کی پرورش کرنا چاہتا ہوں)۔

حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں میں نے اپنے آپ کو رسول اللہ کے سپرد کردیا۔ ان کا نکاح رسول اللہ ﷺ سے ہوگیا اس کے بعد حضرت ام سلمہ کہتی ہیں کہ مجھے سمجھ آیا کہ واقعی اللہ تعالیٰ نے مجھے ابوسلمہ کے بدلے نے ان سے بہتر یعنی رسول اللہ ﷺ عطا کردیئے۔ (صابونی)

استرجاع دل سے پڑھے: ’’ولیس الصبر بالاسترجاع باللسان بل الصبر باللسان وبالقلب‘‘ صبر صرف زبان سے ’’اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّا اِلَیْهِ رَاجِعُوْن‘‘ پڑھنے کا نام نہیں بلکہ زبان اور دل سے جب پڑھے تو صبر اسے کہا جائے گا۔

استرجاع اس امت کا خاصہ ہے:

" فقد اخرج الطبرانی وابن مردویه عن ابن عباس رضی الله عنه قال قال النبی ﷺ ، اعطیت امتی شیا لم یعطه احد من الامم ان تقول عند المصیبة انا لله وانا الیه راجعون "

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا میری امت کو وہ چیز عطاء کی گئی جو پہلی امتوں میں سے کسی امت کو عطا نہیں ہوئی وہ یہ کہ مصیبت کے وقت میری امت یہ پڑھے "اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّا اِلَیْهِ رَاجِعُوْن "

" وفی روایة اعطیت هذه الامة عند المصیبة شیأ لم تعطه الانبیاء قبلهم انا لله وانا الیه راجعون ولو اعطیها الانبیاء قبلهم لاعطیها یعقوب اذ یقول یا اسفا علی یوسف "

اور ایک روایت میں یہ ہے کہ اس امت کو مصیبت کے وقت وہ چیز عطا کی گئی ہے جو ان سے پہلے انبیاء کرام کو بھی وہ عطا نہیں کی گئی ہے وہ چیز ہے " اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّا اِلَیْهِ رَاجِعُوْن " اگر یہ چیز پہلے انبیاء کرام کو حاصل ہوتی تو حضرت یعقوب علیہ السلام کو حاصل ہوتی جب آپ کہہ رہے تھے " یا اسفٰی علی یوسف "اے افسوس یوسف پر۔ (روح المعانی)

یعنی آپ کو اگر یہ کلمات عطا ہوتے تو آپ بھی یہ پڑھتے۔

☆ " واخرج الطبرانی عن ابن عباس قال قال رسول الله ﷺ ان للموت فزعا فاذا اتی احدکم وفاة اخیه فلیقل انا لله وانا الیه راجعون وانا الی ربنا لمنقلبون "(درمنشور)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا بیشک موت سے گھبراہٹ طاری ہوتی ہے جب بھی تم میں سے کسی ایک کے پاس اپنے بھائی کی موت کی خبر آئے تو وہ یہ پڑھے "انا لله وانا الیه راجعون وانا الی ربنا لمنقلبون " (طبرانی)

☆ " واخرج الدیلمی عن عائشة قالت اقبل رسول الله ﷺ وقد لدغته شوکة فی ابهامه فجعل یسترجع منها ویمسحها فلما سمعت استرجاعه دنوت منه فنظرت فاذا اثر حقیر فضحکت فقلت یا رسول الله بابی انت وامی اکل هذا الاسترجاع من اجل هذه

الشوكة فتبسم ثم ضرب على منكبي فقال يا عائشة ان الله عزوجل اذا اراد ان يجعل الصغير كبيرا جعله واذا اراد ان يجعل الكبير صغيرا جعله " (درمنثور)

دیلمی نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ذکر کی آپ فرماتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کو انگوٹھے میں کانٹا چبھ گیا تو آپ اسی ہاتھ سے ملنے لگے اور "اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن" پڑھنا شروع کیا جب میں نے آپ کو " اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن " پڑھتے ہوئے سنا تو آپ کے قریب گئی میں نے دیکھا کہ بہت معمولی سا اثر ہے تو میں ہنسنے لگی میں نے کہا یا رسول اللہ میرے ماں باپ آپ پر قربان کیا ہر چیز پر یعنی کانٹا چبھنے پر بھی " اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن " پڑھا جاتا ہے۔ تو آپ مسکرائے پھر میرے کندھے پر ہاتھ مارتے ہوئے ارشاد فرمایا اے عائشہ بیشک اللہ تعالیٰ جب چاہے چھوٹی چیز کو بڑا بنادے اور جب چاہے بڑی چیز کو چھوٹا بنادے۔ (مسند دیلمی، درمنثور)

یعنی انسان اگر کسی تکلیف کو چھوٹا سمجھ کر رب تعالیٰ کی طرف توجہ نہ کرے اور " اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن " نہ پڑھے تو ہوسکتا ہے وہی تکلیف بڑی ہوجائے اور اگر کسی بڑی تکلیف پر " اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن " پڑھ لے اور رب تعالیٰ کو یاد کرلے تو اس کی خیر و برکت سے وہ تکلیف دور ہوجائے۔

آنسو بہانے پر احادیث مبارکہ:

☆ " واخرج ابن سعد عن خيثمة قال لما جاء عبد الله بن مسعود نعي اخيه عتبة دمعت عيناه فقال ان هذه رحمة جعلها الله لا يملكها ابن آدم "

ابن سعد نے خثیمہ سے روایت بیان کی کہ جب حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے پاس ان کے بھائی عتبہ کی وفات کی خبر آئی تو ان کی آنکھوں سے آنسو جاری ہوگئے تو آپ نے فرمایا یہ رحمت ہے جو اللہ تعالیٰ نے انسان کے لئے بنائی ہے کیونکہ انسان اس پر قادر نہیں (کہ آنسو بھی روک سکے)۔ (درمنثور)

☆ " عن انس بن مالك قال قال رسول الله ﷺ ولدلي الليلة غلام فسميته باسم ابي ابراهيم عليه السلام ثم دفعه الى ام سيف امرأة قين يقال له ابو سيف فانطلق ياتيه واتبعته فانتهينا الى ابي سيف وهو ينفخ بكيره قد امتلأ البيت دخانا فاسرعت المشي بين يدي رسول الله ﷺ فقلت يا ابا سيف امسك جاء رسول الله ﷺ فامسك فدعا النبي ﷺ

بالصبی فضمه الیه وقال ما شاء الله ان یقول فقال انس لقد رأیته وهو یکید بنفسه بین یدی رسول الله ﷺ فدمعت عینا رسول الله ﷺ فقال تدمع العین ویحزن القلب ولانقول الا ما یرضی ربنا والله یا ابراهیم انا بک لمحزونون "(مسلم ج ۲ ص ۲۲۲ باب رحمته ﷺ الصبیان)

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا رات کو میرے بچے کا تولد ہوا میں نے اس کا نام اپنے باپ ابراہیم کے نام پر رکھا۔ پھر وہ آپ نے ام سیف کو (پرورش کے لئے) دے دیا جو ایک لوہار ابوسیف کی زوجہ تھی نبی کریم ﷺ بچے کو ملنے کے لئے چلے میں بھی آپ کے پیچھے چلا ہم ابوسیف کے گھر پہنچے تو وہ آگ کی بھٹی کو دھونکنی کے ذریعے ہوا دے کر بھڑکا رہا تھا گھر دھوئیں سے بھرا ہوا تھا۔ میں جلدی جلدی رسول اللہ ﷺ کے آگے آگے چلا۔ میں نے ابوسیف کو کہا اے ابوسیف رک جاؤ۔ رسول اللہ ﷺ تشریف لا رہے ہیں وہ رک گئے نبی کریم ﷺ تشریف لائے بچے کو طلب کیا سینے سے لگایا پھر آپ نے کچھ ارشاد فرمایا جو اللہ تعالیٰ کی مشیت میں تھا کہ آپ فرمائیں۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں میں نے دیکھا کہ نبی کریم ﷺ کے ہاتھوں میں ہی بچے کا سانس اکھڑنے لگا (نزع کا عالم طاری ہو گیا) نبی کریم ﷺ کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے آپ نے فرمایا آنکھوں سے آنسو جاری ہیں دل غمناک ہے لیکن ہم کوئی ایسی بات نہیں کرتے جو رب تعالیٰ کی رضاء کے خلاف ہو قسم ہے اللہ تعالیٰ کی اے ابراہیم ہم تیری وجہ سے غم زدہ ہیں۔

حدیث پاک سے واضح ہوا:

"جواز البکاء علی المریض والحزن وان ذلک لا یخالف الرضا بالقدر بل هی رحمة جعلها الله فی قلوب عباده وانما المذموم الندب والنیاحة والدعاء بالویل والثبور"

کہ مریض پر رونا جائز ہے اور غم کرنا جائز ہے یہ تقدیر پر رضا مندی کے خلاف نہیں بلکہ یہ رحمت ہے اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کے دلوں میں ڈال دی ہاں برا یہ ہے کہ واویلا کرنا، بال وغیرہ نوچنا، کسی کے لئے ہلاکت کی دعا کرنا۔ (نووی)

فائدہ جلیلہ : " واخرج الطبرانی عن جابر بن سمرة قال قال رسول الله ﷺ من

دفن ثلاثة فصبر علیهم واحتسب وجبت له الجنة فقالت ام ایمن واثنین قال واثنین قالت او واحد فسکت ثم قال وواحد "

طبرانی نے حضرت جابر بن سمرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس شخص نے تین (نابالغ بچے) دفن کئے پھر ان پر صبر کیا اور اللہ تعالیٰ کی رضاء پر شاکر رہا اس کے لئے جنت واجب ہے حضرت ام ایمن نے عرض کیا اور دو (یعنی دو بچے فوت ہو جائیں تو کیا حکم ہے) آپ نے فرمایا دو کا بھی یہی حکم ہے پھر انہوں نے پوچھا اگر ایک ہو تو؟ آپ ذرا خاموش رہے پھر آپ نے فرمایا ایک کا بھی یہی حکم ہے۔ (طبرانی، درمنثور)

راقم نے بریکٹ میں (نابالغ بچے) جو ذکر کیا ہے اس پر ترمذی شریف میں واضح طور پر " لم یبلغوا الحنث " کے الفاظ دلالت کر رہے ہیں۔

☆ " عن ابن عباس انه سمع رسول الله ﷺ یقول من کان له فرطان من امتی ادخله الله بهما الجنة فقالت له عائشة فمن کان له فرط من امتک قال ومن کان له فرط یا موفقه قالت فمن لم یکن له فرط من امتک قال فانا فرط امتی لن یصابوا بمثلی "

(ترمذی جلد اول باب ما جاء فی ثواب من قدم ولدا)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ انہوں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا میری امت میں سے جس شخص کے دو بچے آگے منتظم ہوئے تو اللہ تعالیٰ اس شخص کو ان دونوں کے ذریعے جنت میں داخل کرے گا۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے عرض کیا آپ کی امت میں سے جس کا ایک بچہ منتظم ہوا تو؟ آپ نے فرمایا اے توفیق دی گئی جس کا ایک بچہ منتظم ہوا اس کا بھی وہی حکم ہے پھر حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے ذکر کیا جس کا ایک بچہ بھی منتظم نہ ہوا تو؟ آپ نے فرمایا اس کا میں منتظم ہوں گا میری مثل کسی کو مصائب نہیں پہنچائی گئیں۔

وضاحت: فرط بالتحریک من یتقدم القافلة فهیی لهم ما یحتاجون الیه " فرط کی راء متحرک بالفتحہ ہے یہ اس شخص کو کہا جاتا ہے جو قافلہ سے آگے جا کر وہ چیزیں تیار کرے جن کے وہ محتاج ہوں۔

" والفرط هنا الولد الذی مات قبله فانه یتقدم ویهیی لوالدیه منزلا فی الجنة "

یہاں فرط سے مراد وہ نابالغ بچے ہیں جو والدین سے پہلے فوت ہو جائیں بیشک وہ آگے جا کر

اپنے والدین کے لئے جنت میں مہمان نوازی کا اور جنت میں مقام کا انتظام کریں۔

"ادخله الله الجنة بهما" ان بچوں کی وجہ سے اللہ تعالیٰ اس شخص کو جنت میں داخل کرے گا "یعنی مع الناجین اولا بالصبر علیهما" یعنی بچوں کی وفات پر صبر کرنے کی وجہ سے ہی ابتدائی طور پر جنت میں داخل کرے گا" او الشفاعة منهما" یاان بچوں کی شفاعت سے اللہ تعالیٰ ان کے والدین کو جنت میں داخل کرے گا۔

یا موفقة ای بالخیرات والاسولة الواقعة موقعها شفقة علی الامة" نبی کریم ﷺ نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو فرمایا" اے توفیق دی ہوئی" یعنی بھلائی کی توفیق دی ہوئی" اور سوال جو واقع ہوتے ہیں برمحل تم سے" جو میری امت کے لئے شفقت کا سبب بنتے ہیں ان کی توفیق دی ہوئی۔

(از مرقاۃ بحوالہ حاشیہ ترمذی)

سبحان اللہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سوال نہ کرتیں تو کیسے پتہ چلتا کہ جس کا اور کوئی شفیع نہیں ہوگا اس کے شفیع مصطفی کریم ﷺ ہوں گے۔

"لن یصابوا بمثلی ، ای بمثل مصیبتی لهم فان مصیبتی اشد علیهم من سائر المصائب واکون انا فرطهم"

جس کا اور کوئی نہیں ہوگا اس کا جنت میں پہلے میں منتظم ہوں گا کیونکہ ان میں سے کسی کو بھی وہ مصیبتیں حاصل نہیں ہوئیں جو مجھے حاصل ہوئیں اور میں ان کا شفاعتی اور منتظم ہوں گا۔

(مرقاۃ بحوالہ حاشیہ ترمذی)

خیال رہے کہ " اصاب یصیب "کا مطلقاً معنی پالینا، پہنچادینا بھی آتا رہتا ہے علامہ راغب اصفہانی فرماتے ہیں" واصاب : جاء فی الخیر والشر ، قال " ان تصبک حسنة تسؤهم" وان تصبک مصیبة "ولئن اصابکم فضل من الله " کہ" اصاب "کا استعمال خیر اور شر دونوں میں آتا رہتا ہے کیونکہ " ان تصبک حسنة تسؤهم " میں اور" ولئن اصابکم فضل من الله " میں خیر کے لئے استعمال ہے "وان تصبک مصیبة " میں اور" وان تصبک سیئة "میں مصیبت کے لئے استعمال ہے۔

" قال بعضهم الاصابة فی الخیر اعتبارا بالصوب ای بالمطر و فی الشر اعتبارا باصابة السھم و کلاھما یرجعان الی الاصل "

بعض حضرات نے بیان کیا ہے کہ صوب کا معنی بارش کا ہونا، پانی کا اوپر سے انڈیلنا اس معنی کے لحاظ سے اس کا استعمال خیر کے لئے ہے اور " اصابة السھم " کا معنی تیر کا پہنچنا اس معنی کے لحاظ سے شر میں استعمال ہے۔

اس تمہید کے بعد راقم کا موقف یہ ہے کہ " لن یصابوا بمثلی " کا اگر یہ معنی کر لیا جائے کہ (جس کا کوئی فرط نہیں اس کا میں فرط ہوں) کیونکہ میرے جیسا شفیع اور میرے جیسا منتظم ان کو اور کوئی حاصل نہیں ہوگا تو بہت خوب سے خوب تر معنی نظر آئے گا..... واللہ اعلم بالصواب۔

دین میں بڑی مصیبتیں نبی کریم ﷺ پر آئیں:

" عن عطاء بن ابی رباح قال قال رسول اللہ ﷺ اذا اصاب احدکم مصیبة فلیذکر مصابه بی فانھا من اعظم المصائب "

عطاء بن ابی رباح فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جب تم میں سے کسی ایک کو مصیبت پہنچے وہ میری مصیبتوں کو یاد کرے جو سب سے بڑی مصیبتیں ہیں۔

☆ " قال ابو عمر و صدق رسول اللہ ﷺ لان المصیبة به اعظم من کل مصیبة یصاب به المسلم بعده الی یوم القیامة "

ابوعمرو کہتے ہیں کیا خوب سچا ارشاد رسول اللہ ﷺ کا ہے کہ مسلمانوں کو میرے بعد بہت بڑی مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑے گا جو قیامت تک سلسلہ جاری رہے گا۔ ابوعمرو کہتے ہیں واقعی ہم نے اس ارشاد کا مشاہدہ کیا جب سلسلہ وحی منقطع ہوگیا اور نبی کریم ﷺ کا وصال ہوگیا تو " کان اول ظھور الشر بارتداد العرب و غیر ذلک " سب سے پہلی مصیبت جو مسلمانوں پر واقع ہوئی وہ کئی عرب کا مرتد ہو جانا تھا اس کے بغیر اور کئی فتنے نمودار ہو گئے۔ " و کان اول انقطاع الخیر و اول نقصانه " نبی کریم ﷺ کے وصال کے بعد خیر و بھلائی کا انقطاع ہوگیا اور نقصان پیدا ہوگیا جو آہستہ آہستہ عظیم خلفشار تک پہنچ گیا۔

☆ " قال ابو سعید ما نفضنا ایدینا من التراب من قبر رسول اللہ ﷺ حتی انکرنا قلوبنا "

ابوسعید فرماتے ہیں کہ ہم نے رسول اللہ ﷺ کی قبر شریف کی مٹی سے ابھی ہاتھ بھی نہیں جھاڑے تھے کہ آپ کے وصال کی وجہ سے خیر و برکت کے اٹھ جانے کی وجہ سے ہمارے دلوں میں شکوک وشبہات کی عجیب کیفیت پیدا ہوگئی جو آپ کے بعد بہت بڑی مصیبت تھی۔

☆ ابوالعتاھیہ نے اس حدیث کا معنی نظم کی صورت میں خوبصورت انداز پر پیش کیا۔

اصبر لکل مصیبة وتجلد — واعلم بان المرء غیر مخلد

ہر مصیبت پر صبر کرو اور بہادری سے کام لو — اور یقین کرلو کہ کسی انسان نے ہمیشہ نہیں رہنا

او ما تری ان المصائب جمة — وتری المنیة للعباد بمر صد

کیا تو دیکھتا نہیں کہ بیشک مصیبتیں کثیر ہیں — اور تو موت کو دیکھ جو بندوں کے لئے گھات میں ہے

من لم یصب ممن تری بمصیبة — ھذا سبیل لست فیه باوحد

جن لوگوں کو تم دیکھ رہے ہو کون سا وہ شخص ہے جسے مصیبت نہ پہنچی — یہ وہ راستہ ہے جس میں تم اکیلے نہیں

فاذا ذکرت محمد او مصابه — فاذکر مصابک بالنبی محمد

جب تمہیں یاد آئے نبی کریم ﷺ اور آپ کی مصیبتوں کی — تو اپنی مصیبتوں کو نبی کریم ﷺ کی مصیبتوں کے مقابل یاد کرو۔

(ماخوذ از قرطبی)

نماز باجماعت رہ جانے پر استرجاع:

" واخرج عبد بن حمید عن الحسن قال اذا فاتتک صلوة فی جماعة فاسترجع فانھا مصیبة "

عبد بن حمید حضرت حسن بصری رحمہ اللہ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا جب تمہاری نماز جماعت سے رہ جائے تو "اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّا اِلَیْهِ رَاجِعُوْن" پڑھو کیونکہ یہ بھی ایک مصیبت ہے۔

(درمنثور)

☆ " واخرج عبد بن حمید عن سواد بن داود ان سعید بن المسیب جاء وقد فاتته الصلوة فی الجماعة فاسترجع حتی سمع صوته خارجا من المسجد "

عبد بن حمید نے سواد بن داوٗد سے روایت ذکر کی کہ بیشک سعید بن مسیب آئے اور ان کی نماز

جماعت سے رہ گئی تو انہوں نے بلند آواز سے " اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّا اِلَيْهِ رَاجِعُوْن " پڑھا یہاں تک کہ ان کی آواز مسجد سے باہر سنائی دی۔ (درمنثور)

کلام الامام فی تفسیر الآیت للاختتام:

علامہ رازی رحمہ اللہ فرماتے ہیں ہم اس آیۃ کی تفسیر کو قضاء پر رضاء کے بیان سے ختم کرتے ہیں بندے کا اللہ تعالیٰ کی تقدیر پر راضی رہنا دو طریقہ سے ہے ایک طریق تصرف سے اور دوسرا طریق جذب سے۔

طریق التصرف: تصرف کے طریقہ میں چند وجوہ ہیں:

(۱) بیشک جب کسی کا دل کسی چیز کی طرف مائل ہو اور اس کے دل کی توجہ کامل طور پر کسی چیز کی طرف ہو جائے تو وہ چیز اس کے لئے منشأ آفات بن جاتی ہے اس وقت دل کی توجہ عالم حدوث سے رب تعالیٰ کی طرف پھیر دی جائے (اس میں رب تعالیٰ کی طرف سے بھی توفیق حاصل ہو جاتی ہے):

" فان آدم علیہ السلام لما تعلق قلبه بالجنة جعلها محنة علیه حتی زالت الجنة فبقی آدم مع ذکر الله"

حضرت آدم علیہ السلام کا دل جب جنت سے بہت زیادہ لگ گیا تو وہی جنت آپ کے لئے محنت ومشقت کا ذریعہ بن گئی جب جنت آپ سے زائل ہوگئی تو آپ اللہ تعالیٰ کے ذکر میں باقی رہے (یعنی اللہ تعالیٰ کے ذکر میں کامل مشغول ہو گئے)۔

"ولما استأنس یعقوب بیوسف علیهما السلام اوقع الفراق بینهما حتی بقی یعقوب مع ذکر الحق"

جب حضرت یعقوب علیہ السلام کو اپنے بیٹے حضرت یوسف علیہ السلام سے بہت زیادہ محبت ہوگئی، تو ان دونوں کے درمیان فراق پیدا کر دیا گیا، یہاں تک کہ حضرت یعقوب علیہ السلام فقط اللہ تعالیٰ کے ذکر میں مشغول رہے۔

" ولما طمع محمد ﷺ من اهل مکة فی النصرة والاعانة صاروا من اشد الناس علیه حتی قال ، ما اوذی نبی مثل ما اوذیت "

اور نبی کریم ﷺ کو یہ تمنا لاحق ہوئی کہ اہل مکہ آپ کی نصرت واعانت کریں تو وہی لوگ آپ کے شدید مخالف ہو گئے انہوں نے آپ کو اتنی تکالیف پہنچائیں جس کی مثال نہیں ملتی۔ اسی لئے آپ نے فرمایا کسی نبی کو اتنی تکالیف نہیں دی گئیں جتنی مجھے تکالیف دی گئیں۔ (اسی وجہ سے آپ کو مکہ مکرمہ سے ہجرت کا حکم دے دیا گیا تا کہ آپ دل جمعی سے کامل طور پر صرف اللہ تعالیٰ کے احکام کی تبلیغ اور اس کی عبادت میں منہمک ہو جائیں۔

(۲) انسان پر جب مصیبت آئے تو وہ اس مصیبت کو مصیبت ہی نہ سمجھے اس کو اس طرح دل سے نکال دے کہ اس کی طرف ذرا بھی توجہ نہ کرے وہ مصیبت اسے نہ تو مصیبت نظر آئے گا اور نہ ہی رحمت "فحینئذ یرجع العبد الی اللہ تعالیٰ" پس اس وقت بندہ اللہ تعالیٰ کی طرف کامل طور پر رجوع کرے گا۔

(۳) بیشک بندے پر جب کوئی چیز واقع ہو تو وہ یہ سمجھے کہ یہ مصیبت اس ذات باری تعالیٰ کی طرف سے آئی ہے جو ہر طرف کی بھلائیاں عطاء فرماتا ہے اور وہ توقع رکھنے والے کو بغیر کسی واسطہ کے عطاء کرتا ہے جب بندے کو یہ حالت حاصل ہو جاتی ہے " فیستحی العبد فیرجع الی باب رحمة اللہ " تو بندے کو شرم آتی ہے کہ وہ رب تعالیٰ جس کے مجھ پر ان گنت انعام ہیں اس کی طرف سے اس معمولی آزمائش میں، میں صبر نہ کروں، واویلا کروں اور بے قراری میں رہوں یہ میرے لئے باعث شرم ہے، جب بندے کو شرم آتی ہے تو وہ اللہ تعالیٰ کی رحمت کے دروازہ کی طرف رجوع کرتا ہے۔ یعنی اس کا رب تعالیٰ کی تقدیر پر راضی رہنا ہی رحمت کی طرف رجوع ہے۔ یعنی رب تعالیٰ کی طرف سے رحمت کا حاصل ہونا تو رحمت ہی ہے لیکن مصیبت پر صبر بھی رحمت ہے۔

طریق الجذب : جذب کے طریقہ کے متعلق نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا " جذبة من جذبات الحق توازی عمل الثقلین " حق کے جذبات میں سے ایک جذبہ جن اور انسانوں کے عمل کے برابر ہے۔ جذبہ حق کی اجمالی طور پر تعریف یہ ہے کہ انسان اپنے آپ کو کامل طور پر رب تعالیٰ کی طرف متوجہ کر لے۔ تفصیل اس کی یہ ہے کہ جس شخص کو حق تعالیٰ اپنی طرف کھینچ لے (متوجہ کر لے)

وہ مغلوب ہوجاتا ہے "لان الحق غالب لا مغلوب " اس لئے کہ حق غالب ہے مغلوب نہیں۔

" وصفة الرب الربوبية وصفة العبد العبودية والربوبية غالبة على العبودية لا بالضد "

رب تعالیٰ کی صفت ربوبیت ہے اور بندے کی صفت عبودیت ہے اور ربوبیت کو عبودیت پر غلبہ حاصل ہے ایسا نہیں ہوسکتا کہ عبودیت کو ربوبیت پر غلبہ حاصل ہوجائے۔

" وصفة الحق حقيقة وصفة العبد مجاز والحقيقة غالبة على المجاز لا بالضد "

حق کی صفت حقیقت ہے اور بندے کی صفت مجاز ہے حقیقت کو مجاز پر غلبہ حاصل ہے مجاز حقیقت پر غالب نہیں ہوسکتا۔ غالب کو یہ حق حاصل ہے اور یہ قدرت حاصل ہے کہ مغلوب کو ایک صفت سے دوسرے صفت کی طرف منتقل کردے اس لئے کہ وہ علیم وخبیر ہے جانتا ہے کہ اس بندے کے لائق کون سی صفت ہے۔

ذرا غور تو کریں بندہ جب کسی ہیبت ناک بادشاہ کے پاس جائے تو وہ اپنے آپ کو بھول جاتا ہے اپنے دل اور فکر اور حواس کو کامل طور پر اس کی طرف متوجہ کرلیتا ہے اسی کی طرف مشغول ہوجاتا ہے اور غیروں سے غافل ہوجاتا ہے۔ تو یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ بندہ جب بادشاہوں کے بادشاہ جس کے سامنے سب بادشاہ حقیر ہیں یعنی مالک الملک کے حضور اپنے آپ کو سمجھے تو پھر اپنے آپ کو فانی نہ سمجھے یقیناً جب انسان اپنے آپ کو رب تعالیٰ کے حضور فنا کے مقام پر سمجھتا ہے اور اپنی ذات کے فوائد کی طرف توجہ نہیں کرتا تو وہ رب تعالیٰ کے فیصلوں پر راضی رہتا ہے اور صبر وشکر سے کام لیتا ہے اسے رب تعالیٰ کی عبادت سے روگردانی کا تصور حاصل نہیں ہوتا۔

(ماخوذ از کبیر)

☆☆☆☆☆

﴿ اُولٰئِکَ عَلَیۡھِمۡ صَلَوٰتٌ مِّنۡ رَّبِّھِمۡ وَرَحۡمَۃٌ وَاُولٰئِکَ ھُمُ الۡمُھۡتَدُوۡنَ ﴾

(۱) ''یہ لوگ ہیں جن پران کے رب کی درودیں ہیں اور رحمت اور یہی لوگ راہ پر ہیں''

(۲) یہ لوگ ہیں جن پر مہربانیاں ہیں ان کے رب کی اور رحمت اور یہی لوگ ہدایت پر ہیں''

صلوات : جمع ہے صلوۃ کی ،اگر چہ بظاہر وہم یہ ہوتا ہے کہ صلوۃ کا معنی بھی رحمت ہے پھر اس کے بعد رحمت کا ذکر تکرار ہے تو اس وہم کو مختلف وجوہ سے زائل کیا گیا ہے۔" **الصلوۃ فی الاصل الدعا** " صلوۃ کا اصل میں حقیقی معنی دعا ہے جیسا کہ رب تعالیٰ نے فرمایا﴿ **وصل علیھم** ﴾ **ای ادع لھم** " یعنی ﴿ **صل علیھم** ﴾ کا معنی ہے آپ ان کے لئے دعا کریں۔" **ومن اللہ التزکیۃ والمغفرۃ** " اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان پر صلوات کا مطلب یہ ہے کہ وہ ان کا تزکیہ (پاکیزہ کرنا) فرماتا ہے اور ان کی مغفرت کرتا ہے۔

صلوات ،کو جمع ذکر کیا ہے جس سے کثرت اور اس کی مختلف قسمیں واضح ہوتی ہیں جیسے "**لبیک وسعدیک** " میں تکرار ہے(**ورحمۃ**) **والمراد بالرحمۃ اللطف والاحسان** " رحمت سے مراد لطف اور احسان ہے۔ (از بیضاوی وشیخ زادہ)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہمانے " **صلوات** " کی تفسیر مغفرت سے کی ہے اور یہ ایسے ہی جیسے نبی کریم ﷺ نے رب تعالیٰ کے حضور عرض کیا۔" **اللھم صل علی آل ابی اوفی ای ارحمھم واغفرلھم** " اے اللہ ابواوفی کی آل کی مغفرت فرما اور ان پر رحم فرما۔ " **رحمۃ** " کو نکرہ ذکر کیا ہے جس میں تنوین تعظیم پر دلالت کرتی ہے معنی اس کا بھی ''رحمات'' (کئی رحمتیں) ہے لیکن جمع ذکر کرنے کی ضرورت درپیش نہ آئی۔

اللہ تعالیٰ کی رحمت ان چیزوں کو بھی شامل ہے جو انسان کے لئے باعث مسرت بنیں اور ان کو بھی شامل ہے جو ضرر کو دور کرنے کا ذریعہ ہیں خواہ دنیاوی ضرر ہو یا اخروی۔

تنبیہ: بعض حضرات نے بیان کیا کہ "صلوات" اور "رحمۃ" کا ایک ہی معنی ہے یعنی دونوں کا معنی رحمت ہی ہے اگر چہ الفاظ مختلف ہیں جیسا کہ "سرهم ونجواهم" میں مختلف الفاظ کا ایک ہی معنی ہے۔لیکن یہ قول اتنا درست نہیں کیونکہ جب علیحدہ علیحدہ معنی ممکن ہو تو ایک ہی معنی لینے سے وہ بہتر ہے اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی روایت بھی ایک ہی معنی کے خلاف ہے۔

" روى عن عمر بن الخطاب رضى الله عنه انه قال فى هذه الآية نعم العدلان ونعم العلاوه "

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ اس آیۃ کریمہ میں دو بہتر عدل (بدلے) پائے گئے ہیں اور ان کے علاوہ ایک اور اچھی چیز پائی گئی ہے:

" وجعل قوله ﴿ أُولٰئِكَ عَلَيْهِمْ صَلَوَاتٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ ﴾ عدلا ولقوله ورحمةٌ عدلا ولو كان بمعنى لما كانا عدلين وجعل قوله تعالىٰ ﴿وَأُولٰئِكَ هُمُ الْمُهْتَدُوْنَ ﴾ علاوة "

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ﴿ أُولٰئِكَ عَلَيْهِمْ صَلَوَاتٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ ﴾ کو ایک عدل (بدلہ) کہا ہے اور "رحمۃ" کو دوسرا عدل اگر دونوں کا معنی ایک ہو تو ایک بدلہ بنے گا دو بدلے نہیں بن سکتے اور اللہ تعالیٰ کے قول ﴿ وَأُولٰئِكَ هُمُ الْمُهْتَدُوْنَ ﴾ کو ان دو بدلوں کے علاوہ رب تعالیٰ کا فیضان بیان کیا گیا ہے۔ (از شیخ زادہ)

وَأُولٰئِكَ هُمُ الْمُهْتَدُوْنَ : " للحق والصواب حيث استرجعوا واسلموا لقضاء الله تعالى " یہی لوگ ہدایت پر ہیں یعنی حق اور درست راہ پر ہیں کیونکہ مصیبت کے وقت " انا لله وانا اليه راجعون " پڑھتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کی تقدیر کو تسلیم کرتے ہیں۔ (بیضاوی)

" وقال ابن مسعود لان اخر من السماء احب الى من ان اقول قضاه الله تعالى ليته لم يكن "

اور حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا میرے نزدیک آسمانوں سے نیچے گرنا زیادہ محبوب ہے بنسبت اس کے کہ میں اللہ تعالیٰ کی تقدیر اور فیصلے کے متعلق یہ کہوں "کاش کہ یہ نہ ہوتا" (کبیر)

" وحكى عن داؤد الطائى قال : الزهد فى الدنيا ان لا يحب البقاء فيها

وافضل الاعمال الرضاء عن اللہ ولا ینبغی للمسلم ان یحزن لانہ یعلم ان لکل مصیبة ثوابا "

داؤد طائی رحمہ اللہ فرماتے ہیں دنیا میں زہد یہ ہے کہ اس میں باقی رہنے سے محبت نہ کرے اور تمام اعمال سے افضل عمل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی تقدیر پر راضی رہے کسی مسلمان کی شان کے لائق ہی نہیں کہ وہ کسی مصیبت پر غم کرے جب کہ وہ جانتا بھی ہے کہ ہر مصیبت پر ثواب حاصل ہوتا ہے۔ (کبیر)

مقام توجہ: راقم نے " صلوات " کا ترجمہ '' بھلائیاں '' کیا ہے اور اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ نے ترجمہ '' درودیں '' کیا ہے مطلب ایک ہی ہے صرف آج کل کے عرف میں '' درود '' کا مفہوم لوگ صرف نبی کریم ﷺ پر پڑھا گیا '' درود '' سمجھتے ہیں لوگوں کو '' درود '' کا مطلب '' رحمت اور بھلائی '' پتہ ہی نہیں۔

یہ تراجم ابھی تک ذکر کی گئی تمام بحث کو شامل ہیں اور علامہ رازی رحمہ اللہ نے جو یہ بیان کیا ہے اسے بھی شامل ہے " فاعلم ان الصلوة من اللہ هی الثناء والمدح والتعظیم واما رحمته فهی النعم التی انزلها به عاجلا ثم آجلا " اللہ تعالیٰ کی طرف سے ''صلوة'' کا مطلب یہ ہے کہ رب تعالیٰ تعریف فرماتا ہے مدح کرتا ہے اور عظمت عطا فرماتا ہے اور رحمت کا مطلب یہ ہے کہ وہ دنیا میں اور آخرت میں نعمتیں عطا کرتا ہے۔ (کبیر)

گذشتہ سے پیوستہ:

" انا للہ وانا الیہ راجعون " کو ظاہر آواز سے پڑھنا دل میں پڑھنے سے بہتر ہے۔

" فان فی اظهاره فوائد جزیلة ، منها ان غیره یقتدی به اذا سمعه ، ومنها غیظ الکفار وعلمهم بجده واجتهاده فی دین اللہ والثبات علیه وعلی طاعته "

اس لئے کہ اس کے ظاہر کرنے میں بہت بڑے فوائد ہیں۔ کیونکہ اس سے سن کر دوسروں کو اس کی اقتداء کا فائدہ حاصل ہوگا کہ وہ بھی اپنی مصیبتوں کے وقت " انا للہ وانا الیہ راجعون " پڑھیں گے۔ اور کفار غیظ وغضب سے جل اٹھیں گے، جب ان کو معلوم ہوگا کہ یہ شخص اللہ کے دین میں بڑی کوشش اور محنت کر رہا ہے اور اس پر ثابت قدم ہے، اور اللہ تعالیٰ اور اسکے دین کی طاعت میں قائم ہے۔ (کبیر)

☆ " عن جابر قال قال رسول الله ﷺ یو د اهل العافیة یوم القیامة حین یعطی اهل البلاء الثواب لو ان جلودهم کانت قرضت فی الدنیا بالمقاریض رواه الترمذی وقال هذا حدیث غریب " (مظهری)

حضرت جابر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جب مصیبت پر صبر کرنے والوں کو قیامت کے دن ثواب عطا کیا جائے گا تو اہل عافیت یہ تمنا کریں گے کاش کہ ان کے چمڑے دنیا میں قینچیوں سے کاٹ دیئے جاتے۔

☆ " عن ابی سعید الخدری عن النبی ﷺ قال ما یصیب المسلم من نصب و لا وصب و لا هم و لا حزن و لا اذی و لا غم حتی الشوکة یشاکها الا کفر الله بها من خطایاه ، متفق علیه " (مظهری)

مشکل الفاظ کے معانی:

" قوله من نصب وقوله و لا وصب بفتحتین فیهما اول التعب و الالم الذی یصیب البدن من جراحة وغیرها و الثانی الالم اللازم من السقم الدائم "

" نصب " اور " وصب " دونوں کے پہلے اور دوسرے حرف پر فتحہ (زبر) ہے پہلے لفظ کا معنی " تھک جانا " اور وہ درد جو بدن کو زخم وغیرہ کی وجہ سے پہنچے۔ اور دوسرے لفظ کا معنی دائمی مرض کی وجہ دائمی درد۔

" الهم و الحزن " ما یصیب القلب من الالم بفوت محبوب وقیل الهم یختص بما هو آت و الحزن بمافات "

" ھم " اور " حزن " کا کبھی ایک ہی معنی آتا ہے وہ یہ کہ کسی محبوب چیز کے فوت ہونے پر دل کو جو مصیبت پہنچے اور کبھی فرق کر لیا جاتا ہے آنے والی تکلیف کو " ھم " کہا جاتا ہے۔ اور گزری ہوئی پر صدمہ کو " حزن " کہا جاتا ہے۔ (مرقاۃ بحوالہ حاشیہ ترمذی ج اول ص ۱۱۶ باب ما جاء ثواب المریض)

ترجمہ: حضرت جابر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کسی شخص کو کوئی عارضی درد یا دائمی درد نہیں پہنچتا اور نہ آنے والی تکالیف سے کوئی غم پہنچتا ہے اور نہ فوت ہونے والی چیز سے۔ کوئی غم ہوتا

ہے اور نہ ہی انہیں کوئی تکلیف ہوتی ہے اور نہ ہی کسی قسم کا غم لاحق ہوتا ہے یہاں تک کہ کسی کو کوئی کانٹا بھی چبھ جائے مگر یہ کہ اللہ تعالیٰ اس کے گناہوں کا ان تکالیف کو کفارہ بنا دیتا ہے۔ (ازمظہری)

﴿ وَاُولٰئِکَ هُمُ الْمُهْتَدُوْنَ ﴾ میں چند وجوہ ہیں ایک یہ ہے " انهم المهتدون لهذه الطريقة الموصلة بصاحبها الى كل خير " بیشک وہ اس راہ پر ہیں جس کی ہر سمت میں بھلائی ہی بھلائی ہے یعنی خیر کی راہ پر قائم ہیں۔

دوسری وجہ یہ ہے " المهتدون الى الجنة الفائزون بالثواب" جنت کی راہ پر قائم ہیں اور ثواب حاصل کرنے میں کامیاب ہیں۔

تیسری وجہ یہ ہے "المهتدون لسائر مالزمهم " تمام اوامر ونواہی جو ان پر لازم ہیں ان پر عمل کرنے کی وجہ سے وہ ہدایت پر ہیں۔ (ازکبیر)

فائدہ جلیلہ : " اهتداء " کا ایک معنیٰ یہ ہے "مطالب پر کامیاب ہونا" اس معنیٰ کے لحاظ سے ﴿اُولٰئِکَ هُمُ الْمُهْتَدُوْنَ ﴾ کا مطلب ہوگا:

" اولئک هم الفائزون بمطالهم الدينية والدنيوية فان من نال تزكية الله تعالىٰ ورحمته لم يفته مطلب "

کہ یہی لوگ اپنے دینی اور دنیاوی مطالب میں کامیاب ہیں بیشک جو شخص اللہ تعالیٰ کی طرف سے تزکیہ (پاکیزگی) حاصل کر لے اور رب تعالیٰ کی رحمت حاصل کر لے اسکا کوئی مطلب فوت نہیں ہوتا (روح المعانی)

اسے درد پہنچے یا آرام ہر صورت میں اسے کامیابی حاصل ہوتی ہے کیونکہ اسے ثواب حاصل ہوتا ہے اور رب تعالیٰ کا قرب حاصل ہوتا ہے۔ اسی کا نام کامیابی ہے۔

﴿اِنَّ الصَّفَا وَالْمَرْوَةَ مِنْ شَعَائِرِ اللّٰهِ فَمَنْ حَجَّ الْبَيْتَ اَوِ اعْتَمَرَ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِ اَنْ يَّطَّوَّفَ بِهِمَا وَمَنْ تَطَوَّعَ خَيْرًا فَاِنَّ اللّٰهَ شَاكِرٌ عَلِيْمٌ﴾

۱) ''بیشک صفا اور مروہ اللہ کی نشانیوں سے ہیں تو اس گھر کا حج یا عمرہ کرے اس پر کچھ گناہ نہیں کہ ان دونوں کے پھیرے کرے اور جو کوئی بھلی بات اپنی طرف سے کرے تو اللہ نیکی کا صلہ دینے والا خبردار ہے''

۲) ''بیشک صفا اور مروہ اللہ کی نشانیوں سے ہیں تو جو شخص حج کرے بیت اللہ کا یا عمرہ کرے تو نہیں گناہ اس پر کہ سعی کرے ان دونوں کی اور جو شخص زیادہ نیکی کرے تو بیشک اللہ اس کے شکر کو قبول کرنے والا علم والا ہے''۔

شان نزول: ''عن ابن عباس رضی اللہ عنہ انه كان على الصفا صنم على صورة رجل يقال له اساف وعلى المروة صنم على صورة امرأة تدعى نائلة زعم اهل الكتاب انهما زنيا في الكعبة فمسخهما الله تعالىٰ حجرين فوضعا على الصفا والمروة ليعتبر بهما فلما طالت المدة عبدا من دون الله تعالىٰ فكان اهل الجاهلية اذا طافوا بينهما مسحوا الوثنين فلما جاء الاسلام وكسرت الاصنام كره المسلمون الطواف بينهما لاجل الصنمين فانزل الله تعالىٰ ''

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ بیشک صفا پر ایک بت مرد کی شکل میں تھا جسے اساف کہا جاتا تھا اور مروہ پر ایک بت عورت کی شکل کا تھا جسے نائلہ کہا جاتا تھا اہل کتاب کا گمان تھا (یہ کوئی یقینی بات نہیں) کہ یہ دونوں حقیقت میں انسان ہی تھے انہوں نے کعبہ میں زنا کیا تھا تو اللہ تعالیٰ نے ان کو پتھر بنا دیا۔ پھر ان دونوں کو صفا اور مروہ پر رکھ دیا گیا تا کہ لوگ ان دونوں سے عبرت پکڑیں۔ جب کچھ زیادہ ہی عرصہ گزر گیا تو لوگوں نے اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر ان کی عبادت شروع کر دی زمانہ جاہلیت میں اہل جاہلیت جب صفا اور مروہ کے درمیان چکر لگاتے (سعی کرتے) تو ان بتوں کو آ کر چھوتے (ہاتھ لگاتے) جب اسلام آ گیا اور بتوں کو توڑ دیا گیا مسلمانوں نے پھر بھی صفا اور مروہ کے درمیان

سعی کرنے کو ناپسند سمجھا کہ ان پر بت تھے لہٰذا ان میں سعی کرنا گناہ ہے تو اللہ تعالیٰ نے اس آیۃ کریمہ کو نازل کیا کہ بت پرستی تو منع ہے بتوں کو تبرک کے طور پر ہاتھ لگانا تو منع ہے لیکن صفا اور مروہ تو محترم مقامات ہیں اللہ کی نشانیوں میں سے نشانیاں ہیں حج اور عمرہ میں ان کے درمیان سعی کرنا کوئی گناہ نہیں خصوصاً جب کہ بت توڑ بھی دیئے گئے۔ (از روح المعانی)

اِنَّ الصَّفَا: صفا کو صفا کہنے کی وجہ ایک تو یہ ہے کہ " **صفا یصفو صفوا** " کا معنی خالص صاف ہونا صفا بھی چونکہ خالص پتھر کی چٹان ہے ایسی پہاڑی نہیں جس میں مٹی، ریت، بجری یا درخت پائے جائیں بلکہ خالص سبز سیاہ رنگ کی چٹان ہے " **الصفا فی الاصل الحجر الاملس لا یخالطه غیرہ من طین او تراب** " یعنی صفا خالص صاف پتھر کو کہا جاتا ہے جس کے ساتھ کیچڑ اور خشک مٹی وغیرہ نہ پائی جائیں۔

صفا کو صفا کہنے کی اور وجہ یہ ہے " **وقیل سمی (الصفا) لانه جلس علیه آدم صفی الله** " کہ اس پر حضرت آدم صفی اللہ بیٹھے، ان کے بیٹھنے کی وجہ سے اس کا نام ہی صفا رکھ دیا گیا یعنی اس کے نام کی وجہ " صفی اللہ " سے تعلق ہے۔ (از روح المعانی)

مروہ کو مروہ کہنے کی وجہ: اصل میں سفید اور صاف پتھر کو مروہ کہا جاتا ہے لیکن بعد میں صفا کے مقابل دوسری پہاڑی کا نام مروہ ہے اگرچہ اسکے پتھر بھی صفا کی طرح ہی ہیں سفید سنگ مرمر کی طرح نہیں۔ دونوں پہاڑیوں کی چوٹیوں کو جوں کا توں چھوڑا ہوا ہے اگرچہ نیچے حصہ میں تمام سنگ مرمر کا فرش آجکل لگا ہوا ہے۔

مروہ کو مروہ کہنے کی دوسری وجہ یہ ہے " **وسمی المروة لانه جلست علیه امرأته حواء** " مروہ کا نام مروہ اسلئے رکھا گیا ہے کہ بیشک اسکے اوپر حضرت آدم علیہ السلام کی زوجہ (امرأة) حضرت حواء بیٹھی۔ تو گویا کہ (امرأة) حضرت حواء کی نسبت سے وہ پہاڑ مروہ بن گیا۔ (از روح المعانی)

مِنْ شَعَائِرِ اللهِ: "بیشک صفا اور مروہ" اللہ کی نشانیوں سے ہیں "شعائر" جمع ہی شعیرۃ کی یا شعار کی جس کا معنی ہے "علامت" (نشانی)۔

صفا اور مروہ کو "شعائر اللہ" کہنے کی وجوہ:

(۱) " والمراد بهما اعلام المتعبدات " مراد یہ ہے کہ صفا اور مروہ عبادت کے مقامات کی نشانیاں ہیں کیونکہ ان پر چکر لگانا عبادت ہے۔

(۲) " او العبادات الحجية " صفا اور مروہ کو اس لئے اللہ تعالیٰ کی نشانیاں کہا گیا ہے کہ وہاں حج کے مناسک سے سعی ادا کی جاتی ہے تو حج کی عبادات میں سے عبادت کی نشانیاں ہیں۔

(۳) " وقيل المعنى ان الطواف بين هذين الجبلين من علامات دين الله " اصل میں ان دونوں (صفا اور مروہ) کے درمیان طواف (چکر لگانا) اللہ تعالیٰ کے دین کی نشانیوں میں سے نشانی ہے۔

اس کی وجہ سے ان دونوں کو بھی اللہ کی نشانیاں کہہ دیا گیا ہے گویا کہ " اسم المحل باسم الحال " والا قانون جاری کیا گیا ہے۔

(۴) " او انهما من المواضع التي يقام فيها دينه " یا اس وجہ سے ان دونوں کو اللہ تعالیٰ کی نشانیاں کہا گیا ہے کہ یہ ان مقامات میں سے ہیں جن میں اللہ تعالیٰ کا دین قائم کیا جاتا ہے۔

(۵) " او من علاماته التي تعبد بالسعي بينهما لامن علامات الجاهلية " ان کو اللہ تعالیٰ کی نشانیاں اس لئے کہا گیا ہے ان میں کیا جانے والا فعل اللہ تعالیٰ اور اس کے دین کی نشانی ہے جاہلیت کی رسوم میں سے اسلام کے آنے کے بعد کوئی رسم بتوں کو ہاتھ لگانے والی ادا نہیں کی جاتی۔

(از روح المعانی)

شعائر اللہ کہنے کی عظیم وجہ: جیسا کہ پہلے پارہ میں بیان کیا جا چکا ہے ذرا بالاختصار پھر دیکھئے:

> " فان ابراهيم عليه السلام لما دع ربه بقوله ﴿ وارنا مناسكنا﴾ علمه الله مناسك الحج وشعائره اجابة لدعوته ثم شرعها الله لامة محمد ﷺ والحكمة في شروع السعي بين الصفا والمروة ما حكى ان هاجر حين ضاق عليها الامر في عطشها وعطش ابنها اسمعيل سعت في هذا المكان الى ان صعدت الجبل ودعت فانبع الله ماء زمزم واجاب دعاء ها فجعل فعلها طاعة لجميع المكلفين الى يوم القيامة "

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جب رب تعالیٰ کے حضور دعا کی کہ اے اللہ ''ہمیں حج کے مناسک دکھا'' تو اللہ تعالیٰ نے آپ کی دعا کو قبول کرتے ہوئے حج کے طریقہ اور نشانیاں آپ کو سکھا دیں پھر وہی طریقے نبی کریم ﷺ کی امت کے لئے بھی مقرر فرما دیئے گئے۔

صفا اور مروہ کے درمیان سعی شروع کرنے کی وجہ یہ ہے کہ حضرت ہاجرہ پر جب اپنی پیاس اور اپنے بچے کی پیاس کی وجہ سے معاملہ بے قراری کی حد تک پہنچ گیا تو آپ صفا پر چڑھتی ہیں دعا کرتی ہیں اور دیکھتی ہیں کوئی آبادی نظر آجائے کوئی آدمی نظر آجائے کہیں پانی نظر آجائے۔

پھر وہاں سے مروہ پر آتی ہیں درمیان میں نشیبی جگہ جہاں سے بچہ نظر نہیں آتا وہاں آپ دوڑتی ہیں اسی طرح آپ نے سات چکر لگا دیئے۔

اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت، حضرت ہاجرہ کی دعاء حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کی ایڑی کی رگڑ، اور حضرت جبریل کے پر مارنے سے زمزم کا چشمہ جاری کر دیا۔

آج وہی کام جو حضرت ہاجرہ نے کیا حاجیوں کے لئے واجب ہے حضرت ہاجرہ کے قدم لگنے سے ہی صفا اور مروہ اللہ تعالیٰ کی نشانیاں بن گئے بلکہ اس سے پہلے حضرت آدم علیہ السلام اور حضرت حوا کی وجہ سے بھی ان دونوں مقامات کو عظمت مل چکی تھی۔

اس آیۃ کریمہ کا ماقبل سے تعلق: ابھی تک کی گئی بحث سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے پہلے حکم فرمایا ﴿ فاذکرونی اذکرکم ﴾ تم مجھے یاد کرو میں تمہیں یاد کروں گا۔ یہ حکم تمام عبادات کو شامل ہے اس کے بعد ہمیں حکم دیا:

﴿ یَا اَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اسْتَعِیْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ ﴾

''اے ایمان والو نماز اور صبر سے امداد طلب کرو''

اس کے بعد جہاد کی رغبت دلائی کیونکہ شہداء کے مراتب اور ان کی زندگی بیان فرمائی پھر مصائب سے آزمائش اور ان پر صبر کرنے اور اس پر اجر عظیم عطا کرنے کا ذکر فرمایا۔ پھر اس آیۃ کریمہ میں صفا و مروہ کا ذکر فرمایا اور ان کے درمیان سعی کرنا جو عبادت اور باعث ثواب ہے۔ (از شیخ زادہ)

فَمَنْ حَجَّ الْبَيْتَ اَوِ اعْتَمَرَ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِ اَنْ يَّطَّوَّفَ بِهِمَا :

تو جو شخص حج کرے بیت اللہ کا یا عمرہ کرے تو نہیں گناہ اس پر کہ سعی کرے ان دونوں کے درمیان۔

حج : کا لغوی معنی ارادہ کرنا جس طرح کہا جاتا ہے " رجل محجوج " جب کہ کوئی شخص مقصود ہو اور کبھی کہا جاتا ہے " مکان محجوج " وہ جگہ جس کا ارادہ پایا جائے۔

" فکان الحج لما کان مقصودا بھذا النوع من العبادة سمی ذلک الفعل حجا "

حج کو بھی حج اسی لئے کہا جاتا ہے کہ اس میں بیت اللہ شریف اور مقام عرفات اور دوسرے مقامات معظمہ کا اردہ پایا جاتا ہے یعنی مقامات مقدسہ اس کا مقصود ہوتے ہیں اسی وجہ سے حج کا اصطلاحی معنی ہے " القصد الی المعظم "معظم مقامات کا ارادہ۔

''حج'' کا لغوی معنی حلق کرنا (بال مونڈنا) بھی آتا ہے جیسے کہا جاتا ہے " حج فلان ای حلق" فلاں شخص نے بال منڈوائے۔ چونکہ حج میں بھی حلق کرایا جاتا (بال منڈوائے جاتے ہیں) اس لئے اسے حج کہہ لیا جاتا ہے ''حج'' کا لغوی معنی کسی چیز کی طرف بار بار آنا جانا بھی آتا ہے:

" فمن زار البیت للحج فانه یاتیه اولا لیعرفه ثم یعود الیه للطواف ثم ینصرف الی منی ثم یعود الیه لطواف الزیارة ثم یعود الیه لطواف الصدر "

جو شخص بیت اللہ شریف کی زیارت کا ارادہ کرتا ہے وہ پہلے بیت اللہ شریف کو دیکھنے کے لئے آتا ہے پھر اس کا طواف کرتا ہے پھر منی میں جاتا ہے پھر بیت اللہ شریف میں طواف زیارت کے لئے آتا ہے پھر بیت اللہ شریف میں طواف صدر کے لئے آتا ہے یعنی بیت اللہ شریف میں بار بار طواف کیلئے آنے جانے کی وجہ سے حج کو حج کہا جاتا ہے۔

علامہ رازی رحمہ اللہ نے اسی معنی کو ''اشبہ للصواب'' (زیادہ درست) کہا ہے۔

اور فقہاء کرام نے قصد والا معنی ذکر کیا ہے راقم کو بھی اگر چہ علامہ رازی رحمہ اللہ کا قول ہی پسند ہے لیکن بار بار آنے جانے کی وجہ زیادہ معتبر راقم کو یہ بات نظر آتی ہے کہ ایک مرتبہ جو شخص حج کر لیتا ہے وہ بار بار حج کر سکے یا نہ کر سکے البتہ اس کے دل میں تڑپ پائی جاتی ہے وہ تمنا کرتا ہے کہ بار بار بیت اللہ

شریف کی زیارت کرے۔ (ماخوذ از کبیر)

عمرہ: کو عمرہ کہنے کی وجہ یہ ہے کہ عمرہ کا معنیٰ ''زیارت کرنا'' ہے یہ لفظ ''عمارۃ'' سے لیا ہوا ہے چونکہ زیارت کرنے والا بھی مکان کو آباد کرتا ہے اس لئے اسے عمرہ کہا جاتا ہے (از روح المعانی) عبد القیس کے کلام میں مسجد، کلیسہ، گرجا کو بھی عمرہ کہہ لیا جاتا ہے کیونکہ ان مقامات کی طرف بھی عبادت کرنے والے قصد کرتے ہیں مسلمان مسجد کا، یہود کلیسہ کا اور عیسائی گرجا کا قصد کرتے ہیں۔

جناح: کا لغوی معنیٰ ہے ''میلان کرنا'' جیسا کہ رب تعالیٰ نے فرمایا ﴿ وَاِنْ جَنَحُوْا لِلسَّلْمِ فَاجْنَحْ لَهَا ﴾ اور اگر وہ (کفار) صلح کی طرف میلان کریں تو تم میلان کرو اس کی طرف۔ ''جنحت السفینة'' کشتی کا ڈولنا (میلان کرنا) جناح الطائر، پرندے کے پر۔ جناح کا معنیٰ زیادہ طور پر گناہ کر لیا جاتا ہے اس لئے کہ اس میں باطل اور گناہ کے کاموں کی طرف میلان پایا جاتا ہے۔

یطوف: طاء پر شد ہے اصل میں یتطوف ہے تاء کو طاء کرکے ادغام کیا گیا۔

طواف کا لغوی معنیٰ پھیرے لگانا (چکر لگانا) اعلیٰ حضرت نے یہی ترجمہ کیا ہے۔ صرف طواف کعبہ شریف کے اردگرد پھیرے لگانے میں مشہور ہو چکا ہے اور سعی اگر چہ صفا اور مروہ کے درمیان نشیبی جگہ میں تیز چلنے کا نام ہے لیکن صفا اور مروہ پر پھیرے لگانے کے لئے اصطلاح میں سعی زیادہ مشہور ہو چکا ہے اس لئے راقم نے ترجمہ اس کے مطابق کر دیا ہے۔

سعی کرنا: ''عن صفية بنت شيبة قالت اخبرتني بنت ابي تجراة قالت دخلت مع نسوة من قريش دار آل ابي حسين ننظر الى رسول الله ﷺ وهو يسعى بين الصفا والمروة فرأيته يسعى وان مئزره ليدور من شدة السعي وسمعته يقول اسعوا فان الله كتب عليكم السعي رواه في شرح السنة وروى احمد مع اختلاف'' (مشکوۃ باب دخول مکۃ والطواف)

صفیہ بنت شیبہ کہتی ہیں مجھے بنت ابی تجراۃ نے بتایا وہ کہتی ہیں میں قریش کی عورتوں کے ساتھ آل ابی حسین کے گھر داخل ہوئی رسول اللہ ﷺ کو ہم دیکھ رہے تھے وہ صفا اور مروہ کے درمیان سعی فرما رہے تھے میں نے آپ کو سعی کرتے ہوئے دیکھا کہ آپ کی چادر شدت سعی کی وجہ سے (آپ کے پاؤں مبارک پر) چکر لگا رہی ہے اور میں نے آپ کو کہتے ہوئے سنا سعی کرو بیشک اللہ تعالیٰ نے تم پر سعی

کولازم قرار دیا۔

☆ " رواہ البیھقی بسند حسن بلفظ انه علیه الصلوۃ والسلام استقبل الناس فی المسعی وقال یا ایھا الناس اسعوا فان الله قد کتب علیکم السعی "

بیہقی نے سند حسن سے روایت ذکر کی کہ بیشک نبی کریم ﷺ نے مقام سعی میں لوگوں کی طرف متوجہ ہوکر ارشاد فرمایا اے لوگو سعی کرو بیشک اللہ تعالیٰ نے تم پر سعی کولازم کردیا ہے۔

علامہ طیبی رحمہ اللہ نے فرمایا کہ حدیث شریف میں ''کتب'' کا معنی ہے فرض کیا لہٰذا حدیث پاک اس پر دلالت کررہی ہے۔ " ان السعی فرض ومن لم یسع بطل حجه " بیشک سعی فرض ہے جس شخص نے سعی نہ کی اس کا حج باطل ہے یہی مذہب امام شافعی، امام مالک، امام احمد رحمہ اللہ کا ہے۔

" وقال ابو حنیفة رحمه الله السعی واجب لان الحدیث ظنی وکذا المشی فیه مع القدرۃ ویترک الواجب یجب دم "

امام اعظم ابوحنیفہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ صفاومروہ پر پھیرے لگانا واجب ہے اسی طرح نشیبی جگہ میں دوڑنا بھی واجب ہے کیونکہ حدیث ظنی ہے اگر کسی شخص نے صفاومروہ پر چکر ہی نہ لگائے یا چکر تو لگا لئے لیکن نشیبی جگہ نہ دوڑ لگائی باوجود دوڑنے کی قدرت حاصل ہونے کے تو واجب چھوٹ گیا دم (جانور ذبح کرنا) واجب ہوگا۔

بعض صحابہ کرام سعی کو مستحب قرار دیتے ہیں۔ وہ حضرت ابن عباس اور ابن زبیر رضی اللہ عنہم ہیں اور تابعین میں سے بھی بعض حضرات کا یہی مذہب ہے۔ ان حضرات کی دلیل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ﴿ فَلا جُنَاحَ عَلَيْهِ اَنْ يَّطَّوَّفَ بِهِمَا وَمَنْ تَطَوَّعَ خَيْرًا ﴾ اس میں صفا اور مروہ میں پھیرے لگانے سے گناہ کی نفی ہے اور بھلائی کا کام بطور نفل کرنے کا ذکر ہے۔

امام اعظم رحمہ اللہ کا اعظم مذہب: آپ فرماتے ہیں جب بعض حضرات سعی کو فرض قرار دیتے ہیں اور بعض حضرات سعی کو نفل قرار دیتے ہیں " فالا وسط الاعدل انه واجب " تو درمیان والی صورت ہی بہتر ہے وہ یہ ہے کہ سعی واجب ہے نہ فرض ہے نہ نفل۔

اعتراض : دارقطنی، ابن ابی شیبہ نے اس روایت کو ذکر کیا ہے اور صاحب تنقیح نے کہا ہے ''اسناد

صحیح'' اس کی سند صحیح ہے تو اس حدیث کو ظنی کہہ کر وجوب ثابت کرنا فرض ثابت نہ کرنا کیسے صحیح ہے؟

جواب : ہم کہتے ہیں " اذ مثله لا يزيد على افادة الوجوب " اس قسم کی حدیث سے وجوب سے زیادہ کچھ ثابت نہیں ہو سکتا۔

" واما الركن فانما يثبت عندنا بدليل به فاثباته بهذا الحديث اثبات بغير دليل "

فرضیت قطعی دلیل سے ہمارے نزدیک ثابت ہوتی ہے اس حدیث سے فرضیت ثابت کرنا بغیر دلیل کے ہوگا۔

اگر قطعی دلیل ہوتی تو صحابہ کرام اور تابعین سعی کے نفل ہونے کے قائل نہ ہوتے۔ (ماخوذ از مرقاۃ ج۵ ص۳۲۰)

" لَا جُنَاحَ عَلَيْه " سے فقط گناہ کی نفی ہے ﴿ لَا جُنَاحَ عَلَيْهِ ﴾ انه لا اثم عليه والذى يصدق عليه انه لا اثم فى فعله يدخل تحته الواجب والمندوبات والمباح "

﴿ لَا جُنَاحَ عَلَيْه ﴾ کا معنی یہ ہے کہ اس پر کوئی گناہ نہیں اس آیۃ کریمہ سے اتنا ہی سمجھ آتا ہے کہ اس فعل میں کوئی گناہ نہیں اس کے نیچے واجب اور مستحبات اور مباح داخل ہیں۔ ان تینوں میں سے جس کو بھی ثابت کرنا ہوگا اس آیۃ کے بغیر اور دلیل سے ثابت کرنا ہوگا۔ (از کبیر)

امام شافعی رحمہ اللہ نے فرضیت جس حدیث سے ثابت کی وہ اور اسکا جواب پہلے ذکر کیا جا چکا ہے۔

حدیث عائشہ رضی اللہ عنہا اور اس کا جواب:

" وما روى مسلم عن عائشة انها قالت لعمرى ما اتم الله تعالىٰ حج من لم يسع بين الصفا والمروة ولا عمرته ، ليس فيه دليل على الفرضية ايضا سلمنا لكنه مذهب لها والمسألة اجتهادية فلا تلزم به على انه معارض بما اخرجه الشعبى عن عروة بن مضرس الطائى انه قال اتيت النبى ﷺ بالمزدلفة فقلت يا رسول الله جئت من جبل طى ما تركت جبلا الا وقفت عليه فهل لى من حج ؟ فقال من صلى معنا هذه الصلوة ووقف معنا هذا الموقف وقد ادرك عرفة قبل ذلك ليلا او نهارا فقد تم حجه وقضى تفثه "

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں مجھے اپنی عمر کی قسم اس شخص کا حج اور عمرہ مکمل نہیں جس نے

صفااور مروہ کے درمیان سعی نہیں کی۔

اس حدیث سے امام شافعی رحمہ اللہ فرضیت ثابت کرتے ہیں۔لیکن ہم نے کہا کہ اس حدیث میں فرضیت پر کوئی دلالت نہیں پائی گئی۔کیونکہ واجب کی ترک سے بھی کہا جا سکتا ہے کہ وہ کام مکمل نہیں ہوا کیونکہ واجب چھوٹ گیا۔اگر ہم تسلیم کر بھی لیں کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سعی کی فرضیت کا مذہب رکھتی تھیں تو ہم یہ کہتے ہیں کہ یہ ان کا مذہب تھا جو اجتہاد پر مبنی تھا۔

ہم اس سے فرضیت کو نہیں مانتے کیونکہ اس حدیث کے معارض عروہ بن مضرس طائی کی حدیث ہے جو شعبی نے تخریج کی ہے وہ یہ ہے وہ کہتے ہیں میں نبی کریم ﷺ کی خدمت میں مزدلفہ میں حاضر ہوا میں نے کہا یا رسول اللہ میں طے پہاڑ سے آیا میں نے کوئی پہاڑ نہیں چھوڑا مگر یہ کہ میں اس پر ٹھہرا کیا میرا حج ہو گیا؟ تو آپ نے فرمایا جس شخص نے ہمارے ساتھ یہ نماز ادا کی اور ہمارے ساتھ اس مقام پر ٹھہرا اور وہ اس سے پہلے دن کو یا رات کو عرفات پر بھی ٹھہرا ہو تو اس نے اپنا حج مکمل کر لیا اور اپنے میل کچیل کو دور کر لیا۔

"فاخبر ﷺ بتمام حجه وليس فيه السعي بينهما ولو كان من فروضه لبينه للسائل لعلمه بجهله"

نبی کریم ﷺ نے اس شخص کو حج کے مکمل کر لینے کی خبر دی لیکن اس میں سعی کا ذکر نہیں فرمایا اگر سعی فرض ہوتی تو آپ سائل کو ضرور بتاتے کیونکہ سائل نے پوچھا ہی اس لئے تھا کہ وہ نہیں جانتے تھے۔

(از روح المعانی)

اعتراض : اس حدیث میں نبی کریم ﷺ نے طواف زیارت کا ذکر نہیں فرمایا حالانکہ وہ فرض ہے اسی طرح سعی کا ذکر نہیں فرمایا وہ فرض ہو جائے تو کیا حرج ہے؟

جواب : طواف زیارت "دلالۃ النص" سے سمجھ آ رہا ہے کیونکہ سائل نے مزدلفہ میں سوال کیا حضور ﷺ نے جب مزدلفہ میں اپنے ساتھ نماز میں شریک پایا تو واضح فرمایا کہ اس سے پہلے مقام عرفات پر وقوف (ٹھہرنا) لازم تھا اس پر جب تم ٹھہر چکے ہو تو پہلے فریضے احرام اور وقوف عرفات پر تو تمہارا عمل ہو چکا ہے۔اب اس کے بعد تم نے ہمارے ساتھ ہی چلنا ہے آگے کے مسائل تم پر خود واضح ہوتے چلے

جائیں گے۔ (احکام القرآن للجصاص مع الزیادة)

سعی نفل نہیں بلکہ واجب ہے: نبی کریم ﷺ کا سعی کرنا ثابت ہے جب آپ اپنے حج میں سعی کرنے کی غرض سے صفا کے قریب گئے تو ارشاد فرمایا ﴿ اِنَّ الصَّفَا وَالْمَرْوَةَ مِنْ شَعَآئِرِ اللّٰهِ ﴾ ابدء وا بما بدأ الله به " بیشک صفا اور مروہ اللہ کی نشانیوں سے ہیں تم اسی سے ابتداء کرو جس سے رب تعالیٰ نے ابتداء فرمائی۔

نبی کریم ﷺ نے ابتداء صفا سے کی آپ صفا پر چڑھے یہاں تک کہ بیت اللہ شریف کو دیکھا:

" واذا ثبت انه علیه السلام سعی وجب ان یجب علینا السعی للقرآن والخبر ، اما القرآن فقوله تعالیٰ ﴿ واتبعوه ﴾ واما الخبر فقوله علیه السلام " خذوا عنی مناسککم "

جب یہ ثابت ہو گیا کہ نبی کریم ﷺ نے سعی فرمائی تو ہم پر سعی کرنا قرآن پاک اور حدیث پاک سے واجب ہو گیا۔ کیونکہ قرآن پاک میں آپ کی تابعداری کرنے کا حکم دیا گیا ہے کہ " تم ان کی تابعداری کرو" اور حدیث پاک سے بھی ثابت ہے کیونکہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا " تم مجھ سے اپنے حج کے مناسک سیکھ لو"۔ ﴿ اتبعوا ﴾ اور ﴿ خذوا ﴾ امر ہیں۔ امر وجوب کے لئے آتا ہے جب اس کے خلاف کوئی قرینہ نہ پایا جائے۔

اعتراض : جب رب تعالیٰ نے واضح طور پر سعی کے ساتھ ﴿ ومن تطوع خیرا ﴾ ذکر فرمادیا ہے تو اس سے پتہ چلتا ہے کہ سعی نفل ہے لہٰذا یہ کہنا کہ سعی نفل نہیں کیسے صحیح ہے؟

جواب : ﴿ ومن تطوع خیرا ﴾ سے سعی کے نفل ہونے پر دلیل پکڑنا ضعیف ہے۔

" لان هذا لا یقتضی ان یکون المراد من هذا التطوع هو الطواف المذکور "

یہاں جو ﴿ تطوع ﴾ کا ذکر ہے اس سے مراد یہی سعی جس کا ذکر پہلے ہے "مراد نہیں" بلکہ اس سے مراد اور ہے۔ جس طرح اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے ﴿ وعلی الذین یطیقونه فدیة طعام مسکین ﴾ یہاں سے شیخ فانی کو روزہ نہ رکھ سکنے کی وجہ سے فدیہ کو واجب قرار دیا۔ اس کے بعد ذکر فرمایا ﴿ فمن تطوع خیرا فهو خیر له ﴾ اس سے یہ ثابت فرمایا کہ اگر مقرر حد سے زائد فقیر کو طعام دے

دیا گیا تو اس میں اور زیادہ ثواب حاصل ہوگا۔

اسی طرح یہاں بھی ذکر کرنے کا مقصد یہ ہے " انہ یزید فی الطواف فیطوف اکثر من الطواف الواجب مثل ان یطوف ثمانیة او اکثر " کہ وہ سعی میں سات پھیروں سے زیادہ" آٹھ یا اس سے بھی زائد پھیرے لگادے"۔ تو یہ نفل ہوں گے اسے ثواب حاصل ہوگا۔ اسے عبادت میں اس طرح کی زیادتی شمار نہیں کیا جائیگا (جیسا کہ نماز کی رکعتوں میں زیادتی منع ہے دو رکعت کو تین اور تین کو چار، اور چار کو پانچ رکعت ادا کرنا منع ہے) یا مراد یہ ہے:

" ان یتطوع بعد حج الفرض وعمرته بالحج والعمرة مرة اخری حتی طاف بالصفا والمروة تطوعا "

کہ ایک مرتبہ فرض حج ادا کرکے یا احرام کی وجہ سے جو عمرہ اس نے اپنے آپ پر واجب کردیا تھا وہ ادا کرلیا اس کے بعد حج یا عمرہ کرے وہ حج یا عمرہ چونکہ نفلی عبادت ہوگی۔ لہذا اس میں سعی کو نفل کہنے کا یہ مطلب ہے کہ نفلی عبادت کی سعی ہے اگرچہ وہ سعی بھی واجب ہوگی۔ (ماخوذ از کبیر)

ومن تطوع خیرا فان اللہ شاکر علیم : جس شخص نے طاعت کا فعل کیا خواہ فرض ہو یا نفل، یا فرض حج سے زائد ہو، یا عمرہ سے زائد ہو یا طواف میں زیادتی کرے یا نفلی سعی کرے تو اس نے بھلائی کا کام کیا۔ بیشک اللہ تعالیٰ اسے ثواب عطا فرمائے گا کسی کا کوئی فعل اللہ تعالیٰ پر مخفی نہیں۔ (بیضاوی)

﴿ شاکر ﴾ کا لغوی معنی " المظهر للانعام علیه " جو اس پر انعام ہے اس کو وہ ظاہر کرنے والا ہو۔ یہ اللہ تعالیٰ کے حق میں محال ہے اس لئے اس لفظ کو جب رب تعالیٰ کے حق میں منسوب کیا جائے گا تو مجازی معنی ہوگا " المجازی علی الطاعة " کہ وہ طاعت پر جزاء دینے والا ہے۔

جزاء طاعت کو شکر کہنے کی وجوہ:

۱) " ان اللفظ خرج مخرج التلطف للعباد مبالغة فی الاحسان الیهم " اللہ تعالیٰ نے یہ ظاہر کرنے کے لئے کہ اس کا اپنے بندوں پر بڑا احسان ہے اور وہ اپنے بندوں پر بہت مہربان ہے " شاکر " کے لفظ کو ذکر کیا جو درحقیقت یہ لفظ ان کے لئے استعمال ہوتا ہے جن پر احسان کیا جائے۔

۲) " ان الشکر لما کان مقابلا للانعام او الجزاء علیه سمی کل ما کان جزاء شکرا علی سبیل التشبیه "

بیشک شکر جب کہ انعام یا انعام پر جزاء کے مقابل استعمال ہوتا ہے تو ہر جزاء (ثواب) کو تشبیہ کے طور پر جزاء سے تعبیر کر دیا گیا۔

۳) اللہ تعالیٰ گویا کہ یہ کہتا ہے کہ میں تمہاری طاعت سے بے پرواہ ہوں مجھے اس کا کوئی نفع نہیں اگر بالفرض مجھے اس کا نفع ہوتا تو میں اس کا شکر گزار ہوتا" **وبالجملة فالمقصود بيان ان طاعة العبد مقبولة عند الله تعالىٰ وواقعة موقع القبول في اقصى الدرجات**" حاصل کلام یہ ہے کہ بیان کرنا یہ مقصود ہے کہ بندے کی طاعت اللہ تعالیٰ کے ہاں مقبول ہے اور اسے اعلیٰ درجہ کا مقام قبولیت حاصل ہے۔ (از کبیر)

علیم : فالمعنى انه يعلم قدر الجزاء فلا يبخس المستحق حقه لانه تعالىٰ عالم بقدره وعالم بما يزيد عليه من التفضل"

اللہ تعالیٰ جانتا ہے کہ کس قدر یہ شخص جزاء کا مستحق ہے اس میں وہ کمی نہیں فرماتا بیشک اللہ تعالیٰ اس کی قدر کو بھی جانتا ہے اور جو زیادہ اس نے اپنا فضل عطا کرنا ہے اسے بھی جانتا ہے۔ (از کبیر)

نکتہ : اللہ تعالیٰ نے اپنی دو صفتوں کا ذکر کیا ایک "شاکر" اور دوسری "علیم"۔

" لان التطوع بالخير يتضمن الفعل والقصد فناسب ذكر الشكر باعتبار الفعل وذكر العلم باعتبار القصد "

اس لئے کہ بھلائی کا کام کرنا دو چیزوں سے متعلق ہوتا ہے ایک فعل یعنی اس پر عمل کرنا اور دوسرا قصد، یعنی اس کام کا ارادہ کرنا۔ اس لئے فعل کے اعتبار سے شکر ذکر کر دیا ہے اور قصد کے لحاظ سے علم کا ذکر کر دیا ہے۔ (روح المعانی)

خیال رہے کہ ﴿ شاکر ﴾ سے تعبیر کرنے کا مقصد یہ بھی ثابت کرنا ہے " **مبالغة في الاحسان الى العباد** " کہ رب تعالیٰ کا بندوں پر بہت بڑا احسان ہے اس لفظ میں مبالغہ پایا گیا ہے۔

اور اسی طرح ﴿ علیم ﴾ **مبالغ في العلم بالاشياء فيعلم مقادير اعمالهم وكيفياتها فلا ينقص من اجورهم شيئا** " اللہ تعالیٰ نے اپنی صفت " **علیم** " سے اشیاء کے علم میں مبالغہ بیان کیا ہے کہ وہ اعمال کی مقادیر کو جانتا ہے اور ان کی کیفیات کو جانتا ہے ان کے اجر میں کسی قسم کی کوئی کمی نہیں کرے گا۔

(از روح المعانی)

﴿ اِنَّ الَّذِیۡنَ یَکۡتُمُوۡنَ مَاۤ اَنۡزَلۡنَا مِنَ الۡبَیِّنٰتِ وَ الۡہُدٰی مِنۡ بَعۡدِ مَا بَیَّنّٰہُ لِلنَّاسِ فِی الۡکِتٰبِ ۙ اُولٰٓئِکَ یَلۡعَنُہُمُ اللّٰہُ وَ یَلۡعَنُہُمُ اللّٰعِنُوۡنَ ☆ اِلَّا الَّذِیۡنَ تَابُوۡا وَ اَصۡلَحُوۡا وَ بَیَّنُوۡا فَاُولٰٓئِکَ اَتُوۡبُ عَلَیۡہِمۡ ۚ وَ اَنَا التَّوَّابُ الرَّحِیۡمُ ﴾

۱) ''بیشک وہ جو ہماری اتاری ہوئی روشن باتوں اور ہدایت کو چھپاتے ہیں بعد اس کے کہ لوگوں کے لئے ہم اس کتاب میں واضح فرما چکے ان پر اللہ کی لعنت ہے اور لعنت کرنے والوں کی لعنت۔ مگر وہ جو توبہ کریں اور سنواریں اور ظاہر کریں تو میں ان کی توبہ قبول فرماؤں گا اور میں ہی ہوں بڑا توبہ قبول کرنے والا مہربان''۔

۲) ''بیشک وہ لوگ جو چھپاتے ہیں اس چیز کو جو نازل کی ہم نے یعنی واضح باتیں اور ہدایت، اس کے بعد جو بیان کیا ہے ہم نے اسے لوگوں کے لئے کتاب میں، ان لوگوں پر لعنت کرتا ہے اللہ اور لعنت کرتے ہیں ان پر لعنت کرنے والے۔ سوائے ان لوگوں کے جنہوں نے توبہ کی اور اصلاح کی اور واضح بیان کیا، تو ان لوگوں کی میں توبہ قبول کرتا ہوں، اور میں بڑا توبہ قبول کرنے والا رحم کرنے والا ہوں''۔

مختصر مطلب: اللہ تعالیٰ نے کتاب میں جن چیزوں کو لوگوں کے لئے واضح طور پر بیان فرما دیا ہے ان واضح اور روشن ارشادات کو اور ہدایت کو جو لوگ چھپاتے ہیں ان پر اللہ تعالیٰ کی لعنت ہے اور لعنت کرنے والوں کی لعنت۔ ہاں البتہ وہ لوگ اس لعنت سے بچے ہوئے ہیں جنہوں نے توبہ کر لی اور اپنی اصلاح کر لی اور اللہ تعالیٰ کے ارشادات اور ہدایت کو واضح طور پر بیان کر دیا۔ ان لوگوں کی اللہ تعالیٰ توبہ قبول فرماتا ہے کیونکہ وہی بہت بڑا توبہ قبول کرنے والا ہے وہی اپنے بندوں پر رحم فرمانے والا ہے۔

قدرے تفصیلی ذکر: آیۂ کریمہ کے شانِ نزول میں چند احتمال ہیں۔

(۱) حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول یہ ہے، انصار کے چند لوگ یہود کے پاس آئے، ان

کے اصحاب علم حضرات سے نبی کریم کی صفات کے متعلق پوچھا، اور کچھ احکام کے متعلق سوال کیا "فکتموا فنزلت الآیة" توانہوں نے چھپایا تو آیۃ کریمہ کا نزول ہوا۔

(۲) شان نزول میں دوسرا قول یہ ہے کہ یہ آیۃ کریمہ یہود اور نصاری کے حق میں نازل ہوئی کہ دونوں فریق ہی حق کو چھپاتے تھے۔

(۳) "انہ کلام مستانف یتناول کل من کتم شیئا من الدین" یہاں سے نئے کلام کو شروع کیا گیا ہے کہ ہر وہ شخص جو دین کے مسائل کو چھپاتا ہے وہی اس آیۃ کا مصداق ہے۔

اصل میں ان تین اقوال میں کوئی تعارض نہیں کیونکہ یہود نے بھی حق کو چھپایا اور نصاری نے بھی۔

لہذا نزول کا سبب تو خاص تھا لیکن الفاظ کے عموم کے پیش نظر حکم عام ہے کوئی شخص بھی حق کو چھپائے گا تو اس پر یہی وعید ہوگی۔

"نزولہ عند سبب معین لا یقتضی الخصوص علی ما ثبت فی اصول الفقہ ان العبرۃ بعموم اللفظ لا بخصوص السبب"

آیۃ کریمہ کا نزول کسی معین سبب کی وجہ سے تخصیص پیدا نہیں کرتا کیونکہ اصول فقہ میں یہ ضابطہ موجود ہے کہ اعتبار عموم لفظ کا ہوتا ہے خصوص سبب کا نہیں۔

"ثبت ایضا فی اصول الفقہ ان ترتیب الحکم علی الوصف مشعر بکون الوصف علۃ لذلک الحکم"

اصول فقہ میں یہ ضابطہ بھی موجود ہے کہ حکم کسی وصف پر مرتب ہوتا ہے جب کسی وصف میں اس حکم کے پائے جانے کی علت بننے کی صلاحیت ہو تو وہ حکم اس وصف پر ثابت ہوگا۔ جب کتمان حق (حق چھپانا) سبب ہے لعنت کا، تو اس حکم کو عام رکھنا ہی صحیح ہے اگر چہ بوجوہ نزول خاص ہی کیوں نہ ہو۔
(از کبیر)

کتمان حق کب برا ہے: "ان العالم اذا قصد کتمان العلم عصی، واذا لم یقصدہ لم یلزمہ التبلیغ اذا عرف انہ مع غیرہ، واما من سئل فقد وجب علیہ التبلیغ لھذہ الآیۃ وللحدیث"

بیشک جب علم کو ارادۃً چھپائے گا گنہگار ہوگا، جب مسائل کو چھپانے کا ارادہ نہ ہو تو اس پر تبلیغ

لازم نہیں کیونکہ اسے معلوم ہے کہ میرے بغیر اور حضرات یہ فریضہ ادا کر رہے ہیں، ہاں اگر کسی سے کوئی مسئلہ پوچھا جائے تو اس پر لازم ہو جاتا ہے کہ وہ بیان کرے اس آیۃ کریمہ سے بھی یہی سمجھ آ رہا ہے اور احادیث سے بھی یہ مسئلہ واضح ہے انشاء اللہ آگے احادیث کا ذکر آ رہا ہے۔ (از قرطبی)

" الکتمان ترک اظهار الشئی مع الحاجة الیه وحصول الداعی الی اظهاره لانه متی لم یکن کذلک لا یعد کتمانا "

جب مسائل بیان کرنے کی حاجت ہو اور ان کو ظاہر کرنے کا مطالبہ پایا جائے تو ایسی صورت میں ان مسائل کو نہ بیان کرنا کتمان علم ہے لیکن جب اس قسم کی ضرورت نہ ہو تو کسی کے خاموش رہنے سے کتمان علم کی وعید اس پر صادق نہیں آئے گی۔ (از کبیر)

مقام توجه : رب تعالیٰ نے فرمایا ﴿ مَا اَنزَلْنَا مِنَ الْبَيِّنٰتِ وَالْهُدٰى ﴾ آیۃ کریمہ میں ﴿اَلْبَيِّنٰتِ﴾ کا معنی کیا ہے؟ " الآیات الواضحة الدالة علی الحق " وہ آیات جو حق پر واضح دلائل ہیں ان کو ﴿بَيِّنٰتِ﴾ کہا جاتا ہے اور ﴿اَلْهُدٰى﴾ کا مطلب؟

" والمراد به ما یهدی الی الرشد مطلقا ومنه ما یهدی الی وجوب اتباعه ﷺ والایمان به وهی الآیات الشاهدة علی صدقه علیه الصلوة والسلام "

جس چیز کے ذریعے بھلائی کی ہدایت مل جائے اسے ﴿ اَلْهُدٰى ﴾ کہا جاتا ہے لہذا وہ آیات جن سے نبی کریم ﷺ کی اتباع اور آپ پر ایمان لانے کی رہنمائی حاصل ہو انہیں بھی ﴿ اَلْهُدٰى ﴾ کہا جاتا ہے اور وہ آیات جو واضح طور پر نبی کریم ﷺ کی صداقت پر دلالت کر رہی ہیں وہ بھی ﴿اَلْهُدٰى﴾ ہیں۔

(از روح المعانی)

اس سے واضح ہوا: جب رب تعالیٰ نے ﴿ اَلْبَيِّنٰتِ وَالْهُدٰى ﴾ ذکر فرمایا تو اسی سے واضح ہوا کہ جن چیزوں کی دین میں زیادہ ضرورت ہے کہ ان کو بیان کیا جائے۔ ان کو قصداً چھپانا اور کسی کے مسئلہ پوچھنے پر چھپانا کتمان حق ہے اسی طرح دنیاوی امور جن کو ظاہر کرنا ضروری ہو جائے مثال کے طور پر گواہی دینا ضروری ہو تو گواہی نہ دینا بھی کتمان حق ہے۔

" وعلی هذا الوجه یمدح من یقدر علی کتمان السر لان الکتمان مما یشق علی النفس "

اسی سے یہ بھی واضح ہو گیا کہ راز کو چھپانا اور ظاہر نہ کرنا اچھا کام ہے، کیونکہ راز کو ظاہر کرنا نفس پر شاق ہوتا ہے، لہٰذ وہ چیزیں جن کا ظاہر کرنا کسی نفس پر شاق گزرے ان سے اجتناب کتمان حق نہیں بلکہ قابل تعریف ہے۔ (از کبیر)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

"حفظت عن رسول الله ﷺ وعائين فاما احدهما فبثثته واما الآخر فلو بثثته قطع هذا البلعوم، اخرجه البخاری قال ابو عبد الله البلعوم مجری الطعام"

میں نے رسول اللہ ﷺ سے دو قسم کے یاد رکھنے والے مسائل یاد کئے ہیں ان میں سے ایک قسم کو میں نے بیان کر دیا ہے لیکن دوسری قسم کو بیان کر دوں تو میری حلقوم کٹ جائے۔ ابو عبداللہ (بخاری رحمہ اللہ کی کنیت ہے) فرماتے ہیں "البلعوم" وہ رگ ہے جس سے طعام معدہ میں جاتا ہے۔ (از قرطبی)

بعض شارحین نے تو یہ ہی بیان کیا ہے کہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے جن احادیث کو نہیں بیان کیا یہ وہی ہیں جن میں رسول اللہ ﷺ کے راز مذکور ہیں مرقاۃ اور نووی میں یہ وجہ مذکور ہے۔

تاہم علامہ قرطبی رحمہ اللہ نے بیان کیا ہے کہ جن احادیث کو حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے نہیں بیان فرمایا ان کی اصل وجہ یہ ہے "خاف علی نفسه فتنة او القتل" کہ آپ کو یہ خطرہ تھا کہ اگر ان کو بیان کر دیا گیا تو مجھے مصیبتوں میں مبتلاء ہونا پڑے گا یا مجھے قتل کر دیا جائے گا کیونکہ ان احادیث میں "والنص علی اعیان المرتدين والمنافقين" مرتدین اور منافقین کو معین کر کے ذکر کیا گیا ہے۔ (از قرطبی)

یہ مقامات کتمان حق میں نہیں آتے: "لا يجوز تعليم الكافر القرآن والعلم حتى يسلم" کافر کو قرآن پاک کی تعلیم دینا اور دیگر علوم کی اس وقت تک تعلیم دینا منع ہے جب تک وہ اسلام قبول نہ کر لے لہٰذا کافر کو تعلیم نہ دینا کتمان حق نہیں:

"وكذا لا يجوز تعليم المبتدع الجدال والحجاج ليجادل به اهل الحق"

اسی طرح بدعتی شخص یعنی دین کے خلاف امور کو رواج دینے والے کو تعلیم دینا جائز نہیں کیونکہ وہ تو ہے ہی جھگڑالو اور حجت باز اسے تعلیم دے کر اہل حق سے اور زیادہ جھگڑا کرنے پر قادر کرنا ہے لہٰذا

واضح ہوا کہ دین کے خلاف کام کرنے والے کوتعلیم نہ دینا کتمان حق نہیں۔

" ولا یعلم الخصم علی خصمه حجة یقطع بها ماله " کوئی شخص اپنے مدمقابل جھگڑا کرنے والے کوایسے دلائل کی تعلیم نہ دے جن کی وجہ سے وہ اس کا مال ہی ہتھیالے۔

" ولا یعلم السلطان تاویلا یتطرق به الی مکاره الرعیة " اور بادشاہ کواس طرح کی تاویلات نہ سکھائے جن کی وجہ سے وہ رعیت کے لئے وبال جان ہی بن جائے۔

یہ تو صحیح تاویلات کا مسئلہ ہے غلط اورمن گھڑت تاویلات سکھا کر بادشاہ کوظالم بنانے والےاور اپنی عاقبت برباد کرنے والے بکاؤ مولویوں کا انجام کیا ہوگا۔

واضح ہوا کہ بادشاہ کوتاویلات کی تعلیم نہ دینا کتمان حق نہیں بلکہ رعیت پرمہربانی اوررحم ہے۔

" ولا ینشر الرخص فی السفهاء فیجعلوا ذلک طریقا الی ارتکاب المحظورات وترک الواجبات ونحو ذلک "

بے وقوفوں کوایسے حیلے نہ سکھائے جن کی وجہ سے وہ شریعت میں ممنوع چیزوں کے مرتکب ہوجائیں اورواجبات کوچھوڑنے کے وہ مرتکب ہوجائیں۔

واضح ہوا کہ بے وقوفوں کوکھلی چھٹی دے کرممنوعات کا مرتکب بنانا اورواجبات کوچھوڑنے والا بنانا منع ہے۔

یعنی بے وقوفوں کوحیلے، حجتیں نہ سکھانا کتمان حق نہیں بلکہ حق ہے۔

☆ " یروی عن النبی ﷺ انه قال ، لا تمنعوا الحکمة اهلها فتظلموهم ولا تضعوها فی غیر اهلها فتظلموها "

نبی کریم ﷺ کا ارشادگرامی ہے کہ جولوگ علم حاصل کرنے کے اہل ہیں ان سے علم دور نہ رکھو ورنہ تمہاری طرف سے ان پرظلم ہوگا۔اور جوعلم حاصل کرنے کے اہل نہیں ان کوعلم سکھاؤ نہیں ورنہ ان پر ظلم ہوگا۔

ارشاد مصطفوی سے واضح ہوا کہ بدطینت کوعلم سکھا کرلوگوں کومصیبت میں ڈالنا ہے کیونکہ اس

سے خیر کی توقع نہیں ہوسکتی۔ وہ لوگوں کو گمراہ کرے گا ہدایت نہیں دے سکے گا۔

☆ " وروی عنه ﷺ انه قال لا تعلقوا الدر فی اعناق الخنازیر ، یرید تعلیم الفقه من لیس من اهله "

نبی کریم ﷺ نے فرمایا خنزیروں کی گردنوں میں موتی نہ ڈالو۔ اس سے بھی مراد یہ ہے کہ جو فقہ کا علم حاصل کرنے کی اہلیت نہیں رکھتا اسے نہ تعلیم دو۔ سبحان اللہ کیا ہی خوب تشبیہ ہے کہ نا اہل لوگ ناپاک ہیں ان کو پاک علم کی تعلیم دے کر ان کو اور زیادہ پاک لوگوں کے لئے مصیبت کا سبب بنانا ہے۔
(از قرطبی)

کتمان علم پر وعید: " عن ابی هریرة قال قال رسول الله ﷺ من سئل عن علم علمه ثم کتمه الجم یوم القیامة بلجام من نار "
(رواه احمد وابوداؤد والترمذی ورواه بن ماجه عن انس ، مشکوة کتاب العلم)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس شخص سے علم کے متعلق سوال کیا گیا اس نے علم حاصل کیا پھر اسے چھپایا قیامت کے دن اسے آگ کا لگام ڈالا جائے گا۔ حدیث شریف میں ذکر ہے " الجم " لگام منہ میں ڈالا جاتا ہے" علم اور کلام بھی منہ سے نکلتے ہیں اس لئے جب اس سے سوال کیا جائے، وہ علم کو چھپائے تو منہ میں ہی لگام بھی ڈالا جائے گا۔

اور یہ واضح ہوتا ہے کہ حیوان سے تشبیہ دی گئی کیونکہ عالم کے لئے حق بات کو چھپانا اور بوقت ضرورت بیان نہ کرنا ایسا ہی ہے جیسا کہ حیوان ہو، وہ بے سمجھ ہے یہ بھی گویا کہ بے سمجھ ہے۔

تنبیہ: اس حدیث کو ابن حبان اور ابو یعلی نے بھی بیان کیا ہے اور اس کو تائید سخاوی رحمہ اللہ کی مقاصد حسنہ کی روایت سے ملتی ہے وہ یہ ہے " من کتم علما یعلمه الجم یوم القیامة بلجام من نار لجماعة " اس حدیث کو ترمذی نے حسن کہا اور حاکم نے صحیح کہا ہے۔

زین العرب نے مندرجہ بالا حدیث پر خطابی کی تابعداری کرتے ہوئے یہ جو کہا

" وقد تکلم فی هذا لحدیث بعض العلماء بانه ضعیف بل هو موضوع "

(کہ یہ حدیث ضعیف ہے یا موضوع ہے) (از مرقاة)

راقم کے نزدیک زین العرب کا قول یقیناً علامہ علی قاری رحمہ اللہ کے نزدیک بھی غیر معتبر ہے

کیونکہ انہوں نے اس قول کونقل کرنے کے بعد " المقاصد الحسنة للسخاوی " کی روایت کونقل کیااور کہاہے " وحسنه الترمذی وصححه الحاکم " کاش کہ ایک پہلوکودیکھنے والے مسائل کو سمجھنے کی صلاحیت پیدا کریں۔

☆ " عن عائشة رضی الله عنها انها قالت من زعم ان محمدا علیه الصلوة والسلام کتم شیئا من الوحی فقد اعظم الفریة علی الله والله تعالیٰ یقول ان الذین یکتمون ما انزلنا من البینات ......الخ "

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں جن لوگوں نے گمان کیا کہ بیشک محمد ﷺ نے وحی سے کچھ چیزوں کو چھپایا انہوں نے اللہ تعالیٰ پر بہت بڑا بہتان باندھا۔ پھر حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے یہی آیۃ پڑھی:

" اِنَّ الَّذِیْنَ یَکْتُمُوْنَ مَا اَنْزَلْنَا مِنَ الْبَیِّنَاتِ وَالْهُدٰی " (از کبیر)

سبحان اللہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا کلام کتنا ہی علم کا دریا ایک کوزہ میں بند ہے۔ جب وحی کے چھپانے کی نسبت نبی کریم ﷺ کی طرف کی جائے تو یہ اللہ تعالیٰ پر بہت بڑا افتراء ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا نبی اللہ کے حکم کی خلاف ورزی کرے یہ ممکن ہی نہیں۔ جب رب تعالیٰ نے علم کو چھپانے والوں کی مذمت بیان کی اوران کولعنت کا مستحق قرار دیا تو اللہ تعالیٰ کے نبی سے کتمان علم کا گمان کرنا درحقیقت رب تعالیٰ پرافتراء کہ اس کا نبوت کا انتخاب غلط ہے۔(معاذ اللہ)

☆ " عن ابی هریرة رضی الله عنه قال لو لا آیة فی کتاب الله تعالیٰ ما حدثت احدا بشئی ابدا ثم تلا هذه الآیة " (رواه البخاری وابن ماجه وغیرهما)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں اگر اللہ تعالیٰ کی کتاب (قرآن مجید) میں ایک آیۃ نہ ہوتی تو میں کسی کے سامنے کوئی ایک حدیث بھی نہ بیان کرتا پھر آپ نے یہی (زیربحث) آیۃ پڑھی۔ (روح المعانی)

مِنْ بَعْدِ مَا بَیَّنّٰهُ لِلنَّاسِ فِی الْکِتٰبِ: جس طرح شان نزول میں اقوال پیش کئے جاچکے ہیں ان کے مطابق اگر ﴿ اَلْکِتٰبِ ﴾ سے مراد توراۃ ہو اوراس میں جو بیان کیا گیا ہے اس سے مراد نبی کریم ﷺ ہوں " فعلی هذا یکون المراد بالناس علماء بنی اسرائیل " تو ﴿ اَلنَّاسِ ﴾

سے مراد بنی اسرائیل کے علماء ہوں گے۔

" ومن قال ان المراد بالكتاب جميع ما انزل الله على الانبياء من الاحكام قال المراد بالناس العلماء كافة "

جن حضرات نے یہ کہا کہ ''کتاب'' سے مراد تمام انبیاء کرام پر نازل ہونے والے احکام ہیں انہوں نے کہا کہ ﴿ اَلنَّاسُ ﴾ سے مراد ہر زمانہ کے تمام علماء کرام ہیں۔ (خازن)

ابوالسعو درحمہ اللہ نے ﴿ الناس ﴾ کو عام رکھا ہے کہ تمام لوگوں پر جو بیان کیا گیا۔

اُولٰئِکَ یَلْعَنُهُمُ اللّٰهُ : ''ان لوگوں پر اللہ تعالیٰ کی لعنت ہے۔

﴿ اُولٰئِکَ ﴾ کا اشارہ ﴿ اِنَّ الَّذِیْنَ یَکْتُمُوْنَ مِنَ الآیَاتِ ﴾ ''بیشک وہ لوگ جو آیات کو چھپاتے ہیں'' کی طرف ہے۔ (خازن) ﴿ یلعنھم اللہ ﴾ اللہ ان کو اپنی رحمت سے دور کرتا ہے " واصل اللعن في اللغة الطرد والابعاد " اصل میں لغت میں لعنت کا معنی ہی ''ہانکنا'' اور دور کرنا ہے۔ (خازن)

طلباء کرام توجه فرمائیں: پہلے بیان ہوا ﴿ من بعد بیناہ ﴾ جمع متکلم کا صیغہ ہے "بینا" اب اس کے مطابق " نلعنھم " ہونا چاہئے تھا لیکن غائب کا صیغہ اور فاعل اسم ظاہر لفظ ''اللہ'' ذکر فرمایا اس میں تکلم سے غیب کی طرف التفات پایا گیا ہے اس کی وجہ یہ ہے:

" والالتفات الى الغيبة باظهار اسم الذات لتربية المهابة والاشعار بان مبدأ صدور اللعن صفة الجلال المغائرة لما هو مبدأ الانزال والتبيين من صفة الجمال "

کہ یہ بتانا مقصو ہے کہ لعنت کا صدور رب تعالیٰ کی صفت جلال سے متعلق ہے اس لئے رب تعالیٰ نے اپنا اسم گرامی ذکر فرمایا جو تمام صفات کمالیہ پر دلالت کرتا ہے ان صفات میں صفت جلالیہ بھی ہے۔ لیکن احکام و آیات کو نازل کرنا اور ان کو بیان کرنا صفت جمال ہے۔

اس لئے ان کے بیان میں متکلم کا صیغہ ذکر کیا تا کہ یہ بھی واضح ہو جائے کہ دونوں ایک دوسرے کے مغائر ہیں۔ (روح المعانی)

ویلعنھم اللاعنون : ''اور لعنت کرتے ہیں ان پر لعنت کرنے والے''

لعنت کرنے والے کون ہیں؟ اس میں عموم پایا گیا ہے کہ ان پر فرشتے لعنت کرتے ہیں اور تمام لوگ ان پر لعنت کرتے ہیں۔ جن میں انبیاء کرام اور صالحین حضرات بھی ہیں۔ (کبیر)

﴿ یَلْعَنُهُمُ اللّٰعِنُوْنَ ﴾ کی تفسیر میں جلالین میں مذکور ہے:

" الملائکة والمؤمنون او کل شئی بالدعاء علیهم باللعنة "

ان پر ملائکہ اور مؤمنین لعنت کرتے ہیں بلکہ ہر چیز ان پر لعنت کی دعا کرتی ہے۔

" او کل شئی " جلالین کی عبارت کی وضاحت صاوی میں یوں کی گئی ہے " ای حتی الجمادات والحیتان فی البحر " ہر چیز سے مراد جمادات اور دریا کی مچھلیاں ہیں۔

اس پر حدیث پاک شاہد ہے " العاصی یلعنه کل شئی حتی الحیتان فی البحر " گنہگار شخص پر ہر چیز لعنت کرتی ہے یہاں تک کہ دریا میں مچھلیاں بھی اس پر لعنت کرتی ہیں۔

خیال رہے " او کل شئی " میں " او " تنویع کے لئے ہے شک کے لئے نہیں، اسی لئے راقم نے اس کا ترجمہ "بلکہ" کیا ہے۔ (از جلالین وصاوی)

" وقال مجاهد وعکرمة هم الحشرات والبهائم یصیبهم الجدب بذنوب علماء السوء الکاتمین فیلعنونهم "

مجاہد اور عکرمہ کا قول یہ ہے کہ حشرات الارض (سانپ، بچھو، کیڑے مکوڑے وغیرہ) اور چوپائے ان پر لعنت بھیجتے ہیں کیونکہ علماء سوء (برے علماء) حق کو چھپانے والوں کی نحوست کی وجہ سے وہ قحط میں مبتلاء ہو جاتے ہیں انہیں پانی میسر نہیں ہوتا۔ (قرطبی)

براء بن عازب اور ابن عباس رضی اللہ عنہم کا استدلال:

" اللاعنون کل المخلوقات ما عدا الثقلین الجن والانس وذلک ان النبی ﷺ قال، الکافر اذا ضرب فی قبره فصاح سمعه الکل الا الثقلین ولعنه کل سامع "

"لاعنون" سے مراد تمام مخلوق ہے سوائے ثقلین یعنی جنوں اور انسانوں کے۔

اس پر دلیل یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کافر کو جب قبر میں مارا جاتا ہے تو تمام مخلوق اس کے چلانے کو سنتے ہیں سوائے ثقلین (جن وانس) کے اور ہر سننے والا اس پر لعنت بھیجتا ہے (قرطبی)

یہ استدلال معتبر نہیں کیونکہ قبر کے عذاب کو جنوں اور انسانوں سے مخفی رکھنے کی یہ وجہ ہے کہ دنیا امتحان کا مقام ہے اگر ان پر عذاب ظاہر ہو جائے تو سب نیک ہو جائیں امتحان کا مقصد فوت ہو جاتا ہے سننے والوں کی لعنت کا ذکر ہے نہ سننے والوں کا لعنت نہ بھیجنے کا ذکر نہیں بلکہ آنے والی آیۃ میں کفار پر ملائکہ اور تمام انسانوں کی لعنت کا ذکر ہے۔

عربی گرائمر کا قانون: جب ذوی العقول اور غیر ذوی العقول پر اجتماعی طور پر کسی لفظ کا اطلاق ہو تو ذوی العقول کو غالب سمجھتے ہوئے قاعدہ تغلیب جاری کرتے ہیں الفاظ اس طرح ذکر کریں گے جو ذوی العقول کے لئے استعمال ہوتے ہیں جیسے ﴿ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ﴾ میں ''عالمین'' جمع یا نون سے آئی ہوئی ہے جو ذوی العقول کے لئے آتی ہے۔

اگر صرف غیر ذوی العقول کے لئے الفاظ کا استعمال کیا جائے لیکن صیغے جمع مذکر کے ہوں یا جمع مذکر سالم کا استعمال ہو تو پہلے غیر ذوی العقول کو ذوی العقول کے درجے میں رکھا جاتا پھر ان کے مناسب صیغے استعمال کئے جاتے ہیں جیسے:

﴿ وَالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ رَاَیْتُهُمْ لِیْ سٰجِدِیْنَ ، یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ ادْخُلُوْا مَسٰكِنَكُمْ، وَقَالُوْا لِجُلُوْدِهِمْ لِمَ شَهِدْتُّمْ عَلَیْنَا ، وَكُلٌّ فِیْ فَلَكٍ یَّسْبَحُوْنَ ﴾

'' لاعنون '' کا اطلاق جب ذوی العقول اور غیر ذوی العقول تمام پر ہو گا تو قاعدہ تغلیب جاری ہو گا۔ اگر براء بن عازب اور ابن عباس رضی اللہ عنہما کے استدلال کو دیکھا جائے کہ صرف غیر ذوی العقول کو شامل ہے تو دوسرا قانون جاری ہو گا۔ (ماخوذ از کبیر بتصرف)

اِلَّا الَّذِیْنَ تَابُوْا وَاَصْلَحُوْا وَبَیَّنُوْا فَاُولٰٓئِكَ اَتُوْبُ عَلَیْهِمْ وَاَنَا التَّوَّابُ الرَّحِیْمُ :

''سوائے ان لوگوں کے جنہوں نے توبہ کی اور اصلاح کی اور واضح بیان کیا تو ان لوگوں کی میں توبہ قبول کرتا ہوں اور میں بڑا توبہ قبول کرنے والا ، رحم کرنے والا ہوں''۔

پہلے ذکر فرمایا کہ جو لوگ آیات کو چھپاتے ہیں وہ لعنت کے مستحق ہیں اس سے استثناء کرتے ہوئے فرمایا

ہاں وہ لوگ اس لعنت سے دور رہیں گے جنہوں نے توبہ کر لی اور اپنی اصلاح کر لی اور واضح بیان کیا تو ان لوگوں کی میں توبہ قبول کرتا ہوں میں بڑا توبہ قبول کرنے والا، رحم کرنے والا ہوں۔

توبہ میں صرف یہ کہنا دینا کافی نہیں میں نے توبہ کی " حتی یظھر منه فی الثانی خلاف الاول " یہاں تک کہ وہ جس کام سے توبہ کر رہا ہے اس کے خلاف کام پر عمل کرے۔ اگر مرتد ہو گیا تھا تو اس کی توبہ یہ ہے اسلام کی طرف لوٹے اور شرائع اسلام کو ظاہر کرے۔

اگر گنہگار اپنے گناہوں سے توبہ کر رہا ہے تو اس کی توبہ یہ ہے کہ وہ نیک اعمال پر عمل کرے گناہوں کو چھوڑ دے۔ اور اگر بت پرست تھا تو اس کی توبہ یہ ہے کہ بت پرستوں سے اجتناب کرے اور اہل اسلام سے مل جائے۔ اسی طرح جس کام سے توبہ کر رہا ہو اس کو چھوڑ دے اور اس کے خلاف پر عمل کرے۔ (قرطبی)

اللہ تعالیٰ نے جب کتمان آیات پر عظیم وعید فرمائی تو اس سے وہم ہوتا تھا کہ شائد یہ وعید ان کو ہمیشہ لاحق رہے گی تو اس کا ازالہ فرمایا کہ " اذا تابوا تغیر حکمھم و دخلوا فی اھل الوعد " جب وہ توبہ کر لیں گے تو اہل وعد میں داخل ہو جائیں۔

خیال رہے وعید کا استعمال عذاب کے لئے ہے اور وعد کا استعمال ثواب کے لئے ہے جب توبہ کا مطلب ہے " ان لاتوبة عبارة عن الندم علی فعل القبیح " کہ برے فعل پر نادم ہو جانا۔ پھر توبہ میں اخلاص ضروری ہے یعنی " لابدله بعد التوبة من اصلاح ما افسده " جو فساد کے کام کیے تھے ان میں اصلاح پیدا کرنا در حقیقت توبہ میں اخلاص ہے اسی لئے رب تعالیٰ نے ﴿ تَابُوْا ﴾ کے بعد ﴿ وَاَصْلَحُوْا ﴾ ذکر فرمایا۔

پھر یہ جاننا بھی ضروری ہے کہ " ان التوبة لا تحصل الا بترک کل ما ینبغی وبفعل کل ما ینبغی " بیشک توبہ یہ ہے کہ تمام غیر مناسب کاموں کو چھوڑ دینا اور جو مناسب کام ہیں ان پر عمل کرنا۔

اسی لئے رب تعالیٰ نے ﴿ اِنَّ الَّذِیْنَ یَکْتُمُوْنَ مِنَ الْبَیِّنَاتِ ﴾ کے بعد توبہ کرنے والوں کا ذکر فرماتے ہوئے بیان فرمایا ﴿ وَبَیَّنُوْا ﴾ کہ ان کی توبہ تب قبول ہوگی جب وہ کتمان آیات کو چھوڑ کر

ان کو واضح طور پر بیان کرنا شروع کریں گے۔ (از کبیر)

معتزلہ کا مذہب: آیۃ دلالت کرتی ہے کہ بعض گناہوں سے توبہ اور بعض گناہوں پر قائم رہنا توبہ نہیں "لان قولہ تعالیٰ ﴿ وَاَصْلَحُوْا ﴾ عام فی الکل " اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ﴿وَاَصْلَحُوْا ﴾ یہ عام ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ تمام کام اچھے کرے۔

اہل سنت کا مذہب یہ ہے کہ جس گناہ سے توبہ کرے اسے چھوڑ دے اور اس کے خلاف اچھا کام کرے تو اس گناہ کی توبہ قبول ہوجاتی ہے اگرچہ دوسرے گناہ، گناہ ہی ہیں۔" **ان اللفظ المطلق یکفی فی صدقہ حصول فرد واحد من افرادہ** " بیشک مطلق لفظ کا ایک فرد پر صادق آنا بھی کافی ہے۔

اور دلیل یہ ہے کہ توبہ کا قبول کرنا عقلاً واجب نہیں رب تعالیٰ اپنے فضل سے توبہ قبول کرتا ہے اور اسی وجہ سے رب تعالیٰ نے " **ذکر ذلک فی معرض المدح والثناء علی نفسہ ولو کان ذلک واجبا لما حسن ھذا المدح** " توبہ کی قبولیت کو اپنی ذات کے مقام مدح وثناء میں ذکر فرمایا اگر توبہ قبول کرنا رب تعالیٰ پر واجب ہوتا تو اسے مقام مدح میں ذکر نہ کیا جاتا۔

جب رب تعالیٰ پر توبہ قبول کرنا واجب نہیں بلکہ اپنے فضل وکرم سے توبہ قبول فرماتا ہے تو اس کی شان کریمی کے یہی لائق ہے کہ بندہ جس گناہ سے توبہ کرے اسے قبول فرمالے اگرچہ وہ کسی اور گناہ میں مبتلاء ہی کیوں نہ ہو۔

اور دلیل یہ ہے کہ "معنیٰ ﴿ اَتُوْبُ عَلَیْھِمْ ﴾ **اقبل توبتھم وقبول التوبۃ یتضمن ازالۃ عقاب ماتاب منھا** " ﴿ اَتُوْبُ عَلَیْھِمْ ﴾ کا معنیٰ یہ ہے کہ میں ان کی توبہ قبول کرتا ہوں، توبہ کا قبول کرنا یہی تو ہے کہ جس گناہ سے توبہ کرے اسے رب تعالیٰ اپنے فضل سے قبول فرمالے۔

(ماخوذ از کبیر)

اعتراض: ﴿ فَاُولٰٓئِکَ اَتُوْبُ عَلَیْھِمْ ﴾ کا معنیٰ توبہ کی قبولیت پر جزاء اور ثواب دینا کیوں نہیں مراد لیا جاتا جیسا کہ طاعت کی قبولیت پر جزاء اور ثواب دینا مراد لے لیا جاتا ہے۔

جواب: طاعت کا فائدہ ہی استحقاق ثواب ہے اس کے بغیر اور کوئی استحقاق نہیں یہی غرض ہے اس

کے فعل کی لیکن توبہ کی قبولیت اصل میں عذاب کے دور کرنے کے لئے وضع ہے اور وہی اس کے فعل کی غرض ہے۔ ہاں البتہ اگر تمام گناہوں سے توبہ کر لی تو مستحق ثواب بھی ہو گیا لیکن یہ مجازی معنی ہے۔

وانا التواب الرحیم : ﴿اَلتَّوَّابُ﴾ القابل لتوبة كل ذى توبة فهو مبالغة فى هذا الباب "

﴿اَلتَّـوَّابُ﴾ کا مطلب ہے ہر توبہ قبول کرنے والے کی توبہ قبول کرنے والا یہ مبالغہ کا صیغہ ہے۔ اسی وجہ سے اعلیٰ حضرت نے ترجمہ کیا (بڑا توبہ قبول کرنے والا) راقم نے بھی یہی نقل کیا۔ اس کے بعد ﴿اَلـرَّحِیـمُ﴾ ذکر کیا جس سے واضح کیا کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں پر رحم کرنے والا ہے وہ گناہ بھی کرتے ہیں اور اعمال میں کوتاہیاں بھی لیکن اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے ان کی توبہ قبول فرماتا ہے۔

(از کبیر)

مسئلہ : " لا خلاف فى جواز لعن الكفار فاما الكافر المعين فقد ذهب جماعة من العلماء انه لا يلعن لانا لا ندرى بما يختم الله له "

کافروں پر لعنت کرنے کے جواز میں کوئی اختلاف نہیں البتہ کسی معین کافر کا نام لے کر لعنت جائز نہیں کیونکہ ہمیں علم نہیں کہ اس کا خاتمہ ایمان پر ہوا یا کفر پر (صابونی)

ہاں البتہ جن لوگوں کا کفر قرآن پاک اور حدیث پاک سے یقینی طور پر ثابت ہے ان پر شخصی لعنت بھی جائز ہے جیسا کہ ابوجہل، ابولہب، فرعون وغیرہ۔

خیال رہے مسلمان خواہ کتنا ہی گنہگار کیوں نہ ہو اس پر لعنت اس معنی کے لحاظ سے جائز نہیں کہ وہ اللہ تعالیٰ کی رحمت سے مطلقاً محروم رہے البتہ گنہگار کے لئے رحمت خاصہ سے محرومیت کے معنی میں لعنت جائز ہے۔ (راقم)

گزشتہ سے پیوستہ : " عن مجاهد فى قوله ويلعنهم اللاعنون قال ان البهائم اذ اشتدت عليهم السنة قالت هذا من اجل عصاة بنى آدم لعن الله عصاة بنى آدم "

حضرت مجاہد نے ﴿وَيَلْعَنُهُمُ اللّٰعِنُوْنَ﴾ کی تفسیر میں ذکر کیا ہے کہ چوپاؤں پر جب سال سخت ہو جاتا ہے یعنی قحط پڑ جاتا ہے تو وہ کہتے ہیں کہ یہ گنہگار انسانوں کی نحوست کی وجہ سے تو وہ کہتے ہیں اللہ کی لعنت ہو گنہگار انسانوں پر۔ (در منثور)

☆ " عن مجاهد فى قوله تعالىٰ ﴿وَيَلْعَنُهُمُ اللّٰعِنُوْنَ﴾ قال دواب الارض العقارب

والخنافس يقولون انما منعنا القطر بذنوبهم فيلعنونهم ، اخرجه ابو نعيم فى الحلية والبيهقى فى شعب الايمان "

حضرت مجاہد نے اللہ تعالیٰ کے ارشاد ﴿ وَيَلْعَنُهُمُ اللّٰعِنُوْنَ ﴾ کی تفسیر میں ذکر کیا کہ زمین پر چلنے والے تمام جانور یہاں تک کہ بچھو اور بھونڈ بھی کہتے ہیں کہ ہمیں پانی کے قطرہ سے ان لوگوں کے گناہوں کی وجہ سے محروم کر دیا گیا ہے ان پر اللہ کی لعنت ہو۔ (درمنثور)

☆ " عن ابن مسعود فى هذه الآية قال هو الرجل يلعن صاحبه فى امر يرى ان قداتى اليه فترتفع اللعنة فى السماء سريعا فلا تجد صاحبها التى قيلت له اهلا فترجع الى الذى تكلم بها فلا تجده لها اهلا فتنطلق فتقع على اليهود فهو قوله ﴿ وَيَلْعَنُهُمُ اللّٰعِنُوْنَ ﴾ فمن تاب منهم ارتفعت عنه اللعنة "

حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے اس آیۃ کی تفسیر میں ذکر کیا ہے کہ جب کوئی شخص کسی پر لعنت بھیجتا ہے تو وہ لعنت جلدی ہی آسمانوں کی طرف بلند ہوتی ہے جس شخص پر لعنت کی گئی اگر وہ لعنت کا مستحق نہ ہو تو وہ اس شخص کی طرف لوٹ کر آتی ہے جس نے لعنت کی اگر وہ بھی مستحق نہ ہو تو وہ لعنت چلتے چلتے یہود پر واقع ہو جاتی ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے ﴿وَيَلْعَنُهُمُ اللّٰعِنُوْنَ ﴾ ہاں اگر کوئی شخص ان سے توبہ کر لے تو وہ لعنت اس سے اٹھ جاتی ہے۔ جیسا ﴿ اِلَّا الَّذِيْنَ تَابُوْا ﴾ سے سمجھ آیا۔ (درمنثور)

☆☆☆☆☆

﴿ اِنَّ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا وَمَاتُوۡا وَھُمۡ کُفَّارٌ اُولٰٓئِکَ عَلَیۡھِمۡ لَعۡنَةُ اللّٰہِ وَالۡمَلٰٓئِکَةِ وَالنَّاسِ اَجۡمَعِیۡنَ ☆ خَالِدِیۡنَ فِیۡھَا لَا یُخَفَّفُ عَنۡھُمُ الۡعَذَابُ وَلَا ھُمۡ یُنۡظَرُوۡنَ ﴾

۱) ''بیشک وہ جنہوں نے کفر کیا اور کافر ہی مرے ان پر لعنت اللہ اور فرشتوں اور آدمیوں سب کی ہمیشہ رہیں گے اس میں نہ ان پر سے عذاب ہلکا ہو اور نہ انہیں مہلت دی جائے''۔

۲) ''بیشک وہ جنہوں نے کفر کیا اور مر گئے ایسے حال میں کہ وہ کافر تھے، وہ لوگ ان پر لعنت اللہ اور فرشتوں اور لوگوں سب کی ہمیشہ رہیں گے وہ اس میں نہیں تخفیف کی جائے گی ان سے عذاب کی اور نہ ان کو مہلت دی جائے گی''۔

اس آیۂ کریمہ میں دو احتمال ہیں ایک یہ ہے کہ اس میں استیناف (نیا کلام) پایا جائے اور حکم عام کافروں کو شامل ہے کہ تمام کافر جن کی موت کفر پر آئے ان پر اللہ اور فرشتوں اور تمام لوگوں کی لعنت ہے۔

دوسرا احتمال یہ ہے کہ یہ آیۃ ﴿ اِنَّ الَّذِیۡنَ یَکۡتُمُوۡنَ ﴾ پر مرتب ہے اب مطلب یہ ہوگا کہ وہ لوگ جو واضح مسائل و احکام اور ہدایت کو چھپاتے ہیں ان کی زندگی میں ان پر لعنت ہو پھر ان میں سے توبہ کرنے والوں کا حال ذکر کیا پھر ذکر کیا کہ جن کی موت بغیر توبہ کے حالت کفر پر آجائے ان پر لعنت ہے اللہ اور فرشتوں اور تمام لوگوں کی '' **فکأنہ قیل انھم ملعونون حال الحیاۃ وبعد الموت الا من تاب منھم** '' گویا کہ یہ کہا گیا ہے کہ کتمان آیات والے زندگی میں اور موت کے بعد لعنت کے مستحق ہیں سوائے انکے جنہوں نے ان میں سے توبہ کر لی۔

زمخشری نے بھی یہ ذکر کیا ہے '' **لعنتھم احیاء ولعنتھم امواتا** '' ان پر لعنت ہے حالت حیات میں بھی اور حالت ممات میں بھی۔ (از شیخ زادہ، کشاف)

اعتراض: جب پہلے بھی ذکر ہو چکا ہے ﴿ اُولٰٓئِکَ یَلۡعَنُھُمُ اللّٰہُ ﴾ تو پھر ﴿ اُولٰٓئِکَ عَلَیۡھِمۡ لَعۡنَةُ اللّٰہِ ﴾ کے ذکر کا کیا فائدہ ہے۔

جواب : پہلے جملہ میں خبر جملہ فعلیہ ہے جو حدوث اور تجدد پر دلالت کرتا ہے دوسرے جملہ میں خبر اسم ہے جو دوام واستمرار پر دلالت کرتا ہے اس لئے ﴿اُولٰئِکَ عَلَیۡهِمۡ لَعۡنَةُ اللّٰهِ﴾ کا مطلب یہ ہے "استقر علیهم اللعن من الله" ان پر اللہ تعالیٰ کی لعنت ہمیشہ کے لئے ثابت ہے۔

(از شیخ زادہ وبیضاوی)

تنبیہ : ﴿وَهُمۡ كُفَّارٌ﴾ "الواو واو الحال" ﴿وَهُمۡ كُفَّارٌ﴾ میں واوَ حال کے لئے ہے۔

(قرطبی)

اگر چہ اعلیٰ حضرت کا ترجمہ بھی حال کے مطابق ہی ہے لیکن میں نے ترجمہ حال کے مطابق واضح طور پر ذکر کیا ہے تا کہ طلباء کرام صحیح سمجھ سکیں۔

مقام توجہ : بعض حضرات نے ابن عربی کے اس قول " والصحیح عندی جواز لعنه لظاهر حاله ولجواز قتله وقتاله " (میرے نزدیک صحیح یہ ہے کہ ہر شخص کے ظاہر حال کو دیکھ کر لعنت کرنی جائز ہے۔اسی طرح اس کے ظاہر حال کو دیکھ کر اس سے قتل وقتال جائز ہے) پر اعتراض کیا ہے کہ مسلمانوں پر لعنت جائز نہیں۔لیکن یہ قول درست نہیں کیونکہ جیسا پہلے بیان کیا جا چکا ہے کہ مسلمانوں پر لعنت بمعنی رحمت خاصہ سے محرومی کے جائز ہے۔(ابن عربی رحمہ اللہ کا قول درست ہے) نبی کریم ﷺ نے فرمایا: " لعن الله السارق یسرق البیضة فتقطع یده "

اللہ تعالیٰ کی لعنت ہو اس چور پر جو انڈا (چاندی یا سونا انڈے کے برابر) چوری کرلے اور اس کا ہاتھ کاٹ دیا جائے۔

(قرطبی)

" کل من جاهر بالمعاصی کشراب الخمر وآکلة الربو ومن تشبه من النساء بالرجال ومن الرجل بالنساء الی غیر ذلک مما ورد فی الاحادیث لعنه "

ہر وہ شخص جو معاصی کا مرتکب ہو جیسے شراب پینے والا اور سود کھانے والا اور مردوں کی مشابہت کرنے والی عورتوں پر اور وہ مرد جو عورتیں کی مشابہت کرنے والے ہیں ان پر احادیث مبارکہ سے لعنت کرنا ثابت ہے۔

(ماخوذ از قرطبی)

اعتراض : اس آیۃ کریمہ میں ذکر کیا گیا ہے ﴿وَالنَّاسِ اَجۡمَعِيۡنَ﴾ سب لوگ ان پر لعنت

کرتے ہیں حالانکہ ان کے اپنے دین اور مذہب والے ان پر لعنت نہیں کرتے تو کس طرح کہنا صحیح ہے کہ سب لوگ ان پر لعنت کرتے ہیں۔

جواب اول: ان پر ان کے اپنے دین والے بھی آخرت میں لعنت کریں گے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: ﴿ ثُمَّ يَوْمَ الْقِيَامَةِ يَكْفُرُ بَعْضُكُمْ بِبَعْضٍ وَّيَلْعَنُ بَعْضُكُمْ بَعْضًا ﴾

''پھر قیامت کے دن بعض، بعض سے کفر کریں گے اور تم میں سے بعض، بعض پر لعنت بھیجیں گے''

جواب دوم: قتادہ اور ربیع کا قول یہ ہے کہ ﴿وَالنَّاسِ اَجْمَعِيْنَ﴾ سے مراد مومن لوگ ہیں۔ گویا کہ غیر کا اعتبار ہی نہیں کیا گیا'' **وحکم بان المؤمنین هم الناس لا غیر** '' اور حکم یہ لگایا گیا کہ صرف مؤمن ہی انسان کہلانے کے حقدار ہیں کفار انسانیت سے ہی دور ہیں۔

جواب سوم: ہر شخص ظالم اور جاہل پر لعنت کرتا ہے کیونکہ ظلم اور جہالت کو ہر شخص قبیح سمجھتا ہے۔ چونکہ تمام کافر جاہل اور ظالم ہیں اس لئے ظالم اور جاہل پر لعنت کرنے کی وجہ سے ہر کافر دوسرے کافر پر لعنت بھیج رہا ہے۔

جواب چہارم: مستحق لعنت پر ہر شخص لعنت بھیجتا ہے اس طرح کفار بھی مستحق لعنت پر لعنت کرتے ہیں جو لعنت حقیقت میں ان کفار پر ہی لوٹ کر آتی ہے کیونکہ وہ سمجھتے نہیں کہ لعنت کے مستحق تو کفار ہی ہیں۔

(از کبیر)

خَالِدِيْنَ فِيْهَا: فیها کی ضمیر یا تو لعنت کی طرف لوٹ رہی ہے، مطلب اس کا یہ ہے کہ وہ ہمیشہ لعنت میں رہیں گے ضمیر یا تو نار (آگ) کی طرف لوٹ رہی ہے اگرچہ نار کا پہلے ذکر نہیں لیکن نار ذہن میں ہے۔ اس لئے کہ جب ان پر لعنت کا ذکر کیا گیا ہے تو وہ اللہ تعالیٰ کی رحمت سے مکمل طور پر دور ہیں۔ ''**فهذا یستلزم الخلود فی النار خارجا و ذهنا**'' جو شخص لعنت کا مستحق ہو وہ خارجی اور ذہنی طور پر آگ میں ہمیشہ رہنے کا مستحق ہوتا ہے۔

خیال رہے کہ موت کا کفر کے حال میں آنا خارجی طور پر تو آگ میں ہمیشہ رہنے کو مستلزم ہے لیکن ذہنی طور پر نہیں کیونکہ ذہن یہ بھی کہتا ہے کہ ہو سکتا ہے وہ ظاہری طور پر کفر پر مرا ہو لیکن باطنی طور پر ایمان دار ہو۔

(ماخوذ از روح المعانی)

لَا یُخَفَّفُ عَنْهُمُ الْعَذَابُ : ''نہیں تخفیف کی جائے گی ان سے عذاب کی'' اس میں ایک احتمال ہے استیناف کا یعنی پہلے لعنت کا ذکر کیا کہ ان پر اللہ اور فرشتوں اور سب لوگوں کی لعنت ہے یہ عذاب ہے اور اس کی کثرت تعداد کے لحاظ پر ذکر کی گئی کہ ان پر بے شمار لعنتیں ہوں گی۔ اب یہاں کیفیت کے لحاظ پر کثرت عذاب کو ذکر کیا جا رہا ہے ان پر شدید عذاب ہوگا جس میں تخفیف نہیں ہوگی۔ اور یہ بھی احتمال ہے کہ یہ جملہ ﴿خَالِدِیْنَ فِیْهَا﴾ سے حال واقع ہو وہ ہمیشہ لعنت اور آگ میں رہیں گے حال یہ ہے کہ ان سے عذاب میں تخفیف نہیں ہوگی۔ (از ابو السعود)

وَلَا هُمْ یُنْظَرُوْنَ : ''اور نہیں ان کو مہلت دی جائے گی''

جب لا ینظرون کو انظار سے لیا جائے تو معنی ہوگا " امهال " اور " تأجیل "۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں " لا یمهلون للرجعة ولا للتوبة ولا للمعذرة " ان کو واپس لوٹنے اور توبہ کرنے اور عذر پیش کرنے کی مہلت نہیں دی جائے گی۔ یہی معنی اللہ تعالیٰ کے ارشاد گرامی ﴿ هٰذَا یَوْمُ لَا یَنْطِقُوْنَ ﴾ ''یہ وہ دن ہے جس میں وہ بول نہیں سکیں گے'' اور " ولا یؤذن لهم فیعتذرون " (ان کو (قیامت کے دن) اجازت نہیں دی جائے گی کہ وہ عذر پیش کریں) سے سمجھ آرہا ہے جو حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے پیش کیا۔

﴿ یُنْظَرُوْنَ ﴾ میں ایک احتمال یہ ہے کہ یہ لفظ انظار سے نہ لیا جائے بلکہ نظر سے لیا جائے اب اس کے دو مطلب ہوں گے ایک انتظار کرنا جیسا کہ رب تعالیٰ کے ارشاد گرامی میں اس معنی میں بھی استعمال ہے ﴿ انظرونا نقتبس من نورکم ﴾ ای انتظرونا " ہماری انتظار کرو ہم تمہارے نور سے اقتباس (روشنی) حاصل کرلیں'' اس معنی کے لحاظ پر مطلب ہوگا " لاینظرون لیعتذرو " ان کو انتظار کا وقت نہیں دیا جائے گا کہ وہ عذر پیش کریں۔ اور یا ''نظر'' کا معنی ''دیکھنا'' ہوگا اب مطلب یہ ہوگا " لاینظر الیهم نظر الرحمة " ان کی طرف نظر رحمت نہیں کی جائے گی۔ (از بیضاوی وشیخ زادہ)

آثار مبارکہ : " اخرج ابن جریر وابن ابی حاتم عن ابی العالیة قال ان الکافر یوقف یوم القیامة فیلعنه الله ثم تلعنه الملائکة ثم یلعنه الناس اجمعون "

ابوالعالیہ کہتے ہیں کہ کافر کو قیامت کے دن کھڑا کیا جائے گا تو اس پر اللہ تعالیٰ لعنت کرے گا پھر

فرشتے اس پر لعنت کریں گے پھر اس پر تمام لوگ لعنت کریں گے۔ (درمنثور)

☆ " اخرج عبد بن حميد وابن جرير عن قتادة في قوله اولئك عليهم لعنة الله والملائكة والناس اجمعين يعني بالناس اجمعين المؤمنين "

حضرت قتادہ فرماتے ہیں (ان پر اللہ تعالیٰ کی لعنت اور فرشتوں کی اور تمام لوگوں کی) اللہ تعالیٰ کے ارشاد ﴿ وَالنَّاسِ اَجْمَعِيْنَ ﴾ سے مراد تمام مؤمنین ہیں (حقیقت میں انسان کہلانے کے حقدار وہی ہیں)۔

☆ " اخرج ابن جرير عن السدى في الآية قال لا يتلا عن اثنان مؤمنان ولا كافران فيقول احدهما لعن الله الظالم الا رجعت تلك اللعنة على الكافر لانه فكل احد من الخق يلعنه "

سدی رحمہ اللہ نے آیۃ کی تفسیر میں ذکر کیا ہے کہ دو مؤمن لعنت نہیں کرتے اور نہ ہی دو کافر "یہاں تک کہ ایک ان میں سے کہتا ہے اللہ کی لعنت ہو ظالم پر" مگر یہ کہ وہ لعنت کافر کی طرف لوٹ کر آتی ہے مخلوق میں سے ہر ایک اس پر لعنت کرتا ہے۔ (درمنثور)

☆ " اخرج ابن جرير عن ابی العالية في قوله تعالىٰ خالدين فيها يقول خالدين في جهنم في اللعنة وفي قوله ولا هم ينظرون يقول لا ينظرون فيعتذرون "

ابوالعالیہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے ارشاد گرامی ﴿ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ﴾ کا مطلب ہے کہ وہ جہنم میں لعنت میں ہمیشہ رہیں گے اور ﴿ وَلَا هُمْ يُنْظَرُوْنَ ﴾ کا مطلب ہے کہ ان کو مہلت نہیں دی جائے گی کہ وہ عذر پیش کریں۔ (درمنثور)

☆ " واخرج ابن ابی حاتم عن ابن عباس في قوله ولا هم ينظرون قال لا يؤخرون "

ابن حاتم حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول پیش کرتے ہیں کہ ﴿ وَلَا هُمْ يُنْظَرُوْنَ ﴾ کا مطلب ہے ان کو تاخیر کا موقع نہیں عطا کیا جائے گا۔ (درمنثور)

☆☆☆☆☆

﴿ وَاِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ لَّا اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الرَّحْمٰنُ الرَّحِيْمُ ﴾

۱) ''اور تمہارا معبود ایک معبود ہے اس کے سوا کوئی معبود نہیں مگر وہی بڑی رحمت والا مہربان''

۲) ''اور تمہارا معبود ایک معبود ہے نہیں معبود سوائے اس کے وہی بہت بڑی رحمت والا مہربان ہے''

شان نزول : قریش کے کفار نے کہا'' یا محمد صف لنا ربک وانسبه فانزل الله هذه الآية وسورة الاخلاص '' اے محمد تم ہمیں اپنے رب کے اوصاف بتاؤ اور اس کا نسب بیان کرو تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیۃ اور سورۃ اخلاص نازل فرمائی۔ (خازن)

پہلی آیات میں کتمان آیات سے ڈرایا گیا ہے اور انہیں لعنت کا مستحق قرار دیا گیا ہے اس آیۃ میں ذکر کیا گیا ہے '' ان اول ما يجب اظهاره ولا يجوز كتمانه امر التوحيد '' کہ سب سے پہلے جس چیز کو ظاہر کرنا ضروری ہے اور اس کا چھپانا جائز نہیں وہ امر توحید ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی توحید کو دلائل سے ذکر فرمایا اور انسان کو نظر وفکر کرنے کی دعوت دی کہ وہ اللہ تعالیٰ کی مخلوق اور اس کی صنعت کے عجائب میں تفکر کرے تو اسے خود بخود سمجھ آ جائے گا '' انه لا بدله من فاعل لا يشبهه شئى '' کہ مخلوق کا خالق ہونا ضروری ہے اور مصنوع کا صانع ہونا ضروری ہے اور کوئی چیز اس کی مثل نہیں ہو سکتی وہ ذات بے مثل ہے۔ (از قرطبی)

والهكم : کیا'' اله '' کی نسبت تمام مخلوق کی طرف ہو سکتی ہے یا صرف مکلفین کی طرف؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ '' اله ''کا مطلب ہے''مستحق عبادت'' جب اس وصف کی وجہ سے ذات باری تعالیٰ کا معبود ہونا ضروری ہے تو نسبت بھی ان کی طرف ہو گی جن سے اللہ تعالیٰ کی عبادت کرنا متصور ہو سکے۔ ''فاذن هذه الاضافة صحيحة بالنسبة الى كل المكلفين ، والى جميع من تصح صيرورته مكلفا تقديرا '' تو''اله'' کی نسبت ان کی طرف ہی ہو سکتی ہے جو حقیقت میں مکلفین ہیں یا تقدیری طور پر ان کو مکلف تصور کیا جائے۔ (از کبیر)

اله واحد : ''ومعنى الوحدة الانفراد '' وحدت کا معنی ہے منفرد ہونا یعنی اللہ تعالیٰ منفرد ہے پھر منفرد ہونے کی دو قسمیں ہیں ذات میں منفرد ہونا اور صفت میں منفرد ہونا:

'' وحقيقة الواحد هو الشئى الذى لا يتبعض ولا ينقسم ''

حقیقت اور ذات میں واحد ہونے کا مطلب یہ ہے کہ اس کی تقسیم نہیں ہو سکتی اور اس کے حصے نہیں ہو سکتے۔ یعنی جسموں کے متعلق تو یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ عناصر اربعہ (آگ، مٹی، پانی، ہوا) سے مرکب ہیں اور یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ یہ اس کے اعضاء (ہاتھ، پاؤں وغیرہ) ہیں۔ لیکن اللہ تعالیٰ مرکب ہونے سے اور اعضاء وغیرہ سے پاک ہے وہ منفرد ہے ذات میں۔ صفت کے لحاظ پر منفرد ہونے کا یہ مطلب ہے " لا نظیر لہ ولیس کمثلہ شئی وقیل واحد فی الوھیتہ وربوبیتہ لیس لہ شریک "۔ کہ اس کی کوئی نظیر نہیں کیونکہ رب تعالیٰ نے خود اپنی شان بیان کی کہ اس کی مثل کوئی چیز نہیں بعض حضرات نے کہا کہ اس کا صفت میں واحد ہونے کا مطلب یہ ہے کہ وہ "الوہیت اور ربوبیت" میں واحد ہے اس کا کوئی شریک نہیں۔ مشرکوں نے اللہ تعالیٰ کے ساتھ شریک ٹھہرائے ہوئے تھے تو اللہ تعالیٰ نے ان کا رد کیا اور فرمایا۔ " والھکم الہ واحد " یعنی اس کا الوہیت میں کوئی شریک نہیں اس کی ربوبیت میں کوئی نظیر نہیں۔

توحید کیا ہے؟ " والتوحید ھو نفی الشریک والقسیم والشبیہ " توحید کا مطلب یہ ہے کہ اس کا کوئی شریک نہیں اس کی کوئی جز نہیں اس کی کوئی شبیہ نہیں۔

فاللہ تعالی واحد فی افعالہ لا شریک لہ یشارکہ فی مصنوعاتہ وواحد
فی ذاتہ لا قسیم لہ وواحد فی صفاتہ لا یشبھہ شئی من خلقہ "

اللہ تعالیٰ اپنے افعال میں ایک ہے اس کی مصنوعات میں اس کا کوئی شریک نہیں وہ اپنی ذات میں ایک ہے اس کا کوئی قسیم نہیں یعنی اس کی کوئی جزء اور کوئی حصہ نہیں۔ اور وہ اپنی صفات میں واحد ہے اس کی مخلوق میں اس کوئی کے مشابہ نہیں۔ (خازن)

لا الہ الا ھو : (کوئی معبود نہیں سوائے اس کے) اس کلمہ کی پہلی جز نفی ہے اور دوسری اثبات۔ صرف " لا الـــــہ " کا ورد کرنا اور صرف اتنا ہی کلمہ پڑھتے رہنا کفر ہے اور " الا اللہ " ملائے۔ یا "الاھو " ساتھ ملائے تو ایمان ہے۔ کیونکہ پہلے کلمہ میں معبودان باطلہ کی نفی پائی گئی اور دوسرے کلمہ میں معبود حق کا ثبوت پایا گیا ہے۔

☆ " قال رسول ﷺ، من کان آخر کلامہ لا الہ الا اللہ دخل الجنۃ ، خرجہ الموطأ والبخاری ومسلم وغیرھم "

نبی کریم ﷺ نے فرمایا جس کا آخری کلام " لا الــہ الا اللہ " ہوا وہ جنت میں داخل ہوگا۔
"خرجہ مسلم والمقصود القلب لا اللسان " مسلم نے یہ بھی ذکر کیا ہے کہ مقصد دل سے "لا الہ الا اللہ " کہنا ہے صرف زبان سے کہنے سے مقصد حاصل نہیں ہوتا۔ یعنی اللہ تعالیٰ کی وحدانیت پر صرف اسی کے معبود ہونے پر عقیدہ ہو اگر عقیدہ اس کے خلاف ہو تو زبان سے کہنا بے مقصد ہے۔

مسئلہ : " فلو قال لا اله ومات ومعتقده وضميره الوحدانية وما يجب له من الصفات لكان من اهل الجنة باتفاق اهل السنة "

اگر کسی شخص نے زبان سے "لا الہ" پڑھا۔ اس کی موت اسی حال میں آ گئی لیکن اس کا عقیدہ اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کے متعلق کامل تھا اور اس کے دل میں اللہ تعالیٰ کی وحدانیت تھی اور اللہ تعالیٰ کی صفات کاملہ پر اس کا ایمان تھا اور اسے یقین تھا تو وہ شخص جنتی ہے اس پر اہل سنت کا اتفاق ہے۔

حضرت شیخ شبلی رحمہ اللہ کا تقویٰ: حضرت شبلی رحمہ اللہ "اللہ، اللہ" کا ورد کرتے تھے لیکن " لا الــہ الا اللہ " کا ورد نہیں کرتے تھے جب آپ سے پوچھا گیا کہ آپ کلمہ طیبہ (جو نفی و اثبات پر مشتمل ہے) کا وظیفہ نہیں پڑھتے صرف "اللہ، اللہ" کا وظیفہ پڑھتے ہیں اس کی وجہ کیا ہے؟ انہوں نے فرمایا:

" اخشى ان اخذ فى كلمة الجحود ولا اصل الى كلمة الاقرار "

میں ڈرتا ہوں کہ میں نفی والا کلمہ پڑھ لوں اور اثبات و اقرار والے کلمہ تک پہنچ ہی نہ سکوں تو میری موت آ جائے مقصد یہ تھا کہ میں نہیں چاہتا کہ میری موت "لا الہ" کے کلمہ پڑھنے پر آ جائے بلکہ میں یہ چاہتا ہوں کہ میری زبان پر "اللہ، اللہ" جاری ہو تو میری موت آ جائے۔

تاہم یہ خیال رہے کہ یہ صرف تقویٰ کی بات ہے ورنہ مسئلہ وہی ہے جو پہلے ذکر کر دیا گیا ہے۔ اسی وجہ سے علامہ قرطبی رحمہ اللہ نے فرمایا:

"قلت وهذا من علومهم الدقيقة التى ليست لها حقيقة " میں یہ کہتا ہوں کہ یہ صوفیاء کرام کے مسائل دقیقہ ہیں جو ان کے تقویٰ کے مطابق ہو تو وہ جنتی ہے۔ (ماخوذ از قرطبی)

راقم کا موقف یہ ہے کہ مسئلہ کی دار و مدار نیت پر ہے اگر کوئی یہ تمنا رکھے کہ میری موت "اللہ، اللہ" کے ذکر پر آئے تو اس کا "اللہ، اللہ" کرنا اور " لا الــہ الا اللہ " نہ پڑھنا ہی باکمال ہے۔ اور اگر کوئی

اصل مسئلہ پر عمل کرے کہ جب کلمہ طیبہ " لا اله الا الله " پڑھنے کی فضیلت حدیث شریف سے ثابت ہے تو اسی کا ورد کروں گا اگر میری موت " لا الـه " پر آ بھی گئی تو میں اپنے عقیدہ کے صحیح ہونے کی وجہ سے رب تعالیٰ کی رحمت سے محروم نہیں رہوں گا تو اس کا " لا اله الا الله " کا وظیفہ کرنا بھی با کمال ہے
(راقم)

الرحمن الرحیم : اللہ تعالیٰ نے جب اس سے پہلے اپنی دو صفتوں کا ذکر فرمایا ایک الوہیت اور دوسری وحدانیت " یفید القهر والعلو " تو ان کے ذکر سے یہ فائدہ حاصل ہوگیا کہ اللہ تعالیٰ کو قہر اور بلندی مرتبت یعنی دبدبہ حاصل ہے تو ان کے پیچھے اللہ تعالیٰ نے اپنی صفات رحمٰن اور رحیم کو ذکر فرمایا " **ترویحا للقلوب عن هيبة الالهية وعزة الفردانية** " تاکہ میرے بندوں کے دلوں کو چین حاصل ہو جائے کہ بیشک وہ الہ ہے اور واحد ہے یقیناً اسے قہر و دبدبہ بھی حاصل ہے لیکن وہ رحمٰن و رحیم بھی ہے۔

" واشعارا بان رحمته سبقت غضبه وانه ما خلق الخلق الا للرحمة والاحسان "

اسی سے یہ بھی واضح کر دیا کہ اس کی رحمت کو اس کے غضب پر سبقت حاصل ہے اس نے اپنی تمام مخلوق کو فقط رحمت اور احسان کے لئے بھیجا ہے۔ (از کبیر)

یعنی مخلوق خود اپنے کفر کی وجہ سے اپنے آپ کو رحمت خاصہ سے محروم کر دے اور غیظ و غضب کا مستحق بنا لے تو اس میں مخلوق خود ہی قصوروار ہے۔

رحمٰن اور رحیم کی تفصیلی بحث سورۃ فاتحہ میں بیان کی جا چکی ہے یہاں اتنا یاد کر لیا جائے کہ رحمٰن کے معنی میں مبالغہ ہے اس کا معنی ہے زیادہ رحم کرنے والا اور رحیم میں یہ مبالغہ نہیں پایا گیا۔

﴿ الرحمن الرحیم ﴾ سے یہ فائدہ حاصل ہوا کہ وہ تمام نعمتوں کا مالک ہے خواہ وہ اصول ہوں یا فروع اللہ تعالیٰ کے بغیر کسی اور کو یہ مقام حاصل نہیں۔ کیونکہ اس کے بغیر یا تو نعمت ہوگی۔ یا جن پر نعمتیں ہوں گی۔ لیکن اللہ تعالیٰ پر کسی کا کوئی انعام نہیں " **وهو المنعم على خلقه الرحيم بهم** " وہ اپنی مخلوق پر انعام کرنے والا اور رحم کرنے والا ہے۔

☆ " **عن اسماء بنت يزيد قالت سمعت رسول الله ﷺ يقول اسم الله الاعظم فى هاتين الآيتين والهكم اله واحد لا اله الا هو الرحمن الرحيم ، وفاتحة آل عمران**

الم اللہ لا الٰہ الا ھو الحی القیوم " (اخرجہ ابو داؤد والترمذی وقال حدیث صحیح)

حضرت اسماء بنت یزید کہتی ہیں میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ ارشاد فرماتے ہوئے سنا اللہ تعالیٰ کا اسم اعظم ان دو آیتوں میں ہے ایک ﴿ والھکم الہ واحد لا الہ الا ھو الرحمن الرحیم ﴾ میں اور دوسری سورۃ آل عمران کی پہلی آیۃ میں ﴿ الم ☆ اللہ لا الہ الا ھو الحی القیوم ﴾ (خازن)

طلباء کرام کے لئے: لفظ " ھو " میں اسرار معنویہ کو دیکھا جائے تو عجیب مسائل سمجھ آئیں گے۔ الفاظ کی دو قسمیں ہیں اسم ظاہر اور اسم ضمیر۔ لیکن اسم ظاہر یہ وہ الفاظ ہیں جو ماہیات مخصوصہ پر دلالت کرتے ہیں اس لحاظ پر کہ وہ ماہیات مخصوصہ ہیں جیسے سواد و بیاض، حجر اور انسان۔ مضمرات یہ وہ الفاظ ہیں جو کسی نہ کسی چیز پر دلالت کرتے ہیں۔ خواہ وہ متکلم ہو یا مخاطب ہو یا غائب ضمائر کی دلالت معین ماہیات پر نہیں ہوتی۔

اصل ضمیریں تین ہیں " انا " اور " انت " اور " ھو " ان میں سے اعرف (زیادہ معرفہ) " انا " ہے پھر " انت " پھر " ھو " اس ترتیب کے صحیح ہونے پر دلیل یہ ہے کہ جب مجھے اپنی ذات کا تصور آئے گا اور میں گویا کہ جب یوں کہوں " انی انا " بیشک میں، میں ہی ہوں اس میں کوئی اشتباہ نہیں ہوگا۔ " فانہ من المستحیل ان اصیر مشتبھا بغیری او یشتبہ بی غیری " یہ محال ہوگا کہ میں کسی غیر سے مشتبہ ہو جاؤں یا کوئی غیر مجھ سے مشتبہ ہو جائے۔

یعنی مجھے اپنا تصور آنے کے بعد میں یہ نہیں کہہ سکوں گا کہ میں فلاں شخص ہوں۔ یا فلاں شخص میں ہوں۔ بخلاف اس کے کہ جب میں " انت " کہوں " فانک قد تشتبہ بغیرک وغیرک یشتبہ یک فی عقلی وظنی " تو تم کبھی اپنے غیر سے مشتبہ ہو جاؤ گے اور تمہارا غیر تمہارے مشتبہ ہوگا میرے عقل اور میرے گمان میں پھر " انت " اعرف ہے " ھو " سے۔

حاصل کلام یہ ہے کہ ضمیروں سے " انا " سے زیادہ معرفت حاصل ہوتی ہے اور " ھو " سے بہت کم اور " انت " سے متوسط درجہ کی معرفت حاصل ہوتی ہے۔

متکلم کا اعرف ہونا اس سے بھی واضح ہو جاتا ہے کہ متکلم کی ضمیر خواہ متصل ہو یا منفصل ہو واحد ہو تو مذکر اور مؤنث میں مشترک ہے اور جمع کی ضمیر تثنیہ مذکر اور مؤنث اور جمع مذکر اور مؤنث کو شامل ہے

کیونکہ اس میں التباس کم لازم آتا ہے۔اس کے بعد واضح ہوا کہ جتنی معرفت کسی کو اپنی ذات کی ہوتی ہے اتنی غیر کو نہیں ہوتی اسی وجہ سے یہ کہا جائے گا " فالعرفان التام باللہ لیس الا للہ " اللہ تعالیٰ کی کامل معرفت اللہ تعالیٰ کے بغیر کسی اور کو نہیں ۔ اسی وجہ سے رب تعالیٰ اپنی ذات کے متعلق کہتا ہے "انا اللّٰہ " میں اللہ ہوں دوسرا کوئی شخص اس لفظ کا استعمال نہیں کر سکتا۔

اعتراض : مشہور تو یہ ہے کہ ارواح بشریہ جب اس حقیقت کی معرفت سے منور ہو جاتی ہیں تو عاقل اور معقول متحد ہو جاتے ہیں اس اتحاد کے وقت عارف کو یہ کہنا صحیح ہے " انا اللّٰہ " تو کس طرح یہ کہنا صحیح ہے کہ اللہ تعالیٰ کے بغیر کوئی دوسرا " انا اللہ " نہیں کہہ سکتا۔

جواب: " ان القول بالاتحاد غیر معقول " بیشک اتحاد کا قول ہی عقل کے خلاف ہے لہٰذا باطل ہے اس لئے کہ اتحاد کے وقت دونوں فنا ہو جاتے ہیں یا ایک فنا ہو جاتا ہے " فذاک لیس باتحاد " یہ اتحاد نہیں ہو سکتا۔ " وان بقیا فھما اثنان لا واحد " اگر دونوں باقی رہیں تو ایک نہ ہوئے جب ایک نہ ہوئے تو اتحاد کیسے؟

مقصد: جب کوئی شخص " انا اللّٰہ "نہیں کہہ سکتا تو اب دو احتمال باقی ہیں کہ انسان رب تعالیٰ کو "انت" کہے یا" ھو " کہے۔

"انت" کا استعمال: " اما انت فھو للحاضرین فی مقامات المکاشفات والمشاھدات لمن فنی عن جمیع الحظوظ البشریۃ " جو لوگ مکاشفہ کا مقام حاصل کر لیتے ہیں اور رب تعالیٰ کے حضور حاضر ہوتے ہیں اور انسانی خواہشات کو فناء کر کے مقام مشاہدہ حاصل کر لیتے ہیں وہ" انت " کا استعمال کرتے ہیں۔

حضرت یونس علیہ السلام کی رب تعالیٰ نے خبر دی کہ آپ نے کہا " فنادی فی الظلمات ان لا الٰہ الا انت "(تو انہوں نے تاریکیوں میں (مچھلی کے پیٹ میں) پکارا یہ کہ کوئی معبود نہیں سوائے تیرے) لیکن یہ آپ نے اسی وقت کہا جب آپ نے آثار حدوث اور عالم حدوث کی تاریکیوں سے اپنے آپ کو فنا کے درجہ میں پہنچا کر مقام شہود تک پہنچ گئے۔

نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا" لا احصی ثناء علیک انت کما اثنیت علی نفسک" میں تیری ثناء کو اس طرح شمار میں نہیں لا سکتا جیسا کہ تو نے اپنی ذات کی تعریف کی۔

ہاں البتہ یہ خیال رہے کہ اصل میں " انــت " کا استعمال ان خواص کے لئے ہے جو مقام شہود میں پہنچے ہوتے ہیں۔لیکن بوقت دعاء عام انسان بھی یہ خیال کرتے ہوئے کہ وہ ذات تو میرے قریب ہے میں اس کے سامنے حاضر ہوں اگر چہ مجھے مقام شہود حاصل نہیں " انت " کا استعمال کر لیتے ہیں۔

''ھو'' کا استعمال: واما " ھو " فللغائبین " لیکن " ھو " کا استعمال غائبین کے لئے ہے یعنی جن لوگوں کو مکاشفہ اور مشاہدہ حاصل نہیں ہوتا وہ درجہ غائبین تک پہنچے ہوتے ہیں۔ " ان " ھو فی حقــه اشـرف الاسماء " بیشک " ھو " رب تعالیٰ کے حق میں اشرف الاسماء (بہتر نام) ہے اس مسئلہ کو سمجھنے کے لئے پہلے یہ سمجھا جائے کہ اسم یا کلی ہوگا یا جزئی۔کلی کا نفس تصور شرکت سے مانع نہیں۔ لیکن جزئی کا نفس تصور شرکت سے مانع ہے اسی سے واضح ہوگیا کہ رب تعالیٰ کا اسم کلی نہیں ہوسکتا کیونکہ رب تعالیٰ معین ذات ہے اور کلی سے معین ذات کا پتہ نہیں چلتا۔یہی وجہ ہے کہ ''الرحمٰن ،الرحیم ،الحکیم، العلیم ،القادر'' یعنی تمام اسماء مشتقہ لغوی معنی کے لحاظ پر رب تعالیٰ کی ذات سے خاص نہیں کیونکہ شرکتہ بین کثیرین سے مانع نہیں۔

ہاں البتہ جزئی کا استعمال رب تعالیٰ کے لئے صحیح ہے کیونکہ اس سے معین اور مخصوص ذات کا پتہ چلتا ہے پھر اس میں دو صورتیں علم ذکر کریں یا ضمیر ہر حال میں معین اور مخصوص ہونا واضح وہ جائے گا لہٰذا "یا اللہ " کہیں یا کہ " یا انت " کہیں اور یا کہ " یا ھو " کہیں ان میں کوئی فرق نہیں سب سے تعیین حاصل ہوگئی۔ بلکہ یہ بھی خیال رہے کہ علم ضمیروں کی فرع ہے" والاصل اشرف من الفرع" اصل فرع سے اشرف اور افضل ہے۔" فـقـولـنـا یا انت یا ھـو ، اشرف من سائر الاسماء بالکلیة " اس لئے ہم یا انت کہیں یا کہ "یاھو "کہیں یہ تمام اسماء سے افضل ہیں۔لیکن " انت " کا استعمال حاضرین کے لئے ہے اور ھو کا غائبین کے لئے جیسا کہ بیان کیا جاچکا ہے۔

فائدہ : " ھو " کا استعمال اس صورت کے لئے ہوتا ہے جو عقل میں آئے جب " ھو " کو اس صورت کے لئے تم استعمال کروگے تو وہ صورت تمہارے ذہن میں حاضر ہوگی۔ " فـقـد عـاد القول الـی ان " ھـو " ایضـا لا یتنـاول الا الحاضر " تو اس سے یہ واضح ہوجائے گا کہ " ھو " کا استعمال بھی حاضر کے لئے ہے۔اگر چہ انسان کو مکاشفہ اور مشاہدہ کا درجہ بھی حاصل ہو لیکن وہ رب تعالیٰ کی صفات کو اپنے ذہن میں لاکر درجہ حضور حاصل کر لیتا ہے تو کہتا ہے " یا ھو "

لفظ ''ھو'' کا اور کمال: بیشک ہم دلیل پیش کرتے ہیں کہ حقیقت حق تمام تراکیب کی اقسام سے پاک ہیں رب تعالیٰ کی ذات فرد مطلق ہے اس کی نعت ذکر کر کے اس کی حقیقت کو بیان نہیں کیا جا سکتا:

" لان النعت يقتضي المغايرة بين الموصوف والصفة وعند حصول الغيرية لا تبقى الفردانية "

کیونکہ نعت چاہتی ہے کہ موصوف اور صفت میں مغائرت پائی جائے اور جب غیریت ثابت ہو تو فردانیت باقی نہیں رہتی۔ یہاں یہ خیال رہے کہ کوئی یہ اعتراض نہ کرے کہ رب تعالیٰ کی صفات نہ اس کا عین ہیں اور نہ غیر ہیں تو غیریت کیسے ثابت ہوئی؟ اس کا جواب یہ ہے کہ یہاں صفت کی بات نہیں ہو رہی۔ بلکہ بیان صفت کی بات ہو رہی ہے کہ بیان صفت حقیقت حق کا عین نہیں۔ اور رب تعالیٰ کی حقیقت کے متعلق خبر بھی نہیں دی جا سکتی۔" لان الاخبار يقتضي مخبرا عنه ومخبرا به وذلك ينافي الفردانية " کیونکہ خبر دینے کا تقاضا یہ ہے کہ مخبر عنہ اور مخبر بہ پائے جائیں یہ فردانیت کے منافی ہے اسی سے یہ واضح ہو گیا کہ جمیع اسماء مشتقہ حقیقت حق کی کنہ تک پہنچنے سے قاصر ہیں۔

" واما لفظ " هو " فانه يصل الى كنه تلك الحقيقة المفردة المبراة عن جميع جهات الكثرة فهذه اللفظة لو صولها الى كنه الحقيقة ، وجب ان تكون اشرف من سائر الالفاظ التي يمتنع وصولها الى تلك الحقيقة "

لیکن لفظ " ھو " اس ذات کی حقیقت تک پہنچتا ہے جو کثرت کی تمام جہات سے پاک ہے اور حقیقت مفردہ ہے جب یہ لفظ حقیقت حق کی کنہ تک پہنچتا ہے تو ان تمام الفاظ سے اس لفظ کو فوقیت حاصل ہو گئی جو حقیقت حق تک رسائی سے قاصر ہیں۔

لفظ ''ھو'' کا اور کمال: جو الفاظ مشتق ہیں وہ ذات کی صفت کے حصول پر دلالت کرتے ہیں۔ پھر حق تعالیٰ کی صفات کی ماہیات بھی غیر معلوم ہیں وہ بھی عالم حدوث سے متعلق ہونے کی وجہ سے ان کی علامات ظاہر ہوتی ہیں۔ مخلوق کو دیکھ کر اس کی صفت خالقیت کا پتہ چلتا ہے مرزوق کو دیکھ کر اس کی صفت رازقیت کا پتہ چلتا ہے لیکن اس معرفت سے اس کی حقیقت کا پتہ نہیں چلتا جس سے یقین کا درجہ حاصل ہو جائے۔ ہاں البتہ اس کی قدرت کا ان اشیاء سے پتہ چلتا ہے لیکن ساتھ ساتھ عالم حدوث کا دخل بھی

ہوتا ہے جب انسان دو چیزوں کی طرف نظر کرتا ہے تو کسی ایک چیز کو بھی مکمل طور پر حاصل نہیں کر سکتا بلکہ اس کی معرفت قاصر ہوتی ہے۔

" فاذن جمیع الاسماء المشتقة لا تفید کمال الاستغراق فی مقام معرفة بل کانها تصیر حجابا بین العبد وبین الاستغراق فی معرفة الرب "

تو واضح ہوا کہ تمام اسماء مشتقہ رب تعالیٰ کی معرفت میں کامل طور پر مستغرق ہونے کا فائدہ نہیں دیتے بلکہ اس معرفت میں عالم حدوث کا بھی دخل ہوتا ہے اس لئے یہ اسماء مشتقہ بوجہ عالم حدوث کے ساتھ معلق ہونے کی وجہ سے بندے اور رب تعالیٰ کی معرفت میں مستغرق ہونے کے درمیان حجاب بن جاتے ہیں۔ لیکن لفظ " ھو " رب تعالیٰ کی ذات پر دلالت کرتا ہے ذاتی طور پر اس میں کسی چیز کی اضافت ونسبت نہیں پائی جاتی " فکان لفظ " ھو "یوصلک الی الحق ویقطعک عما ما سواہ " لفظ " ھو " رب تعالیٰ تک براہ راست پہنچاتا ہے اس کی ذات کے ماسواہ تعلق کو منقطع کر دیتا ہے لیکن اس کے ماسوا الفاظ رب تعالیٰ کی ذات کے ماسوا سے رابطہ منقطع نہیں کرتے اسی لئے لفظ "ھو" اشرف ہے۔

لفظ "ھو" کا اور کمال: ابھی تک جو بحث ذکر کی گئی ہے اس سے واضح ہوا کہ " منبع الجلال والعزة ھو الذات " جلال اور عزت کا منبع اس کی ذات ہے صفات کے ذریعے اس کی ذات کی تکمیل نہیں۔ " بل ذاته لکمالها استلزمت صفات الکمال " بلکہ اس کی ذات اپنے کمال کی وجہ سے صفات کے کمال کو مستلزم ہے

" ولفظ ھو یوصلک الی ینبوع الرحمة والعزة والعلو وھو الذات وسائر الالفاظ لا توقفک الا فی مقام النعوت والصفات فکان لفظ "ھو" اشرف ہے۔ (ماخوذ از کبیر)

لفظ " ھو " تمہیں رحمت اور عزت اور علو کے چشمہ تک پہنچا دیتا ہے اور وہ ذات ہے باقی الفاظ تمہیں صرف مقام نعوت اور صفات تک پہنچاتے ہیں لہٰذا لفظ " ھو "جب ذات تک پہنچاتا ہے تو وہ اشرف ہے۔ (از کبیر)

☆☆☆☆☆

﴿ اِنَّ فِیۡ خَلۡقِ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ وَاخۡتِلَافِ الَّیۡلِ وَالنَّهَارِ وَالۡفُلۡکِ الَّتِیۡ تَجۡرِیۡ فِی الۡبَحۡرِ بِمَا یَنۡفَعُ النَّاسَ وَمَاۤ اَنۡزَلَ اللّٰهُ مِنَ السَّمَآءِ مِنۡ مَّآءٍ فَاَحۡیَا بِهِ الۡاَرۡضَ بَعۡدَ مَوۡتِهَا وَبَثَّ فِیۡهَا مِنۡ کُلِّ دَآبَّةٍ وَّتَصۡرِیۡفِ الرِّیٰحِ وَالسَّحَابِ الۡمُسَخَّرِ بَیۡنَ السَّمَآءِ وَالۡاَرۡضِ لَاٰیٰتٍ لِّقَوۡمٍ یَّعۡقِلُوۡنَ ﴾

۱) ''بیشک آسمانوں اور زمین کی پیدائش اور رات دن کا بدلتے آنا اور کشتی کہ دریا میں لوگوں کے فائدے لے کر چلتی ہے اور وہ جو اللہ نے آسمان سے پانی اتار کر مردہ زمین کو اس سے جلا دیا اور زمین میں ہر قسم کے جانور پھیلائے اور ہواؤں کی گردش اور وہ بادل کہ آسمان وزمین کے بیچ میں حکم کا باندھنا ہے ان سب میں عقل مندوں کے لئے ضرور نشانیاں ہیں''۔

۲) ''بیشک آسمانوں اور زمین کی مخلوق میں اور رات اور دن کے بدلنے میں، اور کشتیوں میں جو چلتی ہیں دریاؤں میں کہ نفع پہنچائیں لوگوں کو اور نازل کرنے اللہ کے آسمانوں سے پانی میں زندہ کیا جس کے ذریعے زمین کو بعد مرنے اس کے اور پھیلانے اس میں ہر قسم کے جانوروں میں اور ہواؤں کے چلانے میں اور بادلوں میں جو مسخر ہیں (حکم کے پابند ہیں) درمیان آسمانوں اور زمین کے یقیناً نشانیاں ہیں اس قوم کے لئے جو عقل رکھتے ہیں''۔

جب اللہ تعالیٰ نے اس سے پہلی آیۃ میں اپنی وحدانیت کا ذکر فرمایا تو اس آیۃ میں آٹھ قسم کے دلائل کا ذکر کیا جن سے عقل مند انسان اس کے وجود پر دلائل حاصل کر لیتے ہیں۔ اس کے بعد دوسری آیات میں اللہ تعالیٰ نے اپنی وحدانیت اور ضد اور مثل سے پاک ہونے پر دلائل قائم فرمائے ہیں۔ (کبیر)

شان نزول:

(۱) ابن جریر نے اس آیۃ کریمہ کا شان نزول یہ بیان کیا ہے کہ عطا کہتے ہیں جب نبی کریم ﷺ

مدینہ طیبہ میں آئے تو آیۃ کریمہ ﴿ وَاِلٰـهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ﴾ نازل ہوئی تو مکہ کے قریش جو کافر تھے ان کو جب پتہ چلا تو وہ کہنے لگے " کیف یسع الناس اله واحد " ایک ہی خدا تمام لوگوں کو کیسے کافی ہے تو اللہ تعالیٰ نے اس آیۃ کریمہ کو نازل کیا اس میں آٹھ نشانیوں کا ذکر کیا جو اس کی قدرت پر دلالت کر رہی ہیں جن سے عقل والوں کو معلوم ہو جاتا ہے کہ وہ ایک ہی ذات ہے اس کی کوئی مثل نہیں۔

(۲) سعید بن مسروق کہتے ہیں قریش نے یہود سے سوال کیا کہ تم ہمیں بتاؤ موسیٰ علیہ السلام کون کون سے معجزات لائے؟ انہوں نے بتایا کہ وہ عصا اور ید بیضاء لائے۔ اور قریش نے نصاریٰ سے بھی یہی سوال کیا کہ عیسیٰ علیہ السلام کو کون کون سے معجزات عطا کئے گئے۔ انہوں نے جواب دیا " مادر زاد اندھے کو نظر عطا کرنا، برص والے شخص کی مرض کو دور کرنا، اور مردے زندہ کرنا۔ تو قریش نے نبی کریم ﷺ کو کہا کہ تم ہمارے لئے دعا کرو کہ اللہ تعالیٰ ہمارے لئے صفا پہاڑ کو سونا بنا دے تا کہ ہمیں یقین ہو جائے (کہ تم نبی ہو) اور ہمیں دشمن پر قوت حاصل ہو جائے۔

تو نبی کریم ﷺ نے رب تعالیٰ کے حضور عرض کیا کہ قریش یہ کہتے ہیں تو رب تعالیٰ نے فرمایا کہ میں ان کو عطا تو کر دوں گا" ولکن ان کذبوا بعد ذلک عذبتهم عذابا لا اعذبه احدا من العالمین " لیکن اس کے بعد اگر انہوں نے تکذیب کی تو میں ان کو ایسا عذاب دوں گا جو تمام جہان والوں میں سے کسی ایک کو ایسا عذاب نہیں دوں گا۔

" فقال علیه السلام ذرنی وقومی ادعوهم یوما فیوما "

تو نبی کریم ﷺ نے عرض کیا اے اللہ مجھے اور میری قوم کو اسی حال پر رہنے دے میں ان کو ہر دن دعوت اسلام دیتا رہوں گا۔

تو اللہ تعالیٰ اس آیۃ کریمہ کو نازل فرمایا اور ان کے لئے بیان فرمایا کہ اگر وہ چاہتے ہیں کہ صفا سونا بنے تو وہ ایمان لائیں گے اور انہیں یقین زیادہ ہوگا " فخلق السموات والارض وسائر ما ذکر اعظم " تو آسمانوں اور زمین کی پیدائش میں اور دوسری نشانیاں جو ذکر فرمائی ہیں ان میں رب تعالیٰ کی قدرت کی عظیم نشانیاں موجود ہیں ان میں تفکر کر کے انہیں زیادہ یقین آنا چاہئے لیکن وہ تو ایمان لانا ہی نہیں چاہتے بلکہ حجت بازی میں وقت گزارنا چاہتے ہیں۔ (از کبیر)

(۳) بیہقی نے ابوالضحی سے روایت ذکر کی کہ مشرکین کے کعبہ کے اردگرد تین سو ساٹھ بت رکھے ہوئے تھے جب انہوں نے ﴿ وَاِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ﴾ آیۃ کو سنا تو تعجب کرنے لگے اور انہوں نے نبی کریم ﷺ کو کہا" **ان کنت صادقا فأت بآية نعرف بها صدقك** " اگر تم سچے ہو تو کوئی نشانی لاؤ جس سے ہمیں پتہ چل جائے کہ تم سچے ہو تو اس وقت یہ آیۃ کریمہ نازل ہوئی کہ ان نشانیوں میں تم غور وفکر کیوں نہیں کرتے۔ (از روح المعانی)

اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ : سب معطوف علیہ اور معطوف پر مرتب ہے ﴿لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّعْقِلُوْنَ ﴾ تو گویا کہ مفہوم یہ ہوا بیشک آسمانوں اور زمین کے پیدا کرنے میں نشانیاں ہیں اس قوم کے لئے جو عقل رکھتے ہیں آسمانوں کا بغیر ستونوں کے قائم رہنا اور اوپر سے بھی کسی چیز سے بندھا ہوا نہ ہونا یہ رب تعالیٰ کی قدرت کاملہ کی نشانی ہے۔ اور یہ کام عام عادت کے خلاف ہے:

" ولو جاء نبی فتحدی بوقوف جبل فی الهواء دون علاقة كان معجزا "

اگر نبی سے مطالبہ کیا جائے کہ تم زمین اور آسمان کے درمیان فضاء میں پہاڑ کو معلق کر کے دکھاؤ نبی یہی کام کر دکھائے تو یہ نبی کا معجزہ ہوگا۔

اور یہ محال بھی نہیں کیونکہ جبریل کا مقام تمام انبیاء کرام سے کم ہے اگر جبریل طور پہاڑ کو بنی اسرائیل کے سروں پر معلق کر سکتے ہیں تو نبی بھی یہ کام کر سکتے ہیں جبریل کو بھی طاقت رب تعالیٰ نے ہی دی ہے اور رب تعالیٰ ہی انبیاء کرام کو معجزات بھی عطا کرتا ہے۔

اسی طرح سورج اور چاند، سیارے اور ستارے سب اللہ تعالیٰ کی نشانیاں ہیں کیونکہ وہ طلوع ہوتے ہیں اور غروب ہوتے ہیں کبھی روشن ہوتے ہیں کبھی ان کی روشنی نہیں رہتی۔ یہ تمام رب تعالیٰ کی قدرت سے کام ہو رہا ہے یہ اس ذات کبریاء کی قدرت اور بے مثل ہونے کی نشانیاں ہیں۔ اور زمین میں دریاؤں اور سمندروں کا پایا جانا اور ہر قسم کی معدنیات کا پایا جانا، اور درختوں کا پایا جانا اور کہیں سے زمین کا نرم ہونا اور کہیں سے سخت ہونا یہ رب تعالیٰ کی قدرت کی نشانیاں ہیں۔ (از قرطبی)

سماوات جمع اور ارض واحد کیوں؟ " **انما جمع السموات وافرد الارض لانها طبقات متفاصلة بالذات مختلفة بالحقيقة بخلاف الارضين** "

سماوات کو جمع ذکر کیا کیونکہ وہ مختلف طبقات ہیں اور ان کے درمیان ذاتی طور پر فاصلہ موجود ہے لیکن ''ارض'' کو مفرد ذکر کیا کہ زمینوں میں فاصلہ نہیں بلکہ وہ تہہ بتہہ ہیں۔ (بیضاوی)

دوسری وجہ یہ ہے '' **جمع السماوات لانها اجناس مختلفة كل سماء من جنس غير جنس الاخرى ووحد الارض لانها كلها تراب** '' **والله تعالىٰ اعلم** ۔سماوات کو جمع ذکر کیا کہ تمام آسمان مختلف جنس ہیں ہر آسمان دوسرے آسمان سے علیحدہ جنس ہے اور ارض کو واحد ذکر کیا کیونکہ تمام زمینیں ایک جنس یعنی مٹی سے ہیں۔ (قرطبی)

خلق : کا معنی مخلوق ہے یا مخلوق کا غیر ہے اس پر علامہ رازی رحمہ اللہ فرماتے ہیں '' **فقال عالم من الناس الخلق هو المخلوق** '' لوگوں میں سے عظیم عالم کا یہ قول ہے کہ خلق بمعنی مخلوق ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ﴿ انَّ فِی خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ﴾ پر مرتب فرمایا ﴿ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّعْقِلُوْنَ ﴾ کو اس سے واضح ہو جاتا ہے کہ آیات (نشانیاں) صرف مخلوق ہی ہے:

'' لان المخلوق هو الذى يدل على الصانع فدلت هذه الآية على ان الخلق هو المخلوق ''

کیونکہ مخلوق وہ ہے جو صانع پر دلالت کرتی ہے لہٰذا آیۃ کریمہ اس پر دلالت کر رہی ہے کہ خلق بمعنی مخلوق ہے راقم نے اسی وجہ سے یہ ترجمہ کیا ہے تا کہ یہ قول بھی واضح ہو جائے۔

ایک اور خیال بھی رہے '' **فقال عالم من الناس** '' کا ترجمہ راقم نے کیا ''لوگوں میں سے عظیم عالم کا یہ قول ہے'' یہ ترجمہ تنوین کو تعظیم کی سمجھتے ہوئے کیا ہے اگر تنوین کو تکثیر کے لئے بنایا جائے تو مطلب ہوگا ''لوگوں میں سے کثیر علماء نے یہ کہا ہے'' یہ ترجمہ اور زیادہ خوب ترین ہے۔ کچھ حضرات نے خلق کو غیر مخلوق کہا یعنی مصدری معنی ذکر کیا ہے (پیدا کرنا) ان کی دلیل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ مخلوق سے پہلے ہی خالق ہے لہٰذا مخلوق سے پہلے خلق موجود ہے اعلیٰ حضرت کا ترجمہ اس قول کے مطابق ہے۔ (از کبیر)

وَاخْتِلَافِ الَّیْلِ وَالنَّھَارِ : ''اور رات اور دن کے بدلنے میں (نشانیاں ہیں اس قوم کیلئے جو عقل رکھتے ہیں'' ﴿ اِخْتِلَاف ﴾ کا معنی ایک کا آنا اور دوسرے کا جانا۔ یعنی رات کے آنے کے بعد دن کا جانا۔ اور دن کے آنے کے بعد رات کا جانا، اللہ تعالیٰ کی قدرت کی نشانیاں ہیں وہ واحد

اور بے مثل ذات ہی اس قدرت کی مالک ہے کسی اور کو یہ قدرت حاصل ہونے کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ اسی اختلاف کو رب تعالیٰ نے بیان فرمایا﴿ وھو الذی جعل اللیل و النھار خلفة ﴾ وہ ذات جس نے رات اور دن کو ایک دوسرے کے پیچھے بنایا۔

" والثانی اراد اختلاف اللیل والنھار فی الطول والقصر والنور والظلمة والزیادة والنقصان "

اور دوسری وجہ یہ ہے کہ ﴿ اِخۡتِلَافِ الَّیۡلِ وَالنَّھَارِ ﴾ کا مطلب یہ ہے کہ رات اور دن کے لمبا اور چھوٹا ہونے میں اور روشن اور تاریک ہونے میں اور زیادتی اور نقصان ہونے میں نشانیاں ہیں عقل والوں کے لئے۔

اور تیسری وجہ ﴿ اِخۡتِلَافِ الَّیۡلِ وَالنَّھَارِ ﴾ کی یہ ہے کہ جس طرح دن رات کا لمبا ہونا اور چھوٹا ہونا زمانہ سے متعلق ہے ایسے ہی مکانات کے اختلاف کی وجہ سے بھی دن رات کے لمبے اور چھوٹے ہونے میں اختلاف ہوتا ہے۔ ایک ہی وقت میں ایک جگہ صبح ہے اسی وقت دوسری جگہ ظہر ہے اور اسی وقت اور جگہ عصر ہے اور اسی وقت اور جگہ میں مغرب ہے اور اسی وقت میں اور مقام میں عشاء ہے۔ اس کی وجہ طول البلد میں اختلاف ہے لیکن عرض البلد کے اختلاف کی وجہ سے جن شہروں اور ملکوں کا عرض شمالی ہوگا ان میں گرمیوں کے دن لمبے اور راتیں چھوٹی اور سردیوں کے دن چھوٹے اور راتیں لمبی ہوں گے۔

پاکستان بھی ان ممالک میں ہی آتا ہے۔ لہذا واضح ہوا کہ طول البلد اور عرض البلد کے اختلاف سے عجیب نشانیاں پائی جاتی ہیں جو رب تعالیٰ کی قدرت کاملہ پر دلالت کرتی ہیں۔

دن رات کا اختلاف وجود صانع پر دلالت کرتا ہے: اس میں پھر کئی وجوہ ہیں:

(۱) رات اور دن کے احوال کا اختلاف حرکات شمس سے مرتبط ہے یعنی سورج کی حرکات سے متعلق ہے " وھی من الآیات العظام " اللہ تعالیٰ کی بڑی نشانیوں میں سے یہ ایک بڑی نشانی ہے۔

(۲) دن کبھی لمبے ہوتے ہیں اور کبھی راتیں لمبی ہوتی ہیں اس اختلاف کی وجہ سے مختلف موسم آتے ہیں کبھی موسم بہار اور کبھی گرمیوں کا موسم اور کبھی موسم خزاں اور کبھی سردیوں کا موسم " وھو من الآیات

العظام " یہ بھی اختلاف بڑی نشانیوں میں سے ہے جو رب تعالیٰ کی قدرت پر دلالت کر رہا ہے۔

(۳) بندوں کا دن کو کسب کرنا اور معیشت کے لئے رزق کو طلب کرنا اور رات کو سونا اور آرام کرنا بھی دن اور رات کے اختلاف پر مبنی ہے جو بڑی نشانیوں میں سے ہے اللہ تعالیٰ کی قدرت عقل والوں کو سمجھ آتی ہے۔

(۴) مخلوق کی مصلحتوں کے حصول کے لئے رات اور دن ایک دوسرے سے تعاون کر رہے ہیں "مع ما بینھما من التضاد والتنافی من الآیات العظام" باوجود اس کے کہ ان دونوں کے درمیان تضاد اور منافاۃ ہے لیکن پھر ان کا بندوں کی مصلحتوں کے حصول کے لئے ایک دوسرے سے تعاون کرنا بڑی نشانیوں میں سے ہے جو اللہ تعالیٰ کی قدرت پر دلالت کر رہا ہے حالانکہ عقل کا تقاضا یہ ہے کہ جن دو چیزوں میں تضاد اور منافاۃ ہو وہ ایک دوسرے سے تعاون نہیں کرتیں بلکہ فساد برپا کرتی ہیں۔

(۵) مخلوق کا رات کے اول حصہ میں سونے کی طرف متوجہ ہونا اس موت کے مشابہ ہے جو اسرافیل کے پہلی مرتبہ صور پھونکنے پر آئے گی۔ پھر مخلوق کا صبح جاگنا اس زندگی کے مشابہ ہے جو دوسری مرتبہ صور پھونکنے پر حاصل ہونی ہے تو واضح ہوا کہ دن رات کا بدلنا قیامت کی یاد دلاتا ہے جو عقل والوں کے لئے قدرت باری تعالیٰ پر دلالت کرنے والی بڑی نشانی ہے۔

(۶) رات کی تاریکی کا صبح کے آنے پر پھٹ جانا اس طرح کی بڑی نشانی ہے جیسے صاف پانی کی چھوٹی نہر گدلے (مٹیالے رنگ کے) پانی کے دریا کے ساتھ چل رہی ہو نہ صاف پانی مٹیالے کو صاف کرے اور نہ ہی مٹیالے رنگ کا پانی صاف کو مٹیالا کرے یہ نشانی بھی دن رات کے بدلنے سے حاصل ہوتی ہے۔

(۷) رات اور دن کا معتدل مقدار پر ہونا اور لوگوں کی مصلحتوں کے مطابق ہونا کہ وہ ان مقامات میں سکونت اختیار کر سکیں جہاں دن رات کا یہ نظام ہو یہ بھی قدرت باری تعالیٰ کی ایک عظیم نشانی ہے جسے عقل والے سمجھتے ہیں بخلاف اس کے جن مقامات میں قطب بالکل سیدھا سر کے مقابل ہو وہاں سال میں چھ ماہ کی رات ہوتی ہے " وھناک لا یتم النضج ، ولا یصلح المسکن لحیوان ولا یتھیأ فیه شئی من اسباب المعیشة " اور وہاں پھلوں اور کھیتی وغیرہ کا پکنا مکمل نہیں ہوتا۔ اور جاندار چیزوں کا وہاں رہنا بہت مشکل ہے اور وہاں اسباب معیشت کا مہیا ہونا بھی مشکل کام ہے۔

(۸) صبح کے وقت سورج کا طلوع ہونا اور روشنی کرنا اور شام کو غروب ہونا اور تاریکی چھا جانا یہ کیفیت بھی دن اور رات کے بدلنے سے حاصل ہوتی ہے جس سے عقل والے لوگ رب تعالیٰ کی قدرت پر نشانی حاصل کر لیتے ہیں۔ (از کبیر)

وَالْفُلْکِ الَّتِیْ تَجْرِیْ فِی الْبَحْرِ بِمَا یَنْفَعُ النَّاسَ :

اور کشتیوں میں (نشانیاں ہیں عقل والوں کے لئے) جو چلتی ہیں دریاؤں میں کہ نفع پہنچائیں لوگوں کو۔

طلباء کے لئے: فلک ، بضم الفاء اور بفتح الفاء ، کا مادہ ایک ہی ہے جس کا معنی ہے گھومنا پھر ہر گول چیز کو فلک (بفتح الفاء) کہا جاتا ہے۔ کشتی کو " فلک " (بضم الفاء) کہا جاتا ہے کیونکہ یہ پانی میں آسانی سے گھومتی ہے۔ فلک (بضم الفاء) واحد اور جمع دونوں کے لئے استعمال ہوتا ہے البتہ جب واحد مراد لیا جائے گا تو اس وقت اس کے ساتھ مذکر صیغے استعمال کئے جائیں گے کیونکہ یہ لفظ مذکر ہو گا اور جمع کی صورت میں مؤنث ہوگا کیونکہ جمع مکسر حکم مؤنث میں ہوتی ہے۔

طلباء کرام کی توجہ کے لئے: " البحر سمی بحرا لاستبحاره وهو سعته وانبساطه "

بحر کو بحر اس لئے کہا جاتا ہے کہ اس میں استبحار یعنی وسعت اور بساطت پائی جاتی ہے۔ جیسا کہ کہا جاتا ہے "استبحر فلان فی العلم ، تبحر فلان فی العلم " فلاں شخص کو علم میں وسعت حاصل ہے اسی طرح کہا جاتا ہے " تبحر فلان فی المال " فلاں کا مال وسیع ہے " والبحر الشق ومنه البحيرة " بحر کا ایک معنی ہے پھٹنا اسی معنی کے لحاظ سے بحیرہ کا استعمال ہے۔ بحر میں دونوں معانی معتبر ہو سکتے ہیں کہ اس میں وسعت پائی جاتی ہے اور وہ زمین کے پھٹنے سے واقع ہے۔

مشہور بحور پانچ ہیں:

(۱) بحر ہند اسی کو بحر چین بھی کہا جاتا ہے۔ (۲) بحر مغرب۔

(۳) بحر شام وروم ومصر۔ (۴) بحر نیطش۔ (۵) بحر جرجان۔

تنبیہ: طلباء کرام اس مسئلہ کو نہ بھولیں کہ "بحر" کا اطلاق سمندر پر بھی ہے اور دریا پر بھی ہے اور "نہر" کا اطلاق دریا پر بھی ہے اور نہر پر بھی۔ اس لئے عربی کتب میں سیاق وسباق کو دیکھ کر ترجمہ کیا جائے کہ

یہاں مراد کون سامعنی لیا گیا ہے۔

بحر ہند: اس کا طول مشرق سے مغرب کی جانب ہے حبشہ کی زمین کی انتہاء سے شروع ہوتا ہے اور ہند اور چین کی طرف آتا ہے "**یکون مقدار ذلک ثمانمائة الف میل**" طول کے لحاظ پر اس کی مقدار آٹھ لاکھ میل ہے "**وعرضه الفی وسبعمائة میل**" اس کی مقدار عرض کے لحاظ دو ہزار سات سو میل بنتی ہے اور خط استواء سے دو ہزار سات سو میل متجاوز ہے۔

اس بحر کی **ایک خلیج** (**الخلیج ، من البحر** ،کھاڑی،ندی، **خلیج النهر** ،دریا کے دونوں کنارے (المنجد) یہاں مراد بڑے دریا ہیں جو سمندروں میں گرتے ہیں۔ حبشہ کی زمین سے بربر کے کنارے تک ہے اسے خلیج بربری بھی کہتے ہیں اس کا طول پانچ سو میل کی مقدار ہے اور عرض ایک سو میل ہے۔

دوسری خلیج: بحر ایلہ ہے، اسی کو بحر قلزم بھی کہا جاتا ہے اس کا طول ایک ہزار چار سو میل ہے اور عرض سات سو میل ہے اس کی انتہاء اس بحر تک ہے جسے بحر اخضر، اس کے کنارے پر قلزم واقع ہے اسی لئے اسے بحر قلزم بھی کہا جاتا ہے اور اس کی مشرقی جانب یمن اور عدن کی زمین ہے اور مغربی جانب حبشہ ہے۔

تیسری خلیج: بحر ارض فارس ہے اس کو خلیج فارسی کہا جاتا ہے وہ بحر بصرہ اور فارس ہے اس کی مشرقی جانب تبر اور مکران ہیں اور اس کی مغربی جانب عمان ہے اس کا طول ایک ہزار چار سو میل ہے اور عرض پانچ سو میل ہے۔ ان دو خلیجوں یعنی خلیج ایلہ اور خلیج فارس کے درمیان حجاز اور یمن کی زمین ہے اور تمام ممالک عرب ان کے درمیان ہی ہیں ان دو خلیجوں کے درمیان مسافت ایک ہزار پانچ سو میل ہے۔

چوتھی خلیج: تیسری خلیج سے ہی چوتھی خلیج نکلتی ہے جو ہند کے ممالک تک پھیلی ہوئی ہے اسے خلیج اخضر کہا جاتا ہے اس کا طول ایک ہزار پانچ سو میل ہے۔

جزیرہ بحر ہند: میں کئی جزائر ہیں کوئی آباد ہیں اور کوئی غیر آباد ہیں کل ایک ہزار تین سو ستر جزیرے ہیں اسی بحر اخضر کی انتہاء میں ہند کی زمین کے مقابل چین کے متصل مشرقی کنارے میں جزیرہ سراندیپ ہے۔ جس کا احاطہ تین ہزار میل ہے اس میں بڑے بڑے پہاڑ ہیں اور بہت سے دریا ہیں ان مقامات میں سرخ رنگ کا یاقوت پایا جاتا ہے۔

آباد جزائر: اس جزیرہ کے اردگرد انیس جزیرے آباد ہیں ان میں شہر آباد ہیں اور دیہات آباد

ہیں۔ اسی بحر اخضر کے جزیروں میں سے جزیرہ کلۃ ہے جس میں رصاص (قلعی) پائی جاتی ہے۔ اور اسی بحر کے جزائر میں جزیرہ سریرہ ہے جس میں کافور پائی جاتی ہے۔

بحر مغرب: کا نام محیط بھی ہے یونانیوں نے اس کا نام اوقیانوس رکھا ہے اسی کے ساتھ بحر ہند متصل ہے اس کا طول معلوم نہیں سوائے مغربی اور شمالی کناروں کے۔ یہ روس اور صقالیہ کی زمین کے مقابل ہے جنوبی جانب کی انتہاء سے شروع ہوتا ہے سوڈان کی زمین کے مقابل ہے سوس کی انتہائی حدود سے گزرتا ہے طنجہ، تاہرت، اندلس، جلالقہ اور صقالیہ سے گزرتا ہے پھر وہاں سے پہاڑوں کے پیچھے گزرتا ہے جن پر لوگ نہیں جاتے پھر اس کے ساتھ ساتھ غیر آباد زمین ہے پھر یہ بحر مشرق کی طرف آجاتا ہے۔ اس بحر میں کشتیاں نہیں چلتیں (یہ علامہ رازی کے زمانہ کی بات ہے) بلکہ لوگ مشکیزوں (ہماری پنجابی میں سنڑاہی کہا جاتا ہے) کے ذریعہ اس میں تیرتے ہیں۔

حبشہ کی زمین کے مقابل اس میں چھ جزیرے ہیں جن کو جزائر خالدات کہتے ہیں اس بحر مغرب سے ایک عظیم خلیج شمال صقالیہ میں نکلتی ہے اور یہ بلغاریہ میں مسلمانوں کے علاقہ تک پھیلی ہوئی ہے۔ اس کا طول مشرق سے مغرب کی طرف تین سو میل اور عرض ایک سو میل ہے۔

بحر روم: جو افریقہ اور مصر اور شام تک وسیع ہے اس کا طول پانچ ہزار میل کی مقدار ہے اور اس کی عرض چھ سو میل ہے اور اسی سے ایک خلیج شمالی کنارہ کی طرف نکلتی ہے جو روم کے قریب ہے اس کی لمبائی پانچ سو میل ہے اور اس کی چوڑائی چھ سو میل ہے۔ اور اسی سے ایک اور خلیج نکلتی ہے جو ارض سرین کی طرف جاتی ہے جس کی لمبائی دو سو میل ہے اس بحر روم میں ایک سو باسٹھ جزیرے آباد ہیں جن میں سے پچاس جزیرے بہت بڑے ہیں۔

بحر نیطش: یہ لاذقیہ سے قسطنطنیہ کے خلف کی طرف ہے روس اور صقالیہ کی زمین میں واقع ہے اس کی لمبائی ایک ہزار تین سو میل ہے اور چوڑائی تین سو میل ہے۔

بحر جرجان: اس کی لمبائی مغرب سے مشرق کی جانب تین سو میل ہے اور چوڑائی چھ سو میل ہے اس میں دو جزیرے آباد ہیں اسے ''بحر آب سکون'' بھی کہا جاتا ہے یہ طبرستان، دیلم، نہروان، باب الابواب اور اران کے کنارہ تک پھیلا ہوا ہے یہ کسی اور بحر سے متصل نہیں۔ یہ بڑے بڑے بحروں

کے متعلق مختصر بحث پیش کی گئی اور ان سے چھوٹے جن کو بحیرہ کہا جاتا ہے وہ پھر کثیر تعداد میں ہیں جیسا کہ بحیرہ خوارزم اور بحیرہ طبریہ وغیرہ۔ ارسطو نے بیان کیا ہے کہ بحر اوقیانوس کو زمین میں مرکزی حاصل ہے جیسا کہ کمر بند کو مرکزی حیثیت حاصل ہے۔

بما ینفع الناس : ''وہ کشتیاں جو دریاؤں میں چلتی ہیں'' جن سے لوگ نفع حاصل کرتے ہیں (وہ عقل والوں کے لئے نشانیاں ہیں)۔ لوگوں کو کشتیوں سے نفع کیسے حاصل ہے؟ وہ یہ ہے کہ ان پر سوار ہونا مباح ہے اور ان کے ذریعے مال حاصل کرنا اور تجارت کرنا جائز قرار دے دیا گیا ہے اور دریا کی سیر سے لذت حاصل کرنا کشتیوں کے ذریعے ہی ہوتا ہے یہ سب لوگوں کے لئے منافع ہیں۔

کشتیوں کا دریاؤں میں چلنا نشانیاں کیسے؟ اس میں چند وجوہ پائی گئی ہیں جن سے انسان سمجھ سکتا ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کی قدرت کی عظیم نشانیاں ہیں:

(۱) کشتیاں اگرچہ لوگ تیار کرتے ہیں لیکن وہ آلات وغیرہ جن سے کشتیوں کو بنایا جاتا ہے وہ سب اللہ تعالیٰ کی تخلیق ہیں۔ اگر اللہ تعالیٰ ان چیزوں کو نہ پیدا کرتا تو کشتیاں بھی نہ بنائی جاسکتیں۔ اس لئے یہ اللہ تعالیٰ کی قدرت کی عظیم نشانیاں ہیں۔

(۲) کشتیوں کے چلاتے وقت اگر ہوائیں سازگار نہ ہوں تو پھر بھی کشتیوں کا چلانا اور ان سے نفع حاصل کرنا ممکن نہیں۔ ہواؤں کو سازگار بنانا، اور کشتیوں کا مددگار بنانا رب تعالیٰ کی ہی قدرت ہے۔ جس کا پتہ عقل والوں کو کشتیوں کے چلانے سے حاصل ہوتا ہے۔

(۳) اگر ہوا کو مکمل طور پر رب تعالیٰ بند کردے یا ہوا کو ہمیشہ آندھی کی شکل میں چلائے تو کشتیاں تباہ و برباد ہو کر رہ جائیں ہواؤں کو ان کیفیات سے بچانا دراصل کشتیوں کو بچانا اور نفع مند بنانا ہے یہ سب کچھ اللہ تعالیٰ کی قدرت عظیمہ پر دلالت کررہا ہے۔

(۴) اگر اللہ تعالیٰ بندوں کے دلوں کو قوت نہ عطا فرماتا تو وہ کشتی پر سوار ہونے سے ڈر محسوس کرتے کوئی مقصد حاصل نہ ہو سکتا، اللہ تعالیٰ نے بندوں کی مصلحت کے لئے اور منافع حاصل کرنے کے لئے اور تجارت کے طریقوں پر عمل کرنے کے لئے کشتیوں میں بیٹھنے کی ان کے دلوں میں

قوت بھی پیدا کر دی جو اللہ تعالیٰ کی قدرت عظیمہ پر دلالت کر رہی ہے۔

(۵) اللہ تعالیٰ نے جہان میں ہر طرف میں کوئی نہ کوئی معین اشیاء پیدا فرما دی ہیں جو وہاں ہی مل سکتی ہیں دوسری جگہ نہیں مل سکتیں اگر ہر چیز ہر جگہ ملتی تو لوگ نہ سفر کرنے کے محتاج ہوتے اور نہ ہی کشتیوں پر سوار ہونے کی ضرورت درپیش آتی، اس لئے کشتیوں پر سوار ہو کر خصوصی منافع حاصل کرنے میں عقل والوں کے لئے اللہ تعالیٰ کی قدرت کی عظیم نشانی پائی جاتی ہے۔

(۶) اللہ تعالیٰ کا دریاؤں کو کشتیوں کا بوجھ اٹھانے کے لئے مسخر کرنا اس کی قدرت کی عظیم نشانی ہے ورنہ دریاؤں کی طغیانی، فراوانی، موجوں کا اٹھنا پانی کا حرکت کرنا کشتیوں کو تہہ بالا کر کے رکھ دیتا لیکن اللہ تعالیٰ کی قدرت سے ہی ایسا ممکن ہے۔

(۷) بڑی بڑی وادیاں جیسے جیحون اور سیحون بحیرہ خوارزم میں گرتی ہیں حالانکہ وہ دریا ہے یعنی چھوٹا سمندر ہے لیکن پھر بھی وہ نہ زیادہ ہوتا ہے اور نہ لمبا ہوتا ہے۔

" فالحق سبحانه وتعالیٰ هو العالم بكيفية حال هذه المياه العظيمة التي تنصب فيها "

اللہ تعالیٰ ہی اس کیفیت کو بہتر جانتا ہے کہ اتنے بڑے پانی ایک بحیرہ میں گر کر اسے نہ بڑھائیں یہ اس کی قدرت کی عظیم نشانی ہے۔

(۸) دریا میں بڑے بڑے عظیم جانور، بڑی بڑی مچھلیاں ہونے کے باوجود اللہ تعالیٰ ان سے کشتیوں کو محفوظ فرماتا ہے اور ان کو صحیح وسلامت کنارے پر پہنچا دیتا ہے۔ اگر انسان اس میں تدبر فرمائے تو یقیناً سمجھ جائے گا کہ ہاں واقعی اس میں اللہ تعالیٰ کی عظیم قدرت کی عظیم نشانی پائی گئی ہے۔

(۹) دریاؤں میں اللہ تعالیٰ کی قدرت کی عجیب نشانی جس سے انسانی عقل دنگ رہ جاتی ہے کہ یہ کام صرف رب تعالیٰ کی قدرت میں ہے انسان کو یہ طاقت رب تعالیٰ نے عطاء ہی نہیں کی کہ وہ ایسا کام کر سکے ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ مَرَجَ الْبَحْرَيْنِ يَلْتَقِيَانِ بَيْنَهُمَا بَرْزَخٌ لَّا يَبْغِيَانِ ﴾

اس نے دو سمندر بہائے کہ دیکھنے میں معلوم ہوں ملے ہوئے اور ہے ان میں روک کہ ایک

دوسرے پر بڑھ نہیں سکتا۔ (سورۃ رحمن)

اور رب تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿ وهو الذی مرج البحرین هذا عذب فرات وهذا ملح اجاج وجعل بینهما برزخا وحجرا محجورا ﴾ (الفرقان ۵۳)

''اور وہی جس نے ملے ہوئے رواں کئے دوسمندر یہ میٹھا ہے نہایت شریں اور یہ کھاری ہے نہایت تلخ اوران کے بیچ میں پردہ رکھا اور روکی ہوئی آڑ''

یہ اللہ تعالیٰ کی قدرت ہے کہ دوسمندر اور دو دریا ایک ساتھ چل رہے ہوں بظاہران میں کوئی آڑ نہ ہو لیکن ایک کے پانی کا رنگ اور ہو دوسرے کا اور ہو ایک دوسرے پر تجاوز نہ کرے اسی طرح ایک کا پانی میٹھا ہو دوسرے کا نمکین ہو کوئی ایک دوسرے پر تجاوز نہ کرے عقل والوں کے لئے اس میں نشانی ہے کہ اس میں ضرور کسی ذات کی حفاظت اور تدبیر کا دخل ہے جس کی حکمرانی ان دریاؤں اور سمندروں پر بھی ہے۔ (ماخوذ از کبیر)

وَمَا اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنَ السَّمَاءِ مِنْ مَّاءٍ فَاَحْيَا بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا:

اور جو نازل کیا اللہ نے آسمانوں سے پانی تو زندہ کیا اس کے ذریعے زمین کو اس کے مرنے کے بعد (اس میں نشانیاں ہیں عقل والوں کیلئے)۔ یعنی بارش برسانا اور اس کے ذریعے خشک زمین کو سرسبز وشاداب کرنا اللہ تعالیٰ کی قدرت ہے وجود صانع پر نشانی ہے اس کے نشانی ہونے میں چند وجوہ ہیں۔

(۱) یہ اجسام ہیں ان کے ساتھ جو صفات قائم ہیں رقت اور رطوبت اور میٹھا ہونا۔ '' ولا یقدر احد علی خلقها الا الله تعالیٰ '' اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی ایک بھی پانی کی صفات کو پیدا کرنے پر قادر نہیں تو واضح ہوا کہ یہ اللہ تعالیٰ کی عظیم قدرت کی نشانی ہے۔ رب تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ قُلْ اَرَاَيْتُمْ اِنْ اَصْبَحَ مَاؤُكُمْ غَوْرًا فَمَنْ يَّاْتِيْكُمْ بِمَاءٍ مَّعِيْنٍ ﴾ (سورۃ الملک ۳۰)

''تم فرماء بھلا دیکھو تو اگر صبح کو تمہارا پانی زمین میں دھنس جائے تو وہ کون ہے جو تمہیں پانی لادے نگاہ کے سامنے بہتا''۔

(۲) بیشک اللہ تعالیٰ نے پانی کو حیات انسان کا سبب بنایا اور انسان کے رزق کا ذریعہ بنایا۔ رب تعالیٰ نے فرمایا ﴿ وَفِي السَّمَاءِ رِزْقُكُمْ وَمَا تُوْعَدُوْنَ ﴾ (الذاریات، ۲۲) اور آسمان میں

تمہارا رزق ہے اور جو تمہیں وعدہ دیا جاتا ہے۔ کہ اسی (آسمان) کی طرف سے بارش کر کے زمین کو پیداوار سے مالا مال کیا جاتا ہے اور آخرت کے ثواب وعذاب کا (جو تمہیں وعدہ دیا جاتا ہے) وہ سب آسمان (لوح محفوظ) میں مکتوب ہے۔ (خزائن العرفان)

(۳) بادل اور بادلوں میں بہت بڑے پانی جن سے بڑی بڑی وادیاں بہتی ہیں ان کو آسمانوں کی فضاء میں معلق رکھنا یہ اللہ تعالیٰ کی بڑی بڑی نشانیوں میں سے بڑی نشانی ہے کیونکہ جب چاہے پانی کو نازل فرمائے اور جب چاہے بارشوں کو روک رکھے۔

(۴) پانی کو ہی اللہ تعالیٰ نے انسان کی زندگی کا سبب بنایا اور انسان کے اکثر منافع کی دارومدار پانی پر ہی ہے رب تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ افرأيتُم الماءَ الَّذِي تَشرَبُونَ ءَ أنتُم انزَلتُمُوهُ مِنَ المُزنِ ام نَحنُ المُنزِلُونَ ﴾

''تو بھلا بتاؤ تو وہ پانی جو پیتے ہو کیا تم نے اسے بادل سے اتارا یا ہم ہیں اتارنے والے''

(الواقعۃ: ۶۹)

(۵) جب انسان بارش کے محتاج ہوں تو اپنے گناہوں کی معافی طلب کرتے ہوئے عاجزی اور زاری سے رب تعالیٰ کے حضور جب دعا کریں تو اللہ تعالیٰ ان کو عظیم منافع عطاء فرماتا ہے یعنی بارش عطا کرتا ہے جو عظیم منافع کا ذریعہ ہے یہ اللہ تعالیٰ کی عظیم قدرت کی عظیم نشانی ہے۔

نوح علیہ السلام کی حکایت بیان کرتے ہوئے رب تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ فقلتُ استغفرُوا ربَّكُم انَّهُ كانَ غفَّارًا يُرسلُ السَّماءَ عليكُم مدرارًا ﴾

(سورۃ نوح: ۱۰، ۱۱)

''تو میں نے کہا اپنے رب سے معافی مانگو وہ بڑا معاف فرمانے والا ہے تم پر موسلا دھار بارش برسائے گا''

(ماخوذ از کبیر)

سوال: ایک آیۃ کریمہ میں ہے ﴿ وَانزَلَ مِنَ السَّماءِ ماءً ﴾ جس سے پتہ چلا کہ بارش آسمانوں سے آتی ہے دوسری آیۃ کریمہ میں ہے ﴿ ءَ أنتُم انزَلتُمُوهُ مِنَ المُزنِ ام نَحنُ المُنزِلُونَ ﴾ جس سے سمجھ آتا ہے کہ بارش بادل سے آتی ہے۔ اور فلاسفہ کا مشہور قول ہے کہ سورج کا زمین میں اثر ہوتا ہے زمین کا پانی بخار بن کر اوپر جاتا ہے جب وہ ٹھنڈی فضاء میں پہنچتا ہے تو وہ بخارات ٹھنڈے ہو

کر پانی کی شکل اختیار کر لیتے ہیں تو وہ بارش کی شکل اختیار کر لیتے ہیں۔ ان میں تطبیق کیسے ہے؟ کس قول پر عمل کیا جائے اور کس قول کو چھوڑا جائے۔

جواب: اللہ تعالیٰ آسمانوں سے پانی نازل فرماتا ہے جیسا کہ رب تعالیٰ نے اس آیۃ میں ذکر فرمایا ﴿ وھو الصادق فی خبرہ ﴾ اور وہ اپنی خبر میں سچا ہے۔ البتہ اللہ تعالیٰ بادلوں میں پانی کو روک کر رکھتا ہے " فای بعد فی ان یمسکہ فی السماء " تو کون سی بعید بات ہے کہ وہ آسمانوں میں پانی کو روک کر رکھے۔ یعنی رب تعالیٰ آسمانوں میں پانی کو روک کر رکھتا ہے پھر اسے بادلوں میں روک کر رکھتا ہے جب چاہتا ہے بارش برسا کر پانی کو زمین پر نازل کر دیتا ہے۔

البتہ یہ قول کہ زمین سے بخارات اٹھتے ہیں اور اوپر جا کر فضاء میں ٹھنڈے ہو کر بارش کی شکل میں آتے ہیں اس کے متعلق اگر یہ عقیدہ رکھا جائے کہ اللہ تعالیٰ نے اسباب میں سے یہ بھی ایک سبب بنایا ہے تو جائز ہے۔ لیکن اگر مستقل طور پر اسی کو سبب مانا جائے اور رب تعالیٰ جو قادر مختار ہے اس کے قول کی نفی کی جائے تو جائز نہیں بلکہ یہ کفر ہے۔ (ماخوذ از کبیر) (زیادہ تفصیل پہلے پارہ میں گزر چکی ہے)۔

زمین کو زندہ کرنے کا کیا مطلب؟ بیشک یہ حیات مختلف وجہ سے پائی گئی ہے۔

(۱) بارش کی وجہ سے گھاس اور پودے وغیرہ اگتے ہیں اگر یہ نہ پائے جائیں " لما عاشت دواب الارض " تو زمین پر چلنے والے جانور زندہ نہ رہیں۔ تو گویا کہ زمین کی زندگی سے مراد زمین کی پیداوار سے جانوروں کو زندگی عطا کرنا ہے۔

(۲) اگر بارش نہ ہو زمین کی پیداوار نہ ہو " لما حصلت الاقوات للعباد " تو بندوں کو روزی حاصل نہیں ہو سکتی تو پتہ چلا کہ بارش سبب ہے زمین میں مختلف چیزوں کے پیدا ہونے کا جو بندوں کی زندگی کا سبب ہے اس لئے زمین کو زندہ کرنے سے تعبیر کر دیا۔

(۳) اللہ تعالیٰ ہر چیز کو بقدر حاجت پیدا فرماتا ہے کیونکہ اس نے اپنے فضل و کرم سے بندوں کے رزق کو اپنے ذمہ لے لیا ارشاد فرمایا ﴿ وَمَا مِنْ دَابَّةٍ فِي الْاَرْضِ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ رِزْقُهَا ﴾ تو گویا کہ تمام ذی روح چیزوں کی زندگی کا سبب بارش اور زمین ہیں اسی وجہ سے بارش کے ذریعہ زمین کو زندہ کرنے سے ذکر فرما دیا۔

(۴) زمین میں رنگ برنگ پودے پیدا فرمائے مختلف کھانے کی چیزیں اور مختلف خوشبودار پھول اور لباس بنانے کے لئے کپاس وغیرہ بارش کے ذریعے پیدا فرمائے " لان ذلک کلہ مما لا یقدر علیہ الا اللہ" اس لئے کہ ان تمام چیزوں کی تخلیق پر اللہ تعالیٰ کے بغیر کوئی قادر نہیں گویا کہ رب تعالیٰ نے بارش کے ذریعے ان چیزوں کو پیدا فرما کر زمین کو زندگی عطا فرمائی۔

(۵) اللہ تعالیٰ بارش کی وجہ سے زمین میں حسن اور سبزہ اور تازگی اور رونق پیدا فرماتا ہے " فذلک هو الحیاۃ "اسی کو حیات سے تعبیر کیا گیا ہے۔ (ماخوذ از کبیر)

تنبیہ : اللہ تعالیٰ نے بارش کے ذریعے زمین کو زندہ کرنے کا جو ذکر فرمایا اس کا مجازی معنی لیا گیا ہے "لان الحیاۃ لا تصح الا علی من یدرک ویصح ان یعلم" اس لئے کہ زندگی کا اطلاق اس وقت تک صحیح نہیں جب تک ادراک اور علم نہ پایا جائے اسی طرح موت کا اطلاق بھی وہاں ہوتا ہے جہاں حیات پائی جائے ہاں البتہ جسم جب زندہ ہوتا ہے تو اس میں حسن و جمال اور نشو ونما پائے جاتے ہیں تو زمین میں جب یہی چیزیں پائی جائیں تو ان پر مجازی طور پر حیات کا ذکر فرمادیا ہے " وهذا من فصیح الکلام الذی علی اختصار یجمع المعانی الکثیرۃ " یہ فصیح کلام ہے جو مختصر ہونے کے باوجود بہت بڑے معانی کو جامع ہے۔ (از کبیر)

زمین کا زندہ ہونا نشانی کیسے؟

اللہ تعالیٰ کے صانع ہونے اور اس کی قدرت پر اس میں چند وجوہ سے نشانی پائی گئی ہے:

(۱) " احدھا نفس الزرع لان ذلک لیس فی مقدور احد علی الحد الذی یخرج علیہ "

ایک ان میں کھیتی ہے کیونکہ کسی اور کی قدرت میں یہ داخل نہیں کہ رب تعالیٰ کے بغیر کوئی اور پیدا کرے اور رب تعالیٰ کی قدرت سے باہر ہو ایسا نہیں ہرگز نہیں۔

(۲) " وثانیھا اختلاف الوانھا علی وجہ لا یکاد یحد ویحصی "

اور دوسری نشانی یہ ہے کہ مختلف رنگوں کی اشیاء کا پیدا ہونا ایسے طریقہ پر کہ وہ رب تعالیٰ کی قدرت کے بغیر ان کی کوئی حد ہی نہ ہو اور شمار میں آ ہی نہ سکیں۔

(۳) " وثالثھا اختلاف طعوم ما یظھر علی الزرع والشجر "

اور تیسری نشانی یہ ہے کہ مختلف ذائقوں والے طعام جو کھیتی اور درختوں سے پیدا ہوتے ہیں وہ صرف رب تعالیٰ کی قدرت میں ہیں اس لئے یہ رب تعالیٰ کی قدرت پر نشانی ہے۔

(۴) " ورابعها استمرار العادات بظهور ذلک فی اوقاتها المخصوصة "

چوتھی نشانی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی عادت شریف یہ ہے کہ وہ مقررہ وقت میں کھیتی اور درختوں سے غلہ اور درختوں سے پھل پیدا فرماتا ہے۔ (از کبیر)

یعنی ایک ایک چیز میں اللہ تعالیٰ کی قدرت کی کئی کئی نشانیاں موجود ہیں ہاں البتہ انسان کو اسی وقت رب تعالیٰ کی قدرت کی عظیم نشانی حاصل ہوگی جب اسے ان میں تفکر اور تدبر حاصل ہوگا۔

وَبَثَّ فِیْهَا مِنْ كُلِّ دَآبَّةٍ :

اور پھیلانے اس میں ہر قسم کے جانوروں میں (نشانیوں ہیں عقل والوں کے لئے)

یعنی زمین میں ہر قسم کی جاندار مخلوق کو پھیلانے میں اللہ تعالیٰ کی قدرت کی نشانیاں پائی جاتی ہیں۔ جو صانع کے موجود ہونے اور خالق ہونے پر دلالت کررہی ہیں۔

اللہ تعالیٰ کی عجیب صنعت پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی دلیل: ایک شخص حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس حاضر ہوا اور کہنے لگا میں شطرنج کے معاملہ میں بہت تعجب کرتا ہوں کہ ایک ذراع (ڈیڑھ فٹ) کا ٹکڑا ہوتا ہے اگر انسان کروڑ مرتبہ بھی کھیلے تو دو مرتبہ بھی ایک چال پر متفق نہیں ہوسکتا۔ یہ سن کر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ میں تمہیں اس سے زیادہ تعجب والی چیز بتاتا ہوں وہ یہ ہے کہ انسان کے چہرہ کی مقدار ایک بالشت ہے پھر اعضاء اس میں پائے جانے والے سب انسانوں میں دو ابرو دو آنکھیں، ناک اور منہ ہیں جن میں کوئی تبدیلی نہیں:

" ثم انک لا تری شخصین فی الشرق والغرب یشتبهان فی فما اعظم تلک القدرة والحکمة التی اظهرت فی هذه الرفعة الصغیرة هذه الاختلاف التی لاحدلها "

پھر بیشک تم نہیں دیکھتے ہو کہ مشرق ومغرب کوئی دو شخص ایک دوسرے کے مشابہ نہیں ہوتے اللہ تعالیٰ کی قدرت اور حکمت سے بڑھ کر کسی اور کو یہ مقام کب حاصل ہوسکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی قدرت

وحکمت کی یہ چھوٹی سی رفعت حاصل ہے اس طرح اسکی قدرت کے مختلف مقامات کی کوئی حد نہیں۔

انسان اپنے آپ کو دیکھ کر رب تعالیٰ کی قدرت کا اندازہ کرے:

رب تعالیٰ نے انسان کو پیدا کیا جس کی ابتداء نطفہ سے ہے پھر اس سے خون، پھر اس سے گوشت اور ہڈیوں کو پیدا کرنا، پھر انسان کو شعور اور ادراک اور علم اور حکمت عطاء کرنا ہی واضح کر رہا ہے کہ اس کا کوئی مدبر بھی ہے اور اس کو اعضاء عطاء کرنے والا اور قوت عطاء کرنے والا اور اعضاء میں ترکیب پیدا کرنے والی قادر ذات موجود ہے۔

حیوانات قدرت باری تعالیٰ پر دلالت کر رہے ہیں:

حیوانوں کی تخلیق ان کے اعضاء ان میں قوت ترکیبیہ کا پیدا کرنا، پھر مختلف حیوانات کی مختلف طاقت، مختلف حرکات یہ سب چیزیں اللہ تعالیٰ کی قدرت پر دلالت کر رہی ہیں اور صانع کے موجود ہونے پر دلالت کر رہی ہیں۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ کا شاندار قول: سبحان من بصر بشحم، واسمع بعظم، وانطق بلحم، وہ ذات پاک ہے جس کو عظیم قدرت حاصل ہے جس نے چربی کو (آنکھ کی چربی) دیکھنے کی طاقت عطاء کی۔ اور ہڈیوں کو سننے کی طاقت عطاً (مراد اس سے کان کے پٹھے ہیں ہیں) اور گوشت کو بولنے کی طاقت عطا کی (مراد اس سے زبان کا گوشت ہے)

عناصر اربعہ سے تخلیق قدرت کی نشانی:

انسان ہو یا دوسرے حیوان ہوں ان کی تخلیق عناصر اربعہ سے ہوئی آگ، ہوا، پانی اور مٹی سے۔ اس میں عقل کا تقاضا یہ ہے کہ تمام عناصر سے اوپر آگ ہونی چاہیے کیونکہ اس میں حرارت اور یبوستہ (گرمی، خشکی) پائی جاتی ہیں اور اس سے کم لطافت میں ہوا ہے یعنی ریح کا درجہ اوپر نیچے دوسرے مقام پر ہونا عقل کا تقاضا ہے اور اس کے بعد درجہ ہے پانی کا اور اس کے بعد درجہ ہے زمین کا۔ بدن انسان کی ترکیب میں عقل تقاضا کے مطابق مٹی (یعنی یبوسة وبرودة) کو سب سے نیچے ہونا چاہیے لیکن

اللہ تعالیٰ نے انسان کو اس کی عقل کے تقاضا کے بالکل خلاف بنایا ہے۔

سب سے اوپر ہڈیوں یعنی سر کی کھوپڑی کو رکھا جن میں زمین کی طبیعت (یعنی مٹی کی تاثیر) برودۃ اور یبوسۃ کو رکھا اور اس کے نیچے دماغ کو رکھا جس میں پانی کی تاثیر یعنی برودۃ اور رطوبۃ پائی جاتی ہے۔اور اس کے نیچے نفس (سانس) کو رکھا جس میں ہوا کی تاثیر یعنی حرارت اور رطوبت پائی جاتی ہے۔ اور سب سے نیچے دل کو رکھا جس میں آگ کی تاثیر یعنی حرارت اور یبوست پائی جاتی ہے۔

" فسبحان من بیده قلب الطبائع یرتبها کیف یشاء ویرکبها کیف اراد "

اللہ تعالیٰ کی پاک ذات کے قبضہ قدرت میں ہی طبائع کو بدلنا ہے جسے جس طرح چاہے مرتب فرمادے اور جیسے ارادہ فرمائے اسی طرح مرکب کردے۔

یعنی انسان اگر عقل سے کام لے تو صرف اپنی بناوٹ کی طرف توجہ کرے تو رب تعالیٰ کی قدرت کا اسے پتہ چل جائے کہ رب تعالیٰ نے عقل کے تقاضا کے خلاف کس طرح عناصر اربعہ کو مرکب کیا جب کہ ان کی تاثیرات وہی ہیں جو پہلے تھیں عقل کا تقاضا یہ ہے کہ اس طرح ترکیب ہو نہیں سکتی لیکن قدرت باری تعالیٰ سے کوئی چیز بعید نہیں۔

عناصر اربعہ پر شکل کو مرتب کرنا ایک اور قدرت ہے:

ہر صانع اپنی صنعت کے نقش ونگار جس چیز پر قائم کرنا چاہے۔اسے مٹی سے بچاتا ہے۔تا کہ مٹی اس کے نقوش کو مکدر نہ کردے۔اور پانی سے بچاتا ہے،تا کہ پانی اسکے نقش ونگار کو مٹا نہ دے۔ اور ہوا سے اس چیز کو بچا کر رکھتا ہے۔تا کہ میری صنعت کے نقوش اس کی طراوت اور لطافت کی زد میں نہ آجائیں۔اور آگ سے اس چیز کو بچاتا ہے۔تا کہ آگ اس چیز کو ہی جلا کر راکھ نہ کردے جس کے نقوش بھی زائل نہ ہو جائیں۔ "ثم انه سبحانه وتعالی وضع نقش خلقته علی هذه الاشیاء" پھر رب سبحانہ کی قدرت دیکھو کہ اس نے اپنی مخلوق پر اپنی خلقت کے ان چیزوں پر ہی نقوش بنائے ہیں جن سے لوگ اپنی مصنوعات کو بچا کر رکھتے ہیں۔رب تعالیٰ نے فرمایا:

○ انّ مثل عیسی عند الله کمثل آدم خلقه' من تراب ۞

" بیشک عیسیٰ اللہ کے ہاں آدم کی طرح ہیں ان کو پیدا کیا مٹی سے "

اورارشادفرمایا: ﴿وَجَعَلْنَا مِنَ الْمَاءِ كُلَّ شَيْءٍ حَيٍّ﴾ ''ہم نے پانی سے ہر چیز کو زندگی عطاء کی''

اورفرمایا: ﴿فَنَفَخْنَا فِيهِ مِن رُّوحِنَا﴾ ''ہم نے اس میں اپنی طرف سے روح پھونکی''

اورفرمایا: ﴿وَخَلَقَ الْجَانَّ مِن مَّارِجٍ مِّن نَّارٍ﴾ ''اورجن کو پیدا فرمایا آگ کی لو سے''

''وھذا یدل علی ان صنعته بخلاف صنع کل احد'' اسی سے واضح ہو گیا اللہ تعالیٰ کی صنعت اوراس کی قدرت اس کی مخلوق کی صنعت اور قدرت سے بالاتر ہے۔

سبحان اللہ خالق ومخلوق کی طاقت کے امتیاز پر ہر چیز دلالت کررہی۔انسان اپنے آپ کو ہی دیکھ لےتو اسے پتہ چل جائے،انسان تفکر ہی نہ کرےتو فرعون بن جائےتو اس کی اپنی بدقسمتی۔

بچے کا قدرت باری تعالیٰ کی نشانی ہونا:

بچے کا ماں سے جدا ہونے یعنی پیدا ہونے میں تفکر کرو اور دیکھو کہ اگر بچے کے منہ اور ناک پر کپڑا رکھ دیں تو اس کا سانس رک جائے تو وہ مرجائے گا:

'' ثم انه بقی فی الرحم الضیق مدة مدیدة مع تعذر النفس هناک ولم یمت ''

لیکن بچے کا تنگ رحم (بچہ دانی) میں کتنی مدت تک رہنا باوجود اس کے بچے کو وہاں سانس لینے میں تنگی محسوس ہونا اور بچے کا نہ مرنا بلاشبہ رب تعالیٰ کی قدرت کی نشانی ہے۔پھر بچہ جب پیدا ہوتا ہے تو اس وقت وہ ضعیف وناتواں ہوتا ہے اور سمجھ سے دور ہوتا ہے وہ آگ اور پانی میں فرق نہیں کرسکتا اور نقصان دہ اور لذت والی چیزوں میں فرق کرنے کی اس میں صلاحیت نہیں پائی جاتی۔وہ یہ نہیں سمجھتا کہ یہ میری ماں ہے یا کہ اور کوئی عورت ہے۔

جب یہ معلوم ہو گیا کہ بچہ ابتدائی پیدائش میں سمجھ سے دور ہوتا ہے لیکن آہستہ آہستہ اسے فہم اور عقل اور ادراک میں کمال حاصل ہوتا ہے تو وہ تمام حیوانات سے بڑھ جاتا ہے اور کمال درجہ حاصل کر لیتا ہے '' لیعلم ان ذلک من عطیة القادر الحکیم '' تا کہ معلوم ہو جائے کہ یہ اللہ تعالیٰ قادر وحکیم کی طرف سے عطیہ ہے۔اگر انسان طبعی طور پر پیدائش کے وقت ہی ذکی ہوتا تو فہم وادراک کی تکمیل حاصل کرنے میں اسے اور زیادہ کمال حاصل ہوتا حالانکہ اس طرح نہیں بلکہ

ابتدائی پیدائش میں سمجھ سے خالی ہوتا ہے پھر آہستہ آہستہ اسے فہم وادراک میں کمال حاصل ہوتا ہے " علمنا ان کل ذلک من عطیة الله الخالق الحکیم " تو اس سے ہمیں معلوم ہوگیا کہ یہ اللہ تعالیٰ خالق وحکیم کی طرف سے عطیہ ہے۔

واضح ہوا کہ انسان اپنے آپ کو ' ماں کے پیٹ میں ہونے اور پیدا ہونے کے وقت اور علم کے کمال تک مختلف حالات سے گزرنے کو دیکھے تو اسے قدرت کی عظیم نشانیاں نظر آئیں گی۔

انسانوں کے مختلف مزاج قدرت کی نشانی ہیں:

جب ہم دیکھتے ہیں کہ جنگلی اور پہاڑی حیوانات ایک دوسرے کے بہت مشابہ ہیں پھر ہم انسانوں کو دیکھتے ہیں جو صورت میں ایک دوسرے سے بہت زیادہ مختلف ہوتے ہیں پھر ان کی زبانیں مختلف ہیں اور ان کی طبیعتیں مختلف ہیں اور ان کے مزاج مختلف ہیں اگر ہر انسان ایک دوسرے کے کامل طور پر مشابہ ہوتا اور ہر انسان ایک دوسرے کے برابر ہوتا تو معیشت برباد ہو کر رہ جاتی۔

کیونکہ حاکم اور محکوم کے فرق سے ہی نظام دنیا قائم ہے کوئی کھیتی باڑی کرتا ہے کوئی کپڑے سلائی کرتا ہے کوئی جوتے بناتا ہے کوئی مکان تعمیر کرتا ہے اور کوئی لکڑی کا کام کرتا ہے تو کوئی لوہے کا کام کرتا ہے کوئی معالج ہے کوئی قاضی ہے یہ تمام صورتیں مختلف طبائع اور مختلف مزاجات کی وجہ سے ہی حاصل ہیں اسی سے معاشرہ قائم ہے اسی سے نظام معیشت قائم ہوتا ہے۔

" واستقصاء الکلام فی هذا النوع لا مطمع فیه لانه بحر لاساحل له "

علامہ رازی رحمہ اللہ نے " وبث فیها من کل دابة " کی تفسیر میں قدرت کی نشانیوں پر دلائل کو ذکر فرماتے ہوئے آخر میں ذکر کیا کہ اس نوع میں کلام کو انتہاء پر پہنچانا تو مقصد ہی نہیں کیونکہ یہ تو ایسا سمندر ہے جس کا کوئی کنارہ ہی نہیں۔ (ماخوذ از کبیر)

وَتَصْرِيْفِ الرِّيَاحِ: ''اور ہواؤں کے چلانے میں (نشانیاں ہیں عقل والی قوم کے لئے)

ہواؤں کا چلنا قدرت کی نشانی کیسے؟ ہوا اللہ تعالیٰ کی مخلوق ہے جو تصرف (ایک جگہ سے دوسرے جگہ پھیرنے) کو قبول کرتی ہے ہوا میں رقت اور لطافت پائی جاتی ہے پھر اللہ تعالیٰ اس کو اکثر اوقات ایسے طریقہ سے چلاتا ہے جس میں انسانوں اور حیوانوں اور نباتات کا عظیم فائدہ پایا جاتا ہے۔ پھر اس کی نشانی ہونے میں چند وجوہ ہیں ایک تو یہ کہ ہوا سانس کی اصل ہے اگر ایک گھڑی بھی سانس رک جائے تو انسان مرجائے اور یہ ہے کہ جس چیز کی حاجت زیادہ پائی جاتی ہے وہ چیز آسانی سے حاصل ہوتی ہے۔

چونکہ انسان ہوا کا محتاج ہے، ہوا'' **اعظم الحاجات** '' ہے اس لئے کہ ایک لحظہ بھی ہوا ختم ہوجائے تو انسان مرجائے اسی وجہ سے تمام چیزوں کی بنسبت ہوا آسانی سے حاصل ہوتی ہے۔ ہوا سے کم لیکن باقی چیزوں سے زیادہ پانی کی ضرورت ہوتی ہے اس لئے پانی کا پایا جانا بھی آسان ہے، لیکن ہوا سے کچھ مشکل کیونکہ پانی کنوئیں سے نکالنا پڑتا ہے نہر وغیرہ سے چلو بھرنے پڑتے ہیں۔ لیکن ہوا کے حاصل کرنے میں تکلفات کی ضرورت درپیش نہیں آتی۔ پھر پانی کے بعد طعام کی ضرورت درپیش آتی ہے لیکن پانی سے کم ضرورت درپیش آتی ہے یہی وجہ ہے کہ طعام کا حاصل کرنا بنسبت پانی کے حاصل کرنے کے مشکل ہے۔ طعام کے بعد انسان کو اپنی زندگی میں بیماری کی حالت میں معجونوں اور دواؤں کی ضرور درپیش آتی ہے لیکن ان کی ضرورت کم درپیش آتی ہے اسی لئے ان کو حاصل کرنا مشکل ہے۔ ادویات کے بعد زمرد اور یاقوت وغیرہ کی انسان کو بہت ہی کم ضرورت درپیش آتی ہے اسی لئے ان کو حاصل کرنا بھی بہت مشکل ہوتا ہے۔

جب یہ واضح ہوگیا کہ جس چیز کی زیادہ ضرورت ہوتی ہے وہ آسانی سے حاصل ہوتی ہے اور جس چیز کی ضرورت کم درپیش ہوتی ہے وہ مشکل سے حاصل ہوتی ہے۔

'' وما ذاک الا رحمة منه علی العباد '' یہ صرف اللہ تعالیٰ کی بندوں پر رحمت کی وجہ سے ہے

اسی سے نتیجہ یہ حاصل ہوا:

'' ولما کانت الحاجة الی رحمة اللہ تعالٰی اعظم الحاجات فنرجو ان یکون وجد

انها اسهل من وجدان کل شئی"

کہ جب اللہ تعالیٰ کی رحمت کی سب سے زیادہ ضرورت ہوتی ہے تو ہم امید رکھتے ہیں کہ سب چیزوں سے آسان ہمیں اللہ تعالیٰ کی رحمت ہی میسر ہوگی کیا خوب کسی شاعر نے کہا:

سبحان من خص القلیل بعزه — والناس مستغنون عن اجناسه

واذل انفاس الهواء وکل ذی — نفس لمحتاج الی انفاسه

پاک ہے وہ ذات جس نے قلیل کو عزیز بنا دیا — لوگ مستغنی ہوتے ہیں اس قسم کی چیزوں سے

اور ہوا میں سانس لینے کو آسان کر دیا — اور ہر ذی روح چیز سانس لینے کی محتاج ہے

ہواؤں کے چلنے میں قدرت کی اور نشانی یہ ہے کہ اگر ہوائیں نہ چلتیں تو کشتیاں بھی نہ چلتیں اس پر اللہ تعالیٰ کے بغیر اور کسی کو قدرت حاصل نہیں۔ اگر دنیا کے لوگ تمام اپنی طاقت صرف کر دیں تو کسی کو یہ طاقت حاصل نہیں کہ وہ شمالی ہوا کو جنوبی بنا دے اور نہ ہی کسی کو یہ طاقت حاصل ہے کہ رکی ہوا کو چلا دے۔

ہواؤں کی چار قسمیں ہیں:

(۱) شمال (بفتح الشین) جو شمالی نقطہ سے چلتی ہے۔ (۲) جنوب (بفتح الجیم) جو جنوبی نقطہ سے چلتی ہے۔ (۳) دبور (بفتح الدال) جو مغرب کی طرف سے چلتی ہے۔ (۴) صبا، یہ مشرقی جانب سے چلتی ہے اس کا دوسرا نام قبول (بفتح القاف) بھی ہے۔ (از کبیر)

ریح کی وجہ تسمیہ:

" قال ابن الانباری انما سمیت الریح ریحا لان الغالب علیها فی هبوبها المجی بالروح والراحة وانقطاع هبوبها یکسب الکرب والغم فهی ماخوذة من الروح"

ابن انباری فرماتے ہیں ریح کا نام ریح اس لئے رکھا گیا ہے کہ اس کے چلنے سے خوشی اور راحت محسوس ہوتی ہے۔ اور جب یہ رک جائے تو غم اور مصیبت حاصل ہوتی ہے یہ روح سے ماخوذ ہے۔ (از کبیر)

اعتراض: تم نے ریح کو خوشی اور راحت کا سبب کہا ہے حالانکہ حدیث شریف میں ریح کو مصیبت

کہا گیا ہے۔ حدیث شریف میں ہے:

" انه علیه الصلوة و السلام کان اذا اهبت الریح قال ، اللهم اجعلها ریاحا و لا تجعلها ریحا "

نبی کریم ﷺ جب ہوا چلتی تھی تو یہ دعا فرماتے تھے اے اللہ اسے "ریاح" بنادے اور اے اللہ اسے "ریح" نہ بنانا۔ اس سے تو پتہ چلا کہ "ریاح" باعث راحت ہے اور "ریح" باعث اضطراب ہے۔

جواب: ریح کا لغوی معنی راحت اور خوشی ہے بلکہ صرف ہوا کا چلنا بھی لغوی معنی ہے ہاں البتہ قرآن پاک میں زیادہ طور پر "ریح" کا اطلاق اس ہوا پر ہے جو آندھی کی شکل میں عذاب کا سبب ہو جیسا کہ ارشاد ہوا ﴿ وَفِیْ عَادٍ اِذْ اَرْسَلْنَا عَلَیْهِمُ الرِّیْحَ الْعَقِیْمَ ﴾ اور ارشاد ہوا ﴿ اِنَّا اَرْسَلْنَا عَلَیْهِمْ رِیْحًا صَرْصَرًا ﴾ ان مقامات میں "ریح" کا استعمال بغیر بارش کے آندھی کی شکل میں ہوا پر کیا گیا ہے اور ﴿ وَمِنْ آیَاتِهٖ اَنْ یُّرْسِلَ الرِّیَاحَ مُبَشِّرَاتٍ ﴾ اور اللہ کی نشانیوں میں سے یہ ہے کہ ہواؤں کو (رحمت کی) بشارت بنا کر بھیجا۔ اس مقام میں "ریاح" کو رحمت اور راحت کے لئے استعمال کیا گیا ہے۔

نتیجہ واضح ہوا کہ "ریح" کا لغوی معنی مطلقا ہوا ہے جو زیادہ طور پر راحت کا سبب ہوتی ہے لیکن ہوا کبھی آندھی کی شکل میں عذاب کا سبب بھی بنتی ہے اس لئے قرآن پاک میں استعمال کے لحاظ پر مفرد اور جمع میں فرق کر لیا گیا ہے مفرد کا زیادہ استعمال اس ہوا کے لئے کیا گیا ہے جس میں عذاب ہو اور جمع کا استعمال زیادہ طور پر راحت والی ہواؤں پر کیا گیا ہے۔ (ماخوذ از کبیر و مفردات راغب)

وَالسَّحَابِ الْمُسَخَّرِ بَیْنَ السَّمَاءِ وَالْاَرْضِ :

"اور بادلوں میں جو مسخر ہیں آسمانوں اور زمین میں (نشانیاں ہیں عقل والوں کے لئے)" "سحاب" ماخوذ ہے۔ " سحب " سے۔

جس کا ایک معنی کھینچنا، گھسیٹنا بھی آتا ہے جیسے کہا جاتا ہے " فلان یسحب ذیله " فلاں شخص اپنے دامن کو گھسیٹتا ہے۔ بادلوں کو سحاب کہا جاتا ہے کیونکہ یہ فضاء میں پھیلے ہوئے ہوتے ہیں بعض بعض کو اپنی طرف کھینچتے ہیں " ومعنی التسخیر التذلیل " کسی چیز کو مسخر کرنے کا مطلب ہے "حکم کا پابند کرنا" اور حکم کے سامنے اپنے آپ کو عاجزی سے مطیع کر لینا، مسخر ہو جانا ہے۔

بادلوں کے مسخر ہونے میں قدرت کی نشانیاں:

(۱) بیشک پانی کی طبع میں ثقل ہے ثقیل چیز اوپر سے نیچے اترنے کا تقاضا کرتی ہے پانی کا فضاء میں ٹھہرے رہنا اس کی طبیعت کے خلاف ہے۔ " فلا بد من قاسر قاهر يقهره على ذلك فلذلك سماه بالمسخر " اس لئے ضروری ہے کہ یہ تسلیم کیا جائے کہ فضاء میں پانی کا بلندی پر بغیر کسی رکاوٹ کے رکنا ایسی ذات کی وجہ سے ہے جسے ہر چیز پر قہر اور غلبہ حاصل ہے جس نے اسے روک کر رکھا ہوا ہے اسی کا نام تسخیر ہے کہ بادلوں میں پانی کو اپنے حکم کا پابند کیا ہے یہ اللہ تعالیٰ کی قدرت اور اس کی ذات کے وجود پر بہت عظیم نشانی ہے۔

(۲) بادل اگر ہمیشہ چھائے رہتے تو سورج کی روشنی زمین پر نہ پڑتی اور زیادہ بارشیں ہوتیں زمین لگاتار نمناک رہتی تو کھیتیاں، نباتات وغیرہ نہ پائے جاتے کیونکہ سورج کی روشنی کے بغیر بھی بہت کم ہی کوئی پودا پایا جاتا ہے اور زمین ہمیشہ ہی تر رہے پانی سے جل تھل رہے تو پوداجات نہیں پائے جاتے۔ اور اگر بارش ہمیشہ کے لئے منقطع رہے تو قحط ہی قحط نظر آئے ہر طرف درخت، نباتات، گھاس وغیرہ خشک نظر آئیں کہیں بھی کوئی چیز سرسبز و شاداب نظر نہ آئے۔

" فكان تقديره بالمقدار المعلوم هو المصلحة فهو كالمسخر لله سبحانه ياتي به وقت الحاجة ويرده عند زوال الحاجة "

ایک خاص مقدار کے مطابق بارشوں کو برسانے میں مصلحت پائی جاتی ہے جتنی ضرورت ہو اور جب ضرورت ہو اس وقت بارشوں کا برسانا اور جب ضرورت نہ ہو اس وقت بارشوں کو روک رکھنا رب تعالیٰ کی قدرت اور حکمت پر دلالت کرتا ہے اور اسی کا نام تسخیر ہے۔

(۳) بادل ایک معین جگہ میں نہیں رکتے بلکہ اللہ تعالیٰ جہاں چاہے ان کو ہواؤں کے ذریعہ چلاتا ہے یہ تسخیر بھی ہے اور رب تعالیٰ کے وجود اور اس کی صنعت کی نشانی بھی ہے۔

لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ : ''نشانیاں ہیں اس قوم کے لئے جو عقل رکھتے ہیں''

" آیات " لفظ جمع ہے احتمال ہے کل کی طرف راجع ہو کہ یہ تمام آٹھ چیزیں جن کا ذکر کیا گیا

ہے وہ عقل والوں کے لئے نشانیاں ہیں اور اس میں ایک اور یہ بھی احتمال پایا جاتا ہے کہ " آیـات " کا تعلق ہر ایک ایک سے ہو اور مطلب یہ ہو کہ ایک چیز میں کئی کئی نشانیاں پائی جاتی ہیں ۔ یہی معنی زیادہ درست ہے کیونکہ جن چیزوں کا ذکر کیا گیا ہے ان میں قدرت کی ان گنت ، ان گنت نشانیاں ہیں یہ وہ سمندر ہے جس کا کوئی کنارہ نہیں پھر بھی چند چند قسمیں ذکر کر دی گئیں ۔

عقل والوں کے لئے نشانیاں کہا کیونکہ جو لوگ ان چیزوں میں نظر کریں گے اور ان سے دلیل پکڑیں گے اللہ تعالیٰ کی وحدانیت پر اور اللہ تعالیٰ کے عدل پر اور حکمت پر تو وہ اس کا شکر ادا کریں گے اور اس کی عبادت کریں گے اور اس کی طاعت کریں گے ۔

فـائـده جـلـيلـه : نعمتوں کی دو قسمیں ہیں دنیاوی نعمتیں اور دینی نعمتیں ۔ یہ آٹھ امور جن کو اللہ تعالیٰ نے ذکر فرمایا ہے بظاہر یہ دنیاوی نعمتیں ہیں دنیا میں انسان ان سے نفع حاصل کرتا ہے :

" فاذا تفكر العاقل فيها واستدل بها على معرفة الصانع صارت نعما دينية "

جب عقل مند انسان ان نعمتوں میں تفکر کریں اور رب تعالیٰ کی صنعت کی معرفت میں ان سے دلائل حاصل کریں تو یہی دینی نعمتیں بن جاتی ہیں ۔ لیکن دنیاوی نعمتوں سے انسان اس وقت تک نفع حاصل نہیں کر سکتا جب تک اس کے حواس صحیح و سلامت نہ ہوں اور اس کا مزاج صحیح نہ ہو ۔

" فـكـذا الا نتفاع بها من حيث انها نعم دينية لا يكمل الا عند سلامة العقول وانفتاح بصر الباطن فلذلک قال لآيات لقوم يعقلون "

اسی طرح دینی نعمتوں سے نفع حاصل کرنا اس وقت تک ممکن نہیں جب تک عقل میں سلامتی نہ ہو اور باطنی نظر ان کی نہ کھلے اسی لئے رب تعالیٰ نے ان امور کو عقل والوں کے لئے نشانیاں کہا ہے ۔

(ماخوذ از کبیر)

اس آیۃ کریمہ کے متعلق آثار کا تذکرہ:

☆ " اخـرج ابـو عبيـد وابـن ابـى الدنيا فى كتاب المطر وابن المنذر وابن ابى حاتم وابـو الشيـخ فى العظمة عن ابن عمر وقال الرياح ثمان اربع منها رحمة واربع عذاب فاما الـرحمة فالنا شرات والمبشرات والمرسلات والذاريات واما العذاب فالعقيم والصرصر وهما فى البر والعاصف والقاصف فى البحر "

حضرت ابن عمرو (بن العاص) رضی اللہ عنہ نے فرمایا رحمت والی ہواؤں کے چار نام ذکر کئے گئے ہیں ناشرات اور مبشرات اور مرسلات اور ذاریات۔ اور عذاب والی ہواؤں کے بھی چار نام ہیں دو خشکی میں "عقیم اور صرصر" اور دو دریاؤں میں "عاصف اور قاصف" (در منشور)

☆ " واخرج عبد الله بن احمد بن حنبل فی زوائد الزهد وابو الشيخ فی العظمة عن كعب قال لو احتبست الريح عن الناس ثلاثة ايام لانتن ما بين السماء والارض "

حضرت کعب کہتے ہیں اگر ہوا لوگوں پر تین دن بند ہو جائے تو زمین و آسمان کے درمیان تمام چیزیں (گل سڑ کر) بدبودار ہو جائیں۔ (درمنشور)

☆ " واخرج ابو الشيخ عن انس قال قال رسول الله ﷺ الجنوب من ريح الجنة "

حضرت انس رضی اللہ عنہ نے فرمایا نبی کریم ﷺ نے فرمایا جنوبی ہوا جنتی ہوا ہے۔ (درمنشور)

☆ " واخرج الترمذی والنسائی وعبد الله بن احمد فی زوائد المسند عن ابی بن كعب قال قال رسول الله ﷺ لا تسبوا الريح فانها من روح الله وسلوا الله خيرها وخير ما فيها وخير ما ارسلت به وتعوذوا بالله من شرها وشرما فيها و شرما ارسلت به "

ابی بن کعب کہتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "ہوا کو گالیاں نہ دو کیونکہ یہ اللہ تعالیٰ کی رحمت ہے اللہ تعالیٰ سے اس کی خیر اور اس میں جو کچھ ہے اس کی خیر اور جو اس کی ذریعہ بھیجا گیا ہے اس کی خیر کا سوال کرو اور اس کے شر اور اس میں جو کچھ ہے اس کے شر اور اس کے ذریعے جو عطا کی جائے اس کے شر سے پناہ طلب کرے۔ (درمنشور)

☆ " واخرج ابو الشيخ عن الحسن انه كان اذا نظر الى السحاب قال فيه والله رزقكم ولكنكم تحرمونه بذنوبكم "

حضرت حسن بصری رحمہ اللہ جب بادل کو دیکھتے تو فرماتے کہ اللہ کی قسم اس میں تمہارا رزق ہے لیکن تم اپنے گناہوں کی وجہ سے اپنے آپ کو محروم کر دیتے ہو۔ (درمنثور)

اس سے واضح ہوا کہ بارشوں کا بروقت نہ ہونا یا حد سے زیادہ بارشیں برسیں تو ان کے اسباب میں سے لوگوں کے گناہ بھی سبب ہوتے ہیں جن کی وجہ سے کھیتیاں برباد ہوتی ہیں قحط پڑ جاتا ہے۔

﴿ وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّتَّخِذُ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَنْدَادًا يُّحِبُّوْنَهُمْ كَحُبِّ اللّٰهِ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ وَلَوْ يَرَى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا اِذْ يَرَوْنَ الْعَذَابَ اَنَّ الْقُوَّةَ لِلّٰهِ جَمِيْعًا وَّاَنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعَذَابِ ﴾

(۱) ''اور کچھ لوگ اللہ کے سوا اور معبود بنا لیتے ہیں کہ انہیں اللہ کی طرح محبوب رکھتے ہیں اور ایمان والوں کو اللہ کے برابر کسی کی محبت نہیں اور کیسی ہو اگر دیکھیں ظالم وہ وقت جب کہ عذاب ان کے سامنے آئے اس لئے کہ سارا زور خدا کو ہے اور اس لئے کہ اللہ کا عذاب بہت سخت ہے''۔

(۲) ''اور بعض لوگ بنا لیتے ہیں اللہ کے سوا اور (اس کی) مثل محبت کرتے ہیں ان سے جیسے محبت کرتے ہیں اللہ سے اور وہ لوگ جو ایمان والے ہیں وہ بہت شدید محبت کرتے ہیں اللہ سے اور اگر معلوم کر لیں وہ لوگ جو ظالم ہیں اس وقت کو جب دیکھیں گے عذاب بیشک قوت اللہ کے لئے ہی ہے سب اور بیشک اللہ سخت عذاب دینے والا ہے''۔

وضاحت: جب پہلی آیات میں اللہ تعالیٰ نے اپنی وحدانیت کا ذکر فرمایا اور اپنی قدرت کی نشانیوں کا ذکر فرمایا تو اس آیۂ کریمہ میں ان لوگوں کا ذکر فرمایا جو عقل رکھنے کے باوجود بے عقل بنے بیٹھے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ شریک ٹھہراتے ہیں جو بتوں کی پوجا کرتے ہیں ان کے لئے شدید عذاب ہوگا۔ (از قرطبی)

" بيان لحال المشركين بعد بيان الدلائل الدالة على توحيده "

پہلے وہ دلائل ذکر کیے جو اللہ تعالیٰ کی توحید پر دلالت کر رہے اب اس آیۂ کریمہ میں مشرکوں کا حال بیان کیا جا رہا ہے۔ (روح المعانی)

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّتَّخِذُ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَنْدَادًا :

اور بعض لوگ بنا لیتے ہیں اللہ کے سوا (اس کی) مثل۔

﴿ یَتَّخِذُ ﴾ اخذ سے لیا ہوا ہے باب افتعال ہے دومفعولوں کی طرف متعدی ہوتا ہے اور "جعل " کے قائم مقام ہوتا ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿ یَا اَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوا الْیَھُوْدَ وَالنَّصَارٰی اَوْلِیَاءَ ﴾

''اے ایمان والو نہ بناؤ یہود ونصاریٰ کو دوست'' (مفردات راغب)

یہاں بھی اسی معنی میں استعمال ہے اس کا ایک مفعول ﴿ مِنْ دُوْنِ اللّٰہِ ﴾ ہے اور دوسرا مفعول ﴿ اَنْدَادًا ﴾ ہے۔

دون: جو چیز کسی دوسری چیز سے گھٹیا ہوا سے " دون " کہا جاتا ہے اب حقیقی معنی تو اس طرح بنا اور بعض لوگ بنا لیتے ہیں اللہ سے گھٹیا کو (اس کی) مثل۔ البتہ مراد یہ ہے کہ اللہ کے بغیر اوروں کو اسی لئے زیادہ طور پر " دون " کا معنی (سوا، علاوہ) کیا جاتا ہے اور کبھی " دون " دنو " سے مقلوب ہو کر آتا ہے اس وقت اس کا معنی کیا جاتا ہے ''قریب ہونا'' (از مفردات راغب بزیادۃ)

ند: " ندید الشئی مشارکہ فی جوھرہ وذلک ضرب من المماثلۃ فان المثل یقال فی ای مشارکۃ کانت "

ایک چیز کا دوسری چیز کے اصل میں شریک ہونا " ند " کہلاتا ہے یہ مماثلت کی ایک قسم ہے اسی لئے ہر ''ند'' کو مماثل کہہ لیا جاتا ہے۔ لیکن یہ بات بھی ذہن میں رہے " فکل ند مثل ولیس کل مثل ندا " ہر ''ند'' کو تو مثل کہا جا سکتا ہے لیکن ہر مثل کو ند کہنا غلط ہے۔ (از مفردات راغب)

''اندادا'' جمع ہے ند کی۔

آیۃ کریمہ میں ''اندادا'' کا مطلب کیا ہے؟ اس کے اگرچہ مختلف مطالب بیان کئے گئے ہیں لیکن سب کا مطلب یہ ہے کہ رب تعالیٰ سے دور کر دینے والا اس کی مثل کسی کو نہ بنایا جائے۔

(۱) اس کا ایک مطلب یہ ہے " انھا ھی الاوثان التی اتخذوھا آلھۃ لتقربھم الی اللہ زلفی " کہ بعض لوگوں نے بتوں کو معبود بنا لیا کہ یہ ان کو اللہ کے قریب کر دیتے ہیں۔ بت پرست لوگ اپنے بتوں سے نفع اور نقصان حاصل کرنے کی امید کرتے تھے اور اپنے مسائل میں ان کی طرف ہی قصد کرتے تھے اور ان کے لئے ہی نذریں مانتے تھے اور ان کے لئے قربانیاں کرتے تھے " وھو قول

اکثر المفسرین "یہی قول اکثر مفسرین کرام کا ہے۔ (از کبیر)

اعتراض : اس قول کے مطابق بتوں کو ﴿ اندادا ﴾ کیسے کہا گیا ہے جب کہ " انداد " کا معنی "مثل" ہے بت تو اللہ تعالیٰ کی مثل ہو نہیں سکتے۔

پہلا جواب: " وعلی ھذا الاصنام انداد بعضھا لبعض ای امثال لیس لھا انداد اللہ "

اس قول کے مطابق بتوں کو " انداد " کہنے کا مطلب یہ ہے کہ وہ بت ایک دوسرے کی مثل ہیں وہ اللہ تعالیٰ کی مثل نہیں۔ اب مطلب یہ ہو گیا بعض لوگوں نے اللہ کے بغیر اور معبود بنا لئے ہیں جو سب عاجز ہونے میں معبود بننے کے قابل نہ ہونے میں ایک دوسرے کی مثل ہیں۔

دوسرا جواب: " انھا انداد اللہ تعالیٰ بحسب ظنونھم الفاسدۃ "

بیشک بت وغیرہ معبودان باطلہ تمام ہی اللہ تعالیٰ کی مثل نہیں ہو سکتے لیکن مشرکین اپنے فاسد گمانوں کے مطابق ان کو اللہ تعالیٰ کی مثل سمجھتے تھے اسی وجہ سے ان کی عبادت کرتے تھے۔ (از کبیر)

☆ " واخرج عبد بن حمید عن عکرمۃ " ومن الناس من یتخذ من دون اللہ اندادا ای شرکاء "

بعض لوگوں نے اللہ کے سوا اس کے شریک بنا لئے (اس سے مراد بھی بت وغیرہ ہی ہیں)

(درمنثور)

☆ " واخرج عبد بن حمید عن قتادۃ فی قولہ ﴿ یُحِبُّوْنَھُمْ کَحُبِّ اللہ ﴾ قال یحبونھم یحبون اوثانھم "

قتادہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے ارشاد گرامی ﴿ یُحِبُّوْنَھُمْ کَحُبِّ اللہ ﴾ کا مطلب یہ ہے کہ وہ مشرکین اپنے بتوں سے ایسی محبت کرتے ہیں جیسے اللہ سے محبت کی جاتی ہے۔ (درمنثور)

" الانداد ، الامثال والمراد بھا الاصنام کما ھو الشائع فی القرآن " انداد کا معنی امثال ہے مراد اس سے بت لئے گئے ہیں "انداد" کا اطلاق بتوں پر قرآن پاک میں واضح طور پر موجود ہے۔ (از روح المعانی)

خیال رہے ابھی تک جو وضاحت کی گئی اعلیٰ حضرت کا ترجمہ اسی کے مطابق ہے راقم نے انداد کا

لغوی معنیٰ ''مثل'' ذکر کیا ہے تا کہ دوسرے اقوال کو بھی شامل ہو سکے۔ یہ قول قتادہ اور مجاہد اور اکثر مفسرین کا ہے (روح المعانی) " وھو قول اکثر المفسرین " یہی قول اکثر مفسرین کا ہے۔ (کبیر)

(۲) " اندادا" کا اس آیۃ کریمہ میں دوسرا مطلب یہ ہے:

﴿ وثانیھا انھا السادۃ الذین کانوا یطیعونھم فیحلون لمکان طاعتھم ما حرم اللہ ویحرمون ما احل اللہ ﴾

کہ اس سے مراد ان کے بڑے سرکردہ راہنما، رئیس، لیڈر ہیں کیونکہ یہ لوگ ان کی فرمانبرداری کرتے تھے ان کو انہوں نے رب تعالیٰ کی مثل بنا رکھا تھا اس لئے کہ اپنے رئیسوں کی اطاعت میں جن چیزوں کو اللہ تعالیٰ نے حرام کیا وہ ان کو حلال کرتے تھے اور جن چیزوں کو اللہ تعالیٰ نے حلال کیا وہ ان کو حرام کرتے تھے۔ یعنی جب ان کے رئیس کسی چیز کو حلال کہہ دیتے تو ان کی تابعداری کرنے والے لوگ اسے حلال ہی کہتے خواہ اس چیز کو رب تعالیٰ (اور اس کے رسول ﷺ) نے حرام ہی کیوں نہ کیا ہو۔ اور ان کے رئیس اگر کسی چیز کو حرام کہہ دیتے تو وہ اسے حرام ہی کہتے تھے حالانکہ وہی چیز رب تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ نے حلال کی ہوتی۔ (کبیر)

" وقال ابن عباس والسدی المراد بالانداد الرؤسا المتبعون یطیعونھم فی معاصی اللہ "

حضرت ابن عباس اور سدی رضی اللہ عنہم کا قول یہ ہے کہ ''انداد'' سے مراد ان کے رئیس تھے جن کی تابعداری کی جاتی تھی اور یہ لوگ ان کی گناہوں میں اطاعت کرتے تھے۔ (قرطبی)

نتیجہ واضح ہوا: ﴿ وَمِنَ النَّاسِ ﴾ سے مراد کفار اور مشرکین لوگ ہیں خواہ " اندادا " سے مراد بت لئے جائیں یا ان کے رئیس لئے جائیں کیونکہ رب تعالیٰ کی طرف سے حرام کی ہوئی چیزوں کو حلال سمجھنا اور رب تعالیٰ نے جن چیزوں کو حلال کیا ان کو رئیسوں کی تابعداری میں حرام کرنا کفر ہی تو ہے۔

مقام افسوس: کافروں کے حق میں نازل ہونے والی آیات کو مسلمانوں پر اور بتوں کے حق میں نازل ہونے والی آیات یا رب تعالیٰ کے مقابل حلال اور حرام کرنے والے لوگوں کے متعلق نازل ہونے والی آیات کو انبیاء کرام اور اولیاء کرام پر چسپاں کرنا ظلم عظیم نہیں تو اور کیا ہے۔

مودودی صاحب کی تفسیر کے یہ الفاظ (یعنی خدائی کی جو صفات اللہ کے لئے خاص ہیں ان میں سے بعض کو دوسروں کی طرف منسوب کرتے ہیں اور خدا ہونے کی حیثیت سے بندوں پر اللہ تعالیٰ کے جو حقوق ہیں وہ سب یا ان میں سے بعض حقوق یہ لوگ ان دوسرے بناوٹی معبودوں کو ادا کرتے ہیں مثلاً سلسلہ اسباب پر حکمرانی، حاجت روائی، مشکل کشائی، فریادرسی، دعائیں سننا اور غیب وشہادت ہر چیز سے واقف ہونا یہ سب اللہ کی مخصوص صفات ہیں)۔

اسی مضمون کو پیش کررہے ہیں جو اوپر ذکر کیا گیا ہے انبیاء کرام اور اولیاء کرام کو کس طرح مسلمان کس طرح حاجت روا، مشکل کشا، اور فریادرس سمجھتے ہیں اس کا ذکر راقم نے ﴿ اِیَّاکَ نَعۡبُدُ وَاِیَّاکَ نَسۡتَعِیۡنُ ﴾ کی بحث میں کردیا ہے۔ اور انبیاء کرام کے علم غیب کی بحث انشاء اللہ اپنے محل پر آجائے گی البتہ ضمنی طور پر کئی مقام پر علامہ رازی رحمہ اللہ کے اقوال سے (نبی کریم ﷺ کا علم غیب آپ کا معجزہ ہے) بیان ہو چکا ہے۔

نبی کریم ﷺ دعا فرمائیں تو صاف آسمان پر بادل آجائیں اسی وقت برسنا شروع کردیں اور جب تک آپ دعا نہ فرمائیں بارش رُکے نہیں یہ اسباب پر حکمرانی نہیں تو اور کیا ہے؟

ہاں البتہ یہ حکمرانی رب تعالیٰ نے آپ کو عطاً کی ہے اور رب تعالیٰ کی حکمرانی ذاتی ہے کسی کی عطاً سے حاصل نہیں رب تعالیٰ کی عطاء پر بھی کسی کا دل جلے تو کیا کہا جاسکتا ہے؟ اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ کی زبان میں یہی کہہ دینا کافی ہے

جلتے ہیں جل جائیں گے سب اعداء تیرے   نہ مٹا ہے نہ مٹے گا کبھی چرچا تیرا

اعتراض: صوفیاء کرام خود کہتے ہیں "غیر اللہ" (اللہ کے سوا اوروں) کی طرف دھیان نہ دو صرف رب تعالیٰ کی طرف توجہ کرو تم کہتے ہو "انبیاء کرام اور اولیاء کرام" بھی رب تعالیٰ کی عطاء سے حاجت روا ہیں کیا یہ تعلیمات اولیاء کرام کے مخالف تمہارا قول نہیں؟ علامہ رازی رحمہ اللہ صوفیاء کرام کا قول نقل فرماتے ہوئے رقم طراز ہیں:

" القول الثالث فی تفسیر الانداد قول الصوفیة والعارفین وھو ان کل شئی شغلت قلبک به سوی الله تعالیٰ فقد جعلته فی قلبک ندا لله تعالیٰ" (کبیر)

" اَنۡـدَادًا " کی تفسیر میں تیسرا قول صوفیاء کرام اور عارفین کا ہے کہ ہر وہ چیز جو تمہارے دل کو اللہ تعالیٰ کے سوا اوروں کی طرف لگا دے وہ اللہ تعالیٰ کی " ند " ہے۔

اس سے پتہ چلا کہ اللہ کے سواء اوروں کی طرف توجہ کرنا رب تعالیٰ کے " انـداد " ماننے کے مترادف ہے۔

جواب : اولیاء کرام کے اقوال کو سمجھنا محبان اولیاء کرام کا ہی کام ہے بھلا عام انسان کیا سمجھے؟ صوفیاء کرام نے یہ فرمایا ہر وہ چیز جو تمہیں رب تعالیٰ سے ہٹا کر اوروں کی طرف لے جائے وہ رب تعالیٰ کی "ند" ہے لیکن انبیاء کرام اور اولیاء کرام کی طرف توجہ سے تو رب ملتا ہے یہ رب تعالیٰ سے ہٹانے والے نہیں بلکہ ملانے والے ہیں یہ اللہ والے ہیں جو اللہ سے ملا دیتے ہیں۔

آیئے ولی کامل کی تفسیر کو دیکھئے " ولی ولی مے شناسد " (ولی کو ولی پہچانتا ہے) کے مطابق اقوال اولیاء کرام کو سمجھتے ہوئے کیا خوب کہا میری مراد اس سے پیر محمد کرم شاہ الازہری بھیروی رحمہ اللہ ہیں آپ فرماتے ہیں صوفیاء کرام نے " انداد " کی تفسیر یہ فرمائی " کل مـا کـان مشغلا عن اللہ مـانعا من امتثال امره " ہر وہ چیز جو انسان کو اللہ تعالیٰ کی یاد سے غافل کر دے اور اس کے احکام کی تعمیل سے روک دے وہ " انـداد " سے ہے خواہ وہ بت ہوں گمراہ رئیس ہوں مال و دولت ہو فرزند و زن ہوں یا علم و فن ہر چیز جو اللہ تعالیٰ سے دور کرنے والی ہو وہ ''ند ہے اور پاش پاش کر دینے کے لائق۔

حضور نبی کریم ﷺ سے ہمیں جو عشق و عقیدت اور اولیاء کرام سے ہمیں جو محبت ہے وہ صرف اس لئے ہی تو ہے کہ وہ محبوبان خدا ہیں اور محبوب کا محبوب بھی محبوب ہی ہوا کرتا ہے۔ جو اپنے دل میں اللہ تعالیٰ کے محبوب رسول اللہ ﷺ کے لئے محبت محسوس نہیں کرتا وہ یہ سمجھ لے کہ اسے اللہ تعالیٰ سے بھی محبت نہیں۔ (ضیاء القرآن)

راقم بھی پیر صاحب اور دوسرے پیران عظام سے اسی لئے محبت کرتا ہے کہ یہ محبوبان محبوب خدا ہیں۔ حضرت پیر صاحب کو میں روح جان، دل کی دھڑکن سے تعبیر کرتا ہوں یہ میری ان سے والہانہ عقیدت و محبت ہے۔ (راقم)

یُحِبُّوۡنَهُمۡ كَحُبِّ اللّٰهِ : محبت کرتے ہیں ان سے جیسے محبت کرتے ہیں اللہ سے

محبت کیا ہے؟ محبة ماخوذ ہے حب (بفتح الحاء) سے جس کا معنی ہے " دانه " جیسے کہا جاتا

ہے حبة الحنطة (گندم کا دانہ) حبة الشعیر (جو کا دانہ)۔ دل کے دانہ (نقطہ) کو عام دانہ سے تشبیہ دی گئی پھر مجازی طور پر " حب القلب " کا معنیٰ " میلان قلب " لے لیا گیا۔ کہا جاتا ہے " حببت فھو محبوب الی اصاب حبہ حبة قلبی ورسخ فیھا " میں نے اس سے محبت کی وہ میرا محبوب ہے اس کی محبت میرے دل کے نکتہ تک پہنچ گئی یعنی دل کی گہرائی تک پہنچ گئی اور راسخ ہو گئی۔ اور کہا جاتا ہے "احببتہ فانا محب ای حببتہ بحبة قلبی " میں نے اس سے محبت کی کیونکہ میں اس کا محبّ ہوں یعنی میں نے دل کی گہرائی سے اس کے ساتھ محبت کی۔

بندے کی محبت رب تعالیٰ سے:

" ومحبة الله للعبد ارادة اکرامه واستعماله فی الطاعة وصونه عن المعاصی "

یعنی اللہ تعالیٰ کے ساتھ بندے کی محبت کرنے کا مقصد یہ ہے، کہ بندہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت کا ارادہ رکھتا ہے، اور اس کی ذات کو راضی کرنے کی مکمل کوشش کرتا ہے، اور یہی اس کا مقصد عظیم ہوتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کی محبت بندے سے:

" ومحبة الله للعبد ارادة اکرامه واستعماله فی الطاعة وصونه عن المعاصی "

یعنی بندے کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی محبت کا مطلب یہ ہے کہ وہ اپنے بندے کو اپنا مکرم بنانے کا ارادہ رکھتا ہے اور بندے کو طاعت کی توفیق عطا فرماتا ہے اس لئے بندہ اس کا مطیع بن جاتا ہے اور بندے کو رب تعالیٰ گناہوں سے بچالیتا ہے۔ (ماخوذ از بیضاوی وشیخ زادہ)

﴿یُحِبُّوْنَھُمْ کَحُبِّ اللہ﴾ کا مطلب کیا ہے؟ زیادہ واضح اور صحیح قول تو یہ ہے:

" ﴿یُحِبُّوْنَھُمْ﴾ یعظمونهم ویطیعونهم ﴿کَحُبِّ اللہ﴾ کتعظیمه "

وہ انسے جن کو اللہ کے سوا معبود بنائے ہوئے ہیں محبت کرتے ہیں یعنی ان کی تعظیم کرتے ہیں اور ان کی اطاعت کرتے ہیں جیسا کہ اللہ سے محبت کرتے ہیں اور اس کی تعظیم کرتے ہیں۔ (بیضاوی)

﴿یحبونهم کحب الله﴾ ای یسوون بین الاصنام وبین الله تعالیٰ فی المحبة قال ابو اسحق وهذا القول الصحیح "

ابو اسحٰق نے کہا ہے کہ صحیح قول یہ ہے کہ اس کا مطلب ہے کہ وہ بتوں اور اللہ تعالیٰ سے محبت میں برابری کرتے ہیں۔ (قرطبی)

﴿ کَحُبِّ اللہ ﴾ فیہ ثلاثۃ اقوال قیل فیہ کحبھم للہ وقیل فیہ کالحب اللازم علیھم للہ وقیل فیہ کھب المؤمنین للہ "

اس میں تین قول ہیں ایک یہ کہ وہ اپنے بنائے ہوئے معبودوں سے ایسی محبت کرتے جیسے اللہ تعالیٰ سے محبت کرتے یہ ان حضرات کا قول ہے جو یہ کہتے ہیں کہ وہ رب تعالیٰ کو پہچانتے تھے لیکن پھر بھی انہوں نے رب تعالیٰ کے شریک بنائے ہوئے تھے۔ اس کے بعد دو قول اور ذکر کرنے کے بعد علامہ رازی رحمہ اللہ نے اسی قول کے متعلق تحریر فرمایا" والقول الاول اقرب " پہلا قول زیادہ قریب ہے۔

دوسرا مطلب یہ ہے کہ وہ اپنے بتوں اور رئیسوں سے اس طرح محبت کرتے جس طرح ان پر اللہ تعالیٰ سے محبت کرنا لازم تھا اگرچہ وہ اللہ تعالیٰ سے محبت کرتے نہیں تھے۔

تیسرا مطلب یہ ہے کہ وہ اپنے بتوں اور رئیسوں سے اس طرح محبت کرتے تھے جس طرح مومن اللہ تعالیٰ سے محبت کرتے ہیں۔ یہ دونوں قول ان حضرات کے ہیں جو یہ کہتے ہیں کہ وہ لوگ اللہ تعالیٰ کو نہیں پہچانتے تھے۔ (از کبیر)

مبرد نے کہا ہے کہ اس کا مطلب یہ ہے " **یحبون اصنامھم علی الباطل کحب المؤمنین للہ علی الحق** " وہ اپنے بتوں سے باطل طریقہ سے محبت کرتے تھے جیسے مومنین اللہ تعالیٰ سے محبت کرتے ہیں حق طور پر زجاج نے کہا ہے کہ اس کا مطلب یہ ہے:

" ای انھم مع عجز الاصنام یحبونھم کحب المؤمنین للہ مع قدرتہ "

کہ وہ بتوں کے عاجز ہونے کے باوجود ان سے ایسی محبت کرتے جیسی مومنین اللہ تعالیٰ سے محبت کرتے ہیں جو قادر ذات ہے۔ (قرطبی)

تاہم راقم کے نزدیک بھی پہلا قول ہی زیادہ معتبر ہے کہ وہ اپنے بنائے ہوئے معبودوں سے محبت کرتے جیسے اللہ سے محبت کرتے کیونکہ وہ اللہ تعالیٰ کی معرفت رکھتے تھے اس پر اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی بہت واضح ہے:

﴿ وَالَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِهٖۤ اَوْلِيَاۤءَ مَا نَعْبُدُهُمْ اِلَّا لِيُقَرِّبُوْنَاۤ اِلَى اللّٰهِ زُلْفٰى ﴾ (زمر ۳)

''اور وہ جنہوں نے اس کے سوا اور والی بنالیے (کہتے ہیں) ہم تو انہیں صرف اس لئے پوجتے ہیں کہ یہ ہمیں اللہ کے قریب کردیں''۔

بندہ رب تعالیٰ سے محبت کرتا ہے اس میں اختلاف نہیں:

امت کا اس میں اختلاف نہیں کہ یہ کہنا درست ہے کہ بندہ رب تعالیٰ سے محبت کرتا ہے قرآن پاک سے یہ مسئلہ واضح طور پر ثابت ہے یہ آیۃ جس کی وضاحت جاری ہے اس میں سے۔ **وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ** : ایمان والے اللہ سے زیادہ محبت کرتے ہیں۔ اور دوسری آیۃ کریمہ میں ﴿ یحبوھم ویحبونه ﴾ رب ان سے محبت کرتا ہے اور وہ رب سے محبت کرتے ہیں۔ (از کبیر)

حضرت ابراہیم علیہ السلام رب تعالیٰ کے محبّ ومحبوب:

ابراہیم علیہ السلام کے پاس ملک الموت (عزرائیل) آئے کہ آپ کی روح کو قبض کرلیں تو آپ نے اس فرشتے کو کہا'' ھل رأیت خلیلا یمیت خلیله '' کیا تم نے دیکھا ہے کہ کوئی دوست اپنے ہی دوست کو مار دے۔ یعنی میں جب رب تعالیٰ کا خلیل ہوں تو رب تعالیٰ کا تمہیں میرے پاس روح قبض کرنے کے لئے بھیجنا عجیب سا معلوم ہوتا ہے اللہ تعالیٰ نے آپ کی طرف وحی کی ارشاد فرمایا ﴿ھل رأیت خلیلا یکرہ لقاء خلیله ﴾ کیا تم نے دیکھا ہے کہ دوست اپنے دوست سے ملنے کو ناپسند کرے۔ تو آپ نے یہ سنتے ہی ملک الموت کو کہا'' **یا ملک الموت الآن فاقبض** '' اے ملک الموت اب روح قبض کرلے۔ (از کبیر)

نبی کریم ﷺ کی محبت جنت کا ذریعہ:

'' **وجاء اعرابی الی النبی ﷺ فقال یا رسول الله متی الساعة ؟ فقال ما اعددت لھا ؟ فقال ما اعددت کثیر صلوۃ ولاصیام الا انی احب الله ورسوله فقال علیه الصلوۃ والسلام المرء مع من احب فقال انس فما رأیت المسلمین فرحوا بشئی بعد الاسلام فرحھم بذلک** ''

ایک اعرابی نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے عرض کرنے لگے'' یا رسول اللہ قیامت

کب آئے گی'' آپ نے فرمایا تم نے قیامت کے لئے تیاری کیا کی ؟ تو وہ کہنے لگے میں نے بہت (نفلی) نمازیں تو نہیں ادا کیں اور بہت (نفلی) روزے تو نہیں رکھے البتہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ سے محبت کرتا ہوں آپ نے فرمایا انسان اسی کے ساتھ ہوگا جس سے وہ محبت کرتا ہے حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں میں نے مسلمانوں کو اسلام لانے کے بعد کسی چیز پر اتنا خوش ہوتے ہوئے نہیں دیکھا جتنا آپ کے اس ارشاد گرامی پر خوش ہوئے۔

واضح ہوا کہ محبت حبیب خدا قرب الٰہی کا ذریعہ ہے اور جنت میں جانے کا ذریعہ ہے اللہ تعالیٰ محبت مصطفیٰ کریم ﷺ پر ہی قائم رکھے یہی مسلمان کا سرمایہ ہے۔ (از کبیر)

عیسیٰ علیہ السلام کا ارشاد: حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا تین آدمیوں پر گزر ہوا جن کے بدن کمزور تھے اور ان کے رنگ بدلے ہوئے تھے آپ نے ان سے پوچھا تمہارا حال جو میں دیکھ رہا ہوں اس کی وجہ کیا ہے؟'' **فقالوا الخوف من النار** '' تو انہوں نے کہا آگ کے خوف سے ہمارا یہ حال ہے۔ ''**فقال حق علی اللہ ان یؤمن الخائف** '' تو آپ نے فرمایا اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل وکرم سے اپنے ذمہ یہ لگا رکھا ہے کہ وہ خوف کرنے والوں کو امن میں رکھے۔

پھر آپ کا گزر تین اور آدمیوں پر ہوا وہ ان پہلے آدمیوں سے زیادہ کمزور تھے اور ان کے رنگ بدلے ہوئے تھے آپ نے ان سے پوچھا تمہیں اس حال پر کس چیز نے پہنچایا ہے؟'' **قالوا الشوق الی الجنة** '' انہوں نے کہا جنت کے شوق نے ہمیں اس حال پر پہنچا دیا ہے '' **فقال حق علی اللہ ان یعطیکم ما ترجون** '' تو آپ نے فرمایا اللہ تعالیٰ نے اپنے ذمہ کرم پر لیا ہوا ہے کہ وہ تمہیں وہ چیز عطا کرے جس کی تم امید کرتے ہو۔

پھر آپ کا تین اور آدمیوں سے گزر ہوا جو پہلے تمام کی بنسبت زیادہ کمزور تھے اور ان کے رنگ بدلے ہوئے تھے اور گویا کہ ان کے چہروں پر نور نظر آ رہا تھا آپ نے ان سے پوچھا تم اس حال پر کیسے پہنچ گئے ہو؟ ''**قالوا بحب اللہ** '' انہوں نے کہا اللہ تعالیٰ سے محبت کرنے کی وجہ سے ہم اس حال پر پہنچ گئے ہیں۔

'' **فقال علیہ الصلوۃ والسلام انتم المقربون الی اللہ یوم القیامة** ''

تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا قیامت کے دن تم اللہ تعالیٰ کے مقرب ہوگے۔

فائدہ: قیامت کے دن امتوں کو ان کے انبیاء کرام کے ناموں سے بلایا جائے گا " یا امة موسی ، یا امة عیسی ، یا امة محمد " اے موسیٰ علیہ السلام کی امت، اے عیسیٰ علیہ السلام کی امت، اے محمد مصطفیٰ ﷺ کی امت۔ " غیر المحبین منهم فانهم ینادون یا اولیاء الله " جو ان میں سے محبت کرنے والے نہیں ہوں گے بیشک ان کو ندا دی جائے گی اے اللہ کے دوستو۔ (یعنی تمہارے مومن ہونے کی وجہ سے رب تعالیٰ نے تمہارے ساتھ محبت کو نہیں چھوڑا وہ تمہیں اپنا دوست سمجھتا ہے)

" وفی بعض الکتب ،عبدی انا وحقک لک محب فبحقی علیک کن لی محبا "

اور بعض کتب میں ہے کہ اللہ تعالیٰ فرمائے گا اے میرے بندے میں نے اپنے ذمہ کرم پر یہ لگایا ہے کہ میں تیرے ساتھ محبت کروں اور تیرا حق یہ ہے کہ تو میرے ساتھ محبت کر۔ (از کبیر)

رب تعالیٰ سے عوام کی محبت:

" فاذا قلنا نحب الله فمعناه نحب طاعة الله وخدمته او نحب ثوابه واحسانه "

جب ہم کہتے ہیں ہم اللہ تعالیٰ سے محبت کرتے ہیں تو اس کا یہ مطلب ہوتا ہے کہ ہم اس کی طاعت اور خدمت سے محبت کرتے ہیں یا اس کا مطلب یہ ہوگا ہم اس کی طرف سے حاصل ہونے والے ثواب اور احسان سے محبت کرتے ہیں۔

عارفین کی رب تعالیٰ سے محبت:

" واما العارفون فقد قالوا ، العبد قد یحب الله تعالیٰ لذاته واما حب خدمته او حب ثوابه فدرجة نازلة "

عارفین حضرات یہ فرماتے ہیں کہ کبھی بندہ اللہ تعالیٰ کی ذات پاک سے بلا کیف محبت کرتا ہے رب تعالیٰ کی خدمت یعنی طاعت سے محبت کرنا اور اس کی طرف سے حاصل ہونے والے ثواب سے محبت کرنا یہ گھٹیا درجہ ہے یعنی درجہ عوام کا ہے اور ذات کبریاء سے محبت کرنا عارفین کا درجہ ہے۔

عارفین کی دلیل:

عارفین حضرات یہ کہتے ہیں کہ ہم دیکھتے کہ لذت ذاتی طور پر محبوب ہے اور کمال بھی ذاتی طور پر محبوب ہے۔

لذت سے ذاتی طور پر محبت کیسے؟

وہ اس طرح ہے کہ جب ہم سے پوچھا جائے تو تم کسب کیوں کرتے ہو؟ تو ہم کہتے ہیں ہم مال حاصل کرنے کے لئے کسب کرتے ہیں اگر پوچھا جائے تم مال کیوں حاصل کرتے ہو؟ تو ہم جواب دیتے ہیں کہ ہم مال اس لئے حاصل کرتے ہیں تا کہ کھانے اور پینے کی چیزیں حاصل کرسکیں پھر اگر ہم سے پوچھا جائے کہ تم کھانے اور پینے کی چیزیں کیوں حاصل کرتے ہو؟ تو ہم کہتے ہیں اس لئے کہ لذت حاصل کریں اور درد کو دور کریں۔

" فاذا قیل لنا ولم تطلبون اللذة وتکرھون الالم ؟ قلنا ھذا غیر معلل "

جب ہم سے یہ کہا جائے کہ تم لذت حاصل کیوں کرتے ہو اور درد کو ناپسند کیوں کرتے ہو؟ تو ہم جواب دیتے ہیں اس کی کوئی اور وجہ نہیں۔ کیونکہ اگر ہر چیز کی علت ہی پیش کی جائے تو دور یا تسلسل لازم آئے گا جو محال ہے اس لئے ضروری ہے کہ مطلوب تک اسباب کا سلسلہ ختم ہو جائے مطلوب کے حصول کی اور کوئی وجہ نہ پائی جائے۔

" واذا ثبت ذلک فنحن نعلم ان اللذة مطلوبة الحصول لذاتھا والالم مطلوب الدفع لذاته "

جب یہ بات ثابت ہوگئی تو اسی سے ہمیں معلوم ہوگیا کہ لذت کا حصول ذاتی طور پر مطلوب ہے اور اسی طرح درد و تکلیف کو مندفع کرنا بھی ذاتی طور پر مطلوب ہے۔

کمال محبوب لذاتہ کیسے؟

" واما الکمال فلأنا نحب الانبیاء والاولیاء لمجرد کونھم موصوفین بصفات الکمال "

جب ہم انبیاء کرام اور اولیاء کرام سے محبت کرتے ہیں تو اس کی وجہ صرف یہ ہوتی ہے کہ وہ کمال سے متصف ہیں یعنی ان کے کمال کو دیکھ کر ان سے محبت کرنا ذاتی طور پر کمال سے ہی محبت ہے۔ جب ہم بعض بہادروں کے واقعات سنتے ہیں اور ان کی شجاعت کے واقعات سنتے ہیں جیسے رستم اور اسفندیار کے تو " مالت قلوبنا الیھم " ہمارے دل ان کی طرف میلان کرتے ہیں یعنی ہمیں ان سے محبت ہو جاتی ہے۔

" حتی انہ قد یبلغ ذلک المیل الی انفاق المال العظیم فی تقریر تعظیمہ وقد ینتھی ذلک الی المخاطرۃ بالروح "

یہاں تک کہ وہ محبت اس درجہ تک پہنچ جاتی ہے کہ ہم اس محبوب کی عظمت کو ثابت کرنے لئے عظیم مال خرچ کرتے ہیں اور کبھی اس محبت کی انتہاء روح کے سرور اور وجدانی کیفیت کی حرکت تک پہنچا دیتی ہے۔

مقام توجہ: " وکون اللذۃ محبوبۃ لذاتھا لا ینافی کون الکمال محبوبا لذاتہ "

لذت کا ذاتی طور پر محبوب ہونا کمال کے ذاتی طور پر محبوب ہونے کے منافی نہیں یعنی ایک چیز کی لذت بھی مطلوب ہو اور وہ چیز بھی مطلوب ہو ایسا ممکن ہے اس میں کوئی منافات نہیں۔

مذکورہ بالا بحث سے نتیجہ حاصل ہوا: جن لوگوں نے اللہ تعالیٰ سے محبت کو اس کی طاعت کی محبت اور اس سے حاصل ہونے والے ثواب سے تعبیر کیا " فھؤلاء ھم الذین عرفوا ان اللذۃ محبوبۃ لذاتھا ولم یعرفوا ان الکمال محبوب لذاتہ " یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے صرف لذت کو ہی ذاتی طور پر محبوب سمجھا وہ کمال کو ذاتی طور پر محبوب نہ سمجھ سکے۔ یہ لوگ درحقیقت عارفین کے درجہ میں نہیں پہنچے اسی وجہ سے ان کی نظر کوتاہ ہے۔

" اما العارفون الذین قالوا انہ تعالیٰ محبوب فی ذاتہ ولذاتہ فھم الذین انکشف لھم ان الکمال محبوب لذاتہ "

عارفین حضرات نے کہا کہ بیشک اللہ تعالیٰ ہی کی ذات محبوب ہے اور اس کی محبت میں کوئی واسطہ نہیں بلکہ اس کی محبت ذاتی ہے ان حضرات پر یہ حقیقت منکشف ہوئی کہ کمال محبوب لذاتہ ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اکمل الکاملین ہے اس لئے کہ وہ واجب الوجود ہے اور اپنے سوا ہر کسی سے بے پرواہ ہے اس کو کسی کی محتاجی نہیں۔

" وکمال کل شئی فھو مستفاد منہ وانہ سبحانہ وتعالیٰ اکمل الکاملین فی العلم والقدرۃ "

بلکہ ہر چیز کو کمال اللہ تعالیٰ سے ہی حاصل ہے وہی ذات علم وقدرت میں اکمل الکاملین ہے جب

ہم کسی عالم انسان سے محبت کرتے ہیں تو اس کے علم کے کمال کی وجہ سے اس سے محبت کرتے ہیں۔ اور جب ہم کسی شجاع انسان سے محبت کرتے ہیں تو اس کی شجاعت کے کمال کی وجہ سے اس سے محبت کرتے ہیں اور جب ہم زاہد سے محبت کرتے ہیں تو اس کے غیر مناسب افعال سے بری ہونے کی وجہ سے اس سے محبت کرتے ہیں۔

" فکیف لا نحب اللہ وجمیع العلوم بالنسبة الی علمه کالعدم وجمیع القدرة بالنسبة الی قدرته کالعدم وجمیع ما للخلق من البراءة عن النقائص بالنسبة الی ما للحق من ذلک کالعدم "

تو ہم اللہ تعالیٰ سے کیوں محبت نہ کریں جب کہ اسکے علم کے سامنے تمام مخلوق کے علوم نہ ہونے کے برابر ہیں اور اس کی قدرت کے سامنے تمام مخلوق کی قدرت نہ ہونے کے برابر ہے اور اس کے نقائص سے پاک ہونے کے سامنے تمام مخلوق کا نقائص سے پاک ہونا نہ ہونے کے برابر ہے "فلزم القطع بان المحبوب الحق هو اللہ تعالیٰ " یقینی طور پر واضح ہوا کہ حقیقی محبوب حق تعالیٰ کی ذات پاک ہی ہے اسی کی ذات محبوب ہے اس کی ذات کے محبوب ہونے میں کوئی واسطہ نہیں پایا گیا۔

اللہ تعالیٰ کی معرفت کا ذریعہ: جب یہ نکتہ بیان ہو گیا کہ اللہ تعالیٰ سے محبت ہی کمال لذاتہ ہے تو اسی سے یہ واضح ہو جانا چاہے کہ عام بندے کی رسائی (سوائے انبیاء کرام کے) اللہ تعالیٰ کی ذات اور کمال تک ممکن نہیں جب تک وہ کائنات کو نہ دیکھے کیونکہ تمام کائنات اللہ تعالیٰ کی مخلوق اور مملوک ہے انسان جب اللہ تعالیٰ کی مخلوق میں نظر و فکر کرے گا تو وہ اللہ تعالیٰ کی حکمت اور قدرت کے دقائق پر مطلع ہو گا۔

" ولما کان لانهایة لمراتب وقوف العبد علی دقائق حکمة اللہ تعالیٰ فلا جرم لانهایة لمراتب محبة العباد لجلال حضرة اللہ تعالیٰ "

جب اللہ تعالیٰ کی حکمت کے دقائق پر بندے کی معرفت کے مراتب کی کوئی انتہا نہیں تو یقیناً اس کے اوپر مرتب ہونے والی محبت جو بندوں کو اللہ تعالیٰ سے ہے اس کے مراتب کی بھی کوئی حد نہیں۔

محبت کے مراتب کے اسباب: جب یہ واضح ہو گیا کہ اللہ تعالیٰ کی مخلوق میں اس کی قدرت اور حکمت کے دقائق میں نظر و فکر کرنے سے رب تعالیٰ کی محبت حاصل ہوتی ہے تو اسی سے یہ واضح ہو گیا کہ

بندہ جتنا زیادہ اللہ تعالیٰ کی حکمت کے دقائق کا مطالعہ کرے گا اسی قدر اسے اللہ تعالیٰ کی محبت میں ترقی حاصل ہوگی جتنا یہ مطالعہ اور غور وفکر بڑھتا چلا جائے گا اتنا ہی وہ بندے کے دل پر محبت باری تعالیٰ کے غلبہ کا ذریعہ ہوگا۔

رب تعالیٰ کی محبت بارش کی مثال ہے جس طرح کثیر مقدار موسلا دھار بارش جب برستی ہے تو باوجود اس کے کہ بارش میں لطافت ہے لیکن وہ پتھر میں سوراخ کر دیتی ہے "فاذا غاصت محبة الله فی القلب تکیف القلب بکیفیتها و اشتد الفه بها" جب اللہ تعالیٰ کی محبت دل میں اثر انداز ہو جاتی ہے تو دل کی کیفیت بدل جاتی ہے اس میں وجدانی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے اور محبت میں شدت آ جاتی ہے۔

محبت کا اعلیٰ معیار:

" وکلما کان الالف اشد کانت النفرة عما سواه اشد لان الالتفات الی ما عداه یشغله عن الالتفات الیه والمانع عن حضور المحبوب مکروه فلا تزال تتعاقب محبة الله ونفرته عما سواه علی القلب "

جب رب تعالیٰ سے محبت زیادہ ہوتی چلی جائے گی تو اس کے ماسوا سے اسی طرح نفرت شدید ہوتی چلی جائے گی کیونکہ وہ رب تعالیٰ کی ذات کی طرف متوجہ نہیں ہونے دیتے۔ یہ یقینی بات جو چیز محبوب سے روکے وہ مکروہ نظر آتی ہے لہٰذا محبت تعاقب کرتی رہتی ہے جو ماسوا سے دل میں نفرت پیدا کر دیتی ہے۔ نفرت اسے ماسوا سے دور کر دیتی ہے وہ رب تعالیٰ کے ماسوا کو درجہ فنا میں سمجھتا ہے:

" فیصیر ذلک القلب مستنیرا بانوار القدس مستضیاً باضواء عالم العصمة فانیا عن الحظوظ المتعلقة بعالم الحدوث وهذا المقام اعلی الدرجات "

تو اس کا دل انوار قدس سے روشن ہو جاتا ہے جو چیزیں رب تعالیٰ سے دور ہونے سے اسے بچاتی ہیں ان کی روشنی سے وہ روشنی حاصل کرتا ہے اور جو چیزیں اسے رب تعالیٰ سے دور کر کے اس عالم حادث (فانی دنیا) کی طرف لگاتی ہیں وہ ان سے مکمل طور پر درجہ فنا میں سمجھتا ہے یہی محبت کا اعلیٰ معیار ہے۔

غلط فہمی کا ازالہ: غیر اللہ سے مدد نہ مانگو کی رٹ لگانے والے علامہ رازی رحمہ اللہ کی اس عبارت کو تو پیش کر دیتے ہیں کہ انبیاء کرام اور اولیاء کرام تمام کو فانی سمجھ کر رب تعالیٰ سے محبت کرو اگر ایسا نہیں کرو گے تو تمہیں اللہ تعالیٰ کی کامل محبت حاصل نہیں ہوگی۔ لیکن حقیقت بات یہ ہے کہ وہ علم سے دور ہیں عبارات کی اصل روح کو سمجھنے سے غافل ہیں کاش کہ وہ علامہ رازی رحمہ اللہ کی ان عبارات " **لان الالتفات الی ما عداہ یشغلہ عن الالتفات الیہ** " ماسوا کی طرف توجہ کرنے سے رب تعالیٰ سے توجہ ہٹ جائے۔

" **والمانع عن حضور المحبوب مکروہ** " جو چیز محبوب کے ذکر سے روکے وہ مکروہ ہے " **مستضیاء باضواء عالم العصمۃ** " جو چیزیں اللہ تعالیٰ سے دور ہونے سے بچائیں ان سے وہ اپنے آپ کو روشن کریں۔ " **فانیا عن الحظوظ المتعلقۃ بعالم الحدوث** " وہ چیز جو انسان کو فانی دنیا کی طرف لگا دیں ان کو دور پھینک دے۔ (از کبیر) کو محبت سے پڑھیں نفرت سے نہ پڑھیں علم سے پڑھیں، جہالت سے نہ پڑھیں۔ غور سے پڑھیں بغیر سوچنے کے نہ پڑھیں۔ سب سے بڑی بات یہ ہے میرے علم سے پڑھیں۔ تو ان کو یہ بات سمجھ آ جائے کہ جو چیزیں اللہ تعالیٰ سے دور کریں ان سے وہ بھی دور رہے اور جو چیزیں اللہ تعالیٰ کے قریب کریں ان کے یہ بھی قریب رہے۔

گناہ، معاصی اللہ تعالیٰ سے دور کرتے ہیں ان سے دور رہے انبیاء کرام کی محبت اور اولیاء کرام کی محبت کو رب تعالیٰ کی محبت کا ذریعہ سمجھے اور یہ عقیدہ رکھے کہ اللہ تعالیٰ سے محبت کرنا ہی دراصل مقصود ہے لیکن اللہ تعالیٰ کے محبوب اس کی محبت کا ذریعہ ہیں اس لئے ان سے محبت کرنا دراصل رب تعالیٰ سے ہی محبت ہے۔ جس طرح نماز کے صحیح ادا کرنے میں اس کے لئے شرائط ہیں طہارت اور نیت وغیرہ ان کا نماز کے ساتھ پایا جانا ضروری ہے وہ نماز سے جدا نہیں۔ (راقم)

شوق الی اللہ کا مطلب: شوق اس وقت تک متصور نہیں ہوتا جب تک اس چیز کا کچھ ادراک (علم) پایا جائے اور کچھ نہ پایا جائے " **فاما الذی لم یدرک اصلا فلا یشتاق الیہ** " جب کسی چیز کا ذرا بھی ادراک نہ پایا جائے انسان اس کا مشتاق نہیں ہوتا اسلئے کہ جب کسی کو دیکھا ہی نہ ہو اور کسی چیز کے اوصاف کا ہی پتہ نہ ہو تو اس کے مشتاق ہونے کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ " **ولو ادرک**

کماله لا یشتاق الیه "اور اگر ایک چیز کی ذات کو کامل طور پالیا گیا تو اسکا اشتیاق بھی باقی نہیں رہتا۔

محبوب کے اشتیاق کی دو وجہ: ایک ان میں سے یہ ہے کہ محبوب کو دیکھا لیکن محبوب غائب ہو گیا تو محب کو خیالات آتے ہی رہیں گے اس کا اشتیاق بڑھتا ہی چلا جائے گا کہ وہ مجھ سے دور کیوں ہو گیا۔ اس کے غائب ہونے کی کیا وجہ ہے کاش کہ وہ پھر نظر آئے۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ محبوب کے چہرہ کی ایک جھلک نظر آئی لیکن اس کے گیسو نہیں دیکھے اس کی آنکھوں کا مشاہدہ نہیں کیا اس کے دیگر محاسن نہیں دیکھے تو یہ مشتاق ہوتا ہے کہ میں اسے کامل طور پر دیکھ لوں اس کے تمام محاسن نظر آ جائیں۔

بندے کا رب تعالیٰ کا مشتاق ہونا: دونوں وجہ جو بیان کی گئی ہیں انکے لحاظ سے بندہ رب تعالیٰ کا مشتاق ہوتا ہے اگر چہ اسکی کیفیت وہ نہیں جو بندہ کسی بندے کا مشتاق ہو تو اس کی کیفیات جو بیان کی گئی ہیں۔ رب تعالیٰ کے اشتیاق کی ایک وجہ یوں بیان کی جاتی ہے۔ عارفین پر اگر چہ امور الھیہ بہت زیادہ واضح ہوتے ہیں لیکن پھر بھی وہ اور خیالات سے مکمل طور پر پاک نہیں ہوتے ہیں خیالات کا اس جہان میں پایا جانا ضروری ہے حکایات اور تمثیلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اسلئے رب تعالیٰ کی تجلیات آخرت میں ہی حاصل ہونی ہے لہٰذا ان تجلیات کے حاصل ہونے کا اشتیاق ہر عارف کو رہتا ہے۔

دوسری وجہ اللہ تعالیٰ کے اشتیاق کی یہ ہے کہ امور الھیہ کی کوئی انتہا نہیں بندے پر بعض امور منکشف ہوتے ہیں اور باقی امور پوشیدہ رہتے ہیں جن کی کوئی انتہا نہیں۔ جب عارف کو جن امور کا ادراک حاصل ہوتا ہے وہ کم ہیں اور جن کا ادراک حاصل نہیں ہوتا وہ زیادہ ہیں۔" **فانه لا یزال یکون مشتاقا الی معرفتها**" بیشک وہ ہمیشہ ان کی معرفت کا مشتاق رہتا ہے۔

تنبیه: پہلی قسم کا اشتیاق دار آخرت میں ختم ہو جائے گا کیونکہ اس میں طلب اللہ تعالیٰ کو دیکھنے اور ملاقات کرنے اور مشاہدہ کرنے کی پائی گئی ہے وہ آخرت میں حاصل ہو جائے گی تو لازمی طور پر اشتیاق بھی باقی نہیں رہے گا۔

دوسری وجہ کا اشتیاق ختم نہیں ہوگا کیونکہ اللہ تعالیٰ کے افعال کی حکمت کی کوئی انتہا نہیں اسی وجہ سے ان کے اشتیاق کی بھی کوئی انتہا نہیں۔ (ماخوذ از کبیر)

مومنوں کورب تعالیٰ سے محبت کیسے؟ متکلمین حضرات بیان فرماتے ہیں کہ مومنوں کورب تعالیٰ سے محبت دو وجہ سے ہے۔ایک یہ ہے کہ مومنین کی محبت کی دارومدار اس بات پر ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی تعظیم کرتے ہیں اوراس کی مدح اور ثناء بیان کرتے ہیں اور عبادت صرف اسی ذات کی کرتے ہیں جو شرک سے پاک ہوتی ہے اور غیر مناسب اعتقادات سے وہ پاک ہوتے ہیں۔لیکن مومنوں کے بغیر کفار اور مشرکین، یہود اور نصاریٰ اور ہنود رب تعالیٰ سے اس طرح کی محبت نہیں کرتے۔

دوسری وجہ مومنین کی رب تعالیٰ سے محبت کی یہ ہے کہ اس کے ساتھ امید اور ثواب ملے ہوئے ہوں اوراس کے عظیم مرتبہ کی رغبت پائی جائے اور عذاب کا خوف پایا جائے اور عذاب سے خلاصی کی راہ تلاش کی جائے۔

" ومن يعبد الله ويعظمه على هذا الحد تكون محبته لله اشد "

اور جو شخص اللہ تعالیٰ کی عبادت کرتا ہو اوراس کی تعظیم اس حد تک کرتا ہو جو ہم نے بیان کی تو اسے اللہ تعالیٰ سے بہت محبت حاصل ہے۔ عارفین حضرات کے نزدیک اللہ تعالیٰ کی محبت کا سبب اس کی معرفت ہے وہ اللہ تعالیٰ کو بقدر طاقت بشریہ کے پہچانیں۔ کیونکہ معرفت کو محبت لازم ہے جیسے جیسے معرفت بڑھتی چلی جائے گی ایسے ہی ان کی محبت بھی بڑھتی چلی جائے گی۔

مومنین کی رب تعالیٰ سے محبت زیادہ کیسے؟

بظاہر ایک وہم پیدا ہوتا ہے کہ مومنوں کو اللہ تعالیٰ سے محبت زیادہ کیسے ہے:

"مع انا نرى الهنود ياتون بطاعات شاقة لا يأتي بشئى منها احد من المسلمين ولا ياتون بها الا لله تعالىٰ ثم يقتلون انفسهم حبا لله تعالىٰ"

حالانکہ ہندو لوگ بھی مشقت آمیز عبادت وطاعت بجالاتے ہیں مسلمان اس طرح مشقت نہیں برداشت کرتے ان کی طاعات بھی اللہ تعالیٰ کے لئے ہی ہوتی ہیں پھر وہ اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کی محبت میں قتل بھی کر دیتے ہیں۔

پہلا جواب: بیشک مومنین اپنے عجز اور خشوع وخضوع میں صرف اللہ تعالیٰ کی رضاء طلب کرتے ہیں بخلاف مشرکین کے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرتے ہیں جب انہیں کوئی حاجت درپیش آتی ہے

جب ان کی حاجت زائل ہو جاتی ہے تو وہ اپنے معبودان باطلہ کی طرف رجوع کر لیتے ہیں اللہ تعالیٰ نے ارشادفرمایا:

﴿ فَاِذَا رَكِبُوْا فِی الْفُلْكِ دَعَوُا اللّٰهَ مُخْلِصِیْنَ لَهُ الدِّیْنَ فَلَمَّا نَجّٰهُمْ اِلَی الْبَرِّ اِذَا هُمْ یُشْرِكُوْنَ﴾ (عنکبوت ٦٥)

پھر جب کشتی میں سوار ہوتے ہیں اللہ کو پکارتے ہیں خالص کرتے ہیں اسی کے لئے دین پھر جب وہ نجات دیتا ہے ان کو خشکی کی طرف جبھی شرک کرنے لگتے ہیں۔

" والمومن لا یعرض عن اللہ فی الضراء والسراء والشدة والرخاء والکافر قد یعرض عن ربه فکان حب المؤمن اقوی "

اور مومن اللہ تعالیٰ سے اعراض نہیں کرتا خواہ تنگی ہو یا خوشی ہو خواہ مشکل ہو یا آسانی ہو لیکن کافر کبھی اللہ تعالیٰ سے اعراض بھی کر لیتا ہے اسی وجہ سے مؤمن کی اللہ تعالیٰ سے محبت قوی اور کثیر ہے۔

دوسرا جواب: جو شخص اللہ تعالیٰ کے غیر کسی چیز کی قضاء پر راضی ہو گیا تو اس نے اللہ تعالیٰ کی ملکیت میں غیر کو شریک کر لیا حالانکہ اس کی ملکیت میں کسی کو تصرف کا کوئی حق حاصل نہیں۔

" فاولئک الجهال قتلوا انفسهم بغیر اذنه اما المؤمنون قد یقتلون انفسهم باذنه وذلک فی الجهاد "

یہ جاہل لوگ اپنے اپ کو قتل کرتے ہیں لیکن ان کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی حکم نہیں ہوتا بلکہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی اجازت نہیں ہوتی، اپنے آپ کو آگ لگا دینا، بھوک سے اپنے آپ کو مار دینا رب تعالیٰ کو ناراض کرنا ہے نہ کہ راضی کرنا، یہ اللہ تعالیٰ کی محبت نہیں بلکہ اس کے احکام سے عدولی کر کے اس سے بغاوت ہے۔ لیکن مؤمنین اپنی جانوں کو اللہ تعالیٰ کی اجازت سے قربان کرتے ہیں یعنی جہاد میں اپنی جانیں قربان کرتے ہیں کیونکہ کافروں سے جہاد کرنے کا حکم اللہ تعالیٰ نے دیا ہے لہذا اس میں اس کی رضاء پائی گئی۔ یہی وجہ ہے کہ مومن کو اللہ تعالیٰ سے بہت زیادہ محبت ہے اور اتنی محبت کفار کو کبھی نہیں ہو سکتی۔

تیسرا جواب: کافر کو جب شدید عذاب میں مبتلا کیا جائے گا تو اسے رب تعالیٰ کی معرفت حاصل نہیں

رہے گی جو اس نے کام کئے تھے وہ باطل ہو جائیں گے۔لیکن مومن کے اعمال ضائع نہیں ہوں گے اسے اپنے نیک اعمال کی جزاء حاصل ہوگی مومن اگر گناہوں کی وجہ سے زیر عتاب آبھی گئے تو وہ رب تعالیٰ کو نہیں بھولیں گے انہیں رب تعالیٰ کی معرفت حاصل رہے گی یہی وجہ ہے کہ مومن کو اللہ تعالیٰ سے بہت زیادہ محبت حاصل ہے۔

چوتھا جواب: " قال ابن عباس ان المشركين كانوا يعبدون صنما فاذا رأو اشياء احسن منه تركوا ذلک واقبلوا علی عبادة الاحسن "

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ بیشک مشرکین ایک بت کی عبادت کرتے جب اس سے اور کوئی خوبصورت بت مل گیا تو پہلے خدا کو پھینک دیتے تو نئے خوبصورت معبود کی عبادت شروع کردیتے۔

کیا ہی گھٹیا معیار تھا ان کی عبادت کا، لیکن بفضلہ تعالیٰ مومن کی عبادت کا معیار بہت بلند وبالا ہے وہ صرف رب تعالیٰ کی ہی محبت کرتا ہے اسی لئے اس کی عبادت کرتا ہے باقی تمام محبوبان خدا سے مومنین کی محبت درحقیقت محبت خدا کا ذریعہ ہے اس لئے مؤمن کسی نبی کو کسی ولی کو معبود نہیں مانتا۔

پانچواں جواب: مومنین صرف ایک رب تعالیٰ کی عبادت کرتے ہیں اسے " وحده لا شريك له " مانتے ہیں لیکن کافر کئی بتوں کی عبادت کرتے ہیں لہٰذا اگر وہ کسی ایک بڑے بت کو اپنا معیاری خدا بھی مانے تو پھر اس کے ساتھ اور بتوں کو شریک کرنے کی وجہ سے اس ایک سے ان کی محبت میں کمی واقع ہوتی ہے۔ " اما الا له الواحد فتنضم محبة الجميع اليه "لیکن مومنین کا فقط ایک ہی معبود ہے اس لئے مومنوں کی تمام محبتیں اسی ایک کے ساتھ آکر مل جاتی ہیں۔ (از کبیر)

یہ الفاظ ذرا غور وفکر سے ایمان اور محبت سے پڑھیں تو خود بخود سمجھ آئے گا کہ مومنوں کی محبت اللہ تعالیٰ کے بغیر کسی اور سے معبود سمجھ کر نہیں اور نہ ہی خالق سمجھ کر اللہ تعالیٰ کی مخلوق سمجھ کر اور اس کے برگزیدہ بندے سمجھ کر جب ان سے محبت ہوئی تو وہ تمام محبوبان خدا سے محبت درحقیقت خدا سے ہی محبت ہے کاش کہ اللہ بے سمجھوں کو سمجھ عطا کردے حق وباطل میں تمیز کرسکیں۔ (راقم)

کافروں کا اپنے معبودوں سے دلچسپ سلوک:

" ویعبدون الصنم زمانا ثم یرفضونہ الی غیرہ وربما اکلوہ کما یحکی ، ان باھلۃ کانت لھم اصنام من حیس فجاعوا فی قحط اصابھم فاکلوھا "

کافر اپنے بتوں کی عبادت کرتے رہتے تھے لیکن پھر ان کو چھوڑ کر نئے بت تراش لیتے تھے گویا یوں سمجھیں کہ ان کے خدا پرانے ہو جاتے تھے پھر نئے بنا لیتے تھے۔ وہ اپنے خداؤں کو کبھی کھا لیتے تھے بنی باہلہ (ایک قبیلہ کا نام ہے) نے اپنے بت حیس (کھجور، کھویا اور میدہ سے بنے ہوئے حلوے) سے بنا رکھے تھے جب وہ قحط سالی میں بھوکے ہوئے تو انہوں نے اپنے معبودوں کو کھا لیا "ان باھلۃ کانت لھم اصنام من حیس فجاعوا فی قحط اصابھم فاکلوھا " (روح المعانی)

محبت کی زیادتی ثبات سے حاصل ہوتی ہے:

" لیس المراد الزیادۃ فی اصل الفعل بل الرسوخ والثبات وھو ملاک الامر ولھذا نزل (فاستقم کما امرت) وکان احب الاعمال الیہ ﷺ ادومھا "

زیادتی سے مراد اصل فعل میں زیادتی نہیں بلکہ عمل میں راسخ ہونا اور ثابت قدم رہنا یہی تمام امور کا بادشاہ ہے اسی لئے رب تعالیٰ نے فرمایا ثابت رہو جیسا تمہیں حکم دیا گیا۔ نبی کریم ﷺ کو کسی عمل پر ہمیشہ عمل کرنا پسند تھا۔ (خواہ وہ عمل قلیل ہی کیوں نہ ہو)۔ یہی وجہ ہے کہ رب تعالیٰ نے ﴿ اَشَدُّ حُبًّا ﴾ کہا ہے " احب " نہیں فرمایا تا کہ کسی کو وہم نہ ہو کہ کبھی کافر مقدار کے لحاظ پر طاعت زیادہ کر لیتے ہیں تو مؤمنین کی محبت رب تعالیٰ سے زیادہ کیسے۔

جب یہ واضح ہو گیا کہ مؤمنین کی طاعت اور عبادت کرنے میں ہمیشگی پائی گئی ہے تو اسی سے پتہ چل گیا کہ مؤمنین کی محبت بوجہ ثبات اور قرار کے "اشد" ہے کافروں کی محبت بوجہ زوال کے "غیر اشد" ہے۔

(ماخوذ از روح المعانی)

ولو یری الذین ظلموا اذ یرون العذاب ان القوۃ للّٰہ جمیعا :

اور اگر معلوم کرلیں ظالم اس وقت کو جب دیکھیں گے عذاب بیشک قوت اللہ کے لئے ہی ہے سب۔

راقم نے محذوف الفاظ کے بغیر لفظی ترجمہ کیا ہے جس سے مطلب اتنا واضح نہیں جتنا کہ اعلیٰ حضرت کے ترجمہ سے واضح ہے۔ (اور کیسی ہو اگر دیکھیں ظالم وہ وقت جب عذاب ان کے سامنے آئے گا اس لئے کہ سارا زور خدا کو ہے)۔

علامہ آلوسی رحمہ اللہ نے ﴿ وَلَوْ يَرَى ﴾ کا معنی " لو یعلم " کیا ہے (اگر ان کو علم حاصل ہو جائے) اب مطلب یہ ہوگا اور اگر ظالموں کو ابھی سے معلوم ہو جائے کہ ان کے لئے عذاب تیار کیا گیا ہے جو عذاب وہ قیامت کو دیکھیں گے تو ان کو ابھی سے یہ بھی پتہ چل جائے کہ بیشک تمام قوت اللہ تعالیٰ کو حاصل ہے۔ بلکہ دوسرا معنی اس سے زیادہ واضح ہے

﴿ وَلَوْ يَرَى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا ﴾ اندادھم لا ینفع لعلموا ﴿ اَنَّ الْقُوَّةَ لِلّٰهِ جَمِيْعًا ﴾ لا ینفع ولا یضر غیرہ "

اگر ظالموں کو ابھی پتہ چل جائے کہ ان کے معبودان باطلہ انہیں نفع نہیں دے سکتے جو علم ان کو قیامت کے دن عذاب دیکھ کر ہوگا تو ان کو ابھی سے یہ بھی پتہ چل جائے کہ بیشک قوت تمام اللہ تعالیٰ کو ہی حاصل ہے اس کے بغیر دوسرے معبودان باطلہ نفع ونقصان نہیں پہنچا سکتے۔ (ماخوذ از روح المعانی)

وَاَنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعَذَابِ : اور بیشک اللہ تعالیٰ سخت عذاب والا ہے۔ اس میں قوی احتمال تو یہ ہے کہ اس میں استیناف (نیا کلام) پایا گیا ہے یعنی اللہ تعالیٰ نے ان کو عذاب سے ڈراتے ہوئے یہ ارشاد فرمایا'' کہ بیشک اللہ تعالیٰ کا عذاب سخت ہے''۔ اور ایک احتمال یہ بھی ہے کہ ان کے قول کے ساتھ ہی متعلق ہو۔ کہ انہیں علم حاصل ہو جائے کہ بیشک قوت تمام رب تعالیٰ کو حاصل ہے اور وہ یہ کہیں کہ بیشک اللہ تعالیٰ سخت عذاب والا ہے۔ (از رح المعانی)

☆☆☆☆☆

﴿ اِذْ تَبَرَّأَ الَّذِیْنَ اتُّبِعُوْا مِنَ الَّذِیْنَ اتَّبَعُوْا وَرَأَوُا الْعَذَابَ وَتَقَطَّعَتْ بِهِمُ الْاَسْبَابُ ﴾

۱) ''جب بیزار ہوں گے پیشوا اپنے پیروں سے اور دیکھیں گے عذاب اور کٹ جائیں گی ان سب کی ڈوریں''

۲) جب بے زار ہوں گے وہ جن کی تابعداری کی گئی ان سے جنہوں نے تابعداری کی جب دیکھیں گے عذاب اور منقطع ہو جائیں گے (کٹ جائیں گے) ان کے اسباب (تعلقات)''

مختصر مطلب: یعنی قیامت کے دن جب مشرکین کے قائداپنے آپ سے عذاب کو دور نہیں کر سکیں گے تو اپنے متبعین سے وہ بے زار ہو جائیں گے اور ان کے تعلقات ختم ہو جائیں گے خواہ وہ ان کے تعلقات رشتہ داری کے تھے یا دوستی کے تھے اسی طرح ان کے معاہدے بھی ختم ہو جائیں کوئی ایک دوسرے کی امداد نہیں کر سکے گا ہر ایک کو اپنی فکر ہو گی۔ (ماخوذ از خازن)

قدرے تفصیل: جب پہلے ذکر کیا گیا کہ کفار نے رب تعالیٰ کی مثل اس کے شریک بنا لیے اس کے بعد ان سے بطور تہدید (دھمکی آمیز) کلام کی ﴿ اِذْ یَرَوْنَ الْعَذَابَ ﴾۔ اب مزید وعید کی گئی (ان کو ڈرایا گیا) اور کہا گیا ﴿اِذْ تَبَرَّأَ الَّذِیْنَ اتُّبِعُوْا مِنَ الَّذِیْنَ اتَّبَعُوْا ﴾۔

آیۃ کریمہ کا مطلب یہ ہے: " ان الذین افنوا عمرهم فی عبادتهم و اعتقدوا انهم من اوکد اسباب نجاتهم فانهم یتبرؤن منهم عند احتیاجهم الیهم "

بیشک وہ لوگ جنہوں نے معبودان باطلہ کی عبادت میں عمریں گزار دیں اور یہ عقیدہ رکھا کہ بیشک یہ ان کی نجات کے اسباب ہیں قیامت کے دن جب ان کو شدید محتاجی ہو گی اس وقت ان کے معبودان سے بیزار ہو جائیں گے۔

اسی کی اور مثالیں قرآن پاک سے:

﴿ وقال انما اتخذتم من دون الله اوثانا مودة بینکم فی الحیوة الدنیا ثم یوم القیامة یکفر

بعضکم ببعض ویلعن بعضکم بعضا ومأ واکم النار ومالکم من نصرین ﴾ (عنکبوت ۲۵)
اور ابراہیم نے فرمایا تم نے اللہ کے سوا یہ بت بنا لئے ہیں جن سے تمہاری دوستی یہی دنیا کی زندگی تک ہے پھر قیامت کے دن تم میں ایک دوسرے کے ساتھ کفر کرے گا اور ایک دوسرے پر لعنت ڈالے گا اور تم سب کا ٹھکانا جہنم ہے اور تمہارا کوئی مددگار نہیں"۔

﴿ اَلْاَخِلَّاءُ یَوْمَئِذٍ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ اِلَّا الْمُتَّقِیْنَ ﴾ (الزخرف : ۶۷)

"گہرے دوست اس دن (قیامت کے دن) ایک دوسرے کے دشمن ہوں گے مگر پرہیزگار"

یعنی نیک لوگوں کی دوستی قیامت کے دن بھی کام آئے گی اور کافر دنیا میں ایک دوسرے کے دوست ہوتے ہیں لیکن قیامت کے دن ایک دوسرے سے بےزار ہوں گے اور ایک دوسرے کے دشمن ہوں گے۔

﴿ کُلَّمَا دَخَلَتْ اُمَّةٌ لَّعَنَتْ اُخْتَهَا ﴾ (الاعراف : ۳۸)

"جب ایک گروہ داخل ہوتا ہے دوسرے پر لعنت کرتا ہے"

﴿ اِنِّیْ کَفَرْتُ بِمَا اَشْرَکْتُمُوْنِ مِنْ قَبْلُ ﴾ (ابراہیم ۲۲)

"وہ جو پہلے تم نے مجھے شریک ٹھہرایا تھا میں اس سے سخت بےزار ہوں"

(از کبیر)

متبوعین کی تابعین سے بےزاری کیوں؟ جن لوگوں کی تابعداری کی گئی وہ تابعداری کرنے والوں سے اس لئے بےزار ہوں گے کہ جب وہ عذاب دیکھیں گے تو عذاب سے چھٹکارا حاصل کرنے میں کوئی چارہ ان کو نظر نہیں آئے گا۔ رب تعالیٰ کے ارشاد گرامی ﴿ وَتَقَطَّعَتْ بِهِمُ الْاَسْبَابُ ﴾ کا ایک مطلب یہ بھی ہے کہ جب وہ عذاب کو دیکھ کر اپنے آپ کو اور اپنے متبعین (تابعداری کرنے والے) کو چھڑانے سے عاجز آ جائیں گے اور کلی طور پر ناامید ہو جائیں گے اور سمجھ جائیں گے کہ آج وہ اپنے آپ کو اور اپنے متبعین کو بچا نہیں سکتے ان کے بچاؤ کے اسباب سب ختم ہو جائیں گے۔ (از کبیر)

متبوعین سے مراد کون؟ اس میں مختلف اقوال ہیں جو تمام ہی معتبر ہیں۔

(۱) "انهم السادة والرؤساء من مشرکی الانس" مشرکین جن لوگوں کی تابعداری کرتے تھے وہ بھی مشرک لوگ ہی تھے جو ان کے سردار اور رئیس تھے جن کا کام حرام کو حلال کرنا اور حلال کو حرام کرنا تھا۔

(۲) مشرکین شیاطین جنوں کی تابعداری کرتے تھے اور وہ ان کے دلوں میں وسوسہ ڈالتے تھے۔

(۳) " انهم شياطين الجن والانس " مشرکین شیطان جنوں اور شیطان انسانوں کی تابعداری کرتے تھے جوان کو گمراہ کرتے تھے کبھی شرک کی راہ چلاتے یعنی بت پرستی کراتے اور کبھی حلال کو حرام کر کے اور کبھی حرام کو حلال کر کے ان کو کافر بناتے۔

(۴) " الاوثان الذين كانوا يسمونها بالآلهة " مشرکین کے متبوعین یعنی جن کی یہ تابعداری کرتے تھے وہ ان کے بت تھے جن کی وجہ سے یہ لوگ راہ راست سے بھٹکے ہوئے تھے۔

راقم کے نزدیک تو تمام اقوال اجتماعی طور پر معتبر ہیں تاہم علامہ رازی رحمہ اللہ نے پہلے قول کو ترجیح دی کہ ان کے انسانوں میں سے رئیس اور سردار ہی معتبر ہیں زیادہ صحیح قول یہ ہے کیونکہ ان سے امر اور نہی ممکن ہے جن امور اور نواہی پر چل کر یہ گمراہ ہوتے۔ اسی قول کی ترجیح ایک اور آیۃ کریمہ سے سمجھ آتی ہے ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

﴿ اِنَّا اَطَعْنَا سَادَتَنَا وَ كُبَرَاءَ نَا فَاَضَلُّوْنَا السَّبِيْلَا ﴾ (الاحزاب)

''بیشک ہم نے اپنے سرداروں اور بڑوں کی اطاعت کی انہوں نے ہی ہمیں سیدھی راہ سے بھٹکا دیا''

(از کبیر)

متبوعین اپنے متبعین سے کیسے بے زار ہوں گے: ان کی بے زاری چند طرح ہوگی۔

(۱) " احدها ان يقع منهم ذلك القول " بے زاری کا ایک طریقہ تو یہ ہوگا کہ وہ ظاہر طور پر اپنے متبعین سے کہہ دیں گے کہ آج ہم تم سے بے زار ہیں ہماری امداد کی کوئی توقع نہ رکھو۔

(۲) " وثانيها ان يكون نزول العذاب بهم وعجزهم عن دفعهم عن انفسهم فكيف عن غيرهم فتبرؤا "

اور دوسری وجہ یہ ہوگی کہ ان پر جب عذاب نازل ہوگا وہ اپنے آپ سے عذاب کو دور کرنے سے عاجز ہوں گے تو غیروں سے عذاب کو کیسے دور کر سکیں گے یہی ان کا عجز ہی ان سے بے زاری ہوگی۔

(۳) " وثالثها انه ظهر فيهم الندم على ما كان منهم من الكفر بالله والاعراض عن انبيائه ورسله فسمى ذلك الندم تبرؤا "

اور تیسرا طریقہ انکی بے زاری کا یہ ہوگا کہ وہ جو دنیا میں اللہ تعالیٰ سے کفر کرتے رہے اور انبیاء کرام

اور اللہ تعالیٰ کے رسولوں سے اعراض کرتے رہے قیامت کے دن وہ اس پر نادم ہوں گے ان کی اس ندامت کو ہی بے زاری سے تعبیر کیا گیا کیونکہ جب وہ خود نادم ہوں گے تو اوروں کی کیا امداد کریں گے۔

(ماخوذ از کبیر)

وَرَأَوُا الْعَذَابَ : ''جب دیکھیں گے عذاب'' " الواو للحال ای یتبرؤن فی حال رؤیتھم العذاب " اس مقام پر ''واوَ'' حال کے لئے ہے یعنی وہ بے زار ہوں گے اس حال میں کہ جب وہ عذاب دیکھیں گے۔

راقم نے اسی لئے واوَ کا معنی " جب " کیا ہے۔ تاہم اس میں اور اقوال بھی ہیں اسی لئے اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ نے ''واوَ عطف'' کا معنی کیا ہے (اور)۔

" وھذا اولی من سائر الاقوال لان فی تلک الحالۃ یزداد الھول والخوف "

اور یہ حال والا قول تمام اقوال سے زیادہ بہتر ہے اسلئے کہ اس حالت میں ڈر اور خوف زیادہ ہوتا ہے

(از کبیر)

وَتَقَطَّعَتْ بِهِمُ الْاَسْبَابُ : ''اور ان سے اسباب کو منقطع کر دیا جائے گا''۔ ''سبب'' کا لغوی معنی ہے ''رسی'' جس کے ذریعے نیچے سے اوپر چڑھے یا اوپر سے نیچے آئے پھر ہر وہ چیز جو کسی جگہ تک پہنچائے یا کسی حاجت تک پہنچائے اسے سبب کہا جاتا ہے۔ محبت اور قرابت داری کو بھی سبب کہا جاتا ہے کہ یہ ایک دوسرے کے درمیان تعلق کا ذریعہ ہے اسی لئے کہا جاتا ہے " ما بینی وبینک سبب " میرے اور تمہارے درمیان کوئی محبت اور قرابت نہیں۔

راستے کو بھی سبب کہا جاتا ہے کہ وہ ایک جگہ سے دوسری جگہ تک پہنچاتا ہے " فاتبع سببا " اسے نے راستہ اختیار کیا۔ آسمان کے دروازوں کو بھی ان میں داخل ہو کر آسمانوں تک پہنچانے کا ذریعہ ہیں ﴿اَسْبَابَ السَّمٰوٰتِ﴾ میں اسباب کا معنی دروازے ہیں۔

آیۃ کریمہ میں اسباب سے مراد: اس میں بھی چند وجوہ ہیں جو تمام ہی یہاں مراد ہیں۔

(۱) " الاول انھا المواصلات التی کانوا یتواصلون علیھا " پہلا قول یہ ہے کہ آیۃ کریمہ میں اسباب سے مراد وہ اسباب اور ذرائع ہیں جن کے واسطہ سے متبوعین اور تبعین ایک دوسرے سے تعلق قائم کئے ہوئے ہیں۔

(۲) " والثانی الارحام التی کانوا یتعاطفون بھا " اسباب سے مراد دوسرا قول یہ ہے کہ" قرابت داری مراد ہے جس کی وجہ سے وہ ایک دوسرے پر مہربانی کرتے تھے لیکن قیامت کے دن ان کے درمیان رشتہ داری کا تعلق ختم ہو جائے گا کوئی ایک دوسرے کا حال پوچھنے والا نہیں ہوگا۔

(۳) " الاعمال التی کانوا یلزمونھا " ان کے وہ اعمال جن کو وہ لازم پکڑے ہوئے تھے قیامت کے دن وہ ختم ہو جائیں گے اس لئے ان کے اعمال بھی ان کو قیامت کے دن کوئی نفع نہیں پہنچا سکیں گے۔

(۴) " والرابع العھود والحلف التی کانت بینھم یتوادون علیھا " چوتھا قول یہ ہے کہ ان کے وعدے اور قسمیں جو انہوں نے دوسروں لوگوں سے ملنے کے لئے اٹھا رکھی تھیں وہ ختم ہو جائیں گی۔

(۵) " والخامس ما کانوا یتواصلون بہ من الکفر " پانچواں قول اس میں یہ ہے کہ یہاں اسباب سے مراد وہ ذرائع ہیں جن کے ذریعے وہ کفر تک پہنچتے تھے قیامت کے دن وہ سبب ختم ہو جائیں گے۔

(۶) " السادس المنازل التی کانت لھم فی الدنیا " چھٹا قول یہ ہے کہ اسباب سے مراد اس آیۃ کریمہ میں ان کے وہ مراتب ہیں جو انہیں دنیا میں حاصل تھے یعنی قیامت کے دن ان کی سرداری ختم ہو جائے گی اسی وجہ سے وہ اپنے متبعین کی امداد نہ کر سکنے کی وجہ سے بے زار ہو جائیں گے۔

(۷) " السابع اسباب النجاۃ قتطعت عنھم " ساتواں قول یہ ہے کہ اسباب نجات ان سے منقطع ہو جائیں گے۔

(۸) آٹھواں قول ہی وہ قول ہے جو زیادہ معتبر ہے جس میں پہلے سات قول سمٹ کر آ جاتے ہیں وہ یہ ہے کہ یہاں اسباب سے مراد کل ہیں کیونکہ منقطع ہو جانے کا معنیٰ " نہ رہنا ہے" یہ نفی ہے جو عموم کو چاہتی ہے اس لئے مطلب یہ ہوگا۔" زال عنھم کل سبب یمکن ان یتعلق بہ" ان سے ہر سبب زائل ہو جائے گا جس سے بھی تعلق ممکن ہو سکتا ہو۔ ان کو مراتب اور اسباب اور نسب اور قسمیں اور آپس میں باندھے ہوئے عقد اور معاہدے کام نہیں آئیں گے۔ ان کو انتہائی ناامیدی ہوگی۔ (از کبیر)

وَقَالَ الَّذِیْنَ اتَّبَعُوْا لَوْ اَنَّ لَنَا کَرَّۃً فَنَتَبَرَّاَ مِنْهُمْ کَمَا تَبَرَّءُوْا مِنَّا کَذٰلِکَ یُرِیْهِمُ اللّٰهُ اَعْمَالَهُمْ حَسَرَاتٍ عَلَیْهِمْ وَمَا هُمْ بِخَارِجِیْنَ مِنَ النَّارِ

۱) ''اور کہیں گے پیروکار ہمیں لوٹ کر جانا ہوتا (دنیا میں) تو ہم ان سے توڑ دیتے جیسے انہوں نے ہم سے توڑی یونہی اللہ انہیں دکھائے گا ان کے کام ان پر حسرتیں ہو کر اور وہ دوزخ سے نکلنے والے نہیں''۔

۲) ''اور کہیں گے وہ لوگ جنہوں نے تابعداری کی کاش کہ ہمیں لوٹ کر جانا ہوتا (دنیا میں) تو ہم بیزار ہو جاتے ان سے جیسا کہ وہ بیزار ہوئے ہم سے اسی طرح دکھائے گا ان کو اللہ ان کے اعمال جو حسرتیں ہوں گی ان پر اور نہیں وہ نکلنے والے آگ سے''۔

مختصر مطلب: جن لوگوں نے اپنے رئیسوں، سرداروں، بتوں اور شیاطین کی تابعداری کی جب ان سے قیامت کے دن وہ بےزار ہوں گے جن کی انہوں نے تابعداری کی ہوگی تو یہ حسرت بھری تمنا کر رہے ہوں گے کاش کہ ہمیں بھی دنیا میں لوٹنا نصیب ہو جائے اور ہمارے ساتھ ہی یہ ہمارے متبوعین بھی دنیا میں چلے جائیں تو ہم بھی ان سے ایسے ہی بےزار ہو جائیں جیسے یہ ہم سے بےزار ہو گئے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ ان کو دکھائے گا ان کے اعمال جو ان پر حسرت ہوں گے اور وہ آگ میں ہمیشہ ہمیشہ کیلئے رہیں گے جس سے ان کو نکلنا نہیں ہوگا۔

قدرے تفصیل :

وَقَالَ الَّذِیْنَ اتَّبَعُوْا لَوْ اَنَّ لَنَا کَرَّۃً فَنَتَبَرَّاَ مِنْهُمْ کَمَا تَبَرَّءُوْا مِنَّا:

یہاں ''لـو'' کا استعمال معنی کیلئے ہے اسی وجہ سے جواب میں ''فاء'' آئی ہوئی ہے ''کرۃ'' کا معنی ہے ''رجعة'' اور ''عود'' یعنی لوٹنا۔ اب معنی یہ ہوگا ''لیت لـنـا کرۃ الی الدنیا فنتبرأ منهم کما تبرأ وامنا'' کاش کہ ہمیں دنیا میں لوٹنا ہو تو ہم ان سے بےزار ہو جائیں جیسا کہ وہ ہم سے بیزار ہوئے (از بیضاوی وشیخ زادہ)

وہ رجوع کی تمنا کیوں کریں گے؟ اس لئے کہ وہ یہ خواہش کریں گے کہ ہمیں دنیا میں لوٹا دیا جائے تا کہ ہم اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کی اطاعت کریں اور ہمارے متبوعین جس طرح آج ہم پر غصے میں ہیں اور ہم سے دور ہیں اسی طرح دنیا میں ہم بھی ان پر غصے کا اظہار کریں اور ہم بھی ان سے دور رہیں۔

خیال رہے کہ ان کی یہ تمنا دنیا میں اسی لئے نہیں پائی گئی کہ وہ عذاب کو نہیں دیکھ پائے قیامت کے دن جب عذاب کو دیکھیں گے تو پھر وہ تمنا کریں گے۔ (از روح المعانی)

كَذٰلِكَ يُرِيْهِمُ اللّٰهُ اَعْمَالَهُمْ حَسَرَاتٍ عَلَيْهِمْ:

''اسی طرح دکھائے گا ان کو اللہ ان کے اعمال جو ان پر حسرت ہوں گے۔'' یہاں دو احتمال ہیں ایک یہ ہے کہ جس طرح اللہ تعالیٰ نے انہیں یہ دکھایا کہ ان کے متبوعین ان سے بیزار ہو گئے اسی طرح ان کے اعمال ان کو دکھائے گا جن پر ان کو حسرت ہوگی۔ ان کو اعمال دکھانے کی وجہ بھی یہ ہوگی کہ یہ ایک دوسرے سے کامل طور پر بے زار ہو کر نادم ہو جائیں۔

دوسرا احتمال یہ ہے کہ جس طرح ان کو اللہ تعالیٰ نے عذاب دکھایا اسی طرح ان کو اعمال دکھائے گا جن پر یہ حسرت کریں گے اور ان کو یقین ہو جائے گا اب ہماری بربادی ہی بربادی ہے۔

کون سے اعمال ان کو دکھائے جائیں گے: اس میں کئی احتمال ہیں تاہم وہ سب ہی مجتمع ہوں گے۔

(۱) **"الاول الطاعات يتحسرون لم ضيعوها"** ان میں سے پہلا یہ قول ہوگا کہ ان کو طاعات دکھائی جائیں گی جن پر یہ حسرت کریں گے کہ ان اچھے اعمال کو ہم نے کیوں ضائع کر دیا کہ آج ہم عذاب میں مبتلاء ہیں اور ہماری کوئی نجات نہیں۔ **"الثانی المعاصی و اعمالهم الخبيثة يتحسرون لم عملوها"** دوسرا قول یہ ہے کہ ان کو ان کے گناہ اور ان کے خبیث اعمال دکھائے جائیں گے جن پر وہ حسرت کریں گے کہ یہ اعمال انہوں نے کیوں کئے تھے۔

" الثالث ثواب طاعاتهم التی اتوابها فاحبطوه بالكفر "

تیسرا قول ان میں سے یہ ہے کہ ان لوگوں کو ان کی اچھائیوں کا ثواب دکھایا جائے گا کہ تمہیں یہ ثواب دیا جانا تھا لیکن تم نے کفر کے ذریعے اس ثواب کو ضائع کر دیا ہے۔

" الرابع، اعمالهم التی تقربوا بها الی رؤسائهم من تعظيمهم والانقياد لامرهم "

چوتھا قول یہ ہے کہ اعمال سے مراد ان کے وہ اعمال ہیں جن کی وجہ سے وہ اپنے رئیسوں کے قریب ہوئے یعنی ان کی تعظیم اور ان کی اطاعت۔

" والظاهر ان المراد الاعمال التی اتبعوا فیها السّادة وهو كفرهم ومعاصیهم "

ظاہر یہ ہے کہ ان کے وہ اعمال مراد ہیں جو انہوں نے اپنے رئیسوں اور سرداروں کے کہنے پر کئے ہوں گے یعنی ان کا کفر اور ان کے گناہ معتبر ہوں گے۔

وہ اعمال ان پر حسرت ہوں گے: جب وہ اپنے اعمال یعنی کفر اور معاصی کو اپنے اپنے نامہ اعمال میں دیکھیں گے۔ تو ان کو دیکھ کر حسرت ہوگی اور انہیں یقین ہو جائے گا کہ ان کو اب اس کی جزاء ضرور دی جانی ہے حالانکہ ان پر ممکن تھا وہ ان کو چھوڑ دیتے اور طاعات پر عمل کرتے۔

حسرت کیا ہے؟ اصل میں " الحسر " کا معنیٰ " کشف " کھولنا، ظاہر کرنا ہے جس طرح کہا جاتا ہے " حسر عن ذراعیه " فلاں شخص نے اپنی کلائیوں کو کھولا یعنی ان سے کپڑا اٹھایا۔ " الحسرة " کا معنیٰ شدید ندامت ہے کیونکہ ندامت کے وقت نادم کا حال کھل جاتا ہے۔ اور " الحسیر " ایسے کپڑے ٹکڑے کو بھی کہا جاتا ہے جس میں بظاہر کوئی نفع نہ ہو۔ اس معنیٰ کی مناسبت سے " الحسرة " کا معنیٰ شدید ندامت ہوگا کیونکہ نادم شخص اس کپڑے کی طرح ہی ہو جاتا ہے جس میں کوئی نفع نہ پایا جائے۔ اور " الحسور " کا معنیٰ تھک جانا بھی ہے اس معنیٰ کے لحاظ سے " الحسرة " کا معنیٰ یہ ہوگا کہ نادم کا ندامت کی وجہ سے تھک ہار جانا۔

وَمَا هُمْ بِخَارِجِيْنَ مِنَ النَّارِ : اور وہ آگ سے نکلنے والے نہیں۔ چونکہ ذکر ہی کفار و مشرکین کا ہو رہا ہے اس لئے ان کو جہنم سے کبھی نہیں نکالا جائے گا۔ دوسری آیۃ کریمہ اس پر دلالت کر رہی ہے:

﴿ وَاِنَّ الْفُجَّارَ لَفِیْ جَحِیْمٍ یَصْلَوْنَهَا یَوْمَ الدِّیْنِ وَمَا هُمْ عَنْهَا بِغَآئِبِیْنَ ﴾ (الانفطار)

" اور بیشک فاجر (کافر) لوگ جہنم میں ہوں گے قیامت کے دن اس میں وہ جلیں گے اور وہ اس سے غائب نہیں ہوں گے۔" وثبت ان المراد بالفجار ههنا الكفار لدلالة هذه الآية " معلوم ہو گیا کہ فجار سے مراد کفار ہیں کیونکہ یہ آیۃ اس پر دلالت کر رہی ہے۔ روز روشن کی طرح واضح ہو گیا کہ ان آیات میں کفار کا ذکر ہے کیونکہ یہاں ذکر ہو رہا ہے ان کو جہنم سے نہیں نکالا جائے گا۔

" وان اصحاب الكبيرة من اهل القبلة يخرجون من النار "

بیشک کبیرہ گناہ والوں کو تو جہنم سے نکال لیا جائے گا اس پر اہل سنت کا اجماع ہے۔ (از کبیر)

﴿ یَا اَیُّھَا النَّاسُ کُلُوْا مِمَّا فِی الْاَرْضِ حَلٰلًا طَیِّبًا وَّلَا تَتَّبِعُوْا خُطُوَاتِ الشَّیْطٰنِ اِنَّہٗ لَکُمْ عَدُوٌّ مُّبِیْنٌ ﴾

۱) ''اے لوگو کھاؤ جو کچھ زمین میں حلال پاکیزہ ہے اور شیطان کے قدم پر قدم نہ رکھو بیشک وہ تمہارا کھلا دشمن ہے''۔

۲) ''اے لوگو کھاؤ جو کچھ زمین میں حلال پاکیزہ ہے اور نہ تابعداری کرو شیطان کے قدموں کی بیشک وہ تمہارا دشمن ہے کھلا''۔

ماقبل سے رابطہ: اللہ تعالیٰ نے پہلے توحید کو ذکر فرمایا اور اس پر دلائل قائم فرمائے پھر اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کو تسلیم کرنے والوں کا ثواب ذکر فرمایا۔ اس کے بعد ﴿ وَمَنْ یَّتَّخِذُ مِنْ دُوْنِ اللّٰہِ اَنْدَادًا ﴾ سے مشرکین کے شرک کو بیان فرمایا۔ پھر رئیس کافروں کی تابعداری کرنے والے کفار کا ذکر فرمایا اس کے بعد اس آیۃ میں دونوں فریقوں پر انعام کا ذکر فرمایا اور ان پر احسان کو بیان فرمایا۔ اور یہ بیان فرمایا کہ جو شخص گناہوں میں مبتلا ہوگا وہ گنہگار ہوگا کفر کی وجہ سے کافر ہوگا لیکن اللہ تعالیٰ کا احسان ان پر برقرار رہے گا ''**لم تؤثر فی قطع احسانه ونعمه عنهم**'' یعنی ان کے گناہ اور کفر رب تعالیٰ کے احسان اور نعمتوں کو ختم کرنے کا ذریعہ نہیں ہوں گے۔ (از کبیر)

شان نزول: چند واقعات کے بعد آیۃ کریمہ کا نزول ہوا جو تمام ہی شان نزول ہیں۔ (راقم)

(۱) یہ آیۃ کریمہ مشرکین کے متعلق نازل ہوئی جب کہ انہوں نے اپنے آپ پر بحیرہ اور سائبہ اور وصیلہ اور حام حرام قرار دے دیئے تھے تو ان کو اس آیۃ کریمہ میں اس سے منع کیا گیا کہ حلال پاکیزہ جانوروں کو کھاؤ حلال کو اپنے آپ پر حرام نہ کرو۔ (از روح المعانی)

خیال رہے کہ زمانہ جاہلیت میں کفار کا یہ دستور تھا کہ جو اونٹنی پانچ مرتبہ بچے جنتی اور آخر مرتبہ اس کا بچہ نر ہوتا اس کا کان چیر دیتے پھر نہ اس پر سواری کرتے نہ اس کو ذبح کرتے نہ پانی اور چارے سے اسے ہانکتے اس کو بحیرہ کہتے۔ اور جب سفر پیش ہوتا یا کوئی بیمار ہوتا تو یہ نذر کرتے کہ اگر میں سفر سے

بخیریت واپس آؤں یا تندرست ہو جاؤں تو میری اونٹنی سائبہ (بجار) ہے اور اس سے بھی بحیرہ کی طرح نفع اٹھانا حرام سمجھتے اور اسے آزاد چھوڑ دیتے۔ اور بکری جب سات مرتبہ بچے جن چکتی تو اگر ساتواں بچہ نر ہوتا تو اس کو مرد کھاتے اور اگر مادہ ہوتا تو بکریوں میں چھوڑ دیتے اور ایسے ہی اگر نر مادہ دونوں ہوتے اور کہتے کہ یہ اپنے بھائی سے مل گئی اس کو وصیلہ کہتے۔ اور جب نر اونٹ دس گیابھ (دس مرتبہ مؤنث گابھن ہوتی) حاصل ہو جاتے تو اس کو چھوڑ دیتے نہ اس پر سواری کرتے نہ اس سے کام لیتے نہ اسے چارے پانی سے روکتے اس کو 'حامی' کہتے۔ (خزائن العرفان)

(۲) شان نزول میں ایک اور قول یہ ہے کہ حضرت عبداللہ بن سلام پہلے یہودیت میں تھے انہوں نے اور ان کے چند ساتھیوں نے ایمان قبول کر لیا یہودیت میں اونٹ کا گوشت حرام تھا انہوں نے اسلام لانے کے بعد بھی اپنے آپ پر حرام کر لیا تو یہ آیۃ نازل ہوئی۔

(۳) تیسرا قول شان نزول میں یہ ہے کہ ثقیف اور بنی عامر بن صعصہ اور خزاعہ اور بنی مدلج نے جب اپنے آپ پر کھجور اور پنیر کو حرام کر لیا تو یہ آیۃ کریمہ نازل ہوئی۔ (از روح المعانی)

(۴) چوتھا قول شان نزول میں یہ ہے کہ بعض لوگوں نے اپنے آپ پر اچھے طعام اور اچھے لباس حرام کر لئے تھے تو یہ آیۃ کریمہ نازل ہوئی۔

اعتراض : قاضی ابوالسعو د محمد بن محمد عمادی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

" وقيل نزلت في قوم من المؤمنين حرموا على انفسهم رفيع الاطعمة والملابس ويرده قوله عزوجل ﴿ وَلَا تَتَّبِعُوا خُطُوَاتِ الشَّيْطَانِ ﴾ اى لا تقتدوا بها فى اتباع الهوى فانه صريح في ان الخطاب للكفرة كيف لا وتحريم الحلال على نفسه تذهدا ليس من باب اتباع خطوات الشيطان "

بعض حضرات نے کہا کہ یہ آیۃ کریمہ مومنوں کے بارے میں نازل ہوئی جنہوں نے اپنے آپ پر اچھے طعام اور اچھے لباس حرام کر لئے تھے لیکن یہ قول صحیح نہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی:

﴿ وَلَا تَتَّبِعُوا خُطُوَاتِ الشَّيْطَانِ ﴾ ''اور نہ تابعداری کرو شیطان کے قدموں کی'' اسے رد کر رہا ہے کیونکہ ان الفاظ مبارکہ کا مطلب یہ ہے کہ تم اپنی خواہشات کی تابعداری کرتے ہوئے شیطان

کی اقتداء نہ کرو شیطان کی اقتداء صریح کفر ہے۔ یہ قول کس طرح درست نہ ہو جب کہ زہد کے لئے اپنے آپ پر کسی چیز کو حرام کر لینا شیطان کے قدموں کی تابعداری نہیں۔ (ابوالسعود)

اس تفسیر سے تو واضح ہوا کہ آخری تینوں شان نزول درست نہیں کس طرح ان کو جلیل القدر مفسرین کرام نے بیان کیا ہے۔

جواب: اصل میں ان تمام اقوال میں محاکمہ یہ ہے کہ اگر کوئی شخص حلال چیز کو اپنے پر حرام کرے لاعلمی کی وجہ سے جیسا کہ حضرت عبداللہ بن سلام اور ان کے ساتھیوں (رضی اللہ عنہم) نے اپنے آپ پر اونٹ کا گوشت حرام کیا تھا یہ کفر نہیں۔ اگر کوئی شخص زہد کی خاطر اپنے آپ پر کسی حلال چیز کو حرام کرے تو پھر بھی کفر نہیں لیکن اگر سنت سے اعراض لازم آئے تو منع ہے۔

شیطان کی تابعداری سے منع کیا گیا ہے تو اس کا صرف یہ مطلب نہیں کہ تم اس کی تابعداری کر کے کافر نہ ہو جاؤ بلکہ شیطان کی تابعداری کر کے گناہوں میں مبتلا ہونا بھی تو منع ہے۔ یہی وجہ ہے جب چند صحابہ نے اپنے آپ پر عبادات کو لازم کیا اور ایک صحابی نے کہا " **انا اعتزل النساء فلا اتزوج ابدا** " میں عورتوں سے جدا رہوں گا اور کبھی شادی نہیں کروں گا تو ان کے جواب میں نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا " **فمن رغب عن سنتی فلیس منی** "جس نے میری سنت سے اعراض کیا وہ مجھ سے نہیں۔
(مشکوۃ کتاب الاعتصام بالکتاب والسنۃ)

اس لئے تمام اقوال ہی صحیح ہیں ابوالسعو د رحمہ اللہ کا رد کرنا درست نہیں۔ (راقم)

حلالا: حلال کا معنی ہے کھولنا شریعت میں حلال اس چیز کو کہیں گے جس سے ممانعت کو ختم کر دیا جائے

تنبیہ: حرام کی دو قسمیں ہیں ایک وہ جو حرام ہوتا ہے خبث (ناپاک) کی وجہ سے جیسے مردار کا گوشت خنزیر کا گوشت، دم مسفوح (بہنے والا خون)۔ اور ایک حرام وہ ہوتا ہے جو خبث کی وجہ سے تو نہیں لیکن شریعت نے اس سے منع کر دیا جیسا کہ غیر کی ملکیت چیز خواہ وہ پاک اور ستھری ہی کیوں نہ ہو شریعت کی طرف سے اجازت نہ ہونے کی وجہ سے وہ حرام ہے۔ حلال میں یہ دونوں قیدیں نہیں۔ (از کبیر)

امام مالک رحمہ اللہ نے فرمایا:

" الحلال ما یجده فم الشرع لذیذا لا یعافه ولا یکره او تراه عینه

طاهرا عن دنس الشبهة"

حلال وہ ہے جسے شریعت کا منہ لذیذ سمجھے اس سے نفرت نہ کرے اور اسے ناپسند نہ سمجھے۔اور مطلب یہ ہے کہ شریعت کی آنکھ جس چیز کو شبہات کی میل سے پاک سمجھے وہ حلال ہے۔(روح المعانی)

یعنی شریعت اسے چکھنے کی اجازت دے منع نہ کرے تو گویا کہ شریعت کے منہ نے اسے لذیذ سمجھا۔اور اس میں حرام ہونے کا کوئی شبہ نہ پایا جائے تو گویا کہ اسے آنکھ نے حلال سمجھا یہی مطلب ہے شریعت کی آنکھ کے حلال سمجھنے کا۔(راقم)

طیبا : "الطیب فی اللغة قد یکون بمعنی الطاهر" طیب کا لغت میں معنی پاک ہونا بھی آتا ہے۔اور حلال کو بھی طیب کہا گیا ہے کیونکہ اس کے مقابل حرام کو خبیث کہا گیا ہے۔اللہ تعالیٰ نے فرمایا ﴿قُلْ لَّا یَسْتَوِی الْخَبِیْثُ وَالطَّیِّبُ﴾ "(اے محبوب) آپ فرمادیں حرام اور حلال برابر نہیں۔

اصل میں طیب کا مطلب ہے وہ چیز جس سے لذت حاصل ہو اور طبیعت اسے اچھا سمجھے، چونکہ اس کا وصف اصل میں طاہر ہوتا ہے۔حلال کو بھی اس مناسبت کی وجہ سے طیب کہا جاتا ہے کیونکہ شریعت حرام سے منع کرتی ہے لہذا حرام میں شرعی طور پر لذت نہیں پائی جاتی بلکہ حلال میں ہی شرعاً لذت ہے۔اس آیۂ کریمہ میں اگرچہ طیب کا معنی حلال بھی کیا جا سکتا ہے لیکن اس میں تکرار لازم آئے گا حلال اور طیب کا ایک معنی ہوگا۔

لہذا بہتر یہ ہے کہ طیباً کا معنی پاکیزہ، لذت دار، طبیعت کے مطابق ہو بشرطیکہ شرعاً اس میں ممانعت نہ پائی گئی ہو۔ (از کبیر)

" والمراد بالحلال ما نص الشارع علی حله وبهذا (ای الطیب) مالم یرد فیه النص ولکنه مما یستلذ ویشتهیه الطبع المستقیم ولم یکن فی الشرع ما یدل علی حرمته کاسکار وضرر"

حلال سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ نے اس کے حلال ہونے کو بیان کیا ہو طیب کو بیان تو نہیں کیا البتہ اس سے لذت حاصل ہوتی ہے اور طبع مستقیم (درست طبیعت) اس کی خواہش رکھتی ہے لیکن شرع میں اس کی حرمت کو بیان نہیں کیا گیا۔کیونکہ نشہ والی چیزیں اور نقصان دینے

والی چیزوں سے شریعت نے منع کیا ہے اس لئے وہ طیب نہیں۔

اسی سے ایک اعتراض اٹھ گیا کہ اگر کوئی یہ کہے کہ اللہ تعالیٰ نے طیب کے کھانے کا حکم دیا ہے اس کا یہ مطلب ہے کہ جو طیب نہیں تو اس کا کھانا حرام ہو جائے جب کہ طیب کا معنی بیان کیا گیا ہے کہ اس سے لذت حاصل ہو اور طبع مستقیم اس کی خواہش کرے تو اس سے یہ سمجھ آئے گا کہ سیر ہو کر کھانے کے بعد چونکہ لذت نہیں آتی۔ بیمار آدمی کی طبع مستقیم نہیں ہوتی تو ان حالات میں کھانا منع ہو جائے۔ اس کا جواب پہلے آچکا ہے کہ جس چیز سے شریعت نے منع کیا ہو وہ غیر طیب ناجائز ہو گی جس سے شریعت نے منع نہیں کیا وہ منع نہیں کیونکہ مفہوم مخالف ثابت کرنا ہمارے نزدیک کوئی دلیل نہیں۔

(ماخوذ از روح المعانی)

وَلَا تَتَّبِعُوْا خُطُوَاتِ الشَّيْطَانِ : ''اور تابعداری نہ کرو شیطان کے قدموں کی'' خطوۃ (بفتح الخاء وسکون الطاء) اور ''خطوۃ'' (بضمتین) کا معنی ایک ہی ہے دو قدموں کے درمیان فاصلہ کو '' خطوۃ '' کہا جاتا ہے۔ (قرطبی)

مطلب یہ ہوا: '' لا تعتقدوا بہ وتستنوا فتحرموا الحلال وتحللوا الحرام '' تم شیطان کے ساتھ عقیدت نہ رکھو اس کے طریقہ پر نہ چلو کہ تم حلال کو حرام بناتے رہو یا حرام کو حلال بناتے رہو یعنی شیطان کے نقش قدم پر نہ چلو۔ اعلیٰ حضرت کے ترجمہ میں (قدم پر قدم نہ رکھو) کا یہی مطلب ہے۔

تنبیہ : طلاق کی قسم اٹھانا، حرام کاموں اور گناہ والے کاموں کی نذر ماننا اور اللہ تعالیٰ کے نام کے غیر کی قسم اٹھانا یہ تمام کام شیطان کی تابعداری میں آتے ہیں۔ (از روح المعانی)

اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ : بیشک وہ تمہارا دشمن ہے کھلا، ﴿ مُبِيْنٌ ﴾ باب افعال سے ہے یعنی ''ابانۃ '' سے لیا ہوا ہے اصل مادہ '' بان یبین بیانا '' ہے اس کا معنی ہے ''ظاہر طور'' یعنی بیشک وہ تمہارا کھلا دشمن ہے۔

اعتراض: کھلے دشمن سے تو انسان دھوکے میں نہیں آتا شیطان تو دوست بن کر ورغلاتا ہے۔ دوسرے مقام پر رب تعالیٰ نے فرمایا ﴿ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا اَوْلِيٰٓؤُهُمُ الطَّاغُوْتُ ﴾ کافروں کے

دوست شیطان ہیں کھلا دشمن کہنا کیسے صحیح ہے۔

جواب: " انه ظاهر العداوة عند ذوی البصيرة وان كان يظهر الولاية لمن يغويه "

جو لوگ بصیرت رکھتے ہیں ان کے سامنے اس کی عداوت ظاہر ہے اور جن کو بھٹکانا چاہتا ہے ان کے لئے اس کی دوستی ظاہر ہے۔ لہذا کھلا دشمن کہنا بھی صحیح ہے" اور دوست بن کر بھٹکانے والا" کہنا بھی صحیح ہے۔

(ماخوذ از روح المعانی)

فائدہ: آج کل صاف ستھری چیزوں کے کھانے پر بہت زور دیا جاتا ہے گلی سڑی چیزوں کے کھانے سے پرہیز کرنے کی تلقین کی جاتی ہے کہ گلی سڑی چیزیں صحت کے لئے نقصان دہ ہیں لیکن مقام افسوس یہ ہے کہ حرام اور حلال میں کوئی فرق نہیں کیا جاتا نہ ہی حرام سے بچنے کی ترغیب دی جاتی ہے یہی وجہ ہے کہ مسلمان ذلیل وحقیر ہو رہے ہیں۔

کاش کہ اللہ تعالیٰ کے اس حکم کو مدنظر رکھا جاتا کیا خوب حکم فرمایا کہ حلال چیزیں کھاؤ تا کہ تمہارا باطن پاکیزہ رہے اور پاکیزہ اور صاف ستھری چیزیں کھاؤ تا کہ تمہارا ظاہری بدن صحیح وسلامت رہے۔ آج کل ظاہری علاج کی طرف زیادہ توجہ دی جاتی ہے لیکن قرآن پاک نے باطنی اور ظاہری علاج پر زور دیا ہے۔

(ماخوذ از ضیاء القرآن)

قبولیت دعاء رزق حلال پر موقوف ہے: ابن مردویہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت بیان فرمائی کہ نبی کریم ﷺ کے پاس یہی آیت ﴿يَا أَيُّهَا النَّاسُ كُلُوا مِمَّا فِي الْأَرْضِ حَلَالًا طَيِّبًا﴾ پڑھی گئی۔

" فقام سعد بن ابی وقاص فقال يا رسول الله ادع الله ان يجعلنی مستجاب الدعوة فقال يا سعد اطب مطعمك تكن مستجاب الدعوة والذی نفس محمد بيده ان الرجل ليقذف اللقمة الحرام فی جوفه فما يتقبل منه اربعين يوما وايما عبد نبت لحمه من السحت والربا فالنار اولی به "

تو سعد بن ابی وقاص کھڑے ہوئے عرض کرنے لگے یا رسول اللہ اللہ تعالیٰ سے دعا فرمائیں کہ وہ مجھے دعا کی قبولیت کا شرف عطا کر دے (میری دعا قبول ہو جایا کرے) تو آپ نے فرمایا اے سعد تم اپنا طعام

پاکیزہ اور حلال رکھو تو اللہ تعالیٰ تمہاری دعا کو قبول فرمایا کرے گا قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے بیشک جب کوئی شخص حرام لقمہ اپنے پیٹ میں ڈالتا ہے تو چالیس دن اس کی عبادات کو قبول نہیں کیا جاتا۔ جس کی نشوونما ہی حرام مال سے ہو اور ربو (سود) کے مال سے ہو وہ جہنم کا مستحق ہے۔ (درمنثور)

تین چیزوں میں نجات:

" وقال ابو عبد الله الساجی واسمه سعید بن یزید خمس خصال بها تمام العلم وهی معرفة الله عزوجل ومعرفة الحق واخلاص العمل لله والعمل علی السنة واكل الحلال فان فقدت واحدة لم یرفع العمل "

ابوعبداللہ ساجی جن کا نام سعید بن یزید ہے وہ فرماتے ہیں پانچ چیزوں سے علم کی تکمیل ہوتی ہے وہ یہ ہیں: اللہ تعالیٰ کی معرفت، حق راہ کی معرفت اور عمل صرف اللہ تعالیٰ کے لئے خلوص سے کرنا اور سنت کے مطابق عمل کرنا اور حلال مال کھانا ان پانچ میں سے کوئی ایک بھی حاصل نہ ہو تو اس کے عمل کو رب تعالیٰ کے ہاں شرف قبولیت حاصل نہیں ہوگا۔ (قرطبی)

جب یقین ہو حلال میں پھر کھائے: " قال سهل ولا یصح اكل الحلال الا بالعلم "

سہل کہتے ہیں اس وقت تک حلال مال کو کھانا بھی صحیح نہیں جب تک یقین نہ ہو یعنی اگر شک ہو کہ یہ مال حلال ہے یا حرام ہے تو اس کا کھانا جائز نہیں۔ (از قرطبی)

حلال مال کا چھ چیزوں سے پاک ہونا ضروری ہے:

" ولا یكون المال حلالا حتی یصفو من ست خصال الربا والحرام والسحت (وهو اسم مجمل) والغلول والمروه والشبهة "

اس وقت تک مال حلال نہیں ہو سکتا جب تک وہ چھ چیزوں سے پاک نہ ہو ربو (سود) سے پاک ہو اور حرام ہونے سے پاک ہو اور ایسا مال ہو جس میں اللہ تعالیٰ کی ناراضگی نہ پائی گئی ہو اور مال غنیمت میں خیانت والا مال نہ ہو اور شرعاً مکروہ مال نہ ہو اور ایسا مال جس میں حرام ہونے کا شبہ پایا گیا ہو اس سے پاک ہو۔ (قرطبی)

مقام توجه : رب تعالیٰ نے فرمایا﴿ وَلَا تَتَّبِعُوْا خُطُوَاتِ الشَّيْطٰنِ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ﴾
اور تابعداری نہ کرو شیطان کے قدموں کی بیشک وہ تمہارا دشمن ہے کھلا۔

" والصحيح ان اللفظ في كل ما عدا السنن والشرائع من البدع والمعاصي "
صحیح یہ ہے کہ ﴿ خطوات ﴾ عام ہے اس لئے سنتوں اور شرعی احکام کے بغیر ایسی بدعات جو بری ہوں شریعت کے مخالف ہوں یعنی جن میں معصیت پائی جاتی ہو (گناہ کے کام ہوں) وہ سب شیطانی عمل ہوں گے ان پر چلنا شیطان کی تابعداری کہلائے گا۔ (قرطبی)

شیطان سے بچنے کا حکم رب تعالیٰ نے کئی مقامات پر دیا: ایک اسی آیۃ کے آخری الفاظ مبارکہ ﴿ وَلَا تَتَّبِعُوْا خُطُوَاتِ الشَّيْطٰنِ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ ﴾ اور شیطان کے قدموں کی تابعداری نہ کرو بیشک وہ تمہارا کھلا دشمن ہے۔ اور آنے والی آیۃ کریمہ میں ﴿ اِنَّمَا يَاْمُرُكُمْ بِالسُّوْٓءِ وَالْفَحْشَآءِ ﴾ بیشک وہ تمہیں برائی اور بے حیائی کا حکم دیتا ہے اور ارشاد فرمایا﴿ اَلشَّيْطٰنُ يَعِدُكُمُ الْفَقْرَ وَيَاْمُرُكُمْ بِالْفَحْشَآءِ ﴾ ''شیطان تمہیں فقر (غریب ہو جانے) سے ڈراتا ہے اور حکم دیتا ہے تمہیں بے حیائی کا''۔

﴿ وَيُرِيْدُ الشَّيْطٰنُ اَنْ يُّضِلَّهُمْ ضَلٰلًاۢ بَعِيْدًا ﴾
''اور ارادہ رکھتا ہے شیطان کی تمہیں بہت بڑی گمراہی میں مبتلا کر دے''

﴿ اِنَّمَا يُرِيْدُ الشَّيْطٰنُ اَنْ يُّوْقِعَ بَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَآءَ ﴾
''بیشک شیطان ارادہ رکھتا ہے کہ واقع کرے تمہارے درمیان دشمنی اور بغض''

﴿ اِنَّهٗ عَدُوٌّ مُّضِلٌّ مُّبِيْنٌ ﴾ ''بیشک وہ دشمن بھٹکانے والا ہے کھلا''

﴿ ان الشيطان لكم عدو فاتخذوه عدوا ﴾ ''بیشک شیطان تمہارا دشمن ہے اسے دشمن ہی سمجھو''

ان آیات میں شیطان سے بچنے کا حکم دیا گیا ہے کہ وہ تمہارا دشمن ہے اور تمہیں بھٹکانے والا جب تم دشمن کو دشمن سمجھو گے تو اس کے مکر سے محفوظ رہو گے اگر تم نے اسے اپنا یار بنالیا تو ذلیل وخوار ہو جاؤ گے قرآن پاک میں اور بھی بہت مقامات میں شیطان کا ذکر کیا گیا ہے۔ (از قرطبی)

☆ " وقال عبد الله بن عمر ان ابليس موثق في الارض السفلى فاذا تحرك فان كل

شر فی الارض بین اثنین فصا عدا من تحرکه "

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں بیشک شیطان جب سب سے نیچے والی زمین میں ہو اس طرح جیسا کہ اسے مضبوطی سے باندھ دیا گیا ہو تو پھر بھی جب وہ حرکت کرے دو شخصوں کے درمیان یا زیادہ لوگوں کے درمیان واقع ہونے والے فسادات اس کی حرکت کی وجہ سے ہی ہوتے ہیں۔

(قرطبی)

☆ ترمذی نے ابو مالک اشعری سے روایت ذکر کی جس میں رسول اللہ ﷺ کا یہ ارشاد موجود ہے۔

" و آمرکم ان تذکروا اللہ فان مثل ذلک کمثل رجل خرج العدو فی
اثرہ سراعا حتی اذا اتی علی حصن حصین فاحرز نفسہ منھم
کذالک العبد لا یحزر نفسہ من الشیطان الا بذکر اللہ "

(ھذا حدیث حسن صحیح غریب)

اور میں تمہیں حکم دیتا ہوں کہ تم اللہ کا ذکر کرو بیشک اس کی مثال ایسے ہے جیسے کسی شخص کے پیچھے اس کا دشمن جلدی جلدی بھاگے آ رہا ہو یہاں تک کہ وہ شخص ایک مضبوط قلعہ میں آ جائے تو وہ اپنے آپ کو بچا لیتا ہے اسی طرح بندہ اپنے آپ کو شیطان سے سوائے اللہ تعالیٰ کے ذکر کے بچا نہیں سکتا۔

(قرطبی)

یعنی اللہ تعالیٰ کا ذکر شیطان کے مکروفریب سے بچنے کے لئے ایک مضبوط قلعہ کی حیثیت رکھتا ہے جس نے اللہ کا ذکر کیا وہ مضبوط قلعہ میں آ گیا اس نے اپنے آپ کو بچا لیا۔ جو غافل رہا وہ شیطان کی زد میں آ گیا۔

☆☆☆☆☆

﴿ اِنَّمَا یَاْمُرُکُمْ بِالسُّوْٓءِ وَالْفَحْشَآءِ وَاَنْ تَقُوْلُوْا عَلَی اللّٰہِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ﴾

۱) "وہ تو تمہیں یہی حکم دے گا بدی اور بے حیائی کا اور یہ کہ اللہ پر وہ بات جوڑو جس کی تمہیں خبر نہیں"

۲) بیشک وہ تو تمہیں حکم دیتا ہے برائی اور بے حیائی کا اور یہ کہ تم کہو اللہ پر وہ جو تم نہیں جانتے"

اس سے پہلی آیۃ کریمہ میں شیطان کی تابعداری کرنے سے منع فرمایا گیا اور شیطان کی دشمنی کا ذکر کیا گیا اس آیۃ کریمہ میں شیطان کی تابعداری کے نقصانات اور اس کے بھٹکانے کی قسمیں بیان کی جارہی ہیں۔

عداوت کے تین امور (چیزوں) کا ذکر:

(۱) "اولھا السوء وھو متناول جمیع المعاصی سواء کانت تلک المعاصی من افعال الجوارح او من افعال القلوب"

ان میں سے پہلی چیز "اَلسُّوْٓءِ" ہے جو تمام برائیوں کو شامل ہے خواہ ان برائیوں کا تعلق ظاہری اعضاء سے ہو یا وہ باطنی افعال ہوں۔

(۲) "وثانیھا، الفحشاء وھی نوع من السوء لانھا اقبح انواعہ وھو الذی یستعظم ویستفحش من المعاصی"

ان میں دوسری چیز "اَلْفَحْشَآءِ" یہ بھی برائیوں میں برائی ہی ہے لیکن بہت بڑا گناہ اور گناہوں میں سے بے حیائی کا کام ہے۔

(۳) "وثالثھا اَنْ تَقُوْلُوْا عَلَی اللّٰہِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ" وکانہ اقبح انواع الفحشاء لانہ وصف اللہ تعالیٰ بما لا ینبغی من اعظم انواع الکبائر"

ان میں تیسری چیز یہ ہے ﴿ اَنْ تَقُوْلُوْا عَلَی اللّٰہِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ﴾ شیطان تمہیں یہ وسوسہ ڈالے گا کہ تم اللہ تعالیٰ کے لئے وہ کہو جو تم نہیں جانتے۔ یہ اور ہی زیادہ بڑا گناہ اور بڑی بے حیائی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے وہ اوصاف بیان کئے جائیں جو اس کے شان کے لائق نہیں۔ (از کبیر)

جو چیزیں اللہ تعالیٰ نے حرام نہیں کیں ان کو حرام کہہ کر اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کرنا کہ یہ اللہ تعالیٰ نے حرام کی ہیں اوراس طرح حرام چیزوں کے متعلق یہ کہنا کہ یہ اللہ تعالیٰ نے حلال کر دی ہیں یہ شیطانی جال ہے اور اللہ تعالیٰ کی اولاد ماننا، اور اللہ تعالیٰ کا عام جسموں کی طرح جسم ماننا، اور اللہ تعالیٰ کو معاذ اللہ معطل ماننا تمام شیطانی مکروفریب ہیں۔ (راقم)

شیطان کے حکم دینے کا مطلب: شیطان انسانوں کے دلوں میں وسوسہ ڈالتا ہے جس طرح کوئی آہستہ آہستہ کلام کر کے کسی کو ورغلائے اس کے وسوسہ میں بھی آہستہ کلام ہوتی ہے اگر چہ اسے کوئی سنتا نہیں لیکن اس کا اثر ہوتا ہے۔

☆ حدیث صحیح میں وارد ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا " **ان الشیطن یجری من ابن آدم مجری الدم** " بیشک شیطان انسان میں اس طرح اثر انداز ہوتا ہے جس طرح انسان میں خون کا دوران ہوتا ہے۔ (از خازن)

☆ " **عن ابن مسعود قال قال رسول اللہ ﷺ ان للشیطن لمۃ بابن آدم وللملک لمۃ فاما لمۃ الشیطن فایعاد بالشر وتکذیب بالحق واما لمۃ الملک فایعاد بالخیر وتصدیق بالحق فمن وجد ذلک فلیعلم انہ من اللہ فلیحمد اللہ ومن وجد الاخری فلیتعوذ باللہ من الشیطن ثم قرأ الشیطن یعدکم الفقر ویامرکم بالفحشاء** " (رواہ الترمذی)

حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ انسان پر شیطان کا بھی اثر ہے اور فرشتے کا بھی اثر ہوتا ہے شیطان کا اثر یہ ہے کہ ان کو وہ شر کاموں میں لگا دیتا ہے اور حق کی تکذیب کرتا ہے اور انسان پر فرشتے کا اثر یہ ہے کہ وہ نیکی کے کاموں پر لگا دیتا ہے اور حق کی تصدیق کرتا ہے۔ پھر آپ نے (بطور دلیل) پڑھا ﴿اَلشَّیْطَانُ یَعِدُکُمُ الْفَقْرَ وَیَاْمُرُکُمْ بِالْفَحْشَاءِ﴾ شیطان تمہیں (اللہ کی راہ میں مال خرچ کرنے سے) فقر سے ڈراتا ہے (غریب ہو جاؤ گے) اور تمہیں بے حیائی کا حکم دیتا ہے۔

☆ " **وفی حدیث ابن عباس قولہ ﷺ الحمد للہ الذی رد امرہ الی الوسوسۃ** " (رواہ ابو داؤد)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا نبی کریم ﷺ نے فرمایا سب تعریفیں اللہ تعالیٰ کی جس

نے شیطان کے امر کو وسوسہ کی طرف پھیر دیا۔ (مظھری)

یعنی شیطان لازمی طور پر حکم نہیں دے سکتا بلکہ صرف دل میں وسوسہ ڈال سکتا ہے اسی لئے اللہ تعالیٰ کے نیک بندوں پر اس کا داؤ نہیں چلتا اگر وہ لازمی طور پر حکم چلانے کی صلاحیت رکھتا تو سب کو بھٹکا تا رہتا۔ اسی حدیث پاک سے یہ واضح ہو گیا کہ آیۃ کریمہ میں شیطان کے حکم دینے سے مراد اس کا وسوسہ ڈالنا ہے۔

تنبیہ : ﴿اِنَّمَا﴾ کا معنی " ما الا " والا ہوتا ہے جو حصر کا فائدہ دیتا ہے اس کے معنی کو اس طرح بیان کیا جاتا ہے سوائے اس کے کہ نہیں اعلیٰ حضرت کے ترجمہ سے یہ بخوبی واضح ہے۔ اسی سے پتہ چل گیا کہ شیطان ہمیشہ برائیوں کا حکم دیتا ہے نیکی کی راہ پر نہیں چلاتا ہاں البتہ بعض عارفین نے کہا کہ کبھی نیکی کی راہ پر بظاہر چلاتا ہے لیکن مقصد اس کا شر ہوتا ہے۔ جیسا کہ ایک نیکی کا کام افضل (زیادہ فضیلت والا) ہو اور دوسرا کام فاضل (فضیلت والا) ہو لیکن زیادہ فضیلت والا نہ ہو۔ تو شیطان کبھی افضل سے ہٹا کر فاضل کی طرف لگا دیتا ہے حالانکہ فاضل بھی نیکی کا کام ہی ہوتا ہے لیکن اس کے بعد فاضل کام چھڑا کر شر کی طرف لے جانا اس کے لئے آسان ہو جاتا ہے۔

اور کبھی فاضل آسان سے ہٹا کر افضل مشکل کی طرف لے جاتا ہے تا کہ اس شخص کو دین سے نفرت ہو جائے عام لوگوں پر اس طرح یہ کامیابی حاصل کر لیتا ہے لیکن اللہ تعالیٰ کے مقبول بندوں پر اس کا داؤ نہیں چلتا بلکہ وہ افضل مشکل کام کو ترجیح دیتے ہیں۔ (ماخوذ از کبیر)

مقام توجہ: فلاسفہ اور صوفیاء ملک (فرشتہ) جو خیر کی طرف دعوت دیتا ہے اسے قوۃ عقلیہ کہتے ہیں اور شیطان جو شر کی طرف دعوت دیتا ہے اسے قوۃ غضبیہ اور قوۃ شہویہ کہتے ہیں (از کبیر)

السوء کا لغوی معنی: " ساء یسوء سوءا (بفتح السین) مساءۃ " غم میں ڈالنا۔ گناہ چونکہ انسان کو برے انجام کی وجہ سے غم میں ڈالتے ہیں اس لئے گناہ کو " سوء " کہا جاتا ہے۔ (قرطبی)

"الفحشاء" کا لغوی معنی قبیح المنظر (بدصورت) جیسا کہ کہا گیا ہے " **وجید کمجید الریم لیس بفاحش** " (اور اس کی گردن ہرن کی گردن کی طرح ہے بدصورت نہیں) پھر برے مقاصد کے لئے "الفحشاء" بولتے ہیں۔

وَاِذَا قِيْلَ لَهُمُ اتَّبِعُوْا مَا اَنْزَلَ اللّٰهُ قَالُوْا بَلْ نَتَّبِعُ مَا اَلْفَيْنَا عَلَيْهِ آبَاءَنَا اَوَلَوْ كَانَ آبَاؤُهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ شَيْئًا وَّلَا يَهْتَدُوْنَ

۱) ''اور جب ان سے کہا جائے اللہ کے اتارے پر چلو تو کہیں بلکہ ہم تو اس پر چلیں گے جس پر اپنے باپ دادا کو پایا کیا اگرچہ ان کے باپ دادا نہ کچھ عقل رکھتے ہوں نہ ہدایت''۔

۲) ''اور جب کہا جاتا ہے ان کو تابعداری کرو اس چیز کی جو نازل کی ہے اللہ نے وہ کہتے ہیں بلکہ تابعداری کرتے ہیں ہم اس چیز کی پایا ہم نے جس پر اپنے باپ دادوں کو کیا جب کہ ان کے باپ دادے نہیں سمجھتے ہیں کچھ چیز اور نہ ہی ہدایت (سیدھی راہ) پر ہیں۔

وَاِذَا قِيْلَ لَهُمُ اتَّبِعُوْا مَا اَنْزَلَ اللّٰهُ: اور جب کہا جاتا ہے ان کو تابعداری کرو اس چیز کی جو نازل کی ہے اللہ نے یہ کن لوگوں سے کہا گیا؟ اس میں تین احتمال ہیں کہ " لھم " میں ضمیر کا مرجع کیا ہے

(۱) اس میں ایک احتمال یہ ہے کہ ضمیر " من " کی طرف لوٹے جو ﴿ مَنْ يَّتَّخِذُ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَنْدَادًا ﴾ میں ہے معنوی لحاظ پر " من " میں عموم پایا جاتا ہے اس لئے جمع کی ضمیر لوٹانا درست ہے۔ مراد اس سے مشرکین ہیں یعنی مشرکین کو کہا گیا کہ تم اس چیز کی تابعداری کرو جو اللہ تعالیٰ نے نازل کی تو وہ کہتے ہیں ہم تو اس چیز کی تابعداری کرتے ہیں جس پر ہمارے آباء واجداد (باپ دادے) تھے۔

(۲) دوسرا احتمال یہ ہے کہ ﴿ يَا اَيُّهَا النَّاسُ ﴾ میں جو " الناس " ہے ضمیر اس کی طرف لوٹ رہی ہے پہلے تو خطاب کر کے ان کو حکم دیا گیا۔ اب لوگوں میں سے جو قرآن پاک کے احکام سے عدولی کر کے اپنے آباء واجدا کے دین پر چلنے والے کافر تھے ان کی طرف غائب کی ضمیر لوٹا کر قاعدہ التفات پر عمل کرتے ہوئے عقلاء کو گویا کہ خطاب کرتے ہوئے یوں کہا ﴿ انظروا الی ھؤلاء الحمقی ماذا یقولون ﴾ ان بیوقوفوں کو دیکھو یہ کیا کہتے ہیں۔

(۳) تیسرا احتمال یہ ہے کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا ارشاد یہ ہے کہ یہ آیت کریمہ یہود کے متعلق نازل ہوئی جب ان کو نبی کریم ﷺ نے دعوت اسلام دی تو انہوں نے کہا" نتبع ما وجدنا

علیہ آباء نا فھم کانوا خیرا منا واعلم منا " ہم تو اس چیز کی تابعداری کرتے ہیں جس پر ہم نے اپنے آباء واجداد کو پایا وہ ہم سے بہتر تھے اور ہم سے زیادہ علم رکھتے تھے۔ (از کبیر)

راقم کے نزدیک تمام صورتیں مجموعی طور پر آیۃ کریمہ کا شان نزول ہیں۔

قَالُوا بَلْ نَتَّبِعُ مَا اَلْفَیْنَا عَلَیْهِ آبَاءَ نَا:

وہ کہتے ہیں بلکہ تابعداری کرتے ہیں ہم اس چیز کی پایا ہم نے جس پر اپنے باپ دادوں کو۔

یہ جملہ ان کے حال ماضی کی حکایت ہے اسی وجہ سے ترجمہ راقم نے حال والا کیا ہے۔ یعنی وہ کہتے کہ ہم تو اپنے آباء واجداد کے دین پر ہیں وہ بت پرستی کرتے تھے تو ہم بھی بت پوجتے ہیں جن چیزوں کو وہ حلال کہتے رہے ہم تو وہی حلال مانتے ہیں اور جن کو وہ حرام کہتے رہے ہم صرف ان چیزوں کو ہی حرام کہتے ہیں ہمیں کیا غرض ہے اس چیز سے جو اللہ تعالیٰ نے نازل کی۔

طلباء کرام توجہ فرمائیں: " بـــل " اضراب کے لئے آتا ہے جب ان کو کہا گیا تم اس چیز کی تابعداری کرو جو اللہ تعالیٰ نے نازل کی تو انہوں نے کہا ہم ایسا نہیں کریں گے بلکہ ہم تو اسی چیز کی تابعداری کرتے ہیں جس چیز پر ہم نے اپنے آباء واجداد کو پایا۔ ﴿ اَلْفَیْنَا ﴾ کا معنی ہے " وجدنا " ہم نے پایا چونکہ دوسری جگہ صراحۃً لفظ " وَجَدْنَا " آیا ہوا ہے۔

﴿ بَلْ نَتَّبِعُ مَا وَجَدْنَا عَلَیْهِ آبَاءَ نَا ﴾

''بلکہ ہم تو تابعداری کرتے ہیں اس چیز کی جس پر پایا ہم نے اپنے آباء واجداد کو''

اَوَلَوْ کَانَ آبَاؤُهُمْ لَا یَعْقِلُوْنَ شَیْأً وَّلَا یَهْتَدُوْنَ:

کیا جب کہ ان کے باپ دادے نہیں سمجھتے ہیں کچھ چیز اور نہ ہی ہدایت (سیدھی راہ) پر ہیں:

" الواو للحال والهمزة بمعنى الرد والتعجب معناه ايتبعونهم ولو كان آبا نهم لا يعقلون شيا من الدين ولا يهتدون للصواب "

واؤ حال کے لئے ہے ہمزہ استفہام انکاری کیلئے ہے ان (کی حماقت) پر تعجب کرتے ہوئے کہا گیا ہے ان پر تعجب ہے کیا وہ تابعداری کرتے ہیں اپنے آباء واجداد کی جب کہ ان کے آباء واجداد دین کی کسی چیز کو سمجھتے نہیں اور سیدھی راہ پر قائم نہیں۔ (مدارک)

مدارک کی اس تفسیر کے مطابق راقم نے ترجمہ کیا ہے کبیر میں واؤ کو عطف کے لئے بنایا گیا ہے۔اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ کا ترجمہ اس کے مطابق ہے۔ اگرچہ مدارک کی تفسیر کے مطابق اعتراض وجواب کی گنجائش نہیں تاہم زیادتی وضاحت کے لئے علامہ رازی رحمہ اللہ کے اعتراض وجواب کو ذکر کیا جاتا ہے۔

﴿ لا یعقلون شیا ﴾ لفظ عام ومعناه الخصوص لانهم کانوا یعقلون کثیرا من امور الدنیا فهذا یدل علی جواز ذکر العام مع ان المراد به الخاص فالمراد انهم لا یعلمون شیا من الدین " (کبیر)

یعنی اگر کوئی یہ اعتراض کرے کہ ﴿ لَا یَعْقِلُوْنَ شَیْاً ﴾ (وہ نہیں سمجھتے کچھ چیز) کا کیا مطلب ہے جب کہ وہ دنیاوی معاملات کثیر مقدار میں جانتے تھے تو اس کا جواب یہ دیا گیا ہے کہ لفظ عام بول کر خاص مراد لینا عربی قانون میں جائز ہے یہاں بھی ذکر عام ہے اور مراد خاص ہے یعنی مراد یہ ہے کہ وہ دین کے معاملہ میں کچھ بھی نہیں جانتے تھے۔ (از کبیر)

تقلید کے متعلق علامہ قرطبی رحمہ اللہ کا ارشاد:

" تعلق قوم بهذه الآیة فی ذم التقلید لذم الله تعالیٰ الکفار باتباعهم لآبائهم فی الباطل واقتدائهم بهم فی الکفر والمعصیة وهذا فی الباطل صحیح ، اما التقلید فی الحق فاصل من اصول الدین وعصمة من عصم المسلمین یلجا الیها الجاهل المقصر عن درک النظر "

بعض لوگوں نے اس آیۃ کریمہ کو تقلید کی مذمت پر چسپاں کیا ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے کفار کی مذمت اسی وجہ سے اس آیۃ کریمہ میں بیان کی ہے کہ وہ باطل نظریات میں اپنے آباء واجداد کی تقلید کرتے تھے اور کفر ومعصیت میں ان کی اقتداء کرتے تھے۔ اگر اس دلیل کا مطلب کفر کی حد تک ہو تو صحیح ہے یعنی کافروں کی تقلید ناجائز اور حرام ہے۔ لیکن حق میں تقلید تو دین کے اصول میں سے ایک اصل ہے (یعنی دین کے قوانین میں سے ایک قانون ہے) اور مسلمانوں کو باطل راہ پر چلنے سے بچانے کا ایک خاص ذریعہ ہے جاہل لوگ جو خود مسائل میں علم اور نظر وفکر نہیں رکھتے۔ وہ مجتہدین کرام کی محنتوں سے

فائدہ اٹھا لیتے ہیں اور ان کے علم کی آغوش میں بھٹکانے والوں سے بچ کر پناہ لے لیتے ہیں۔

تقلید کا معنی: " وھو فی اللغة ماخوذ من قلادة البعیر " یہ لغت میں اونٹ کے قلادہ (گلے کی رسی) سے ماخوذ ہے اصطلاح میں " التقلید عندنا حقیقته قبول قول بلا حجة " تقلید ہمارے نزدیک اس کی حقیقت یہ ہے کہ کسی کے قول کو بغیر کسی حجت کے قبول کرلیا جائے۔

تقلید فروع میں: " واما جوازه فی مسائل الفروع فصحیح " فروع (مسائل واحکام) میں تقلید صحیح ہے۔

اصول میں صحیح یہ ہے تقلید نہیں: " واختلف العلماء فی جواز فی مسائل الاصول " اصول یعنی عقائد میں تقلید کے پائے جانے یا نہ پائے جانے میں اختلاف ہے بعض حضرات کے نزدیک توحید میں تقلید صحیح ہے لیکن یہ قول درست نہیں اس لئے کہ توحید " لا یحصل الا من جهة الکتاب والسنة " نہیں ہوتی سوائے کتاب اور سنت کے۔

عقائد میں تقلید کے متعلق صحیح اور درست قول یہ ہے " قال ابن عطیة اجمعت الامة علی ابطال التقلید فی العقائد " ابن عطیہ نے کہا امت کا اس مسئلہ میں اجماع ہے کہ عقائد میں تقلید باطل ہے۔

تقلید کے مخالفین ٹیڑھے ہیں: علامہ قرطبی رحمہ اللہ نے تقلید کے مخالفین کو " اھل الزیغ " (ٹیڑھی راہ پر چلنے والے) کہا ہے اور بیان کیا ہے کہ انہوں نے دلائل قرآن پاک کی ان آیات سے پیش کئے ہیں۔ ﴿ رَبَّنَا اِنَّا اَطَعْنَا سَادَتَنَا وَکُبَرَاءَ نَا فَاَضَلُّوْنَا السَّبِیْلَا ﴾

" اے ہمارے رب ہم اپنے سرداروں اور اپنے بڑوں کے کہنے پر چلے تو انہوں نے ہمیں راہ سے بہکا دیا" (الاحزاب ۶۷)

﴿ بَلْ قَالُوْا اِنَّا وَجَدْنَا آبَاءَ نَا عَلٰی اُمَّةٍ وَّاِنَّا عَلٰی آثَارِھِمْ مُّھْتَدُوْنَ ☆ وَکَذٰلِکَ مَا اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِکَ فِیْ قَرْیَةٍ مِّنْ نَّذِیْرٍ اِلَّا قَالَ مُتْرَفُوْھَا اِنَّا وَجَدْنَا آبَاءَ نَا عَلٰی اُمَّةٍ وَّاِنَّا عَلٰی آثَارِھِمْ مُّقْتَدُوْنَ ☆ قٰلَ اَوَلَوْ جِئْتُکُمْ بِاَھْدٰی مِمَّا وَجَدْتُّمْ عَلَیْهِ آبَاءَ کُمْ قَالُوْا اِنَّا بِمَا اُرْسِلْتُمْ بِهٖ کٰفِرُوْنَ ☆ فَانْتَقَمْنَا مِنْھُمْ فَانْظُرْ کَیْفَ کَانَ عَاقِبَةُ الْمُکَذِّبِیْنَ ﴾ (الزخرف، ۲۲ تا ۲۵)

بلکہ بولے ہم نے اپنے باپ دادا کو ایک دین پر پایا اور ہم ان کی لکیر پر چل رہے ہیں اور ایسے ہی ہم نے تم سے پہلے جب کسی شہر میں کوئی ڈر سنانے والا بھیجا وہاں کے آسودہ حال والوں نے یہی کہا کہ ہم نے اپنے باپ دادا کو ایک دین پر پایا اور ہم ان کی لکیر کے پیچھے ہیں۔ نبی نے فرمایا اور کیا جب بھی کہ میں تمہارے پاس وہ لاؤں جو سیدھی راہ ہو اس سے جس پر تمہارے باپ دادا تھے بولے جو کچھ تم لے کر بھیجے گئے ہم اسے نہیں مانتے۔ تو ہم نے ان سے بدلہ لیا تو دیکھو جھٹلانے والوں کا کیسا انجام ہوا''

(کنز الایمان)

ان مندرجہ بالا آیات سے دلیل پکڑنا باطل ہے کیونکہ یہ کفار کے حق میں نازل ہیں کافروں کی اپنے آباء واجداد اور اپنے سرداروں اور بڑوں کی تقلید کفر ہی تھی کیونکہ جن کی وہ تقلید کر رہے تھے وہ بھی کافر ہی تو تھے۔ " واولئک نسبوا افکھم ای اھل الا باطیل فازدادوا فی التضلیل " ان لوگوں نے اپنے چھوٹے عقائد باطل راہ پر چلنے والوں کی طرف منسوب کئے اسلئے یہ اور زیادہ بھٹک گئے۔

نیک لوگوں کی تابعداری: انبیاء کرام کی (اور نیک لوگوں کی یعنی ائمہ مجتہدین کی) تابعداری "وھو الدین الخالص الذی ارتضاہ اللہ" وہ خالص دین ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے پسند فرمایا ہے " کان اتباعہ آباء ہ من صفات المدح " اس قسم کے آباء واجداد کی اتباع کی رب تعالیٰ نے تعریف فرمائی جیسا کہ حضرت یوسف علیہ السلام کے کلام کا ذکر قرآن پاک میں فرمایا:

﴿ اِنِّیْ تَرَکْتُ مِلَّةَ قَوْمٍ لَّا یُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰہِ وَھُمْ بِالْآخِرَةِ ھُمْ کٰفِرُوْنَ ☆ وَاتَّبَعْتُ مِلَّةَ آبَائِیْ اِبْرَاھِیْمَ وَاِسْحَاقَ وَیَعْقُوْبَ مَاکَانَ لَنَا اَنْ نُّشْرِکَ بِاللّٰہِ مِنْ شَیْءٍ ذٰلِکَ مِنْ فَضْلِ اللّٰہِ عَلَیْنَا وَعَلَی النَّاسِ ﴾ (یوسف ۳۷، ۳۸)

بیشک میں نے ان لوگوں کا دین نہ مانا جو اللہ پر ایمان نہیں لاتے اور وہ آخرت سے منکر ہیں اور میں نے اپنے باپ دادا ابراہیم اور اسحاق اور یعقوب کا دین اختیار کیا ہمیں نہیں پہنچتا کہ کسی چیز کو اللہ کا شریک ٹھہرائیں یہ اللہ کا فضل ہے ہم پر اور لوگوں پر۔ (کنز الایمان) (بحث ماخوذ از قرطبی)

نوٹ: اس مسئلہ کی زیادہ وضاحت کیلئے جس سے عوام اور طلباء کرام یکساں فائدہ حاصل کریں اپنے رسالہ ''فقہ اور امام اعظم'' کو یہاں شامل کر رہا ہوں تا کہ مسئلہ نکھر کر واضح ہو جائے۔

﴿بِسْمِ اللهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ﴾

" الحمد لله رب العلمين ☆ والصلوة والسلام علی رسوله رحمة للعلمين ☆ وعلی اله وصحابه اجمعين"

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

" فقيه واحد اشد علی الشيطان من الف عابد" (ترمذی، ابن ماجه، مشکوة کتاب العلم

یعنی ایک فقیہ شیطان پر ہزار عابد سے زیادہ سخت ہوتا ہے۔

ہزار عابد سے مراد معین تعداد نہیں بلکہ "المراد الکثرة" مراد کثیر عبادت گذار لوگ ہیں خواہ ہزار سے زائد ہی کیوں نہ ہوں، ایک فقیہ کثیر عابدوں کی بنسبت شیطان پر سخت اور بھاری کیوں ہے؟ اس لئے کہ جب شیطان مکر وفریب کے دروازے کھولتا ہے تو فقیہ اسے جانتا ہے وہ اپنی تقریر وتحریر کے ذریعے دوسرے لوگوں کو بھی اس کے مکر وفریب سے آگاہ کرتا ہے اس طرح وہ شیطانی راستے کو بند کرتا ہے کیونکہ جب لوگ شیطان کے جال میں نہیں پھنستے تو وہ رسوا ہو جاتا ہے۔

لیکن عابد اپنی عبادت میں مشغول رہتا ہے اسکی توجہ ہی شیطانی مکر وفریب کی طرف نہیں ہوتی، اس لئے وہ تو خود شیطانی جال کی زد میں ہوتا ہے دوسروں کو کیا بچائے گا خیال رہے کہ فقیہ یعنی عالم سے مراد باعمل عالم ہے اور عابد سے مراد بے علم عابد ہے۔

اعتراض: اس حدیث کے متعلق تو طبرانی نے لکھا ہے "سنده ضعيف وله شواهد اسانيدها ضعيفة" اس کی سند ضعیف ہے اور اس کے ضعیف ہونے پر کثیر شواہد پائے جاتے ہیں؟

جواب: طبرانی نے اگر چہ اسی حدیث کے متعلق لکھا ہے لیکن سند اس کی دوسری ہے وہ بیہقی نے شعب میں اور طبرانی نے اوسط میں ذکر کی ہے جسکی سند حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ تک پہنچتی ہے۔

ملا علی قاری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

" لكن كثرة طرقه تخرجه من الضعف خصوصا حيث اعتضده برواية الترمذی وابن ماجه عن ابن عباس "

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث بے شک راویوں کے لحاظ سے ضعیف ہے لیکن

کثرت طرق کی وجہ سے ضعف سے خارج بلکہ حسن لغیرہ ہے خصوصا جب اس کو تائید حاصل ہے ترمذی اور ابن ماجہ کی روایت سے جو حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے۔ واضح ہوا کہ حضرت ابن عباس کی سند سے مروی حدیث نے تو حضرت ابو ہریرہ سے مروی حدیث کو بھی ضعف سے نکال دیا ہے، یہ خود ضعیف نہیں۔ (مرقاۃ جلد ۱ ص ۲۸۴)

اجتہاد کے درجہ کا علم فرض کفایہ ہے:

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

" طلب العلم فريضة على كل مسلم ومسلمة "

ہر مسلمان پر علم کا حاصل کرنا فرض ہے۔ ہر مسلمان پر جس علم کا حاصل کرنا فرض عین ہے یہ وہ علم ہے کہ جس کے بغیر کوئی چارہ کار ہی نہیں۔ جس طرح اللہ تعالیٰ کے موجود ہونے، خالق ہونے کا علم، اس کی وحدانیت کا علم اور اس کے رسولوں کی نبوت کا علم، اور نماز کی کیفیت کا علم فرض عین ہے یعنی یہ باتیں ہر شخص کو جاننا ضروری ہیں اگر کوئی ان چیزوں سے بے خبر رہا تو گناہگار ہوگا۔

"واما بلوغ رتبة الاجتهاد والفتيا ففرض كفاية " (از مرقاۃ ج ۱ ص ۲۸۴)

یعنی اجتہاد اور فتوی دینے کی حد تک علم حاصل کرنا فرض کفایہ ہے۔ تقریبا ستاون میل کے اندر کوئی ایک بھی ایسا عالم پایا جائے جو تفصیلی علم رکھتا ہو تو دوسرے لوگ گنہگار نہیں ہونگے ورنہ تمام گناہگار ہونگے۔

اس سے واضح ہوا کہ تفصیلی علم حاصل کرنا ہر شخص پر فرض نہیں لیکن مسائل کا خود علم نہ رکھنے کی وجہ سے مجتہد عالم کی طرف رجوع کرنا ضروری ہوگا۔

فائدہ: " فان قيل ما الفرض قبل الفرض فقل العلم قبل العمل وان قيل ماالفرض فى الفرض فقل الاخلاص فى العلم والعمل وان قيل ما الفرض بعد العمل فقل الخوف والرجاء ' (مرقاۃ ج ۱ ص ۲۸۴)

اگر کہا جائے کہ فرض سے پہلے کیا فرض ہے تو تم کہو عمل سے پہلے علم یعنی فرض دونوں ہی ہیں لیکن علم پہلے اور عمل بعد میں) اگر کہا جائے کہ فرض میں فرض کیا ہے تو تم کہو علم اور عمل میں خلوص (یعنی جس طرح علم اور عمل فرض ہیں اسی طرح ان میں خلوص بھی فرض ہے) اگر کوئی کہے عمل کے بعد کیا چیز فرض ہے تو تم کہو خوف اور امید (یعنی عمل بھی فرض ہے اور عمل کے بعد یہ

بھی فرض ہے کہ انسان بخشش کی امید بھی رکھے اور اللہ تعالے کے عذاب سے ڈرتا بھی رہے، یہ امید وبیم بھی فرض ہے۔

فقہ کیا ہے؟

فقہ کالغوی معنی ہے ''سمجھنا'' اور اہل شرع کے نزدیک فقہ ایک خاص علم کا نام جسکی تعریف یہ ہے:

" الفقة هو العلم الحاصل بجملة من الاحكام الشرعية الفرعية بالنظر والاستدلال" (مقدمہ نورالانوار)

فقہ وہ علم ہے کہ نظر واستدلال سے تمام احکام شرعیہ فروعیہ حاصل ہوں۔

فقہ کی تعریف میں لفظ علم استعمال کیا گیا ہے یہ بمعنی یقین کے ہے یعنی جس کے ذریعے احکام شرعیہ فروعیہ کا یقین حاصل ہو اگر گمان حاصل ہوا تو وہ حقیقی معنی کے لحاظ سے فقہ نہیں اگرچہ مجازاً اسے فقہ کہہ لیا جاتا ہے۔ اور یہ بیان کیا ہے کہ تمام احکام کا علم حاصل ہو اسلئے کہ اگر کسی کو ایک دو مسئلے آجائیں تو اس کے علم کو فقہ نہیں کہا جائے گا۔

یہ کہا گیا کہ احکام بھی شرعی ہوں، اس لئے کہ اگر عقلی یا حسی اشیاء کا علم حاصل ہو جائے تو اسے فقہ نہیں کہتے۔ فروعیہ کہا گیا ہے جسکا مطلب ہے کہ وہ علم جو خود دلیلوں کے حجت ہونے کا ہے یعنی قرآن سنت (حدیث)، اجماع اور قیاس دلائل فقہ ہیں اس چیز کے جاننے کا نام فقہ نہیں بلکہ ان سے حاصل ہونے والے مسائل کا نام فقہ ہے نیز اصولی اشیاء کا علم بھی فقہ نہیں توحید باری تعالیٰ رسالت ونبوت، قیامت کا علم جنت ودوزخ وغیرہ اس قسم کے عقائد کا علم فقہ نہیں۔

فقیہ کون ہے؟

"ولم يطلق الفقيه الاعلى المستنبطين منهم يعنى يشترط لهم ملكة الاستنباط الصحيح وهو ان يكون مقرونا بشرائطه " (ازتوضیح)

یعنی فقیہ وہ ہوگا جسے تمام احکام شرعیہ فرعیہ کے استنباط صحیح کا ملکہ حاصل ہو اور استنباط صحیح کی تمام شرائط پائی جائیں یعنی مجتہد ہو اور اجتہاد کی شرائط اسمیں پائی گئی ہوں۔

وشرط الاجتهاد ان يحتوى علم الكتاب بمعانيه اللغوية والشرعية ووجوهه التى

قلنا من الخاص والعام والامر والنهی وسائر الاقسام السابقة وعلم السنة بطرقها المذکورة وان یعرف وجوه القیاس بطرقها وشرائطها۔ (از منار و نورالانوار ص ۲۴۲)

اجتہاد کی شرط یہ ہے کہ کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ ﷺ کے معانی لغویہ اور شرعیہ پر انسان حاوی ہو اور اصول فقہ کے تمام ضوابط یعنی خاص، عام، مشترک، ماؤل، ظاہر، نص، مفسر، محکم، خفی، مشکل، مجمل، متشابہ، حقیقت، مجاز، صریح، کنایہ، عبارۃ النص، دلالۃ النص، اشارۃ النص، اقتضاء النص، اور امر و نہی وغیرہ کو جانتا ہو، اور تمام طریقوں کا علم اسے سنت میں بھی حاصل ہو جیسے قرآن پاک کا علم ان طریقوں کے مطابق ہونا ضروری ہے نیز قیاس کے تمام طریقے اور انکی شرائط کو جانتا ہو۔

خیال رہے کہ جو مسائل کتاب و سنت و اجماع سے ثابت ہوں ان میں قیاس و اجتہاد نہیں ہوگا البتہ ایک مسئلہ مختلف احادیث سے مختلف طریقوں سے ثابت ہو رہا ہو تو ان احادیث میں تطبیق دینا اور مسئلہ کا استنباط کرنا مجتہد کا کام ہے اسی طرح قرآن پاک کی آیت اور حدیث میں اگر بظاہر تعارض نظر آ رہا ہو تو اس تعارض کو ختم کرنے کے لیئے اجتہاد ہوگا۔

اسلام کے پہلے فقیہ و مجتہد:

رسول اللہ ﷺ کے صحابی حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ ہیں آپ سے پوچھا گیا کہ ایک عورت کا خاوند جماع سے پہلے ہی فوت ہو گیا اور نکاح کے وقت اسکا مہر بھی مقرر نہیں کیا گیا تھا اسکا کیا حکم ہے یعنی وہ عورت کتنا مہر لینے کی حقدار ہے؟ آپ نے فرمایا:

" اجتهد فیها برایی ان اصبت فمن الله وان اخطات فمنی ومن الشیطان "

میں اپنی رائے سے اس میں اجتہاد کروں گا اگر میں نے درست بیان کر دیا تو یہ اللہ تعالیٰ کا فضل اور مہربانی ہوگی اور اگر میں نے اس میں غلط فیصلہ کیا تو میرے اجتہاد میں میری اپنی ہی غلطی ہوگی یا شیطان کی طرف سے شک ڈالا گیا ہوگا۔

آپ نے اس مسئلہ میں ایک ماہ تک اجتہاد کرنے کے بعد یہ فیصلہ صادر فرمایا "اری لها مهر مثل نسائها لا وکس ولا شطط" میں نے اپنے اجتہاد سے یہ مسئلہ حاصل کیا کہ اسکا مہر اس کے خاندان کی اس جیسی عورتوں کی مثل ہوگا یعنی وہ مہر مثل کی حقدار ہے نہ اس سے کچھ کم ہوگا اور نہ زائد۔

آپ کا یہ قول سنکر ایک صحابی نے کہا کہ حضور ﷺ نے بھی ایک عورت کے متعلق یہی فیصلہ کیا تھا۔ یہ سن کر عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ بہت خوش ہوئے کہ میرا اجتہاد نبی کریم ﷺ کے فیصلہ کے مطابق ہوگیا کیونکہ آپ نے پہلے اس مسئلہ کے متعلق کسی سے نہیں سنا تھا کہ نبی کریم ﷺ نے بھی اس میں کوئی حکم فرمایا ہے۔

" وکان ذالک بمحضر من الصحابة ولم ینکر علیه احد منهم"

حضرت ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے یہ اجتہاد کئی صحابہ کرام کی موجودگی میں فرمایا اور کسی نے انکار نہیں کیا لہٰذا اس مسئلہ پر اجماع صحابہ ہوگیا کہ اجتہاد کیا جا سکتا ہے، اور اجتہاد میں غلطی کا بھی گمان ہوسکتا ہے اور اجتہاد صحیح بھی ہوسکتا ہے۔

مجتہد کو اجتہاد کرنیکا ثواب ہر حالت میں حاصل ہوگا اگر درست فیصلہ ہوا تو دو ثواب حاصل ہونگے ایک اجتہاد کا، اور دوسرا درست فیصلے کا اور اگر خطا ہوگئی تو بھی اجتہاد کا ثواب ضرور حاصل ہوا۔
(از نور الانوار ص ۲۴۶)

عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے بعد کے فقہاء کرام:

حضرت ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے بعد مزید فقہ کی مزید وضاحت حضرت علقمہ بن قیس نے کی، یہ ابراہیم نخعی کے ماموں ہیں۔ نبی کریم ﷺ کی ظاہری حیات میں ہی پیدا ہوگئے تھے انہوں نے حضرت ابن مسعود، حضرت علی، حضرت ابوالدرداء اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہم سے علم حاصل کیا اور ان سے ہی قرآن پاک پڑھا۔ ان کے بعد ابراہیم بن یزید نخعی نے مختلف فوائد ونوادر جمع کیے اور ان کے بعد مزید وضاحت اور چھان بین حضرت حماد مسلم کوفی نے کی۔

ان کے بعد اثر اصول وضوابط امام الائمہ سراج الامۃ حضرت امام اعظم ابوحنیفہ نعمان بن ثابت رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے مرتب فرمائے، سب سے پہلے فقہ کو تدوین کرنے والے آپ ہی ہیں آپ نے ہی فقہ کی کتب کو کتاب باب وغیرہ میں مرتب فرمایا اور آج تک اسی پر فقہی کتب مرتب ہو رہی ہیں خیال رہے کہ امام مالک رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے بھی اپنے مؤطا میں امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ کی ترتیب ہی کی

تابعداری کی ہے۔ کتاب الفرائض اور کتاب الشروط کو بھی سب سے پہلے مرتب کرنے والے امام اعظم ہی ہیں، آپ کے بعد امام ابو یوسف رحمہ اللہ تعالیٰ نے امام صاحب کے بیان کردہ اصول وضوابط میں مزید نظر فرمائی اور فروع کا استنباط کیا ان کے بعد مزید وضاحت اور استنباط امام محمد بن حسن شیبانی رحمۃ اللہ تعالیٰ نے کیا۔ (شامی جلد ۱ ص ۳۵)

تقلید کیا ہے؟

" التقليد اتباع الرجل غيره فيما يقول او في فعله على زعم انه محق بلانظر في الدليل فكان المقلد جعل قول الغير او فعله قلادة في عنقه كذافي مختصر المنار "

(حاشیہ نور الانوار ص ۲۱۶)

تقلید کا لغوی معنی ہے گردن میں قلادہ یعنی پٹا ڈالنا۔ اور اصطلاحی معنی یہ ہے کہ غیر کے قول اور فعل کی تابعداری کرنا یہ قوی اور غالب گمان کرتے ہوئے کہ اس شخص کا قول اور فعل حق ہے اس کے دلائل کو بھی نہ دیکھا جائے کہ اس کے دلائل کس درجہ کے ہیں لغوی اور اصطلاحی معنی میں مطابقت واضح ہے کہ تقلید کرنے والے نے گویا اپنے گلے میں غیر کے قول وفعل کا قلادہ ڈال لیا ہے۔

تقلید صرف مجتہد کی ہوگی:

صاحب منار نے تحریر فرمایا ہے "تقليد الصحابي واجب يترك به القياس" صحابی کی تقلید واجب ہے اس کے ذریعے قیاس کو چھوڑ دیا جائیگا۔ اس عبارت کی وضاحت میں صاحب قمر الاقمار فرماتے ہیں

"والمراد بالصحابي الصحابي المجتهد كذافي التلويح فان رواية الصحابي الغير المجتهد قدتترك اذاكالف القيس من كل وجه فوله اولى بالترك "

(نور الانوار ص ۲۱۶)

صحابی سے مراد وہ صحابی ہے جو مجتہد ہو یعنی مجتہد صحابی کے قول کے خلاف اگر قیاس ہو تو اسے چھوڑ دیا جائیگا۔ جیسا کہ اصول فقہ کی مشہور کتاب تلویح میں بھی ذکر ہے لیکن غیر مجتہد صحابی کی روایت جب قیاس کے سراسر مخالف ہو اور ان میں تطبیق کی کوئی وجہ نہ ہو تو وہاں قیاس پر عمل

ہوگا اور قول صحابی کو چھوڑ دیا جائے گا۔

مذاہب اربعہ حق ہیں:

مذہب حنفی، مذہب مالکی، مذہب شافعی اور مذہب حنبلی چاروں حق ہیں ان چاروں مذاہب میں جس کسی کی تقلید کی جائے صحیح ہے تقلید کرنے والا گناہ گار نہ ہوگا کیونکہ مجتہد سے اپنے اجتہاد میں خطا بھی ہو جائے تو وہ گناہگار نہیں۔ وہ اپنے اجتہاد کے مطابق عمل کرے تو اسکا عمل صحیح ہوگا اور اس کی تقلید بھی اس اجتہاد میں صحیح ہوگی۔

"ان المجتهد يخطي ويصيب والحق في موضع الخلاف واحد لكن لايعلم ذلك الواحد باليقين فهذا قلنا بحقيه المذاهب الاربعة اى الحنفي والشافعي والمالكي والحنبلي" (منار، نورالانوار، قمر الاقمار ٢٤٦)

بے شک مجتہد سے اجتہاد میں کبھی خطا ہو جاتی ہے اور کبھی اسکا اجتہاد درست ہوتا ہے جب مجتہدین کے اجتہادات مین اختلاف ہوتو حق صرف ایک میں ہے ہوگا کیونکہ یقینی طور پر معلوم نہیں کہ کس اجتہاد میں حقانیت ہے اسلئے چاروں مذاہب یعنی حنفی، شافعی مالکی اور حنبلی حق ہونگے۔ خیال رہے کہ ایک کے حق ہونے سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک ان میں سے حق ایک ہی ہے۔

" ان لله تعالى فى كل مسئالة فيها المجتهدون حكما معينا فمن اصابه اصاب ومن اخطأه اخطاء " (قمر الاقمار حاشيه نور الانوار ص ٢٤٦)

یعنی جس مسئلہ میں مجتہدین کا اختلاف ہوگا ان مختلف اجتہادات میں سے اللہ تعالیٰ کے نزدیک ایک ہی حکم معین ہوگا جس کو اس کی طرف سے توفیق کامل حاصل ہوئی اس نے راہ حق کو پالیا اور دوسرے سے خطا واقع ہوگئی۔ لیکن خیال رہے کہ تقلید کرنے والے صرف دلائل کی برتری اور طرز استدلال کو دیکھ کر کسی ایک مذہب کو ترجیح دیں گے اسلئے جس مذہب کو غالب سمجھ کر کسی نے تقلید کر لی وہی اس کے حق میں درست ہوگا۔

مذاہب اربعہ کے بغیر تقلید منع ہے:

" ولايجوز تقليد ماعدا المذاهب الاربعة ولو وافق قول الصحابة والحديث

الصحیح والایة فالخارج عن المذاهب الاربعة ضال مضل وربما اداہ ذالک الی الکفر لان الاخذ بظواهر الکتاب والسنة من اصول الکفر "

(صاوی ، سورۃ الکہف ایۃ واذکر ربک اذا نسیت)

ان چاروں مذاہب کے علاوہ کسی اور مذہب کی تقلید درست نہیں اگرچہ وہ بظاہر صحابہ کے قول اور حدیث اور کسی آیت کے مطابق ہی کیوں نہ ہو، جو ان چاروں مذاہب سے خارج ہے وہ گمراہ ہے اور گمراہ کرنے والا ہے کیونکہ بسا اوقات یہ کفر تک پہنچا دیتا ہے اسلئے کہ قرآن وحدیث کے ظاہری معانی مراد لینا اور انکی حقیقت کو نہ سمجھنا کفر کی جڑ ہے۔

تقلید بہت ضروری ہے:

رب تعالیٰ نے ارشاد فرمایا.....!فاسئلوا اهل الذکر ان کنتم لاتعلمون تم اہل علم سے پوچھ لو اگر تم خود نہیں جانتے۔ اہل ذکر سے مراد کون ہیں؟ فاسئلوا المؤمنین العالمین من اهل القرآن (خازن) یعنی جو مومن ہیں اور قرآن کا علم رکھتے ہیں ان سے پوچھ لو اگر تم خود نہیں جانتے۔ مندرجہ بالا آیت کی تفسیر میں علامہ سیوطی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ درمنثور میں فرماتے ہیں:

" اخرج ابن مردویه عن انس قال سمعت النبی ﷺ یقول ان الرجل یصلی ویصوم ویحج ویغزو وانه لمنافق قالوا یارسول الله بما ذا دخل علیه النفاق قال لطعنه علی امامه وامامه من قال قال الله فی کتابه فاسئلوا اهل الذکر ان کنتم لاتعلمون"

ابن مردویہ نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے کہ وہ کہتے ہیں میں نے نبی کریم ﷺ کو فرماتے سنا کہ بیشک ایک شخص نماز پڑھتا ہوگا، روزے رکھتا ہوگا، حج کرتا ہوگا اور جہاد کرتا ہوگا لیکن وہ منافق ہوگا۔ صحابہ نے عرض کی، یا رسول ﷺ! وہ کس وجہ سے منافق ہوگا؟ آپ نے فرمایا! اپنے امام پر طعنہ کرنے کی وجہ سے، امام کون ہے؟ فرمایا، رب تعالیٰ کا ارشاد ہے: فاسئلوا اهل الذکر ان کنتم لا تعلمون .

تقلید مذاہبِ اربعہ ہی کی کیوں ضروری ہے:

صرف ان چاروں ائمہ کی ہی تقلید ہوسکتی ہے کسی اور کی نہیں کیونکہ ان حضرات نے ہی وہ قوانین وضوابط

مرتب فرمائے ہیں جن کے ذریعہ مسائل کا حل نکالا جا سکتا ہے اور باقی تمام لوگ ان کے ہی پیروکار ہیں ۔خیال رہے کہ غیر مقلدین بھی اپنے دلائل وہی پیش کرتے ہیں جو کسی نہ کسی امام کے مذہب میں پیش کیے گئے ہیں ۔تمام حنفی فقہاء امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ کے مقلد ہیں

تمام فقہاء کے کل سات درجے ہیں :

پہلا درجہ ان حضرات کا جو مجتہد فی الشرع ہیں جس طرح چاروں امام یعنی امام ابوحنیفہ، امام مالک، امام شافعی، اور امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہم اجمعین انہی حضرات نے فقہ کے قواعد واصول مرتب فرمائے ہیں۔

دوسرا درجہ ان حضرات کا ہے جو مجتہد فی المذہب ہیں جیسے امام ابو یوسف، امام محمد، رحمۃ اللہ علیہما اور امام اعظم کے دیگر شاگرد جن کو یہ طاقت حاصل تھی کہ وہ اپنے امام اور استاذ کے بتائے ہوئے قوانین کے ذریعے قرآن وحدیث سے مسائل نکال سکتے تھے۔

تیسرا درجہ مجتہدین فے المسائل کا ہے یہ وہ حضرات ہیں جو اصول اور فروع میں اپنے امام کے مقلد ہیں ہاں البتہ جن مسائل میں کوئی نص نہیں پائی جاتی یہ حضرات وہ مسائل اپنے امام کے بنائے ہوئے اصول وقوانین سے نکالنے کی طاقت رکھتے ہیں ۔ جیسے خصاف ، ابوجعفر طحاوی ، ابوالحسن کرخی ، شمس الائمہ حلوانی، شمس الائمہ سرخسی ،فخر الاسلام بزدوی ،فخر الدین قاضیخان وغیرہ۔

چوتھا درجہ مقلدین میں اصحاب تخریج کا ہے یہ حضرات اجتہاد پر تو بالکل قادر نہیں ہوتے لیکن انہیں قوانین اور ماخذ کا علم ہوتا ہے اگر کوئی مسئلہ مجمل ہوتا اور اس میں دو وجوہات ہوتیں یا اسی طرح کوئی مسئلہ مبہم ہوتا جس میں دو احتمال پائے جاتے تو یہ ترجیح دے سکتے تھے جیسے رازی وغیرہ۔

پانچواں درجہ مقلدین میں اصحاب ترجیح کا ہے یہ وہ حضرات ہیں جو روایات کے متعلق یہ فیصلہ کرنے کی طاقت رکھتے تھے کہ یہ اولیٰ ہے ، یہ اصح ہے ، یہ لوگوں کی لئے بہتر اور آسان ہے جیسے ابوالحسن قدوری اور صاحب ہدایہ ۔

چھٹا درجہ مقلدین میں سے ان حضرات کا ہے جو زیادہ قوی اور قوی اور ضعیف کے درمیان فرق

کرنے کی صلاحیت رکھتے تھے اور ظاہر اور روایات نادرہ وغیرہ میں تمیز کر سکتے تھے جیسے متأخرین فقہاء کرام جنہوں نے وہ کتب تصنیف کیں جنہیں متن کہا جاتا ہے جیسے صاحب کنز، صاحب مختار، صاحب وقایہ، صاحب مجمع وغیرہ۔ یہ حضرات اقوال مردود اور روایات ضعیفہ نقل نہیں کرتے۔

ساتواں درجہ ان فقہائے کرام کا ہے جو ان چھ مذکورہ مدارج میں سے کسی درجہ پر نہیں ہوتے بلکہ انہیں صرف یہ مقام حاصل ہوتا ہے کہ وہ فقہ کی کسی کتاب کو دیکھ کر مسئلہ بتا سکتے ہیں۔ جو فقہ کی کتب کو اچھی طرح سمجھ سکتا ہو اسے ہم فقیہ اعظم اور فقیہ العصر کے القاب دیتے ہیں یہ کامل طور پر مقلد ہوتے ہیں۔

(ارشامی ج ۱ ص ۵۷)

تنبیہ: ایک درجہ کے فقہاء ایک دوسرے کے مقلد نہیں ہوتے لیکن اوپر والے درجہ کے فقہاء کے مقلد کی حیثیت میں ہوتے ہیں اگرچہ درحقیقت امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ ہی کے مقلد ہوتے ہیں۔

امام اعظم کے شاگردوں کا آپ سے کئی مسائل میں اختلاف کیوں؟

ایک مرتبہ امام اعظم رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے ایک بچہ کو کیچڑ میں کھیلتے ہوئے دیکھ کر فرمایا، دیکھنا کہیں گر نہ جانا۔ اس بچے نے عرض کی:

" احذر انت السقوط فان فی سقوط العالم سقوط العالم "

آپ احتیاط کرنا کیونکہ ایک عالم کے پھسلنے اور گرنے سے تمام جہان گر جاتا ہے۔

یعنی عالم کی غلطیوں سے لوگ غلطی میں پڑ جاتے ہیں۔ اس واقعہ کے بعد امام صاحب نے اپنے اصحاب کو حکم دیا: " ان توجہ لکم دلیل فقولوا بہ "۔

اگر تمہیں کوئی دلیل نظر آئے تو اس کے مطابق تم مسئلہ بیان کر دیا کرو، آپ کا یہ ارشاد آپکے کامل تقوی پر دلالت کرتا ہے آپ کے اس ارشاد کے باوجود آپ کے تلامذہ نے آپکے بیان کردہ اصول وضوابط کے خلاف کوئی قانون نہیں وضع کیا بلکہ آپکے اصولوں کے مطابق ہی مسائل میں اجتہاد کیا ہے۔

امام ابو یوسف فرماتے ہیں:

" ماقلت قولا خالفت فیه اباحنیفة الا قولا قد کان قوله "

یعنی میں نے امام اعظم علیہ الرحمۃ کے کسی قول کی سوائے ایک قول کے مخالفت نہیں کی۔

امام زفر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

"ماخالفت اباحنیفة فی شئی الاقد قاله ثم رجع عنه"

میں نے امام صاحب کے کسی قول کی مخالفت نہیں کی ہاں البتہ آپ کا ایسا کوئی قول ہو جس سے آپ نے خود ہی رجوع فرمالیا ہو تو اس کی مخالفت اگرچہ میں نے کی لیکن وہ بھی درحقیقت مخالفت نہیں کیونکہ آپ نے اسے ترک کردیا تھا۔

"فهذا اشارة الی انهم ماسلکوا الطریق الخلاف بل قالوا ماقالوا عن اجتهاد ورأی اتباعا لما قاله استاذهم ابوحنیفة رحمه الله تعالیٰ" (درمختار و شامی ج ۱ ص ۴۹، ۵۰)

اس سے واضح ہوا کہ امام صاحب کے شاگردوں نے آپ کے مخالف کسی راہ کو اختیار نہیں کیا بلکہ انہوں نے اپنے اجتہاد یا اپنی رائے سے جو مسئلہ بھی بیان کیا ہے اس میں انہوں نے اپنے استاذ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ ہی کی تابعداری کی ہے۔

اس بحث سے واضح ہوا کہ تمام فقہاء کے طبقات امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ کے ہی مقلد ہیں اور آپکے شاگرد بھی آپ ہی کے مقلد ہیں ایک درجے کا فقیہ اپنے ہی درجے کے فقیہ کا مقلد نہیں نیز ہمارے زمانے کے سب فقہاء پہلے تمام فقہاء کے تابع ہیں۔

تقلید کن مسائل میں جائز ہے؟

علامہ اسماعیل حقی رحمۃ اللہ علیہ تفسیر روح البیان میں آیۃ "نصیبهم غیر منقوص" کی تفسیر میں فرماتے ہیں۔

"وفی الایة ذم التقلید وهو قبول قول الغیر بلادلیل وهو جائز فی الفروع والعملیات ولایجوز فی اصول الدین والاعتقادیات بل لابد من النظر والاستدلال"

تقلید صرف فروعی مسائل اور عملیات میں ہے اصول دین اور اعتقادی مسائل میں تقلید جائز نہیں بلکہ ان میں نظر واستدلال ضروری ہے آیت کریمہ میں جس تقلید کی مذمت کی گئی ہے وہ یہی ہے کہ اعتقادیات اور اصول دین کو بغیر نظر واستدلال کے صرف کسی شخص کے کہنے پر تسلیم

نہ کیا جائے۔

اپنے امام کے مذہب کو حق ماننا واجب ہے:

" اذا سئلنا عن مذهبنا ومذهب مخالفنا قلنا وجوبا مذهبنا صواب يحتمل الخطاء ومذهب مخالفنا خطاء يحتمل الصواب " (مقدمه در مختار)

جب ہم سے ہمارے مذہب (مذہب حنفی) اور دوسروں کے مذہب کے متعلق سوال کیا جائے تو ہم پر واجب ہوگا کہ ہم یہ جواب دیں، ہمارا مذہب حق اور درست ہے اور غلطی کا اس میں بہت ہی کم احتمال ہے جبکہ ہمارے غیر کا مذہب درست نہیں اور اس کے صحیح ہونے کا بہت ہی کم احتمال ہے۔

" واذا سئلنا عن معتقدنا ومعتقد خصومنا قلنا وجوبا بالحق ما نحن عليه والباطل ما عليه خصومنا " (درمختار)

اور جب ہم سے پوچھا جائے کہ ہمارا عقیدہ سچا ہے یا ہمارے مخالفین کا تو ہم پر یہ جواب دینا واجب ہے کہ ہمارا عقیدہ حق، اور سچ اور درست ہے اور ہمارے مخالفین کا عقیدہ باطل ہے۔

یعنی ہمیں اپنے عقیدے کی اور اپنے مذہب کی حقانیت پر کامل یقین ہو کیونکہ یہ ضروری ہے کہ ہم اپنے عقیدے اور مذہب میں متزلزل اور متردد نہ ہوں۔

درمختار کی اس عبارت پر علامہ شامی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

" عن معتقدنا اى عما نعتقده من غير المسائل الفرعية مما يجب اعتقاده على كل مكلف بلا تقليد لاحد وهو ما عليه اهل السنة والجماعة وهم الاشاعرة والماتريدية وهم متوافقون الافى مسائل يسيرة اربعها بعضهم الى الخلاف اللفظى " (شامی ج ۱ ص ۳۶)

عقیدہ سے مراد فروعی مسائل کے بغیر اصول دین ہیں عقائد میں ہر مکلّف یعنی عاقل و بالغ کے لئے ضروری ہے کہ وہ کسی شخص کی تقلید کے بغیر ان پر اعتقاد رکھے۔ (فروعی مسائل میں تقلید واجب ہوگی) عقائد صحیحہ صرف وہی ہونگے جن پر اہل سنت و جماعت یعنی اشاعرہ اور ماتریدیہ کا اجماع ہے، انکا آپس میں بہت ہی کم اختلاف ہے وہ بھی بعض حضرات کے نزدیک لفظی اختلاف ہے۔

علامہ شامی کی اس تحقیق کے بعد یہ واضح ہوگیا کہ اعتقادیات یعنی اصول دین میں تقلید نہیں، صرف فروعی مسائل میں تقلید ہوگی۔ اسی وجہ سے صاحب درمختار نے بھی مذہب اور عقیدہ کا الگ الگ ذکر کیا ہے کیونکہ مذہب سے مراد فروعی مسائل میں امام کی تقلید ہے اور عقیدہ سے مراد اصول دین ہیں جنہیں بغیر تقلید کے تسلیم کرنا اور ان پر قائم رہنا واجب ہے۔

خیال رہے کہ صریح احکام جن میں احادیث متعارض نہیں ان میں بھی تقلید نہیں اور نہ ہی ان میں کسی امام کا اختلاف ہے جیسے نماز کی رکعتیں یعنی فجر کی نماز دو رکعت فرض ہیں اور ظہر کی چار، اسی طرح رمضان کے پورے مہینے کے روزے فرض ہیں، اس قسم کے مسائل میں تقلید نہیں۔

صحابہ کرام پر کس کی تقلید ضروری تھی؟

جیسا کہ پہلے ذکر کیا گیا کہ فقہاء کرام کے کئی طبقات ہیں ہر طبقہ کے لوگوں کو اپنے ہی درجے کے لوگوں کا مقلد ہونا ضروری نہیں البتہ اپنے سے اوپر والے درجے کے فقہاء کا مقلد ہونا ضروری ہے اس سے واضح ہوگیا کہ صحابہ کرام کو آقائے دو جہاں ﷺ کے ہوتے ہوئے کسی کی تقلید کی ضرورت نہ تھی وہ جب چاہتے نبی کریم ﷺ سے مسائل پوچھ لیتے تھے اسلئے انکو دین سمجھنے میں کوئی مشکل پیش نہیں آتی تھی۔

اسی طرح تابعین صحابہ کرام کی طرف رجوع فرمالیتے تھے اور انکو بھی کسی ایسے امام کی ضرورت نہیں تھی لیکن جیسے جیسے وقت گزرتا گیا مسائل کو سمجھنا اور احادیث میں تطبیق دینا دشوار ہوتا چلا گیا اسلئے بعد کے لوگوں کو ائمہ کی تقلید کرنا واجب ہوا کیونکہ ان ائمہ نے مسائل کے حل اور احادث میں تطبیق کے لئے اصول وضوابط مقرر فرمادیئے۔

امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ کے مذہب کو فوقیت کیوں؟

1: مذہب حنفی کی فضیلت کی سب سے بڑی وجہ تو یہ ہے کہ امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ تابعی ہیں اور تابعی کا قول حدیث قولی ہے اور تابعی کا فعل حدیث فعلی ہے اور تابعی کے سامنے کوئی کام کیا جائے اور وہ اس سے نہ روکے تو وہ حدیث تقریری ہے یعنی جس طرح نبی کریم ﷺ اور صحابہ کرام کے اقوال وافعال اور ان کا کسی کام کے کرنے سے نہ روکنا احادیث ہیں اسے طرح تابعی کے بارے میں بھی یہی حکم ہے

قوت اور ضعف کا فرق ہوگا لیکن حدیث ہونے سے انکار نہیں کیا جاسکتا اور خصوصاً جبکہ تابعی بھی وہ ہو جسے علم اور تقوی کا اعلیٰ مقام حاصل ہو تو یقیناً اس کے اقوال نے حجت ہونا ہی ہے۔

امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ کا تابعی ہونا:

" ادرک بالسن نحو عشرین صحابیا " (مقدمہ درمختار)

آپ نے اپنی عمر میں تقریباً بیس صحابہ کرام سے ملاقات کی۔

جن کے اسمائے گرامی یہ ہیں۔

ابن نفیل ، واثلہ ، عبداللہ بن عامر ، ابن ابی اوفی ، ابن جزء ، عتبہ ، مقداد، ابن بسر، ابن ثعلبہ، سہل بن سعد، انس ، عبدالرحمٰن بن یزید، محمود بن لبید، محمود بن ربیع ، ابوامامہ، ابوالطفیل ، عمرو بن حریث، عمرو بن سلمہ ، ابن عباس، سہل بن منیف رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین۔

"وصح ان اباحنیفة سمع الحدیث من سبعة من الصحابة " (مقدمه درمختار)

صحیح طور پر یہ بات ثابت ہے کہ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے سات صحابہ کرام سے احادیث بلاواسطہ سنیں ہیں:

" ولم یثبت ذلک لاحد من ائمة المعاصرین له کالاوزاعی بالشامی و الحمادین بالبصرة والثوری بالکوفة ومالک بالمدینة الشریفة واللیث بن سعد بمصر "

(شامی ج ۱ ص ۴۸)

علامہ ابن حجر عسقلانی فرماتے ہیں کہ امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ نے کوفہ میں صحابہ کی ایک جماعت کو پایا اور یہ مقام آپ کے زمانے کے دوسرے اکابر ائمہ کو حاصل نہیں ہوسکا جن میں ملک شام میں اوزاعی ، بصرہ میں حمادین، کوفہ میں ثوری ، مدینہ طیبہ میں امام مالک اور مصر میں لیث بن سعد علیہم الرحمۃ تھے۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ کی امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ کے لئے دعا:

دوسری وجہ امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ کے مذہب کی فوقیت کی یہ ہے کہ آپکے لئے شیر خدا، حیدر کرار حضرت علی المرتضی رضی اللہ عنہ نے دعا فرمائی جو یقیناً قبول ہوئی اسی وجہ سے کسی امام کو آپکا

سا مرتب حاصل نہ ہوا دعا کی۔ یقینی قبولیت کا میں نے اسلئے ذکر کیا ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ سید الاولیاء اور مستجاب الدعوات ہیں۔

وقد ثبت ان ثابتا ادرک الامام علی بن ابی طالب فدعا له ولذریتة بالبرکة

(مقدمہ درمختار)

یعنی تحقیق یہی ہے کہ امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ کے والد حضرت ثابت بن نعمان (آپ اپنے دادا کے ہم نام ہیں) نے حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی خدمت میں حاضری دی تو انہوں نے ان کے لئے اور انکی اولاد کے لئے برکت کی دعا فرمائی۔

اسی لئے امام اعظم کے پوتے اسماعیل بن حماد بن نعمان بن ثابت فرماتے ہیں، نحن نرجو ان یکون الله تعالی قد استجاب لعلی فینا. یعنی ہم امید کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ہمارے حق میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کی دعا قبول فرمالی ہے۔ قد استجاب کا معنی یہ ہے یقیناً دعا قبول فرمالی ہے۔

یہ بھی خیال رہے کہ یہ دعا امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ کی پیدائش سے پہلے کی ہے کیونکہ آپکی پیدائش ۸۰ھ میں جبکہ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی شہادت ۴۰ھ میں ہوئی اصل میں جو مشہور ہے کہ امام اعظم کے والد آپکو حضرت علی رضی اللہ عنہ کے پاس لے گئے اس کی وجہ یہ ہے کہ تاریخ ابن خلکان کے بعض نسخوں میں امام صاحب کے پوتے اسماعیل بن حماد کا قول اس طرح بیان کیا گیا ہے:

" ولد جدی ابوحنیفة سنة ثمانین وذهب ثابت بجدی الی علی ابن ابی طالب "

یعنی میرے دادا ابوحنیفہ ۸۰ھ میں پیدا ہوئے اور انکے باپ ثابت انہیں حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پاس لے گئے، لیکن صحیح نسخہ میں "ذهب ثابت جدی" کے الفاظ ہیں۔

یعنی میرے دادا ثابت حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پاس گئے۔

"والظاهر ان لفظة بجدی من زیادة النسخ او الباء زائدة واصله جدی لان علیا مات سنة اربعین من الهجرة "

(شامی ج ا ص ۴۷)

ظاہر یہی ہے کہ بجدی یا تو کتابت کی غلطی اور یا لفظ باء زائد ہے اصل جدی ہے کیونکہ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ ۴۰ھ میں شہید ہو گئے۔

آپکی فضیلت میں حضور علیہ السلام کے ارشادات:

تیسری وجہ امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ اور انکے مذہب کی برتری کی یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ کے کئی ارشادات ایسے ہیں جو امام صاحب کی افضلیت پر دلالت کرر ہے ہیں اگر چہ بعض احادیث میں صراحت کے ساتھ بھی ذکر ملتا ہے کہ حضور ﷺ نے آپکا نام لے کر آپ کی افضلیت بیان کی ہے لیکن ان احادیث پر بعض حضرات نے جرح کی ہے۔

حدیث نمبر۱:

" وعنه عليه الصلوة والسلام ان ادم افتخربی وانا افتخر برجل من امتی اسمه نعمان وكنيته ابوحنيفة هو سراج امتی"

نبی کریم ﷺ فرماتے ہیں آدم علیہ السلام کو مجھ پر فخر تھا اور مجھے اپنی امت کے ایک شخص پر فخر ہے جسکا نام نعمان ہوگا اور کنیت ابوحنیفہ۔ وہ میری امت میں ایک چراغ کی حیثیت رکھے گا۔

حدیث نمبر۲:

" وعنه عليه الصلوة والسلام ان سائر الانبياء يفتخرون بی وانا افتخر بابی حنيفة من احبه فقد احبنی ومن ابغضه فقد ابغضنی "

حضور ﷺ فرماتے ہیں، بیشک تمام انبیاء کرام نے مجھ پر فخر کیا اور مجھے ابوحنیفہ پر فخر ہے جس نے اس سے محبت کی وہ میری محبت کی وجہ سے ہی اس سے محبت کرتا ہوگا اور جس نے اس سے بغض رکھا وہ میرے ساتھ بغض رکھنے کی وجہ سے ہی اس سے بغض رکھے گا۔

ان دونوں حدیثوں کے متعلق ابن جوزی نے کہا ہے کہ یہ موضوع ہیں اگر چہ صاحب درمختار نے اسکا رد ان الفاظ سے کیا ہے۔

" وقول ابن الجوزی انه موضع تعصب لانه روی بطرق مختلفة "

ابن جوزی کا موضوع کہنا صرف تعصب کی وجہ سے ہے کیونکہ یہ مختلف طریقوں سے مروی ہے جو حسن لغیرہ کے درجہ میں ہے لیکن علامہ شامی کہتے ہیں کہ ان احادیث کوئی اور حضرات نے بھی موضوع کہا ہے۔ اسلئے علامہ ابن حجر عسقلانی شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی کتاب خیرات الحسان میں فرمایا:

" ومن اطلع علی مایأتی فی هذا الكتاب من احوال ابی حنيفة وكراماته واخلاقه

وسیرته علم انه غنی عن ان یستشهد علی فضله بخبر موضوع "
جوشخص اس کتاب میں امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے احوال، کرامات اخلاق اور سیرت پر مطلع ہوگا اسے معلوم ہو جائے گا کہ آپ کے فضائل پر موضوع احادیث کے دلیل بنانے کی ضرورت نہیں کیونکہ صحیح احادیث آپکی شان پر دلالت کر رہی ہیں۔

حدیث نمبر ۳:

" روی عنه علیه الصلوة والسلام انه قال ترفع زینة الدنیا سنة خمسین ومأة "

نبی کریم ﷺ نے فرمایا ایک سو پچاس سن ہجری میں دنیا کی زینت کو اٹھا لیا جائے گا۔ اس حدیث کی شرح میں شمس الائمه کردی بیان کرتے ہیں" ان هذا الحدیث محمول علی ابی حیفة لانه مات تلک السنة "یعنی بے شک یہ حدیث امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی شان کو واضح کر رہی ہے کیونکہ آپکا وصال ۱۵۰ھ میں ہی ہے۔

بخاری اور مسلم نے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالے عنہ سے اور طبرانی نے حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے یہ حدیث روایت کی۔

حدیث نمبر ۴:

" ان النبی ﷺ قال لو کان الایمان عند الثریا لتناوله رجال من ابناء فارس "
بیشک نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ اگر ایمان ثریا یعنی آسمان کے پاس بھی ہوا تو فارس کے شخص اسے حاصل کرلیں گے۔

ابونعیم نے ابوھریرہ رضی اللہ عنہ سے اور شیرازی اور طبرانی نے قیس بن سعد بن عبادہ سے روایت کی ہے:

"ان النبی ﷺ قال لو کان العلم معلقا عندالثریا لتناوله رجال من ابناء فارس ".
بیشک نبی کریم ﷺ نے فرمایا، اگر علم آسمان کے پاس بھی لٹکا ہوا ہوگا تو فارس کے شخص اسے حاصل کرلیں گے۔

طبرانی کے الفاظ قیس کی روایت سے یہ ہیں:

" لا تناله العرب لناله رجال من ابناء الفارس "

یعنی جسے عرب حاصل نہیں کرسکیں گے اسے فارس کے شخص حاصل کرلیں گے۔

مسلم نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا:

"لو کان الایمان عند الثریا لذھب به رجل من ابناء فارس حتیٰ یتناوله"

اگر ایمان آسمان کے پاس بھی ہوا تو فارس سے ایک شخص جائے گا اور اسے حاصل کرلے گا۔

بخاری اور مسلم نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا:

"والذی نفسی بیدہ لو کان الدین معلقا بالثریا لتناوله رجل من فارس"

ارشادِ نبوی ہے، قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے، اگر دین آسمان کے ساتھ بھی ہوا تو فارس کا ایک شخص اسے حاصل کرلے گا۔

اعتراض: امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ ۸۰ھ میں عبد الملک بن مروان کے زمانے میں کوفہ میں پیدا ہوئے، جب آپ شیراز وغیرہ کے نہیں تو یہ حدیثیں آپ پر کیسے صادق آرہی ہیں؟

جواب: جس طرح فقہ وغیرہ کی کتب میں اردو، پنجابی، سرائیکی وغیرہ تمام زبانوں کو ہندیہ کہا گیا ہے اور ہندوستان و پاکستان کے تمام علاقوں کو ملک ہند بولا گیا ہے اسی طرح حجاز سے باہر کے علاقے جن پر اسوقت بلادِ عرب کا اطلاق نہیں ہوتا تھا بلکہ ان کو بلادِ عجم کہا جاتا تھا، ان علاقوں کے لیے فارس ہی بولا جاتا تھا اس لئے فارس سے مراد خاص شیراز وغیرہ کا علاقہ نہیں" **و لیس المراد بفارس البلاد المعروفة بل جنس من العجم** "فارس سے مراد خاص فارس کا خطہ نہیں بلکہ اسی کی جنس سے دوسرے عجمی علاقے بھی فارس کہلاتے ہیں۔

دیلمی میں مذکور ہے" **خیر العجم فارس** "یعنی عجم میں سے بہتر حضرات کو فارس کہا جاتا تھا۔

و قد کان جد ابی حنیفه من فارس علی ما علیه الاکثرون"۔ دوسری وجہ یہ بھی ہے کہ امام اعظم ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے دادا محترم خاص مشہور ملک فارس کے تھے اسلئے بھی آپ کو فارس کا شخص کہا گیا ہے جیسا کہ ہمارے علاقہ میں ہندوستانی، کشمیری وغیرہ کے الفاظ ان لوگوں پر بھی استعمال ہو رہے ہیں جن کے آباؤ اجداد ہندوستان یا کشمیر سے تشریف لائے تھے۔

علامہ سیوطی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

" ھذا الحدیث الذی رواہ الشیخان اصل صحیح یعتمد علیہ فی الاشارۃ لابی حنفیہ و ھو متفق علی صحتہ "

یہ حدیث جو بخاری اور مسلم نے بیان کی ہے اسکے صحیح ہونے پر اہل علم کا اتفاق ہے اور اسی پر کامل اعتماد کیا جا سکتا ہے کہ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی شان کی طرف یہ حدیث واضح طور پر اشارہ کر رہی ہے اسلئے موضوع احادیث کا سہارا لینے کی ضرورت نہیں۔

مواہب کے حاشیہ پر علامہ سیوطی رحمۃ اللہ علیہ کے ایک شاگرد علامہ شامی (یہ اور شامی ہیں، مشہور علامہ شامی نہیں) فرماتے ہیں:

" ماجزم بہ شیخنا من ان اباحنیفۃ ھو المراد من ھذا الحدیث ظاھر لا شک فیہ لانہ لم یبلغ من ابناء فارس فی العلم مبلغہ احد " (شامی ج ۱ ص ۳۹، ۴۰)

ہمارے شیخ علامہ سیوطی رحمۃ اللہ علیہ نے اس پر یقین کیا ہے کہ بخاری و مسلم کی حدیث سے مراد امام ابوحنیفہ ہی ہیں، یہ ظاہر بات ہے اور اس میں کوئی شک و شبہ نہیں کیونکہ فارس کے علاقوں میں سے کوئی ایک بھی امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ کے منصب پر نہیں پہنچ سکا۔

امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ کا علمی مقام:

چوتھی وجہ امام اعظم اور آپکے مذہب کی برتری کی یہ ہے آپ کے علمی مقام کو کسی اور امام نے نہ پایا، ابھی آپ کے علمی مقام کی طرف حدیث پاک میں اشارہ ہونا ثابت ہو چکا ہے۔ لطف کی بات یہ ہے کہ تقوی کا بادشاہ اور احادیث میں کامل علم رکھنے والا علامہ سیوطی حنفی نہیں، جس نے ثابت کیا ہے کہ حدیث میں بلاشک اشارہ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ ہی کی طرف ہے۔ امام اعظم کے علمی مقام کو سمجھنے کے لئے پہلے آپکے دو مشہور شاگردوں کے علم کا اندازہ کریں پھر خود بخود سمجھ میں آئے گا کہ آپکا مقام کیا ہے۔

امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ:

آپ کا نام یعقوب ہے، کنیت سے ہی مشہور ہیں، امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ کے بیان کردہ اصول وقواعد میں آپ نے دقیق نظر فرمائی، فروع واحکام کے استنباط میں آپ نے اجتہاد فرمایا، قاضی القضاۃ

(چیف جسٹس آف سپریم کورٹ) کے منصب پر قائم رہے، آپ نے حنفی مذہب کو مختلف علاقوں تک پہنچایا

" وھو افقہ اھل عصرہ ولم یتقدمہ احد فی زمانہ و کان النھایة فی العلم و الحکم والریاسة "

آپ اپنے زمانے میں تمام اہل علم سے زیادہ فقیہ تھے آپکے زمانہ میں کوئی ایک شخص بھی آپ سے زیادہ فقہ میں مہارت نہیں رکھتا تھا آپکو علم وحکمت وریاست میں اعلیٰ مقام حاصل تھا۔

آپکی پیدائش ۱۱۳ھ میں ہوئی اور وفات بغداد میں ۱۸۲ھ میں ہوئی۔ (شامی ج ۱ ص ۳۷)

آپکو موضوع احادیث ہی ہزاروں کی تعداد میں یاد تھیں تا کہ اگر کوئی شخص کسی مسئلہ پر موضوع حدیث کو بطور دلیل پیش کرے تو دفاع کیا جا سکے اور اسے بتایا جا سکے کہ یہ حدیث تو موضوع ہے۔ صحیح حدیثیں آپکو بہت ہی کثیر تعداد میں یاد تھیں یہاں سے ہی ایک اور سوال خود بخود رد ہو گیا کہ امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ کو احادیث کا علم نہیں تھا، یہ بہتان عظیم ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اسوقت احادیث لکھنے کا رواج کم تھا یاد کرنے کا ہی زیادہ رواج تھا، آپکو ہزاروں بلکہ لاکھوں احادیث یاد تھیں۔ جس شخص نے صحابہ کرام سے بلاواسطہ احادیث سنیں ہوں اور وہ خود بھی تابعی ہو اور اسے جلیل القدر تابعین کے ساتھ بیٹھنے اٹھنے کے ہزاروں مواقع میسر آئے ہوں اسکے متعلق یہ تصور کرنا باطل ہے۔

آپکی کتاب **مسند امام اعظم** اور آپکے شاگرد امام محمد کی **مؤطا امام محمد** اس پر شاہد ہیں کہ آپ سے بڑھ کر کسے حدیث کا علم ہو سکتا ہے۔ صرف یہ خیال کر کے کہنا کہ آپ سے کم احادیث مروی ہیں یا آپ نے کتابی شکل میں احادیث کو جمع نہیں کیا اسلئے آپکو احادیث کا علم نہیں تھا، یہ ایسی عظیم غلطی ہے کہ اس سے معاذ اللہ یہ لازم آئے گا کہ کسی صحابی کو بھی حدیث مین کوئی دسترس حاصل نہ ہو۔ کیونکہ کسی نے بھی کتابی شکل میں احادیث کو جمع نہیں کیا۔ نیز خلفاء راشدین کا علم حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے کم ماننا پڑے گا کیونکہ خلفاء راشدین سے مروی احادیث کی تعداد حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی احادیث سے بہت ہی کم ہے، لیکن یہ دلیل ہی باطل ہے۔

مقامِ تفکر :

امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ کی ولادت ۸۰ھ میں اور وفات ۱۵۰ھ میں ہوئی جبکہ امام بخاری کی پیدائش ۱۹۴ھ میں اور وفات ۲۵۶ھ میں ہوئی اور امام مسلم کی ولادت ۲۰۴ھ میں اور وفات ۲۶۱ھ

میں اب آپ خود غور وفکر کریں کہ دوسو سال تک مسلمان کیا دین سے اور علم حدیث سے بے خبر تھے ؟

لوگوں کو گمراہ کرنے کی ایک سازش یہ کی جاتی ہے کہ صرف وہ حدیثیں معتبر ہیں جو صحاح ستہ میں ہیں یہ بھی ایک غلط روش ہے کیونکہ صحیح احادیث صرف صحاح ستہ ہی میں نہیں ہیں ۔ شیخ عبدالحق محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں :

" وقد حدث هذا فرقة من المبتدعة اطالوا السنتهم بالطعن على ائمة الدين بان مجموع ماصح عندكم من الاحاديث لم يبلغ زهاء الاف "

ایک نیا بدعتی فرقہ ایجاد ہو چکا ہے جو ائمہ کرام پر طعن کی زبانیں لمبی کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ تمہارے پاس تو دس ہزار تک صحیح حدیثیں نہیں پہنچیں ۔

حالانکہ ان کا یہ قول سراسر باطل ہے کیونکہ امام بخاری خود کہتے ہیں :

" حفظت من الصحاح مأة الف حديث ومن غير الصحاح مأتى الف "

یعنی میں نے صحیح حدیثیں ایک لاکھ حفظ کیں اور غیر صحیح حدیثیں یعنی حسن ، ضعیف وغیرہ دو لاکھ ۔

حالانکہ بخاری نے اپنی کتاب میں صرف سات ہزار دو سو پچھتر (۷۲۷۵) احادیث جمع کیں جبکہ کثیر حدیثیں تکرار سے آئی ہوئی ہیں اگر تکرار کو حذف کیا جائے تو صرف چار ہزار حدیثیں باقی رہ جاتی ہیں ۔ یہ بھی خیال رہے کہ بخاری اور مسلم نے یہ نہیں کہا کہ صحیح حدیثیں صرف وہی ہیں جو ہم نے جمع کی ہیں بلکہ امام بخاری کہتے ہیں ۔

" ما اوردت في كتابي هذا الاماصح ولقد تركت كثيرا من الصحاح "

یعنی میں نے اپنی صحیح میں صرف صحیح حدیثوں کو جمع کیا ہے لیکن بہت سی صحیح حدیثوں کو جمع نہیں بھی کیا ۔

امام مسلم کہتے ہیں : " الذی اوردت فی هذا الكتاب من الاحاديث صحيح ولا اقول ان ما تركت ضعيف "

یعنی میں نے اس کتاب میں جو احادیث جمع کی ہیں وہ صحیح ہیں لیکن میں یہ نہیں کہتا کہ میں نے جن کو ذکر نہیں کیا وہ ضعیف ہیں ۔

واضح ہوا کہ یہ رٹ لگانا کہ حدیث وہی معتبر ہے جو صحاح ستہ میں ہو ۔ یہ اپنی زبان سے اپنی

جہالت کا ثبوت پیش کرنا ہے:

" ولقد صنف الآخرون من الائمة صحاحا مثل ابن خزيمه وصحيح ابن حبان وصحيح الحاكم ابى عبد الله النيشابورى المسمى بالمستدرك وصحيح ابن عوانه وابن السكن والمنتقى لابن جارود وهذه الكتب كلها مختص بالصحاح، ولقد اورد السيوطى فى كتاب جمع الجوامع من كتب كثيرة يتجاوز خمسين مشتملة على الصحاح والحسن والضعاف " (از مقدمه مشكوة)

یعنی دوسرے ائمہ نے بھی صحیح احادیث جمع کی ہیں جیسے صحیح ابن خزیمہ اور صحیح ابن حبان اور حاکم ابوعبداللہ نیشاپوری کی صحیح جس کا نام مستدرک ہے اور صحیح ابن عوانہ اور صحیح ابن جارود کی صحیح منتقی ، یہ سب کتب صحیح احادیث پر مشتمل ہیں علامہ سیوطی نے جمع الجوامع میں احادیث کی پچاس سے زائد کتب کا ذکر کیا ہے جن میں صحیح حسن اور ضعیف حدیثوں کا ذکر ہے۔

سب سے بڑی بات یہ ہے کہ دن رات یہ رٹ لگانے والے کہ ہم تو صرف قرآن وحدیث کو مانتے ہیں اور اسکے بعد کی کسی کتاب کو نہیں مانتے ، تو وہ جب حدیث کی سند پر بحث کرتے ہیں یہ حدیث ضعیف ہے تو قرآن سے کیسے ثابت کریں گے کہ یہ ضعیف ہے اور رسول اللہ ﷺ اور صحابہ کرام اور تابعین عظام کے اقوال سے کیسے ثابت کریں گی کہ یہ حدیث ضعیف ہے۔ جب وہ بعد کی لکھی ہوئی کتب سے اسماء الرجال کی بحثوں کو صحیح مانتے ہیں تو فقہی مسائل کو تسلیم کرنے میں انہیں کیا تکلیف ہوتی ہے جبکہ امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ کے اجتہادات امام بخاری ومسلم کی پیدائش سے بھی پہلے کے ہیں۔ بات صرف ضد اور ہٹ دھرمی کی ہے اور اس کا کوئی علاج نہیں، حقیقت پسندی ہی انسانیت ہے۔

امام محمد رحمۃ اللہ علیہ:

آپ امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ کے شاگرد ہیں اور امام اعظمؒ کے شاگرد امام ابو یوسفؒ کے بھی شاگرد ہیں۔ جو مسائل آپ نے امام اعظم سے بلاواسطہ سنے ان کو آپ نے جس کتاب میں جمع کیا اسکا نام جامع کبیر ہے اور جو مسائل امام ابو یوسف کے واسطہ سے سنے انکو اپنی کتاب جامع صغیر میں جمع کیا اور جو ثقہ راویوں سے آپ تک امام صاحب کے مسائل تواتر اور مشہور طریقے سے پہنچے ان کو آپ نے جمع کیا وہ اصل یعنی مسبوط اور ظاہر الروایۃ ہیں۔

نوادر کو آپ نے اپنی دوسری کتب کیسانیات ، ہارونیات ، جرجانیات ، رقیات ، میں جمع کیا اسطرح آپ کی کتاب سیر صغیر ہے جب کچھ لوگوں نے اس کے مختصر ہونے پر چہ میگوئیاں کیں تو آپ نے سیر کبیر تصنیف فرمائی۔

امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ آپکے شاگرد ہیں:

امام شافعیؒ امام محمد رحمۃ اللہ علیہ کے شاگرد ہیں اور یہ بھی خیال رہے کہ جس دن امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ کی وفات ہوئی اسی دن امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کی پیدائش ہوئی اور آپ کے والد کے فوت ہونے پر آپکی والدہ نے امام محمد رحمۃ اللہ علیہ سے نکاح کر لیا یوں امام شافعی امام محمد رحمۃ اللہ علیہ کے زیر تربیت زیر پرورش اور زیر تعلیم رہے۔

امام محمد رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی تصنیف کردہ کتب بھی انکے ہی حوالے کر دی تھیں اسی لئے امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ انصاف کرتے ہوئے ، حقیقت پسندی سے کام لیتے ہوئے فرماتے ہیں:

"من اراد الفقه فليلزم اصحاب ابی حنيفة فان المعانی قد تيسرت لهم والله ماصرت فقيها الابكتب محمد بن الحسن" (مقدمه در مختار)

یعنی جو شخص فقہ کا علم حاصل کرنا چاہتا ہے وہ امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے شاگردوں کے پاس جائے ، ان سے فیض حاصل کرے کیونکہ وہ آسانی سے مسائل و معانی کو سمجھتے ہیں ، اللہ تعالیٰ کی قسم ! میں امام محمد بن حسن شیبانی کی کتابوں کو پڑھنے سے ہی فقیہ بنا ہوں۔

" روى الخطيب عن الربيع قال سمعت الشافعی يقول الناس عيال علی ابی حنيفة فی الفقة كان ابو حنيفة ممن وفق له الفقة " (شامی ج ا ص ۳۷)

خطیب نے ربیع سے روایت کیا ہے ، وہ کہتے ہیں میں نے امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ تمام لوگ حضرت امام اعظم رحمہ اللہ کے بچے ہیں کیونکہ امام اعظم ہی وہ شخص ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ نے فقہ کے علم میں خاص توفیق عطا فرمائی ، باقی امام آپ کے شاگردوں کے شاگرد ہیں صرف امام مالک رحمۃ اللہ علیہ آپکے شاگرد نہیں لیکن امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ کو سات صحابہ کرام سے بلا واسطہ روایت بیان کرنے کی وجہ سے ان پر بھی برتری حاصل ہے اور آپ کے طرز استدلال سے انکا بھی مقابلہ نہیں۔

امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ کا علمی مقام کافی حد تک واضح ہو چکا ہے لیکن ایک دو مثالوں سے اندازہ کریں کہ آپ کا علمی مقام کتنا بلند ہے۔

نماز کی تکبیر تحریمہ کے وقت ہاتھوں کا اٹھانا سنت ہے۔ ہاتھ کہا تک اٹھائے جائیں؟ اس بارے میں ایک روایت میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ "کان یرفع یدیہ حذو منکبیہ اذا افتتح الصلوۃ" جب نماز کو شروع فرماتے تو ہاتھ کانوں تک اٹھاتے تھے، اور دوسری روایت میں ہے:

کان رسول اللہ ﷺ اذا کبر رفع یدیہ حتی یحاذی بھما اذنیہ

حضور ﷺ جب نماز شروع فرماتے اور تکبیر کہتے تو اپنے ہاتھ کانوں کے برابر اٹھاتے تھے۔

ایک اور روایت میں ہے۔

"یرفع ابھامیہ الی شحمۃ اذنیہ" رسول اللہ ﷺ جب ہاتھ اٹھاتے تو آپ کے ہاتھوں کے انگوٹھے کانوں کی لو (نرم حصہ) تک آتے تھے۔

ایک اور روایت میں ہے،" الی فروع الاذنین "کانوں کے اوپر تک ہاتھ اٹھاتے تھے اب اس مسئلہ میں امام مالک اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہما ہاتھوں کے کندھوں تک اٹھانے کے قائل ہیں اس طرح ان کے مسلک میں صرف ایک روایت پر عمل ہوتا ہے۔ دوسری روایات پر عمل نہیں ہوتا لیکن امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ ہاتھوں کے انگوٹھوں کو کانوں کی لو تک اٹھانے کا حکم فرماتے ہیں اس پر عمل کرنے سے تمام روایات پر عمل ہو جاتا ہے۔ کیونکہ ہاتھوں کی ہتھیلیاں کندھوں کے برابر ہونگی، انگوٹھے کانوں کی لو کے برابر ہونگے اور انگلیاں کانوں کے اوپر ہوں گی۔

یعنی امام اعظمؒ کے مسلک کو مدنظر رکھتے ہوئے اور ہاتھوں کے اٹھانے کی روایات کو دیکھتے ہوئے یہ کہا جاسکتا ہے کہ واقعہ ایک ہی ہے جسے صحابہ کرام نے اپنے اپنے انداز پر بیان کر دیا، جس نے ہتھیلیوں کو دیکھا اسنے کندھوں کے برابر اٹھانے کا ذکر کر دیا، جس نے ہاتھ کے انگوٹھوں کو دیکھا اس نے کہہ دیا کہ آپ نے ہاتھ کانوں تک اٹھائے اور جس نے آپکی انگلیوں کو دیکھا اس نے کہا کہ آپ نے اپنے ہاتھ کانوں کے اوپر تک اٹھائے، واقعہ ایک ہے مگر انداز بیاں مختلف ہے۔

اس پوری تفصیل پر ابوداؤد شریف کی حدیث حضرت وائل بن حجر سے مروی شاہد ہے، وہ کہتے ہیں:

" انہ بصر النبی ﷺ حین قام الی الصلوۃ رفع یدیہ حتی کانتا بحیال منکبیہ

وحاذی ابهامیہ اذنیہ" (مشکوۃ باب صفۃ الصلوۃ)

ایک اور مثال دیکھئے امام صاحب اور دوسرے اہل علم حضرات ایک ولیمہ میں شریک تھے میزبان نے اپنی دو بیٹیوں کا نکاح دو بھائیوں سے کردیا تھا، ولی مکان سے باہر آیا اور اس نے کہا ہم سخت مصیبت میں پڑ گئے ہیں کیونکہ رات کو غلطی سے دلہنیں بدل گئیں اور ایک کی زوجہ سے دوسرے نے اور اس دوسرے کی زوجہ سے اس نے وطی کرلی ہے اب کیا کیا جائے؟ اس پر سفیان نے کہا، کوئی حرج نہیں ہر شخص جس سے اس نے وطی کی ہے اسے مہر دے اور پھر اپنی زوجہ واپس لے اور دوسری مرتبہ مہر اسے دے۔

شرعی نکتہ نظر سے مسئلہ کا یہ حل بھی ٹھیک ہے کیونکہ شُبہ سے جو وطی ہو جائے اس کا مہر ادا کرنا لازم آتا ہے اور اپنا نکاح برقرار رہتا ہے لیکن اس میں خرابی یہ تھی کہ ہر ایک جس نے وطی کی اسکے دل میں اس سے تعلق برقرار رہتا ہے جس سے کئی خرابیاں پیدا ہوتیں۔ امام اعظم نے دونوں لڑکوں کو بلایا اور پوچھا، تم نے جس جس عورت سے وطی کی ہے وہ تمہیں پسند بھی ہے؟ ہر ایک نے کہا ہاں ہمیں وہ پسند ہے آپ نے فرمایا تم دونوں اپنی اپنی زوجہ کو یعنی جس سے نکاح ہوا ہے اسے طلاق دو اور پھر جس جس سے وطی کی ہے اس سے نکاح کرلو۔ مسئلہ کا یہ حل بہت زیادہ اچھا تھا اس لئے تمام حاضرین نے آپکو داد دی۔

(خیرات الحسان)

امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا مذہب:

" قد صح عنه انه قال اذاصح الحديث فهومذهبی " (شامی ج ۱ ص ۵۰)

صحیح طور پر یہ بات ثابت ہے کہ امام اعظمؒ نے فرمایا، جو حدیث صحیح ہوگی وہی میرا مذہب ہے۔

آپ کے اس ارشاد سے واضح ہوا کہ آپ کا مذہب احادیث صحیح کے مطابق ہے ان کے مخالف نہیں۔

ایک غلط فہمی کا ازالہ:

امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کئی ایسی احادیث سے مسائل کو حاصل کرتے ہیں جن سے امام صاحب نے مسائل کو حاصل نہیں کیا۔

" ظن الناس ان مذهبه مخالف لاحاديث والحال ان ههنا احاديث اصح واقوى من

تلک الاحادیث التی تمسک بها الشافعی ترکها ابو حنیفة لاجلها"

یعنی لوگوں نے سمجھا کہ آپ کا مذہب احادیث کے مخالف ہے حالانکہ امام صاحب نے ان احادیث سے زیادہ صحیح اور قوی احادیث کو بطور دلیل پیش کیا۔

خیال رہے کہ امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ نے جو احادیث بطور دلیل پیش کیں ان پر اصحاب شافعی اور بعد والوں نے جو ضعف کا قول کیا ہے ان کے اس قول سے امام صاحب کے مذہب پر کوئی عیب نہیں لگایا جا سکتا، کیونکہ آپ تابعی ہیں آپ کے پاس پہنچنے والی بعض احادیث صحابہ کرام سے بلا واسطہ ہیں اور بعض احادیث آپ کے پاس تابعین کے ذریعے پہنچی ہیں۔ حدیث کا ضعیف ہونا راوی کی وجہ سے ہوتا ہے۔ یعنی راوی ثقہ نہ ہو تو حدیث میں ضعف آئے گا۔

" ولكم بضعف الحديث من جهة الراوى لا يستلزم الحكم بضعفه
فى الزمان المتقدم الذى لم يكن هذا الراوى موجودا فيه "

(مقدمہ مرقاۃ شرح مشکوۃ ص ۱۰)

راوی کی وجہ سے ان احادیث کو ضعیف کہنا جو امام صاحب نے بطور دلائل پیش کی ہیں، درست نہیں کیونکہ متاخرین کے پاس وہ احادیث کئی واسطوں سے پہنچی ہیں اور ان میں کوئی راوی ضعیف ہو تو حدیث ضعیف ہو جائے گی لیکن امام اعظم کے پاس تو وہ حدیث صحابی سے بلا واسطہ پہنچی ہے یا صرف ایک واسطہ تابعی کا ہے اور جب آپ کا ارشاد ہی یہ ہے کہ میرا مذہب وہی ہے جو صحیح احادیث سے ثابت ہے تو پھر ان احادیث کو امام صاحب کے زمانہ میں ضعیف کیسے کہا جا سکتا ہے۔

خیال رہے کہ صحابہ کرام کے زمانہ میں کوئی حدیث بھی ضعیف، حسن، معلل، شاذ وغیرہ نہیں بلکہ سب حدیثیں صحیح تھیں اسی طرح نبی کریم ﷺ سے براہ راست سننے والے کے لئے آپ کے ارشاد پر عمل کرنا اتنا ہی ضروری تھا جتنا قرآن پاک کے احکام پر عمل کرنا ضروری تھا اور یہ بھی خیال رہے کہ احادیث کے راویوں کے متعلق کئی حضرات نے بحثیں کی ہیں۔ بعض حضرات نے کسی راوی کو غیر ثقہ کہا، بعض دوسرے حضرات نے اسے ثقہ کہا ہے، یہ اپنے اپنے علم کے مطابق کہا ہے۔ اسلئے کسی حدیث کو مطلقاً غیر ثقہ راوی کی روایت نہیں کہا جائے گا۔

حضرت ابن ہمام فرماتے ہیں:

" كم من راو يختلف فيه الناس باجتهاد هم ومن جارح ومعدل فعسى ان يكون

الذی عدلوہ مجروحا عند امامنا " (مقدمہ مرقاۃ ص ۷۸)

کتنے راوی ایسے ہیں جن میں لوگوں کا اپنے اپنے اجتہاد کی وجہ سے اختلاف ہے کسی نے راوی پر جرح کی تو کسی نے عادل کہا، ہوسکتا ہے کہ بعض راویوں کو دوسرے حضرات عادل کہیں۔ اور وہ ہمارے نزدیک عادل نہ ہوں اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ کسی راوی کو دوسرے حضرات ضعیف کہیں اور وہ ہمارے نزدیک ثقہ راوی ہو۔

" لاترجیح بکثرۃ الرواۃ وانما هو بفقه الراوی وهکذا لاترجیح بکثرۃ الرویات وانما هو بقوۃ الروایۃ "

کثیر راویوں کی وجہ سے روایت کو ترجیح نہیں دی جاتی بلکہ راوی کی فقاہت سے ترجیح دی جاتی ہے اسی طرح کثیر روایات وجہ ترجیح نہیں بلکہ روایت کا قوی ہونا وجہ ترجیح ہے۔ یہ کہنا ہی غلط ہے کہ فلاں مسئلہ میں ہمارے عقیدہ کے مطابق اتنی حدیثیں ہیں جو تمہارے مسلک کے مطابق پیش کردہ حدیثوں سے زائد ہیں، بات دلیل کی قوت وضعف پر مبنی ہے، کثرت وقلت پر نہیں۔

بخاری یا مسلم میں آنے والی کئی حدیثیں منسوخ بھی ہیں جن پر عمل نہیں کیا جائے گا، کئی حدیثیں دوسری حدیثوں سے متعارض بھی ہیں ان میں یا تطبیق دی جائے گی یا تعارض کو ختم کرنے کے لیے ایک حدیث کو چھوڑنا پڑے گا۔ اہل علم کو انصاف سے لوگوں کو حق بات بتانی چاہیے صرف قوم کو انتشار میں مبتلا کر کے دین سے برگشتہ کرنا علم وعقل سے دوری کی علامت ہے۔

امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ کے اساتذہ وشاگرد:

علامہ ابن حجر عسقلانی فرماتے ہیں، امام صاحب کے اساتذہ بیشمار ہیں جن کے لیے یہ مختصر کتاب گنجائش نہیں رکھتی، امام ابوحفص کبیر نے آپ کے اساتذہ کی تعداد چار ہزار بیان کی ہے اور دوسروں نے کہا ہے کہ صرف تابعین میں سے آپ کے اساتذہ کی یہ تعداد ہے اور غیر تابعین میں بھی آپکے اساتذہ ہیں۔

امام صاحب کے شاگرد بھی اتنی کثیر تعداد میں ہیں کہ جن کا ذکر کرنا دشوار ہے اسی وجہ سے بعض علماء نے کہا ہے کسی کے اتنے زیادہ شاگرد نہیں ہوئے جتنے امام صاحب کے شاگرد ہیں اور عام لوگوں کو کسی اور سے اسقدر فائدہ نہ پہنچا جتنا امام صاحب اور انکے شاگردوں سے احادیث مشتبہ کی تفسیر،

مسائل کی تفسیر اور مسائل مستنبط اور نوازل وقضاواحکام کے بیان میں فائدہ پہنچا، اللہ تعالیٰ ان لوگوں کو بہتر جزا دے۔ بعض متاخرین نے امام صاحب کے تذکرہ میں آٹھ سو شاگردوں کا ذکر کیا ہے اور انکے نام ونسب کو بھی بیان کیا ہے۔ (الخیرات الحسان)

امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ کے تقویٰ کی ایک جھلک:

" وقد صلی الفجر بوضوء العشاء اربعین سنة "

آپ نے چالیس سال عشاء کے وضو سے صبح کی نماز ادا کی۔ یعنی جس وضو سے عشاء ادا کرتے اسی وضو سے فجر کی نماز ادا کرتے، اگر سوجاتے تو یقیناً فجر کی نماز کے لیے تازہ وضو کرنا پڑتا کیونکہ سہارا لگا کر یا لیٹ کر سونے سے وضو ٹوٹ جاتا ہے اس سے معلوم ہوا کہ آپ تمام رات عبادت میں مشغول رہتے تھے۔" و حج خمسا و خمسین حجة "آپ نے پچپن حج ادا فرمائے، جب ایک ہی حج کرنے سے انسان صغیرہ گناہوں سے اس طرح پاک ہوجاتا ہے جس طرح پیدائش کے دن گناہوں سے پاک ہوتا ہے تو آپ اندازہ کریں کہ پچپن حج کرنے والے کی بزرگی اور تقویٰ کا کیا مقام ہوگا۔ آپ نے اپنے آخری حج میں کعبہ شریف کے دربانوں سے اجازت طلب کی اور اندر تشریف لے گئے پھر!

" فقام بین العمودین علی رجله الیمنی حتی ختم نصف القرآن ثم رکع وسجد ثم قام علی رجل الیسری حتی نصف القرآن یعنی مع وضع القدمین علی الارض بدون رفع احدهما"

آپ دوستونوں کے درمیان کھڑے ہوگئے آپ نے پہلی رکعت میں اپنے دائیں پاؤں پر زور رکھا اور بائیں پر دباؤ نہیں تھا اگرچہ دونوں پاؤں زمین پر تھے اس حال میں آپ نے نصف قرآن کی تلاوت کی اور پھر رکوع کیا اور سجدہ کیا پھر دوسری رکعت میں کھڑے ہوئے بائیں پاؤں پر زور رکھا اور نصف قرآن پڑھ کر اس رکعت کا رکوع اور سجدہ کیا اسطرح آپ نے دو رکعت نفل نماز میں مکمل قرآن شریف کی تلاوت کی۔

(خیال رہے کہ یہ جو ذکر ملتا ہے کہ ایک پاؤں پر کھڑے ہوئے اور دوسرے پاؤں کو پیٹھ کی طرف کر دیا اسے علامہ شامی نے رد کیا کہ یہ سنت کے خلاف ہے، صحیح وہی ہے جو ذکر کیا گیا)

" فلما سلم بکی وناجی ربه وقال الهی ماعبدک هذا العبد الضعیف حق

عبادتک لکن عرفک حق معرفتک "

جب آپ نے سلام پھیرا تو روتے ہوئے رب کے حضور عرض کیا، الٰہی! اس تیرے ضعیف بندے نے تیری عبادت کا حق تو ادا نہیں کیا لیکن تجھے پہچانا ہے ایسے جیسے تجھے پہچاننے کا حق ہے۔

یعنی اگر صرف یہ کہا جاتا کہ اے اللہ تیرے بندے نے تیری عبادت کا حق ادا نہیں کیا تو وہم ہوتا شائد آپ نے اللہ تعالیٰ کو پہچانا ہی نہ ہو اس لئے عبادت کا حق ادا نہ کیا ہو، جب یہ کہا کہ الٰہی تجھے ایسے پہچانا جیسے پہچاننے کا حق ہے تو اب اس وہم کا ازالہ ہو گیا۔ البتہ یہ خیال کیا جائے کہ اللہ تعالیٰ کو پہچاننا انسان کی طاقت میں نہیں۔ پھر آپ نے عرض کیا، اے اللہ! اگرچہ ادائیگی خدمت میں تو نقصان ہے لیکن پہچاننے میں کمال ہے لہٰذا اسی کے طفیل تو اپنا احسان فرمایا تو آپ کو غیبی طور پر آواز آئی، اے ابو حنیفہ! تم نے ہمیں ایسا پہچانا جیسے پہچاننے کا حق ہے اور تم نے ہماری عبادت کے ذریعے ہماری ایسی خدمت کی جسے ہم نے اچھا پایا، ہم نے تمہاری مغفرت کر دی اور قیامت تک تمہاری اتباع کرنے والے تمہارے مذہب پر چلنے والوں کی بھی مغفرت کر دی۔ (مقدمہ در مختار، شامی ج ۱ ص ۳۸)

امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ کے مقلدین اولیاء کرام:

وقد اتبعه علی مذهبه کثیر من الاولیاء الکرام ممن اتصف ثبات المجاهدة ورکض فی میدان المشاهدة.

کثیر اولیاء کرام نے آپ کے مذہب کی تابعداری کی اور اولیاء کرام بھی وہ کہ جن کا مجاہدہ اور مشاہدہ کی میدان میں سبقت لے جانا واضح طور پر ثابت ہے۔

فلو وجدوا فیه مااتبعوه ولا اقتدوا به ولا وافقوه.

اگر وہ اس میں ذرا بھر بھی شبہ پاتے تو کبھی آپ کی تابعداری نہ کرتے اور نہ ہی آپ کی اقتداء کرتے اور نہ ہی آپ کی موافقت کرتے۔ وہ جلیل القدر اولیاء کرام ایسی ہستیاں ہیں، ابراہیم بن ادہم، شفیق بلخی، معروف کرخی، ابو یزید بسطامی، فضیل بن عیاض، داؤد طائی، ابو حامد لفاف، خلف بن ایوب، عبداللہ بن مبارک، وکیع بن جراح، ابو بکر وراق، رحمہم اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین۔ یہ تو چند مشہور و معروف حضرات تھے "وغیرهم ممن لایحصی" ورنہ ان کے علاوہ اتنے اہل علم، اہل کشف، علماء و صلحاء، اولیاء اللہ آپ کے مذہب کے متبعین اور آپکے مقلدین تھے جو شمار میں نہیں آ سکتے۔ (مقدمہ درمختار)

امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ طریقت کے بادشاہ:

ابو القاسم قشیری جو شافعی المذہب تھے اور اپنے مذہب میں بہت پختہ تھے وہ کہتے ہیں میں نے اپنے استاذ ابو علی دقاق کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ میں نے طریقت کو ابو القاسم نصر سے حاصل کیا اور انہوں نے امام ابو بکر شبلی سے اور انہوں نے ابو الحسن سری سقطی سے اور انہوں نے معروف کرخی سے اور انہوں نے داؤد طائی سے اور انہوں نے علم اور طریقت کو امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ سے حاصل کیا ان تمام حضرات نے آپ کے علم اور تقویٰ کی تعریف کی ہے، یہ سب لوگ طریقت و شریعت کے امام تھے۔

(مقدمہ در مختار)

امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ اور امام باقر رضی اللہ عنہ:

امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ کی مدینہ طیبہ میں امام باقر سے ملاقات ہوئی تو انہوں نے فرمایا، سنا ہے کہ تم قیاس کی بناء پر ہمارے نانا (حضور ﷺ) کی احادیث کی مخالفت کرتے ہو؟ عرض کی یہ بہتان ہے، دیکھیے عورت مرد سے کمزور ہے لیکن وراثت میں اس کا حصہ مرد سے نصف ہے اگر میں قیاس کرتا تو فتویٰ دیتا کہ عورت کو مرد سے دوگنا حصہ ملنا چاہیئے لیکن میں ایسا نہیں کرتا، اسی طرح نماز، روزے سے افضل ہے اگر میں قیاس کرتا تو حائضہ عورت کو نماز کی قضاء کا حکم دیتا مگر میں حدیث کے مطابق روزہ ہی کی قضاء کا حکم دیتا ہوں۔ یہ سن کر امام باقر اس قدر خوش ہوئے کہ انہوں آپ کی پیشانی کو بوسہ دیا۔ آپ نے ایک مدت تک ان سے اکتساب فیض کیا۔ (مناقب الامام للموفق)

اللہ تعالیٰ ہمیں ان اولیاء کرام کے نقش قدم پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے اور امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ اور آپ کے مذہب پر طعن کرنے والے مردودین ومبتدعین سے محفوظ رکھے۔

آمین ثم آمین بجاہ النبی الکریم ﷺ

﴿ وَمَثَلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا كَمَثَلِ الَّذِىْ يَنْعِقُ بِمَا لَا يَسْمَعُ اِلَّا دُعَآءً وَّنِدَآءً صُمٌّ بُكْمٌ عُمْىٌ فَهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ ﴾

۱) ''اور کافروں کی کہاوت اس کی سی ہے جو پکارے ایسے کو کہ خالی چیخ پکار کے سوا کچھ نہ سنے بہرے اندھے تو انہیں سمجھ نہیں''۔

۲) اور مثال ان لوگوں کی جنہوں نے کفر کیا مثل اس شخص کے ہے جو آواز دے ایسی چیزوں کو جو نہ سنیں سوائے چیخ وپکار کے، بہرے ہیں، گونگے ہیں، اندھے ہیں تو وہ عقل نہیں رکھتے''۔

اس مثال سے یہ واضح کیا گیا کہ جس طرح چرواہا بھیڑ بکریوں کو آواز دے تو ان کو بات کا مطلب تو سمجھ نہیں آتا بلکہ وہ فقط چیخ وپکار سنتی ہیں۔ اسی طرح یہ کافر بھی چوپاؤں کی طرح ہیں ان کو دعوت ایمان دیں تو یہ بھی اسے دل کے کانوں سے نہیں سنتے اور نہ ہی حق بات بولتے ہیں اور نہ ہی حق راہ دیکھ سکتے ہیں تو وہ عقل نہیں رکھتے۔ (از قرطبی)

یعنی کافر اپنے آباء واجداد کی تقلید میں اس طرح منہمک (گھرے ہوئے) ہیں اور گمراہی میں ہمیشہ کیلئے قائم ہیں ان کے سامنے قرآن پاک کی آیات تلاوت کی جائیں تو وہ ان کی طرف اپنے ذہن نہیں لگاتے جب ان کے سامنے کسی چیز کو بیان کیا جائے تو وہ اسے سوچتے نہیں غور وفکر نہیں کرتے بلکہ چوپاؤں کی طرح صرف آواز کی طرف کان لگاتے ہیں کہ انکی سمجھیں ختم ہو چکی ہیں۔ (از روح المعانی)

" والنعيق التتابع في التصويت على البهائم للزجر "

چوپاؤں کو ڈانٹنے کے لے جو آواز بار بار دی جائے اسے " نعق " کہا جاتا ہے۔ " لَا يَسْمَعُ اِلَّا دُعَآءً وَّنِدَآءً، كناية عن عدم الفهم والاستجابة " یعنی رب تعالیٰ کے ارشاد ﴿لَا يَسْمَعُ اِلَّا دُعَآءً وَّنِدَآءً﴾ کا مطلب یہ ہے کہ وہ سمجھ نہیں سکتے اور نہ ہی قبول کرتے ہیں:

" قيل نعب بالباء والدعاء والنداء بمعنى وقيل ان الدعاء ما يسمع والنداء قد يسمع وقد لا يسمع "

نعب اور نداء اور دعا کا بعض حضرات نے ایک ہی معنی لیا ہے یعنی پکارنا اور بعض حضرات نے بیان کیا کہ ''دعا'' اس پکار کو کہتے ہیں جو کبھی سنی جائے اور نداء اس پکار کو کہتے ہیں جو کبھی سنی جائے اور کبھی نہ سنی جائے کیونکہ نداء قریب کے لئے بھی ہوتا ہے اور بعید کے لئے بھی۔ (از روح المعانی)

تنبیہ: کوا جب گردن اٹھا کر اور گردن کو حرکت دے کر آواز نکالے تو اس وقت " نعق الغراب (بالمعجمة) کہتے ہیں اور جب وہ بغیر گردن کے اٹھانے اور حرکت دینے کے آواز نکالے تو اس وقت نعق الغراب (بالمہملة) کہتے ہیں۔ (از روح المعانی)

فَهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ : "ای لا یدرکون شیا لفقدان الحواس الثلاثة" تو وہ عقل نہیں رکھتے۔ یعنی تینوں حواس سننا، دیکھنا اور بولنا ہی جب ان میں نہیں پائے گئے تو وہ کسی چیز کو نہیں سمجھ سکتے۔ اسی وجہ سے کہا جاتا ہے "من فقد حسا فقد فقد علما" جس شخص نے حواس کھو دیئے تحقیق اس نے علم ضائع کر دیا یہاں عقل کی حقیقی نفی نہیں بلکہ سمجھنے کی صلاحیت سے جو ثمرات مرتب ہوتے ہیں ان کی نفی ہے۔ (از روح المعانی)

☆ " اخرج ابن جریر وابن ابی حاتم عن ابن عباس فی قوله ومثل الذین کفروا کمثل الذی ینعق بما لا یسمع قال کمثل البقر والحمار والشاة، ان قلت لبعضهم کلاما لم یعلم ما تقول غیر انه یسمع صوتک وکذلک الکافر ان امرته بخیر او نهیته عن شر او وعظته لم یعقل ما تقول غیر انه یسمع صوتک "

ابن جریر اور ابن حاتم نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول بیان فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی ﴿ وَمَثَلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا كَمَثَلِ الَّذِيْ يَنْعِقُ بِمَا لَا يَسْمَعُ ﴾ کا مطلب یہ ہے کہ کافر بھیڑ، بکریوں اور بیل اور گدھے کی طرح ہیں اگر تم ان سے کلام کرو تو وہ نہیں جانتے تم کیا کہہ رہے ہو وہ صرف تمہاری آواز سنتے ہیں۔ اسی طرح کافر کو اگر تم اچھے کام کا حکم دو یا برے کام سے منع کرو یا نصیحت کرو تو وہ نہیں سمجھتے کہ تم کیا کہہ رہے ہو وہ صرف تمہاری آواز سنتے ہیں۔ (درمنثور)

☆ " واخرج ابن جریر عن ابن عباس فی الآیة قال مثل الدابة تنادی فتسمع ولا تعقل ما یقال لها کذلک الکافر یسمع الصوت ولا یعقل "

ابن جریر نے بیان فرمایا حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے اس آیۃ کے متعلق بیان فرمایا کہ جس طرح چوپاؤں کو ندا دی جائے تو وہ سنتے ہیں اور سمجھتے نہیں اسی طرح کافر آواز سنتا ہے اور سمجھتا نہیں۔ (درمنثور)

☆ " واخرج وکیع عکرمة فی قوله ینعق بما لا یسمع الا دعاء ونداء قال مثل الکافر مثل البهیمة تسمع الصوت ولا تعقل "

وکیع نے حضرت عکرمہ رضی اللہ عنہ سے اس آیۃ کریمہ کے متعلق یہی بیان کیا کہ کافر چوپاؤں کی طرح ہیں آواز سنتے ہیں اور سمجھتے نہیں۔

يَا أَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوْا كُلُوْا مِنْ طَيِّبَاتِ مَا رَزَقْنَاكُمْ وَاشْكُرُوْا لِلّٰهِ إِنْ كُنْتُمْ إِيَّاهُ تَعْبُدُوْنَ

۱) ''اے ایمان والو کھاؤ ہماری دی ہوئی ستھری چیزیں اور اللہ کا احسان مانو اگر تم اسی کو پوجتے ہو''

۲) ''اے وہ لوگو جنہوں نے ایمان لایا کھاؤ پاکیزہ چیزیں جو ہم نے عطا کیں اور شکر کرو اللہ کا اگر تم اسی کی عبادت کرتے ہو''۔

پہلے عام لوگوں کو حلال اور پاکیزہ چیزیں کھانے کا حکم دیا اب اس آیۃ کریمہ میں ایمان والوں کی عظمت کے پیش نظر ان کو علیحدہ حکم پھر دیا حالانکہ ان کا ذکر بھی ﴿يَا أَيُّهَا النَّاسُ كُلُوْا مِمَّا فِي الْأَرْضِ حَلٰلًا طَيِّبًا﴾ ''اے لوگو کھاؤ جو چیزیں زمین میں ہیں حلال اور پاکیزہ'' میں آچکا تھا۔ اسے تخصیص بعد از تعمیم کہا جاتا ہے کہ عمومی ذکر کے بعد خصوصی ذکر ہوتا کہ خاص کا عظیم الشان اور رفیع الشان ہونا پتہ چل جائے۔ (از روح المعانی)

طیب قرآن پاک میں چار معانی میں استعمال ہے:

(۱) ''طیب بمعنی حلال'' رب تعالیٰ کا ارشاد گرامی ہے ﴿وَلَا تَتَبَدَّلُوا الْخَبِيْثَ بِالطَّيِّبِ ، ای ولا تتبدلوا الحرام بالحلال﴾ اور تم حلال کے بدلے حرام کو حاصل نہ کرو۔

(۲) طیب بمعنی طاہر (پاک) ارشاد باری تعالیٰ ہے ﴿فَتَيَمَّمُوْا صَعِيْدًا طَيِّبًا﴾ تو تیمم کرو پاک مٹی سے۔

(۳) طیب بمعنی حسن (اچھا) رب قدوس نے ارشاد فرمایا ﴿إِلَيْهِ يَصْعَدُ الْكَلِمُ الطَّيِّبُ﴾ اسی کی طرف اچھے کلمات چڑھتے ہیں یعنی رب تعالیٰ کے ہاں مؤمنین کے اچھے کلمات کو شرف قبولیت حاصل ہوتا ہے۔

(۴) طیب بمعنی مومن رب قدوس نے ارشاد فرمایا ﴿لِيَمِيْزَ اللّٰهُ الْخَبِيْثَ مِنَ الطَّيِّبِ﴾ تاکہ اللہ تعالیٰ جدا کر دے کافر کو مومن سے۔ (شیخ زادہ)

دونوں کلاموں کے فرق میں عجیب نکتہ: پہلے خطاب میں فرمایا:

﴿يَا أَيُّهَا النَّاسُ كُلُوْا مِمَّا فِي الْأَرْضِ حَلٰلًا طَيِّبًا﴾

اس آیۂ کریمہ میں ارشاد فرمایا: ﴿ یَا اَیُّھَا الَّذِیْنَ آمَنُوْا کُلُوْا مِنْ طَیِّبَاتِ مَا رَزَقْنَاکُمْ ﴾
پہلا حکم عام لوگوں کو ہے ان کو حکم دیتے ہوئے وسعت فرمائی سوائے حرام کے زمین میں پائی جانے والی تمام چیزوں کو مباح قرار دیا گویا کہ حکم یوں پایا گیا ﴿ کلوا حلالا ﴾ حلال چیزیں کھاؤ۔

" تنبیه علی انه لم یخظر علیهم الا تناول المحرم " حلال چیزوں کے کھانے کا حکم دے کر اس پر تنبیہ کی گئی ہے کہ ان پر حرام چیزوں کے کھانے کے بغیر کوئی چیز منع نہیں۔ اسی وجہ سے اس کے بعد ﴿ وَلَا تَتَّبِعُوْا خُطُوَاتِ الشَّیْطٰنِ ﴾ کو ذکر کیا گیا کہ تم شیطان کے قدموں کی تابعداری نہ کرو کہ اتنی وسعت دینے کے باوجود وہ پھر بھی تمہیں حرام چیزوں کے کھانے کی رغبت دلائے گا اگر تم نے اس کی تابعداری کی تو وہ اپنی دشمنی کی وجہ سے تمہیں برباد کر دے گا۔

مومنین کو خطاب:

اس آیۂ کریمہ میں مومنین کو خطاب ہے جس میں صرف طیب چیزوں کے کھانے کا حکم دیا:

" وامرهم ان لا یتوسعوا فی تناول ما رزقوه بل یتخیروا من الطیب بخیر الناس مما فی الارض "

یعنی مؤمنین کو یہ حکم دیا گیا ہے کہ تم اپنے کھانے میں جو تمہیں رب تعالیٰ نے حلال مال دے رکھا ہے وسعت نہ پیدا کرو زیادہ کھانے کے عادی نہ بن جاؤ بلکہ پاک چیزیں اتنی ہی اختیار کرو جتنی بہتر لوگوں یعنی اللہ تعالیٰ کے مقرب لوگوں کی شان کے لائق ہے کہ وہ زمین میں پائی جانے والی حلال چیزوں کو بھی بقدر ضرورت استعمال کرتے ہیں۔

پہلی آیۃ میں عام لوگوں کو شیطان کی تابعداری سے منع کیا گیا اور شیطان کے مزین کیے ہوئے گناہوں سے بچنے کا حکم دیا لیکن یہاں مومنین کو شکر کرنے کا حکم دیا " الذی هو ارفع منازل للعباد " جو بندوں کے لئے بلند مرتبہ کا ذریعہ ہے۔ بلکہ

اِنْ کُنْتُمْ اِیَّاہُ تَعْبُدُوْنَ : سے اس پر تنبیہ کر دی " ان عبادته تعالیٰ لا تتم الا بشکره " کہ بیشک اللہ تعالیٰ کی عبادت اس وقت تک مکمل ہی نہیں جب تک اس کا شکر ادا نہ کیا جائے۔

شکر کا حکم وجوبی ہے: یہ امر ﴿ واشکروا الله ﴾ اباحت کے لئے نہیں بلکہ وجوب کے لئے ہے

اس لئے کہ ہر عقل مند آدمی کے دل میں یہ اعتقاد ہوتا ہے:

" ان من اوجده وانعم علی بما لم یخص من النعم الجلیلة مستحق لغایة التعظیم وان یظهر بلسانه وبسائر جوارحه "

بیشک وہ ذات جس نے اسے موجود کیا ہے اور بہت بڑی بڑی نعمتیں عطاء کی ہیں یہ ان نعمتوں کے لئے کوئی مختص تو نہیں تھا وہ ذات بہت ہی تعظیم کے مستحق ہے یعنی دل میں اس کی عظمت کا لحاظ کیا جائے اور اس کی عظمت کو ظاہر کرنے کے لئے زبان اور باقی اعضاء سے اظہار (ظاہر) کیا جائے اسے ہی شکر کہا جاتا ہے۔ (از شیخ زادہ)

احادیث مبارکہ: " عن ابی هریرة قال قال رسول الله ﷺ ان الله طیب لا یقبل الا الطیب وان الله امر المؤمنین بما امر المرسلین فقال ﴿ یَا اَیُّهَا الرُّسُلُ کُلُوْا مِنَ الطَّیِّبَاتِ وَاعْمَلُوْا صَالِحًا ﴾ وقال ﴿ یَا اَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا کُلُوْا مِنْ طَیِّبَاتِ مَا رَزَقْنَاکُمْ ﴾ ثم ذکر الرجل یطیل السفر یمدیده الی السماء یا رب یا رب اشعث اغبر مطعمه حرام ومشربه حرام وملبسه حرام وغذی بالحرام فانی یستجاب لذلک " (رواہ مسلم)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا بیشک اللہ تعالیٰ طیب (پاک) ہے وہ سوائے طیب کے کسی اور چیز (یعنی خبیث چیز) کو قبول نہیں کرتا۔ اور بیشک اللہ تعالیٰ نے مومنوں کو وہ حکم فرمایا جو حکم رسولوں کو فرمایا یعنی رب تعالیٰ نے رسولوں کو حکم دیتے ہوئے ارشاد فرمایا:

﴿ یَا اَیُّهَا الرُّسُلُ کُلُوْا مِنَ الطَّیِّبَاتِ وَاعْمَلُوْا صَالِحًا ﴾

"اے رسولو کھاؤ پاکیزہ چیزیں اور اچھے عمل کرو"

اور مؤمنین کو حکم دیتے ہوئے ارشاد فرمایا:

﴿ یَا اَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا کُلُوْا مِنْ طَیِّبَاتِ مَا رَزَقْنَاکُمْ ﴾

"اے ایمان والو کھاؤ پاکیزہ چیزیں جو ہم نے تمہیں عطا کیں"

پھر ایک شخص کا ذکر فرمایا کہ ایک شخص لمبا سفر کر کے آتا ہے اس کے بال بکھرے ہوتے ہیں اس کی حالت پراگندہ ہوتی ہے وہ کہتا ہے اے رب اے رب (یعنی دعا کرتا ہے) اس کی دعا کو کیسے قبول کیا جائے گا۔ جب اس کا کھانا حرام ہو اور پینا حرام ہو اور لباس حرام ہو اور غذا حرام ہو۔

☆ " عن النبی ﷺ یقول اللہ تعالیٰ انی والانس والجن فی نبأ عظیم اخلق ویعبد غیرہ وارزق ویشکر غیری ، اخرجه الطبرانی فی مسندات الشامیین والبیهقی فی شعب الایمان والدیلمی من حدیث ابی الدرداء "

حضرت ابوالدرداء رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کہتا ہے بیشک میں اور انسان اور جن ایک عظیم خبر میں ہیں (یعنی میرا اور انسانوں اور جنوں کا معاملہ عجیب ہے) پیدا میں کرتا ہوں اور وہ عبادت غیروں کی کرتے ہیں اور رزق میں دیتا ہوں وہ شکر غیروں کا ادا کرتے ہیں۔

(از مظهری)

☆ " واخرج ابن ابی شیبة واحمد ومسلم عن انس قال قال رسول اللہ ﷺ ان اللہ لیرضی عن العبد ان یاکل الاکلة ویشرب الشربة فیحمد اللہ علیها "

حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا بیشک اللہ تعالیٰ اپنے بندے سے یہ پسند کرتا ہے کہ کھانے کی کوئی چیز کھائے اور پینے کی کوئی چیز پیئے تو اس پر اللہ تعالیٰ کی حمد کرے۔

(از درمنثور)

یعنی رب تعالیٰ کا دل سے شکر کرے یہی شکر اس کا معتبر ہے کیونکہ جب تک رب تعالیٰ کی تعظیم دل میں نہ ہو صرف زبان سے شکر کرنا یا صرف اعضاء سے شکر کرنا حقیقت میں مطلوب نہیں۔

(از کبیر)

☆☆☆☆☆

﴿ اِنَّمَا حَرَّمَ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةَ وَالدَّمَ وَلَحْمَ الْخِنْزِيْرِ وَمَا اُهِلَّ بِهٖ لِغَيْرِ اللّٰهِ فَمَنِ اضْطُرَّ غَيْرَ بَاغٍ وَّلَا عَادٍ فَلَا اِثْمَ عَلَيْهِ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴾

۱) ''اس نے یہی تم پر حرام کیے ہیں مردار اور خون اور سور کا گوشت اور وہ جانور جو غیر خدا کا نام لے کر ذبح کیا گیا تو جو ناچار ہو نہ یوں کہ خواہش سے کھائے اور نہ یوں کہ ضرورت سے آگے بڑھے تو اس پر گناہ نہیں بیشک اللہ بخشنے والا مہربان ہے''۔

۲) ''بیشک جو حرام کیے اللہ نے تم پر وہ مردار اور خون اور گوشت سور کا اور وہ جانور جو ذبح کیے گئے ہوں اللہ کے غیر کا نام لے کر اور جو مجبور ہو جائے وہ تجاوز نہ کرے اور حد سے نہ بڑھے تو نہیں گناہ اس پر بیشک اللہ بخشنے والا رحم کرنے والا ہے''۔

طلباء کرام کی توجہ کے لئے: بظاہر اعتراض یہ ہے کہ ﴿ اِنَّمَا ﴾ حصر کا فائدہ دیتا ہے اس کا ترجمہ ہوتا ''جز ایں نیست'' (سوائے اس کہ نہیں) اس ترجمہ سے تو یہ صورت بنے گی کہ چار چیزوں کے بغیر اور کوئی چیز حرام نہیں وہ چار چیزیں جو اس آیۃ میں رب تعالیٰ نے بیان فرمادی ہیں مردہ جانور اور خون اور سور کا گوشت اور جن جانوروں پر ذبح کے وقت اللہ کے بغیر کسی اور کا نام لیا جائے۔

حالانکہ ان کے بغیر اور بھی کتنی چیزیں حرام ہیں تو یہاں حصر کا معنی کیسے صحیح ہے؟ اس کے جواب کو سمجھنے کے لئے پہلے یہ سمجھا جائے کہ ﴿ اِنَّمَا حَرَّمَ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةَ ﴾ میں تین قراءتیں ہیں۔ ایک یہ کہ ﴿ اَلْمَيْتَةَ ﴾ منصوب ہے اور ''حرم'' فعل معروف ہے (مبنی للفاعل) اس صورت میں ''ان'' حرف مشبہ بالفعل ہے اور ''ما'' کافہ ہے یعنی ان کو عمل سے روک رہا ہے اب اس صورت میں دو مذہب ہیں ایک یہ کہ ﴿ اِنَّمَا ﴾ حصر کا فائدہ دے رہا ہے اور دوسرا مذہب یہ ہے کہ اس صورت میں ﴿ اِنَّمَا ﴾ حصر کا فائدہ نہیں دے رہا۔ اسی مذہب کو اختیار کرتے ہوئے جواب دیا گیا:

'' قلنا المختار عند الحنفية ما قال نحاة الكوفة ان كلمة انما ليست

للقصر بل هي مركبة من ان للتحقيق وما الكافة "

ہم نے کہا احناف کے نزدیک کوفہ کے نحویوں کا قول معتبر ہے وہ یہ کہتے ہیں کلمہ ﴿ اِنَّمَا ﴾ قصر (حصر) کا فائدہ ہی نہیں دیتا۔ کیونکہ یہ مستقل کلمہ ہی نہیں بلکہ یہ " ان " حرف تحقیق اور " ما " کافہ سے مرکب ہے۔

" وعلى تقدير التسليم فالقصر اضافي بالنسبة الى ما حرمه الكفار من بحيرة وسائبة ووصيلة وحام ونحوها "

اگر بصرہ والے نحویوں کے قول کو تسلیم کر کے قصر (حصر) والا معنی لیا جائے تو قصر اضافی ہے قصر حقیقی نہیں کہ اعتراض وارد ہو سکے بلکہ اضافی ہے بیان کرنے کا مقصد یہ ہے کہ حرام تو وہ چیزیں ہیں جو رب تعالیٰ نے حرام کی ہیں کافر لوگ جو خود اپنے آپ پر حرام کرتے ہیں یہ ان کا باطل مذہب ہے جیسا کہ انہوں نے بحیرہ اور سائبہ اور وصیلہ اور حامی اپنے آپ پر حرام کر لئے ہیں۔

(ماخوز از مختصر المعانی و کواشی ومظہری)

خیال رہے کہ " حامی " سے یاء بوجہ کسرہ کے گرانے اور التقاء ساکنین یاء اور تنوین کے درمیان لازم کی وجہ سے حذف ہوگئی پچھلی آیات میں ان کا ذکر کر دیا گیا ہے۔

قراءت میں دوسری صورت یہ ہے کہ " حرم " فعل معروف ہو اور " میتة " پر رفع ہو بوجہ خبر کے اور ﴿اِنَّمَا﴾ میں " ان " حرف تحقیق ہو اور " ما " موصول ہو اور صلہ میں ضمیر بوجہ قرینہ کے پائے جانے کے حذف ہو اب اس میں پھر دو مذہب ہیں کوفہ کے نحویوں کے نزدیک قصر نہیں تقدیر عبارت یہ ہے " انما حرمه الله عليكم الميتة " بیشک جس چیز کو اللہ نے حرام کیا ہے وہ مراد ہے۔ راقم نے اسی ترجمہ کو اختیار کیا ہے۔

اور بصری نحویوں کے نزدیک قصر والا معنی ہوگا تقدیر عبارت کی یہ ہوگی ﴿ انما حرمه الله عليكم هو الميتة ﴾ اللہ تعالیٰ نے تم پر صرف میتہ وغیرہ کو حرام کیا۔

اب بھی جواب وہی ہوگا کہ یہاں قصر اضافی ہے قصر حقیقی نہیں۔

(ماخوذ از کواشی ومختصر المعانی مع وضاحت راقم)

قراءت میں تیسری صورت یہ ہے کہ " حـــرم "فعل مجہول ہے اور المیتۃ مفعول مالم یسم فاعلہ ہے۔کلمہ " ما " میں دو احتمال ہیں کہ " ما "کافہ ہو یا موصولہ پھر اسی طرح دو مذہب ہیں کہ قصر ہے یا نہیں قصر نہ ہونے کی صورت میں کوئی اعتراض نہیں اور قصر پائے جانے کی صورت میں قصر اضافی ہوگا۔

(از مختصر المعانی وکواشی مع وضاحت راقم)

میتہ سے مراد کیا ہے: میتہ اس جانور کو کہا جاتا ہے جو خود بخود مر جائے اس کو کسی نے ذبح نہ کیا ہو یا کسی نے ذبح تو کیا ہے لیکن اس میں ذبح کی شرائط نہیں پائی گئی۔ (احکام القرآن للجصاص)

زندہ جانور سے گوشت کاٹنے کا حکم: زمانہ جاہلیت میں یہ دستور تھا کہ زندہ جانوروں کے جسموں سے کہیں سے گوشت کاٹ کر پکا لیا جاتا تھا اور کھا لیا جاتا تھا اس کے متعلق ارشاد نبوی یہ ہے:

" عن ابی واقد اللیثی قال قال رسول اللہ ﷺ ما قطع من البھیمۃ حیۃ فھو میتۃ " (اخرجہ ابو داؤد والترمذی حسنہ)

ابو واقد لیثی فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جو گوشت زندہ جانور سے کاٹا وہ مردار ہی ہے یعنی وہ اسی طرح حرام ہے جس طرح مردہ جانور حرام ہے۔ (مظھری)

مردہ جانور سے نفع حاصل کرنا منع ہے:

اس پر اجماع ہے کہ مردہ جانور کو بیچنا اور اس کی قیمت سے نفع حاصل کرنا حرام ہے اسی طرح اس کی چربی سے نفع حاصل کرنا منع کیا گیا ہے اور مردہ جانور کے چمڑے سے دباغت (چمڑے کو خشک کر کے اس سے خون وغیرہ کو دور کر کے کار آمد بنانا) سے پہلے نفع حاصل کرنا منع ہے۔

☆ " عن جابر انہ سمع رسول اللہ ﷺ یقول عام الفتح وھو بمکۃ ان اللہ ورسولہ حرم بیع الخمر والمیتۃ والخنزیر والاصنام فقیل یا رسول اللہ ارأیت شحوم المیتۃ فانہ یطلی بھا السفن ویدھن بھا الجلود ویستصبح بھا الناس فقال لا ھو حرام ثم قال عند ذلک قاتل اللہ الیھود ان اللہ لما حرم شحومھا اجملوہ ثم باعوہ فاکلوا ثمنہ "

(بخاری ومسلم)

حضرت جابر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں انہوں نے رسول اللہ ﷺ کو فتح مکہ کے دن مکہ میں فرماتے ہوئے سنا بیشک اللہ اور اس کے رسول ﷺ نے شراب اور مردار اور سور اور بتوں کی خرید وفروخت حرام

کردی۔ پھر آپ سے سوال کیا گیا یا رسول اللہ مردہ جانوروں کی چربی کے متعلق آپ کی رائے کیا ہے؟ کیونکہ اس کے ذریعے کشتیوں کو تیل لگایا جاتا ہے اور چمڑے کو چربی کا تیل لگایا جاتا ہے اور اس سے لوگ چراغ جلاتے ہیں تو آپ نے فرمایا نہیں (چربی سے نفع حاصل کرنا بھی جائز نہیں) وہ حرام ہے۔ پھر آپ نے فرمایا اللہ تعالیٰ یہود کو برباد کرے بیشک اللہ تعالیٰ نے ان پر مردہ جانوروں کی چربی کو حرام کیا لیکن انہوں نے چربی کو ڈھال کر تیل نکال کر اسے بیچنا شروع کر دیا اور اس کی قیمت کو کھانا شروع کر دیا۔

(از مظہری)

☆ "عن عبد الله بن عكيم قال اتانا كتاب رسول الله ﷺ الا لا تنتفعوا من الميتة باهاب ولا عصب" (رواه احمد والشافعي واصحاب السنن الاربعة)

حضرت عبداللہ بن عکیم رضی اللہ عنہ کہتے ہیں ہمارے پاس رسول اللہ ﷺ کا خط آیا آپ نے فرمایا خبردار مردہ جانور کے چمڑے اور پٹھوں سے نفع حاصل نہ کرو۔ (مظہری)

خیال رہے کہ " اهاب "اس چمڑے کو ہی کہا جاتا ہے جس کو دباغت نہ دی جائے دباغت کے بعد ہر چمڑہ پاک ہو جاتا ہے اس سے نفع حاصل کرنا جائز ہے سوائے انسان کے چمڑے کے کیونکہ انسان رب تعالیٰ کی مخلوق میں مکرم ہے اس لئے اس کے اعضاء سے نفع حاصل کرنا منع ہے۔ اسی طرح خنزیر (سور) کے چمڑے سے دباغت کے بعد بھی نفع حاصل کرنا جائز نہیں وہ مکمل طور پر ناپاک ہے۔

☆ "عن ابن عباس قال سمعت رسول الله ﷺ يقول اى اهاب دبغ فقد طهر" (رواه مسلم)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا ہے جو چمڑہ بھی دباغت دے دیا جائے وہ پاک ہو جاتا ہے۔ (از مظہری)

☆ "وعن عائشة ان رسول الله ﷺ امر ان ينتفع بجلود الميتة اذا دبغت"

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں بیشک رسول اللہ ﷺ نے حکم فرمایا کہ مردہ جانور کے چمڑے کو دباغت دے کر اس سے نفع حاصل کیا جائے۔ (مظہری)

تنبیہ : جن احادیث میں درندے کے چمڑے سے نفع حاصل کرنا منع کیا گیا ہے ان سے مراد بھی دباغت سے پہلے نفع حاصل کرنا مراد ہے دباغت کے بعد جائز ہے۔

دباغت کیا ہے؟ دباغت کی دو قسمیں ہیں حقیقی اور حکمی۔ دباغت حقیقی یہ ہے کہ کیکر کی چھال وغیرہ سے چمڑے کو تیار کیا جائے جیسے آج کل کیمیائی اجزاء کے استعمال سے چمڑے کو تیار کیا جاتا ہے۔
دباغت حکمی یہ ہے کہ چمڑے پر مٹی وغیرہ ڈال کر اور دھوپ میں رکھ کر خشک کرلیا جائے۔ (از کتب فقہ)

مسئلہ: ہر جانور خواہ ذبح کیا گیا ہو یا مردار ہو اس کے بالوں اور ہڈیوں اور خشک پٹھوں اور سینگوں اور پاؤں کی ہڈی سے نفع حاصل کرنا جائز ہے۔ (از مظہری)

انتباہ: بعض ائمہ نے خنزیر کے بالوں سے سلا ہوا جوتا استعمال کرنا بوقت ضرورت جائز قرار دیا۔
لیکن ابن ہمام رحمہ اللہ نے فرمایا" **ان الضرورة لیست ثابتة فی الخرز به بل یمكن ان یقام بغیره** " بیشک ضرورت جوتے کی سلائی میں نہیں پائی جاتی اور دھاگہ وغیرہ سلائی کے لئے حاصل کرنا ممکن ہے ایسے جوتوں کی خرید وفروخت منع ہے۔

" **وقد كان ابن سيرين لا يلبس خفا خزر بشعر الخنزير** "

حضرت ابن سیرین رحمہ اللہ کبھی وہ جوتا استعمال نہیں کرتے تھے جس میں سور کے بال ہوں۔

کیا کوئی جانور ذبح کرنے کے بغیر حلال ہے؟

جی ہاں اس مسئلہ پر رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی موجود ہے:

☆ " **عن ابن عمر قال قال رسول الله ﷺ احلت لنا ميتتان ودمان فاما الميتتان فالجراد والسمک واما الدمان فالطحال والكبد** "

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا دو جانور بغیر ذبح کرنے کے ہی ہم پر حلال ہیں اور دو خون ہم پر حلال ہیں دو غیر مذبوح سے مراد مکڑی اور مچھلی اور دو خونوں سے مراد تلی کا خون اور جگر کا خون۔ (از جصاص)

واضح ہوا کہ مکڑی اور مچھلی ذبح کرنے کے بغیر ہی حلال ہیں۔

تنبیہ: " **عن جابر عن عبد الله قال قال رسول الله ﷺ اذا وجد تموه حيا فكلوه وما القى البحر حيا فمات فكلوه وما وجدتموه ميتاطا فيا فلا تاكلوه** "

حضرت جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جب تم مچھلی کو زندہ

پکڑ و تو اسے کھا سکتے ہو اور جسے دریا نے زندہ ہی باہر پھینک دیا پھر وہ مرگئی اسے بھی کھا سکتے ہو اور جسے تم مردہ پانی پر تیرتا ہوا پاؤ اسے نہ کھاؤ۔ (جصاص)

بعض لوگوں نے اس حدیث پاک سے غلط مطلب سمجھا انہوں نے کہا اس مچھلی کا پانی میں رہنا مراد ہے اور یہی وجہ حرام ہونے کی ہے اگر کوئی جانور ذبح کر کے پانی میں پھینک دیا جائے اور وہ پانی کی سطح میں آجائے تو وہ حرام ہو جائے گا۔ یہ قول غلط اور باطل ہے ذبح کیا ہوا جانور پانی میں ڈالنے سے حرام نہیں ہوتا۔

"ان السمک لو مات ثم طفا علی الماء لاکل ولو مات حتف انفه ولم یطف علی الماء لم یؤکل والمعنی فیه عندنا هو موته فی الماء حتف انفه لا غیر"

مچھلی کو زندہ پکڑا وہ مرگئی پھر اسے پانی میں ڈال دیا گیا وہ پانی کی سطح پر آگئی اسے کھایا جائے جو مچھلی خود بخود مر جائے بیشک وہ پانی پر نہ تیرے اسے نہیں کھایا جائے گا۔

مردہ مچھلی کو نہ کھانے کی اصل وجہ اس کا خود بخود مر جانا ہے اور کوئی وجہ نہیں لہٰذا وہ مچھلی پانی میں ہو یا باہر کنارے میں ہو یہ معلوم نہ ہو کہ پانی نے اسے زندہ ہی باہر پھینکا ہے تو اس کا کھانا جائز نہیں۔
(الجامع لا حکام القرآن للجصاص)

جانوروں کے پیٹ میں بچے کا حکم: جب کسی گائے، بھینس، بھیڑ، بکری اور اونٹنی وغیرہ کو ذبح کیا تو اس کے پیٹ سے مردہ بچہ نکلا تو اس بچے کے گوشت کو کھانا حرام ہے اور اگر زندہ نکلا ذبح نہیں کیا اور مرگیا پھر بھی وہ حرام ہے اور اگر زندہ نکلا اور اسے ذبح کر لیا گیا تو اس کے گوشت کا کھانا حلال ہے یہ قول امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کا ہے یہی درست ہے۔

بعض ائمہ نے کہا جب اس بچے کی ماں کو ذبح کر دیا گیا تو یہ اس بچے کے لئے کافی ہے وہ حلال ہونے یا حرام ہونے میں اپنی ماں کے تابع ہے۔ اس لئے بچہ زندہ نکلے یا مردہ اس کے جسم پر بال نکل آئے تھے یا نہیں نکلے ہر حال میں وہ حلال ہے کیونکہ اس کی ماں ذبح کی وجہ سے حلال ہوگئی۔ ان حضرات نے اپنے موقف پر یہ حدیث پاک پیش کی "عن علی وابن عمر قالا ذکاة الجنین

ذکاۃ امہ" حضرت علی اور حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہم نے فرمایا ماں کے پیٹ میں بچے کا ذبح اس کی ماں کا ذبح ہی ہے اس کا جواب یہ ہے " وھذہ الاخبار کلھا واھیة السند " اس مسئلہ میں اس قسم کی آنے والی تمام روایات کی اسناد میں ضعف پایا گیا ہے ضعیف حدیثوں سے کسی حرام چیز میں حلت ثابت نہیں ہو سکتی۔

دوسرا جواب یہ ہے کہ جو حدیث پیش کی گئی ہے اس میں دو احتمال پیش کئے گئے ہیں ایک تو وہی جو بعض حضرات نے بطور دلیل پیش کیا ہے کہ " ذکاۃ الجنین ذکاۃ امہ " کا معنی یہ ہوگا" ان ذکاۃ امہ ذکاۃ لہ " بیشک اس کی ماں کا ذبح کرنا اس کا ذبح کرنا ہے۔

لیکن دوسرا احتمال یہ ہے کہ بچے کو ذبح کرنے کا وجوبی طور پر حکم دیا گیا ہو حدیث پاک کا مطلب یہ ہو " تذکیتہ کما تذکی امہ " اس بچے کو ذبح کرنے کا وہی حکم ہے جو اس کی ماں کے ذبح کرنے کا حکم ہے " کاف " عام طور پر محذوف ہوتا رہتا ہے جیسا کہ رب تعالیٰ نے فرمایا ﴿ جَنَّةٍ عَرْضُهَا السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ ﴾ اس کا معنی ہے " کعرض السموات والارض " جنت کی چوڑائی آسمانوں اور زمین کی چوڑائی کی طرح ہے۔ اسی طرح کہا جاتا ہے " قولی قولک " یعنی " قولی کقولک " میرا قول تمہارے قول کی طرح ہے۔ اور کہا جاتا ہے " مذھبی مذھبک " میرا مذہب تمہارے مذہب کی طرح ہے یعنی " مذھبی کمذھبک " کسی شاعر نے اپنی محبوبہ کو ہرنی سے تشبیہ دے کر اس کی تعریف کرتے ہوئے محبوبہ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا:

فعیناک عیناھا وجیدک جیدھا سوی ان عظم الساق منک دقیق

تو تمہاری آنکھیں اس کی آنکھوں کی طرح ہیں اور تمہاری گردن اس کی گردن کی طرح ہے سوائے اس کے کہ اس کی پنڈلی کی ہڈی تم سے باریک ہے۔

اس شعر میں بھی کاف محذوف ہے۔ واضح ہوا کہ اس حدیث پاک کا زیادہ واضح مطلب ہی یہ ہے کہ اس بچے کو ایسے ہی ذبح کیا جائے جیسا کہ اس کی ماں کو ذبح کیا گیا ہے۔

(ماخوذ از الجامع لاحکام القرن للجصاص)

چوہے وغیرہ کا گھی میں مرجانے کا حکم:

" عن الزهری عن سعید بن المسیب عن ابی هریرة قال سئل النبی ﷺ عن الفارة تقع فی السمن فقال علیه السلام ان کان جامدا فالقوها وما حولها وان کان مائعا فلا تقربوه "

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ سے سوال کیا گیا کہ چوہا گھی میں گر جائے تو اس کا کیا حکم ہے؟ آپ نے فرمایا اگر گھی منجمد (جما ہوا) ہے تو جہاں گرا ہے اس کے اردگرد سے گھی نکال لیا جائے اور چوہے کو بھی نکال کر پھینک دیا جائے اور اگر گھی پگھلا ہوا ہے تو اس کے قریب نہ جاؤ۔

تنبیہ: حدیث شریف میں جو حکم بیان ہے اس کا تعلق کھانے سے ہے اگر یہی گھی جو پگھلا ہوا تھا اور چوہا اس میں گر کر مر گیا وہ بیچ دیا اور یہ واضح کر دیا جائے کہ اس میں چوہا گر کر مر گیا ہے تو اس کا بیچنا جائز ہے اس لئے چراغ جلانے کشتیوں وغیرہ کی لکڑیوں پر اسے استعمال کرنا جائز ہے۔ یعنی جس طرح گدھے وغیرہ کو بیچنا جائز ہے کہ اس سے نفع حاصل کیا جائے لیکن اسے کھایا نہ جائے یہی حکم اس گھی کا بھی ہے کیونکہ یہ نجس العین نہیں۔ (از جصاص)

ہنڈیا میں پرندہ گر کر مرجانے کا حکم:

علی بن مسہر کہتے ہیں کہ میں امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے پاس تھا آپ کے پاس ابن مبارک آئے جنہوں نے خراسانی ہیئت (شکل) اختیار کی ہوئی تھی انہوں نے امام صاحب سے سوال کیا کہ ایک شخص نے ہنڈیا کو آگ پر چڑھایا اس میں گوشت تھا ایک پرندہ اس پر سے گزرتے ہوئے گر کر مر گیا تو اس کا حکم کیا ہے؟

امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ نے اپنے اصحاب سے پوچھا کہ تمہارے نزدیک اس کا کیا حکم ہے؟ انہوں نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے قول سے دلیل پیش کرتے ہوئے کہا کہ شوربا انڈیل دیا جائے اور گوشت دھو کر کھا لیا جائے۔ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ نے فرمایا کہ ہم بھی یہی کہتے ہیں لیکن اس میں تفصیل ہے وہ یہ ہے۔

" فان کان وقع فیها فی حال سکونها فکما فی هذه الروایة وان وقع فیها فی حال غلیانها لم یؤکل اللحم ولا المرق "

اگر پرندہ گرا ہے جب کہ ہنڈیا جوش نہیں مار رہی تھی تو پھر یہی حکم ہی کہ شوربا انڈیل دیا جائے اور گوشت دھوکر کھالیا جائے لیکن پرندہ اگر ہنڈیا کے جوش مارتے وقت گرے تو شوربا اور گوشت دونوں چیزوں کو کھانا منع ہے۔

حضرت ابن مبارک نے اس تفصیل کی وجہ پوچھی تو آپ نے بتایا کہ جب جوش مارتے وقت پرندہ گرے تو اس کی نجاست گوشت کے اندر سرایت کر جاتی ہے۔ اور جب ہنڈیا جوش نہ مار رہی ہو تو پرندہ گرے تو وہ گوشت میں اثر انداز نہیں ہوتا۔ زیادہ سے زیادہ گوشت اوپر سے میلا (گندہ) ہو گیا اسے دھوکر کھالیا جائے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت مطلق ہے اس میں یہ دونوں احتمال پائے جاسکتے ہیں جن کی تفصیل امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ نے بیان فرمادی سبحان اللہ امام اعظم رحمہ اللہ کا کلام بھی اعظم ہے۔

روایت ابن عباس: " روی ابن المبارک عن عثمان بن عبد الله الباهلی قال حدثنی عکرمة عن ابن عباس فی طیر وقع فی قدر فمات فقال یهراق المرق ویؤکل اللحم "

حضرت عکرمہ فرماتے ہیں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا جب کوئی پرندہ ہنڈیا میں گر جائے اور مر جائے تو شوربا گرا دیا جائے اور گوشت (دھوکر) کھالیا جائے۔ اس روایت میں گوشت کے جوش مارنے کی حالت میں پرندے کے گرنے کا ذکر نہیں لہٰذا امام صاحب رحمہ اللہ کی تفصیل بہت درست ہے۔

اعتراض: حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے ایک روایت اور ثابت ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ پرندہ ہنڈیا کے جوش مارنے کی حالت میں بھی گر کر مر جائے تو گوشت کا کھانا جائز ہے۔

" روی محمد بن ثوبان عن السائب بن خباب انه کان له قدر علی النار فسقطت فیها دجاجة فماتت ونضجت مع اللحم فسألت ابن عباس فقال اطرح المیتة واهرق المرق وکل اللحم فان کرهته فارسل الی منه عضوا او عضوین "

محمد بن ثوبان سائب بن خباب سے روایت کرتے ہیں کہ ان کی ہنڈیا آگ پر پک رہی تھی اس میں مرغی گر کر مر گئی اور گوشت کے ساتھ پک گئی تو میں نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے اس کے

متعلق سوال کیا تو آپ نے فرمایا کہ مردار کو پھینک دو، شوربا بہادو، اور گوشت کھالو اگر تمہیں گوشت کھانے میں کراہت محسوس ہو تو گوشت کا ایک یا دو عضو میری طرف بھی بھیج دو۔

اس حدیث سے پتہ چلا کہ ہنڈیا جوش مار رہی تھی اسی وجہ سے مرغی اس میں پک گئی تو امام صاحب کی توجیہ کس طرح صحیح ہی؟

جواب: " لا دلالة فيه على حال الغليان لانه جائز ان يكون وقعت فيه بعد سكون الغليان والمرق حار فنضجت فيه والله سبحان اعلم "

اس روایت میں یہ کوئی دلالت نہیں پائی گئی کہ وہ مرغی ہنڈیا کے جوش مارنے کی حالت میں گری ہو سکتا ہے کہ ہنڈیا کا جوش ختم ہونے کے بعد گری ہو شوربے کے گرم ہونے کی وجہ سے پک گئی ہو۔ (اس کی نجاست گوشت کے اندر اثر انداز نہ ہوئی ہو) (از جصاص)

خیال رہے کہ " نضج " کا معنی کامل طور پر پک کر تیار ہونا مراد بھی نہیں بلکہ پکنے کی حالت کو "نضج" کہا جاتا ہے۔

والدم: "اور خون" یعنی جو چیزیں تم پر اللہ تعالیٰ نے حرام کی ہیں ان میں سے خون بھی ہے جو حرام ہے۔

کون سا خون حرام ہے: خون سے مراد بہنے والا خون ہے کیونکہ دوسری آیۃ میں ﴿ اَوْ دَمًا مَّسْفُوْحًا ﴾ ذکر فرمایا جس سے واضح ہوتا ہے کہ مراد " دم مسفوح " بہنے والا خون ہی ہے۔ البتہ جس طرح پہلے حدیث پاک بیان کر دی گئی کہ دو بہنے والے خون حلال ہیں یعنی تلی اور جگر کا خون بہنے کے باوجود حلال ہے۔ ذبح کے وقت جو خون نکلے یا زخم سے اور پھوڑے وغیرہ کے پھٹ جانے سے جو خون نکلے وہ حرام ہے۔

دم مسفوح نجاست غلیظہ ہے: بہنے والا خون اگر جسم اور کپڑے پر درھم سے کچھ زائد ہو جائے تو اس کا دھونا فرض ہے اس کے ہوتے ہوئے نماز ادا نہیں ہوگی۔ اگر درہم کی مقدار ہو جائے تو واجب ہے کہ اسے دھو دیا جائے درھم کی مقدار یہ ہے کہ ہاتھ کو سیدھا اکڑا کر رکھے اور پانی ہتھیلی میں ڈالے جتنی جگہ پانی رک جائے اتنی مقدار ہے درھم کی۔

مسئلہ: جسم کے کسی حصہ سے خون کے نکلنے سے وضوء ٹوٹ جاتا ہے۔ ہاں اگر خراش آئے خون

ظاہر ہوا لیکن آگے نہیں چلا تو وضو نہیں ٹوٹے گا۔ دانتوں سے خون نکلے تو تھوک کر دیکھے اگر تھوک زردی مائل ہو تو وضو نہیں ٹوٹا اگرچہ وضو بنا کر لینا بہتر ہے اور اگر تھوک سرخی مائل ہو تو وضو ٹوٹ گیا۔ جو خون وضوء کو توڑ دیتا ہے وہ ناپاک ہے اور جو خون وضوء کو نہیں توڑتا وہ ناپاک نہیں۔ (از شامی)

ذبح کے بعد گوشت میں رہ جانے والے خون کا حکم:

" واما اللحم يخالطه الدم فلا بأس به " گوشت میں جو خون پایا جاتا ہے اس میں کوئی حرج نہیں یعنی وہ حلال اور پاک ہے۔ خون کے جو اجزاء گوشت میں رہ جاتے ہیں اور رگوں میں رہ جاتے ہیں ان کا کھانا جائز ہے اس مسئلہ میں فقہاء کرام کا کوئی اختلاف نہیں۔

" الا ترى انه متى صب عليه الماء ظهرت تلك الاجزاء وليس هو بمحرم اذ ليس هو مسفوحا "

کیا تم دیکھتے نہیں ہو کہ جب اس پر پانی بہایا جائے تو خون کے اجزا ظاہر ہو جاتے ہیں حالانکہ وہ حرام نہیں کیونکہ وہ بہنے والا خون نہیں۔

☆ " روى القاسم بن محمد عن عائشة انها سئلت عن الدم يكون في اللحم والمذبح قالت انما نهى الله عن الدم المسفوح "

قاسم بن محمد رحمہ اللہ سے مروی ہے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے سوال کیا گیا کہ جو خون گوشت میں رہ جاتا ہے اور ذبح کرنے کے بعد جانور میں خون رہ جاتا ہے اس کا حکم کیا ہے تو آپ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے بہنے والے خون سے منع فرمایا ہے۔ (از جصاص)

آپ کا مطلب یہ تھا کہ جو خون گوشت میں رہ جاتا ہے اس سے رب تعالیٰ نے منع نہیں فرمایا۔ جب رب تعالیٰ نے منع نہیں فرمایا تو حلال ہے۔

آپ کے ارشاد سے واضح ہو گیا کہ جس چیز سے رب قدوس نے منع نہ فرمایا ہو وہ حلال رہتی ہے کیونکہ اشیاء میں اصل اباحت ہے۔ (راقم)

☆ " وقد روت عائشة رضى الله عنها قالت كنا نطبخ البرمة على عهد رسول الله ﷺ تعلوها الصفرة من الدم فناكل ولا ننكره "

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ ہم رسول اللہ ﷺ کے زمانہ میں ہنڈیا پکاتی تھیں

گوشت کے اوپر خون کی وجہ سے زردی آ جاتی تھی ہم اسے کھالیتے تھے کبھی ہم نے اس کا انکار نہیں کیا۔ (از قرطبی)

شرعی ضابطہ: " لان التحفظ من هذا اصر وفيه مشقة والاصر والمشقة فى الدين موضوع وهذا اصل فى الشرع "

شرع میں قانون اور ضابطہ یہ پایا گیا ہے کہ جس کام میں مشقت اور بوجھ پایا جائے اسے شریعت میں رب تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ اٹھا لیتے ہیں گوشت میں رہ جانے والے خون سے بچنا بھی مشکل اور مشقت کا سبب تھا اسی وجہ سے اسے حلال کر دیا گیا اس کے حرام ہونے کا حکم نہیں دیا گیا۔

اسی ضابطہ کی وجہ سے جو کام امت پر حرج کا سبب بنے ہیں عبادت میں ان کو عبادات میں سے ساقط کر دیا گیا۔ (ہٹا دیا گیا) یہی وجہ ہے کہ جو شخص مجبور ہو جائے اسے مردار کھانے کی اجازت دے دی گئی۔ (جس کا ذکر تفصیل سے انشاء اللہ اسی آیۃ کریمہ کے آخر میں آ رہا ہے) اور مریض کو روزہ افطار کرنے کی اور تیمم کرنے کی اجازت دی گئی۔ (از قرطبی)

مچھلی کا خون پاک اور حلال ہے: قالیسی رحمہ اللہ سے مروی ہے کہ مچھلی کا خون پاک ہے اور انہوں نے یہ بھی بیان کیا ہے کہ یہ حلال ہے اور یہی قول ابن عربی رحمہ اللہ کے نزدیک معتبر ہے۔

" **لانه لو كان دم السمك نجسا لشرعت ذكاته** اسی لئے کہ اگر مچھلی کا خون نجس ہوتا تو مچھلی کو ذبح کرنا بھی شریعت میں لازم ہوتا۔

یہی مذہب امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کا ہے مچھلی کا خون حقیقت میں خون ہی نہیں صرف اس کے ظاہری رنگ کو دیکھ کر اس پر "دم" (خون) کا لفظ بول لیا جاتا ہے اس لئے کہ قانون یہ ہے کہ خون دھوپ پر سیاہ ہو جاتا ہے لیکن مچھلی کا خون دھوپ پر سفید ہو جاتا ہے اس سے پتہ چلا کہ مچھلی کا خون حقیقت میں خون ہی نہیں۔

اعتراض: گوشت خون سے پیدا ہوتا ہے اللہ تعالیٰ نے مچھلی کے لئے " لحما طريا " (تر و تازہ گوشت) کے الفاظ کا استعمال کیا ہے تو کس طرح کہا جاتا ہے کہ مچھلی میں خون نہیں۔

جواب: ﴿ لحم ﴾ بھی مچھلی پر ایسے ہی بولا گیا ہے جیسے ﴿ دم ﴾ بولا گیا ہے اس لئے کہ ضابطہ یہ ہے

کہ خون میں حرارت (گرمی) اور پانی میں برودت (ٹھنڈک) پائی جاتی ہی اسی وجہ سے دموی (خون والے جانور) ہمیشہ پانی میں نہیں رہ سکتے۔

بطخ اور مرغابی میں خون پایا جاتا ہے اس لئے وہ ہمیشہ پانی میں نہیں رہتیں حالانکہ مچھلی کی پیدائش بھی پانی میں ہوتی ہے اور ہمیشہ ہی پانی میں رہتی ہے پانی کے بغیرہ زندہ رہ ہی نہیں سکتی اسی سے واضح ہو گیا کہ مچھلی میں خون نہیں۔ (ماخوذ از قرطبی ونور الانوار)

جانوروں کے حلال ہونے اور حرام ہونے پر شاندار ضابطہ:

کل حرام جانور یہ ہی نہیں بلکہ اسکے علاوہ کتا، بلی، گدھا وغیرہ سب حرام ہیں عالمگیری میں اسکی پہچان کا عجیب قاعدہ بیان کیا وہ یہ کہ جانور دو قسم کی ہیں، دریائی اور خشکی کے، دریائی سب حرام ہیں سوائے مچھلی کے۔ خشکی والے پھر دو طرح کی ہیں، پرندے اور چرندے، یعنی ہوائی اور زمینی۔ پرندے پھر دو قسم کے ہیں ایک خون والے اور بغیر خون کے۔ جن میں بہنے والا خون نہیں وہ سب حرام ہیں سوائے مکڑی کے۔ خون والے پرندے جو پنجے سے پکڑ کر چیز کھائیں وہ حرام باقی حلال۔ زمینی جانور بھی دو طرح کے ہیں خون والے اور بغیر خون کے جن میں خون نہیں وہ سب حرام ہیں۔ اور خون والے جو دوسرے پر حملہ کرنیوالے درندے ہیں جیسے کتا، بلی، شیر وغیرہ یہ سب حرام ہیں باقی حلال۔ اور خون والے حشرت الارض کیڑے مکوڑے وغیرہ اور موذی جانور بچھو، سانپ، چوہا، چھپکلی وغیرہ سب حرام ہیں۔
(از نعیمی)

مسئلہ : حلال جانوروں کی یہ چیزیں حرام ہیں، خون بہنے والا، پتہ، مثانہ، نر کا ذکر، مادہ کی فرج ذکر اور مؤنث کی دبر۔ (از نعیمی)

فائدہ : تلی اور گردہ نبی کریم ﷺ کو ناپسند تھے ایسے ہی اوجڑی وغیرہ۔ اور بکری کا دست (اگلے پاؤں) اور سینہ کا گوشت بھی حضور ﷺ کو پسند تھا۔ (از نعیمی)

طوطے کا حکم: " یحرم اکلها علی الاصح فی الرافعی ونقله فی البحر عن الضمیری واقره وعلل ذلک بخبث لحمها "

طوطے کا کھانا حرام ہے صحیح قول یہی ہی رافعی میں یہی مذکور ہے اور البحر الرائق ضمیری سے یہی

ذکر کیا ہے پھراس قول کواسی طرح ثابت رکھا ہے کوئی رد نہیں کیا اور علت اس کی یہ بیان کی گئی ہے کہ اس کا گوشت خبیث (ناپاک) ہے۔ تاہم بعض حضرات نے حلال بھی کہا ہے کہ یہ پاکیزہ چیزیں کھاتا ہے اور زہریلے جانوروں سے نہیں، اور دوسرے پرندوں کا شکار نہیں کرتا اور نہ ہی اس کے قتل کا حکم دیا گیا ہے اور نہ ہی اس سے منع کیا گیا ہے یہ تمام وجوہ ہیں حلال ہونے کی۔ لیکن صحیح وہی جو جلیل القدر فقہاء کرام نے بیان کیا ہے کہ یہ حرام ہے۔ (از حیوۃ الحیون)

مور کا حکم: "**یحرم اکل لحم الطاؤس لخبث لحمه**" مور کا گوشت کھانا حرام ہے کیونکہ اس کا گوشت خبیث (ناپاک) ہے۔ تاہم اس میں بھی ایک قول حلال ہونے کا ملتا ہے کہ یہ گندی چیزیں نہیں کھاتا۔ لیکن جب حرام ہونا واضح طور پر ملتا ہے تو حرام ہی سمجھا جائے۔ (از حیوۃ الحیوان)

مور کے پر دوسرے پرندوں کے پروں کی طرح پاک ہیں خوبصورتی کی وجہ سے لوگ قرآن پاک میں رکھ لیتے ہیں یہ جائز ہے۔ شیخ سعدی رحمہ اللہ نے بھی قرآن پاک میں مور کے پروں کا خوبصورتی کی وجہ سے رکھنے کا ذکر اپنے کتاب گلستان میں کیا ہے۔ گویا کہ یہ قدیم زمانہ کا رواج ہے جب جائز ہے تو اس پر کسی قسم کی بحث کی ضرورت نہیں۔ (راقم)

خنزیر: یہ مردار کھاتا ہے۔ یہ اپنی مؤنث کی پیٹھ پر سوار ہو جاتا ہے اور وہ چرتی رہتی ہے کئی میلوں تک وہ چلتی رہتی ہے یہ اس کی پیٹھ پر سوار رہتا ہے۔ یہ جب کسی کتے کو کاٹ لے تو اس کے بال گر جاتے ہیں اسے بیشک گھڑیال بھی لیں اس کی بے حیائی والی حرکات میں کوئی فرق نہیں آتا۔ سانپ کو یہ کھالیتا ہے سانپ کا زہر اس پر اثر نہیں کرتا۔ اگر یہ تین دن بھوکا رہے پھر دو دن کھالے تو موٹا ہو جاتا ہے اسے گدھے کے ساتھ باندھ دیں جب گدھا پیشاب کرے تو یہ مر جاتا ہے۔ اس کی ایک آنکھ نکال دیں تو یہ جلدی مر جاتا ہے۔ یہ جب مریض ہو جائے تو کیکڑا کھائے تو ٹھیک ہو جاتا ہے۔ شہوت بھی اس میں بہت ہے اور بے حیا بھی ہے۔ خنزیرنی جب پندرہ سال کی ہو جائے تو اس کی اولاد کا سلسلہ ختم ہو جاتا ہے خنزیر کی نسل تیزی سے پھیلتی ہے۔ (حیوۃ الحیوان)

کبھی پاکستانیوں نے سوچا ہے کہ آج کل خنزیروں کی بہتات کیوں ہے؟ اسکی صرف وجہ یہ ہے کہ تیل کمپنیوں کے انگریزوں نے خنزیر کے بچوں کے جوڑے لا کر پاکستانی جنگلوں میں چھوڑ دیئے۔

انگریز کی یاری کا یہ فائدہ حاصل ہوا کہ آج کل کھیتی باڑی تباہ ہو رہی ہے خنزیروں کو ختم کرنا اب ممکن نظر نہیں آتا

ولحم الخنزیر : (اور سور کا گوشت) یعنی تم پر سور کا گوشت حرام کردیا ہے۔سور (نجس العین) یعنی مکمل طور پر ناپاک ہے اس کا گوشت، ہڈیاں، پٹھے اور بال وغیرہ تمام اعضاء اس کے ناپاک ہیں ان سے نفع حاصل کرنا جائز نہیں۔خنزیر اور اس کے تمام اعضاء گوشت وغیرہ کی خرید وفروخت حرام ہے۔(از کتب فقہ)

سوال وجواب : افریقہ کے ایک دوست نے یہ مسائل پوچھے تھے کہ ہمارے علاقہ میں صابن وغیرہ ایسا ملتا ہے جس میں مردہ جانوروں کی چربی استعمال ہوتی ہے ان کا استعمال جائز ہے یا نہیں۔اسی طرح دانتوں والے برش میں سور کے بال استعمال ہوتے ہیں ایسے برش کا استعمال شرعاً جائز ہے یا نہیں۔اور بعض صابنوں میں سور کی چربی استعمال ہوتی ہے اس کا حکم کیا ہے؟

راقم نے جو جواب تحریر کر کے دیا تھا اس کا خلاصہ یہ ہے کہ اگر صابن مردہ جانور کی چربی کے بغیر دوسرے تیل سے بنا ہوا ملتا ہے تو مردہ جانور کی چربی والا استعمال جائز نہیں۔اگر اور کوئی صابن نہیں ملتا تو عذر ہے اس صابن کو استعمال کیا جا سکتا ہے لیکن یہ صابن نجس (ناپاک) ہے اس لئے جس کپڑے یا جسم پر استعمال کیا جائے تو اس کے بعد تین مرتبہ پانی سے پاک کرنا ضروری ہے کیونکہ ناپاک صابن سے جسم ناپاک ہو گیا ہے۔ایسا برش جس میں سور کے بال ہوں اور یقین ہو اس برش کا استعمال کرنا حرام ہے تاہم پاکستان میں اکثر طور پر دانتوں والے برش پلاسٹک کے بالوں سے تیار ہیں جن کا استعمال جائز ہے ممکن ہے عیسائیوں کے یار سور کے بالوں والے برش استعمال کرتے ہوں تو یہ حرام ہے۔سور کی چربی والا صابن جب یقین ہو کہ اس میں سور کی چربی استعمال کی گئی ہے اسے استعمال کرنا حرام ہے۔

(واللہ اعلم بالصواب)

تنبیہ : کسی حرام جانور کو مسلمان اللہ تعالیٰ کا نام لے کر ذبح کر دے تو وہ حلال تو نہیں ہوتا لیکن گوشت اس کا پاک ہو جاتا ہے وہ گوشت یا گوشت میں رہ جانے والا خون انسان کے جسم یا کپڑے کو لگ جائے تو وہ جسم اور کپڑا ناپاک نہیں ہوگا۔خنزیر کو مسلمان اللہ کا نام لے کر ذبح بھی کر دے پھر بھی وہ حرام اور نجس (ناپاک) ہی رہے گا۔ (از کتب فقہ)

مسئلہ : کسی کافر کا ذبح کیا ہوا جانور حلال نہیں ہوتا البتہ اہل کتاب کا ذبح کیا ہوا جانور حلال

ہو جاتا ہے کیونکہ ان کا اللہ تعالیٰ پر ایمان ہوتا ہے۔ لیکن آج کل زیادہ اہل کتاب یعنی یہود و نصاری زندیق، دہریئے ہیں جن کا اللہ تعالیٰ پر اور قیامت پر ایمان نہیں ان کا ذبح کیا ہوا جانور حرام ہوتا ہے۔ زیادہ طور پر وہ بڑے جانور کو گولی مار کر ہلاک کر دیتے ہیں جو حرام ہو جاتا ہے۔

یہ بھی خیال رہے کہ بندوق کی گولی مسلمان بسم اللہ پڑھ کر جانور پر چلائے تو وہ گولی سے مر جائے تو حرام ہے کیونکہ گولی جانور کو پھاڑتی نہیں بلکہ اس کی ضرب سے جانور مر جاتا ہے۔

پکی گولی اگرچہ پھاڑتی ہے لیکن جس جانب سے وہ لگتی ہی اس جانب سے صرف سوراخ کرتی ہی دوسری جانب سے گولی کا بارود اور اس میں ملے ہوئے لوہے کی ٹکڑے پھاڑتے ہیں اس لئے وہ بھی حرام ہی ہوتا ہے۔

یہود و نصاری آج کل مرغی کی گردن پکڑ کر کھینچ کر ہلاک کر دیتے ہیں اور بھیڑ بکری کے سر میں دماغ کے اندر کیل ٹھونک کر مار دیتے ہیں اس لئے یہود و نصاری کے ہاتھوں مارے ہوئے جانوروں کا گوشت کھانا حرام ہے۔ (از کتب فقه بمع وضاحت راقم)

مسئلہ : مردہ مرغی کے پیٹ سے پکا انڈا نکلے تو اس کا کھانا جائز ہے اور کچا انڈا جس پر سخت خول نہ آئے اس کا کھانا جائز نہیں۔ ذبح کی ہوئی مرغی کے پیٹ سے پکا انڈا نکلے یا کچا اس کا کھانا جائز ہے۔

(از قرطبی)

تنبیہ : انفحه (بکری کے بچے کے معدے سے بنا ہوا پنیر (المنجد) سے جو پنیر حاصل ہوتا ہے یعنی دودھ کو منجمد کرنے کے لئے، کھویا بنانے کے لئے "انفحه" کا استعمال بعض حضرات نے جائز قرار دیا ہے خواہ مردار سے حاصل ہو۔ کہ نبی کریم ﷺ کے پاس پنیر عجم سے آتا تھا جو آپ نے استعمال کیا ہے حالانکہ وہ انفحہ مردہ جانوروں سے حاصل کیا جاتا تھا۔

اس کا جواب یہ ہے کہ صحابہ کرام فتوحات کے بعد عجم میں پھیل گئے تھے ذبح کئے ہوئے جانوروں کے انفحه سے حاصل ہونے والا پنیر استعمال کیا گیا۔

لیکن مردہ جانوروں کے انفحه سے بنایا جانے والا پنیر (کھویا) حرام ہے۔ (ماخوذ از قرطبی)

☆ " عن سلمان الفارسی قال سئل رسول اللہ ﷺ عن السمن والجبن والفراء فقال الحلال ما احل اللہ فی کتابه والحرام ما حرم اللہ فی کتابه وما سکت عنه فهو مما عفا عنه "

حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ سے سوال کیا گیا "گھی" اور پنیر (کھویا) اور جنگلی گدھے کے متعلق۔ تو آپ نے فرمایا حلال وہ ہے جو اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں حلال کر دیا ہے اور حرام وہ ہے جو اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں حرام کیا ہے۔ اور جس سے سکوت (خاموشی کو) اختیار کیا ہے وہ معاف ہے۔

اس حدیث پاک سے واضح ہوا کہ مردہ جانور سے حاصل ہونے والا انفحہ حرام ہے لہذا جب اسے دودھ میں استعمال کر کے کھویا بنائے جائے تو وہ کھویا بھی حرام ہے۔ اور حلال جانور سے حاصل ہونے والا انفحہ حلال ہے جب اسے دودھ میں ڈال کر کھویا بنایا جائے تو وہ حلال ہے۔ (ماخوذ از قرطبی)

تنبیہ : جس چیز کو نبی کریم ﷺ حلال کر دیں وہ حلال ہے اور جس چیز کو نبی کریم ﷺ حرام کر دیں وہ حرام ہے وہ دراصل رب تعالیٰ کے حکم سے ہوتا ہے لہٰذا گویا کہ وہ کتاب اللہ کا حکم ہی ہوتا ہے۔

☆ " وعن المقدام بن معد یکرب قال قال رسول اللہ ﷺ الا انی اوتیت القرآن ومثله معه الا یوشک رجل شبعان علی اریکته یقول علیکم بهذا القرآن فما وجدتم فیه حلال فاحلوه وما وجدتم فیه من حرام فحرموه وان ما حرم رسول اللہ کما حرم اللہ الا لا یحل الحمار الاهلی ولا کل ذی ناب من السباع ولا لقطة معاهد الا ان یستغنی عنها صاحبها ... الخ ، رواه ابو داؤد روی الدارمی نحوه وکذ ابن ماجه الی قوله کما حرم اللہ "
(مشکوۃ کتاب الاعتصام بالکتاب والسنة)

مقدام بن معد یکرب فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا خبردار بیشک مجھے قرآن پاک اور اس کی مثل (حدیث پاک) عطا کئے گئے۔ خبردار ایک وقت میں ایک شخص امیر آرام دہ کرسی پر بیٹھنے والا کہے گا۔ تم پر لازم ہے کہ صرف قرآن پر عمل کرو۔ جو قرآن میں حلال پاؤ وہی حلال ہے اور جو قرآن میں حرام پاؤ وہی حرام ہے بیشک اللہ کے رسول نے جس چیز کو حرام کیا وہ ایسے ہی حرام ہے جیسے اللہ تعالیٰ نے کسی چیز کو حرام کیا۔ خبردار تمہارے لئے گھریلو گدھے حلال نہیں۔ اور درندے حلال نہیں (جیسے شیر، چیتا، بھیڑیا وغیرہ۔ دوسری حدیث میں دوسرے پرندوں کا شکار کرنے والے پرندوں کو بھی حرام قرار دیا جیسے

چیل، باز وغیرہ)اور کسی ذمی (جس سے تمہارا معاہدہ ہو کہ تو ہمارے ملک میں رہ سکتا ہے ہم تیرے مال اور تیری جان کے محافظ ہیں باوجود اس کے کہ وہ کافر ہوتا ہے) کی گری ہوئی چیز تمہارے لئے حلال نہیں ہاں اگر اس کا مالک اس سے بے پرواہ ہو۔

اس حدیث میں ذمی کی گری ہوئی چیز کا ذکر کیا ہے حالانکہ مسلمان کی گری ہوئی چیز کا بھی یہی حکم ہے کہ وہ چیز اٹھانے والا خود استعمال نہ کرے ہاں اگر کوئی حقیر چیز ہو پتہ ہو کہ مالک اسے تلاش نہیں کر رہا ہوگا، تو وہ کسی غریب کو دے دے، یا خود محتاج ہو تو استعمال کر لے۔

ذمی کے ذکر کا مقصد یہ ہے کہ بعض اوقات انسان لاپرواہی سے کام لیتا ہے کہ چلو یہ چیز تو کافر کی ہے اسے کیا دینی ہے واضح ہوا کہ رسول اللہ ﷺ کی طرف سے حلال ہونے والی چیزیں یا حرام ہونے والی چیزیں قرآن پاک کے مطابق ہی ہیں کیونکہ آپ وہی ارشاد فرماتے ہیں جو اللہ تعالیٰ کا حکم ہوتا ہے۔

اعتراض: تم نے کہا ہے مردہ جانور کا انفحہ (بکری کے بچے کے معدہ کے ساتھ پایا جانا والا کوئی عضو) حرام ہے۔ حالانکہ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ نے اسے پاک کہا ہے۔

جواب: امام مالک اور امام ابوحنیفہ رحمہما اللہ کا اس میں قول یہ ہے " ان ذلک لا ینجس بالموت ولکن ینجس بمجاورة الوعاء النجس " یہ جانور کے مرنے سے اگرچہ نجس نہیں ہوتا لیکن جس جگہ میں ہوتا ہے وہ جگہ اس جانور کے مرنے سے ناپاک ہو جاتی ہے اس لئے یہ بھی ناپاک ہو جاتا ہے۔

(ماخوذ از قرطبی)

وَمَا اُهِلَّ بِهٖ لِغَيْرِ اللّٰهِ : "اور وہ جانور جو ذبح کئے گئے ہوں اللہ کے غیر کا نام لے کر" یعنی جن جانوروں کو اللہ تعالیٰ کے نام کے بغیر ہی ذبح کر دیا جائے وہ حرام ہیں اس گوشت کا کھانا مسلمان کیلئے جائز نہیں۔

تنبیہ: ﴿ وَمَا اُهِلَّ بِهٖ لِغَيْرِ اللّٰهِ ﴾ کے مسئلہ میں شدید اختلاف پایا جاتا ہے وجہ اختلاف یہ ہے کہ مسئلہ کو واضح طور پر کھول کر نہیں بیان کیا جاتا جس کی وجہ سے اختلاف کا سبب بنتا ہے اگر مسئلہ کو واضح طور پر بیان کیا جائے تو کوئی اختلاف باقی نہیں رہتا۔

مقام افسوس ہے کہ اہل علم مسئلہ کی ایک ایک صورت کو بیان کر کے اختلاف کا شکار ہیں کاش کہ

مسئلہ مکمل بیان کر دیا جائے۔

اس مسئلہ میں تین وجوہ: دوصورتوں میں حرام ہے ایک صورت جائز اور حلال ہے۔

حرام ہونے کی پہلی وجہ: جس جانور کو ذبح کرتے وقت اللہ کا نام نہ لیا جائے بتوں کے نام لے کر ذبح کیا جائے اس کا کھانا حرام ہے:

﴿ وَمَا أُهِلَّ بِهِ لِغَيْرِ اللّٰهِ ﴾ ای ذکر علیہ غیر اسم اللہ تعالیٰ وھی ذبیحة المجوسی والوثنی والمعطل فالوثنی یذبح للوثن والمجوسی للنار والمعطل لا یعتقد شیا فیذبح لنفسہ "

جس جانور پر اللہ تعالیٰ کے غیر کا نام لے کر ذبح کیا جائے وہ حرام ہے آگ پرست آگ کا نام لے کر ذبح کرتا تھا اس لئے اس کا ذبح کیا ہوا جانور حرام ہے۔ اور بت پرست بتوں کے نام لے کر ذبح کرتے تھے اس لئے ان کا ذبح کیا ہوا جانور حرام ہے۔ اور تعطیلیہ فرقہ کا کوئی شخص جانور کو ذبح کرتا تو وہ بھی حرام ہوتا کیونکہ ان کے عقیدہ میں رب تعالیٰ نے عقل اول کو پیدا کیا پھر وہ خود معطل ہو گیا۔ اب نظام عقول عشرہ چلا رہے ہیں۔ اس لئے یہ کافر ہیں لہٰذا ان کا ذبح کیا ہوا جانور بھی حرام ہوتا ہے۔ اگرچہ ذبح کے وقت یہ کسی کا نام بھی نہیں لیتے آگ پرست اور بت پرست آگ یا بت کا نام نہ بھی لیں تو پھر بھی ان کے ذبح کرنے سے جانور حرام ہو جاتا ہے۔ کیونکہ یہ مشرکین ہیں مشرکین کے ذبح کرنے سے جانور حرام ہو جاتا ہے۔

" والاھلال رفع الصوت یقال اھل بکذا ای رفع صوتہ "

" اھلال " کا معنی ہے آواز بلند کرنا، کہا جاتا ہے " اھل بکذا " اس نے اس طرح آواز کو بلند کیا۔ "ومنہ اھلال الصبی واستھلالہ وھو صیاحہ عند ولادتہ " پیدائش کے وقت بچے کے رونے کو بھی " اھلال " کہتے ہیں۔ (از قرطبی)

" وقد روی عطاء بن السائب عن زادان ومیسرة ان علیا علیہ السلام قال اذ اسمعتم الیھود والنصاری یھلون لغیر اللہ تعالیٰ فلا تأکلوا واذا لم تسمعوھم فکلوا فان اللہ قد احل ذبائحھم وھو یعلم ما یقولون "

عطاء بن سائب نے زادان اور میسرہ سے روایت کیا ہے کہ بیشک حضرت علی رضی اللہ عنہ نے

فرمایا جب تم سنو کہ یہود اور نصاریٰ نے ذبح کے وقت اللہ تعالیٰ کے غیر کا نام لیا ہے تو اسے نہ کھاؤ اور اگر ان سے یہ نہ سنو تو کھالو کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ان کا ذبیحہ حلال کیا ہے وہ جانتا ہے کہ یہ کیا کہہ رہے ہیں۔

(الجصاص وفتح البیان ج ۱ ص ۲۲۲)

" ای رفع به الصوت عند ذبحه " (بیضاوی)

﴿ وَمَا اُهِلَّ بِهٖ لِغَيْرِ اللّٰهِ﴾ کا مطلب یہ ہے کہ ذبح کے وقت آواز کو بلند کرنا۔

" قال الاصمعی **الاهلال اصله رفع الصوت فكل رافع صوته فهو مهل** وقال ابن احمر ، يهل بالفد ركبانها ، كما يهل الراكب المعتمر هذا معنى الاهلال فى اللغة ثم قيل للمحرم مهل لرفعه الصوت بالتلبية عند الاحرام هذا معنى الاهلال يقال اهل فلان بحجة او عمرة اى احرم بها وذلك لانه يرفع الصوت بالتلبية عند الاحرام والذابح مهل لان العرب كانوا يسمون الاوثان عند الذبح ويرفعون اصواتهم بذكرها "

امام فرماتے ہیں کہ اہلال کا اصلی معنی آواز بلند کرنا ہے پس جو شخص بھی آواز بلند کرے گا اس کو عربی میں مہل کہیں گے ابن احمر کا ایک شعر ہے:

جنگل میں اس کے سواروں نے آواز بلند کی ، جس طرح عمرہ کرنے والا آواز بلند کرتا ہے

لغت میں اہلال کے یہی معنی ہیں اسی وجہ سے محرم (احرام باندھنے والے) کو مہل کہا جاتا ہے کیونکہ وہ احرام کی حالت میں تلبیہ پڑھتے ہوئے آواز بلند کرتا ہے۔ اسی طرح کہا جاتا ہے " اهل فلان بحجة او عمرة " فلاں شخص نے حج اور عمرہ کا احرام باندھا اس کی وجہ بھی یہی ہے کہ وہ تلبیہ پڑھتے وقت آواز کو بلند کرتا ہے۔ ذبح کرنے والے کو بھی مہل کہا جاتا ہے کیونکہ عرب والے لوگ ذبح کے وقت اپنے بتوں کا نام بلند کرتے تھے۔ (کبیر)

يعنى وما ذبح للاصنام والطواغيت واصل الاهلال رفع الصوت وذلك انهم كانوا يرفعون اصواتهم بذكر آلهتهم اذا ذبحوا لها فجرى ذلك مجرى امرهم وحالهم حتى قيل لكل ذابح مهل وان لم يجهر بالتسمية "

یعنی ذبح کے وقت جن جانوروں پر بتوں اور شیطانوں کا نام لیا گیا ہو وہ حرام ہیں۔ اصل میں

اہلال کا معنی آواز کو بلند کرنا ہے۔ اس لئے کہ وہ ذبح کے وقت اپنے باطل معبودوں کا نام لیتے تھے۔ اگرچہ اصل میں آواز بلند کرنے کو اہلال کہتے ہیں لیکن مطلقاً سبب کو مسبب کی جگہ رکھ دیا اگرچہ آواز کو بلند نہ کریں بلکہ آہستہ آواز میں بھی بتوں کا نام استعمال کریں اسے بھی اہلال کہا جاتا ہے۔ (خازن)

☆ " اخرج ابن المنذر عن ابن عباس فی قولہ تعالیٰ ﴿ وَمَا اُهِلَّ ﴾ قال ذبح "

☆ " واخرج ابن جریر عن ابن عباس فی قولہ تعالیٰ ﴿ وَمَا اُهِلَّ بِهٖ لِغَيْرِ اللّٰهِ﴾ يعنى ما اهل للطواغيت "

☆ " واخرج ابن ابی حاتم عن مجاهد ﴿ وَمَا اُهِلَّ ﴾ قال ما ذبح لغير الله "

☆ " واخرج ابن ابی حاتم عن ابی العالية " ﴿ وَمَا اُهِلَّ بِهٖ لِغَيْرِ اللّٰهِ ﴾ يقول ما ذكر عليه اسم غير الله "

(اللہ کے نام کے بغیر) ابن منذر نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا کہ ﴿وَمَآ اُهِلَّ ﴾ کا مطلب ذبح کرنا ہے۔

اور ابن جریر نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا کہ ﴿وَمَا اُهِلَّ بِهٖ لِغَيْرِ اللّٰهِ﴾ کا مطلب ہے بتوں کے نام پر ذبح کرنا۔

ابن ابی حاتم نے مجاہد سے روایت بیان کی کہ ﴿ وَمَا اُهِلَّ بِهٖ لِغَيْرِ اللّٰهِ﴾ کا مطلب یہ ہے اللہ کے غیر کا نام لے کر ذبح کیا جائے۔ ابن ابی حاتم نے ابو العالیہ سے روایت ذکر کی کہ ﴿ وَمَا اُهِلَّ بِهٖ لِغَيْرِ اللّٰهِ﴾ کا مطلب ہے جس پر اللہ کے غیر کا نام لیا جائے۔ (درمنثور)

" قال الربيع بن انس يعنى ما ذكر عند ذبحه اسم غير الله والاهلال اصله رؤيته الهلال يقال اهل الهلال ثم لماجرت العادة برفع الصوت بالتكبير عند رؤية الهلال سمى لرفع الصوت مطلقا الاهلال وكان الكفار اذا ذبحوا لا لهتهم يرفعون اصواتهم بذكرها فجرى ذلک من امرهم حتى قيل لكل ذابح وان لم يجهر مهل "

حضرت ربیع بن انس فرماتے ہیں ﴿وَ مَا اُهِلَّ بِهٖ لِغَيْرِ اللّٰهِ ﴾ سے مراد وہ ہے جس پر ذبح کے وقت اللہ کے غیر کا نام پکارا جائے " اھــلال " اصل میں چاند دیکھنے کو کہا جاتا ہے جس طرح کہا جاتا

ہے "اھل الھلال" فلاں نے چاند دیکھا پھر چاند دیکھنے کے وقت عام عادت جاری ہوگئی کہ وہ بلند آواز سے تکبیر کہتے بلند آواز کی وجہ سے کہے گئے الفاظ کو مطلقاً اہلال کہا جانے لگا۔

کافر چونکہ ذبح کے وقت اپنے باطل معبودوں کا نام لیتے اور اپنی آوازوں کو بلند کرتے تو اس وجہ سے ذبح کرنے والے کو مہل کہا جانے لگا خواہ اس نے آواز کو بلند کیا ہوتا یا بلند نہ کیا ہوتا۔ (از مظھری)

" یعنی ما ذبح للاصنام والطواغیت وصبح فی ذبح "

یعنی ذبح کے وقت بتوں اور شیطانوں کے نام لئے جاتے اور ان پر آواز کو بلند کیا جاتا۔ (فتح البیان)

﴿ وَمَا اُھِلَّ بِهٖ لِغَيْرِ اللّٰهِ ﴾ ای وحرم ما رفع به الصوت عند ذبحه للصنم واصل الاھلال رفع الصوت وکانوا اذا ذبحوا الآلھتھم یرفعون اصواتھم بذکرھا ویقولون باسم اللات ولاعزی فجری ذلک من امرھم حتی قیل لکل ذابح وان لم یجھر بالتسمیة مھل "

جس جانور پر ذبح کے وقت بتوں کا نام پکارا جائے وہ حرام ہے اہلال اصل میں مطلقاً آواز بلند کرنے کو کہتے ہیں کفار جب کسی جانور کو ذبح کرتے تو بلند آواز سے باسم اللات والعزی کہتے پھر ہر ذبح کرنے والے کو " مھل " کہا جانا لگے خواہ وہ آواز بلند نہ کرے۔ (روح البیان)

" وَمَا اُھِلَّ بِهٖ لِغَيْرِ اللّٰهِ ای رفع به الصوت عند ذبح للصنم "

﴿ وَمَا اُھِلَّ بِهٖ لِغَيْرِ اللّٰهِ ﴾ کا مطلب یہ ہے کہ ذبح کرتے وقت جب بت کا نام لیا جائے تو وہ جانور حرام ہوگا۔ (ابوالسعود) " ای ذبح علی اسم غیره " یعنی غیر کا نام لے کر ذبح کردیا جائے۔ (جلالین)

﴿ وَمَا اُھِلَّ بِهٖ لِغَيْرِ اللّٰهِ ﴾ ای ما ذبح للاصنام والطواغیت واصل الاھلال رفع الصوت وکانوا اذا ذبحوا لآلھتھم یرفعون اصواتھم بذکرھا فجری ذلک من امرھم حتی قیل لکل ذابح وان لم یجھر بالتسمیة مھل وقال الربیع بن انس وغیره ﴿ وَمَا اُھِلَّ بِهٖ لِغَيْرِ اللّٰهِ ﴾ قال ذکر اسم غیر الله ﴾ (معالم التنزیل)

اسی عبارت کا ترجمہ مظہری اور درمنثور کی عبارات کا ہے اس لئے تکرار کی ضرورت نہیں۔

مذکورہ بالا بحث سے حاصل ہوا :

ابھی تک تفاسیر کی عبارات جو نقل کی ہیں ان سے دو باتیں واضح طور پر سمجھ آئیں ایک یہ کہ تقریباً جمہور مفسرین کرام کا مذہب یہ ہے کہ ﴿ وَمَا اُهِلَّ بِهٖ لِغَيْرِ اللّٰهِ ﴾ کا مطلب یہی ہے کہ ذبح کے وقت اللہ کا نام لئے بغیر ذبح کئے جانے والا جانور حرام ہے۔ اور دوسری بات یہ سمجھ آئی کہ مراد اس سے کفار ہیں جو اپنے جانوروں کو ذبح کرتے وقت اپنے بتوں کا نام لیتے تھے۔

اور یہ بھی واضح ہوا کہ " اهلال " کا مطلب ذبح کے وقت نام لینا خواہ آہستہ آواز میں ہی کیوں نہ ہو۔

دوسری قسم جو حرام ہے: ذبح سے مقصد غیر خدا کا تقرب حاصل ہو یعنی غیر خدا کو خدا سمجھ کر اس کے لئے ذبح کیا جائے ذبح کو عبادت سمجھا جائے اور جس کے لئے ذبح کیا ہے اسے معبود سمجھا جائے تو یہ قطعی طور پر حرام ہے اگر چہ ذبح کے وقت اس پر اللہ تعالیٰ کا نام بھی لے لیا ہو۔ یہی وہ قسم ہے جس کو فقہاء نے "الذبح لغیر الله" غیر اللہ کے لئے ذبح کرنا بیان کیا ہے۔ یا" ما ذبح لتقرب غیر الله" سے تعبیر کرتے ہیں یعنی جس میں غیر اللہ کا تقرب حاصل کرنا اسے معبود سمجھنا مقصود ہو یہ حرام ہے۔

تیسری قسم جو حلال ہے: وہ یہ کہ ذبح اللہ تعالیٰ کا نام لے کر کیا رب تعالیٰ کو ہی معبود سمجھا لیکن اس ذبح میں گوشت غریبوں اور مسکینوں میں تقسیم کر کے کسی بزرگ کو ثواب پہنچانا مقصود ہو تو یہ جائز ہے۔

یعنی اس قسم میں ذبح سے مقصود جانور کی جان نکالنا اور خون گرانا نہیں بلکہ مطلوب گوشت ہے وہ گوشت اس وقت حاصل ہوگا جب جانور کو ذبح کیا جائے گا گویا کہ مقصد مطلوب ہوگا اور ذبح ذریعہ اور وسیلہ ہوگا۔ جیسا کہ گوشت بیچنا اور خریدنا مباح ہے گوشت کھانا مباح ہے گوشت کھانے یا بیچنے کے لئے جانور کو ذبح کیا اللہ تعالیٰ کا نام لے کر وہ جانور حلال ہے یہاں ذبح وسیلہ ہے مباح کام کا۔

اسی طرح جانور کے ذبح کرنے میں مقصد ولیمہ کرنا ہے تو یہ ذبح ذریعہ ہے سنت کے لئے کیونکہ ولیمہ مسنون ہے۔

اسی طرح جانور ذبح کیا مہمانوں کے لئے یا اپنے اقرباء کے ایصال ثواب کے لئے یا بزرگوں کے ایصال ثواب کے لئے تو یہ جانور ذبح کرنے میں مقصد ثواب حاصل کرنا ہے اس لئے یہ ذبح مستحب

کو حاصل کرنے کا ذریعہ ہے یہ تمام قسم کے ذبح کیے جانے والے جانور حلال ہیں۔

لطف کی بات یہ ہے کہ اگر کوئی جانور کسی ظالم کو بطور رشوت دینے کے ذبح کیا اور ذبح مسلمان نے اللہ کا نام لے کر کیا تو وہ جانور بھی حلال ہے حالانکہ یہ کام حرام ہے جس کے لئے ذبح کیا مقصد حاصل کرنا حرام ہے لیکن جانور کا ذبح کرنا حلال ہے۔

آخری دونوں قسموں پر دلائل: سب سے پہلے یہ دیکھنا ہوگا کہ ذبح کی کون سی شرط نہیں پائی گئی جس کی وجہ سے جانور حرام ہوگیا یا تمام شرائط پائی گئی ہیں کہ وہ حلال ہوگیا۔

ذبح کرنے کی چھ شرائط ہیں:

" والشرط ذکر الذابح اسمه تعالیٰ المجرد علی الذبیحه عند الذبح لله تعالی "

یعنی ذبح کرنے کی شرط یہ ہے ذبح کرنے والا خالص اللہ تعالیٰ کا نام ذکر کرے ذبح پر جب کہ ذبح اللہ تعالیٰ کے لئے ہو اس مختصر عبارت میں چھ شرطیں پائی گئی ہیں۔

پہلی شرط: " انما قلنا الذابح لانه لو سمی غیر لا یحل کما فی المحیط " ذبح کرنے والا خود بسم اللہ پڑھے ذبح کرنے والا اور ہو بسم اللہ پڑھنے والا اور ہو تو وہ جانور حلال نہیں محیط میں ایسا ہی ذکر ہے یہ فائدہ عبارت مذکورہ میں لفظ " الذابح " سے حاصل ہوا۔

دوسری شرط: " وانما قلنا اسمه تعالیٰ لانه لو ذکر اسم غیره تعالیٰ لم یحل "

ذبح کرنے والا اللہ کا نام لے کر ذبح کرے تو وہ جانور حلال ہوگا اللہ تعالیٰ کے غیر کا نام لے تو وہ حلال نہیں ہوگا۔ یہ فائدہ عبارت مذکورہ میں " اسمه تعالیٰ " سے حاصل ہوا۔

تیسری شرط: " وانما قلنا المجرد لانه لو قال اللهم اغفرلی لم یجز لانه دعاء کما فی الهدایة "

ذبح کرنے والا فقط اللہ کا نام لے دعائیہ کلمات اس کے ساتھ شامل نہ کرے اسی لئے ذبح کرنے والے نے اگر ﴿ اَللّٰهُمَّ اغْفِرْلِیْ ﴾ پڑھ کر جانور ذبح کیا تو وہ حلال نہیں ہوگا کیونکہ اس میں خالص اللہ تعالیٰ کا نام نہیں لیا گیا یہ مسئلہ حاصل ہوا " المجرد " سے۔

چوتھی شرط: " وانما قلنا علی الذبیحة لانه لو سمی عند الذبح لا فتتاح عمل لم یحل "

جس جانور کو ذبح کرنا ہے اسی پر بسم اللہ پڑھے تو حلال ہوگا اگر کسی اور کام کو شروع کرنے کے لئے ''بسم اللہ'' پڑھی پھر دوبارہ بسم اللہ نہ پڑھی پہلی پر اکتفا کر لیا تو جانور حلال نہیں ہوگا۔ یہ مسئلہ حاصل ہوا" علی الذبیحۃ " کے الفاظ سے۔

پانچویں شرط: " وانما قلنا عند الذبح لانه اذا فصل بينه وبين التسمية بعمل كثير لم يحل وقال الزعفرانی لوحد الشفرة لم يحل فلوسمی علی ذبيحة وذبح غيرها لم يحل "

ذبح کرتے وقت بسم اللہ پڑھے تو جانور حلال ہوگا اگر بسم اللہ پڑھ کر کوئی اور کام شروع کر لیا کچھ دیر بعد بغیر بسم اللہ پڑھنے کے جانور ذبح کر دیا تو وہ حلال نہیں ہوگا۔ زعفرانی رحمہ اللہ نے فرمایا بسم اللہ پڑھ کر چھری کو تیز کرنا شروع کر دیا پھر دوبارہ بسم اللہ نہ پڑھی تو جانور حلال نہیں ہوگا۔ اگر ایک جانور پر بسم اللہ پڑھی ذبح دوسرا کر دیا تو وہ حلال نہیں ہوگا۔ یہ شرط حاصل ہوئی " عند الذبح " کے الفاظ سے۔

تنبیہ: بسم اللہ پڑھنا جان بوجھ کر چھوڑ دیا تو جانور حرام ہوگا اگر بھول کر بسم اللہ رہ جائے تو جانور حلال ہوگا۔

چھٹی شرط: " وانما قلنا للّٰه تعالی لانه لو سمی وذبح لقدوم الامير او غيره من العظماء لا يحل لانه ذبح تعظيما له لا لله تعالی "

اگر جانور کو ذبح کیا امیر کے آنے کی وجہ سے یا کسی اور بڑے شخص کے آنے کی وجہ سے اس بڑے کا تقرب حاصل کرنا مقصود ہو اس کی عظمت مقصود ہو اور اللہ تعالیٰ کی عظمت مقصود نہ ہو تو وہ جانور حلال نہیں ہوگا یہ شرط حاصل ہوئی" للّٰه تعالیٰ " کے الفاظ مبارکہ سے۔

غیر اللہ کے لئے ذبح کرنے کی حلت وحرمت کی دارومدار چھٹی شرط پر ہے:

کسی بزرگ، کسی بڑے کے لئے ذبح کرنے میں مقصد اس کی تعظیم ہو اسے مقرب سمجھا جائے اسے معبود سمجھا جائے اللہ تعالیٰ کی تعظیم مقصود نہ ہو اور اللہ تعالیٰ کو مقرب نہ سمجھا جائے اور اللہ تعالیٰ کو معبود نہ سمجھا جائے تو وہ جانور یقینی طور پر حرام ہوگا بیشک اس پر اللہ کا نام ذبح کے وقت لے لیا گیا ہو۔ جب باقی تمام شرطیں بھی پائی جائیں اور اللہ تعالیٰ کو معبود سمجھ کر اسی کی تعظیم مقصود ہو کسی بڑے کا آنا صرف ذریعہ ہو

کسی بزرگ کا ایصال ثواب صرف ذریعہ ہوتو وہ جانور حلال ہوگا۔

غیر اللہ کیلئے بنیت تقرب ذبح کرنا حرام ہے:

" قال النیشابوری تحت قوله تعالیٰ ﴿ وَمَا اُهِلَّ بِهٖ لِغَيْرِ اللّٰهِ ﴾ قال العلماء لو ان مسلما ذبح ذبيحة وقصد بذبحها التقرب الى غير الله صار مرتدا و ذبيحته ذبيحة مرتد "

علامہ نیشاپوری رحمہ اللہ نے اپنی تفسیر میں زیر بحث آیۃ کریمہ کی وضاحت میں لکھا ہے کہ اگر مسلمان کسی جانور کو ذبح کرے اور اس میں غیر اللہ کے تقرب کا ارادہ کرے تو وہ شخص مرتد ہو جائے گا اور جانور مرتد کا ذبح کیا ہوگا۔ نیشاپوری کی تفسیر میں " وقصد بها بذبحها التقرب الى غير الله " کے الفاظ کو غور سے پڑھیں پھر یہ انصاف سے فیصلہ کریں کہ علماء اہل سنت و جماعت (بریلوی مسلک) کا کیا یہی عقیدہ نہیں؟

غیر اللہ کے لئے ذبح بغیر ارادہ تقرب کے حلال ہے:

صاحب ہدایہ نے اس مسئلہ کو واضح کیا ہے اور شیخ احمد ملا جیون رحمہ اللہ نے تفسیرات احمدیہ میں بہت ہی واضح الفاظ سے اس مسئلہ کو حل کیا ہے۔ صاحب ہدایہ اور کفایہ کی وضاحت کے ساتھ ہی درمختار اور شامی کا اتفاق ہے:

" ویکره ان یذکر مع اسم الله تعالیٰ شیأ غیره وان یقول عند الذبح اللهم تقبل من فلان "

ذبح کے وقت اللہ تعالیٰ کے نام کے ساتھ کسی اور کا نام ملانا اور یہ کہنا اے اللہ یہ فلاں کی طرف سے قبول فرما یہ مکروہ ہے۔ اس عبارت کی وضاحت فرماتے ہوئے صاحب ہدایہ تحریر فرماتے ہیں:

" وهذه ثلاث مسائل احداها ان يذكر موصولا لا معطوفا فيكره ولا تحرم الذبيحة وهو المرد بما قال ونظيره ان يقول باسم الله محمد رسول الله لان الشركة لم توجد فلم يكن الذبح واقعاله الا انه يكره لوجود القرآن صورة فيتصور بصورة المحرم " (هداية)

یہاں تین مسائل ہیں ایک یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے نام کے ساتھ ذبح کے وقت غیر کا نام متصل طور پر ذکر کرے درمیان میں واؤ عاطفہ ذکر نہ ہو تو وہ جانور مکروہ ہوگا حرام نہیں متن کی عبارت میں یہی مسئلہ معتبر ہے اس کی مثال یہ ہے کہ جب ذبح کرنے والا ذکر کرے " باسم اللہ محمد رسول اللہ" اس میں لفظ " محمد رسول اللہ " لفظ "اللہ" کے ساتھ حکم میں شریک نہیں اس لئے ذبح میں رسول اللہ ﷺ کا تقرب نہیں پایا گیا لہذا یہ جانور حرام نہیں ہوگا البتہ مکروہ اس لئے ہے کہ دونوں نام ملا کر اکٹھے ذکر کردیئے گئے جو بظاہر حرام نظر آتا ہے حالانکہ حرام نہیں۔

یہ بھی خیال رہے کہ امام التمر تاشی رحمہ اللہ نے ذکر فرمایا کہ اللہ کا ذکر اور رسول اللہ ﷺ کا ذکر بغیر واؤ عاطفہ کے چند وجہ پر ہیں:

" اما ان یکون بنصب محمدا او بحفضه او برفعه وفی کلها یحل لان اسم الرسول غیر مذکور علی سبیل العطف فیکون مبتدئا لکن یکره لوجود الوصل صورة " (کفایه)

یا تو لفظ محمد پر نصب (زبر) ہوگی یا جر (زیر) ہوگی اور یا رفع (پیش) ہوگا ان تمام صورتوں میں جانور حلال ہوگا کیونکہ " محمد رسول اللہ " کا ماقبل سے کوئی تعلق نہیں بلکہ یہ جملہ علیحدہ ہے ہاں البتہ مکروہ ہے کیونکہ بظاہر لفظ "اللہ" اور لفظ محمد ملے ہوئے ہیں۔

" والثانیة ان یذکر موصولا علی وجه العطف والشرکة بان یقول باسم الله واسم فلان او یقول باسم الله وفلان او باسم الله ومحمد رسول الله بکسر الدال فتحرم الذبیحة لانه اهل به لغیر الله " (هدایه)

دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ ذبح کرنے والے نے ذبح کے وقت " باسم اللہ واسم فلان " پڑھا۔ یا بغیر لفظ اسم کے " باسم اللہ وفلان " پڑھا۔ یا " بسم اللہ ومحمد رسول اللہ " لفظ محمد کے نیچے کسرہ (زیر) سے پڑھا۔ ان صورتوں میں جانور حرام ہوگا کیونکہ اللہ تعالیٰ کے نام کے ساتھ غیر کو عطف کے ساتھ شریک کردیا گیا لہذا اس جانور کو اللہ کے غیر کے نام کے ساتھ ذبح کردیا گیا۔

لیکن اسی صورت میں یعنی " بسم اللہ ومحمد رسول اللہ " میں لفظ محمد پر پیش پڑھا تو وہ

جانور حلال ہوگا۔ کیونکہ یہ ابتدائی کلام بن گئی اور اگر نصب (زبر) سے پڑھے تو اگر چہ اس میں اختلاف ہے (لیکن صحیح یہی ہے کہ جانور حرام نہیں ہوگا کیونکہ اس صورت میں بھی ماقبل سے رابطہ نہیں ہوگا)۔ (کفایہ)

" والثالثة ان يقول مفصولا عنه صورة ومعنى بان يقول قبل التسمية وقبل ان يضجع الذبيحة او بعده وهذا لا بأس به لما روى عن النبى ﷺ انه قال بعد الذبح اللهم تقبل هذه عن امة محمد ممن شهدلك ولى بالبلاغ "

تیسرا مسئلہ یہ ہے کہ جانور کولٹانے اور بسم اللہ پڑھنے سے پہلے یا ذبح کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ کے ذکر سے جدا طور پر اللہ کے غیر کا ذکر کرے (اے اللہ فلاں کے ایصال ثواب کے لئے قبول فرما) تو اس میں کوئی حرج نہیں یعنی یہ مکروہ نہیں۔ اس لئے کہ نبی کریم ﷺ نے جانور کو ذبح کرنے کے بعد رب تعالیٰ کے حضور عرض کیا:

" اللهم تقبل هذه عن امة محمد (ﷺ) ممن شهد لک بالوحدانية ولى بالبلاغ "

اے اللہ یہ امت محمد (ﷺ) کی طرف سے قبول فرما یعنی ان لوگوں کی طرف سے جنہوں نے تیری وحدانیت کی شہادت دی اور میرے حق میں یہ شہادت دی کہ میں نے تیرا پیغام پہنچا دیا ہے (ھدایہ) شامی نے درمختار کے الفاظ ''لاباس'' (جیسا کہ ہدایہ میں بھی ہیں) کی وضاحت ''لا یکرہ'' سے کی ہے ھدایہ اور کفایہ سے جو بحث ذکر کی ہے وہ تمام درمختار اور شامی میں بھی دیکھی جا سکتی ہے۔

شیخ احمد ملا جیون رحمہ اللہ کی وضاحت:

ھدایہ کی بحث جو ذکر کی ہے اسی کو مختصر طور پر ملا جیون رحمہ اللہ نے ذکر کرنے کے بعد خلاصہ اور نچوڑ ایسے خوبصورت اور واضح الفاظ سے بیان کر دیا جس سے طعنہ زنوں کی اور زبان دراز لوگوں کی زبانیں گنگ ہوگئیں۔ آپ فرماتے ہیں:

ومن ههنا علم ان البقرة المنذورة للاولياء كما هو الرسم فى زماننا حلال طيب لانه لم يذكر اسم غير الله عليها وقت الذبح وان كانوا ينذورنها له "

یہاں سے پتہ چل گیا کہ بیشک گائے (وغیرہ) جس کی اولیاء کرام کے لئے نذر مانی جائے جیسا کہ ہمارے زمانہ میں یہ رسم پائی جاتی ہے وہ حلال اور طیب (پاکیزہ) ہے کیونکہ اس پر ذبح کے وقت اللہ کے غیر کا نام نہیں لیا جاتا ہے اگر چہ اولیاء کرام کے لئے اس کی نذر مان لی جاتی ہے۔ (تفسیرات احمدیہ)

یہ یاد رہنا چاہئے کہ یہ نذر اللہ تعالیٰ کے محبوب بندوں کے ایصال ثواب کے معنی میں ہے اسے نذر و نیاز کہا جاتا ہے تقرب حاصل کرنے کے لئے معبود سمجھ کر نذر صرف رب تعالیٰ کے لئے ہی ہوتی ہے۔ (راقم)

بہت خوب فیصلہ: " ذبح لقدوم الامیر ونحوه کواحد من العظماء یحرم لانه اهل به لغیره الله ولو (وصلیة) ذکر اسم الله تعالیٰ" (درمختار کتاب الذبح)

اگر کوئی شخص حاکم یا کسی بڑے شخص کے آنے کی وجہ سے ذبح کرے تو وہ جانور حرام ہو جائے گا کیونکہ اس پر اللہ کے غیر کا نام پیش کر دیا گیا ہے یہ جانور اگر چہ اللہ کے نام پر ہی کیوں نہ ذبح کر دیا گیا ہو۔

" ولو ذبح للضیف لا یحرم لانه سنة الخلیل واکرام الضیف اکرام الله تعالیٰ" (درمختار)

اور اگر مہمان کے لئے ذبح کیا جائے تو وہ جانور حرام نہیں ہوگا کیونکہ وہ حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام کی سنت ہے مہمان کا اکرام اللہ تعالیٰ کا اکرام ہے:

" قوله لا یحرم ، قال البزازی ومن ظن انه لا یحل لانه ذبح لاکرام ابن آدم فیکون اهل به لغیر الله تعالیٰ فقد خالف القرآن والحدیث والعقل فانه لا ریب ان القصاب یذبح للربح ولو علم انه نجس لا یذبح فیلزم هذا الجاهل ان لا یاکل ما ذبحه القصاب وما ذبح للولائم والاعراس والعقیقة" (شامی)

جو جانور مہمان کے لئے ذبح کیا جائے وہ حرام نہیں ہوتا اس پر علامہ شامی رحمہ اللہ علیہ نے بزازیہ کے حوالہ سے تبصرہ کرتے ہوئے فرمایا کہ اگر کوئی شخص یہ سمجھے کہ مہمان کی تکریم (عزت) کے لئے جو جانور ذبح کیا گیا وہ حرام ہے کیونکہ اس میں آدمی کی عزت کی گئی یہ ﴿مَا اُهِلَّ بِهٖ لِغَیْرِ اللّٰهِ﴾ میں آ گیا تو وہ شخص قرآن پاک اور حدیث پاک کا مخالف ہے اور یہ عقل کے بھی خلاف ہے۔ اس بات میں کوئی شک نہیں کہ قصاب نفع حاصل کرنے کے لئے جانور ذبح کرتا ہے اگر اسے معلوم ہو کہ یہ جانور نجس

ہے تو وہ ذبح نہیں کرتا۔

اس سے تو یہ لازم آئے گا کہ جاہل انسان وہ جانور بھی نہ کھائے جسے قصاب نے ذبح کیا ہے اور ولیمہ کے لئے اور شادی کے لئے اور عقیقہ کے لئے ذبح کئے جانور بھی نہ کھائے ان کو بھی حرام سمجھے۔

(شامی)

کیونکہ ان جانوروں کے ذبح کرنے میں بھی انسانوں کی عزت پائی گئی ہے۔(راقم)

وجہ فرق: کسی حاکم کے آنے کی تعظیم کے لئے ذبح کیا ہوا جانور حرام ہو جائے اور مہمان کے آنے پر ذبح کیا جانے والا حلال ہو اس میں فرق کیا ہے؟

" والفارق انه قدمها لياكل منها كان الذبح لله والمنفعة للضيف او للوليمة او للربح وان لم يقدمها لياكل منها بل يدفعها لغيره كان لتعظيم غير الله فتحرم "

فرق یہ ہے کہ غیر اللہ کے لئے ذبح کئے ہوئے جانور سے خود بھی کھالے اپنے آپ پر حرام نہ کرے تو یہ جانور حلال ہوگا کیونکہ اس کو ذبح اللہ تعالیٰ کے لئے کیا گیا تھا البتہ نفع مہمان نے بھی حاصل کرلیا۔ اور اگر غیر اللہ کے لئے ذبح کئے ہوئے جانور سے خود نہ کھائے بلکہ غیر کو دے دے تو وہ حرام ہوگا اس لئے کہ اس میں غیر کی تعظیم پائی گئی۔ (درمختار)

شامی رحمہ اللہ کی مزید وضاحت:

" قوله والفارق) ای بين ما اهل به لغير الله بسبب تعظيم المخلوق وبين غيره وعلى هذا فالذبح عند وضع الجدار او عروض مرض او شفا منه لا شک في حله لان القصد منه التصدق حموی ومثله النذر بقربان معلقا بسلامته من بحر فيلزمه التصدق به على الفقراء فقط كما فی فتاوی الشلبی "

اگر کوئی شخص دیوار بناتے وقت دیوار پر شہتیر رکھتے ہوئے مرض کے لاحق ہونے پر مرض سے شفا حاصل ہونے پر جانور ذبح کرے وہ حلال ہے اس میں کسی قسم کا کوئی شک نہیں اس میں اس کا ارادہ

صدقہ کرنا ہے یہ نفلی صدقہ ہے اس سے خود بھی کھا سکتا ہے بلکہ خود بھی کھالے تا کہ غیر اللہ کی تعظیم کا وہم نہ پایا جائے۔ (حموی) اگر نذر مانے کہ مجھے اس مرض سے سلامتی حاصل ہوگئی یا اس سفر سے میں سلامتی سے لوٹ آیا تو یہ نذر واجب ہے اس واجب نذر کا حکم یہ ہے کہ یہ گوشت صرف فقراء پر صدقہ کرے خود بھی نہ کھائے اور غنی لوگوں کو بھی نہ کھلائے صدقہ واجبہ کا یہی حکم ہے " البحر الرائق وچلبی "

(ماخوذ از شامی)

وجہ فرق پر شامی رحمہ اللہ کا وضاحتی قول: اگر غیر اللہ کے لئے ذبح کئے ہوئے جانور میں غیر کی تعظیم بطور تقرب مقصود تھی تو وہ جانور حرام ہوگا اگر صرف مہمان سمجھ کر عزت کرنا مقصود تھا تو حلال ہوگا۔ ذبح کرنے والے کا اپنا کھانا اور نہ کھانا مقصود نہیں۔ صرف وہ اپنے آپ پر حرام کرتا ہے یا نہیں۔ (ماخوذ از شامی) شامی کی عبارت یہ ہے:

" (قوله) وان لم يقدمها ليأكل منها) هذا مناط الفرق لامجرد دفعها لغيره اى يغير من ذبحت لاجله او غير الذابح فان الذابح قديتر كها او يأخذها كلها او بعضها فافهم واعلم ان المدار على القصد عند ابتداء الذبح فلا يلزم انه لو قدم للضيف غيرها ان لا تحل لانه حين الذبح لم يقصد تعظيمه بل اكرامه بالا كل منها وان قدم اليه غيرها ويظهر ذلك ايضا فيما لو ضافه امير فذبح عند قدومه فان قصد التعظيم لا تحل وان اضافه بها وان قصد الاكرام تحل وان اطعمه غيرها تأمل " (شامی)

غیر اللہ کے تقرب کا مطلب: ماتن یعنی صاحب تنویر الابصار کے عبارت میں لفظ " یحرم " پر بحث کرتے ہوئے مومن کی شان کو بیان فرمایا اور اس پر شامی نے مزید وضاحت کی جس سے لفظ تقرب کا معنی بھی سمجھ آ گیا اور مسئلہ بھی نکھر کر واضح ہوگیا:

" وهل يكفر قولان بزازيه وشرح وهبانيه ، قلت وفى صيد المنية انه يكره ولا يكفر لانا لا نسئى الظن بالمسلم انه يتقرب الى الآدمى بهذا النحر ونحوه فى شرح الوهبانية عن الذخيرة ونظمه فقال وفاعله جمهورهم قال كافر وفضلى اسمعيلى ليس يكفر " (درمختار)

کیا غیر اللہ کے لئے ذبح کرنے والا کافر ہوگا اس میں دو قول ہیں۔ بعض نے کہا کافر ہوگا بعض نے کہا نہیں۔ (بزازیہ، شرح وھبانیۃ) اور صید المنیۃ میں ہے کہ بیشک فقط مکروہ ہے اور وہ شخص کافر نہیں ہوگا بیشک ہم کسی مسلمان پر بدگمانی نہیں کرتے کہ وہ اس ذبح میں کسی آدمی کا تقرب حاصل کر رہا ہے۔ (السحر الفائق وشرح وھبانیۃ عن الذخیرۃ) اور نظم میں کہا گیا ہے جمہور حضرات نے کافر کہا ہے لیکن صحیح یہ ہے کہ فضلی یعنی اسماعیلی جو عظیم فقیہ ہیں انہوں نے بھی کہا ہے کافر نہیں ہوگا۔

علامہ شامی کی وضاحت: " (هل يكفر) اى فيما بينه وبين الله تعالىٰ اذلا يفتى بكفر مسلم امكن حمل كلامه او فعله على محمل حسن او كان فى كفره خلاف "

متن کی عبارت ﴿ هل يكفر ﴾ کو جو سوالیہ طور پر پیش کیا گیا ہے کہ غور یہ کرنا ہے کہ غیر اللہ کے لئے ذبح کرنے والا کیا اپنے اور اپنے اللہ کے درمیان جو رابطہ اور تعلق ہے اسے توڑ کر کافر ہوگیا ہے؟ پھر فرماتے ہیں نہیں نہیں۔ کسی مسلمان کے قول اور فعل کو جب تک اچھے معانی اور مقاصد پر استعمال کرنے کا احتمال موجود ہو تو اس کے کافر ہونے کا فتویٰ جاری نہیں کیا جا سکتا۔

اسی طرح اگر کسی کے کافر ہونے میں اہل علم کا اختلاف ہو تو اس کے کافر ہونے کا فتویٰ بھی جاری نہیں کیا جا سکتا:

> " (انه يتقرب الى الآدمى) اى على وجه العبادة لانه المكفر وهذا بعيد من حال المسلم فالظاهر انه قصد الدنيا او القبول عنده باظهار المحبة بذبح فداء عنه لكن لما كان فى ذلك تعظيم له لم تكن التسمية مجردة لله تعالىٰ حكما كما لو قال بسم الله واسم فلان حرمت ولا ملازمة بين الحرمة والكفر كما قد مناه عن المقدسى فافهم "

متن کی عبارت میں جو یہ کہا گیا ہے کہ غیر اللہ کے لئے ذبح کرنا مکروہ ہے فقط کیونکہ ہم کسی مسلمان کے متعلق بدگمانی نہیں کر سکتے وہ اس میں کسی آدمی کا تقرب حاصل کر رہا ہے۔ شامی رحمہ اللہ نے بیان کیا ہے کہ " انه يتقرب الى الآدمى " کا مطلب ہے یہ ہے کہ وہ کسی انسان کو معبود سمجھے اور کسی انسان کے لئے کئے ہوئے کام کو عبادت سمجھے یہ مسلمان کے حال سے دور ہے۔ ظاہر یہی ہے کہ وہ

کسی حاکم کے لئے ذبح کر رہا ہے تو اس میں اس کے دنیاوی مقاصد ہیں یا وہ یہ چاہتا کہ اس ظاہری محبت کی وجہ سے میں اس کا مقبول ہو جاؤں کہ میں اس کے لئے ذبح کر کے اس پر فدا ہوں۔ ہاں اگر ذبح کر کے اتنی تعظیم کرے کہ گوشت بچ بھی جائے پھر بھی خود نہ کھائے کہ یہ بادشاہ صاحب کے لئے ذبح کیا گیا تھا اور ان کے لئے ہی پکایا گیا تھا مجھ پر تو یہ کھانا حرام ہے تو اس شخص کے متعلق حرمت کا قول کیا جاسکے گا کہ اس نے اللہ تعالیٰ کے نام کے ساتھ گویا کہ غیروں کو ملا لیا ہے لیکن پھر بھی کافر نہیں کہا جا سکتا۔ (شامی)

لیکن یہ بھی خیال رہے کہ حرام بمعنی مکروہ لینا صاحب درمختار کا مختار قول ہے اور یہی صید المنیہ میں مذکور ہے۔

خلاصہ کلام: اللہ تعالیٰ کا نام ذبح کے وقت نہ لیا جائے بلکہ کسی اور کا نام لیا جائے تو وہ جانور حرام ہے اور ایسا کرنے والا کافر ہے۔

اور ذبح اللہ تعالیٰ کے نام سے کیا لیکن غیر کے لئے کیا اسے معبود سمجھا تو پھر بھی یہ شخص مرتد ہے اور وہ جانور حرام ہے۔

اگر غیر کی تعظیم کا گمان ہے اور ذبح کے وقت ''بسم اللہ'' کے ساتھ ''اللّٰھم تقبل من فلان'' ملا لیا تو یہ مکروہ ہے۔

ذبح سے پہلے ہو یا بعد میں '' اللھم تقبل من فلان '' کہے تو یہ جائز ہے نہ مکروہ نہ حرام اور نہ ہی کفر ہے یہ ہے مکمل مسئلہ۔

اور یہی تمام صورتیں بکرا پالنے میں بھی ہوں گی ویسے ہی مسلمانوں کو کافر اور مشرک بنانا سوائے جہالت اور حماقت کے اور کچھ نہیں۔

علم معانی کا ضابطہ: فعل یا شبہ فعل کی نسبت ماھولہ کی طرف ہو تو حقیقۃ عقلیہ اور اگر نسبت غیر ماھولہ کی طرف ہو تو مجاز عقلی ہے۔ کافر جب کہے '' انبت الربیع البقل '' (موسم بہار نے سبزہ اگایا) تو یہ کلام حقیقۃ عقلیہ ہے کیونکہ کافر موسم بہار کو موثر حقیقی مانتا ہے اس کا رب تعالیٰ پر ایمان نہیں اس کا یہ کلام کافرانہ ہے۔

اگر یہی کلام مومن کرے تو اس کا یہ کلام مجاز عقلی ہے اس میں کوئی کفر نہیں کیونکہ وہ موسم بہار کو

موثر حقیقی نہیں مانتا اس کے نزدیک اللہ تعالیٰ موثر حقیقی ہے موسم بہار صرف سبب ہے۔(از مختصر المعانی)

اہل علم سے انصاف کی توقع: خدارا انصاف سے کام لیتے ہوئے یہ تو بتاؤ کہ کون سا وہ مسلمان ہے جو کسی نبی یا ولی کو خدا مانتا ہے ان کو خالق مانتا ہے ان کو حقیقی کارساز مانتا ہے؟

جب مسلمان نبی کو اللہ کا نبی مانتے ہیں، ولی کو اللہ کا ولی مانتا ہے، تو مسلمانوں کو کافر اور مشرک بنا کر کون سا دین کا کام کیا جارہا ہے۔

وَمَا أُهِلَّ بِهِ لِغَيْرِ اللهِ میں سب سے پہلا اختلاف: سب سے پہلے شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی تفسیر عزیزی میں اس مقام پر پھسلے ہیں لطف کی بات یہ ہے کہ آپ کے فتاوی عزیزیہ میں یہ مسئلہ اس طرح لکھا گیا ہے جیسا کہ اہل سنت و جماعت کا عقیدہ ہے۔ تفسیر عزیزی میں آپ نے جمہور کی مخالفت کی ہے آپ اس میں بالکل اکیلے ہیں آپ کے دلائل کے جوابات سید الاولیاء حضرت مہر علی شاہ رحمہ اللہ نے اپنی کتاب "اعلاء كلمة الله في بيان وما اهل به لغير الله" میں کامل طور پر بیان فرمائے ہیں۔

آپ کا انداز بیان کچھ مشکل ہوتا ہے اس لئے راقم نے اسے آسان انداز میں پیش کر دیا ہے شاہ عبدالعزیز صاحب کے دلائل یا قبلہ سید الاولیاء حضر پیر مہر علی شاہ گولڑوی رحمہ اللہ کے جوابات کو ذکر نہیں کیا۔ تاہم زیادہ بحث حضرت پیر صاحب کی کتاب سے ہی لی ہے۔ البتہ اس کی ابتداء اور انتہاء میں راقم کی اپنی طرف سے بھی بحث شامل ہے۔

مسئلہ کافی حد تک واضح کر دیا گیا ہے جو طلباء اور عوام کے لئے کافی ہے البتہ علماء کرام اپنے علمی ذوق کو پورا کرنے کے لئے حضرت کی کتاب کا مطالعہ کریں۔ شاہ صاحب کی تفسیر عزیزی کی مکمل بحث اور فتاوی عزیزیہ کا مکمل فتوی اور مولنا عبدالحکیم سیالکوٹی رحمہ نے شاہ عبدالعزیز صاحب کا جو رد کیا ہے وہ رسالہ بھی حضرت کی کتاب میں شامل ہے۔

نوٹ: اگر چہ بعض حضرات نے یہ بھی بیان کیا ہے کہ تفسیر عزیزی میں یہ بحث شاہ صاحب کی اپنی نہیں ورنہ آپ اپنے ہی فتوی کے مخالف تحریر نہ کرتے بلکہ یہ بحث کسی اور نے شامل کی ہے۔ عقل سے یہ بھی

کوئی بعید نہیں لیکن انسان سے خطا واقع ہونا کوئی امر بعید نہیں شاہ ولی اللہ صاحب کی نسخ کے متعلق بحث کی مخالفت مفتی محمد شفیع صاحب نے بھی معارف القرآن میں کی ہے راقم بھی الفوز الکبیر کا قائل نہیں۔

فَمَنِ اضْطُرَّ غَیْرَ بَاغٍ وَّلَا عَادٍ فَلَا اِثْمَ عَلَیْهِ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ :

اور جو مجبور ہو جائے تجاوز نہ کرے اور حد سے نہ بڑھے تو نہیں گناہ اس پر بیشک اللہ بخشنے والا رحم کرنے والا ہے یعنی جو شخص بھوک کی وجہ سے مجبور اور لاچار ہو جائے ہلاکت کا خطرہ ہو تو وہ یہی حرام چیزوں میں سے اپنی زندگی بچانے کے لئے کچھ کھالے تو اس کے لئے جائز ہے البتہ تجاوز نہ کرے اور حد سے نہ بڑھے بیشک اللہ تعالیٰ بخشنے والا رحم کرنے والا ہے۔

فَمَنِ اضْطُرَّ : اضطرار کی دو صورتیں ہیں ان دونوں صورتوں میں ان حرام اشیاء سے تھوڑی مقدار میں کھانا جائز ہے " **احدهما الجوع الشدید مع عدم وجدان ما کول حلال یسد رمقه** " ان میں سے ایک یہ ہے کہ بہت ہی شدید بھوک ہو ہلاکت کا خطرہ ہو کوئی حلال چیز کھانے کی ملی نہیں تو ایسی صورت میں وہ اتنی مقدار میں حرام چیز کو کھالے جس سے اپنے آپ کو بھوک کی ہلاکت سے بچالے۔

" **وثانیهما الاکراه علی تناوله** " اور ان میں دوسری صورت یہ ہے کہ حرام چیز کے کھانے پر کوئی شخص اس طرح مجبور کر رہا ہے کہ وہ جابر اور ظالم ہے یہ کہہ رہا ہے کہ اگر تم یہ حرام چیز نہیں کھاؤ گے تو میں تمہیں قتل کر دوں گا یا میں تمہارا کوئی عضو کاٹ دوں گا اس صورت میں بھی ، تھوڑی مقدار میں حرام چیز کھا کر اپنے آپ کو بچالینا ضروری ہے ہاں اگر کوئی شخص دھمکی دے کہ اگر تم حرام چیز نہیں کھاؤ گے تو میں تمہیں بہت ماروں گا۔ یا یہ کہے کہ اگر تم یہ حرام چیز نہیں کھاؤ گے تو میں تمہیں قید کرلوں گا ان صورتوں میں حرام چیز کا کھانا جائز نہیں۔ (از شیخ زاده)

غَیْرَ بَاغٍ : ''تجاوز نہ کرے'' یعنی اگر کوئی دوسرا شخص بھی بھوک کی وجہ سے ہلاکت کے قریب ہو اور حرام چیز بھی بہت زیادہ نہیں تو اکیلے ہی وہ حرام چیز کھا کر دوسرے پر تجاوز نہ کرے بلکہ کچھ حصہ خود کھائے اور کچھ حصہ دوسرے کو دے تاکہ دونوں ہی ہلاکت سے بچ جائیں۔

" بَـــاغٍ " اصل میں ''باغی'' ہے یاء پر ضمہ ثقیل ہونے کی وجہ سے حذف کر دیا گیا پھر یاء اور نون

تنوین دو ساکن جمع ہو گئے یاء کو بھی حذف کر (گرا) دیا گیا۔

" غیر باغ " فی اکله فوق حاجته " حاجت سے زائد کھانے میں حد سے تجاوز نہ کرے۔ یہ معنی قتادہ اور حسن اور ربیع اور ابن زید اور عکرمہ رحمھم اللہ نے بیان کیا ہے اور راقم نے بھی یہی ترجمہ کیا ہے۔ (از قرطبی)

﴿غَیْرَ بَاغٍ﴾ حال ای اکل غیر باغ للذة وشهوة " اور لذت اور خواہش سے کھا کر تجاوز نہ کرے (مظہری) یہ ترجمہ سدی رحمہ اللہ نے کیا ہے (قوطبی) اور یہی ترجمہ اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ کا ہے (اور نہ یوں کہ خواہش سے کھائے)

وَلَا عَادٍ : ''اور نہ حد سے بڑھے'' یعنی صرف بھوک کو بند کرنے کے لئے کھائے اس سے آگے نہ بڑھے ایسا نہ ہو کہ سیر ہو کر کھائے۔ " عاد " اصل میں " عائد " ہے جس کا معنی ہے لوٹنا۔ یعنی بار بار لوٹ لوٹ کر نہ کھائے مراد یہی ہے کہ سیر ہو کر نہ کھائے کیونکہ اس میں حد سے بڑھنا لازم آئے گا۔ "عائد" میں اس طرح قلب پایا گیا ہے جس طرح ''شاک'' میں پایا گیا ہے کیونکہ یہ بھی اصل میں "شائک" تھا " شاکی السلاح " یہی لفظ ہے۔

فَلَا اِثْمَ عَلَيْهِ : ''تو اس پر کوئی گناہ نہیں''

یعنی جتنی مقدار میں اللہ تعالیٰ نے اجازت دی ہے اتنی مقدار میں کھانے میں کوئی گناہ نہیں۔

اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ : ''بیشک اللہ بخشنے والا رحم کرنے والا ہے) یعنی اللہ تعالیٰ نے جن چیزوں کی خود ہی رخصت دی ہے ان میں اس کی طرف سے کوئی پکڑ نہیں ہوئی کیونکہ وہ بخشنے والا ہے اور اس نے اپنی رحمت کی وجہ سے ہی رخصت دی ہے۔ (قرطبی)

تنبیه : امام شافعی رحمہ اللہ نے ﴿غَیْرَ بَاغٍ وَّلَا عَادٍ﴾ کا یہ معنی بھی کیا ہے۔ ﴿غَیْرَ بَاغٍ﴾ علی المسلمین ﴿وَّلَا عَادٍ﴾ علیهم " مسلمانوں پر تجاوز نہ کرے اور مسلمانوں پر حد سے نہ بڑھے یعنی باغی (بادشاہ حق کے خلاف ہتھیار اٹھانے والا) ڈاکو، چور اور اپنے قریبی رشتہ داروں سے قطع تعلقی کی غرض سے سفر کرنے والا۔ یہ تمام لوگ بھوک کی وجہ سے مر بھی رہیں ہوں تو یہ اللہ تعالیٰ کی رحمت کے مستحق نہیں۔ ان کے لئے حرام کو حلال نہیں کیا گیا خواہ وہ حالت اضطرار میں ہی کیوں نہ ہوں۔ لیکن امام شافعی رحمہ اللہ کا مذہب ہے امام اعظم ابو حنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک دنیا میں رب تعالیٰ کی رحمت سے

مجرم بھی فائدہ اٹھا رہے ہیں البتہ قیامت میں کافر رب تعالیٰ کی رحمت سے محروم ہوں گے اور مومن گنہگار اللہ تعالیٰ کی مشیت میں ہوں گے رب تعالیٰ چاہے تو معاف فرمادے اور چاہے تو پکڑ فرمالے۔ اس لئے امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک عاصی اور مطیع دونوں ہی اضطرار کی حالت میں حرام چیزوں کو کھا کر اپنی زندگی بچا سکتے ہیں ان کے لئے جائز ہے۔

مسئلہ : بھوک کی وجہ سے مجبور صرف اتنی مقدار میں کھا سکتا ہے جس سے اس کی جان بچ جائے اس سے زائد مقدار میں اس کے لئے جائز نہیں۔ (الجصاص)

مسئلہ : جس شخص کو قتل یا عضو کے کاٹنے کی دھمکی دی گئی وہ صرف اسی وقت حرام چیز کو استعمال کر سکتا ہے۔ جب تک وہ خطرہ موجود ہے اگر دھمکی دینے والے ظالم نے اپنی دھمکی کو چھوڑ دیا تو اس کے لئے کھانا جائز نہیں۔ (الجصاص)

یاد رکھنے کے قابل : جب کوئی شخص اضطرار کی حالت میں ہو تو اس کے لئے حرام چیز کو حلال کر دیا جاتا ہے جب وہ چیز حرام ہی نہیں تو اس کے لئے واجب ہے کہ وہ چیز کھا کر اپنی جان بچائے۔ اگر نہیں کھائے گا اور بھوک کی شدت کی وجہ سے مر گیا تو گنہگار ہوگا۔ رب تعالیٰ کا ارشاد گرامی:

﴿ وَقَدْ فَصَّلَ لَكُمْ مَا حَرَّمَ عَلَيْكُمْ اِلَّا مَا اضْطُرِرْتُمْ اِلَيْهِ ﴾

''حرام کو ذکر کرنے کے بعد اضطرار کی حالت کو اس حکم سے علیحدہ کر دیا گیا''

''فبقی علی الاصل مباحا والمباح واجب اکله عند خوف الهلاک''

اس لئے اصل میں یہ حرام چیز ہلاکت کے خطرے کے وقت حلال ہو گئی حرام رہی ہی نہیں اس لئے ہلاکت کے خوف کے وقت حلال چیز کا استعمال کرنا واجب ہو جاتا ہے۔ (از مظهری)

تنبیہ : اگر بھوک کی شدت کی وجہ سے مجبور شخص کو مذکورہ تمام چیزیں مل جائیں تو کون سی چیز کھا کر اپنی بھوک کو زائل کرے؟ "وهذا هو الالیق بظاهر هذه الآية" اس آیۃ کریمہ کے ظاہر سے یہی قول زیادہ مناسب نظر آتا ہے تاہم بعض حضرات نے یہ کہا ہے کہ جہاں تک ہو سکے خنزیر کو استعمال نہ کرے بلکہ دوسرے مردار کا گوشت کھالے۔ (از کبیر)

اگرچہ علامہ رازی رحمہ اللہ نے پہلے قول کو ترجیح دی ہے تاہم راقم کو بھی یہ دوسرا قول زیادہ پسند

آیا۔ تاہم یوں کہا جاسکتا ہے تحقیق کے لحاظ سے پہلا قول زیادہ راجح ہے مومن کو خنزیر سے نفرت کے لحاظ پر دوسرا قول زیادہ پسند نظر آتا ہے۔ واللہ اعلم بالصواب (راقم)

حالت اضطرار میں شراب کا حکم:

جس طرح حرام ہونے کا حکم ان چار چیزوں میں بند نہیں اسی طرح مجبور ہونے کی حالت میں حلال ہونا بھی ان چار چیزوں میں بند نہیں بلکہ ہر حرام چیز ہلاکت سے بچانے کے لئے حلال ہو جائے گی۔ اس لئے جان بچانے کی حد تک شراب بھی حلال ہوگا۔ اسی طرح اگر گلے میں لقمہ پھنس جائے کوئی حلال چیز پینے والی نہیں سوائے شراب کے تو لقمہ کو گلے میں نیچے اتارنے کے لئے شراب کا اتنی مقدار میں استعمال جائز ہوگا جس سے وہ لقمہ نیچے اتر جائے تاکہ ہلاکت سے بچ سکے۔

" فان اللہ تعالیٰ انما اباح هذه المحرمات ابقاء للنفس و دفعا للهلاک عنها فکذلک فی هذه الصورة وهذا هو اقرب الی الظاهر "

جب اللہ تعالیٰ نے انسان کو ہلاکت سے بچانے کے لئے ان چار حرام چیزوں کو حلال قرار دے دیا تو شراب کا بھی یہی حکم ہے کہ اس کا استعمال کرنا جائز ہے بلکہ ہر حرام چیز کا یہی حکم ہے۔ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ اور حضرت سعید ابن جبیر رضی اللہ عنہ کا یہی مذہب جو ذکر کر دیا گیا۔

امام شافعی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ بھوک کی شدت کی وجہ سے بھی شراب کا استعمال جائز نہیں بیشک کوئی اور حلال چیز نہ بھی ملے اس لئے کہ شراب سے بھوک اور پیاس میں زیادتی ہوتی ہے اور اس سے عقل بھی زائل ہوتی ہے۔

علامہ رازی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ قول زیادہ پائیدار نہیں کیونکہ بھوک کی شدت کی وجہ سے ہلاکت کا خطرہ ہو کوئی اور چیز مل نہیں رہی سوائے شراب کے تو شراب کو استعمال کرلے کچھ نہ کچھ بھوک کے زائل کرنے کا ذریعہ ضرور بنے گی۔

" وقوله یزیل العقل فکلامنا فی القلیل الذی لا یکون کذلک "

اور جہاں تک آپ کے قول کا تعلق عقل کے زائل ہونے سے ہے اس کا جواب یہ ہے کہ زیادہ مقدار میں شراب پینا جائز نہیں۔ بلکہ بہت معمولی مقدار میں صرف ہلاکت سے بچنے کے لئے استعمال

جائز سمجھا گیا ہے اس سے عقل کا زوال نہیں۔ (از کبیر)

شراب سے علاج کا حکم: علامہ رازی رحمہ اللہ کا اس مسئلہ میں مسلک یہ ہے کہ اگر مرض ہلاک کرنے والی ہو اور مسلمان ماہر طبیب یہ کہے کہ اس مرض کا علاج صرف شراب میں ہے تو بطور دوا استعمال جائز ہے۔ اگر مرض ہلاک کرنے والی بظاہر نظر نہیں آتی یا مسلمان ماہر طبیب یہ کہتے ہیں کہ اس کا علاج اور بھی دواؤں میں ہے صرف شراب میں نہیں تو بطور دوا شراب کا استعمال جائز نہیں۔

امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ بطور دوا شراب کا استعمال جائز نہیں کیونکہ حرام چیز کے استعمال کرنے سے مرض کے زائل ہونے کا جب یقین نہیں تو حرام چیز کو بطور دوا کیوں استعمال کیا جائے جب کہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد گرامی بہت واضح ہے:

"ان اللہ تعالٰی لم یجعل شفاء امتی فیما حرم علیھم"

"بیشک اللہ تعالٰی نے میری امت کی شفا حرام چیزوں میں نہیں رکھی"

اگرچہ اس کا جواب بھی دیا گیا کہ مرض ہلاک کرنے والی جب ہو اور مسلمان ماہر طبیب جب علاج بھی صرف شراب کو قرار دیں تو وہ شراب اس آدمی کے حق میں حرام ہی نہیں رہتا۔ نبی کریم ﷺ کے ارشاد کا تعلق ان اشیاء سے ہے جن کا استعمال مریض کے لئے حرام ہے۔ (از کبیر)

تاہم راقم کے نزدیک امام اعظم رحمہ اللہ کا قول ہی عظیم ہے تقوی بھی اسی میں ہے فتوی بھی اسی پر دیا جائے۔ (راقم)

مرکب ادویات: جن مرکب دواؤں میں بعض چیزیں ایسی استعمال ہوں جن کا اکیلے استعمال جائز نہ ہو لیکن جب یہ معمولی مقدار میں ہوں اور دوسری اور دوائیں ان کے ساتھ مل جائیں تو بعض حضرات نے ان دواؤں کا استعمال جائز رکھا ہے ہومیو پیتھک کی دواؤں میں بھی اگرچہ معمولی مقدار میں الکحل کا استعمال ہوتا ہے لیکن ان کا استعمال بھی جائز نظر آتا ہے۔ "**ان التریاق الذی جعل فیہ لحوم الافاعی مستطاب**" تریاق میں سانپوں کا گوشت بھی استعمال ہوتا ہے۔ حالانکہ تریاق کا استعمال کرنا جائز ہے۔

راقم کا اس میں موقف یہی ہے کہ مرکب دوا میں جب غیر طیب کی معمولی آمیزش ہو وہ جائز ہے تقوی کے طور پر اجتناب کیا جائے تو علیحدہ بات ہے ورنہ تریاق کا استعمال ناجائز ہوگا حالانکہ جائز ہے۔

واللہ اعلم بالصواب۔ (از کبیر)

خون دینے کا حکم: ایک انسان کا خون دوسرے کو لگایا جاتا ہے جب کہ خون حرام ہے اور نجس، تو یہ کیسے جائز ہے؟ اس کا جواب بھی یہی ہے کہ جب کسی انسان کا علاج مسلمان ماہر طبیبوں نے فقط اپریشن منتخب کیا ہے یا کوئی شخص جنگ میں شدید زخمی ہو گیا یا حادثہ میں شدید زخمی ہو گیا جسے خون لگانا ضروری ہو گیا ان صورتوں میں جان بچانے کے لئے خون لگانا جائز ہے۔

عام طور پر معمولی معمولی تکالیف میں یا کمزوری کو دور کرنے کے لئے خون لگا دیا جاتا ہے یہ حرام ہے، ناجائز ہے اکثر طور پر ضعیف آدمی جن کی وفات یقینی طور پر نظر آتی ہے ڈاکٹر حضرات ان کا اپریشن کرنا تجویز کر دیتے ہیں صرف وہ اپنے تجربات کرنے کے لئے۔ ایسی حالت میں جب موت کا غالب گمان ہو زندگی کا کم گمان ہو اپریشن تجویز کرنا ظلم عظیم ہے خون دینا بھی منع ہوگا۔ ڈاکٹر حضرات کچھ انصاف سے کام لیا کریں۔ بے مقصد لوگوں کا خرچ کرانا اور ضعیف آدمی کو کاٹ کر موت تک پہنچانا کون سا انصاف ہے۔ (راقم)

فائدہ: " قال رسول الله ﷺ لطارق بن سوید وقد سأله عن الخمر فنهاه او کره ان یصنعها فقال انما اصنعها للدواء فقال انه لیس بدواء ولکنه داء "(رواہ مسلم فی الصحیح)

رسول اللہ ﷺ نے طارق بن سوید کو فرمایا جب انہوں نے آپ سے شراب کے متعلق سوال کیا تو آپ نے ان کو منع فرمایا بلکہ آپ نے شراب بنانے کو بھی ناپسند سمجھا۔ وہ کہنے لگے میں شراب دوا کے لئے بناتا ہوں آپ نے فرمایا یہ دوا نہیں بلکہ بیماری ہے۔

" وهذا یحتمل ان یقید بحالة الاضطرار فانه یجوز التداوی بالسم ولا یجوز شربه ، والله اعلم "

ہو سکتا ہے کہ صرف اضطرار کی حالت میں جواز ہو کیونکہ زہر سے دوا جائز ہے زہر کا پینا جائز نہیں (قرطبی)

مسئلہ: کسی نجس چیز کو جب جلا کر راکھ بنا دیا جائے اس کی حقیقت بدل جانے کی وجہ سے وہ راکھ پاک ہو جاتی ہے اس راکھ کو دوا میں استعمال کرنا جائز ہوگا۔ (از قرطبی)

اِنَّ الَّـذِيـنَ يَكْتُمُوْنَ مَا اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنَ الْكِتَابِ وَيَشْتَرُوْنَ بِهٖ ثَـمَـنًا قَلِيْلًا ، اُولٰئِكَ مَا يَاْكُلُوْنَ فِىْ بُطُوْنِهِمْ اِلَّا النَّارَ وَلَا يُكَلِّمُهُمُ اللّٰهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَلَا يُزَكِّيْهِمْ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ

۱) ''وہ جو چھپاتے ہیں اللہ کی اتاری کتاب اور اس کے بدلے ذلیل قیمت لے لیتے ہیں وہ اپنے پیٹ میں آگ ہی بھرتے ہیں اور اللہ ان سے قیامت کے دن بات نہ کرے گا اور وہ انہیں ستھرا کرے گا اور ان کے لئے دردناک عذاب ہے''۔

۲) ''بیشک وہ لوگ جو چھپاتے ہیں وہ جو نازل کی اللہ نے کتاب اور حاصل کرتے ہیں اس کے ذریعے گھٹیا قیمت وہ لوگ نہیں کھاتے اپنے پیٹوں میں سوائے آگ کے اور نہیں کلام کرے گا ان سے اللہ دن قیامت کے اور نہ تزکیہ کرے گا ان کا اور ان کے لئے عذاب دردناک ہے''۔

شانِ نزول : یہود کے علماء اور رئیس لوگ اپنے سے کم درجہ کے لوگوں سے ہدیئے طلب کرتے تھے اور کھانے کی چیزیں لیتے تھے اور امید یہ رکھتے تھے کہ آخری نبی ہمارے خاندان یعنی بنی اسحاق میں سے تشریف لائیں گے۔ جب نبی کریم ﷺ بنی اسمٰعیل میں سے تشریف لے آئے تو ان کو خوف لاحق ہوا کہ ہمارے ہدیئے اور کھانے کی چیزیں ختم ہو جائیں گی:

'' فعمدوا الى صفة رسول الله ﷺ فغير وهاثم اخرجوها اليهم فلما نظرت السفلة الى النعت المغير وجدوه مخالفا لصفة محمد ﷺ فلم يتبعوه ''

تو انہوں نے نبی کریم ﷺ کے اوصاف کو اپنی کتب میں تبدیل کر دیا پھر وہ اپنی طرف سے من گھڑت اوصاف اپنے سے کم درجہ والوں پر پیش کئے وہ کہنے لگے یہ اوصاف تو اس شخص میں نہیں جو مدعی نبوت ہے تو انہوں نے ایمان قبول نہ کیا۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی مذمت میں اس آیۃ کریمہ کو نازل فرمایا۔
(بغوی، مظہری)

یہود کے مشہور رئیس اور عالم لوگ:

کعب بن اشرف اور کعب بن سعد اور مالک بن صیف اور حیی بن اخطب اور ابو یاسر بن اخطب'' (از کبیر)

اِنَّ الَّذِیْنَ یَکْتُمُوْنَ مَا اَنْزَلَ اللّٰہُ مِنَ الْکِتٰبِ:

''بیشک وہ لوگ چھپاتے ہیں جو نازل کی اللہ نے کتاب''

یہود کیا چھپاتے تھے؟ '' فقیل کانوا یکتمون صفة محمد ﷺ ونعته والبشارة به''

وہ نبی کریم ﷺ کے اوصاف چھپاتے تھے اور آپ کے تشریف لانے کی بشارت جو ان کی کتاب میں دی گئی اسے چھپاتے تھے، یہ قول حضرت ابن عباس اور قتادہ اور سدی اور اصم اور ابو مسلم کا ہے یہود کی طرح نصاریٰ یہ چھپاتے تھے کہ عیسیٰ علیہ السلام نے آپ کے تشریف لانے کی بشارت دی لیکن انہوں نے اسے ظاہر نہ کیا لیکن ان کے ظاہر نہ کرنے کی وجہ سے آپ کی شان کو کم نہیں کیا جا سکتا تھا قرآن پاک میں عیسیٰ علیہ السلام کی بشارت کو ذکر کر دیا جو نبی کریم ﷺ کی تشریف آوری کے متعلق تھی۔

'' وقال الحسن کتموا الاحکام وهو قوله تعالیٰ ان کثیرا من الاحبار والرهبان لیأ کلون اموال الناس بالباطل ویصدون عن سبیل الله ''

اور حضرت حسن بصری رحمہ اللہ فرماتے ہیں وہ احکام کو بھی چھپاتے تھے اللہ تعالیٰ نے ان کا ذکر کیا ''بیشک بہت سے ان کے علماء اور پادری لوگوں کا مال ناحق طور پر کھالیتے تھے اور اللہ کی راہ سے روکتے تھے'' (از کبیر)

وہ آیات کو کیسے چھپاتے تھے؟ کبھی تو وہ آیات میں تحریف کر دیتے تھے الفاظ بدل دیتے تھے جن سے مطالب غلط بیان کرتے تھے۔ اور کبھی وہ الفاظ تو نہیں بدلتے تھے لیکن ان کی تاویلیں غلط کرتے تھے۔

'' وکانوا یذکرون لها تاویلات باطلة ویصرفونها عن محالها الصحیة الدالة علی نبوة محمد ﷺ ''

ان غلط تاویلوں کے ذریعے نبی کریم ﷺ کی نبوت پر دلالت کرنے والی آیات کے صحیح مطالب کو پھیر کر باطل کر دیتے تھے ان کے آیات کو چھپانے کا یہ مطلب بھی ہے۔ (از کبیر)

یہودیوں کا کیا ہی عجیب طریقہ تھا کہ وہ اپنی ساری کوششیں اور ساری توانائیاں نبی کریم ﷺ کے اوصاف کو بدلنے میں صرف کرتے تھے ان کو یہ پسند نہیں ہوتا تھا کہ کوئی نبی کریم ﷺ کی تعریف کرے اور آپ کے کمالات بیان کرے۔ اگر یہ طریقہ کسی نام نہاد مسلمان میں بھی پایا جائے تو سمجھ لیں کہ وہ یہود کا پروردہ (پالا ہوا) ہے یا ان کے نقش قدم پر چلنے والا ہے۔

واضح ہو گیا: ﴿ مَا اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنَ الْكِتَابِ ﴾ سے مراد توراۃ وانجیل ہیں جن کو اہل کتاب بدل دیتے تھے اور ﴿ اِنَّ الَّذِيْنَ يَكْتُمُوْنَ ﴾ سے مراد یہود و نصاری ہیں۔ لیکن اگر قرآن پاک میں نبی کریم علیہ السلام کی شان کو واضح طور پر بیان کرنے والی آیات کو کوئی شخص صحیح نہ بیان کرے ان کی غلط تاویلیں کریں تو وہ بھی شدید مجرم ہوگا۔ (راقم)

وَيَشْتَرُوْنَ بِهٖ ثَمَنًا قَلِيْلًا : "اور حاصل کرتے ہیں اس کے ذریعے حقیر قیمت" "بہ" میں ضمیر کا مرجع "کتمان" ہے جو ﴿ يَكْتُمُوْنَ ﴾ کے ضمن میں پایا گیا ہے یعنی ان کا کتمان حق میں مقصد ہی مال حاصل کرنا ہوتا تھا وہ مال کی خاطر دین کو برباد کر دیتے۔

ثَمَنًا قَلِيْلًا کہنے کی وجہ کیا ہے؟

اس میں چند وجوہ ہیں ان میں سے ایک یہ ہے "انہ فی نفسہ قلیل" بیشک وہ جو مال حاصل کرتے تھے وہ حقیقت میں ہوتا ہی قلیل تھا یعنی ان کو معمولی مقدار میں جو کے دانے، یا گھٹیا قسم کے کپڑوں کا جوڑا مل جاتا ہے۔

اور دوسری وجہ یہ ہے "انہ بالاضافة الی ما فيه الضرر العظيم قليل" کہ ان کو حق کے چھپانے میں جو گناہ حاصل ہوتا اور عذاب کے مستحق ہوتے اس میں بہت ہی زیادہ نقصان تھا اس لئے عظیم نقصان کے مقابلہ میں مال قلیل ہی تھا۔ (از کبیر)

اور تیسری وجہ یہ تھی "وسماہ قليلا لانقطاع مدته وسوء عاقبته" کہ وہ جو مال حاصل کرتے تھے وہ جلدی ختم ہو جایا کرتا تھا اور ان کو جو عذاب ہونا ہے وہ نہ ختم ہونے والا ہے۔ (قرطبی)

اور چوتھی وجہ یہ ہے کہ رب تعالیٰ نے فرمایا ﴿ قُلْ مَتَاعُ الدُّنْيَا قَلِيْلٌ ﴾ اے محبوب آپ فرما دیں دنیا کا مال قلیل ہے یعنی دنیا کا مال جتنا زیادہ بھی ہو وہ اخروی نعمتوں کے مقابل قلیل ہی ہے۔ (راقم)

"وانهم باعوا آخرتهم بحظهم من المعظم الذی لا خطر له"

یعنی وہ کتنے ہی بیوقوف تھے جنہوں نے آخرت کی عظیم نعمتوں کو دنیا کے حقیر مال کے بدلے بیچ دیا۔ (از قرطبی)

اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ نے "قليل" کا معنی "ذلیل" کیا ہے راقم نے بھی اسی کی نقل کی ہے اور عام فہم لفظ "حقیر" سے ترجمہ کر دیا ہے۔ یہ تراجم تمام مذکورہ وجوہ (جو وجہ ذکر کی گئی ہیں) کو شامل ہیں۔

اُولٰئِکَ مَایَاْکُلُوْنَ فِیْ بُطُوْنِہِمْ اِلَّا النَّارَ :

''وہ لوگ نہیں کھا رہے اپنے پیٹوں میں سوائے آگ کے۔

﴿یَاْکُلُوْنَ﴾ کے بعد بطور تاکید ﴿فِیْ بُطُوْنِہِمْ﴾ ذکر کر کے اشارہ کیا گیا ہے کہ اس میں ﴿یَاْکُلُوْنَ﴾ کا حقیقی معنی ہے ''کھانا''۔ مجازی معنی نہیں کیونکہ کبھی کسی کی زمین کوئی شخص غصب کر لے تو اس وقت بھی کہا جاتا ہے " اکل ارضی " فلاں شخص میری زمین کھا گیا۔ اسی طرح کوئی شخص کسی کا مال بے مقصد ضائع کر دے تو اس وقت بھی کہا جاتا ہے " اکل مالی " فلاں شخص نے میرا مال کھالیا ہے لیکن یہ مجازی معانی ہیں۔

آگ کھانے کا مطلب:

چونکہ انہوں نے حق کو چھپایا۔ حق کو چھپانا حرام ہے حرام کام پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے عذاب ہوگا خصوصا حق کو چھپانے سے رشوت لینا حرام طریقہ سے مال حاصل کرنا آگ میں جانے کا ذریعہ ہے۔

" فسمی ما اکلوه من الرشاء نارا لانه یؤدیهم الی النار "

ان کے رشوت کھانے کو آگ سے تعبیر کر دیا کیونکہ یہ انہیں آگ میں پہنچانے کا ذریعہ ہے۔
اکثر مفسرین کرام نے آگ کا یہی مطلب ذکر کیا تاہم بعض حضرات نے یہ بھی بیان کیا ہے۔

" وقیل ای انه یعاقبهم علی کتمانهم بأکل النار فی جهنم حقیقة "

اور بعض حضرات نے بیان کیا ہے کہ ان کو حق کے چھپانے کی وجہ سے جہنم میں حقیقۃً آگ کھلائی جائے گی۔ (قرطبی)

وَلَا یُکَلِّمُہُمُ اللّٰہُ یَوْمَ الْقِیَامَۃِ : ''اور نہیں کلام کرے گا ان سے اللہ قیامت کے دن''

کلام نہ کرنے کی تین وجوہ: بظاہر یہ وہم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کلام تو تمام لوگوں سے کرنا ہے کیونکہ رب تعالیٰ نے فرمایا ہے ﴿فَوَرَبِّکَ لَنَسْئَلَنَّہُمْ اَجْمَعِیْنَ عَمَّا کَانُوْا یَعْمَلُوْنَ﴾ قسم ہے تیرے رب کی ہم ضرور بضرور تمام سے سوال کریں گے اس سے جو وہ عمل کرتے رہے۔ اور ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿فَلَنَسْئَلَنَّ الَّذِیْنَ اُرْسِلَ اِلَیْہِمْ وَلَنَسْئَلَنَّ الْمُرْسَلِیْنَ﴾
''ہم ضرور بضرور سوال کریں گے ان لوگوں سے جن کی طرف رسول بھیجے گئے اور ضرور بضرور ہم سوال کریں گے مرسلین سے''

ان آیات سے پتہ چلتا ہے کہ رب تعالیٰ نے کلام تو مومنوں اور کافروں سب سے ہی فرمانا ہے کلام نہ کرنے کا کیا مطلب؟ تو اس کے جواب میں یہ بتایا گیا ہے کہ کلام نہ کرنے کی تین وجوہ ہیں:

اس میں **ایک** وجہ یہ ہے ''کان المراد من الآیة انه تعالیٰ لا یکلمھم بتحیة وسلام'' کہ اللہ تعالیٰ ان سے رحمت کا کلام نہیں فرمائے گا ان پر سلام نہیں فرمائیگا اس آیۃ سے یہ مراد جن آیات میں کلام کرنے کا ذکر ہے انکا مطلب یہ ہے کہ کفار سے غیظ وغضب کا کلام کریگا جس سے انکا غم زیادہ بڑھے گا۔ حسرت زیادہ ہوگی کہ کاش ہم نے وہ کام نہ کئے ہوتے جن کی وجہ آج ہمیں ذلت کا سامنا ہے اللہ تعالیٰ فرمائے گا ﴿ اخْسَئُوا فِيهَا وَلَا تُكَلِّمُونِ ﴾ ''یہاں سے ہٹ جاؤ میرے ساتھ کلام نہ کرو'' تقریباً اس کا آسان لفظوں میں مطلب یہ ہے دفعہ ہو جاؤ میرے ساتھ کوئی بات نہ کرو۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ '' ولا یکلمھم '' کا مجازی معنی یہ ہے (قیامت کے دن) رب تعالیٰ ان پر ناراض ہوگا:

'' لان عادۃ الملوک انھم عند الغضب یعرضون عن المغضوب علیه
ولا یکلمونه کما انھم عند الرضا یقبلون علیه بالوجه والحدیث ''

اس لئے کہ بادشاہوں کی عادت یہ ہے کہ وہ غضب کے وقت اس شخص سے منہ پھیر لیتے ہیں جس پر ان کو غصہ ہوتا ہے اور اس سے وہ کلام نہیں کرتے جس طرح وہ راضی ہونے کے وقت اس کی طرف توجہ کرتے ہیں اور کلام کرتے ہیں۔

تیسری وجہ یہ بھی ممکن ہے کہ جن آیات میں کلام کرنے کا ذکر ہے ان سے مراد اللہ تعالیٰ کا کلام کرنا فرشتوں کے واسطہ سے ہو۔ اور جن میں کلام نہ کرنے کا ذکر ہے اس سے مراد یہ ہو کہ اللہ تعالیٰ بالکل ہی کافروں سے کلام نہیں فرمائے گا۔ (از کبیر)

پہلی دو وجہ زیادہ قوی نظر آتی ہیں کیونکہ غیظ وغضب سے کلام کرنیکو درحقیقت کلام کرنا نہیں کہا جاتا۔ (راقم)

وَلَا يُزَكِّيهِمْ : ''اور تزکیہ نہیں کرے گا ان کا'' اس جملہ کا مشہور معنی تو یہ ہے ﴿ وَلَا يُزَكِّيهِمْ ﴾ ای لا یطھرھم من دنس الذنوب '' اور ان کو گناہوں کی میل سے پاکیزہ نہیں کرے گا۔

یعنی جس طرح مسلمان اگر گہنگار رہوئے اور اللہ تعالیٰ نے چاہا تو ان کو گناہوں سے پاک کر کے ان کی بخشش فرمادے گا لیکن کفار کو گناہوں سے پاک نہیں فرمائے گا کیونکہ کفر وشرک کو اللہ تعالیٰ نے اپنے وعدہ کے مطابق معاف فرمانا ہی نہیں۔ (ماخوذ از روح المعانی)۔ اس کا اور معنی یہ ہے ''لا ینسبھم الی

التزکیۃ ولا یثنی علیھم " کہ اللہ تعالیٰ ان کو پاکیزگی کی طرف منسوب نہیں کرے گا اور نہ ہی ان کی تعریف فرمائے گا۔

اس کا اور معنی یہ ہے " لا یقبل اعمالھم کما یقبل اعمال الازکیاء " کہ اللہ تعالیٰ ان کے اعمال قبول نہیں فرمائے گا جس طرح وہ پاکیزہ لوگوں کے اعمال کو قبول فرمائے گا۔

اور اس کا معنی یہ ہے "لا ینزلھم منازل الازکیاء " کہ اللہ تعالیٰ ان کو پاکیزہ لوگوں کے مراتب عطا نہیں فرمائے گا۔

اردو کا دائرہ تنگ ہے کوئی ایسا لفظ نہ ملا جو ان تمام معانی کو شامل ہوتا تو راقم نے ترجمہ میں بھی عربی لفظ ہی شامل کر دیا (اور ان کا تزکیہ نہیں فرمائے گا)۔

وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ : ''اور ان کے لئے دردناک عذاب ہے''

طلباء کرام کی توجہ کے لئے : فعیل کبھی بمعنی فاعل ہوتا ہے جیسے " سمیع " بمعنی " سامع " اور " علیم " بمعنی ''عالم'' اور فعیل کبھی بمعنی مفعول ہوتا ہے جیسے " جریح " بمعنی ''مجروح'' اور ''قتیل'' بمعنی ''مقتول'' اور فعیل کبھی معنی مفعل ہوتا ہے جیسے " بصیر " بمعنی ''مبصر''۔ (از کبیر)

اس میں پھر دو احتمال ہیں کہ فاعل کا معنی ہے ان کے لئے عذاب ہوگا درد پہنچانے والا۔

اور ایک احتمال یہ ہی کہ مفعول کا معنی ہو'' جلالین میں مفعول والا معنی لیا گیا ہے'' کہ ان کو عذاب ہوگا درد پہنچایا ہوا یعنی اتنا شدید عذاب ہوگا کہ خود عذاب کو درد محسوس ہوگا۔ (راقم)

عجیب نکتہ : جب کسی کو خالص ضرر (نقصان و تکلیف) پہنچایا جائے اور اس کے ساتھ اس کی ذلت وحقارت بھی پائی جائے تو اسے عقاب کہا جاتا ہے۔ یہاں رب تعالیٰ نے پہلے ان کی ذلت وحقارت کو ﴿وَلَا يُكَلِّمُهُمُ اللّٰهُ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَلَا يُزَكِّيْهِمْ﴾ سے بیان فرمایا کہ نبی کریم ﷺ کے اوصاف چھپانے والے اتنے حقیر اور ذلیل ہوں گے کہ رب تعالیٰ ان سے قیامت کے دن نہ ہی رحمت والا کلام فرمائے گا اور نہ ہی ان کو سلام دے گا۔ اور اپنے گناہوں کی آلودگی میں جوں کے توں ہی رہیں گے رب تعالیٰ انہیں پاک نہیں فرمائے گا۔ اس کے بعد رب تعالیٰ نے ﴿وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ﴾ سے ان کے ضرر کو بیان فرمایا (گویا یوں سمجھا جائے کہ اس مقام پر علیحدہ علیحدہ اجزا کو ذکر فرما کر کہ ان کی حقارت وذلت بھی ہوگی اور ان کو ضرر بھی ہوگا اس کو واضح کر دیا کہ ان کو جو عذاب دیا جائے گا وہ عقاب ہی ہوگا۔

" وقدم الاھانة علی المضرة تنبیھا علی ان الاھانة اشق واصعب "

اوران کی حقارت وذلت کوضرر سے پہلے ذکرفرما کراس پرتنبیہ کی گئی ہے کہ بیشک کسی کوحقیر سمجھنا اوراسے ذلیل کرنا اسے عذاب دینے سے زیادہ اس پرشاق گزرتا ہےاوراس کی طبیعت پراس کا زیادہ بوجھ ہوتا ہے جواسے مشکل نظرآتا ہے۔

شدید عذاب کی عظیم وجہ: آیۃ کریمہ میں جب شدید عذاب کا ذکر کیا کہ وہ اپنے پیٹوں میں آگ کھائیں گے۔ان کیلئے ذلیل ورسوا کرنے والا عذاب ہوگا۔اتنا شدید عذاب کیوں ہوگا؟اس کی صرف یہی وجہ ہے کہ ان کا جرم سب جرموں سے بڑا ہوگا کہ انہوں نے محبوب خدا کےاوصاف چھپائے جب کہ رب تعالیٰ نے آپ کےاوصاف وکمالات کوبیان کرنے کاحکم دیا﴿ وَاَمَّا بِنِعۡمَةِ رَبِّکَ فَحَدِّثۡ﴾ اور آپ اپنے رب کی نعمت کوخوب بیان کرو۔جب مصطفیٰ کریم ﷺ رب تعالیٰ کی نعمت عظمیٰ ہیں تو آپ کے اوصاف کوبیان کوواجب ہوگیا جنہوں نے آپ کےاوصاف کوچھپایا یقیناً وہ عظیم مجرم ہیں۔(راقم)

مسئلہ: " دلت الآیة علی تحریم الکتمان لکل عالم فی باب الدین یجب اظھارہ "

آیۃ کریمہ سے یہ واضح ہوا کہ دین میں جن چیزوں کا ظاہر کرنا ضروری ہےان کوچھپانا کسی عالم کے لئے جائز نہیں(کبیر)بس یہی وجہ ہے کہ علماء بے دینوں کی نظر میں کھٹکتے ہیں کہ وہ حق کوظاہر کرتے ہیں بے دین اسے پسند نہیں کرتے۔

تنبیہ: " العبرة بعموم اللفظ لا بخصوص السبب فالآیة وان نزلت فی الیھود لکنھا عامة فی حق کل من کتم شیئا من باب الدین یجب اظھارہ فتصلح لان یتمسک بھا القاطعون بوعید اصحابه الکبائر واللہ اعلم "

اعتبارعموم الفاظ کا ہوتا ہےخصوص سبب کانہیں آیۃ اگرچہ یہود کے متعلق نازل ہوئی لیکن عام ہے ہراس شخص کے متعلق جس نے دین سے ان مسائل کوچھپایا جن کوظاہر کرنا ضروری ہے۔اور یہ بھی واضح ہو گیا کہ جوکبیرہ گناہوں کے مرتکب ہوتے ہیں وہ رب تعالیٰ کی شدید وعید کے مستحق ہوتے ہیں۔(ازکبیر)

﴿ اُولٰئِکَ الَّذِیْنَ اشْتَرَوُا الضَّلٰلَةَ بِالْهُدٰی وَ الْعَذَابَ بِالْمَغْفِرَةِ فَمَا اَصْبَرَهُمْ عَلَی النَّارِ ﴾

۱) ''یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے ہدایت کے بدلے گمراہی مول لی اور بخشش کے بدلے عذاب تو کس درجہ انہیں آگ کا سہارا ہے''۔

۲) ''یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے حاصل کیا گمراہی کو بدلے ہدایت کے اور عذاب کو حاصل کیا بدلے بخشش کے تو کتنا ہی صبر ہے ان کا آگ پر''۔

اس سے پہلی آیۃ کریمہ میں علماء یہود کے کتمان حق (حق چھپانا) کا ذکر کیا اور ان پر وعید شدید (سخت عذاب) کا ذکر کیا اب اس آیۃ کریمہ میں ان کے جرم پر مرتب ہونے والے آثار کا ذکر کیا جارہا ہے کہ وہ گمراہی کو ہدایت کے بدلے حاصل کررہے تھے اور عذاب کو مغفرت کے بدلے حاصل کررہے تھے ان کا یہ طریقہ آگ کے عذاب تک پہنچانے کا ذریعہ ہے وہ کیسے ہی لوگ تھے جو آگ تک پہنچانے والے کاموں پر قائم تھے۔

قدرے وضاحت: ہر انسان جو کام بھی کرتا ہے اس کا تعلق یا دنیا سے ہوتا ہے اور یا آخرت سے۔ دنیا سے تعلق رکھنے والے کام دو قسم کے ہیں ایک اچھے اور دوسرے برے دنیا کے لحاظ پر اچھے کاموں میں زیادہ اچھے دو کام ہیں ہدایت پر رہنا اور علم حاصل کرنا کیونکہ تمام اچھے کاموں کی دارومدار ان دو چیزوں پر ہی ہے۔ اور دنیا میں سب سے بری چیزیں دو ہیں گمراہی اور جہالت کیونکہ تمام برائیاں ان میں ہی پائی جاتی ہیں جب انہوں نے دنیا میں ہدایت اور علم کو چھوڑ دیا اور گمراہی اور جہالت پر راضی ہو گئے۔

'' فلا شک انهم فی نهایة الخیانة فی الدنیا ''

اس میں کوئی شک نہیں کہ بیشک وہ دنیا میں بہت بڑی خیانت پر ہیں یہی ان کے لئے بہت بڑے خسارے کا سبب ہے۔ آخرت میں سب سے اچھی چیز مغفرت ہے اور سب سے زیادہ خسارے والی چیز عذاب ہے جب انہوں نے مغفرت کو چھوڑ دیا اور عذاب پر راضی ہو گئے۔ تو یقیناً وہ آخرت میں بہت بڑے خسارے میں ہوں گے۔

" واذا کانت صفتهم علی ما ذکرناه کانوا لا محالة اعظم الناس خسارا فی الدنیا وفی الآخرة "

جب ان لوگوں کی صفات وہ ہیں جو ہم نے ذکر کی ہیں تو وہ یقینی طور پر تمام لوگوں سے زیادہ دنیا اور آخرت میں خسارے میں ہوں گے۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے متعلق کہا ہے کہ "انہوں نے مغفرت کے بدلے عذاب حاصل کیا"۔ کیونکہ جب ان کو علم تھا کہ حضور ﷺ کے اوصاف برحق ہیں اور یہ بھی انہیں علم تھا کہ ان اوصاف کا ظاہر کرنا شکوک وشبہات کو دور کرنا ہے اور اس پر عظیم ثواب حاصل ہونا ہے۔ اور ان کو چھپانے میں اور شبہادت ڈالنے کی وجہ سے بہت بڑا عذاب ہونا ہے جب سب کچھ جاننے کے باوجود انہوں نے حق چھپایا " کانوا بالعین للمغفرة بالعذاب لا محالة " تو وہ یقیناً مغفرت کے بدلے عذاب حاصل کرنے والے ہوئے۔ (از کبیر)

تنبیہ: آیۂ کریمہ میں ﴿اِشْتَرَوُا﴾ اپنے حقیقی معنی "خریدنے" میں استعمال نہیں بلکہ اس کا مجازی معنی "تبدیل کرنا اور" حاصل کرنا" ہے کیونکہ حقیقی معنی میں مال کا تبادلہ مال سے ہوتا ہے یہاں وہ صورت نہیں پائی گئی۔ (راقم)

فَمَآ اَصْبَرَهُمْ عَلَى النَّارِ : "تو کتنا ہی صبر ہوگا ان کا آگ پر" اس جملہ کے مطلب دو طرح بیان کئے گئے ہیں ایک یہ کہ "ما" استفہامیہ (برائے سوال) لیکن استفہام بمعنی توبیخ (ڈانٹ ڈپٹ) کے استعمال ہے اب معنی یہ ہوا " ما الذی اصبرهم ، وای شئی صبرهم علی النار حتی ترکوا الحق واتبعوا الباطل " کس چیز نے انہیں آگ پر صبر دلایا یعنی انہوں نے حق کو چھوڑ کر باطل کی تابعداری شروع کر لی جو ان کو آگ تک پہنچانے کا ذریعہ ہے کتنے ہی نادان ہیں وہ لوگ جو اس پر سہارا لگا بیٹھے ہیں۔

اس معنی کے لحاظ پر " اصبر " صبر کے معنی میں ہوگا کثیر مقام پر " افعل " بمعنی "فعل" اور " اکرم " بمعنی "کرم" اور " اخبر " بمعنی "خبر" استعمال ہوتا۔

دوسرا مطلب یہ ہے کہ تعجب کا معنی لیا گیا ہو کیونکہ جو شخص کسی چیز کے اسباب پر راضی ہوتا ہے وہ اس چیز پر بھی راضی ہوتا ہے جب وہ ایسے کام کر رہے تھے جو آگ میں جانے کا ذریعہ تھے تو گویا

انہیں آگ پسند تھی اس وجہ سے کہا گیا ﴿ فَمَا اَصۡبَرَهُمۡ عَلَى النَّارِ ﴾ (تعجب ہے اس پر کہ) کتنا ہی صبر ہے ان کا آگ پر۔

اسی طرح جب وہ ایسے کام کر رہے تھے جو عذاب کا سبب تھے وہ جانتے بھی تھے کہ ہم عذاب والے کام کر رہے ہیں تو گویا کہ "بذلک کالراضین بعذاب اللہ تعالیٰ" وہ اس وجہ سے اللہ تعالیٰ کے عذاب پر راضی تھے۔ عربی زبان کا یہ محاورہ بھی ہے کہ جب کوئی شخص بادشاہ کی مخالفت کرتا ہے اس کو غضب دلانے والے کام کرتا ہے تو کہا جاتا ہے "ما اصبرک علی القید والسجن" تو کتنا ہی صبر کرنے والا ہے قید اور قید خانہ پر۔

اسی سے یہ واضح ہو گیا کہ مراد اس سے دنیا میں صبر کرنا ہے کیونکہ وہ دنیا میں وہ کام کر رہے تھے جو ان کو آگ تک پہنچانے والے تھے دنیا میں ہی وہ ہدایت کے بدلے گمراہی حاصل کر رہے تھے۔ لہٰذا اصم کا یہ کہنا کہ اس کا تعلق آخرت سے ہے کہ رب تعالیٰ جب انہیں فرمائے گا ﴿ اخسؤ فیھا ولا تکلمون ﴾ دھتکارے پڑے رہو اس میں میرے ساتھ کلام نہ کرو۔

تو اس وقت وہ اپنے سروں کو جھکائے ہوں گے اور خاموش ہوں گے یہی ان کا صبر ہوگا۔ لیکن اصم کا یہ قول درست نہیں کیونکہ رب تعالیٰ نے ان کا یہ وصف فی الحال بیان کیا ہے یہ نہیں کہ آئندہ ایسا ہوگا دوسری وجہ یہ ہے کہ جہنمیوں کا خاموش رہنا بھی درست نہیں "قد یقع منھم الجزع والاستغاثۃ" بلکہ وہ چلائیں گے اور فریاد طلب کریں گے۔

طلباء کرام کی توجہ کے لئے:

یہاں یہ ذکر کرنا ہے کہ تعجب کیا ہے اور اس کے صیغے کیا ہیں اس میں دو بحثیں ہیں۔

پہلی بحث کہ تعجب کیا ہے؟ "وھو استعظام الشئی مع خفاء سبب حصول عظم ذلک الشئی" تعجب یہ ہے کہ کسی چیز کو عظیم سمجھنا اور اس کی عظمت کے حاصل ہونے کے اسباب کا پتہ نہ ہو۔ حقیقی تعجب تو ان دو معنوں کے بغیر حاصل نہیں ہوتا۔ ہاں البتہ کبھی کسی چیز کے عظیم ہونے پر تعجب کر لیا جاتا ہے۔ اگرچہ اس کے اسباب پوشیدہ نہ ہوں یا عظمت کے اسباب حصول ہی نہ پائے جائیں۔

تنبیہ : علامہ نحعی رحمہ اللہ نے فرمایا"معنی التعجب فی حق اللہ تعالیٰ مجردہ الاستعظام" تعجب کی نسبت جب رب تعالیٰ کی طرف ہوتو اسوقت معنی صرف کسی چیز کا بڑا ہونا مراد ہوتا ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ سے کسی چیز کے اسباب کا مخفی ہونا ممکن نہیں ۔البتہ بندوں کے لئے تعجب کی وہی تعریف ہے جو ذکر کی گئی کہ چیز عظیم بھی ہواوراس کی عظمت کے حصول کے اسباب مخفی ہوں۔

اسی طرح"سخریة" اور " استھزاء "اور"مکر" کی نسبت بندوں کی طرف کریں تو اور معانی ہیں اور رب تعالیٰ کی طرف منسوب کریں تو اور معانی ہیں۔

دوسری بحث: فعل تعجب کے دوصیغے ہیں " ما افعله و افعل به " ﴿فَمَا اَصْبَرَهُمْ عَلَى النَّارِ﴾ پہلے صیغہ کے مطابق ہے اس میں نحویوں کے تین مذہب ہیں ایک سیبویہ کا اس کے نزدیک "ما" نکرہ ہے لیکن " شر اھرذ اناب " کی طرح مبتدا ہے اوراس کے مابعد خبر ہے۔اور اخفش کے نزدیک " ما " موصولہ ہے اور خبر محذوف ہے تقدیر عبارت کی یہ ہے یعنی " ما احسنه " کا معنی یہ ہوگیا:

" الذی احسن زیدا ای جعله ذا حسن شئی عظیم "

اور فراء کے نزدیک " ما " استفہامیہ ہے اوراس کے بعد خبر ہے اب تقدیر عبارت کی یہ ہوگی "ای شئی احسن زیدا "

فراء کے مذہب کو علامہ رضی نے راجح قرار دیا بہر حال معنی تعجب کا"زید کتنا ہی حسین ہے" اور ﴿فَمَا اَصْبَرَهُمْ عَلَى النَّارِ﴾ کا معنی تعجب کے طور پر"ان کو کتنا ہی صبر ہے آگ پر"

(از کبیر و کافیہ و جامی)

﴿ ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ نَزَّلَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ وَاِنَّ الَّذِيْنَ اخْتَلَفُوْا فِي الْكِتٰبِ لَفِيْ شِقَاقٍۢ بَعِيْدٍ ﴾

۱) ''یہ اس لئے کہ اللہ نے کتاب حق کے ساتھ اتاری اور بیشک جو لوگ کتاب میں اختلاف ڈالنے لگے وہ ضرور پرے سرے کے جھگڑالو ہیں''۔

۲) ''یہ اس لئے کہ بیشک اللہ نے اتاری کتاب حق کے ساتھ اور بیشک وہ لوگ جنہوں نے اختلاف کیا کتاب میں وہ بھٹکے ہوئے ہیں بہت بڑے''۔

'' **ذلک ای مجموع ماذکر** ''اس مقام میں '' **ذلک** '' کا اشارہ '' **مجموع ما ذکر** '' (تمام چیزیں جن کا ذکر پہلے ہو چکا ہے) کی طرف ہے یعنی ان کا پیٹوں میں آگ کھانا۔ اور اللہ تعالیٰ کا ان سے کلام نہ کرنا اور اللہ تعالیٰ کا ان کی پاکیزگی بیان نہ کرنا اور ان کا دردناک عذاب میں مبتلا ہونا جو ان کے کتمان حق (حق چھپانے) پر مرتب ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کتاب کو حق سے اتارا لیکن انہوں نے اس میں اختلاف کیا بعض پر ایمان لائے اور بعض سے کفر کیا وہ حق راہ سے دور ہو کر گمراہی میں مبتلا ہوئے۔

بِاَنَّ اللّٰهَ نَزَّلَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ : '' باء '' سبب کے لئے ہے '' **الکتاب** '' سے مراد قرآن پاک یا توراۃ ہے۔ '' **بالحق** '' یعنی **متلبسا بالحق** کہ کتاب کو حق سے اتارا یعنی ان میں جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے اتارا گیا وہ حق ہے توراۃ میں تو تحریف کر دی گئی اور وہ منسوخ بھی ہو گئی لیکن قرآن پاک کی حفاظت کا ذمہ رب تعالیٰ نے خود اٹھالیا اس لئے اس میں نہ تحریف ہوئی ہے اور نہ ہی منسوخ۔

مقصد بیان یہ ہے کہ وہ کتاب جو حق سے نازل کی اگر مراد توراۃ ہو تو مطلب یہ ہوگا کہ توراۃ میں نبی کریم ﷺ کے اوصاف حق سے بیان کئے گئے ہیں لیکن یہ لوگ ان کو چھپا کر گمراہ ہو گئے۔ اور اگر مراد قرآن پاک ہو تو مطلب یہ ہوگا کہ قرآن پاک اللہ تعالیٰ نے حق سے نازل فرمایا لیکن وہ اسے چھوڑ کر گمراہی میں مبتلا ہو گئے۔

وَاِنَّ الَّذِیْنَ اخْتَلَفُوْا فِی الْکِتَابِ : الکتاب، پر الف لام جنسی ہے یعنی جنس کتاب مراد اس سے یہ ہے کہ بیشک وہ لوگ جنہوں نے اللہ تعالیٰ کی کتابوں میں اختلاف کیا بعض کتابوں پر ایمان لایا اور بعض پر ایمان نہیں لایا۔

یا الف لام عہد خارجی ہو اور کتاب سے مراد توراۃ ہو اب ﴿ اختلفوا ﴾ بمعنی "تخلفوا " ہوگا مطلب یہ ہوگا کہ بیشک '' توراۃ میں جو حق بیان کیا گیا ہے'' اس پر چلنے سے وہ ہٹ گئے یا معنی یہ بیان کیا جائے گا کہ بیشک توراۃ میں نبی کریم ﷺ کے جو اوصاف تھے اور جو احکام تھے " جعلوا ما بدلوہ خلفا عما فیھا " ان کو بدل کر ان کے پیچھے (ان کی جگہ) اور رکھ دیئے۔

الف لام عہد خارجی سے مراد قرآن پاک بھی ہوسکتا ہے اب ان کے اختلاف کرنے کا مطلب یہ ہوگا کہ بعض نے کہا قرآن سحر (جادو) ہے اور بعض نے کہا قرآن شعر ہے اور بعض نے کہا قرآن پہلے لوگوں کی کہانیاں ہیں۔

لَفِیْ شِقَاقٍ بَعِیْدٍ : " ﴿شِقَاقٍ﴾ ای خلاف ﴿بَعِیْدٍ﴾ عن الحق موجب لاشد العذاب "

وہ اس اختلاف میں ہیں جو حق سے دور ہے جو سخت عذاب کا سبب ہے۔ (از روح المعانی)

﴿ لَفِیْ شِقَاقٍ بَعِیْدٍ ﴾ کے معنی میں چند وجوہ ہیں۔

(۱) ایک ان میں سے یہ ہے کہ بیشک یہ لوگ آپ کی عداوت کی وجہ سے توراۃ اور انجیل کی تحریف کی کیفیت میں اختلاف رکھتے ہیں اسی وجہ سے " ھم فیما بینھم فی شقاق بعید ومنازعۃ شدیدۃ " وہ آپس میں بہت زیادہ اختلاف رکھتے ہیں شدید جھگڑا کرتے ہیں۔

اعلیٰ حضرت کا ترجمہ اسی قول کے مطابق ہے ''اور ضرور پرلے سرے کے جھگڑالو ہیں''۔

(۲) دوسری وجہ یہ ہے گویا کہ رب تعالیٰ نے نبی کریم ﷺ کو یہ فرمایا:

" ھؤلاء وان اختلفوا فیما بینھم فانھم کالمتفقین علی عداوتک وغایۃ المشاقۃ لک فلھذا خصھم اللہ بذلک الوعید "

یہ لوگ اگرچہ آپس میں ایک دوسرے سے اختلاف رکھتے لیکن آپ کے ساتھ عداوت رکھنے میں سب متفق ہیں جو آپ کو بہت زیادہ مشقت میں ڈالنے کا ذریعہ ہے اسی وجہ سے رب تعالیٰ نے اس

وعید میں یہود ونصاریٰ کو خاص کیا۔

اب مطلب یہ ہوگا کہ بیشک جن لوگوں نے کتاب میں اختلاف کیا وہ آپ کے ساتھ عداوت کرنے کی وجہ سے آپ کو بہت بڑی مشقت میں ڈال رہے ہیں۔

(۳) تیسرا معنی یہ ہے کہ انہوں نے اصل تحریف میں تو اتفاق کیا لیکن تحریف کی کیفیت میں اختلاف کیا" فان کل واحد منهم یکذب صاحبه ویشاقه وینازعه " بیشک ہر ایک ان میں سے اپنے صاحب کی تکذیب کرتا ہے اور مخالفت کرتا ہے اور جھگڑا کرتا ہے۔ (از کبیر)

خیال رہے کہ پہلے معنی اور تیسرے معنی میں فرق یہ ہے کہ پہلے معنی میں مطلقا ان کا اختلاف ذکر کیا کہ وہ آپس میں اختلاف رکھتے ہیں اور جھگڑا کرتے ہیں۔ اور تیسرا معنی خاص اور مقید ذکر کیا کہ وہ تحریف کی کیفیت میں ایک دوسرے کی مخالفت کرتے ہیں اور جھگڑا کرتے ہیں۔

تمام معانی کا جامع معنی: ﴿لَفِیْ شِقَاقٍ بَعِیْدٍ﴾ لفی ضلال بعید عن الحق "

بیشک جن لوگوں نے اختلاف کیا ہے کتاب میں وہ گمراہی میں ہیں جو حق سے دور ہے۔

یعنی "شِقَاقٍ" کا معنی "گمراہی" اور "بعید" سے مراد حق سے دور ہونا ہے۔ (از بیضاوی)

راقم کے نزدیک علامہ بیضاوی رحمہ اللہ کا بیان کیا ہوا معنی روح المعانی کے معنی کو اور کبیر کے تینوں معانی کو شامل ہے اس لئے راقم نے اسی کے مطابق ترجمہ کیا ہے" وہ بہت بڑی گمراہی میں ہیں" کیونکہ حق سے دور ہونا درحقیقت بڑی گمراہی میں مبتلا ہونا ہی ہے۔

☆☆☆☆☆

﴿ لَیسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوا وُجُوهَکُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَلٰکِنَّ الْبِرَّ مَنْ آمَنَ بِاللّٰهِ وَالْیَوْمِ الْآخِرِ وَالْمَلٰئِکَةِ وَالْکِتَابِ وَالنَّبِیّٖنَ وَآتَی الْمَالَ عَلٰی حُبِّهٖ ذَوِی الْقُرْبٰی وَالْیَتَامٰی وَالْمَسَاکِیْنَ وَابْنَ السَّبِیْلِ وَالسَّائِلِیْنَ وَفِی الرِّقَابِ وَاَقَامَ الصَّلٰوةَ وَآتَی الزَّکٰوةَ وَالْمُوْفُوْنَ بِعَهْدِهِمْ اِذَا عَاهَدُوْا وَالصَّابِرِیْنَ فِی الْبَاْسَاءِ وَالضَّرَّاءِ وَحِیْنَ الْبَاْسِ اُولٰئِکَ الَّذِیْنَ صَدَقُوْا وَاُولٰئِکَ هُمُ الْمُتَّقُوْنَ ﴾

۱) ''کچھ اصل نیکی یہ نہیں کہ منہ مشرق یا مغرب کی طرف کرو ہاں اصل نیکی یہ کہ ایمان لائے اللہ اور قیامت اور فرشتوں اور کتاب اور پیغمبروں پر، اور اللہ کی محبت میں اپنا عزیز مال دے رشتہ داروں اور یتیموں اور مسکینوں اور راہ گیر اور سائلوں کو گردنیں چھڑانے میں اور نماز قائم رکھے اور زکوٰۃ دے اور اپنا قول پورا کرنے والے جب عہد کریں اور صبر والے مصیبت اور سختی میں اور جہاد کے وقت یہی ہیں جنھوں نے اپنی بات سچی کی اور یہی پرہیزگار ہیں''

۲) ''نہیں ہے کامل نیکی کہ تم پھیرو اپنے چہروں کو طرف مشرق اور مغرب کے اور لیکن کامل نیکی یہ ہے کہ جو شخص ایمان لائے اللہ پر اور دن آخرت پر اور کتاب پر اور نبیوں پر اور دے مال محبت سے قریبی لوگوں کو اور یتیموں کو اور مسکینوں کو اور مسافروں کو اور سوال کرنے والوں کو اور گردنیں چھڑانے میں اور قائم رکھے نماز اور دے زکوٰۃ اور پورا کرنے والے ہیں اپنے وعدوں کو جب وہ وعدہ کرتے ہیں اور صبر کرنے والے ہیں مصیبت اور سختی میں اور بوقت جہاد یہی لوگ ہیں وہ جنھوں نے سچ کہا اور یہی لوگ تقوی رکھنے والے ہیں''۔

شان نزول: اس آیۃ کریمہ کے شان نزول میں چند احتمال ہیں:

۱) یہ آیۃ کریمہ اہل کتاب کے حق میں نازل ہوئی جب انہوں نے بیت المقدس کی طرف توجہ کرنے میں شدت اختیار کی اور مؤمنین کو بھی طعنے دینے لگے کہ تم نے بیت المقدس کو چھوڑ کر کعبہ کو قبلہ بنالیا رب تعالیٰ نے ان کا رد فرمایا کہ مشرق اور مغرب کی طرف منہ کرنا ہی نیکی نہیں بلکہ کامل نیکی اس وقت حاصل ہوگی جب ایمان کامل ہوگا اور نیک اعمال پائے جائیں گے (تفصیلی ذکر انشاء اللہ آگے آرہا ہے)

۲) یہ آیۃ کریمہ مومنین کے حق میں نازل ہوئی جب قبلہ تبدیل کر دیا گیا تو بعض مومن حضرات نے کعبہ کے قبلہ بن جانے کو ہی مقصود اعظم سمجھا اسی پر سہارا لگا بیٹھے تو رب تعالیٰ نے اس آیۃ کریمہ کو نازل فرمایا کہ کامل نیکی صرف مشرق و مغرب کی طرف منہ کرنے سے حاصل نہیں بلکہ جن پر ایمان لانا ضروری ہے ان پر ایمان لائے اور عبادات پر عمل کرے تو پھر کامل نیکی حاصل ہوگی۔

۳) شان نزول میں تیسرا قول یہ ہے کہ یہ آیۃ کریمہ مومنین اور یہود کے متعلق نازل ہوئی یعنی اس کا حکم عام ہے کیونکہ قبلہ کی تبدیلی پر مومنین نے خوشی کا اظہار کیا اور یہود نے تشدد شروع کیا یعنی وہ مسلمانوں کو طعنے دینے لگے کہ تم نے قبلہ تبدیل کر دیا ہے۔ جس سے رب تعالیٰ تم پر ناراض ہے وہ یہ نہ سمجھ سکے کہ مسلمانوں کا قبلہ تبدیل کرنا اپنے رائے سے نہ تھا بلکہ اللہ تعالیٰ کے حکم سے تھا۔

" حتی ظنوا انہ الغرض الاکبر فی الدین فبعثھم اللہ تعالیٰ بھذا الخطاب علی استیفاء جمیع العبادات و الطاعات "

یہاں تک کہ ہر فریق نے یہی سمجھا تھا کہ کامیابی کی دارومدار صرف قبلہ پر ہے اور یہی بہت بڑا مقصد ہے تو رب تعالیٰ نے ان کو اس خطاب سے بتایا کہ اصل میں تمام عبادات اور تمام طاعات کو مکمل کرنے میں کامیابی ہے۔

علامہ رازی رحمہ اللہ اس تیسری وجہ کو ترجیح دیتے ہوئے فرماتے ہیں:

" وھذا اشبہ بالظاھر اذ لا تخصیص فیہ فکانہ تعالیٰ قال لیس البر المطلوب ھو امر القبلۃ بل البر المطلوب ھذہ الخصال التی عدھا "

کہ یہ قول زیادہ بہتر ہے کیونکہ آیۃ کریمہ میں ظاہر طور پر کوئی تخصیص نہیں پائی گئی کہ یہ کسی ایک

فریق سے خاص ہو گویا کہ اللہ تعالیٰ نے عام ارشاد فرمایا کہ مطلوب صرف قبلہ نہیں بلکہ تمام نیکیوں پر عمل کرنا ہی بڑا مقصد ہے۔ (ماخوذ از کبیر)

۴) سب سے پہلے حکم صرف ایمان لانے کا تھا احکام فرض نہیں تھے فرائض سے پہلے جس نے کلمہ شہادت صدق دل سے پڑھ لیا ﴿ اشھد ان لا الہ الا اللہ و اشھد ان محمد اعبدہ ورسولہ ﴾ وہ جنت کا مستحق ہو گیا حضرت قتادہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ سب سے پہلے اسی آیۃ کے ذریعے احکام فرض ہوئے۔ (قرطبی)

راقم کے نزدیک بھی تیسرا قول ہی راجح ہے جس کو علامہ رازی رحمہ اللہ نے ترجیح دی ہے۔

طلباء کرام توجہ فرمائیں: ﴿ لَیْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا ﴾ اس مقام میں " البر " کو بعض قراءتوں میں مرفوع پڑھا گیا ہے اور بعض میں منصوب۔ دونوں قراءتیں اولی (بہتر) ہیں ہر ایک میں وجہ ترجیح موجود ہے۔

حمزہ اور حفص کی قراءت جو عاصم سے منقول ہے اس پر نصب (زبر) ہے ان کی دلیل اپنے قول کے راجح ہونے پر یہ ہے کہ " البر " معرفہ ہے اور ﴿ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْھَکُمْ ﴾ بھی مصدر کی تاویل میں معرفہ ہے۔ " ان المصدر المؤول اعرف من المحلی بالالف و اللام " بیشک فعل جب ان مصدریہ کی وجہ سے تاویل مصدر میں ہو وہ زیادہ معرفہ ہوتا ہے بنسبت الف لام کے ذریعے معرفہ سے۔ اس لئے جو زیادہ معرفہ ہو اسے اسم بنانا چاہئے لہٰذا " البـــر " خبر مقدم ہے اور ﴿ اَنْ تُــوَلُّــوْا وُجُوْھَکُمْ ﴾ اسم مؤخر۔

اور رفع والی قراءت کا قول کرنے والے حضرات کی دلیل یہ ہے کہ " لیـــس " کا اسم فاعل کے مشابہ ہے اور خبر مشابہ ہے مفعول کے، فاعل کے لئے اصل یہ ہے کہ وہ فعل کے ساتھ متصل ہو یعنی بغیر کسی وجہ کے فاعل کو مؤخر کرنا اور مفعول کو مقدم ذکر کرنا بہتر نہیں اسی طرح " لیـــس " کا اسم بھی مؤخر کرنا بہتر نہیں۔

دونوں قراءتیں صحیح ہیں دونوں کے دلائل قوی ہیں تاہم ہمارے نزدیک حفص کی قراءت بہتر

ہے لہٰذا " البر " پر نصب کے بہتر ہونے کا قول کیا گیا ہے۔ (از شیخ زادہ و کبیر)

یہود ونصاریٰ کے ایمان اور عبادات میں خلل واقع ہونا:

یہود اور نصاریٰ کا قبلہ میں بھی اتفاق نہ تھا بیت المقدس کی مغربی جانب کا استقبال کرتے تھے اور نصاریٰ مشرق جانب کا۔ پھر بھی وہ سمجھتے یہی تھے کہ صرف بیت المقدس کو قبلہ مان لینے سے تمام مقصد حاصل ہو جاتا ہے۔ رب تعالیٰ نے فرمایا صرف بیت المقدس کو قبلہ تسلیم کر لینے میں کامیابی نہیں بلکہ ایمان لانے اور عبادات کرنے میں کامیابی ہے۔ لیکن ان میں بھی تم خلل ڈالتے ہو۔

اہل کتاب کے ایمان میں خلل:

یہود اللہ تعالیٰ کے جسم کے قائل تھے کہ وہ جسم ہے اسی وجہ سے رب تعالیٰ نے ان کے قول کی حکایت بیان " وَقَالَتِ الیهود عزیرُ ن ابن الله "اور یہود نے کہا عزیر اللہ کے بیٹے ہیں۔

اور یہود نے اللہ تعالیٰ کو معاذ اللہ بخیل (کنجوس) کہا" قَالُوا اِنَّ اللهَ فَقِيرٌ وَّنَحنُ اَغنِيَاء " یہود نے کہا اللہ فقیر ہے اور ہم غنی ہیں۔

" وَقَالَتِ الۡيَهُوۡدُ يَدُ اللهِ مَغۡلُوۡلَة " اور یہود نے کہا اللہ کا ہاتھ تنگ ہے۔

نصاریٰ نے بھی اللہ تعالیٰ کو جسم سمجھا اسی لئے وہ عیسیٰ علیہ السلام کو خدا کا بیٹا تسلیم کرتے تھے ﴿وَقَالَتِ النَّصَارَى الۡمَسِيۡحُ ابۡنُ الله﴾ ''اور نصاریٰ نے کہا مسیح (عیسیٰ) اللہ کا بیٹا ہے۔

واضح ہوا کہ یہود ونصاریٰ کا اللہ تعالیٰ پر وہ ایمان نہ تھا جو اس کی شان کے لائق تھا بلکہ ان کا ایمان حقیقت میں کفر تھا۔

آخرت پر ایمان لانے میں خلل: " وَقَالُوۡا لَنۡ يَّدۡخُلَ الۡجَنَّةَ اِلَّا مَنۡ كَانَ هُوۡدًا اَوۡ نَصَارٰى "

اور انہوں نے کہا ہرگز جنت میں کوئی بھی داخل نہیں ہوگا سوائے اس کے جو یہودی ہوا یا نصرانی۔

یعنی یہود کا دعویٰ یہ تھا کہ جنت میں صرف یہودی جائیں گے اور نصرانیوں کا دعویٰ یہ تھا کہ جنت میں صرف نصرانی جائیں گے ان دونوں فریقوں کا یہ دعویٰ من گھڑت تھا لہٰذا آخرت پر ایمان لانے میں انہوں نے خلل پیدا کیا۔

﴿ وَقَالُوْا لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ اِلَّآ اَيَّامًا مَّعْدُوْدَةً ﴾
''اورانہوں نے کہا ہرگز آگ ہمیں مس نہیں کرے گی سوائے چند دنوں کے''

یعنی انہوں نے کہا کہ ہمارے آباء واجداد نے چالیس دن تک بچھڑے کی پوجا کی تھی ہمیں صرف اتنے دن ہی عذاب ہوگا یہ من گھڑت قول بھی انکے آخرت پر ایمان لانے میں خلل اندازی کا سبب تھا۔

'' والنصاری انکروا المعاد الجسمانی '' نصاری نے جسم کے پھر زندہ ہونے کا انکار کیا ''وکل ذلک تکذیب بالیوم الآخر '' یہ تمام اقوال درحقیقت قیامت کے دن کے انکار کا سبب ہیں۔

ملائکہ پر ایمان لانے میں خلل: یہود نے اس میں خلل پیدا کیا جب انہوں نے جبریل سے اپنی عداوت کا اظہار کیا رب تعالیٰ نے فرمایا جبریل کی عداوت باعث کفر ہے۔ یعنی جبریل کی عداوت درحقیقت رب تعالیٰ سے عداوت اور تمام فرشتوں سے عداوت ہے ان تمام سے عداوت رکھنے والے یقیناً کافر ہیں۔

اللہ کی کتابوں پر ایمان لانے میں خلل: یہود ونصاری نے اس میں بھی خلل ڈالا جب وہ جانتے تھے قرآن پاک اللہ کی کتاب ہے پھر بھی انہوں نے اس کا رد کیا اور اسے قبول نہ کیا۔ اور اپنی کتب کے بھی بعض احکام پر ایمان لایا اور بعض سے کفر کیا رب تعالیٰ نے ان کی مذمت میں فرمایا:

﴿ وَاِنْ يَّاْتُوْكُمْ اُسٰرٰى تُفٰدُوْهُمْ وَهُوَ مُحَرَّمٌ عَلَيْكُمْ اِخْرَاجُهُمْ اَفَتُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْكِتٰبِ وَتَكْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ ﴾

''اور اگر آئیں تمہارے پاس قیدی تو ان کا تم فدیہ دیتے ہو حالانکہ ان کا نکالنا ہی تم پر حرام تھا کیا تم بعض کتاب پر ایمان رکھتے ہو اور بعض سے کفر کرتے ہو''۔

ان کا یہ طریقہ اللہ تعالیٰ کی کتابوں پر ایمان لانے میں خلل اندازی کا سبب تھا۔

انبیاء کرام پر ایمان لانے میں خلل: یہود نے انبیاء کرام پر ایمان لانے کی بجائے ان کو شہید کر دیا رب تعالیٰ نے ان کی مذمت میں بیان فرمایا:

﴿ وَيَقْتُلُوْنَ النَّبِيّٖنَ بِغَيْرِ الْحَقِّ ﴾ ''اور وہ شہید کرتے ہیں انبیاء کو ناحق''

'' وحیث طعنوا فی نبوة محمد ﷺ '' اور انہوں نے نبی کریم ﷺ کی نبوت میں بھی

طعنہ زنی کی اور آپ کی نبوت کو تسلیم نہ کیا اور نہ ہی آپ پر ایمان لایا۔

مال کے خرچ کرنے میں خلل: اللہ تعالیٰ نے جس طرح مال کے خرچ کرنے کا حکم دیا انہوں نے اس کے خلاف دوسرے لوگوں کو شبہات میں ڈال کر ان سے گھٹیا مال حاصل کیا۔ گویا کہ ان کو ثواب سے محروم کر کے حرام طریقہ پر مال خرچ کرنے کا حکم دیا رب تعالیٰ نے ان کی مذمت میں بیان فرمایا:

﴿ واشتروا به ثمنا قليلا ﴾ ''اور حاصل کیا انہوں نے اس کے ذریعے گھٹیا مال''

نماز اور زکوٰۃ میں خلل:

یہود و نصاریٰ نے نبی کریم ﷺ پر ایمان ہی نہ لایا کہ وہ آپ کی شریعت کے مطابق نماز قائم کرتے اور زکوٰۃ ادا کرتے بلکہ " **واليهود كانوا يمنعون الناس بها** "۔ وہ دوسرے لوگوں کو بھی نماز اور زکوٰۃ ادا کرنے سے منع کرتے تھے۔

ایفاء عہد میں خلل: وہ اللہ تعالیٰ سے کیے ہوئے وعدے پورے نہیں کر رہے تھے اس لئے رب تعالیٰ نے ان کو " اَوۡفُوۡا بِعَهۡدِىۡ " کا حکم دیا کہ تم میرے ساتھ کیے ہوئے وعدے پورے کرو۔ (از کبیر)

اعتراض: اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

﴿ لَيۡسَ الۡبِرَّ اَنۡ تُوَلُّوۡا وُجُوۡهَكُمۡ قِبَلَ الۡمَشۡرِقِ وَالۡمَغۡرِبِ ﴾

''نیکی نہیں کہ تم اپنے چہروں کو پھیرو مشرق کی طرف اور مغرب کی طرف''

پھر حکم دیا ﴿ وَاَقَامَ الصَّلٰوةَ ﴾ نماز کے قائم کرنے کا'' نماز میں قبلہ کی طرف منہ کرنا شرط ہے اور نیکی کا کام ہے تو قبلہ کی طرف منہ کرنے کی نفی کرنا کیسے صحیح ہے؟

پہلا جواب: " ﴿ لَيۡسَ الۡبِرَّ ﴾ **نفى لكمال البر وليس نفيا لأصله** "

کہ یہاں یہ مطلب نہیں کہ قبلہ کی طرف منہ کرنا بالکل نیکی نہیں بلکہ مطلب یہ ہے کہ کامل نیکی نہیں گویا کہ یہ کہا گیا ہے نیکی صرف یہ نہیں بلکہ نیکی تمام اچھی عادات کو حاصل کرنے کا نام ہے۔ "**واستقبال القبلة واحد منها فلا يكون ذلك تمام البر**" اور قبلہ کا استقبال بھی خصال حمیدہ (اچھی عادات یعنی عبادات) میں سے ایک ہے صرف استقبال قبلہ کامل نیکی نہیں۔

دوسرا جواب: جب یہود مسلمانوں کو قبلہ کی تبدیلی پر طعنے دے رہے تھے کہ تم نے بیت المقدس سے

کعبہ کی طرف منہ پھیر کر اپنی نیکیوں کو برباد کر لیا ہے جب تک بیت المقدس کی طرف منہ نہیں کرو گے تمہیں کوئی نیکی حاصل نہیں ہوگی۔

اللہ تعالیٰ نے ان کے رد میں یہ آیۂ کریمہ نازل فرمائی کہ جب قبلہ کی تبدیلی میرے حکم سے ہوئی میں نے خود بیت المقدس کے قبلہ ہونے کو منسوخ کر دیا ہے اور کعبہ کو قبلہ بنالیا ہے لہذا اب بیت المقدس کی طرف منہ کرنا کوئی نیکی نہیں:

"بل کان ذلک اثما وفجورا لانه عمل بمنسوخ قد نهى الله عنه وما یکون کذلک فانه لا یعد فی البر"

بلکہ گناہ اور فسق وفجور ہے اس لئے کہ منسوخ پر عمل کرنا منع ہے جس کام سے رب تعالیٰ منع فرما دے اس پر عمل کرنا کوئی نیکی نہیں اس جواب کے مطابق مطلقاً نیکی کی نفی کی گئی۔

تیسرا جواب: "ان استقبال القبلة لا یکون برا اذا لم یقارنه معرفة الله"

بیشک قبلہ کا استقبال اس وقت تک نیکی نہیں جب تک اس کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی معرفت نہ پائی جائے اللہ تعالیٰ کی معرفت اسوقت حاصل ہوگی جب ایمان حاصل ہوا اور عبادات پر عمل کیا جیسا کہ سجدہ اس وقت تک عبادت نہیں جب تک اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ پر ایمان نہ ہو۔

﴿ وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ آمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَالْمَلَائِكَةِ وَالْكِتَابِ وَالنَّبِيِّنَ ﴾

"اور لیکن نیکی وہ ہے جو (نیکی) ایمان لایا اللہ تعالیٰ پر اور آخرت پر اور فرشتوں پر اور نبیوں پر"

" البر " اسم جامع للطاعات، جو تمام طاعات کا جامع ہوا سے " البر " کہا جاتا ہے۔

اور اعمال خیر جو اللہ تعالیٰ کا مقرب بنائیں وہ " البر " ہیں اسی معنی کے لحاظ سے ماں، باپ کی فرمانبرداری کو " بر الو الدین " کہا جاتا ہے۔ اور اسی معنی کا لحاظ کیا گیا ہے ان الفاظ مبارکہ میں ﴿ اِنَّ الْاَبْرَارَ لَفِىْ نَعِيْمٍ ﴾ "بیشک نیک لوگ نعمتوں میں ہوں گے (مراد جنت کی نعمتیں)۔ اسی طرح " البر " مطلقاً ضد ہے " اثم " (گناہ) کی۔ اور ضد ہے " الفجور " (بڑے گناہ) کی۔ یہاں حذف مضاف ہے اصل عبارت یوں ہوگی ﴿ وَلٰكِنَّ الْبِرَّ بِرٌّ مَنْ آمَنَ بِاللّٰهِ ﴾ اور لیکن نیکی نیکی

ہے اس شخص کی جس نے اللہ پر ایمان لایا۔

نیکی کا اعتبار چند امور پر: اللہ تعالیٰ نے نیکی کی ماہیت کے پائے جانے کو چند چیزوں پر موقوف کیا ہے ان میں سے پہلی چیز ہے ''ایمان لانا پانچ چیزوں پر یعنی اللہ تعالیٰ اور آخرت کے دن اور فرشتوں اور آسمانی کتابوں اور انبیاء کرام پر ایمان لانا۔

رب تعالیٰ پر ایمان میں وہم اور اس کا ازالہ: بظاہر تو یہ پتہ چلتا ہے کہ اللہ تعالیٰ پر ایمان لانا ممکن نہیں کیونکہ ایمان لانے کے لئے اس کی ذات کا علم ہونا ضروری ہے اور رب تعالیٰ کی ذات کا علم حاصل ہونا محال ہے؟ تو اس کا جواب یہ دیا جائے گا کہ اللہ تعالیٰ کا علم دلائل اور اصول سے ممکن ہے۔ اگر چہ اس کی ذات تک رسائی ممکن نہیں۔ جب دلائل سے واضح ہے کہ مخلوق کا علم اور عالم اور تمام جہان حادث ہیں یعنی ان کو کسی ذات نے موجود کیا ہے تمام کائنات اپنے وجود میں کسی ذات کی محتاج ہے وہ ذات اللہ تعالیٰ کی ہے ایمان لانے کے لئے اتنا علم کافی ہے۔

اسی طرح جب یہ معلوم ہو جائے کہ اللہ تعالیٰ واجب الوجود ہے قدیم ہے ہمیشہ کے لئے بقاء اسے حاصل ہے تو اسی سے یہ بھی معلوم ہو جائے گا کہ تمام معلومات اس کے علم میں ہیں وہ تمام ممکنات پر قادر ہے وہ ہمیشہ کے لئے زندہ ہے وہ ارادہ کا مالک، وہ سننے کی قوت کا مالک ہے، وہ دیکھنے کی قوت کا مالک ہے وہ کلام فرمانے پر قادر ہے یعنی حی، مرید، سمیع، بصیر اور متکلم ہے۔

ان تمام صفات کے علم سے پتہ چل گیا کہ تمام مخلوق حادث ہے رب تعالیٰ نے ہی تمام کو موجود کیا اور اللہ تعالیٰ کی صفات سلبیہ کے علم سے بھی کائنات کا محتاج ہونا اور مخلوق ہونا پتہ چل جاتا ہے کیونکہ یہ صفات مخلوق کے کسی فرد میں نہیں کہ وہ محل اور حیز (مکان) اور عرض ہونے سے پاک ہو یہ صرف اللہ تعالیٰ کو ہی صفات حاصل ہیں۔ (ماخوذ از کبیر)

رب تعالیٰ پر ایمان کیسے؟ اللہ تعالیٰ پر ایمان لائے کہ وہ اپنی ذات میں واحد ہے اور اپنی صفت میں یکتا ہے اور واجب الوجود ہے اور اس کا کرم اور جود ثابت ہے اور تمام صفات کمال اسے حاصل ہیں جن میں بعض صفات جمالیہ اور بعض صفات جلالیہ ہیں وہ ہر عیب سے پاک ہے وہ ہر صفت حدوث سے

پاک ہے وہی واجب الوجود ہے۔ (از مرقاۃ ج ۱ ص ۵۵)

یوم آخرت پر ایمان لانا: یعنی قیامت کے دن پر ایمان لانا کہ قیامت یقینی طور پر آنی ہے اور اس میں جسموں کو اٹھایا جانا ہے اور حساب ہونا ہے اس کے بعد جنت کے مستحقین کو جنت میں بھیجا جانا ہے اور جہنم والوں کو جہنم میں بھیج دیا جائے گا۔ قیامت کے دن کو " الیوم الآخر " کہنے کی وجہ یہ ہے کہ وہ دنیا کا آخری دن ہوگا۔

فرشتوں پر ایمان لانا:

ہم اس پر ایمان رکھیں کہ اللہ تعالیٰ کے فرشتے موجود ہیں جن میں سے چار مقربین کے نام بھی معلوم ہیں جبریل، میکائیل، اسرافیل اور عزرائیل۔ اور باقی فرشتوں پر اجمالی ایمان لانا ہوگا:

﴿ اِنَّهُمْ عِبَادٌ مُّكْرَمُوْنَ يُسَبِّحُوْنَ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ لَا يَفْتُرُوْنَ وَلَا يَعْصُوْنَ اللّٰهَ مَا اَمَرَهُمْ وَيَفْعَلُوْنَ مَا يُؤْمَرُوْنَ ﴾

کہ بیشک وہ اللہ تعالیٰ کے مکرم عبادت گزار ہیں رات اور دن کو تسبیحات پڑھتے ہیں تھکتے نہیں اور اللہ تعالیٰ کی نافرمانی نہیں کرتے جو اس نے ان کو حکم دیا اور وہ وہی کرتے ہیں جو ان کو حکم دیا جاتا ہے۔

اور فرشتوں پر یہ ایمان بھی رکھے کہ ان میں کراماً کاتبین (لوگوں کے اعمال لکھنے والے) بھی ہیں۔ اور حاملین عرش مقربین بھی ہیں (رب تعالیٰ کے قریبی عرش کو اٹھانے والے جس کی کیفیت رب تعالیٰ ہی جانتا ہے)۔ اور ان کے پر بھی ہیں کسی کے دو، کسی کے تین اور کسی کے چار اور وہ مذکر ہونے اور مؤنث ہونے سے پاک ہیں۔

فرشتے جواہر علویہ نورانیہ ہیں جسمانی کدورت سے پاک ہیں اور یہ اللہ تعالیٰ اور اس کے انبیاء کرام کے درمیان واسطہ ہیں اور اللہ تعالیٰ کے خاص اصفیاء کو فرشتوں کی تائید حاصل ہوتی ہے۔

الہامی کتابوں پر ایمان لانا: اللہ تعالیٰ نے جو کتابیں انبیاء کرام پر نازل فرمائیں ان کے حق ہونے پر ہمارا اعتقاد ہونا چاہئے کہ توراۃ موسیٰ علیہ السلام پر نازل ہوئی، زبور حضرت داؤد علیہ السلام پر نازل ہوئی۔ اور انجیل حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر نازل ہوئی۔ اور قرآن پاک ہمارے نبی کریم محمد مصطفیٰ ﷺ پر نازل ہوا۔ اور ہمارا یہ ایمان ہو کہ:

" انها مسفوح بالقرآن وانه لا یجوز علیه نسخ ولا تحریف الی قیام الساعة لقوله تعالیٰ ﴿ اِنَّا نَحنُ نَزَّلنَا الذِّکرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحَافِظُونَ ﴾

تمام کتابیں قرآن پاک کے نازل ہونے پر منسوخ ہوگئیں اور قرآن پاک کا مکمل طور پر منسوخ ہونا ابتداء سے ہی منع تھا۔ البتہ نبی کریم ﷺ کے وصال کے بعد قرآن پاک کا کوئی حصہ بھی منسوخ نہیں ہوسکتا۔ اور قیامت تک قرآن پاک میں کوئی شخص تحریف (تبدیلی) نہیں کر سکے گا۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اس کی حفاظت کو اپنے ذمہ لگایا ہے۔

انبیاء کرام پر ایمان لانا: یہ ایمان رکھنا کہ اللہ تعالیٰ نے جو احکام انبیاء کرام پر نازل فرمائے وہ انہوں نے لوگوں تک پہنچا دیئے۔ اور یہ عقیدہ رکھنا کہ انبیاء کرام معصوم ہیں یعنی گناہوں سے پاک ہیں صغائر اور کبائر گناہوں سے انبیاء کرام پاک ہیں۔ جن انبیاء کرام کا ذکر قرآن شریف اور حدیث پاک میں آچکا ہے ان پر تفصیلی طور پر ایمان لانا اور جن کا ذکر نہیں ہوا ان پر اجمالی طور پر ایمان لانا۔ اور انبیاء کرام کی تعداد معین نہ کرنا بلکہ یہ عقیدہ رکھنا کہ اللہ تعالیٰ کے جتنے انبیاء کرام ہیں میرا ان پر ایمان ہے۔

(ماخوذ از مرقاۃ ج ۱ ص ۵۵ تا ص ۵۷)

اور یہ عقیدہ رکھے " وانهم اشرف الناس حسبا ونسبا وان لیس فیهم وصمة ولا عیب منفر " کہ انبیاء کرام حسب ونسب کے لحاظ سے لوگوں سے اشرف (زیادہ بزرگی رکھنے والے) ہوتے ہیں اور بیشک ان میں کوئی عیب اور عار نہیں پائی جاتی اور ان میں کوئی ایسا عیب نہیں پایا جاتا جس سے لوگ نفرت کریں (لیکن اہل علم حضرات عیب اور بیماری میں فرق ضرور ذہن میں رکھیں عیب اور چیز ہے مرض اور) (راقم)

ویعتقد ان سیدهم وخاتمهم محمد ﷺ وشریعته ناسخة لجمیع الشرائع والتمسک بها لازم لجمیع المکلفین الی یوم القیامة "

اور یہ عقیدہ رکھے کہ تمام انبیاء کے سردار اور تمام انبیاء کے بعد آکر سلسلہ نبوت کو ختم کرنے والے حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ ہیں اور آپ کی شریعت تمام شریعتوں کو منسوخ کرنے والی ہے قیامت تک تمام مکلفین کو اسی پر عمل کرنا لازم ہوگا۔ (روح المعانی)

وَ آتَی الْمَالَ عَلٰی حُبِّهٖ : ''اور دے مال محبت پر''

یعنی کامل نیکی کے کاموں میں سے اللہ تعالیٰ کی راہ میں مال خرچ کرنا ہے پھر اس میں زیادہ کمال اس وقت آئے جب مال محبت پر خرچ کرے کیونکہ مطلقا مال خرچ کرنا ثواب کا کام ہے اور جتنا خلوص اس میں زیادہ پایا جائے گا اتنا ہی زیادہ اس میں ثواب ہوگا۔

﴿ وَآتَى الْمَالَ ﴾ میں ''واؤ'' حال کے لئے ﴿ عَلٰى حُبِّهٖ ﴾ کی ضمیر مجرور کا مرجع کیا ہے؟ اس میں کئی احتمال ہیں ایک احتمال یہ ہے کہ ضمیر اللہ تعالیٰ کی طرف لوٹے اب معنی یہ ہوگا اور دے مال اللہ تعالیٰ کی محبت کی وجہ سے اور دوسرا احتمال یہ ہے کہ ضمیر لوٹے ﴿ وَآتَى ﴾ کے مصدر کی طرف۔ اس صورت میں مطلب یہ ہوگا کہ وہ دے مال جب کہ مال دینے میں اس کی محبت پائی جائے۔

اور تیسرا احتمال یہ ہے کہ ضمیر لوٹے مال کی طرف اس صورت میں مفہوم یہ ہوگا کہ وہ مال دے جب اسے مال سے محبت ہو۔ (راقم نے اپنے ترجمہ میں اسی لئے ضمیر کے مرجع کا معنی ذکر نہیں کیا تا کہ طلباء ہر احتمال کے مطابق ترجمہ کرسکیں)۔

☆ " عن ابی هريرة قال جاء رجل الى النبی ﷺ فقال يا رسول الله الی الصدقة اعظم اجرا قال ان تصدق وانت صحيح شحيح تخشی الفقر وتامل الغنی ولا تمهل حتی اذا بلغت الحلقوم قلت لفلان كذا ولفلان كذا وقد كان لفلان "

(اخرجه احمد والبخاری ومسلم وابو داؤد والنسائی وابن حبان بحواله درمنثور)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں نبی کریم ﷺ کی خدمت میں ایک شخص حاضر ہوا۔ اس نے عرض کیا یا رسول اللہ کون سا صدقہ میں زیادہ اجر ہے؟ آپ نے فرمایا تم صدقہ کرو جب کہ تم تندرست ہو اور مال پر حریص ہو اور تمہیں احتیاج کا ڈر ہو۔ اور تم غنی ہونے کی امید رکھتے ہو ہاں اتنی دیر نہ کرنا کہ روح تمہارے گلے تک پہنچ جائے (یعنی موت قریب آجائے) تو پھر کہو اتنا مال فلاں کو دے دینا اور اتنا مال فلاں کو دے دینا حالانکہ وہ مال فلاں کو تو خود بخود مل جانا ہے۔ (یعنی وارثوں کو تمہارے کہنے کے بغیر ہی مال مل جانا ہے) (از روح المعانی)

☆ " واخرج البيهقی فی شعب الايمان عن المطلب انه قيل يا رسول الله ما آتی المال علی حبه فكلنا نحبه قال رسول الله ﷺ تؤتيه حين تؤتيه ونفسك حين تحدثك بطول العمر والفقر " (درمنثور)

مطلب کہتے ہیں رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں عرض کیا گیا یا رسول اللہ ﴿ آتی الْمَالَ عَلٰی حُبِّہٖ ﴾ کا کیا مطلب ہے؟ ہم تمام ہی محبت سے مال دیتے ہیں آپ نے فرمایا تم مال اللہ کی راہ میں خرچ کرو اس وقت جب تمہارا نفس لمبی عمر اور فقیر ہو جانے کی تمہارے ساتھ باتیں کر رہا ہو۔

☆ " واخرج احمد وابو داؤد والترمذی وصححہ والنسائی والحاکم وصححہ والبیھقی عن ابی الدرداء قال سمعت رسول اللہ ﷺ یقول مثل الذی ینفق او یتصدق عند الموت مثل الذی یھدی اذا شبع "

حضرت ابو الدرداء فرماتے ہیں میں نے رسول اللہ ﷺ کو ارشاد فرماتے ہوئے سنا کہ جو شخص موت کے وقت خرچ کرتا ہے یا صدقہ کرتا ہے وہ ایسے ہی ہے جیسے خود کوئی سیر ہو کر کھالے پھر کسی کو ہدیہ دے دے۔ (درمنثور)

نتیجہ واضح ہوا: " ان الصدقۃ حال الصحۃ افضل منھا عند القرب من الموت "

بیشک صدقہ تندرستی کے وقت افضل ہے بنسبت موت کے وقت کے قریب صدقہ دینے سے۔

احادیث مبارکہ کو ذکر کر دیا گیا ہے اور عقلی دلائل سے بھی یہ مسئلہ واضح ہے:

(۱) تندرستی کے وقت انسان کو مال کی حاجت کا گمان حاصل ہوتا ہے اور موت کے وقت کے قریب استغناء کا گمان حاصل ہوتا ہے۔ عقل کا تقاضا ہے کہ محتاجی کے وقت نیکی کے کاموں میں مال خرچ کرنا بہت بہتر ہے بنسبت مستغنی ہونے کی صورت میں "رب تعالیٰ نے فرمایا":

﴿ لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰی تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ ﴾

"ہرگز نیکی کو تم نہیں پا سکتے یہاں تک کہ خرچ کرو جو تمہیں پسند ہے"

(۲) جو شخص تندرستی کے وقت مال خرچ کرتا ہے اس کو رب تعالیٰ کے وعد اور وعید پر یقین ہوتا ہے لیکن موت کے وقت مال کے خرچ کرنے میں یہ صورت نہیں پائی جاتی۔

(۳) صحت کے حال میں مال خرچ کرنے پر زیادہ ثواب حاصل ہوتا ہے کیونکہ اس وقت انسان کو مال کی شدید ضرورت ہوتی ہے اور ایسے حال میں مال خرچ کرنے سے بظاہر فقر بھی آتا ہے۔ اسی وجہ سے اس میں زیادہ ثواب حاصل ہوتا ہے کیونکہ موت کے وقت انسان مال کا محتاج نہیں ہوتا۔

اسی سے واضح ہو گیا کہ فقیر محتاج کا خرچ کرنا بہتر ہے غنی اور غیر محتاج کے خرچ کرنے سے۔

(۴) جب کسی انسان کو مال کے ضائع ہونے کا خطرہ ہو اس وقت کسی کو ہبہ کرنا اس خیال سے کہ اگر میں نے یہ مال نہ دیا تو ضائع تو ہو ہی جانا ہے اس میں وہ کمال نہیں جو اس وقت کسی کو دے جب یہ خطرہ نہ ہو اس وقت مال خرچ کرنے میں خوشی اور رغبت ہوتی ہے لیکن موت کے وقت جب مال کے ضائع ہونے کی فکر ہو اس وقت صدقہ کرنا مجبوری نظر آتا ہے۔ (ماخوذ از کبیر)

وآتی المال سے مراد صدقہ یا زکوٰۃ: ایک قول یہ ہے کہ ﴿ وَآتَى الْمَالَ عَلٰى حُبِّهٖ ﴾ سے مراد اور ﴿وَآتَى الزَّكٰوةَ ﴾ سے مراد زکوٰۃ ہی ہے۔ البتہ پہلے الفاظ مبارکہ سے مصارف کا ذکر کیا کہ زکوٰۃ کن لوگوں کو دی جائے اور دوسرے الفاظ مبارکہ سے مراد زکوٰۃ کا ادا کرنا اور اس پر برانگیختہ کرنا ہے لیکن مراد اول سے نفلی صدقات کا قول زیادہ بہتر ہے کیونکہ معطوف علیہ اور معطوف میں مغائرت ہوتی ہے۔ اسی طرح ﴿ وَآتَى الْمَالَ عَلٰى حُبِّهٖ ﴾ حقوق واجبہ کو بھی شامل ہے۔

حدیث شریف میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کے قول " نسخت الزکوۃ کل صدقة " (زکوٰۃ نے تمام صدقات کو منسوخ کر دیا) کا مطلب بھی یہی ہے کہ زکوٰۃ فرض ہے اس کے بغیر صدقہ کوئی فرض نہیں بلکہ واجب یا نفل ہے۔ کسی عذر کی وجہ سے فرض ہو جانا اس سے مستثنیٰ رہے گا۔ رب تعالیٰ کا ارشاد گرامی:

﴿ وَفِیْۤ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ لِّلسَّآئِلِ وَالْمَحْرُوْمِ ﴾

''اور ان کے مالوں میں سائلین اور محرومین کا حق ہے''

بھی اسی پر دلالت کر رہا ہے کہ نفلی صدقات اور وجوبی صدقات ان مذکور لوگوں کے لئے ہیں اور نبی کریم ﷺ کا ارشاد " فی المال حقوق سوی الزکوة " مال میں حقوق ہیں سوائے زکوٰۃ کے

اور ارشاد نبوی ہے " لا یؤمن باللہ والیوم الآخر من بات شبعانا وجارہ طاو الی جنبہ " وہ شخص اللہ تعالیٰ پر اور آخرت کے دن پر کامل ایمان رکھنے والا نہیں جو رات سیر ہو کر گزارے اور اس کا پڑوسی (بھوک کی وجہ سے) کروٹیں بدلتا رہے۔

" روی ان الشعبی سئل عمن له فادی زکوته فهل علیه سواء قال نعم

یصل القرابة ویعطی السائل ثم تلا هذه الآیة "

حضرت شعبی سے پوچھا گیا کہ ایک شخص زکوٰۃ ادا کرتا ہے کیا اسے کوئی اور مال بھی خرچ کا حکم دیا جائے گا؟ انہوں نے فرمایا ہاں اقرباء سے صلہ رحمی کی وجہ سے ان پر مال خرچ کرنا۔ اور سائل کو مال دینا پھر اپنے قول پر بطور دلیل انہوں نے یہی آیۃ تلاوت کی۔ (از بیضاوی و شیخ زادہ بتغیر)

ذوی القربی : (قریبیوں کو) یعنی نیکی کے کاموں میں سے یہ ہے کہ مال عطاء کرے قریبی رشتہ داروں کو یہاں ذوی القربی سے مرادکون سے لوگ ہیں " الذین یقربون منه بولادة الابوین او بولادة الجدین " وہ لوگ مراد ہیں جو اس کے ماں باپ کی اولاد ہو یا اس کے دادا، دادی اور نانا، نانی کی اولاد ہو یہاں صرف ذی رحم مراد نہیں کیونکہ محرمیۃ (یعنی کسی سے نکاح کرنا حرام ہونا) حکم شرعی ہے۔ اور "قرابۃ" لغوی لفظ ہے جو نہی قرابت پر استعمال ہوتا ہے اس میں وہ تمام لوگ آئیں گے جن کا ذکر کیا جا چکا ہے۔ ہاں البتہ رشتہ جتنا زیادہ قریبی ہوگا اتنا ہی زیادہ وہ حقدار ہوگا اور ان کو مال دینے میں اتنا ہی زیادہ ثواب ہوگا۔ (از کبیر)

رشتہ دار کو صدقہ دینا زیادہ ثواب ہے:

" اخرج الطبرانی والحاکم وصححه والبیهقی فی سننه عن ام کلثوم بنت عقبة بن ابی معیط سمعت رسول الله ﷺ یقول افضل الصدقة علی ذی الرحم الکاشح "

ام کلثوم بنت عقبہ بن ابی معیط کہتی ہیں میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا عداوت رکھنے والے ذی رحم (قریبی رشتہ) پر صدقہ کرنا افضل ہے۔ (درمنثور)

یہی روایت ہدایہ اخیرین ص ۶۵۸ میں حضرت ابو ایوب انصاری سے بحوالہ مسند امام احمد مذکور ہے کفایہ میں حدیث پاک کی وضاحت میں کہا گیا ہے:

" وانما جعل هذه التصدق افضل لان التصدق علی المحب الصدیق یمیل الیه النفس لمحبته وصداقته وفی القریب الکاشح المنظور الیه هو معنی القرابة لا غیر مع مخالفة نفسه لان نفسه لا تدعوا الی التصدق "

عداوت رکھنے والے رشتہ دار کو صدقہ دینا افضل اس لئے قرار دیا ہے کہ محب اور صدیق کی طرف تو اس کی محبت اور صداقت کے پیش نظر انسان کا نفس خود ہی مائل ہوتا ہے کہ اس کو صدقہ دیا جائے لیکن عداوت رکھنے والے رشتہ دار کی طرف انسان کا نفس تو میلان نہیں کرتا اور صدقہ بھی نہیں دینا چاہتا لیکن وہ رشتہ داری کی وجہ سے جب صدقہ دے گا تو یہ اس کے لئے افضل ہوگا (کفایة)

☆ " واخرج ابن ابی شیبة واحمد والترمذی وحسنه والنسائی وابن ماجه والحاکم والبهیقی فی سننه عن سلمان بن عامر الضبی قال قال رسول الله ﷺ الصدقة علی المسکین صدقة وعلی ذی الرحم اثنتان صدقة وصلة "

سلمان بن عامر ضبی کہتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا مسکین کو صدقہ دینا ایک صدقہ ہے اور ذی رحم کو صدقہ دینے سے دو چیزیں حاصل ہوتی ہیں ایک صدقہ (کا ثواب) اور دوسری صلہ رحمی۔ (درمنثور، ومشکوۃ)

یعنی عام فقراء اور غرباء کو صدقہ دینے میں ایک ثواب اور رشتہ داروں کو صدقہ دینے میں دو ثواب حاصل ہوتے ہیں۔

☆ " واخرج احمد وابو داؤد وابن حبان والحاکم وصححه عن میمونة ام المؤمنین قالت اعتقت جاریة لی فقال النبی ﷺ اما انک لو اعطیتها بعض اخواتک کان اعظم لا جرک "

ام المؤمنین حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں میں نے اپنی لونڈی کو آزاد کر دیا نبی کریم ﷺ نے فرمایا یہی غلامہ اگر تم اپنی بہنوں میں سے کسی کو دے دیتی تو تمہیں عظیم اجر حاصل ہوتا۔ (درمنثور)

☆ " واخرج ابن المنذر عن فاطمة بنت قیس انها قالت یا رسول الله ان لی مثقالا من ذهب قال اجعلیها فی قرابتک "

فاطمہ بنت قیس کہتی ہیں میں نے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں عرض کیا یا رسول اللہ بیشک میرے پاس ایک مثقال (ساڑھے چار ماشے) سونا ہے آپ نے فرمایا اپنے رشتہ داروں کو دے دو۔ (درمنثور)

☆ " واخرج احمد والبخاری ومسلم والنسائی وابن ماجه عن زینب امرأة عبد الله بن مسعود قالت سالت رسول الله ﷺ اتجزئی عنی من الصدقة النفقة علی زوجی وایتام فی حجری قال لک اجران اجر الصدقة واجر القرابة "

عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی زوجہ زینب کہتی ہیں میں نے سوال کیا رسول اللہ ﷺ سے کہ میں صدقہ کا مال اپنے خاوند اور اپنی زیر پرورش یتیموں کو دے سکتی ہوں؟ تو آپ نے فرمایا ہاں تمہیں دو ثواب حاصل ہوں گے ایک صدقہ کا اور دوسرا قرابت کا (یعنی صلہ رحمی کا)۔ (درمنثور)

نفلی اور وجوبی صدقہ کے مصرف میں فرق:

" ولا یجوز ان یدفع الزکوة الی ذمی لقوله علیه السلام لمعاذ رضی الله عنه خذها من اغنیاء هم وردها فی فقراء هم ویدفع الیه ما سوی ذلک من الصدقة لقوله علیه السلام تصدقوا علی اهل الادیان کلها ولو لا حدیث معاذ لقلنا بالجواز فی الزکوة " (از هدایه اولین ۱۸۵)

زکوۃ ذمی کو دینا جائز نہیں اس لئے کہ نبی کریم ﷺ نے حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کو (جب عامل بنایا تو) فرمایا کہ مسلمانوں کے اغنیاء سے زکوۃ کا مال وصول کرو اور مسلمانوں کے فقراء پر تقسیم کرو۔ زکوۃ اور صدقہ فطر اور نذر اور کفارات کے سواء تمام صدقات ذمی (مسلمانوں کے ملک میں حاکم کی اجازت سے شہریت رکھنے والا) کو دیئے جاسکتے ہیں۔ اس لئے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا ''تمام دینوں والوں کو صدقہ دو'' اگر حضرت معاذ رضی اللہ عنہ والی حدیث اس کے معارض نہ ہوتی تو اس حدیث کی وجہ سے ہم ذمی کو زکوۃ دینے کا حکم بھی ثابت کر سکتے تھے لیکن حدیث معاذ کے معارض ہونے کی وجہ سے صدقات واجبہ کا حکم علیحدہ ہو گیا۔ یہاں سے بہت ہی واضح ہو گیا کہ صدقات واجبہ اور صدقات نفلیہ کا حکم علیحدہ علیحدہ ہو گیا۔ صدقات واجبہ غنی کو دینا منع ہے۔ لیکن صدقات نفلیہ جائز ہیں۔

" قد یقصد بالصدقة علی الغنی الثواب وقد حصل "

(هدایة اخیرین ص ۲۹۳ فصل فی الصدقة)

کبھی غنی کو صدقہ ادا کرنے میں ثواب کا ارادہ کیا جاتا ہے وہ حاصل بھی ہو جاتا ہے۔

" فان من له نصاب وله عیال کثیرة فالناس یتصدقون علیه علی قصد الثواب " (حاشیه هدایة)

بے شک وہ شخص جو صاحب نصاب (غنی) ہوتا ہے لیکن اس کے اہل وعیال کثیر ہوتے ہیں اس

لئے لوگ اس پر ثواب کی غرض سے صدقہ کرتے ہیں۔ اسی سے ایک اور مسئلہ بھی حل ہو گیا کہ ایصال ثواب وغیرہ کی محافل میں غرباء اور فقراء کے لئے کھانا پکایا جائے اور اغنیا بھی شریک ہوں تو کوئی حرج نہیں کیونکہ نفلی صدقہ ان کو دینا جائز ہے۔ (راقم)

" ولا تدفع الی بنی ھاشم "بنی ہاشم کو زکوۃ نہیں دی جاسکتی۔ (ھدایہ اولین ص۱۸۶)

" عن عبد المطلب بن ربیعة قال قال رسول الله ﷺ ان ھذہ الصدقات انما ھی اوساخ الناس وانھا لا تحل لمحمد ولا لآل محمد رواہ مسلم " (مشکوۃ باب من لا تحل له الصدقة)

حضرت عبد المطلب بن ربیعہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا بیشک یہ صدقات لوگوں (کے مالوں) کی میل کچیل ہیں فرمایا بیشک یہ محمد (ﷺ) اور آل محمد کے لئے حلال نہیں۔

اسی حدیث کی شرح میں علامہ ملا علی قاری رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

" قال ابن الملک الصدقة لا تحل للنبی ﷺ فرضا کانت او نفلا وکذا المفروضة لا له الی اقربائه واما التطوع فمباح لھم "

(مرقاۃ ج ۴ ص ۱۱۱)

ابن ملک رحمہ اللہ فرماتے ہیں نبی کریم ﷺ کے لئے فرضی اور نفلی صدقہ تو حلال نہیں تھا لیکن آپ کی آل کے لئے اور آپ کے اقرباء کے لئے فرضی صدقہ تو حلال نہیں لیکن نفلی صدقہ حلال ہے۔

" واما الصدقة النافلة فقال فی النھایة ویجوز النفل بالاجماع وکذا یجوز النفل للغنی " (مرقاۃ ج ۴ ص ۱۱۱)

نفلی صدقہ کا حکم بیان کرتے ہوئے صاحب نہایہ نے بیان فرمایا کہ بنو ہاشم کے لئے نفلی صدقہ بالاجماع جائز ہے اور اسی طرح غنی کے لئے بھی نفلی صدقہ جائز ہے۔

" لان المال ھھنا کالماء یتدنس باسقاط الفرض اما التطوع بمنزلة التبرد بالماء " (ھدایہ اولین ص ۱۸۶)

اس لئے کہ مال پانی کی طرح ہے فرض کے ساقط کرنے سے میلا ہو جاتا ہے اور نفل کا ادا کرنا پانی سے ٹھنڈک حاصل کرنے کی طرح ہے۔

البتہ یہ خیال رہے کہ غنی کو نفلی صدقہ، صدقہ کی نیت سے دینا مطلق جائز ہے۔ اس میں کسی قسم کا خلاف ادب لازم نہیں آتا لیکن بنو ہاشم کے ادب کا تقاضا کچھ اور ہے۔ علامہ ملا علی قاری رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

" فلا تدفع اليهم النافلة الا على وجه الهبة مع الادب " (مرقاۃ ج ۲ ص ۱۱۱)

کہ بنو ہاشم کو نفلی صدقہ بھی "ہبہ" کی نیت سے دیا جائے اس میں صدقہ کی نیت نہ کی جائے تاکہ ان کے ادب و احترام کا لحاظ پایا جائے۔

" ولا الى امرأته للاشتراك في النفع عادة ولا تدفع المرأة الى زوجها عند ابى حنيفة لما ذكرنا وقالا تدفع اليه لقوله عليه السلام لك اجر ان اجر الصدقة واجر الصلة قاله لأمرأة ابن مسعود وقد سالته عن التصدق عليه قلنا هو محمول على النافلة " (ہدایہ اولین ۱۲۶)

خاوند اپنی زوجہ کو زکوٰۃ نہیں دے سکتا کیونکہ زوجین کے منافع مشترک ہیں زوجہ اپنے خاوند کو بھی زکوٰۃ نہیں دے سکتی وجہ اس کی بھی یہی ہے کہ منافع دونوں کے مشترک ہیں یہ امام اعظم رحمہ اللہ کے نزدیک ہے۔ البتہ صاحبین (حضرت امام ابو یوسف اور حضرت امام محمد) کے نزدیک زوجہ اپنے خاوند کو زکوٰۃ دے سکتی ہے۔ کیونکہ عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی زوجہ نے رسول اللہ ﷺ سے پوچھا کہ میں اپنے خاوند کو صدقہ دے سکتی ہوں؟ تو آپ نے فرمایا ہاں تمہیں دو اجر حاصل ہوں گے ایک صدقہ کا اور دوسرا صلہ رحمی کا۔

امام اعظم رحمہ اللہ اس کا جواب یہ دیتے ہیں کہ اس صدقہ سے مراد نفلی صدقہ ہے اس بحث سے یہ واضح ہو گیا کہ نفلی صدقہ عورت اپنے خاوند کو بالاتفاق دے سکتی البتہ وجوبی صدقہ امام اعظم رحمہ اللہ کے نزدیک نہیں دے سکتی۔ اسی قول پر فتویٰ ہے۔ ابھی تک جو بحث ذکر کی ہے اس سے مسئلہ بہت واضح ہو گیا کہ وجوبی صدقہ اور نفلی صدقہ علیحدہ علیحدہ احکام رکھتے ہیں۔

وَالْيَتَامٰى : (اور یتیموں کو) یعنی نیکی کے کاموں میں یہ ہے کہ وہ محبت پر مال یتیموں کو دے۔
یتیم نابالغ بچے اور بچی کو کہا جاتا ہے جس کا باپ فوت ہو چکا ہے بالغ ہونے کے بعد اس پر یتیم

کا حکم باقی نہیں رہتا۔ زکوٰۃ کا مال تو یتیم کو اس وقت دیا جائے گا جب وہ غریب بھی ہو۔ اگر محتاج نہیں تو اس کو زکوٰۃ اور دوسرے صدقات واجبہ کا مال نہیں دیا جائے گا۔ لیکن نفلی صدقہ یتیم کو شفقت کے لئے دیا جائے گا جیسا کہ مندرجہ بالا بحث میں بیان کیا جا چکا ہے۔

وَالْمَسَاكِيْنَ : ''اور مساکین کو''یعنی نیکی کے کاموں میں محبت پر مال مسکینوں کو دینا۔ ﴿مَسَاكِيْنَ﴾ جمع ہے '' مسکین '' کی جس کا معنی ہے **الدائم السکون** ''(ہمیشہ سکونت اختیار کرنے والا) چونکہ مسکین کو بھی حاجت ایک جگہ ٹھہرا لیتی ہے اس میں حرکت نہیں پائی جاتی۔ اس لئے اسے مسکین کہا جاتا ہے۔ اور یا معنی ہے '' **دائم السکون** '' ہمیشہ سکون میں رہنا کہ وہ غریب و مسکین ہونے کے باوجود یعنی کسی مال کا مالک نہ ہونے کے باوجود وہ لوگوں کے سامنے ہاتھ نہیں پھیلاتا سوال نہیں کرتا۔ بڑے اطمینان سے پرسکون زندگی بسر کرتا ہے جس حال پر رب تعالیٰ نے اسے رکھا ہوا ہے وہ اسی پر صابر و شاکر رہتا ہے۔

وَابْنَ السَّبِيْلِ : ''اور مسافر کو''یعنی نیکی کے کاموں میں اور یہ ہے کہ محبت پر مال مسافر کو دے مسافر کو ﴿وَابْنَ السَّبِيْلِ﴾ اس لئے کہا جاتا ہے کہ وہ راستہ کو لازم پکڑتا ہے اسی طرح '' **قاطع الطريق** '' (ڈاکو) کو بھی '' **ابن الطريق** '' کہہ لیا جاتا ہے۔

یا اس لئے مسافر کو ﴿ **ابن السبيل** ﴾ کہا جاتا ہے کہ راستہ اسے ظاہر کرتا ہے گویا کہ اس کی ماں نے اسے جنا ہے اور وہ مقام ظہور میں آ گیا۔ مسافر جب دوران سفر محتاج ہو جائے اور بے خرچ ہو جائے تو اسے صدقات واجبہ اور صدقات نفلیہ اور زکوٰۃ کا مال دینا جائز ہے اگرچہ گھر اس کا مال بھی ہو ﴿وَابْنَ السَّبِيْلِ﴾ کو مفرد ذکر کرنے میں عجیب حکمت پائی جاتی ہے:

'' وكان افراده الى انفراده عن احبابه ووطنه واصحابه فهو ابدا يتوق الى الجمع ''

گویا کہ مفرد ذکر کر کے اس طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ مسافر اپنے احباب اور اپنے وطن اور اپنے ساتھیوں سے علیحدہ ہونے کی وجہ سے اکیلا ہوتا ہے یعنی وہ مفرد ہوتا ہے اور جمع کا مشتاق ہوتا ہے۔ یعنی اس کے دل میں تمنا پائی جاتی ہے کہ میں اپنے احباب سے مل کر جمع بن جاؤں۔

وَالسَّـائِلِينَ : ''اور سوال کرنے والوں کو'' محبت پر مال دے سوال کرنے والوں کو۔ یعنی جو لوگ حاجت مند ہیں اور اسی احتیاجی کی وجہ سے وہ سوال کر رہے ہیں تو ان کو مال دیا جائے بیشک وہ غنی بھی کیوں نہ ہوں۔ (ہاں البتہ پیشہ ور بھکاریوں کو مال نہ دے کر ان کی حوصلہ شکنی ضروری ہے):

" عن الحسين بن علی رضی الله عنهما قال قال رسول الله ﷺ للسائل حق وان جاء علی فرس "

سائل کا (تمہارے مالوں میں) حق ہے اگر چہ وہ گھوڑے پر سوار ہو کر آئے۔

گویا کہ مسکین اور سائل میں یہ فرق ہے کہ مسکین سوال نہیں کرتا اگر چہ حاجت مند ہوتا ہے ان کا حال ان کی حاجت مندی کی وجہ سے معلوم ہوتا ہے۔ اور سوال کرنے والا بعض اوقات غنی بھی ہوتا ہے لیکن اسے مال دینا جائز ہے ہاں اگر دینے والے کے پاس مال نہیں یا سائل کو زیادہ مستحق نہ سمجھ کر مال نہ دے تو اس میں کوئی حرج نہیں۔

(ماخوذ از بیضاوی وروح المعانی بتغیر)

☆ **" عن ام بجيد انها قالت يا رسول الله ان المسكين ليقوم علی بابی فما اجد شيا اعطيه اياه فقال لها ان لم تجدی الا ظلفا محرقافا دفعيه اليه اخرجه ابن سعد والترمذی "**

ام بجید کہتی ہیں میں نے عرض کیا یا رسول اللہ میرے دروازے پر مسکین آتے ہیں لیکن میرے پاس کوئی چیز نہیں ہوتی کہ میں اسے دوں تو آپ نے فرمایا اور تمہیں کچھ نہ ملے سوائے جانور کے پاؤں کی ہڈی کے جلے ہوئے حصہ کے تو وہی دے دو۔ (درمنثور)

مطلب یہ ہے کہ جتنی معمولی چیز بھی ہو سکے وہی دے دے۔

☆ **" واخرج ابو نعيم والثعلبی والديلمی والخطيب فی رواة مالک بسند رواه عن ابن عمر مرفوعا هدية الله للمؤمن السائل علی بابه "**

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مرفوع حدیث مروی ہے (اگر چہ سند ضعیف ہے) اللہ تعالیٰ کی طرف سے مومن کے لئے ہدیہ (تحفہ) ہے کہ سائل اس کے دروازے پر آئے۔ (درمنثور)

☆ **" واخرج ابن شاهين وابن النجار فی تاريخه عن ابی بن كعب قال قال رسول الله ﷺ الا ادلكم علی هدايا الله عزوجل الی خلقه قلنا بلی قال الفقير هو هدية الله قبل ذلک او ترک "**

ابی بن کعب کہتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کیا میں تمہیں اللہ تعالیٰ کے ہدایا (تحفوں) کی خبر نہ دوں؟ صحابہ کرام نے عرض کیا ہاں یارسول اللہ آپ بتائیں تو آپ نے فرمایا فقیر اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہدیہ ہے انسان اسے قبول کرتا ہے یا چھوڑتا ہے۔ (درمنثور)

یقینی بات ہے کہ رب تعالیٰ کے ہدیہ کو چھوڑنا درست نہیں البتہ کوئی عذر ہو تو کوئی حرج بھی نہیں۔

وَفِی الرِّقَابِ : ''اور گردنوں کے چھڑانے میں) یعنی نیکی کے کاموں میں سے ''محبت پر مال خرچ کرنا گردنوں کے چھڑانے میں'' بھی ہے۔ گردنوں کے چھڑانے کے تین مطلب ہیں۔

ایک یہ کہ مکاتب غلام کو مال دے تا کہ وہ مولی کو مال دے کر اپنے آپ کو آزاد کرالے۔

دوسرا مطلب یہ کہ غلام خرید کر آزاد کردے۔

اور تیسرا مطلب یہ ہے کہ مال خرچ کر کے کافروں کے ہاتھوں سے قیدی چھڑالے۔ (از بیضاوی)

پیشہ ور مجرمین کو مال دے کر چھڑانا اس وقت تک ثواب نہیں جب تک وہ توبہ نہ کرلیں کیونکہ مجرمین کی معاونت درحقیقت جرموں کو بڑھانا ہے۔ (راقم)

وَاَقَامَ الصَّلٰوةَ وَآتَی الزَّكٰوةَ : ''اور نماز قائم کرے اور زکوٰۃ دے''

یعنی نیکی کے کاموں میں سے فرض نماز قائم کرنا اور زکوٰۃ ادا کرنا بھی ہے:

'' اخرج ابن حاتم عن سعيد بن جبير في قوله واقام الصلوة يعني واتم الصلوة المكتوبة وآتى الزكوة يعني الزكوة المفروضة ''

حضرت سعید بن جبیر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں۔

رب تعالیٰ کے ارشاد گرامی ﴿ وَاَقَامَ الصَّلٰوةَ ﴾ کا مطلب یہ ہے کہ فرض نماز کو مکمل کرنا ہے۔

اور ﴿ وَآتَی الزَّكٰوةَ ﴾ کا مطلب ہے فرض زکوٰۃ ادا کرنا۔ (درمنثور)

وَالْمُوْفُوْنَ بِعَهْدِهِمْ اِذَا عَاهَدُوْا :

''اور پورا کرنے والے ہیں اپنے وعدوں کو جب وہ وعدہ کرتے ہیں''

کون سا وعدہ مراد ہے؟ وعدہ سے مراد مختلف وعدے ہیں جو تمام ہی مراد ہیں۔

اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول سے وعدہ:

" اخرج ابن جریر وابن ابی حاتم عن ابی العالیة فی قوله ﴿ والموفون بعهدهم اذا عاهدوا ﴾ قال فمن اعطی عهد الله ثم نقضه فالله ینتقم منه ومن اعطی ذمة النبی ﷺ ثم عذربها فالنبی ﷺ خصمه یوم القیامة "

ابوالعالیہ کہتے ہیں رب تعالیٰ کے ارشادگرامی ﴿ وَالْمُوفُوْنَ بِعَهْدِهِمْ ﴾ سے مراد اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ سے وعدہ کرنا ہے جس نے اللہ تعالیٰ سے وعدہ کر کے اسے توڑ دیا اللہ تعالیٰ اس سے انتقام لے گا اور جس نے اپنے آپ کو رسول اللہ ﷺ کے ذمہ کر کے (ذمی ہونے کو قبول کر کے) بے وفائی کی قیامت کے دن اسے رسول اللہ ﷺ کی مخالفت کا سامنا کرنا پڑے گا۔ (درمنشور)

لوگوں سے وعدہ کرنا:

" واخرج ابن ابی حاتم عن سعید بن جبیر فی قوله ﴿وَالْمُوفُوْنَ بِعَهْدِهِمْ ﴾ اذا عاهدوا یعنی فیما بینهم وبین الناس "

سعید بن جبیر فرماتے ہیں اس آیۃ میں وعدہ کرنے سے مراد لوگوں کا آپس میں وعدہ کرنا مراد ہے کہ مومن کیئے ہوئے وعدہ کو پورا کرتے ہیں۔ (درمنشور)

ایفاءعہد میں وسعت: کہ وہ اللہ تعالیٰ سے وعدہ کرتے ہیں (یعنی جو وعدہ اللہ تعالیٰ نے ان سے لیا) کہ وہ حدود قائم کریں گے اور طاعت کا عمل کریں گے۔ اور اسی طرح وعدہ سے مراد ابتدائی طور پر بندوں کی جانب سے رب تعالیٰ سے وعدہ کرنا ہے کہ وہ نذر مان کر اسے پورا کرتے ہیں۔ بندوں سے وعدہ کرنے سے مراد وعدوں کی وفا اور امانتوں کو ادا کرنا ہے۔

" یعنی اذا وعدوا انجزوا واذا نذروا اوفوا واذا حلفوا بروا فی ایمانهم واذا قالوا صدقوا فی اقوالهم واذا ائتمنوا ادوا "

یعنی جب وہ وعدہ کرتے ہیں پورا کرتے ہیں اور جب نذر مانتے ہیں تو اسے پورا کرتے ہیں اور جب قسم اٹھاتے ہیں اس پر قائم رہتے ہیں اور جب بات کرتے ہیں تو سچی بات کرتے ہیں اور ان کے پاس جب امانت رکھی جائے تو وہ (بغیر خیانت کے) ادا کر دیتے ہیں۔ (از خازن)

وَالصَّابِرِيْنَ فِي الْبَأْسَاءِ وَالضَّرَّاءِ وَحِيْنَ الْبَأْسِ:

''اورصبر کرنے والے ہیں مصیبت اور سختی میں اور جہاد کے وقت میں'' ﴿فِي الْبَأْسَاءِ﴾ ای فی الشدة والفقر والفاقة '' ﴿بَأْسَا﴾ سے مراد شدت اور فقر (غربت) اور فاقہ۔ ﴿وَالضَّرَّاءِ﴾ یعنی المرض والزمانة ''ضراء سے مراد مریض ہو جانا اور چلنے پھرنے سے عاجز ہونا ہے۔ ﴿وَحِيْنَ الْبَأْسِ﴾ سے مراد اللہ تعالیٰ کی راہ میں جہاد کرنے کی وجہ سے شدت کا حاصل ہونا ہے۔

☆ " عن البراء قال كنا والله اذا احمر البأس نتقى به وان الشجاع منا الذى يحاذى به يعنى النبى ﷺ " (بخاری ومسلم)

حضرت براء رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں قسم ہے اللہ تعالیٰ کی جب شدید لڑائی جاری ہوتی تو ہم اپنا بچاؤ کرتے لیکن ہم میں سب سے زیادہ بہادر یعنی نبی کریم ﷺ میدان جنگ میں دشمن کے مقابل آگے بڑھتے چلے جاتے۔ (از خازن)

طلباءِ کرام کی توجہ کے لئے: ﴿وَالصَّابِرِيْنَ﴾ کی نصبی حالت ہے مدح کی وجہ سے۔

تقدیر عبارت اخص یا امدح ہے ما قبل سے انداز بیان کو تبدیل کیا ہے کہ صبر کی فضیلت واضح ہو جائے اور باقی تمام اعمال پر فوقیت حاصل ہو جائے گویا کہ یہ جنس ہی علیحدہ ہے۔ اگر عطف ﴿وَالْمُوْفُوْنَ﴾ پر ہوتا تو" والصابرون "پڑھا جاتا۔ (از روح المعانی)

نصب کی ایک اور وجہ یہ بھی ہے کہ عطف تو" من آمن " پر ہے اس لحاظ پر رفع آنا چاہئے تھا لیکن " ونصبها على تطاول الكلام " نصب کلام لمبا ہونے کی وجہ سے ہے اس لئے کہ جب بات لمبی ہو رہی ہو تو عرب حضرات حرکات ما قبل سے تبدیل کر لیتے ہیں تا کہ توجہ کی جائے بے توجہی سے بات کو نہ سنا جائے۔ سورۃ مائدہ میں ﴿والصابؤن﴾ کی رفعی حالت بھی ما قبل سے مختلف ہونے کی یہی وجہ ہے اور سورۃ نساء میں ﴿وَالْمُقِيْمِيْنَ الصَّلٰوةَ﴾ میں نصب کی بھی یہی وجہ ہے۔ (مظہری)

اُولٰئِكَ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا: ''یہی وہ لوگ ہیں جنہوں نے سچ کہا'' ﴿اُولٰئِكَ﴾ کا اشارہ ہے ما قبل تمام مذکورہ چیزوں کی طرف یعنی جن لوگوں میں یہ تمام اوصاف پائے گئے وہ ایمان اور نیکی میں سچے ہیں۔

وَاُولٰئِكَ هُمُ الْمُتَّقُوْنَ: ''اور یہی لوگ تقویٰ والے ہیں''

یعنی کفر اور گناہوں والے رذیل کاموں سے بچنے والے ہیں۔

یہ آیۃ کریمہ اصل الاحکام ہے: اللہ تعالیٰ پر ایمان لانا یعنی اس کی ذات اور صفات اور اسماء پر ایمان لانا۔ آخرت کے دن پر ایمان لانا، اس میں "نشر اور حشر، میزان اور صراط (پل صراط) اور حوض (کوثر) اور شفاعت اور جنت اور دوزخ" تمام چیزوں پر ایمان لانا آ گیا۔ ملائکہ پر ایمان لانا اور آسمانی کتابوں پر ایمان لانا کہ یہ حق ہیں، اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل ہوئی ہیں۔ انبیاء کرام پر ایمان لانا، اور مال خرچ کرنا بطور وجوب یا بطور استحباب۔ اور قریبی رشتہ داروں کو مال دینا، اسی سے صلہ رحمی کی فضیلت اور قطع رحمی سے دور رہنے کا پتہ چل گیا۔ اور یتیموں پر مہربانی کرنا اور ان کی کفالت کرنا، اور مساکین کی معاونت کرنا، اور مسافروں کی امداد کرنا۔

﴿ وَابْنَ السَّبِيلِ ﴾ میں ہی مہمان بھی داخل ہیں، یعنی مہمانوں کی مہمان نوازی کرنا، اور سوال کرنے والے کو مال دینا، اور مکاتب کو آزاد کرانا، اور غلام خرید کر آزاد کرنا، اور کافروں کے ہاتھوں قیدیوں کو چھڑانا، اور نماز اور زکوۃ کے ادا کرنے کی پابندی کرنا، اور وعدہ پورا کرنا، ور مصیبتوں میں صبر کرنا، اور غربت وفقر میں صبر کرنا، اور فاقہ میں صبر کرنا، اور مرض میں صبر کرنا، اور اعضاء کے کمزور ہو جانے اور چلنے پھرنے سے عاجز آنے میں صبر کرنا، اور جہاد میں صبر کرنا۔ ان تمام چیزوں کا تذکرہ جب اس آیۃ کریمہ میں موجود ہے تو یقیناً یہ آیۃ عظیمہ کثیر احکام پر مشتمل ہے۔ (قرطبی)

اور اس آیۃ کے آخر میں: نیک بندوں کا وصف سچائی اور تقوی اور وعدہ کی وفاء کا ذکر فرمایا جس سے واضح ہوتا ہے کہ یہ امور دین میں عمدہ ہیں اس طرح یہ اوصاف رکھنے والوں کی کامل تعریف پائی گئی ہے صدق بمقابلہ کذب استعمال ہوتا ہے کہا جاتا ہے " صدقوهم القتال " انہوں نے جنگ کو سچ کر دکھایا۔ "الصدیق" جو سچائی کو لازم پکڑے حدیث شریف میں ہے۔

☆ " عليكم بالصدق فان الصدق يهدى الى البر وان البر يهدى الى الجنة وما يزال الرجل يصدق ويتحرى الصدق حتى يكتب عند الله صديقا "

تم پر لازم ہے کہ سچ بولو بیشک سچائی انسان کو نیکی کی ہدایت دیتی ہے اور بیشک نیکی جنت کی ہدایت دیتی ہے جب انسان ہمیشہ سچ بولتا رہے اور سچ بولنے میں تحری (کوشش) کرتا رہے تو وہ اللہ تعالیٰ کے ہاں صدیق لکھ دیا جاتا ہے۔ (از قرطبی)

يَا اَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِصَاصُ فِي الْقَتْلٰى اَلْحُرُّ بِالْحُرِّ وَالْعَبْدُ بِالْعَبْدِ وَالْاُنْثٰى بِالْاُنْثٰى فَمَنْ عُفِيَ لَهٗ مِنْ اَخِيْهِ شَيْءٌ فَاتِّبَاعٌ بِالْمَعْرُوْفِ وَاَدَآءٌ اِلَيْهِ بِاِحْسَانٍ ذٰلِكَ تَخْفِيْفٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَرَحْمَةٌ فَمَنِ اعْتَدٰى بَعْدَ ذٰلِكَ فَلَهٗ عَذَابٌ اَلِيْمٌ

۱) ''اے ایمان والوتم پرفرض ہے کہ جوناحق مارے جائیں ان کے خون کا بدلہ لو آزاد کے بدلے آزاد اور غلام کے بدلے غلام اور عورت کے بدلے عورت تو جس کے لئے اس کے بھائی کی طرف سے کچھ معافی ہوئی تو بھلائی سے تقاضا ہو اور اچھی طرح ادا۔ یہ تمہارے رب کی طرف سے تمہارا بوجھ ہلکا کرنا ہے اور تم پر رحمت تو اس کے بعد جو زیادتی کرے اس کے لئے دردناک عذاب ہے''۔

۲) ''اے لوگو جو ایمان لائے ہو ثابت کر دیا گیا ہے تم پر قصاص (بدلہ لینا خون کا) ان کا جو ناحق قتل کر دیئے گئے، آزاد بدلے آزاد کے، اور غلام بدلے غلام کے، اور عورت بدلے عورت، کے تو وہ شخص معاف کر دیا گیا جسے اس کے بھائی کی طرف سے کچھ، تو پیچھا کیا جائے بھلائی سے، اور ادا کرے اسے اچھے طریقہ سے، یہ تخفیف ہے تمہارے رب کی طرف سے اور رحمت، تو جو شخص تجاوز کرے اس کے بعد تو اس کے لئے عذاب ہے دردناک''۔

شان نزول:

(۱) بغوی، شعبی، کلبی اور قتادہ رحمہم اللہ فرماتے ہیں کہ عرب میں دو قبیلے تھے جو زمانہ جاہلیت میں ایک دوسرے سے معمولی معمولی بات پر لڑائی شروع کرتے جو ایک دوسرے کو قتل کرنے اور زخمی کرنے پر ختم ہوتی۔ ایک قبیلہ کو دوسرے پر طاقت اور دنیاوی شرافت حاصل ہوتی تھی وہ دوسرے قبیلہ کی عورتوں سے

بغیر مہر کے نکاح کر لیتے تھے وہ قسم اٹھاتے تھے کہ ہم ضرور بر ضرور اپنے غلام کے بدلے تمہارے آزاد آدمی کو قتل کریں گے اور ہم اپنی عورتوں کے بدلے تمہارے مردوں کو قتل کریں گے تم نے ہمارا ایک آدمی قتل کیا تو ہم تمہارے دو آدمی قتل کریں گے۔

تم جتنے زخم ہمیں پہنچاؤ گے ہم ان سے دوگنا تمہیں زخم پہنچائیں گے یہ زمانہ جاہلیت میں ان کا طریقہ تھا لیکن اب دونوں قبیلے مسلمان ہو چکے تھے یہ دو قبیلے اوس اور خزرج تھے یہی قول سعید ابن جبیر کا ہے اور یہی صحیح ہے کیونکہ رب تعالیٰ نے ﴿ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا ﴾ سے خطاب فرمایا اگرچہ مقاتل بن حبان کا قول یہ ہے کہ یہ دو قبیلے بنی نضیر اور قریظہ تھے لیکن یہ قول درست نہیں کیونکہ انہوں نے ایمان قبول نہیں کیا اوس اور خزرج کی زمانہ جاہلیت میں جنگ کے دوران جو لوگ قتل ہو گئے تھے یا زخمی ہو گئے تھے ابھی تک انہوں نے ایک دوسرے سے بدلہ نہیں لیا تھا اب وہ مسلمان ہو چکے تھے لہٰذا دونوں یعنی اوس اور خزرج نے اپنا معاملہ اور اپنی قسموں کو نبی کریم ﷺ کے سامنے پیش کیا تو یہ آیۃ کریمہ نازل ہوئی جس میں مساوات کا حکم دیا گیا۔ دونوں قبیلوں نے اسے تسلیم کیا اور فیصلہ پر راضی ہو گئے اسلام کی برکت سے ان کی لڑائیاں بھی ختم ہو گئیں۔ (مظھری)

(۲) شان نزول کی دوسری وجہ یہ ہے کہ یہود پر قتل میں صرف قصاص فرض تھا اور نصاری پر مطلقاً معاف کرنا فرض تھا " **وخير هذه الامة بينهما وبين الدية تيسيرا عليهم وتقديرا للحكم على حسب مراتبهم** " اس امت کو اختیار دے دیا گیا کہ مقتول کے ورثا چاہیں تو قصاص لیں چاہیں تو معاف کر دیں اور چاہیں تو دیۃ (فدیہ) لے لیں۔

یہ حکم اس امت کی آسانی کے لئے دیا گیا رب تعالیٰ کے احکام ان کے مراتب کے مطابق دیئے گئے۔ چونکہ نبی کریم ﷺ کی امت تمام امتوں سے افضل ہے اس لئے ان کو ان کی شان کے مطابق ہی احکام دیئے گئے اور اسی طرح ان کے درجات بھی بلند کئے گئے۔ (ماخوذ از بیضاوی وشیخ زادہ)

(۳) علامہ رازی رحمہ اللہ نے یہ دو وجہ بھی ذکر کی ہیں اور تیسری وجہ بھی ذکر کی ہے کہ یہ آیۃ کریمہ حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد نازل ہوئی۔ تاہم پہلے دو قول زیادہ قوی ہیں اور دونوں مجتمع ہیں۔ بلکہ علامہ بیضاوی نے پہلی وجہ شان نزول کی بیان کی اور دوسری وجہ ﴿ ذٰلِكَ تَخْفِيفٌ مِّنْ

رَبِّكُمْ ﴾ کی تفسیر میں ذکر کی ہے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِصَاصُ فِي الْقَتْلَى :

''اے لوگو جوایمان لائے ہو ثابت کر دیا گیا ہے تم پر قصاص (بدلہ لینا خون کا) ان کا جو ناحق قتل کر دیئے گئے''

اَلْقِصَاصُ : " تتبع الدم بالقود " خون کا بدلہ خون سے یعنی کسی کو ناحق قتل کرنے سے جب مقتول (جسے قتل کیا گیا) کے ورثاء مطالبہ کریں کہ ہمارے مقتول کے بدلے قاتل کو قتل کیا جائے تو اسے قصاص کہا جاتا ہے۔ (مفردات راغب)

فِي الْقَتْلَى : فعلی کا وزن جمع ہے فعیل کی جب اس کا معنی مفعول کا ہو اس لئے قتلی جمع ہے قتیل بمعنی مقتول کی اور ''فی'' اس مقام میں سببیت کے لئے استعمال ہے اب معنی یہ ہوگا " بسبب قتل القتلی " قصاص ثابت کیا گیا ہے بوجہ مقتولوں کے قتل کے۔

حدیث شریف میں بھی ''فی'' سبب کے معنی میں استعمال ہے نبی کریم ﷺ نے فرمایا " ان امرأة دخلت النار فی هرة " بیشک ایک عورت بلی کی وجہ سے جہنم میں داخل ہوگئی۔

وجہ اس کی یہ تھی کہ اس نے بلی کو باندھ دیا تھا کوئی چیز کھانے اور پینے کی نہ دی اور نہ ہی کھولا کہ وہ کوئی چیز کھا پی لے تو وہ بلی بھوک اور پیاس کی وجہ سے تڑپ تڑپ کر مرگئی۔ تو اس عظیم ظلم کی وجہ سے وہ عورت جہنم میں داخل ہونے کی مستحق ہوگئی۔

﴿ القتل ﴾ اصل القتل ازالة الروح عن الجسد كالموت "

قتل اور موت کا حقیقت میں ایک ہی معنی ہے یعنی روح کا جسم سے زائل کرنا لیکن استعمال کے لحاظ پر فرق ہے جب روح کے زوال کی نسبت کسی انسان کی طرف ظاہر کو دیکھ کر کی جائے تو اسے قتل کہا جائے اگر اس میں ظاہری طور پر کسی انسان کا دخل نہیں تو وہ موت ہے۔ (از مفردات راغب بتغیر)

اعتراض : ''کتب'' اصل معنی کتابۃ کا لکھنا ہے کبھی لکھنے کو فرضیت لازم ہو جاتی ہے اسی ضابطہ کی وجہ سے (یعنی تسمیۃ الملزوم باسم اللازم کے ضابطہ کی وجہ سے) ''کتب'' کا معنی کیا جاتا ہے ''فرض کیا گیا'' جب ناحق قتل میں مقتول کے ورثاء کو اختیار دیا گیا ہے کہ وہ قصاص لیں یا معاف کر دیں یا فدیہ لے لیں تو ''کتب'' (فرض کیا گیا) کا کیا مطلب ہے۔

پہلا جواب: " کتب معناه فرض واثبت "یعنی "کتب" کا معنی فرض کیا گیا بھی ہے اور ثابت کیا گیا بھی آتا ہے اس لئے معنی اگر "ثابت کیا گیا" کرلیا جائے تو کوئی اعتراض وارد نہیں ہوگا۔

دوسرا جواب: " ان ﴿کُتِبَ﴾ هنا اخبار عما کتب فی اللوح المحفوظ وسبق به القضاء "

بیشک یہاں " کتب " سے یہ خبر دی گئی ہے کہ قصاص کا حکم لوح محفوظ پر لکھ دیا گیا ہے اور قتل میں تقدیر سبقت لے گئی یعنی اگر " کتب "کا معنی کیا جائے "لکھ دیا گیا ہے" تو پھر بھی اعتراض نہیں ہوگا۔
(از قرطبی بتغیر)

تیسرا جواب: " ﴿کُتِبَ عَلَیْکُمُ﴾ ای فرض والزم عند المطالبة صاحب الحق فلایضر فیه قدرة الولی علی العفو فان الوجوب انما اعتبر بالنسبة الی الحکام او القاتلین "

(کتب) کا معنی تو یہی ہے کہ فرض کیا گیا ہے یا تو خطاب حکام کو ہے کہ جب صاحب حق مطالبہ کرے کہ میں نے تو قصاص ہی لینا ہے تو اس وقت احکام تم پر فرض ہو جائے گا کہ تم قصاص دلاؤ۔ ولی اگر معاف کرنے کی طاقت رکھتا ہے اسے اختیار بھی ہے لیکن وہ معاف نہیں کر رہا تو قصاص فرض ہو گیا۔ اسی طرح یہ خطاب قاتلین کو ہو تقدیر عبارت کی یہ ہو " یا ایها القاتلون کتب علیکم تسلیم النفس عند مطالبة الولی القصاص " اے قاتلو جب مقتول کا ولی قصاص کا مطالبہ کرے تو تم پر فرض ہے کہ تم اپنے آپ کو قصاص کے لئے پیش کر دو۔

اس صورت میں قاتل کے لئے جائز نہیں کہ اپنے آپ کو نہ پیش کرے اور یہ بھی جائز نہیں کہ وہ قصاص سے انکار کرے۔ (یہ در حقیقت چوتھا جواب ہے) (ماخوذ از روح المعانی و کبیر)

کون سے قتل میں قصاص ہے؟ قتل کی پانچ قسمیں ہیں باقی کی تفصیل انشاء اللہ پانچویں پارہ میں آئے گی۔ البتہ یہ یاد رکھا جائے کہ قصاص قتل عمد میں لازم آتا ہے۔

قتل عمد یہ ہے کہ جان بوجھ کر ارادہ سے کسی کو ہتھیار سے قتل کرنا یا جو ہتھیار کے قائم مقام ہوں جیسے نوک دار لکڑی اور بانس کا چھلکا اور پتھر نوک دار اور آگ سے کسی کو اپنے ارادہ سے قتل کرنا قتل عمد ہے آسان لفظوں میں یہ سمجھا جائے کہ کسی کو ایسے آلہ سے جان بوجھ کر قتل کیا جائے جس سے زخم ہوں خون

چلے وہ قتل عمد ہے۔

قتل عمد پر مرتب ہونے والے احکام: قاتل گنہگار ہوگا کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

﴿ وَمَنْ يَّقْتُلْ مُؤْمِنًا مُّتَعَمِّدًا فَجَزَآؤُهٗ جَهَنَّمُ خَالِدًا فِيْهَا ﴾

''جو شخص کسی مومن کو جان بوجھ کر اپنے ارادہ سے قتل کرے اس کی جزاء جہنم ہے جس میں وہ بہت دیر رہے گا''

(هدایه باب القصاص)

قتل سے گناہ پر احادیث مبارکہ:

" عن عبد الله بن مسعود قال قال رسول الله ﷺ لا یحل دم امری مسلم یشهد ان لا اله الا الله وانی رسول الله الا باحدی ثلاث النفس بالنفس والثیب الزانی والمارق لدینه التارک للجماعة "

(بخاری ومسلم مشکوة کتاب القصاص)

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کسی شخص کے لئے حلال نہیں کہ وہ کسی مسلمان کا خون بہائے جس نے گواہی دی کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور گواہی دی بیشک میں اللہ کا رسول ہوں۔ سوائے تین شخصوں کے (ان کو قتل کیا جائے گا) جو شخص کسی کو ناحق عمداً قتل کردے اس قاتل کو قصاص کے طور پر قتل کردیا جائے اور زانی محصن کو سنگسار کرکے قتل کردیا جائے۔ اور دین کو چھوڑ کر جماعت کے عقائد کو چھوڑ کر جو مرتد ہو جائے اسے قتل کردیا جائے۔

☆ " عن ابن عمر قال قال رسول الله ﷺ لن یزال المؤمن فی فسحة من دینه ما لم یصب دما حراما " (رواہ البخاری)

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا مومن کو ہمیشہ اپنے دین میں کشادگی حاصل رہتی ہے جب تک حرام خون کو نہ پالے۔ (مشکوۃ کتاب القصاص)

یعنی مومن کو اللہ تعالیٰ کی طرف رحمت کی امید کرنے میں وسعت حاصل رہتی ہے جب وہ کسی کو ناحق قتل کر ڈالے تو اس پر دین میں چلنا تنگ کردیا جاتا ہے اور رب تعالیٰ کی رحمت کی امید بھی اس پر تنگ کردی جاتی ہے۔ (لمعات)

☆ " عن المقداد بن الاسود انه قال یا رسول الله ارأیت ان لقیت رجلا من الکفار

فاقتلنا فضرب احدی یدی بالسیف فقطعها ثم لا ذمنی بشجرة فقال اسلمت لله وفی روایة فلما اهویت لاقتله قال لا اله الا الله اقتله بعد ان قالها قال لا تقتله فقال یا رسول الله انه قطع احدی یدی فقال رسول الله ﷺ لا تقتله فان قتلته فانه بمنزلتک قبل ان تقتله وانک بمنزلته قبل ان یقول کلمته قال" (بخاری ومسلم)

مقداد بن اسود کہتے ہیں کہ انہوں نے عرض کیا یا رسول اللہ آپ اس کے متعلق کیا ارشاد فرماتے ہیں کہ میں اگر کسی کافر سے مقابلہ کروں ہمارے درمیان لڑائی واقع ہو اس کافر نے میرا ایک ہاتھ تلوار سے کاٹ دیا ہو پھر وہ ایک درخت کے ساتھ سہارا لگاتے ہوئے مجھ سے پناہ حاصل کرے یہ کہتے ہوئے کہ میں اللہ کے لئے اسلام لے آیا۔ ایک روایت میں ہے میں اس کو قتل کرنے کا ارادہ کرتا ہوں تو وہ کہتا ہے " لا اله الا الله " کیا اس شخص کو میں قتل کر دوں؟ آپ نے فرمایا تم اسے قتل نہ کرو انہوں نے عرض کیا یا رسول اللہ (میں اسے کیوں نہ قتل کروں) اس نے تو میرا ہاتھ کاٹ دیا ہے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تم اسے قتل نہ کرو۔ اگر تم نے اسے قتل کر دیا تو قتل کرنے سے پہلے جو تمہارا مقام تھا وہ اس پر آ جائے گا اور اس کے کلمہ (لا الہ الا اللہ) پڑھنے سے پہلے جو اس کا مقام تھا تم اس پر چلے جاؤ گے۔

وضاحت حدیث: نبی کریم ﷺ نے ﴿ لا تقتله ﴾ ارشاد فرما کر واضح کر دیا کہ کسی مسلمان کو ناحق قتل کرنا جائز نہیں اسی لئے آپ نے منع فرمایا۔ اور مسئلہ یہ واضح ہوا کہ اگر کافر حربی کسی مسلمان پر کوئی جنایت کرے پھر وہ اسلام قبول کر لے تو اس سے بدلہ نہیں لیا جائے گا کیونکہ جب کافر نے مسلمان کا ہاتھ حالت کفر میں کاٹا ہو پھر مسلمان ہو جائے تو اس کا ہاتھ نہیں کاٹا جائے گا۔ اس لئے کہ نبی کریم ﷺ نے یہ نہیں فرمایا کہ اسے قتل نہ کرو البتہ اپنے ہاتھ کے بدلے ہاتھ کاٹ لو۔ اور فائدہ یہ حاصل ہوا کہ مسلمان کا خون بہانا (قتل کرنا) جائز نہیں اور کافر کو قتل کرنا جائز ہے اب حدیث پاک کے آخری الفاظ کا مطلب واضح ہو جائے گا۔ اگر تم نے اسے قتل کیا تو تم سمجھ لو کہ جب وہ کافر تھا اسے قتل کرنا جائز تھا اب وہ مسلمان ہو چکا ہے اس کے قتل کے بدلے تمہیں قتل کر دیا جائے گا یعنی جس طرح اسلام سے پہلے اس کو قتل کرنا جائز تھا اب تمہیں قتل کرنا جائز ہو جائے گا۔ اگرچہ وجوہ قتل مختلف ہوں گے۔ اس کے قتل کئے جانے کا سبب کفر تھا تمہارے قتل کئے جانے کا سبب قصاص ہوگا۔

اس کو قتل کرنے سے پہلے تمہارا مقام یہ تھا کہ تمہیں بحیثیت مسلمان قتل کرنا منع تھا اور تمہارے قتل کئے جانے سے قصاص لیا جانا تھا اور تم اللہ تعالیٰ کے مقرب تھے قتل کے بعد رب تعالیٰ تم سے ناراض ہو جائے گا۔ اگر تم نے اسے قتل کر دیا تو یہ تمہارا مقام اسے حاصل ہو جاتا ہے۔ (ازمرقاۃ)

☆ "عن السامة بن زيد قال بعثنا رسول الله ﷺ الى اناس من جهينة فاتيت على رجل منهم فذهبت اطعنه فقال لا اله الا الله فطعنته فقتلته فجئت الى النبی ﷺ فاخبرته فقال اقتلته وقد شهد ان لا اله الا الله قلت يا رسول الله انما فعل ذلک تعوذا قال فهلا شققت عن قلبه" (بخاری ومسلم) "وفی رواية جندب بن عبد الله البجلی ان رسول الله ﷺ قال كيف تصنع بلا اله الا الله اذا جاء ت يوم القيامة قال مرارا رواه مسلم"

(مشکوۃ کتاب القصاص)

حضرت اسامہ بن زید رضی اللہ عنہما کہتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے ہمیں جہینہ قبیلہ کے لوگوں کی طرف بھیجا (اورلوگ بھاگ گئے) ایک آدمی ان میں سے ثابت رہا میں نے اسے نیزہ مارنا چاہا تو اس نے کہا "لا الہ الا اللہ" میں نے نیزہ مار کر اسے قتل کر دیا تو میں نبی کریم ﷺ کے پاس (جب) آیا تو میں نے آپ کو اس کی خبر دی تو آپ نے فرمایا تم نے اس شخص کو قتل کر دیا جس نے اس کی شہادت دی کہ "لا الہ الا اللہ" میں نے عرض کیا یا رسول اللہ اس نے اپنے بچاؤ کے لئے ایسے کیا آپ نے فرمایا تم نے اس کے دل کو کیوں نہیں پھاڑا۔ جندب بن عبداللہ بجلی کی روایت میں یہ ہے کہ بیشک رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جب قیامت کے دن لا الہ الا اللہ آ گیا تو تم کیا کرو گے۔ یہ الفاظ نبی کریم ﷺ نے کئی مرتبہ ارشاد فرمائے۔

وضاحت: حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ نے یا تو اس گمان پر اسے قتل کیا تھا کہ اس نے سچے دل سے ایمان قبول نہیں کیا اور یا آپ نے اجتہاد کیا کہ ایسے حال میں جب مسلمان کافر کو قتل کرنے لگے وہ اسلام لے آئے تو وہ اسلام اس کا قبول نہیں۔ لیکن حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ کا گمان اور اجتہاد دونوں ہی درست نہیں تھے اسی لئے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "هلا شققت قلبه" یہاں "شق قلب" کا مجازی معنی ہے "غور وفکر" کرنا دیر کرنا کہ پہلے اس سے پوچھا جائے پھر اور ذرائع سے معلوم کیا جائے ہوسکتا ہے وہ سچا ہی ہو۔ اب مطلب یہ ہو گیا:

" لم لا شققت قلبه لتعلم وتطلع علی ما فی قلبه وتبین لک "

تم نے اس کے دل کے حال پر توجہ کیوں نہیں کی غور وفکر نہیں کیا کہ تمہیں معلوم ہوتا اور تم اس کے دل پر مطلع ہوتے اور تم پر واضح ہوتا کہ اس نے صرف بچاؤ کے لئے کلمہ پڑھا تھا یا خلوص دل سے۔ (از مرقاۃ)

دوسری روایت کے الفاظ " کیف تصنع بلا اله الا الله اذا جاء ت یوم القیامة " کا مطلب یہ ہے کہ اگر قیامت کے دن اللہ تعالیٰ نے " لا الـــه الا الله " کو انسانی شکل دے دی اس نے تمہارے ساتھ مخاصمت شروع کردی کہ اس نے میرا لحاظ نہیں کیا تو تم کیا کرو گے۔

دوسرا مطلب یہ ہے کہ اگر کلمہ شریف کی طرف سے فرشتہ نے آ کر مخاصمت کی کہ اس نے کلمہ کا پاس نہیں کیا تو اس حال میں تم کیا کرو گے۔ تیسرا مطلب یہ ہے کہ اگر اس شخص نے تمہارے ساتھ مخاصمت کی جس نے کلمہ شریف پڑھ لیا تھا پھر تم نے اسے قتل کردیا تو تم کیا کرو گے۔ (از لمعات) نبی کریم ﷺ نے یہ الفاظ کئی مرتبہ اسی لئے ارشاد فرمائے کہ آپ کو دکھ ہوا کہ ایک مسلمان کو قتل کردیا گیا۔ واضح ہوا کہ شک کی وجہ سے کہ ہوسکتا ہے یہ کافر ہو کسی کو قتل کرنا ہرگز ہرگز جائز نہیں۔ (راقم)

☆ " وعن عبد الله ابن عمرو قال قال رسول الله ﷺ من قتل معاهدا لم یرح رائحة الجنة وان ریحها توجد من مسیرة اربعین خریفا " رواه البخاری (مشکوۃ کتاب القصاص)

عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس شخص نے کسی ذمی کو قتل کیا وہ جنت کی خوشبو نہیں پائے گا۔ حالانکہ جنت کی خوشبو چالیس سال کی مسافت سے پائی جائے گی۔

وضاحت : ذمی (معاہد) اس شخص کو کہا جاتا ہے جو کافر ہو مسلمانوں کے ملک میں رہے مسلمان حاکم نے اس کے مال اور اس کی جان کی حفاظت کی ذمہ داری اٹھائی ہو۔ " خریف " اگرچہ موسم خریف کو کہا جاتا ہے لیکن یہاں مراد سال ہے کیونکہ خریف بھی سال میں ایک دفعہ آتا ہے۔ (از لمعات و مرقاۃ)

خودکشی کا جرم:

" عن ابی هریرة قال قال رسول الله ﷺ من تردی من جبل فقتل نفسه فهو فی نار جهنم یتردی فیها خالدا مخلدا فیها ابدا ومن تحسی

سما فقتل نفسه فسمه فی یده یتحساه فی نار جهنم خالدا مخلدا فیها ابدا ومن قتل نفسه بحدیدة فحدیدته فی یده یتوجا بها فی بطنه فی نار جهنم خالد مخلدا فیها ابدا ...... بخاری ومسلم"

(مشکوۃ کتاب القصاص)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جو شخص پہاڑ سے اپنے آپ کو گرا کر قتل کردے تو اسے جہنم کی آگ میں ہمیشہ اوپر سے نیچے گرایا جاتا رہے گا۔ اور جس شخص نے زہر پی کر اپنے آپ کو قتل کر دیا تو اس کے ہاتھ میں زہر دیا جائے گا جو جہنم کی آگ ہمیشہ وہ پیتا رہے گا اور جس شخص نے اپنے آپ کو کسی تیز دھار آلہ سے قتل کر دیا تو اس کے ہاتھ میں تیز دھار آلہ دیا جائے گا وہ جہنم کی آگ میں اپنے آپ کو ہمیشہ اس سے قتل کرتا رہے گا۔

وضاحت: یعنی خودکشی کرنے والا جس طرح دنیا میں اپنے آپ کو قتل کرے گا قیامت کے دن اسے ایسا ہی عذاب ہوگا۔ اور اسی طرح وہ اپنے آپ کو قتل کرے گا پھر زندہ کر دیا جائے گا پھر وہ اپنے آپ کو قتل کرے گا۔ یہ سلسلہ لگاتار جاری رہے گا۔ جیسا کہ رب تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

﴿ كُلَّمَا نَضِجَتْ جُلُوْدُهُمْ بَدَّلْنٰهُمْ جُلُوْدًا غَيْرَهَا ﴾

''جب بھی ان کے چمڑے جل جائیں گے ان کے بدلے ہم ان کو اور چمڑے دے دیں گے''

(راقم)

☆ "عن ابی سعید وابی هریرة عن رسول الله ﷺ قال لو ان اهل السماء والارض اشتركوا فی دم مؤمن لاكبهم الله فی النار رواه الترمذی وقال هذا حدیث غریب"

(مشکوۃ کتاب القصاص)

حضرت ابوسعید اور ابوھریرہ رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اگر بیشک تمام آسمان والے اور زمین والے کسی مومن کے خون (قتل میں شریک ہو جائیں تو اللہ تعالیٰ ان کو آگ میں اوندھا گرا دے گا۔

قتل عمد کا اور حکم: ابھی تک قتل عمد کا ایک حکم بیان ہوا کہ قاتل گنہگار ہوگا۔ اب دوسرا حکم بیان کیا جا رہا ہے وہ ہے قصاص جیسا کہ اسی آیۃ مبارکہ میں جو زیر بحث ہے مذکور ہے ﴿ كتب علیكم القصاص فی القتلی ﴾ ہاں البتہ جان بوجھ کر قتل کرنے سے قصاص کو حدیث پاک کے ذریعے مقید کیا گیا ہے۔

نبی کریم ﷺ کا ارشادگرامی ہے " العمد قود " ، ای موجبہ "جان بوجھ کرقتل کرنا قصاص کا سبب ہے۔

(من حدیث ابن عباس رواہ ابن ابی شیبہ)

عقل کا بھی یہی تقاضا ہے کہ عمداً قتل کرنے سے جنایت کامل پائی جاتی ہے اس لئے اس پر زجر بھی کامل ہونی ضروری ہے سزا اس پر قصاص سے بڑھ کر اور کوئی نہیں اسی لئے قصاص مقرر کیا۔

(از هدایة اخیرین کتاب الجنایات)

قتل عمد کا اور حکم: ابھی تک دو حکم بیان کئے گئے ہیں کہ عمداً قتل کرنے والا گہنگار ہوگا اور اس پر قصاص لازم ہوگا۔ تیسرا حکم یہ ہے کہ مقتول کے ورثاء اگر اسے معاف کر دیں تو جائز ہے اور اگر وہ کچھ مال لے کر معاف کر دیں تو ان کی مرضی رب تعالیٰ نے یہ حق ان کو دیا ہے۔ یہ دونوں حکم اسی زیر بحث آیۃ کریمہ میں آگے (انشاءاللہ) آرہے ہیں جن پر مناسب بحث کردی جائے گی۔

قتل عمد کا ایک اور حکم: ابھی تک قتل عمد کے تین حکم بیان کئے جاچکے ہیں چوتھا حکم یہ ہے:

" عن ابی هريرة عن النبی ﷺ قال القاتل لا يرث ، اخرجه الترمذی فی الفرائض "

کہ قاتل اگر اس شخص کو قتل کردے جس کی وراثت اسے ملنی تھی تو یہ شخص وراثت سے محروم ہو جائے گا۔ کیونکہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا قاتل وارث نہیں ہوتا۔

(ماخوذ از هدایہ بمع حاشیہ کتاب الجنایات)

اَلْحُرُّ بِالْحُرِّ وَالْعَبْدُ بِالْعَبْدِ وَالْاُنْثٰی بِالْاُنْثٰی:

آزاد بدلے آزاد کے اور غلام بدلے غلام کے اور عورت بدلے عورت کے۔

جیسا کہ شان نزول سے بیان ہو چکا ہے کہ اوس اور خزرج کے حق میں یہ آیۃ نازل ہوئی جب کہ ان میں سے ایک قبیلہ نے قسم اٹھائی ہوئی تھی کہ تم ہمارے غلام کو قتل کرو گے تو ہم تمہارے آزاد آدمی کو قتل کریں گے تم ہماری عورت کو قتل کروں گے تو ہم تمہارے مرد کو قتل کریں گے۔

اسلام لانے کے بعد جب انہوں نے نبی کریم ﷺ سے پوچھا تو ان کو اس غلط طریقہ سے روک دیا گیا۔ کہ اگر غلام غلام کو قتل کرے تو غلام کو ہی قتل کیا جائے۔ اگر آزاد شخص آزاد کو قتل کرے تو آزاد قاتل کو ہی قتل کیا جائے۔ اگر مؤنث قتل کرے مؤنث کو تو مؤنث کو ہی قتل کیا جائے۔

آیۃ کریمہ کا یہی مطلب جو شان نزول سے واضح ہوا:

﴿ ولا یدل علی ان لا یقتل الحر بالعبد والذکر بالانثی کما لا یدل علی عکسه ﴾

آیۃ کریمہ اس پر دلالت ہی نہیں کر رہی کہ غلام کا قاتل آزاد ہو تو آزاد کو قتل نہ کیا جائے یا مذکر قتل کر دے مؤنث کو تو مذکر کو قتل نہ کیا جائے۔ اسی طرح آیۃ کریمہ سے اس کا عکس (الٹ) بھی ثابت نہیں کہ اگر غلام قتل کر دے آزاد کو تو غلام کو قتل نہ کیا جائے اور اگر مؤنث مذکر کو قتل کر دے تو مؤنث کو قتل نہ کیا جائے۔

(از بیضاوی مع زیادتی وضاحت)

مسئلہ : ہر وہ شخص جس کے خون کی حفاظت کا حکم شریعت نے دیا ہے یعنی مسلمان اور ذمی ان کو ناحق جان بوجھ کر کوئی شخص بھی قتل کر دے اس سے قصاص لیا جائے گا۔ قصاص میں مساوات خون کی حفاظت میں ہے نہ کی حریت اور عبدیت میں اور نہ ہی تذکیر و تانیث میں کیونکہ رب تعالیٰ کا ارشاد گرامی مطلق ہے ﴿ اِنَّ النَّفْسَ بِالنَّفْسِ ﴾ بیشک نفس، نفس کے بدلے یعنی ایک جان کے بدلے جان کو ہی قتل کر کے قصاص لیا جائے۔

خیال رہے یہ آیۃ مومنوں کے حق میں وہی حکم ثابت کر رہی ہے جو بنی اسرائیل کے لئے حکم تھا یہ آیۃ منسوخ نہیں اور نہ بنی اسرائیل سے خاص نہیں اور بنی اسرائیل کے عذاب کا اس میں ذکر نہیں۔ اور نبی کریم ﷺ کا ارشاد بھی مطلق ہے "العمد القود" جان بوجھ کر قتل کرنے میں قصاص ہے۔

(از هدایة مع حاشیه)

مسئلہ : اگر مسلمان نے کسی ذمی کو قتل کر دیا تو مسلمان کو قصاص کے طور پر قتل کر دیا جائے گا "عن ابن عمر ان رسول الله ﷺ قتل مسلما بمعاهد" (دار قطنی)

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں بیشک رسول اللہ ﷺ نے ذمی کے بدلے مسلمان کو قتل کرنے کا حکم دیا۔ (از هدایہ مع حاشیہ)

مسئلہ : حربی کافر کو کسی مسلمان نے یا کسی ذمی نے دارالحرب میں قتل کر دیا ہو تو یہ قتل کرنا جائز ہے لہٰذا اس کافر مقتول کے بدلے مسلمان یا ذمی کو قتل نہیں کیا جائے گا۔ رب تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

﴿ قَاتِلُوا الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ﴾

"ان لوگوں سے قتال کرو جو اللہ اور آخرت کے دن پر ایمان نہیں رکھتے"

اور نبی کریم ﷺ کا ارشاد گرامی " **لا یقتل مؤمن بکافر** " (اخرجہ ابوداؤد عن علی)

مومن کو کافر کے بدلے قتل نہ کیا جائے۔ (از ھدایہ مع حاشیہ)

مسئلہ : اگر کوئی کافر دارحرب سے مسلمانوں کے ملک میں حاکم کی اجازت سے آتا ہے اسے کوئی مسلمان یا ذمی قتل کر دیتا ہے تو اس قتل کے بدلے مسلمان یا ذمی کو قتل نہیں کیا جائے گا اس لئے کہ یہ کافر ہمیشہ کے لئے محفوظ الدم نہیں اس نے لوٹ کر بھی جانا تھا اور مسلمانوں سے لڑائی بھی کرنی تھی۔

(از ھدایہ)

لیکن یہ کبھی نہ بھولیں کہ مسلمان اپنے حاکم کے وعدہ کے خلاف کام کرنے کی وجہ سے شدید گنہگار ہوگا خصوصا آج کل کے بین الاقوامی قوانین کے مطابق دوسرے ممالک میں رہنے والے مسلمانوں کے لئے اس قسم کے عمل سے مشکلات پیدا ہوتی ہیں۔

اسی طرح ذمی اگر حربی کافر مستامن (جو اجازت لے کر آیا ہے) کو قتل کر دے تو وہ بھی مسلمانوں کے حاکم اور دوسرے مسلمانوں کیلئے مشکلات پیدا کرنے کا سبب بن رہا ہے۔ مسلمان حاکم کو اختیار ہے کہ امن لے کر آنیوالے کے قاتل کو تعزیری سزا دے "قید یا کوڑوں سے" قتل نہیں کرا سکتا۔ (راقم)

مسئلہ : عورت کو مرد قتل کر دے تو عورت کے بدلے مرد کو قتل کر دیا جائے گا۔ اور اگر عورت نے مرد کو قتل کر دیا تو عورت کو مرد کے بدلے قتل کر دیا جائے گا۔ بڑے نے چھوٹے کو قتل کر دیا تو بڑے کو چھوٹے کے بدلے قتل کر دیا جائے گا۔ اور صحیح شخص نے نابینا کو یا چلنے پھرنے سے معذور شخص کو قتل کر دیا تو صحیح کو قصاص کے طور پر قتل کر دیا جائے گا۔ اور صحیح شخص نے اس شخص کو قتل کر دیا جس کا عضو کٹا ہوا تھا۔ یا کوئی عضو شل تھا تو صحیح کو اس کے بدلے قتل کر دیا جائے گا۔ اسی طرح صحیح شخص نے پاگل کو قتل کر دیا تو اس کے بدلے صحیح کو قتل کر دیا جائے گا۔ وجہ سب میں ﴿ اِنَّ النَّفْسَ بِالنَّفْسِ ﴾ "بیشک جان کے بدلے جان ہے"۔ (ماخوذ از ہدایہ)

مسئلہ : کسی شخص نے اپنے بیٹے کو قتل کر دیا تو گنہگار ہوگا، وراثت سے محروم ہوگا لیکن اسکے باپ ہونے کی تحریم کو دیکھتے ہوئے قصاص کے طور پر اسے قتل نہیں کیا جائیگا۔ " **لقوله عليه السلام لايقاد الوالد بولده** "

(اخرجه الترمذی و ابن ماجه فی الدیات عن عمر ابن الخطاب)

نبی کریم ﷺ نے فرمایا باپ سے بیٹے کا قصاص نہ لیا جائے۔ (ھدایہ مع النقایۃ)

مسئلہ : اگر کوئی شخص آزاد کسی کے غلام کو قتل کر دے تو آزاد کو اس کے بدلے قتل کر دیا جائے گا۔ لیکن اگر کسی نے اپنے غلام کو قتل کر دیا تو اسے اس کے بدلے قتل نہیں کیا جائے۔ (از ہدایہ)

اعتراض : حدیث شریف میں ہے "من قتل عبده قتلناه" جس شخص نے اپنے غلام کو قتل کیا ہم اسے قتل کر دیں گے۔

جواب : "هو حديث ضعيف" یہ حدیث ضعیف ہے۔ (قرطبی)

نوٹ: بین الاقوامی قوانین کے مطابق آج کل کوئی غلام نہیں پائے جاتے گھریلو ملازم کو غلام سمجھنا نادانی ہے۔ (راقم)

مسئلہ : جب چند آدمی مل کر ایک مسلمان کو ناحق قتل کر دیں یا ذمی کو ناحق قتل کر دیں تو اس ایک مقتول کے بدلے تمام قاتلین کو قتل کر دیا جائے گا:

"عن سعيد بن مسيب ان عمر بن الخطاب قتل نفرا خمسة او سبعة برجل واحد قتلوه قتل غيلة وقال عمر لوتمالأ عليه اهل صنعاء لقتلتهم جميعا" (رواه مالک وروى البخاري عن ابن عمر نحوه، مشكوة باب الديات)

حضرت سعید بن مسیب فرماتے ہیں کہ بیشک حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے پانچ یا سات آدمیوں کو قتل کرنے کا حکم دیا جنہوں نے مل کر ایک شخص کو دھوکے سے چھپ کر قتل کر دیا تھا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا اگر صنعاء کے تمام لوگ جمع ہو کر ایک شخص کے قتل میں ایک دوسرے کی امداد کرتے تو میں تمام کو قتل کرنے کا حکم نافذ کرتا۔

مسئلہ : اگر کوئی شخص مسلمانوں پر تلوار تان لیتا ہے یعنی ان کو قتل کرنے کی دھمکی دیتا ہے خواہ وہ شہر میں ہے یا باہر کہیں ہے دن ہو یا رات تو مسلمانوں کو حق پہنچتا ہے اسے قتل کر دیں اس شخص کے قتل میں نہ گناہ ہے اور نہ ہی قصاص ہے۔

ابونعیم نے بیان کیا ہے کہ تاریخ اصبہان میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے: "من شهر على المسلمين سيفا فقد اطل دمه" جس شخص نے مسلمانوں پر تلوار تان لی تحقیق اس نے

اپنا خون ضائع کر دیا۔

نسائی میں حضرت ابن زبیر رضی اللہ عنہ سے مرفوع حدیث مروی ہے: "من شهر سيفه ثم وضعه فدمه هدر" جس شخص نے تلوار تان لی پھر رکھ دی تو اس کا خون معاف ہے۔ (از هدایہ مع حاشیۃ)

مسئلہ: ایک شخص نے مسلمان یا ذمی کو زخمی کر دیا وہ ان زخموں سے ہی فوت ہو گیا تو یہ زخمی کرنے والا اب قاتل ہے اس کو اس شخص کے بدلے قتل کر دیا جائے گا۔ (از ہدایۃ)

مسئلہ: جس شخص پر قصاص لازم تھا وہ فوت ہو جائے تو قصاص ساقط ہو جائے گا اب اس کے ورثاء پر کسی قسم کی کوئی ضمان لازم نہیں۔ (از ہدایہ)

قصاص صرف تیز دھار آلہ سے لیا جائے:

جب کسی شخص کو قصاص کے طور پر قتل کرنا ہے تو صرف تلوار یا کسی ایسے آلہ سے قتل کیا جائے جس سے اسے زیادہ تکلیف نہ ہو۔

"عن ابی بكر عن النبی ﷺ لا قود الا بالسيف" (ابن ماجه)

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں نبی کریم ﷺ نے فرمایا قصاص نہیں سوائے تلوار کے۔

"والمراد به السلاح" نبی کریم ﷺ کے ارشاد گرامی میں تلوار سے مراد ہتھیار ہے۔ (از ہدایہ مع نقایۃ)

مفتی شجاعت علی قادری رحمہ اللہ کا فتوی راقم کی نظر سے گزرا جس میں آپ نے موجودہ طریقہ پھانسی دینے کو بھی جائز قرار دیا کہ اس میں ایسی تکلیف نہیں ہوتی جیسی ہڈی وغیرہ کے توڑنے سے ہوتی ہے ایک ہی جھٹکے سے انسان مر جاتا ہے۔

اعتراض: ایک حدیث شریف سے تو یہ سمجھ آتا ہے کہ جس طرح کوئی شخص دوسرے کو قتل کرے اسی طرح اس سے قصاص لیا جائے دونوں حدیثوں میں تطبیق کیسے ہوگی وہ حدیث شریف یہ ہے:

"عن انس ان يهودا رض رأس جارية بين حجرين فقيل له من فعل بک هذا افلان افلان حتى سمى اليهودی فاومت براسها فجئی باليهودی فاعترف وامر به رسول الله ﷺ فرض رأسه بالحجارة"

(بخاری ومسلم ،مشکوة کتاب القصاص)

حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں بیشک ایک یہودی نے ایک لڑکی کا سر دو پتھروں کے درمیان رکھ کر کوٹ دیا۔ (اس میں ابھی جان باقی تھی) اس سے پوچھا گیا تمہارے ساتھ یہ معاملہ کس نے کیا (کئی نام لئے گئے) کیا فلاں نے کیا؟ کیا فلاں نے کیا؟ یہاں تک کہ جب یہودی کا نام لیا گیا تو اس نے سر کے اشارے سے بتا دیا کہ ہاں اسی نے میرا سر کوٹ دیا ہے۔ یہودی کو لایا گیا اس نے اعتراف کر لیا رسول اللہ ﷺ نے حکم دیا اس کا سر بھی پتھر سے کوٹ دیا گیا۔

اس حدیث پاک سے واضح ہوا جس طرح کوئی قتل کرے اسی طرح اس کو قصاص میں قتل کیا جائے۔

پہلا جواب: نبی کریم ﷺ نے یہودی کا سر پتھر سے پھوڑنے کا جب حکم دیا اس وقت کفار سے سخت طریقہ سے نمٹنے کا حکم تھا" **وقد کان ذلک جائزا علی وجه المثلة کما سمل العرنیین ثم نسخ** "اس وقت مثلہ بنانا بھی جائز تھا کیونکہ عرینہ قبیلہ کے لوگوں کی آنکھیں نکالنے کا حکم بھی دیا گیا پھر مثلہ بنانا منسوخ کر دیا گیا۔

دوسرا جواب: حضرت انس رضی اللہ عنہ کی ایک روایت میں یہ ہے:

" **فامر به النبی ﷺ ان یرجم حتی قتل ، فذکر فی هذا الحدیث الرجم ولیس ذلک بقصاص عند الجمیع** "

کہ نبی کریم ﷺ نے حکم فرمایا کہ اس یہودی کو سنگسار کر دیا جائے یہاں تک کہ یہ قتل ہو جائے جب اس حدیث میں سنگسار کرنے کا حکم دیا گیا تو یہ بالاتفاق قصاص نہیں (اسی وجہ سے شیخ عبد الحق محدث دہلوی رحمہ اللہ نے لمعات میں ذکر فرمایا کہ یہ قتل قصاصا نہیں تھا بلکہ سیاسۃً تھا۔

تیسرا جواب: جب یہودی کو پتہ چلا کہ اب مجھے قتل کی وجہ سے قصاصا قتل کر دیا جائے گا کیونکہ یہ معاہد (ذمی) تھا۔ یہ مدینہ طیبہ بھاگ کر قریب ہی یہودیوں کے محلہ میں چلا گیا جو اس وقت دار حرب کے حکم میں تھا" **فاخذ بعد ذلک فقتله علی انه حربی ناقض للعهد** "بعد میں اسے پکڑ لیا گیا اور اسے پتھروں سے قتل کر دیا گیا اب قتل کرنے کی وجہ یہ تھی کہ یہ معاہدہ کو توڑ کر حربی بن چکا تھا۔

(از احکام القرآن للجصاص)

فَمَنْ عُفِیَ لَهٗ مِنْ اَخِیْهِ شَیْءٌ فَاتِّبَاعٌۢ بِالْمَعْرُوْفِ وَاَدَآءٌ اِلَیْهِ بِاِحْسَانٍ

تو وہ شخص معاف کر دیا گیا جسے اس کے بھائی کی طرف سے کچھ، تو پیچھا کیا جائے بھلائی سے، اور ادا

کرے اسے اچھے طریقہ سے۔

﴿ فَمَنْ عُفِیَ لَه' مِنْ اَخِیْهِ شَیْ ءٌ﴾

ان الفاظ مبارکہ کی زیادہ مفسرین کرام کے نزدیک تفسیر یہ ہے کہ

العفو الصفح وترک عقوبة المستحق عفی عنه ذنبه وعفی له ذنبه "(قاموس)

" عفو " کا معنی ہے درگزر کرنا اور جس سزا کا وہ مستحق ہے اسے چھوڑ دینا یعنی وہ سزا نہ دینا۔ " عفو " ذنب کی طرف بلاواسطہ متعدی ہے اور گناہ کرنے والے کی طرف " عن " سے متعدی ہونے کی صورت میں پڑھا جاتا ہے " عفی عنه ذنبه "اور " لام " کے واسطہ سے متعدی ہونے کی صورت میں پڑھا جاتا ہے " عفی له ذنبه "معنی دونوں صورتوں میں ایک ہی ہوتا ہے اس کے گناہ معاف کر دیئے گئے۔

" من " مبتداء ہے، یا شرطیہ ہے، یا موصولہ، مراد اس سے "قاتل" ہے اور ﴿ مِنْ اَخِیْهِ ﴾ میں "من " ابتدائیہ ہے اور ظرف لغو ہے متعلق ہے " عفی " کے اور " اخیه " میں " اخ " سے مراد مقتول کا ولی ہے اور "ضمیر" لوٹ رہی ہے " من " کی طرف اور " شئی " کی تنکیر تبعیض پر دلالت کر رہی ہے۔ اب مطلب یہ ہوگا کہ قاتل کو اس کے بھائی کی طرف سے کچھ معاف کر دیا گیا۔ مقتول کے جو وارث ہیں وہی قصاص کا مطالبہ کرنے کے حقدار ہیں تمام قصاص کا مطالبہ کریں تو قاتل کو قصاص کے طور پر قتل کر دیا جائے گا۔

لیکن یہ خیال کریں کہ قصاص کا فیصلہ صرف حکام یعنی قاضی کو کرنا ہوگا ان کے حکم سے قصاص لیا جائے گا۔ مقتول کے ورثاء مطالبہ کریں گے اور قاضی فیصلہ کرے گا پھر قصاص جاری ہوگا مقتول کے ورثاء قاضی کے فیصلہ کے بغیر اگر قاتل کو قتل کریں گے تو گنہگار ہوں گے۔ مقتول کے تمام ورثاء قاتل کو معاف کر دیں یا کچھ لوگ معاف کر دیں تو قاتل سے قصاص نہیں لیا جائے گا۔

تنبیه : ﴿ فَمَنْ عُفِیَ لَه' مِنْ اَخِیْهِ شَیْ ءٌ﴾ سے معاف کرنے کی دو صورتیں بیان کی گئیں ہیں
ایک تو یہ ہے مقتول کے تمام ورثاء قصاص معاف کر دیں اور مال بھی نہ لیں۔

دوسری صورت یہ ہے کہ اگرچہ وہ قصاص تو معاف کر رہے ہیں لیکن مال لے کر صلح کرنا چاہتے

ہیں تو اس صورت میں حکم یہ ہے:

" واذا اصطلح القاتل واولیاء القتیل علی مال سقط القصاص ووجب المال قلیلا کان او کثیرا "

کہ جب قاتل اور مقتول کے ورثاء مال پر صلح کرلیں تو قصاص ساقط ہو جائے گا مال کی کوئی حد نہیں دونوں فریق جس پر رضاء مند ہو جائیں خواہ قلیل مال ہو یا کثیر ﴿ فَمَنْ عُفِيَ ﴾ سے مطلقا معاف کرنا ثابت ہے یعنی بغیر مال لینے کے معاف کرنے کا بھی مقتول کے ولیوں کو حق حاصل ہے۔

﴿ فَاتِّبَاعٌ بِالْمَعْرُوفِ وَاَدَآءٌ اِلَيْهِ بِاِحْسَانٍ ﴾

سے ثابت ہو رہا ہے کہ قصاص معاف کرنے کی دوسری صورت یہ ہے کہ مال پر فریقین کی صلح ہو جائے۔

" ای فله اتباع ای فلولی القتیل اتباع المصالح بالمعروف ای مطالبة ببدل الصلح علی حسن معاملته "

یعنی معروف طریقہ سے اتباع کا مطلب یہ ہے کہ مقتول کے ولی کے لئے یہ ہے کہ جب ان کی قاتل سے مال پر صلح ہو جائے تو اس سے مطالبہ کرنے میں اس کا پیچھا کرنے میں اچھے طریقہ سے در پیش آئے۔ یعنی سختی سے مطالبہ نہ کرے بلکہ نرمی سے مطالبہ کرے:

" ﴿ وَاَدَآءٌ اِلَيْهِ بِاِحْسَانٍ ﴾ ای وعلی المصالح اداء الی ولی القتیل باحسان فی الاداء "

یعنی جب مال پر صلح ہو جائے تو قاتل کو بھی چاہئے کہ مقتول کے اولیاء (ورثاء) کو مال اچھی طرح ادا کر دے نہ اس میں کمی کرے اور نہ ہی تاخیر کرے کہ انہیں بار بار مطالبہ کرنا پڑے۔ (هدایة مع کفایة)

مقام توجہ: جب بعض ورثاء معاف کریں اور بعض معاف نہ کریں تو قصاص ساقط ہو جائے گا لیکن دیت مقرر ہوگی جن لوگوں نے معاف نہیں کیا ان کی کل دیت سے وراثت کے حساب سے جتنا مال ملنا ہوگا وہ دے دیا جائے گا۔ اور جنہوں نے معاف کر دیا ان کا جو حصہ ہوگا اس کا فائدہ قاتل کو ہوگا۔

(از هدایة)

مقرر دیت کیا ہے؟ ایک سو اونٹ، یا ایک ہزار دینار، یا دس ہزار درہم، ان میں سے جو چاہے لے۔

ایک ہزار دینار کا وزن: دینار سونے کا سکہ ہے ایک ہزار دینار کا وزن 375 تولے سونا ہے

دس ہزار درہم: درہم چاندی کا سکہ ہے دس درہم کا وزن 2625 تولے چاندی ہے۔

﴿مِنْ اَخِيْهِ﴾ سے ایک لطیف اشارہ: جو تفسیر بیان کی جارہی ہے اس کے مطابق مطلب یہ ہے کہ قاتل کو اس کے بھائی کی طرف سے معاف کر دیا جائے۔ بھائی کہہ کر مقتول کے ورثاء کو معاف کرنے کی ترغیب دی گئی کہ اگرچہ قاتل نے تمہارے رشتہ دار کو قتل کر کے سنگین جرم کا ارتکاب کیا ہے۔ جس کی وجہ سے انتقام کی آگ کا دلوں میں بھڑکنا قدرتی بات ہے لیکن یہ نفس کا تقاضا ہے کہ اسے قتل کر دیا جائے۔

اگر تم غور کرو تو یہ بات تمہیں سمجھ آجائے گی کہ وہ گنہگار تو ہے لیکن اس کا ایمان تو ضائع نہیں ہوا لہٰذا وہ ایمان کی وجہ سے دین کی وجہ سے تمہارا بھائی ہے بھائی کے لئے یہی بہتر ہے کہ اپنے بھائی کو معاف کر دے زیادہ بھلائی تو اس میں ہے کہ بغیر مال لینے کے معاف کر دو ہاں اگر یہ نہیں کر سکتے تو مال لے کر معاف کر دو یہ بھی تمہاری طرف سے قاتل پر احسان ہوگا۔ اگر تم یہ بھی نہیں کر سکتے تمہارے انتقام کی آگ بغیر بدلہ لینے کے ٹھنڈی نہیں ہوتی تو قاضی کے پاس مقدمہ لے جاؤ تاکہ وہ قصاص کا فیصلہ کر دے۔ قصاص کا حق دے کر تجاوز سے منع کر دیا گیا کہ کہیں ایک کے بدلے کئی کو قتل نہ کر دو قاتل غلام ہو تو آزاد کو قتل نہ کر دینا، اور اسی طرح قتل کرنے والی عورت ہو تم مذکر کو نہ قتل کر دینا اگر رب تعالیٰ کے حکم کو ٹھکراؤ گے اور حد سے تجاوز کرو گے تو دردناک عذاب میں مبتلا ہو جاؤ گے۔

﴿فَمَنْ عُفِيَ﴾ میں دوسرا احتمال: " من " سے مراد قاتل ہو " عفی " متضمن ہو " عافی " معاف کرنے والے کو وہ ہے مقتول کا ولی اور " اخ " سے مراد مقتول اور " شئی " سے مراد خون۔ اب معنی یہ ہوگا " **ان القاتل اذا عفا عنه ولی المقتول عن دم مقتوله** " بیشک قاتل کو جب مقتول کا ولی اپنے مقتول بھائی کا خون معاف کر دے تو قصاص ساقط ہو جائے گا بغیر مال کے معاف کرے یا مال سے معاف کرے۔ (از قرطبی)

ذٰلِكَ تَخْفِيْفٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَرَحْمَةٌ: یہ تخفیف ہے تمہارے رب کی طرف سے اور رحمت یعنی اہل توراۃ کے لئے قتل کے بعد صرف قتل تھا اور اہل انجیل کے لئے صرف معاف کرنا تھا لیکن نبی کریم ﷺ کی امت کے لئے تخفیف کر دی گئی اور رحمت کرتے ہوئے ان کے لئے حکم آسان کر دیا گیا

''فمن شاء قتل ومن شاء اخذ الدية ومن شاء عفا'' جوشخص چاہے قصاص لے جو چاہے معاف کردے جو چاہے مال لے لے۔

فَمَنِ اعۡتَدٰی بَعۡدَ ذٰلِکَ فَلَهٗ عَذَابٌ اَلِیۡمٌ :

جوشخص تجاوز کرے گا اس کے بعد تو اس کے لئے عذاب ہوگا دردناک۔

زمانہ جاہلت میں پہلے دیت طے کر کے صلح کر لیتے جب قاتل مطمئن ہو جاتا کہ اب مجھے قتل نہیں کیا جائے گا پھر موقع پا کر اسے قتل کر دیا جاتا۔ اس بری رسم کو ختم کرنے کے لئے رب تعالیٰ نے حکم فرمایا کہ جوشخص دیت طے کر کے پھر اللہ تعالیٰ کے حکم سے تجاوز کرتے ہوئے قتل بھی کرے گا اس کے لئے دردناک عذاب ہوگا۔ (ازقرطبی)

ضیاء القرآن کی ضیاء پاشیاں: اسلام سے پہلے عرب میں دستور تھا کہ اگر طاقتور قبیلے کا کوئی شخص قتل کر دیا جاتا تو وہ صرف قاتل کے قتل پر اکتفاء نہ کرتے بلکہ قاتل کے قبیلہ کے دس دس بیس بیس آدمی قتل کرنا اپنا حق سمجھتے اگر کسی آزاد کو غلام قتل کر دیتا تو غلام کے بدلے غیر قاتل آزاد کا سر قلم کیا جاتا اور اگر عورت قتل کرتی تو مرد قتل کیا جاتا اسی ظالمانہ اور غیر اسلام دستور پر صدیوں عمل ہوتا رہا اور عرب اپنی نسلی نخوت اور قبائلی برتری کی تسکین بے گناہوں کا خون بہا بہا کر کرتے رہے قرآن کریم نے اس دستور کو ایک قلم منسوخ کر دیا ور حکم دیا کہ مقتول کا قاتل ہی قصاص میں قتل کیا جائے گا خواہ وہ مرد ہو یا عورت آزاد ہو یا غلام۔

یہ رواج صرف عرب ہی میں نہ تھا بلکہ دوسری قوموں میں بھی تھا بلکہ آج تک یورپ کی حکمران قومیں بھی اس پر عمل پیرا رہی ہیں جنوبی افریقہ کے حبشی آسٹریلیا کے اصلی باشندے اور امریکہ کے ریڈ انڈین آج بھی اس پر شاہد ہیں یہ فخر اسلام کو ہی حاصل ہے کہ اس نے جھوٹے امتیازات کے بت مدت ہوئی پاش پاش کر دیئے اور انسانی مساوات کا صرف قانون ہی پیش نہیں کیا بلکہ عمل کر کے دکھا دیا۔
(ضیاء القرآن)

وَلَكُمْ فِي الْقِصَاصِ حَيٰوةٌ يّٰاُولِي الْاَلْبَابِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ

۱) ''اور خون کا بدلہ لینے میں تمہاری زندگی ہے اے عقل مندو کہ تم کہیں بچو''۔

۲) اور تمہارے لئے قصاص میں عظیم زندگی ہے اے عقل والو تا کہ تم بچ جاؤ''۔

جب پہلی آیۃ کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے قاتل کیلئے جو حکم بیان کیا ہے اسے اپنی رحمت قرار دیا ہے تو بظاہر اس میں وہم ہوتا ہے کہ عبد ضعیف کو قصاص کا حکم دینے میں رحمت باری تعالیٰ کیسے؟ جب کہ بظاہر تو اس میں شدت پائی جاتی ہے۔ اس آیۃ کریمہ میں قصاص کی حکمت بیان کی جا رہی ہے جب انسان کو قصاص کی حکمت کا پتہ چل جائے گا تو خود بخود سمجھ آ جائیگا کہ یہ اللہ تعالیٰ کی عظیم رحمت ہے۔ (از کبیر)

قصاص میں حکمت: جب قاتل کو یہ پتہ چل جائے کہ اگر میں نے قتل کیا تو مجھے اس کے بدلے میں قتل کیا جائے تو وہ یقیناً قتل کرنے سے رک جائے گا اس طرح دو جانوں کی حفاظت ہوگئی۔ جسے قتل کرنے کا ارادہ تھا جب قتل نہ کیا تو اسے حیات حاصل ہوگئی قاتل جب قتل سے رک گیا تو قصاص سے بچ گیا اسے زندگی حاصل ہوگی۔

﴿ حَيٰوةٌ ﴾ سے حیات عظیمہ کا ذکر: ﴿ حَيٰوةٌ ﴾ کو نکرہ ذکر کیا جس کی تنوین تعظیم پر دلالت کرتی ہے جس کا مطلب ہے اور تمہارے لئے قصاص میں عظیم زندگی ہے۔

حیات عظیمہ کیسے؟ اس لئے کہ زمانہ جاہلیت میں دستور یہ تھا کہ اگر ایک شخص قتل ہو جاتا تو دونوں فریقوں میں قتل عام شروع ہو جاتا جب قصاص مقرر کیا گیا تو یہ بری رسم یک لخت ختم ہوگئی کیونکہ اب ہر شخص کو معلوم ہو رہا تھا کہ جو قتل کرے گا اگر مقتول کے ورثاء نے مطالبہ کیا تو اسے اس کے بدلہ میں قتل کر دیا جائے گا۔ اس طرح قصاص کے قانون سے کئی لوگوں کی جانیں بچ گئیں یہی تو حیات عظیمہ ہے۔

آج کل اپنے معاشرہ کو دیکھیں اسلام قوانین پر فیصلے نہ ہونے کی وجہ سے اور حکام کے لئے علیحدہ قوانین پیسے والوں کے لئے علیحدہ قوانیں، غنڈوں کے لئے علیحدہ قوانین نے ہی تو قتل و غارت اور لوٹ مار کا بازار گرم کر رکھا ہے قانون کے شکنجے میں صرف غریب اور شریف آتا ہے۔

کاش کہ عدل و انصاف پر فیصلے ہوتے غریب اور امیر رعایا اور حکام کے لئے ایک جیسے قوانین

ہوتے اسلام کا نظام عدل قائم ہوتا اور قصاص کا قانون انصاف کے تقاضوں کے مطابق ہوتا تو قتل وغارت کا سلسلہ بند ہو جاتا۔

نظام قصاص سے لڑائی جھگڑے کی روک تھام:

قصاص کا لغوی معنی صرف بدلہ لینا ہے اور سورۃ مائدہ میں قصاص کے قانون کو عام کر کے جان کے بدلے جان اور آنکھ کے بدلے آنکھ اور ناک کے بدلے ناک اور کان کے بدلے کان اور دانت کے بدلے دانت اور زخمی کرنے پر بھی قصاص کو نافذ کر کے مطلقاً لڑائی جھگڑے کا دروازہ بند کر دیا۔ انگریز کے پجاری شرعی قوانین پر عمل کر کے تو دیکھیں پھر ان کی برکات اور ان پر مرتب ہونے والے کمالات کو دیکھیں۔ (ماخوذ از کبیر)

قصاص میں زندگی کی ایک اور وجہ:

"اتفق ائمة الفتوی علی انه لا یجوز لاحد ان یقتص من احد حقه دون السلطان"

اس پر فتویٰ دینے والے ائمہ کرام کا اتفاق ہے کہ کسی شخص کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ خود ہی قصاص لے بلکہ قصاص صرف بادشاہ اور اس کی طرف سے مقرر کیا ہوا قاضی (جج) دلا سکتا ہے۔ اس قانون سے بھی لوگوں کا قتل کے معاملہ میں حد سے تجاوز کرنا ختم ہوا جس نے قتل عام سے لوگوں کو بچا لیا جو حیات عظیمہ کا سبب بنا۔ (ماخوذ از قرطبی)

نبی کریم ﷺ کا اپنے آپ کو قصاص کے لئے پیش کرنا:

"عن ابی سعید الحذری قال بینا رسول الله ﷺ یقسم شیئا اذا کب علیه رجل فطعنه رسول الله ﷺ بعرجون کان معه فصاح الرجل فقال له رسول الله (تعال) فاستقد، قال بل عفوت یا رسول الله" (رواه النسائی)

حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں ایک مرتبہ رسول اللہ ﷺ ہمارے درمیان کچھ چیز تقسیم فرماتے ایک شخص آپ پر اوندھا گرا آپ کے پاس کھجور کی چھڑی تھی جس سے آپ نے اسے ضرب لگائی وہ شخص چلایا تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا (آؤ) بدلہ لے لو اس نے عرض کیا یا رسول اللہ میں آپ کو معاف کر رہا ہوں۔ اس شخص نے بدلہ بیشک نہیں لیا لیکن نبی کریم ﷺ کا اپنے آپ کو بدلہ کے

لئے پیش کرنا درحقیقت قانون کی حکمرانی کو ثابت کرنا تھا۔

" عن ابی فراس قال خطب عمر بن الخطاب رضی الله عنه فقال الا من ظلمه امیره فلیرفع ذلک الی اقیده منه فقام عمرو بن العاص فقال یا امیر المؤمنین لئن ادب رجل منا رجلا من اهل رعیته لتقصنه منه قال کیف لا اقصه منه وقد رأیت رسول الله ﷺ یقص من نفسه "

(رواہ ابو داؤد الطیالسی)

حضرت ابوفراس کہتے ہیں حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے خطبہ دیا تو آپ نے فرمایا خبردار جس شخص پر اس کے امیر (گورنر) نے ظلم کیا وہ معاملہ میرے پاس لایا گیا تو میں اس سے قصاص (بدلہ) لوں گا حضرت عمرو بن عاص کھڑے ہوئے عرض کرنے لگے اے امیر المؤمنین اگر کسی امیر نے کسی شخص کو ادب سکھانے کے لئے مار دیا تو پھر بھی آپ قصاص لیں گے؟ آپ نے فرمایا کیوں میں قصاص نہ لوں جب میں نے نبی کریم ﷺ کو دیکھا کہ آپ نے اپنے آپ کو قصاص کے لئے پیش کیا۔

(ماخوذ از قرطبی)

یٰٓاُولِی الْاَلْبَابِ : "اے عقل والو" اولوا الالباب سے مراد کامل عقل والے، کامل عقل والوں کو خطاب اس لئے کیا گیا کہ وہ عقل سے سوچیں اور سمجھیں کہ قصاص میں حیات عظیمہ ہے۔ (از بیضاوی)

لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ : "تاکہ تم بچ جاؤ" یعنی قصاص پر عمل کر کے قتل سے بچ جاؤ اور اللہ تعالیٰ کے حکم پر عمل کر کے گناہوں سے بچ جاؤ۔ یہی اسباب ہیں تقویٰ کے۔ (از بیضاوی)

مقام توجہ: اگرچہ قصاص کے ساتھ ساتھ معاف کرنے اور خون بہا لینے کا بھی اختیار دیا گیا لیکن انسانی فطرت کا تقاضا یہ ہے کہ وہ انتقام لے کر ہی اپنے غصہ کو ٹھنڈا کرتا ہے اسی لئے ذکر فرمایا ﴿وَلَكُمْ فِي الْقِصَاصِ حَيٰوةٌ﴾ اور تمہارے لئے قصاص میں عظیم زندگی ہے۔

علامہ رازی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ﴿يٰٓاُولِي الْاَلْبَابِ﴾ سے مراد وہ عقلاء ہیں جو عواقب کو پہچانتے ہیں اور وجوہ خوف کو جانتے ہیں جب وہ کسی دشمن کو قتل کرنے کا ارادہ کریں گے تو انہیں معلوم ہو جائیگا کہ ہم سے قصاص لیا جائیگا کوئی عقلمند انسان اپنی جان کو ہلاکت میں ڈال کر غیر کو قتل نہیں کرتا۔ جب اسے خوف دامن گیر ہوگا تو وہ یقیناً قتل سے رک جائیگا جو دونوں کیلئے زندگی کا سبب بنے گا اسی لئے رب تعالیٰ نے عقل والوں کو خطاب کیا۔ بے وقوف جہلا کو یہ نقطہ کیسے سمجھ آسکتا ہے۔ (ماخوذ از کبیر)

قرآن پاک کی فصاحت: رب تعالیٰ نے جس مضمون کو ﴿فِی الْقِصَاصِ حَیٰوۃٌ﴾ کو پیش کیا اسی مضمون کو عرب حضرات ان جملوں سے ادا کرتے " قتل البعض احیاء للجمیع " بعض کا قتل تمام کی زندگی ہے، اور کبھی کہتے " اکثروا القتل لیقل القتل " زیادہ قتل کرو تا کہ قتل میں کمی واقع ہو جائے۔ ان کے نزدیک زیادہ فصیح کلمہ یہ تھا " القتل انفی القتل " قتل نفی کرتا ہے قتل کی۔ لیکن غور کیا جائے تو رب تعالیٰ کے ارشاد ﴿فِی الْقِصَاصِ حَیٰوۃٌ﴾ کے مقابل القتل انفی للقتل " کو فصاحت میں کوئی حیثیت ہی حاصل نہیں آیئے ان دونوں میں چند وجہ سے فرق دیکھئے:

(۱) ﴿فِی الْقِصَاصِ حَیٰوۃٌ﴾ میں الفاظ کم ہیں مقاصد زیادہ کیونکہ یہ دس حروف ہیں اس لئے کہ تنوین مستقل حرف نہیں بلکہ دوسرے حرف کے تابع ہے۔ اور " القتل انفی للقتل " میں چودہ حروف ہیں اور وہ مقاصد بھی حاصل نہیں جو ﴿فِی الْقِصَاصِ حَیٰوۃٌ﴾ سے حاصل ہیں۔

(۲) ان دونوں جملوں میں اور فرق یہ ہے کہ ﴿فِی الْقِصَاصِ حَیٰوۃٌ﴾ میں اطراد پایا گیا ہے یعنی یہ ضابطہ لگا تار جاری ہے کیونکہ ہر قصاص میں عظیم زندگی حاصل ہے لیکن " القتل انفی للقتل " میں اطراد نہیں کیونکہ " فان القتل ظلما ادعی للقتل "ظلماً قتل زیادہ قتل کا سبب بنتا ہے قتل کو روکتا نہیں۔

(۳) ﴿فِی الْقِصَاصِ حَیٰوۃٌ﴾ میں تنوین عظمت پر دلالت کر رہی ہے کہ قصاص میں عظیم زندگی ہے لیکن یہ کمال " القتل انفی للقتل " میں نہیں کیونکہ اس میں مطلقاً ذکر ہے کہ قتل روکتا ہے قتل کو۔

(۴) ﴿فِی الْقِصَاصِ حَیٰوۃٌ﴾ میں صنعت طباق پائی گئی ہے کہ ضد سے ایک عظیم حکم ثابت کیا گیا ہے کیونکہ بظاہر قصاص زوال حیات پر دلالت کرتا ہے لیکن حقیقت میں حصول حیات عظیمہ کا ذریعہ ہے۔ اس صورت کا تصور تک " القتل انفی للقتل " میں نہیں پایا گیا۔

(۵) ﴿وَلَکُمْ فِی الْقِصَاصِ﴾ میں واضح طور پر بیان کیا گیا ہے کہ قصاص سے بالذات حیات حاصل ہوتی ہے یعنی قصاص بالذات حیات پر دلالت کر رہا ہے اور " القتل انفی للقتل " سے اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے واسطوں کی ضرورت ہے۔

(۶) ﴿وَلَکُمْ فِی الْقِصَاصِ﴾ میں ایک عجیب و غریب حکمت پہلے بیان ہوئی کہ اس میں ایک ضد سے دوسری ضد کا ثبوت پایا گیا۔ اور کمال یہ ہے کہ قانون یہ ہے کہ ظرف جب اپنے مظروف پر مشتمل

ہوتومظروف کے اجزاء کوبکھرنے سے بچالیتی ہے " **فکان القصاص فیما نحن فیه یحمی الحیاة من الآفات** " اس قانون کومدنظر رکھتے ہوئے زیر بحث الفاظ گرامی کا کمال خود بخود واضح ہو جاتا ہے کہ قصاص حیات کوآفات سے بچاتا ہے قصاص یا دیت وغیرہ لینے کے بعد رب تعالیٰ نے تجاوز سے منع فرما دیا اور تجاوز کرنے پر دردناک عذاب کا ذکر فرمایا۔لیکن یہ " **القتل انفی للقتل** "کوحاصل نہیں۔

(۷) وہ جملہ جوتکرار سے خالی ہواس میں مطالب کو سمجھنا قریب ہوتا ہےاور عربی کی روانگی میں خصوصی ذوق پایاجاتا ہے یہ کمال ﴿ وَلَكُمْ فِي الْقِصَاصِ حَيٰوةٌ ﴾ کوحاصل ہے۔لیکن " **القتل انفی للقتل** " میں تکرار ہے آخری کلمہ پہلے کلمہ پر مرتب ہے تکرار کی وجہ سے اس میں نہ ذوق ہے اور نہ ہی مطالب کو سمجھنا قریب ہے۔

(۸) " **القصاص** " میں الف لام جنسی ہے جوقتل اور مارنے اور زخمی کرنے کوشامل ہے یعنی قتل اور ماراور زخمی کرنے اور اعضاء کے کاٹنے میں بدلہ لیناعظیم زندگی کا سبب ہے جس میں جرائم کی روک تھام پائی جاتی ہے۔اور " **القتل انفی للقتل** " میں صرف قتل کوختم کرنا بھی لازم نہیں آتا مار یا زخمی کرنا یا اعضاء کوکاٹنے کی روک تھام اس جملہ سے سمجھ نہیں آئی۔

(۹) " **القتل انفی للقتل** " میں "انفی" افعل کاوزن ہے جس سے زیادتی کی نفی تو سمجھ آتی ہے لیکن اصل فعل کی نفی سمجھ نہیں آتی یعنی یہ سمجھ آتا ہے کہ قتل زیادہ قتل کوروکتا ہے لیکن یہ سمجھ نہیں آتا کہ قتل مطلقاً قتل کوروکتا ہے۔یہ کمال صرف ﴿ فِي الْقِصَاصِ حَيٰوةٌ ﴾ کوحاصل ہے۔

(۱۰) ﴿ فِي الْقِصَاصِ حَيٰوةٌ ﴾ سے پتہ چلتا ہے کہ قصاص سے دنیاوی زندگی حاصل ہوتی ہے کیونکہ قتل اور عظیم فتنہ وفساد کی روک تھام حاصل ہوتی ہے۔اور اخروی زندگی بھی حاصل ہوتی ہے کیونکہ جب مومن سے قصاص لیا جائے گا تو یقیناً وہ توبہ بھی کرلے گا جو اس کی نجات اور اخروی زندگی کے حصول کا سبب بنے گا۔لیکن یہ مقاصد " **القتل انفی للقتل** " سے حاصل نہیں ہوتے سب سے بڑی بات یہ ہے کہ انسانوں کے کلام کورب تعالیٰ کے کلام سے نسبت ہی کیا ہے۔

(ماخوذ از روح المعانی و کبیر)

﴿كُتِبَ عَلَيْكُمْ اِذَا حَضَرَ اَحَدَكُمُ الْمَوْتُ اِنْ تَرَكَ خَيْرَا نِ الْوَصِيَّةُ لِلْوَالِدَيْنِ وَالْاَقْرَبِيْنَ بِالْمَعْرُوْفِ حَقًّا عَلَى الْمُتَّقِيْنَ﴾

۱) ''تم پر فرض ہوا کہ جب تم میں کسی کو موت آئے اگر کچھ مال چھوڑے تو وصیت کر جائے اپنے ماں باپ اور قریب کے رشتہ داروں کے لئے موافق دستور یہ واجب ہے پرہیز گاروں پر''۔

۲) ''فرض کیا گیا تم پر جب حاضر ہو تم میں سے کسی ایک پر موت اگر چھوڑے کچھ مال تو وصیت کرے والدین اور قریبی رشتہ داروں کے لئے اچھی طرح ثابت ہے پرہیز گاروں پر''۔

شان نزول: آیۃ میراث جو سورۃ نساء میں ہے اس کے نازل ہونے سے پہلے جو شخص فوت ہونے کے قریب ہوتا اس پر لازم تھا کہ وہ اپنے والدین اور قریبی رشتہ داروں کیلئے عدل وانصاف سے وصیت کر جائے تاکہ ان کو مال ان کے رشتوں کے لحاظ سے مناسب مقدار میں مل جائے۔ پھر رب تعالیٰ نے وراثت کے حصہ داروں کا خود ہی حصہ مقرر فرما دیا جس کی وجہ سے وصیت کرنے کی فرضیت منسوخ ہوگئی خصوصاً ورثاء کے لئے وصیت کرنا منع قرار دے دیا گیا۔

حدیث پاک سے اس آیۃ کی منسوخیت: رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

'' ان اللہ قد اعطی کل ذی حق حقه ولا وصية لوارث ''

''بیشک اللہ تعالیٰ نے ہر صاحب حق کو (وراثت سے) حق دے دیا، وارث کے لئے کوئی وصیت نہیں''۔

اعتراض: یہ حدیث خبر واحد ہے خبر واحد سے قرآن پاک کی آیۃ کو منسوخ کرنا درست نہیں اس حدیث کے متعلق صرف یہ کہا جا سکتا ہے کہ اسے امت نے قبول کیا ہے " **والحديث من الآحاد تلقى الامة له بالقبول لا يلحقه بالمتواتر** " خبر واحد کو اگر امت قبول کرلے تو وہ خبر متواتر نہیں بن جاتی۔

نیز اس حدیث کو بخاری اور مسلم نے ذکر نہیں کیا ان کا نہ ذکر کرنا دلیل ہے اس پر کہ یہ حدیث قابل حجت نہیں اور آیۂ میراث میں صراحۃً منسوخیت کا ذکر ہی نہیں تو منسوخ کرنا کیسے صحیح ہے۔

(از بیضاوی)

پہلا جواب: آیۃ میراث میں ورثاء کے حصے مقرر کردیئے گئے اس سے اتنا پتہ چل گیا کہ اب مرنے والے کو حصے مقرر نہیں کرنے۔ حدیث پاک سے آیۃ میراث کو تائید مل گئی اور حدیث پاک ناسخ بن گئی جہاں تک یہ اعتراض ہے کہ حدیث خبر واحد ہے ناسخ نہیں بن سکتی اس کا جواب یہ ہے کہ یہ حدیث خبر واحد نہیں بلکہ مشہور ہے اگرچہ صحابہ کرام کے دور میں درجہ احاد میں ہے لیکن تابعین اور تبع تابعین کے دور میں اس کے راوی کثیر ہوگئے۔

" وان الاحناف یجوزون النسخ بالحدیث المشهور احد قسمی المتواتر عند ابی یوسف رحمه الله فیجوز نسخ الکتاب به "

یہ حدیث مشہور ہے اور مشہور حدیث قرآن پاک کے لئے ناسخ ہے کیونکہ امام ابو یوسف رحمہ اللہ کے نزدیک متواتر کی دو قسمیں ہیں یا اس کا تواتر صحابہ کرام کے زمانہ سے ثابت ہوگا یا تابعین اور تبع تابعین کے زمانہ میں تواتر ثابت ہوگا۔ یہی دوسری قسم متواتر کی وہ قسم ہے جس سے نسخ قرآن جائز ہے۔

(از شیخ زادہ)

دوسرا جواب: ہم کہتے ہیں کہ آیۃ میراث سے اتنا پتہ چل گیا کہ ورثاء کے حقوق رب تعالیٰ نے خود مقرر فرمادیئے ہیں قریب المرگ شخص کو ان کے لئے وصیت نہیں کرنا۔

حدیث پاک سے یہ ثابت ہوگیا کہ وارث کے لئے وصیت جائز نہیں۔ حدیث پاک سے ثابت ہونے پر اجماع امت ہوگیا کہ وراث کے لئے وصیت جائز نہیں۔ اجماع امت ناسخ ہے جیسا کہ مؤلفۃ قلوب کا حق زکوۃ میں اجماع امت سے منسوخ ہے۔

جہاں تک یہ کہنا ہے کہ بخاری اور مسلم نے اس حدیث کو نہیں ذکر کیا لہذا یہ حدیث قابل حجت نہیں۔ یہ قول معتبر ہی نہیں۔ حدیث کی سند کو دیکھنا مقصود ہوتا ہے یہ مقصود ہی نہیں کہ فلاں کتب میں آنا ضروری ہے آیئے اس حدیث کی اسناد اور کتب احادیث کو دیکھیں کہ یہ حدیث کس درجہ کی ہے۔

" ونور دهمنا احادیث یصلح ان یکون سندا للاجماع منها حدیث ابی امامة الباهلی قال سمعت رسول الله ﷺ یقول فی خطبة حجة الوداع ان الله قد اعطی کل ذی حق حقه فلا وصیة لوارث "

(رواه ابو داؤد والترمذی والنسائی وابن ماجه وقال الحافظ حسن الاسناد)

ہم چند احادیث ذکر کرتے ہیں جو اجماع امت کے لئے سند ہیں ان احادیث میں ایک حدیث ابوامامۃ باہلی نے روایت کی ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو حجۃ الوداع میں ارشاد فرماتے ہوئے سنا کہ بیشک اللہ تعالیٰ نے ہر صاحب حق کو (وراثت میں) حق دے دیا ہے تو وارث کے لئے کوئی وصیت نہیں۔ اس حدیث کو ابوداؤد اور ترمذی اور نسائی اور ابن ماجہ نے بیان کیا ہے یہ حدیث سند کے لحاظ پر حسن ہے:

" وکذا رواہ احمد والترمذی والنسائی وابن ماجہ من حدیث عمرو بن خارجہ "

اسی طرح یہ حدیث احمد اور ترمذی اور نسائی اور ابن ماجہ نے عمرو بن خارجہ رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے " ورواہ ابن ماجہ من حدیث سعید بن سعید عن انس " اور یہی حدیث ابن ماجہ نے سعید بن سعید کی روایت حضرت انس رضی اللہ عنہ سے بھی ذکر فرمائی ہے:

" والبیھقی من طریق الشافعی عن ابن عینیۃ عن سلیمان الا حول عن مجاھد ان رسول اللہ ﷺ قال لا وصیۃ لوارث "

بیہقی نے امام شافعی رحمہ اللہ سے انہوں نے ابن عینیہ سے انہوں نے سلیمان احوال سے انہوں نے مجاہد سے روایت ذکر کی ہے بیشک رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "وارث کیلئے وصیت نہیں"۔

(ماخوذ از مظہری)

یہاں تک جو بحث ذکر کی ہے اس سے پتہ چل گیا کہ والدین کے لئے اور قریبی رشتہ داروں کے لئے وصیت کرنا فرض تھا جو منسوخ ہو گیا۔

اب اعلیٰ حضرت کا ترجمہ بلا غبار سمجھ آئے گا کیونکہ آپ نے "خیرا" کا ترجمہ کیا ہے "کچھ مال" اور "حقا" کا ترجمہ کیا ہے "واجب" اس لئے کہ جب وصیت فرض تھی اس وقت جتنا مال بھی ہوتا اس میں وصیت فرض تھی اس میں قلیل وکثیر کی کوئی حد نہیں تھی۔

كُتِبَ عَلَيْكُمْ اِذَا حَضَرَ اَحَدَكُمُ الْمَوْتُ :

﴿ اِذَا حَضَرَ ﴾ سے مراد موت کے آثار جب ظاہر ہوں۔

اِنْ تَرَكَ خَيْرَ نِ الْوَصِيَّةُ : ﴿ خَيْرًا ﴾ سے مراد مال ہے جیسا کہ ﴿ قُلْ مَا اَنْفَقْتُمْ مِنْ خَيْرٍ ﴾ سے مراد مال ہے ﴿ وَاِنَّهٗ لِحُبِّ الْخَيْرِ لَشَدِيْدٌ ﴾ میں بھی خیر سے مراد مال ہے۔

لِلْوَالِدَیْنِ وَالْاَقْرَبِیْنَ بِالْمَعْرُوْفِ : ﴿ اَقْرَبِیْنَ ﴾ سے مراد قریبی رشتہ دار ہیں بالمعروف سے مراد عدل وانصاف سے اسی لئے اعلیٰ حضرت نے ترجمہ کیا ہے موافق دستور۔

راقم نے ظاہری معنی کر دیا ہے اچھے طریقہ سے یعنی شرعا جو اچھا طریقہ ہوگا اس میں یقیناً عدل وانصاف ہوتا ہی ہے۔ مفہوم کافی حد تک واضح ہوگیا کہ تم پر وصیت کرنا فرض قرار دے دیا گیا ہے جب تم پر آثار موت ظاہر ہوں وہ وصیت اس وقت فرض ہوگی جب تمہارا مال پیچھے رہ رہا ہوگا۔ اور وہ وصیت والدین اور قریبی رشتہ داروں کے لئے ہے۔

حَقًّا عَلَی الْمُتَّقِیْنَ : اعلیٰ حضرت نے ﴿ حَقًّا ﴾ کا معنی ''واجب'' کیا ہے اور راقم نے لغوی معنی کیا ہے ''ثابت'' بظاہر وہم ہوتا ہے کہ یہ حکم عام ہے صرف متقین کے ساتھ خاص نہیں تو متقین کا ذکر کیسے صحیح ہے؟ تو اس کا ایک جواب یہ دیا گیا ہے ﴿ والمراد بالمتقین المؤمنون ﴾ متقین سے مراد مومنین ہیں۔ یعنی ذکر خاص اور مراد عام ہے البتہ متقین ذکر کر کے اس طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ ہر مومن کو چاہئے کہ وہ تقوی اختیار کرے۔

دوسرا جواب یہ ہے کہ اگر چہ حکم عام ہے لیکن متقین کا ذکر کر کے یہ بتایا گیا ہے:

" ان المحافظة علی الوصیة والقیام بها من شعائر المتقین الخائفین من اللہ تعالیٰ "

کہ وصیت پر عمل کرنا اور اس کے حقوق کی حفاظت کرنا متقین کی علامت ہے یہ کام وہی کرتے ہیں جن کے دل میں اللہ تعالیٰ کا خوف ہو اور تقوی حاصل ہو۔ (ماخوذ از روح المعانی)

وہ وصیت جو منسوخ نہیں: مطلقا وصیت کرنا منسوخ نہیں بلکہ مستحب ہے البتہ اس کیلئے تین شرطیں ہیں:

(۱) وہ وصیت ورثا کے لئے نہ ہو۔ (۲) مال کثیر ہو۔ (۳) تیسرے حصہ مال سے زیادہ کی وصیت نہ ہو۔ ورثاء کے لئے وصیت کی ممانعت پہلے احادیث مبارکہ سے ثابت کی جا چکی ہے۔

کثیر مال میں وصیت کرے:

" عن عروة ان علیا کرم اللہ تعالیٰ وجهه دخل علی مولی له فی الموت وله سبعمائة درهم او ستمائة درهم فقال الا اوصی ؟ قال لا انما قال اللہ تعالیٰ (ان ترک خیرا) ولیس لک کثیر مال فدع مالک لورثتک " (رواہ البیهقی)

حضرت عروہ سے مروی ہے کہ بیشک حضرت علی رضی اللہ عنہ اپنے آزاد کردہ غلام کے پاس (عیادت) کے لئے تشریف لے گئے جب اس پر آثار موت واقع ہو رہے تھے اس کے پاس سات سو یا چھ سو درہم تھے اس نے پوچھا کیا میں وصیت نہ کر جاؤں؟ آپ نے فرمایا نہیں اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ﴿ اِنْ تَرَکَ خَیْرًا ﴾ جب کثیر مال ہو تو اسے " خیر " کہا جاتا ہے اور تمہارے پاس کثیر مال نہیں اس لئے تم وہ مال اپنے ورثاء کے لئے چھوڑ جاؤ۔

" عن عائشة رضي الله عنها ان رجلا قال لها اريد ان اوصى قالت كم مالك ؟ قال ثلاثة آلاف قالت كم عيالك ؟ قال اربعة قالت قال الله تعالىٰ (ان ترك خيرا) وهذا لشئي يسير فاتركه لعيالك فهو افضل "

(رواه ابن ابی شیبة)

حضرت عائشة رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ بیشک ایک شخص نے آپکی خدمت میں عرض کیا میں وصیت کرنا چاہتا ہوں آپ نے پوچھا تمہارا مال کتنا ہے؟ تو اس نے کہا تین ہزار درہم پھر آپ نے پوچھا تمہارے عیال کتنے ہیں؟ اس نے کہا چار افراد ہیں آپ نے فرمایا اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے ﴿ اِنْ تَرَکَ خَیْرَ ﴾ ''وہ تو کثیر مال مراد ہے'' اور تمہارا یہ مال تھوڑا ہے بہتر یہی ہے کہ تم اپنے عیال کیلئے چھوڑ دو۔

فائدہ : " والظاهر من هذا ان الكثرة غير مقدرة بمقدار بل تختلف باختلاف حال الرجل فانه بمقدار من المال يوصف رجل بالغنى ولا يوصف به غيره لكثرة العيال "

کتنا مال ہو جسے کثیر کہا جائے جس میں وصیت کرنا درست ہو؟ ظاہر یہ ہے کہ کثرت کے لئے مال کی کوئی حد مقرر نہیں بلکہ مال کو دیکھا جائے اور عیال کو دیکھا جائے اندازہ کرلیا جائے کہ اس مال سے فقراء وغیرہ کے لئے وصیت کرنے میں عیال جلدی ہی محتاج نہیں ہوں گے لوگوں سے ہاتھ نہیں پھیلائیں گے وہ مال کثیر ہے۔ ایک شخص کے عیال کم ہوں تو اس کے لئے جو مال کثیر ہوگا وہی دوسرے شخص کیلئے قلیل ہوگا جس کے عیال زیادہ ہوں گے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کے نزدیک کثرت کی حد:

عبد بن حمید نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی تقدیر کو بیان کیا ہے کہ وہ اس حد کے قائل تھے " من لم يترك ستين دينار الم يترك خيرا "جس شخص نے ساٹھ دینار نہیں چھوڑے

اس نے ""خیر"" "مال کثیر" نہیں چھوڑا۔ (ماخوذ از روح المعانی)

راقم کے نزدیک ممکن ہے کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول بھی کسی شخص کے حال کو دیکھ کر ہوا اس طرح حد مقرر نہ ہونے کا قول اتفاقی ہو۔ (واللہ اعلم بالصواب)

تنبیہ: اگر آیۃ کریمہ میں صرف وصیت کی فرضیت اور ورثاء کے لئے وصیت کرنے کو منسوخ مانا جائے تو حضرت علی رضی اللہ عنہ اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہما کے اقوال بغیر کسی تاویل کے صحیح رہیں گے کہ وصیت کرنا مستحب ہے وہ جب کہ کثیر مال ہو۔ (واللہ اعلم بالصواب)(راقم)

وصیت تہائی مال سے زیادہ نہ کرے:

"عن عامر بن سعد عن ابیه قال عادنی رسول الله ﷺ فی حجة الوداع من وجع اشفیت منه علی الموت قلت یا رسول الله بلغ بی ما تری من الوجع وانا ذومال ولا یرثنی الا ابنة لی واحدة افأ تصدق بثلثی ما لی قال لا قلت افاتصدق بشطره قال لا الثلث والثلث کثیر انک ان تذر ورثتک اغنیاء خیر من ان تذرهم عالة یتکففون الناس ولست تنفق نفقة تبتغی بها وجه الله الا اجرت بها حتی اللقمة تجعلها فی فی امرأتک قال قلت یا رسول اخلف بعد اصحابی قال انک لن تخلف فتعمل عملا تبتغی به وجه الله الا ازددت به درجة ورفعة ولعلک تخلف حتی ینفع بک اقوام ویضربک آخرون اللهم امض لا صحابی هجرتهم ولا ترد علی اعقابهم لکن البائس سعد بن خولة قال رثی له رسول الله ﷺ من ان توفی بمکة" (مسلم ج ۲ کتاب الوصیة)

حضرت عامر بن سعد نے اپنے باپ سے روایت کی وہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے حجۃ الوداع میں میری عیادت کی جب کہ میں درد کی وجہ سے موت کے کنارے پر پہنچا ہوا تھا۔ میں نے عرض کیا یا رسول اللہ مجھے جو درد تکلیف لاحق ہے وہ آپ دیکھ ہی رہے ہیں اور میں مالدار شخص ہوں اور میری بیٹی کے سوا میرا اور کوئی وارث نہیں کیا میں اپنے مال کے دو تہائی حصے صدقہ کر دوں؟ آپ فرمایا نہیں میں نے عرض کیا کیا میں نصف مال صدقہ کر دوں؟ آپ نے فرمایا نہیں (پھر آپ نے فرمایا) تہائی مال صدقہ کر دو، تہائی بہت ہے بیشک تمہارا ورثا کو غنی چھوڑ کر جانا اس سے بہتر ہے کہ تم ان کو حاجت مند چھوڑ

جاؤ وہ لوگوں کے سامنے ہاتھ پھیلاتے رہیں۔تم کوئی مال اللہ کی رضا حاصل کرنے کے لئے خرچ نہیں کروگے سوائے اس کے کہ اللہ تعالیٰ تمہیں اجر عطا فرمائے گا یہاں تک کہ تم اپنی زوجہ کے منہ میں جو لقمہ ڈالوگے (اس کا اجر وثواب بھی تمہیں حاصل ہوگا) میں نے کہا یا رسول اللہ کیا میں اپنے دوستوں کے پیچھے یہاں ہی رہ جاؤں گا؟ آپ نے فرمایا بیشک تم ہرگز پیچھے نہیں رہوگے بلکہ تم اللہ تعالیٰ کی رضاء کی خاطر عمل کروگے جس سے تمہارے درجات بلند ہوں گے اور تمہیں رفعت حاصل ہوگی (تم ابھی پیچھے رہوگے یعنی تم نے ابھی زندہ رہنا ہے) یہاں تک کہ تمہارے ذریعے بعض قوموں کو فائدہ ہوگا اور بعض دوسرے لوگوں کو تمہاری وجہ سے نقصان ہوگا۔(پھر حضور ﷺ نے دعا فرمائی) اے اللہ میرے اصحابہ کو ہجرت پر جاری رکھ (یعنی انہوں نے جہاں سے ہجرت کی وہاں ان کو موت نہ آئے) کہ وہ اپنے ایڑیوں پر نہ لوٹیں۔لیکن افسوس تو سعد بن خولہ پر ہے رسول اللہ ﷺ نے ان پر اظہار تعزیت کیا کہ ان کی وفات مکہ میں ہوگئی۔

وضاحت حدیث: اس حدیث پاک سے ایک مسئلہ یہ ثابت ہوا کہ مریض کی عیادت مستحب ہے۔ اور یہ ثابت ہوا کہ حاکم (امام) کے لئے بھی مریض کی عیادت کرنا ایسے ہی مستحب ہے جیسے کہ عام افراد کے لئے مستحب ہے۔" **اشفیت منه علی الموت** " یہ ماخوذ ہے " **شفا** " (**بفتح الشين**) سے جس کا معنی ہے کنارہ۔معنی یہ ہے کہ میں اس تکلیف کی وجہ سے موت کے کنارے پر تھا یعنی موت کے قریب تھا۔ابن قتیبہ کا قول یہ ہے کہ " **اشــفــی** " کسی تکلیف وغیرہ پریشان کن چیز کے کنارے پر ہونے کو کہا جاتا ہے۔کسی اچھی چیز کے لئے استعمال نہیں ہوتا۔اس لئے " **اشقــی عـلــی الجنة** " (میں جنت کے کنارے پر ہوں) نہیں کہا جائے گا" **الــوجــع** " کا اگرچہ معنی 'درد' ہے لیکن ابراہیم حربی کہتے ہیں " **الوجع اسم لكل مرض** " کہ ہر قسم کی بیماری کو " **وجع** " کہا جاتا ہے۔اور مسئلہ یہ سمجھ آیا کہ جائز ہے مریض اپنی مرض کا ذکر کرے مقاصد اس کے صحیح ہوں دوا حاصل کرنے کے لئے ذکر کرے یا کسی نیک آدمی سے دعا کرانا مقصود ہو یا وصیت کرنا مقصود ہو یا اپنے حال کے متعلق فتوی طلب کرنا مقصود ہو اس طرح کے اور نیک جائز مقاصد کے لئے مرض کا ذکر کرنا درست ہے۔

" **وانما يكره من ذلك ما كان على سبيل التسخط ونحوه فانه قادح في اجر مرضه** "

مکروہ اس وقت ہے کہ مرض کو اچھا نہ سمجھے ناراضگی کے طور پر دل تنگی کے طور پر ذکر کرے یہ عیب ہے مرض کے اجر وثواب میں کمی کا باعث ہے " **وانا ذو مال** " اگر چہ اس کا ظاہری معنی صرف صاحب مال ہوتا ہے لیکن عرف میں زیادہ مال کا مالک ہونا معتبر ہے اور ان الفاظ سے ہی یہ سمجھ آیا کہ " **هذا دليل على اباحة جمع المال** " یہ دلیل اس پر ہے کہ جائز طریقہ سے مال جمع کرنا جائز ہے۔ " **لا يرثني الا ابنة لي** " سوائے میری بیٹی کے میرا کوئی وارث نہیں۔

اعتراض: حضرت سعد کے ورثاء تو اور بھی تھے بلکہ حدیث کا روای ہی آپ کا بیٹا ہے تو یہ کہنا کیسے درست ہے کہ ان کا سوائے بیٹی کے کوئی اور وارث نہیں تھا؟

جواب: " **وقيل معناه لا يرثني من اصحاب الفروض** " بعض حضرات نے اس سوال کا جواب دیتے ہوئے یہ فرمایا کہ ان کا کہنا " میرا کوئی وارث نہیں سوائے بیٹی کے اس کا مطلب یہ ہوا کہ اصحاب فروض سے میرا کوئی وارث نہیں سوائے بیٹی کے۔

" **والثلث كثير** " نبی کریم ﷺ نے تہائی مال کی وصیت کی اجازت فرمائی۔ اور تہائی مال کو کثیر کہا۔ " **وفى هذا الحديث مراعاة العدل بين الورثة والوصية** " اس حدیث پاک سے ورثاء اور وصیت کے درمیان عدل کرنے کا حکم دیا گیا۔ علماء نے بیان کیا ہے کہ ورثا اگر غنی ہوں تو تہائی حصہ مال کی وصیت کرنا چاہتا ہے تو کر دے لیکن جب اس کے ورثا فقیر، حاجت مند ہوں تو تہائی حصہ سے کم کی وصیت کرے۔ ہاں اگر تمام ورثا متفق ہو کر اسے کل مال کی وصیت کرنے کی اجازت دے دیں تو اس کے لئے جائز ہے کل مال کی وصیت کر جائے۔ اور نبی کریم ﷺ کا یہ فرمانا کہ تمہارا ورثا کو غنی چھوڑ کر جانا بہتر ہے فقیر چھوڑ کر جانے سے کہ وہ لوگوں کے سامنے ہاتھ پھیلاتے رہیں اسی سے واضح ہوا:

" **وفى هذا الحديث على صلة الارحام والاحسان الى الاقارب والشفقة على الورثة وان صلة القريب الاقرب والاحسان اليه افضل من الابعد** "

اس حدیث میں صلہ رحمی کرنے اور قریبی رشتہ داروں پر احسان کرنے اور ورثا پر شفقت کرنے پر برانگیختہ کیا گیا ہے۔ اسی حدیث پاک سے یہ واضح ہوا کہ جتنا زیادہ رشتہ دار قریبی ہوگا اس کے ساتھ صلہ رحمی کرنا اور اس پر احسان کرنا دور والے رشتہ دار پر احسان کرنے سے افضل ہے۔

" واستدل به بعضهم علی ترجیح الغنی علی الفقیر "

بعض حضرات نے اسی حدیث پاک سے یہ ثابت کیا ہے کہ رشتہ دار غنی کو (نفلی) صدقہ دینا زیادہ بہتر ہے بنسبت اجنبی فقیر کے۔

طلباء کرام توجہ فرمائیں: " فی فی امرأتک " میں پہلا " فی " حرف جار ہے اور دوسرا " فی " اسماء ستہ مکبرہ سے ہے جس کی رفعی حالت میں " فو " اور نصبی حالت میں " فا " اور جری حالت میں " فی " پڑھا جاتا ہے جس کا معنی ہے " منہ " نبی کریم ﷺ نے فرمایا اللہ تعالیٰ کی رضاء کے لئے جو مال تم خرچ کرو گے اس میں تمہیں اجر حاصل ہوگا یہاں تک کہ تم اپنی زوجہ کے منہ میں لقمہ ڈالو (تو اس کا اجر بھی تمہیں ملے گا) اسی سے یہ سمجھ آ گیا کہ نیکی کی راہ کوئی بھی ہو اس میں مال خرچ کرنا باعث اجر وثواب ہوگا دارومدار نیت پر ہے:

" وفیه ان الانفاق علی العیال یثاب علیه اذا قصد به وجه الله تعالیٰ "

اور اسی حدیث سے یہ بھی سمجھ آ گیا کہ عیال پر مال خرچ کرنا اللہ تعالیٰ کی رضا کے لئے باعث ثواب ہے۔

فائدہ عظیمہ : " ان المباح اذا قصد به وجه الله تعالیٰ صار طاعة ویثاب علیه "

بیشک مباح کام جب اللہ تعالیٰ کی رضاء کے لئے کیا جائے تو وہ طاعت بن جاتا ہے اور اس پر ثواب حاصل ہوتا ہے۔

اس لئے کہ نبی کریم ﷺ نے زوجہ کے منہ میں اللہ تعالیٰ کی رضاء کے لئے لقمہ ڈالنا باعث ثواب قرار دیا حالانکہ انسان کو زوجہ سے دنیاوی تعلقات حاصل ہوتے ہیں اس سے خواہشات حاصل کرتا ہے اور زوجہ سے کھیل وغیرہ میں لذت حاصل ہوتی ہے یہ مباح کام ہیں۔ جب کہ زوجہ کے منہ میں لقمہ ڈالنے کی اصل وجوہ یہی ہیں لیکن نبی کریم ﷺ نے رب تعالیٰ کی رضاء کے لئے زوجہ کے منہ میں لقمہ ڈالنا باعث اجر وثواب قرار دیا۔

" ویتضمن ذلک ان الانسان اذا فعل شیاء اصله علی الا باحة وقصد به وجه الله تعالیٰ یثاب علیه "

یہ حدیث اس کو متضمن ہے (یہ مسئلہ اپنے اندر لئے ہوئے ہے) کہ بیشک انسان جب مباح کام کرے اور اس میں ارادہ اللہ تعالیٰ کی رضا کا کرے تو اسے ثواب حاصل ہوگا۔ اللہ تعالیٰ کی طاعت کے لئے اور تقویٰ حاصل کرنے کے لئے کھانا بھی باعث ثواب ہے اس غرض سے سونا کہ نیند کا غلبہ اور سستی ختم ہو جائے اور میں جاگ کر تازہ دم ہو کر عبادت چستی سے کر سکوں تو سونا بھی باعث ثواب ہے زوجہ سے اس لئے نفع حاصل کرنا کہ حرام کاری سے بچ جائے تو زوجہ سے منافع حاصل کرنا بھی اجر و ثواب کا باعث ہیں۔ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے "وفی بضع احدکم صدقة" تمہاری زوجہ کی بضع میں تمہارے لئے ثواب ہے۔ اس کا بھی یہی مطلب ہے جو ترجمہ سے واضح ہے۔

"اخلف بعد اصحابی قال انک لن تخلف فتعمل عملا تبتغی به وجه الله تعالیٰ الا ازددت به درجة ورفعة"

حضرت سعد کا یہ کہنا کیا میں اپنے ساتھیوں کے پیچھے رہ جاؤں گا اس سے مراد ان کا مکہ میں رہ جانے پر ڈر تھا اس کی چند وجوہ تھیں ایک وجہ یہ تھی وہ ڈر رہے تھے کہ میری موت مکہ کرمہ میں آ گئی تو کہیں میری ہجرت کے ثواب میں کمی نہ آ جائے کیونکہ دوسری روایت اس کی تائید بھی کرتی ہے اخلف عن ھجرتی کیا میں اپنی ہجرت سے پیچھے رہ جاؤں گا۔

دوسری وجہ یہ تھی کہ ڈر اس بات کا تھا کہ میں بیمار ہوں میں یہاں مکہ مکرمہ میں رہ جاؤں گا اور نبی کریم ﷺ اور صحابہ کرام تشریف لے جائیں گے یعنی اصل ان کے مکہ مکرمہ میں رہ جانے کے ڈر کی وجہ یہ تھی کہ میں آپ کے فراق کو کیسے برداشت کروں گا۔ "ولعلک تخلف حتی ینفع بک اقوام" نبی کریم ﷺ نے فرمایا تم تو ابھی باقی رہو گے تم سے کئی قومیں نفع حاصل کریں گی۔ یہ آپ کا معجزہ ہے کیونکہ حضرت سعد رضی اللہ عنہ فتح عراق تک زندہ رہے آپ کے ذریعے کئی قوموں نے دین اور دنیا میں نفع حاصل کیا۔

اسی حدیث سے یہ فائدہ حاصل ہوا کہ نیک اعمال کے لئے زیادہ عمر حاصل ہونا افضل ہے اسی طرح جس عمر میں اللہ تعالیٰ کی رضاء کی خاطر کام کئے جائیں وہ عمر بھی افضل ہے۔ اور نبی کریم ﷺ کا حضرت سعد کو یہ فرمانا کہ کئی لوگوں کو تم سے نقصان ہوگا آپ کا یہ ارشاد بھی واقع ہو کر رہا کیونکہ کئی کافران

کے ہاتھوں قید ہوئے کئی قتل ہوئے ،اسی طرح کافروں کی عورتوں کو انہوں نے قید کرلیا۔اور یہ بھی خیال رہے کہ حضرت سعد رضی اللہ عنہ کو عراق کا والی بنایا۔اسی دوران آپ کے ہاتھ پر کئی لوگ بیعت کر کے مسلمان ہوئے اور کافروں کو آپ کے ہاتھوں نقصان ہوا۔ (ماخوذ از نووی)

وصیت کی اہمیت: وصیت کرنا اگرچہ مستحب ہے عمل کرے تو ثواب ہے عمل نہ کرے تو گناہ نہیں تاہم نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے وصیت کو اہم قرار دیا:

" عن سالم عن ابیه انه سمع رسول الله ﷺ قال ما حق امرئ مسلم له شئی یوصی فیه یبیت ثلاث لیال الا و وصیته عنده مکتوبة قال عبد الله بن عمر ما مرت علی لیلة منذ سمعت رسول الله ﷺ قال ذلک الا وعندی وصیتی " (مسلم ج ۲ کتاب الوصیة)

حضرت سالم اپنے باپ سے روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا کہ کسی مسلمان کو حق نہیں پہنچتا کہ جس مال میں اس نے وصیت کرنی ہے تو تین راتیں اسی طرح گزار دے مگر یہ کہ اس کے وصیت لکھی ہوئی ہونی چاہئے۔حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں جب سے میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد سنا تو مجھ پر کوئی رات نہیں گزری مگر یہ کہ میرے پاس وصیت لکھی ہوئی موجود رہی۔

مستحب یہ ہے کہ وصیت جلدی لکھ دے اور اپنی صحت میں وصیت کر دے اور اس پر گواہ بنالے۔ ہر دن کے چھوٹے چھوٹے معاملات اور جزی جزی امور کے مطابق وصیت لکھنے کا حکم دینا وسعت سے زائد امر ہے " **تکلیف ما لا یطاق** " (یعنی جن کاموں کی طاقت نہ ہو ان کی تکلیف دینا) منع ہے۔ (از نووی)

وصیت کے متعلق کچھ مسائل: وصیت تہائی حصہ مال سے زائد جائز نہیں لیکن اگر تمام ورثا بالغ ہوں اور تمام ہی اجازت دے دیں تو تیسرے حصہ سے زائد وصیت بھی جائز ہے۔تیسرے حصہ سے زائد کی وصیت کی ممانعت ورثا کو نقصان پہنچانے کی وجہ سے ہے۔

" عن ابن عباس عن النبی ﷺ قال الاضرار فی الوصیة من الکبائر "

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا وصیت میں (ورثاء) کو

نقصان پہنچانا کبیرہ گناہ ہے۔ (دار قطنی)

"وقد جاء فی الحدیث الحیف فی الوصیة من اکبر الکبائر" (ابن مردویہ)

حدیث پاک میں ہے وصیت میں ظلم کرنا بہت بڑا گناہ ہے (وصیت میں ظلم کرنے کا یہی مطلب ہے کہ تیسرے حصہ سے زائد وصیت کرنا ورثاء پر ظلم ہے)۔

مسئلہ واضح ہو گیا کہ وصیت تیسرے حصہ زائد مال سے منع اس لئے ہے کہ ورثا کا نقصان نہ ہو جب تمام ورثا اجازت دے رہے ہوں اور بالغ ہوں تو یقیناً تہائی سے زائد کی وصیت جائز ہے کیونکہ اصحاب حقوق نے اپنے حق میں کمی کی اجازت دے دی۔ بلکہ ورثا کی اجازت سے کل مال کی وصیت کرنا بھی جائز ہے کیونکہ اپنا حق مکمل ختم کرنے کا بھی اختیار ہے۔

تنبیہ: ورثا کی اجازت اس شخص کی موت کے بعد قابل قبول ہے اس لئے کہ ان کو وراثت میں جب حق مل جائے گا تو وہ اپنے حق میں تصرف کر سکیں گے۔ لیکن اس شخص کی موت سے پہلے ان کو حق وراثت ہی نہیں ملا تو ان کی اجازت کا کوئی اعتبار نہیں۔ موت کے بعد وصیت کی اجازت دینے کا کیا مطلب؟ اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر کسی شخص نے کل مال کی وصیت کر دی تھی یا تہائی حصہ سے زائد کی پھر وہ فوت ہو گیا اس کی وفات کے بعد تمام ورثاء نے اجازت دے دی کہ وہ جو وصیت کر گیا ہے ہمیں اس پر کوئی اعتراض نہیں تو وہ وصیت جاری ہو جائے گی اگر ورثا نے اجازت نہ دی تو وہ وصیت رد ہو جائے گی۔

(ماخوذ از هداية مع عناية)

مسئلہ: وارث کیلئے وصیت کرنا جائز نہیں لیکن اگر کوئی شخص کسی وارث کیلئے وصیت کر کے فوت ہو گیا اسکی وفات کے بعد اس کے ورثاء اجازت دے دیں تو وصیت جائز ہو گی اس وارث کو وصیت کے مطابق مال حاصل ہو جائے گا لیکن اگر ورثاء نے اجازت نہ دی تو وہ وصیت رد ہو جائیگی۔ (ماخوذ از ہدایہ)

مسئلہ: مسلمان ذمی کے لئے وصیت کرے یا ذمی مسلمان کے لئے وصیت کرے جائز ہے جس طرح زندگی میں نفلی صدقات دینا جائز ہے اسی طرح موت کے بعد جاری کرنا بھی جائز ہے۔ لیکن جواز اور اولویت (بہتری) میں فرق ذہن میں رہے اگر چہ جائز ہے لیکن ثواب حاصل نہیں ہونا ثواب اسی وقت حاصل ہو گا جب مسلمان کے لئے وصیت کرے یا کسی اور کار خیر کے لئے وصیت کرے۔ اسی سے

یہ بھی واضح ہو گیا کہ وصیت اور وراثت کے احکام میں فرق ہے۔ وصیت ذمی کفار کے لئے جائز ہے وراثت جائز نہیں کیونکہ کافر مسلمان کا یا مسلمان کافر کا وارث نہیں بن سکتا۔ (ماخوذ از ھدایہ مع عنایۃ)

مسئلہ : تہائی حصہ تک وصیت جائز ہے لیکن تہائی حصہ سے کم وصیت کرنا بہتر ہے:

" روی عن ابی بکر وعمر انهما قالا لان یوصی بالخمس احب الینا من یوصی بالربع ولان یوصی بالربع احب الینا من ان یوصی بالثلث "

حضرت ابوبکر اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ مال کے پانچویں حصہ کی وصیت کرنا ہمارے نزدیک محبوب ہے بنسبت چوتھے حصہ مال کی وصیت کرنے سے اور تہائی حصہ کی وصیت کرنے سے ہمیں زیادہ پسند یہ ہے کہ چوتھے حصہ کی وصیت کرے۔ (کفایہ باب الایصاء)

مسئلہ : اگر کوئی شخص کسی کو جان بوجھ کر یا خطاء کے طور پر زخمی کر دے وہ زخمی ہونے والا اسی شخص کے حق میں مال کی وصیت کر دے جس نے اسے زخمی کیا پھر ان زخموں سے ہی وہ مرجائے تو یہ وصیت جائز نہیں بلکہ رد ہو جائے گی " عن علی ابن ابی طالب قال قال رسول اللہ ﷺ لیس لقاتل وصیة " حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا قاتل کے لئے وصیت نہیں۔ (از ہدایہ مع حاشیۃ)

مسئلہ : جس شخص کے حق میں وصیت کی گئی وصیت کرنیوالے کی وفات کے بعد اسے قبول کرنے اور رد کرنے کا حق حاصل ہوتا ہے جب تک قبول نہ کرے وہ مالک نہیں بنے گا ہاں ایک صورت میں اسے ملکیت حاصل ہو گی وہ یہ ہے کہ وصیت کرنیوالا فوت ہو جائے اور جس کے حق میں وصیت کی گئی وہ بھی اسکے پیچھے وصیت رد کرنے سے پہلے فوت ہو جائے تو وہ وصیت والے مال کا مالک ہو کر فوت ہوا۔ (از ہدایۃ)

مسئلہ : کسی آدمی نے اپنے مال کی وصیت کر دی لیکن اس پر قرض اتنا ہے کہ تمام مال قرض کی ادائیگی میں خرچ ہو جاتا ہے تو اس صورت میں اس کا وصیت کرنا باطل ہو جاتا ہے۔ (از ہدایۃ)

مسئلہ : نابالغ بچے کا اپنے مال کی وصیت کرنا جائز نہیں۔ (ھدایۃ)

مسئلہ : مرنے والے شخص کے مال سے پہلے اس کی تجہیز و تکفین پر مال خرچ ہو گا پھر اس کا قرض اتارا جائے۔ پھر جو مال بچ جائے اس کے تہائی حصہ سے اس کی وصیت پر عمل کرے پھر باقی مال ورثا پر تقسیم کر دیا جائے۔ (سراجی)

﴿ فَمَنۢ بَدَّلَهٗ بَعْدَ مَا سَمِعَهٗ فَاِنَّمَآ اِثْمُهٗ عَلَى الَّذِيْنَ يُبَدِّلُوْنَهٗ اِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴾

۱) ''تو جو وصیت کو سن سنا کر بدل دے اسکا گناہ انہیں بدلنے والوں پر ہے بیشک اللہ سنتا جانتا ہے''۔

۲) ''تو جس شخص نے بدل دیا اسے بعد اس کے کہ اس نے سن لیا بیشک اس کا گناہ ان لوگوں پر ہے جنہوں نے اسے بدل دیا بیشک اللہ سننے والا جاننے والا ہے''۔

جن لوگوں کو کہا گیا تھا کہ تم وصیت جاری کرو وہ لوگ ہی وصیت کو بدل دیں یا گواہ وصیت کو بدل دیں تو اس کا گناہ وصیت کے بدلنے والوں پر ہوگا۔ خواہ انہوں نے وصیت کرنے والے سے خود سنا تھا یا اس کا پیغام کسی نے بمع گواہوں کے پہنچایا۔ اس کے بعد وصیت کو بدلنا حق کو بدلنا ہے جو گناہوں کا سبب ہے بیشک اللہ تعالیٰ سننے والا جاننے والا ہے اس لئے اس کے عذاب سے کوئی بچ نہیں سکے گا۔

فَمَنۢ بَدَّلَهٗ بَعْدَ مَا سَمِعَهٗ : ضمیر منصوب بدلہ کی اور سمعہ کی وصیت کی طرف لوٹ رہی ہے وصیت کو ایصاء کے معنی میں لے کر یا اس سے مراد حکم لے کر ضمیر لوٹائی تا کہ یہ وہم نہ ہو کہ ضمیر مذکر کی وصیۃ مؤنث کی طرف کیسے لوٹائی گئی ہے۔ تبدیل کرنے والا کون ہے؟ یا تو وہ شخص جس کو وصیت جاری کرنے کا حکم دیا گیا ہے وہ مراد ہے کہ وہ لکھنے میں یا حقوق کے تقسیم کرنے میں تبدیلی کر دے۔ یا مراد گواہ ہیں کہ وہ گواہی جو دینی تھی اسے تبدیل کر کے گواہی دے دیں یا وہ گواہی چھپا کر تبدیل کر دیں یا اس سے مراد عام لوگ ہیں کہ وہ حقدار تک وصیت نہ پہنچنے دیں اس طرح وہ وصیت کو تبدیل کر دیں ﴿ بعد ما سمعه ﴾ سے مراد عام ہے کہ براہ راست سنیں یا بالواسطہ سنیں۔

فَاِنَّمَآ اِثْمُهٗ عَلَى الَّذِيْنَ يُبَدِّلُوْنَهٗ گناہ صرف ان لوگوں کو ہی ہوگا جو اس وصیت کو تبدیل کریں گے گواہوں وغیرہ میں سے جو لوگ تبدیل کرنے سے باز رہے وہ اس وعید سے بھی پاک ہیں۔

اِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ : بیشک اللہ سننے والا جاننے والا ہے۔

یعنی تبدیل کرنے والوں اور وصیت کرنیوالوں کے اقوال کو سنتا ہے اور ان کی نیات کو جانتا ہے۔

یہ الفاظ مبارکہ وصیت کرنے والوں اور وصیت کو جاری کرنے والوں اور گواہوں کے لئے وعید

بھی ہیں اور وعد بھی ہیں اگر ان میں ہر شخص نے اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق عمل کیا تو ان کیلئے اجر وثواب ہے یہ وعد ہے اور ان میں سے اگر کسی شخص نے رب تعالیٰ کے حکم سے عدولی کی تو وہ رب تعالیٰ کی گرفت میں آئے گا یہ وعید ہے۔ (راقم)

وصیت کرنے والوں کو حق میں وعد ہے کہ جب وہ صحیح وصیت کر کے فوت ہوں تو پھر وصیت جاری کرنے والے اور گواہ اس وصیت کو تبدیل کر دیں تو ان کے حق میں وعید ہے۔

فائدہ : اس آیۃ میں جب یہ ذکر ہوا کہ گناہ صرف تبدیل کرنے والے کو ہوگا جس کی وصیت کو تبدیل کیا گیا اسے کسی قسم کا کوئی مؤاخذہ نہیں ہوگا۔ اسی سے یہ فائدہ حاصل ہوا کہ بچے کو اس کے ماں باپ کے کفر کی وجہ سے عذاب نہیں ہوگا۔ کافروں کے بچے مقام اعراف میں ہوں گے یا جنت میں ہوں گے اس میں اہل علم کے مختلف اقوال ہیں تاہم اتنی بات واضح اور راجح ہے کہ ان کو جہنم میں عذاب نہیں دیا جائیگا۔

اور یہ فائدہ حاصل ہوا کہ کسی شخص نے اپنے ورثا کو بتا دیا کہ مجھ پر اتنا قرض ہے وہ ادا کر دینا پھر اس کے مال سے ورثا نے قرض ادا نہ کیا تو کوتاہی کی وجہ سے گناہ ان کے ذمہ ہوگا مرنے والے پر کوئی گناہ نہیں کیونکہ وہ اتنا مال چھوڑ کر گیا کہ اس کا قرض ادا ہو سکتا تھا اور وصیت بھی اس نے کر دی تھی کہ میرا قرض ادا کر دینا۔

اور یہ فائدہ حاصل ہوا کہ کسی کے رونے پیٹنے سے میت کو عذاب نہیں ہوگا عقل کا بھی یہی تقاضا ہے کہ روئے پیٹے کوئی اور عذاب کسی اور کو ہو ایسا نہیں ہوگا۔ (از کبیر)

اعتراض : علامہ رازی رحمہ اللہ نے کیسے بیان کیا ہے **" ان المیت لا یعذب ببکاء غیرہ علیہ "** کہ بیشک میت کو دوسرے لوگوں کے رونے (چلانے، پیٹنے) سے عذاب نہیں ہوگا۔ حالانکہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے " ان المیت یعذب ببکاء اھلہ علیہ " بیشک میت کو اسکے اہل کے رونے سے عذاب دیا جاتا ہے۔

جواب : زمانہ جاہلیت میں رواج تھا مرنے والا وصیت کر جاتا تھا کہ میرے مرنے کے بعد نوحہ کرنے والی عورتوں کو بلانا جو مجھ پر بین کر کے روئیں اس رونے سے میت کو عذاب دیا جائے گا۔ اور عذاب سے مراد مطلقاً تکلیف بھی ہو سکتی ہے کہ میت در حقیقت پھر سے زندگی سے متصف ہو جاتا ہے جیسا زندہ شخص کو رونے چلانے سے تکلیف ہوتی ہے ایسے ہی میت کو بھی تکلیف ہوتی ہے اس سے مراد حقیقی عذاب نہ ہو واضح ہوا کہ حدیث پاک اور علامہ رازی رحمہ اللہ کے قول میں کوئی تعارض نہیں۔ (ماخوذ از مرقاۃ، نووی)

﴿ فَمَنْ خَافَ مِنْ مُّوْصٍ جَنَفًا اَوْ اِثْمًا فَاَصْلَحَ بَيْنَهُمْ فَلَا اِثْمَ عَلَيْهِ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴾

۱) ''پھر جسے اندیشہ ہوا کہ وصیت کرنے والے نے کچھ بے انصافی یا گناہ کیا تو اس نے اس میں صلح کرادی اس پر کچھ گناہ نہیں بیشک اللہ بخشنے والا مہربان ہے''۔

۲) ''پھر جو شخص خوف رکھے وصیت کرنے والے سے بے انصافی یا گناہ کی تو اس نے صلح کرادی تو اس پر کوئی گناہ نہیں بیشک اللہ بخشنے والا مہربان ہے''۔

اس سے پہلی آیۃ کریمہ میں وصیت بدلنے والے کے لئے رب تعالٰی کی طرف سے وعید پائی گئی ہے لیکن وہ تبدیلی حق سے باطل کی طرف تھی اب اس آیۃ کریمہ میں وصیت کو باطل سے حق کی طرف بدلنے کی اجازت دی گئی ہے کیونکہ اصلاح کی غرض سے بدلنا مستحسن (اچھا) ہے۔ اصلاح خود ہی تبدیلی اور تغیر کا تقاضا کرتی ہے اسی وجہ سے اللہ تعالٰی نے اس تبدیلی (یعنی جو اصلاح کی غرض سے ہو) اور پہلی تبدیلی (جو باطل طریقہ سے ہو) میں فرق بیان فرمایا کہ کوئی شخص جہالت کی وجہ سے دونوں کا حکم ایک نہ سمجھ لے بلکہ حق سے باطل کی طرف تبدیلی باعث گناہ ہے اور باطل سے حق کی طرف تبدیلی میں کوئی گناہ نہیں بلکہ ثواب ہے۔ (از کبیر)

'' قال مجاهد معناه ان الرجل اذا حضر مريضا وهو يوصى فرآه يميل عن الحق فامره بمعروف ونهاه عن منكر ''

حضرت مجاہد کہتے ہیں آیۃ کریمہ کا مطلب یہ ہے کہ جب کوئی شخص کسی مریض کے پاس حاضر ہو وہ مریض وصیت کررہا ہو یہ شخص دیکھے کہ مریض وصیت کرنے میں حق راہ سے اعراض کررہا ہے تو یہ اس کو اچھے کاموں کا حکم دے اور برے کاموں سے روکے۔ کیونکہ نبی کریم ﷺ نے حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کو تہائی حصہ مال سے زائد کی وصیت سے منع فرمایا اسی طرح حضرت عائشہ صدیقہ اور حضرت علی رضی اللہ عنہما نے مال کے کم ہونے کی وجہ سے مطلقاً وصیت کرنے سے ہی منع فرمایا۔

(از مظہری)

ایک اور روایت ملاحظہ فرمائیں:

" عن النعمان بن بشیر ان اباه اتی به الی رسول الله ﷺ فقال انی نحلت ابنی هذا غلاما فقال اکل ولدک نحلت مثله قال لا قال فارجعه "

نعمان بن بشیر فرماتے ہیں بیشک ان کے باپ ان کو رسول اللہ ﷺ کے پاس لائے تو کہا کہ بیشک میں نے اپنے اس بیٹے کو غلام بطور عطیہ دے دیا۔ تو آپ نے فرمایا کیا آپ نے اپنی تمام اولاد کو اسی طرح عطیہ دیا ہے؟ صحابی نے عرض کیا نہیں یا رسول اللہ تو آپ نے فرمایا کہ یہ عطیہ لوٹا لو۔ ایک روایت میں ہے کہ نعمان کی والدہ نے کہا تھا کہ میرے اس بیٹے کو خصوصی طور پر عطیہ دو اس عطیہ پر رسول اللہ ﷺ کو گواہ بنالو جب وہ اپنے بیٹے کو نبی کریم ﷺ کی خدمت میں لائے تا کہ اس پر آپ کو گواہ بنائیں تو آپ نے فرمایا " لا اشهد علی جور " میں ظلم پر گواہ نہیں بنتا۔ (از مظہری و مسلم ج ۲ کتاب الوصیۃ)

فَمَنْ خَافَ مِنْ مُّوْصٍ جَنَفًا اَوْ اِثْمًا :

''پھر جو شخص خوف رکھے وصیت کرنے والے سے بے انصافی یا گناہ کی''

الجنف : " المیل فی الامور " امور میں میلان کرنے کو 'جنف' کہا جاتا ہے " واصله العدول عن الاستواء " اصل میں برابری سے عدول کرنا ہے اسی معنی کے لحاظ سے اعلیٰ حضرت نے ترجمہ کیا ہے ''بے انصافی'' راقم نے بھی وہی نقل کیا ہے۔ " جنف یجنف " باب علم یعلم کے وزن پر ہے '' تنجانف " بھی میلان کرنے کو کہا جاتا ہے رب تعالیٰ نے فرمایا ﴿ غَیْرَ مُتَجَانِفٍ لِّاِثْمٍ ﴾ سوائے گناہوں کی طرف میلان کرنے کے۔

جنفاً اور اثماً میں فرق: "ان الجنف هو الخطأ من حيث لا يعلم به والاثم هو العمد "

اگر بے علمی سے بے انصافی ہو جائے خطا کے طور پر حق سے میلان ہو جائے تو اسے ''جنف " کہا جاتا ہے اور ارادہ سے گناہ کرنے کو اثم کہا جاتا ہے۔

فَمَنْ خَافَ : کے معنی میں دو قول ہیں ایک یہ ہے کہ اس کا معنی ہے " فمن علم " جو شخص جان لے (یعنی اس کے علم میں آ جائے) خوف اور خشیۃ دونوں علم کے معنی میں استعمال ہوتے ہیں یعنی خوف سے مراد خاص حالت ہے جو خاص گمان سے حاصل ہوتی ہے یعنی آنے والے حضرات سے خوف زدہ

ہونے کا گمان ہی خوف کہلاتا ہے۔ پھر گمان بمعنی علم اور علم بمعنی ظن کے استعمال ہوتا رہتا ہے کیونکہ ظن اور علم کئی امور میں ایک دوسرے کے مشابہ ہیں اب معنی یہ ہوگا کہ جب کسی کو معلوم ہو کہ میت نے وصیت میں خطا کی ہے یا جان بوجھ کر ظلم کیا ہے تو کوئی حرج نہیں کہ اسے بدل دے اور اس کی موت کے بعد اس میں اصلاح کر دے۔ یہ قول حضرت ابن عباس اور قتادہ اور ربیع کا ہے۔ دوسرا قول اس میں یہ ہے کہ ''خاف'' خوف اور خشیۃ کے معنی میں استعمال ہے (یہی قول زیادہ مشہور ہے)

اعتراض: ''خوف'' کا استعمال تو امر منتظر (آنے والے خطرات) میں ہوتا ہے وصیت کرنے والے نے جب خطاء یا عمداً بے انصافی کر دی تو اب خوف کا کیا مطلب؟

پہلا جواب: مراد یہ ہے کہ اصلاح کرنے والا شخص جب دیکھے وصیت کرنے والا وصیت کر رہا ہے لیکن اس کی جہالت کی وجہ سے اس سے بے انصافی کے علامات نظر آ رہی ہیں، یا کسی تاویل وغیرہ کی وجہ سے اس سے بے انصافی کی علامات ظاہر ہو رہی ہیں، یا دیکھے کہ وہ جان بوجھ کر غیر مستحق کو زیادہ دے رہا ہے، یا مستحق کا حق کم کر رہا ہے، یا مستحق کو حق دے ہی نہیں رہا تو ان علامات کے ظاہر ہونے پر وصیت کے مکمل ہونے سے پہلے وہ اصلاح کرے۔

" لان اصلاح الامر عند ظهور امارات فساده وقبل تقرر فساده يكون اسهل "

کیونکہ معاملات کے فاسد ہونے سے پہلے صرف علامت فساد کے ظاہر ہوتے وقت ان کی اصلاح آسان ہے بنسبت اس کے کہ ان میں فساد پیدا ہو جائے تو پھر ان کی اصلاح مشکل ہوگی۔ اسی وجہ سے ''خاف'' ذکر فرمایا ''علم'' ذکر نہیں فرمایا کیونکہ ان حالات میں انسان کو گمان تو ہوتا ہے کہ وصیت کرنے والا غلطی کر رہا ہے اسے یقین نہیں۔

دوسرا جواب: جن وجوہ کا ذکر کیا ہے ہوسکتا ہے وصیت کرنے والا ان کو ختم کر کے نئی وصیت جاری کر دے اس لئے اس کی بے انصافی کا خوف ہے لیکن یقین نہیں اسی وجہ سے ﴿ خَافَ ﴾ ذکر کیا ''علم'' نہیں۔

تیسرا جواب: ہوسکتا ہے کہ کوئی شخص اس کی بے انصافی کو تو دیکھ رہا ہے لیکن ابھی تک اس پر یقین نہیں کہ اس کی موت بے انصافی پر ہوگی ہوسکتا ہے کہ وصیت کرنے والے اور حقداروں کے درمیان صلح ہو جائے۔ لہٰذا گمان تو بے انصافی کا ہوسکتا ہے یقین نہیں اسی وجہ سے ﴿ خَافَ ﴾ کہا ہے ''علم'' نہیں کہا۔

(ماخوذ از کبیر)

قابل توجہ مسئلہ: ابھی پہلے ذکر کیا گیا ہے کہ ''جنف'' بغیر ارادہ کے حق سے پھرنے کو کہا جاتا ہے اور ''اثم'' ارادہ سے غلطی کے ارتکاب کرنے کو کہا جاتا ہے۔ نبی کریم ﷺ کا ارشاد گرامی ہے '' رفع عن امتی الخطأ والنسیان '' میری امت سے خطا اور بھول کو اٹھالیا گیا ہے۔ یعنی ان کی کوئی پکڑ نہیں ہوگی ان پر کوئی گناہ مرتب نہیں ہوگا۔ لیکن یہ اس وقت ہے جب انسان سے خطا اپنے حق میں ہو جب وہ خطا دوسروں کے حق میں ہو تو اس کا حکم یہ ہے:

'' ومعلوم ان الخطأ فی حق الغیر فی انه یجب ابطاله بمنزلة العمد فلا فصل بین الخطأ والعمد فی ذلک فمن هذا الوجه سوی عزوجل بین الأمرین ''

معلوم یہ ہوا کہ غیر کے حق میں خطا کو باطل کرنا ضروری ہے جیسے جان بوجھ کر کی ہوئی غلطی کو ختم کرنا ضرور ہے غیر کے حق میں جان بوجھ کر بے انصافی کی جائے یا کہ خطاً سے ایک ہی حکم ہے دونوں کا اسی لئے رب تعالیٰ نے دونوں کو ایک جگہ جمع کیا ہے۔

فَاَصْلَحَ بَيْنَهُمْ : ''تو ان کے درمیان صلح کرادے (تو نہیں ہے کوئی گناہ اس پر)

یہ صلح کرانے والا کون ہوگا؟ ظاہر ہے کہ یہ وہ شخص ہوگا جس کو وصیت کرنے والا مقرر کرے گا کہ میری وصیت کو جاری کر دینا۔ اور اس حکم میں گواہ بھی داخل ہے کہ وہ بھی جب بے انصافی کو دیکھے تو اصلاح کرادے اور یہ حکم عام مسلمانوں کو بھی ہے کہ جو کوئی بھی وصیت کرنے والے میں بے انصافی کو دیکھے وہ اصلاح کر دے۔ (از کبیر)

فَلَا اِثْمَ عَلَيْهِ : ''تو نہیں ہے گناہ اس پر'' بظاہر وہم ہوا ہے کہ اصلاح کرنے والا عظیم نیکی کا کام کرتا ہے صرف گناہ کی نفی کا کیا مطلب؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ گناہ کی نفی کرنے میں چند حکمتیں ہیں:

(۱) جب رب تعالیٰ نے پہلی آیۃ میں وصیت کو بدلنے پر گناہ کا ذکر فرمایا اور یہاں بھی وصیت کی تبدیلی کا ذکر ہے لیکن یہ تبدیلی پہلی سے مختلف ہے اس لئے گناہ کی نفی کی تاکہ یہ وہم نہ ہو کہ شائد اس تبدیلی میں بھی گناہ ہوگا۔

(۲) جب مصلح وصیت میں کمی کرے گا تو یقیناً جن لوگوں کے حق میں حق سے زائد وصیت کی گئی تھی

بظاہر ان پر مشکل ہوگی وہ یہ سمجھیں گے کہ یہ شخص گنہگار ہو رہا ہے اس لئے ضروری ہوا کہ گناہ کی نفی کر کے ان کے وہم کا ازالہ کیا جائے۔

(۳) وصیت اور گواہی یقینی امور نہیں ان پر عمل کرنے سے پہلے حق کی طرف تبدیلی ممکن ہے اسی لئے ناحق وصیت کرنے والا وصیت کرنے کے ساتھ ہی گنہگار نہیں ہوتا بلکہ اس وقت گنہگار ہوتا ہے جب اسی ناحق وصیت پر قائم رہتے ہوئے فوت ہو جائے اور اس میں اصلاح بھی نہ کی جائے۔ جب اس میں اصلاح کی جائے گی تو وصیت کرنے والے کے ذہن میں بظاہر اصلاح میں قباحت آئے گی اس لئے گناہ کی نفی کرنا ہی زیادہ مفید ہے تا کہ اس وہم کا ازالہ ہو جائے۔

(۴) اصلاح کرنے والے کو زیادہ باتیں کرنی پڑتی ہیں ہو سکتا ہے اس کے کسی قول یا فعل پر کوئی ناراض ہو جائے تو اس کے قول اور فعل کو گناہ سمجھ بیٹھے تو رب تعالیٰ نے گناہ کی نفی کی کہ جو شخص صرف اللہ تعالیٰ کی رضامندی کے لئے صلح کرا رہا ہے تو وہ گنہگار نہیں۔ (از کبیر)

فائدہ: اس آیۂ کریمہ سے یہ فائدہ حاصل ہوا کہ جب دو شخصوں میں جھگڑا ہو اور خطرہ ہو کہ یہ نزاع ان کو شریعت کے خلاف کی طرف لے جائے گا تو ان کے درمیان صلح کرا دی جائے تا کہ وہ دونوں شریعت کے پابند رہیں۔ صلح کرانے والے کو ثواب حاصل ہوگا۔ (از کبیر)

اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ : ''بیشک اللہ بخشنے والا رحم کرنے والا ہے''۔

اگر اس سے مراد وصیت کرنے والے کی بے انصافی اور گناہ کی مغفرت ہو تو واضح ہے کہ جب اس کی وصیت میں اصلاح کر دی جائے گی تو اللہ تعالیٰ اس کی مغفرت فرمائے گا اور رحم فرمائے گا۔ اور اگر اصلاح کرنے والے کی مغفرت مراد ہو تو بظاہر وہم ہوگا کہ اس نے تو عظیم نیکی کا کام کیا ہے اس کے تو ثواب کا ذکر کیا جانا تھا صرف مغفرت کے ذکر کا کیا مقصد؟

تو اس کا جواب یہ دیا گیا کہ یہاں ادنیٰ سے اعلیٰ کی طرف ترقی پائی گئی پہلے مغفرت کا ذکر فرما کر پھر رحمت کا ذکر فرما کر گویا کہ رب تعالیٰ نے یہ فرمایا:

﴿ان الذی اغفر الذنوب ثم ارحم المذنب﴾

''بیشک میں پہلے گناہوں کی مغفرت کرتا ہوں پھر گنہگار پر رحم کرتا ہوں''

گویا کہ رب تعالیٰ نے اپنے بندوں کو یوں کہا:

" اوصل رحمتی وثوابی الیک مع انک تحملت المحن الکثیرة فی اصلاح هذا لمهم کان اولی "

میری رحمت اور ثواب تمہیں ملے گا جب کہ پہلے تم اصلاح میں کثیر محنتیں برداشت کرو گے بلکہ یوں کہا جائے کہ تمام عبادات میں یہی کیفیت ہے کہ انسان جتنی زیادہ مشقت برداشت کرے گا اتنا ہی زیادہ ثواب پائے گا۔

بلکہ نظام دنیا کو بھی ہم دیکھتے ہیں تو مقام مقبولیت اسے ہی حاصل ہوتا ہے جو اس حد تک محنت کرتا ہے کہ وہ اساتذہ کو بھی بھونکنے سے باز نہیں آتا اسی کو دیکھ کر راقم نے اپنے مکتب پر لکھ کر رکھا ہوا ہے۔

" اللهم انا نعوذ بک من کلاب السادات لان النباح واظهارا لاسنان لها العادات "

زندگی وصحت میں صدقہ افضل ہے:

اس مسئلہ میں اتفاق ہے کہ زندگی اور صحت میں صدقہ افضل ہے بنسبت اس صدقہ کے جو موت کے بعد کیا جائے:

" لقوله علیه السلام وقد سئل ای الصدقة افضل ؟ فقال ان تصدق وانت صحیح شحیح "

نبی کریم ﷺ سے سوال کیا گیا کون سا صدقہ افضل ہے تو آپ نے فرمایا کہ تم صدقہ کرو ایسے حال میں جب تم صحیح ہو اور مال پر حریص ہو۔

" وروی الدار قطنی عن ابی سعید الخدری ان رسول الله ﷺ قال لان یتصدق المرء فی حیاته بدرهم خیر له من ان یتصدق عند موته بمائة "

حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں بیشک رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ انسان کا اپنی زندگی میں ایک درہم صدقہ کرنا موت کے وقت ایک سو درہم صدقہ کرنے سے بہتر ہے۔

" وروی النسائی عن ابی الدرداء عن النبی ﷺ قال مثل الذی ینفق

او یتصدق عند موته مثل الذی یهدی بعد ما یشبع "

حضرت ابوالدردا فرماتے ہیں نبی کریم ﷺ نے فرمایا جو شخص موت کے وقت مال خرچ کرتا ہے اور صدقہ کرتا ہے وہ ایسے ہی ہے جیسے سیر ہونے کے بعد کسی کو ہدیہ دیا جائے۔ (از قرطبی)

فائدہ عظیمہ : نفلی عبادات سنن مؤکدہ میں کچھ کمی واقع ہونے کا کفارہ بنتی ہے اور سنن مؤکدہ ادا کرنے سے واجبات میں کچھ خطا وغیرہ ہوگئی تو کفارہ بنیں گی اور واجبات فرائض میں کوتاہیوں کا کفارہ بنتے ہیں اسی طرح زکوۃ میں کوئی کمی ہوگئی کمی ہو جانے کا مطلب یہ ہے کہ ہوسکتا ہے حساب لگانے میں بھول واقع ہوئی ہو کوئی خطا ہو مستحق کے سمجھنے میں خطا واقع ہوئی ہو تو اس صورت میں وصیت اس کا کفارہ ہوگی:

" روی الدار قطنی عن معاویة بن قرة عن ابیه قال قال رسول الله ﷺ من حضرته الوفاة فاوصی فکانت وصیته علی کتاب الله کانت کفارة لما ترک من زکوته "

معاویہ بن قرۃ اپنے باپ سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس شخص کو وفات حاضر ہوا اس نے کتاب اللہ کے مطابق وصیت کی تو یہ زکوۃ میں واقع ہونے والی کوتاہی کا کفارہ بنے گی۔
(از قرطبی بزیادۃ)

وصیت میں ورثاء کو ضرر پہنچانے پر وعید:

" عن ابن عباس عن رسول الله ﷺ قال الاضرار فی الوصیة من الکبائر رواه الدار قطنی "

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا وصیت میں کسی کو نقصان پہنچانا کبیرہ گناہوں میں سے ہے۔

" وروی ابو داؤد عن ابی هریرة رضی الله عنه رسول الله ﷺ قال ان الرجل او المرأة لیعمل بطاعة الله ستین سنة ثم یحضرهما الموت فیضاران فی الوصیة فتجب لهما النار "

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں بیشک رسول اللہ ﷺ نے فرمایا مرد یا عورت اللہ تعالیٰ

کی طاعت میں ساٹھ سال عمل کرتے رہیں پھر ان پر موت آتی ہے تو وہ وصیت کرنے میں (اپنے ورثا کو) نقصان پہنچاتے ہیں تو وہ دونوں جہنم کے مستحق ہیں۔

"عن عمر ان بن حصین رضی اللہ عنہ ان رجلا اعتق ستة مملوکین له عند موته ولم یکن له مال غیرهم فبلغ ذلک النبی ﷺ فغضب من ذلک وقال لقد هممت الا اصلی علیه" (رواه النسائی)

عمران بن حصین رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں ایک شخص نے اپنی موت کے وقت چھ غلام آزاد کر دیئے ان کے بغیر اس کا اور کوئی مال نہیں تھا نبی کریم ﷺ کو جب یہ خبر ملی تو آپ غصہ میں ہوئے فرمایا میرا ارادہ بنتا ہے کہ میں اس کی نماز جنازہ نہ پڑھاؤں۔ (ماخوذ از قرطبی)

فائدہ: "وفی صحیح البخاری ان ابن عباس قال لو ان الناس غضوا من الثلث الی الربع فان رسول اللہ ﷺ قال الثلث والثلث کثیر"

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ اگر لوگ تیسرے حصہ سے کم وصیت کریں تو ان کے لئے بہتر ہے اس لئے کہ رسول اللہ ﷺ نے تہائی حصہ کو اجازت دی اور تہائی کو کثیر قرار دیا۔ (پتہ چلا کہ تہائی حصہ سے کم کی وصیت کرنا بہتر ہے)۔ (از خازن وصابونی)

☆☆☆☆☆

يَآ اَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ☆ اَيَّامًا مَّعْدُوْدَاتٍ فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَّرِيْضًا اَوْ عَلٰى سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ اَيَّامٍ اُخَرَ وَعَلَى الَّذِيْنَ يُطِيْقُوْنَهٗ فِدْيَةٌ طَعَامُ مِسْكِيْنٍ فَمَنْ تَطَوَّعَ خَيْرًا فَهُوَ خَيْرٌ لَّهٗ وَاَنْ تَصُوْمُوْا خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ

۱) ''اے ایمان والوتم پر روزے فرض کیے گئے جیسے اگلوں پر روزے فرض ہوئے تھے کہ کہیں تمہیں پرہیز گاری ملے گنتی کے دن ہیں تو تم میں جو کوئی بیمار یا سفر میں ہوتو اتنے روزے اور دنوں میں اور جنہیں اسکی طاقت نہ ہو وہ بدلہ دیں ایک مسکین کا کھانا پھر جو اپنی طرف سے نیکی زیادہ کرے تو وہ اس کیلئے بہتر ہے اور روزہ رکھنا تمہارے لئے زیادہ بھلا ہے اگر تم جانو''۔

۲) ''اے ایمان والوں فرض کیئے گئے تم پر روزے جیسے فرض کیئے گئے ان لوگوں پر جو تم سے پہلے تھے تا کہ تم پرہیز گار بنو گنتی کے دن ہیں تو جو شخص تم میں سے ہو مریض، یا سفر میں ہوتو اتنے اور دنوں میں اور ان لوگوں پر جو طاقت نہیں رکھتے فدیہ ہے طعام ایک مسکین کا پھر جو شخص زیادہ نیکی کرے تو وہ بہتر ہے اس کے لئے اور تمہارا روزہ رکھنا بہتر ہے تمہارے لئے اگر تم جانتے ہو''۔

جب اس سے پہلے قصاص اور وصیت کی فرضیت کا ذکر کیا تو اس آیۃ کریمہ میں روزہ کی فرضیت کا ذکر کیا اور روزہ چونکہ اسلام کے پانچ ارکان میں سے ایک رکن ہے اس لئے اس کا ذکر کرنا اہم تھا۔

ارکان اسلام:

" قال رسول الله ﷺ بنی الاسلام علی خمس شهادة ان لا اله الا الله وان محمدا رسول الله واقام الصلوة وایتاء الزكوة وصوم رمضان والحج " (رواه ابن عمر، متفق عليه)

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما نے فرمایا رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے اسلام کی بنیاد پانچ چیزوں پر ہے گواہی دینا کہ اللہ کے بغیر کوئی معبود نہیں اور بیشک محمد اللہ کے رسول ہیں اور نماز قائم کرنا اور زکوٰۃ ادا کرنا اور رمضان کا روزہ رکھنا اور حج کرنا۔ (ماخوذ از قرطبی)

مختصر مطلب : ان دونوں آیتوں کا مختصر مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ایمان والوں کو خطاب کرتے ہوئے ارشاد فرمایا اے ایمان والو تم پر روزے فرض کئے گئے ایسے ہی جیسے تم سے پہلے آدم علیہ السلام سے لے کر نبی کریم ﷺ تک تمام انبیاء کرام اور ان کی امتوں پر روزے فرض کئے گئے روزے اس لئے تم پر فرض کئے گئے ہیں کہ تم متقی بن جاؤ۔ وہ روزے بھی چند دن ہیں جو شخص تم میں سے مریض ہو جائے یا مسافر ہو تو وہ اس وقت روزہ افطار کر لے تو اس کے لئے جائز ہے بعد میں جتنے روزے افطار کئے اتنی تعداد میں قضاء کر لے۔

جو شخص شیخ فانی ہو روزہ نہ رکھ سکے وہ ایک روزہ کے بدلہ ایک مسکین کو طعام دو وقت کھلا کر فدیہ ادا کر دے اگر فدیہ کی اس مقدار سے جو زیادہ دے اس کے لئے بہتر ہے روزہ رکھنا تمہارے لئے بہتر ہے اگر تمہیں معلوم ہو جائے کہ روزہ میں کیا خیر و برکات ہیں۔

قدرے تفصیل:

يَآ اَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ : ''اے ایمان والو فرض کئے تم پر روزے''

روزہ کی فرضیت کیسے ہوئی؟ نبی کریم ﷺ کی امت پر پہلے یوم عاشورا کا روزہ فرض ہوا پھر اسے منسوخ کر دیا گیا اور ہر ماہ کے ایام بیض (چاند کی تیرہ، چودہ، پندرہ تاریخوں) کو روزے فرض کئے گئے پھر یہ حکم منسوخ کر کے رمضان کے مہینے کے روزے فرض کئے گئے۔ اس میں اختیار تھا جو چاہیں روزہ رکھیں اور جو چاہیں روزہ نہ رکھیں بلکہ فدیہ دے دیں۔ پھر اختیار کو منسوخ کر دیا گیا تمام لوگ جو روزہ رکھنے کی طاقت رکھتے ہوں ان پر روزہ رکھنا فرض کر دیا گیا صرف چند عذروں کی وجہ سے روزہ افطار کرنے کی اجازت دی گئی (جس کی تفصیل ان شاء اللہ آگے آرہی ہے)۔

(ماخوذ از روح المعانی ونور الانوار)

كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ : ''جیسا کہ فرض کئے گئے تم سے پہلے لوگوں پر''

"یعنی هذه العبادة کانت مکتوبة واجبة علی الانبیاء والامم من لدن آدم الی عهدکم"

یعنی یہ عبادت (روزہ رکھنے کا حکم) فرض تھی تمام انبیاء کرام اور تمام امتوں پر آدم علیہ السلام سے لے کر تمہارے عہد تک یہ سلسلہ اسی طرح چلا آ رہا ہے۔ کوئی امت بھی نہیں گزری جن پر روزہ فرض نہ کیا گیا ہو بلکہ ہر امت پر روزے فرض تھے۔

قرآن پاک کا بیان ذیشان: سب سے پہلے تو کہا ﴿ یَا اَیُّهَا الَّذِیْنَ آمَنُوْا ﴾ "اے ایمان والو یعنی مجھ پر ایمان لانے والو میری محبت کا دم بھرنے والو، میرے پیار و محبت و پیار کا تقاضا یہی ہے کہ میرا حکم بھی مانو میرا حکم یہ ہے کہ تم روزے رکھو کیونکہ تم پر روزے فرض کر دیئے گئے۔ اور آسان یوں کیا کہ روزے ہر نبی اور ہر امت پر فرض کئے گئے " **لا یفرضها علیکم وحدکم** " تم پر ہی تو فرض نہیں کئے گئے۔ جب تم تمام امتوں سے بہتر ہو تو اپنے منصب میں خلل نہ آنے دینا بلکہ روزے رکھ کر میرے حکم کو تسلیم کر کے اپنی برتری کو برقرار رکھنا۔

پھر اس حکم پر عمل کرنے کے لئے اور آسانی پیدا کی گئی کہ روزہ رکھنے میں تمہارا ہی فائدہ ہے کیونکہ تقوی تمہیں ہی حاصل ہونا ہے اس لئے تقوی حاصل کرنے کیلئے بڑھ چڑھ کر عمل کرو۔ اس کے بعد اس حکم کو تسلیم کرنے کے لئے ﴿ اَیَّامًا مَّعْدُوْدَاتٍ ﴾ "چند دن" کہا کہ یہ روزے زیادہ نہیں بلکہ حساب کریں تو ہر ماہ کے تین روزے بھی مکمل نہیں ہوتے۔ جب چند دن تم پر روزے فرض کئے گئے ہیں تو تمہارا حق ہے کہ ان پر عمل کرنے میں کوئی کوتاہی نہ کرنا پھر حکم کو اور آسان کیا گیا کہ مرض اور سفر کی حالت میں روزہ افطار کر کے تمہیں قضاء کرنے کی اجازت ہے۔ پھر اور آسانی پیدا کرنے کے لئے شیخ فانی کو روزہ کے بدلے فدیہ دینے کی اجازت دی گئی۔ تو روزہ رکھنے کی طرف مزید رغبت دلانے کے لئے ﴿ وَاَنْ تَصُوْمُوْا خَیْرٌ لَّکُمْ ﴾ "اور تمہارا روزہ رکھنا تمہارے لئے بہتر ہے" کہا کہ جب روزہ خیر و برکت کا ذریعہ تو روزہ رکھ کر خیر و برکت کو حاصل کرو۔ پھر ﴿ اِنْ کُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴾ کہہ کر روزہ رکھنے کا مزید احساس دلایا گیا کہ اگر تمہیں روزہ کی خیر و برکت کا علم حاصل ہو جائے تو یقیناً تم روزہ رکھو گے۔ (راقم)

پہلے لوگوں کے روزں سے مشابہت کی وجہ: مسلمانوں کے روزے پہلی قوموں کے روزوں

سے اصل وجوب میں مشابہ ہیں کہ ان پر بھی روزے فرض تھے اور مسلمانوں پر بھی فرض ہیں لیکن مسلمانوں کے روزوں کے پہلی قوموں کے روزوں کے ساتھ وقت اور کیفیت میں مشابہت نہیں تھی۔ البتہ نصاری کے روزوں سے دو وجہ سے مشابہت تھی ایک تو یہ کہ ان پر کھانا، پینا اور جماع کرنا دن کو منع تھا افطار کے وقت جائز تھا لیکن جب ایک مرتبہ کوئی سو جاتا تھا پھر اس پر یہ چیزیں حرام ہو جاتیں خواہ رات کو ہی وہ کیوں نہ جاگ جائے۔

ابتداء اسلام میں مسلمانوں کو بھی یہی حکم تھا لیکن بعد میں صرف صبح صادق سے غروب آفتاب تک روزہ رکھنا لازم قرار دیا گیا رات سے روزے کا حکم منسوخ کر دیا گیا۔ اور ان سے دوسری مشابہت کی وجہ یہ ہے کہ نصاری کو بھی حکم رمضان کا مہینہ روزہ رکھنے کا تھا لیکن انہوں نے جب یہ سوچا کہ روزے کبھی سردیوں میں آتے ہیں اور کبھی گرمیوں میں۔ گرمیوں میں روزے رکھنا بڑا مشکل کام ہے تو انہوں نے اپنے علماء کے ذریعے یہ حکم بدل دیا کہ روزے رمضان کے بدلے موسم بہار میں رکھا کریں گے جب ان میں بیماری پھیل گئی تو انہوں نے ڈر کر بیس روزے اور بڑھا دیئے یعنی اب وہ پچاس روزے رکھتے ہیں ان کی عید الفطر ہمیشہ اپریل میں ہوتی ہے تفسیر بیضاوی نے یہی بیان کیا ہے البتہ روح المعانی اور قرطبی نے کچھ مختلف بیان کیا ہے۔ (از قرطبی)

لَعَلَّکُمْ تَتَّقُوْنَ :

''تاکہ تم پرہیزگار ہو جاؤ'' یعنی تم تمام گناہوں سے بچ جاؤ۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا ''الصیام جنة ووجاء'' روزہ ڈھال ہے اور شہوت کو کم کرتا ہے یقیناً شہوت کی کمی گناہوں سے روکتی ہے۔

اَیَّامًا مَّعْدُوْدٰتٍ :

''چند دن ہیں'' یعنی روزے چند دن فرض ہیں وہ سال بھر میں صرف رمضان کا مہینہ ہے۔ (از قرطبی)

صوم کا لغوی معنی: ''ھو لغة الامساک مطلقا'' لغت میں مطلقاً امساک کو صوم کہتے ہیں اسی لغوی معنوی کے لحاظ سے مطلقا کلام سے رکنے کو بھی رب تعالیٰ نے ''صوم'' فرمایا رب تعالیٰ نے حضرت مریم کو کہا تم کہو:

﴿اِنِّیْ نَذَرْتُ لِلرَّحْمٰنِ صَوْمًا فَلَنْ اُكَلِّمَ الْیَوْمَ اِنْسِیًّا﴾ (مریم ۲۶)

''میں نے آج رحمٰن کا روزہ مانا ہے تو آج ہرگز کسی آدمی سے بات نہیں کروں گی''۔

صوم کا اصطلاحی معنیٰ: یعنی اصطلاح شرع میں ''صوم'' (روزہ) کا مطلب یہ ہے کہ روزے کی نیت سے صبح صادق سے لے کر غروب آفتاب تک جماع سے رکنا اور پیٹ میں کسی چیز کو داخل کرنے سے رکنا اور ہر وہ مقام جس کو باطن کا حکم دیا جائے اس میں کسی چیز کو داخل کرنے سے روکنا یعنی ایسی رگیں وغیرہ جن کا تعلق براہ راست دماغ یا معدہ سے ہے ان میں دواء وغیرہ ڈالنے سے رکنا۔ (اس کی تفصیل ان شاء اللہ آئے گی)۔

روزہ کے فوائد:

(۱) چونکہ نفس امارہ کی خواہشات کی وجہ سے باقی اعضا یعنی آنکھوں، کانوں اور زبان اور ہاتھ، پاؤں وغیرہ میں بھی خواہشات پائی جاتی ہیں جن سے انسان مختلف گناہوں میں مبتلا ہو جاتا ہے روزہ کی وجہ سے نفس امارہ کی خواہشات ماند پڑ جاتی ہیں جن کی وجہ سے دوسرے اعضاء کو بھی قرار آجاتا ہے اور انسان گناہوں سے باز آجاتا ہے۔ اسی وجہ سے کہا جاتا ہے " اذا جاعت النفس شبعت جميع الاعضاء واذا شبعت جاعت كلها " کہ جب نفس بھوکا ہوتا ہے تو تمام اعضاء سیر ہوتے ہیں اور جب نفس سیر ہوتا ہے تو تمام اعضا بھوکے ہوتے ہیں۔

(۲) روزہ کی وجہ سے دل کدورت سے پاک وصاف ہوتا ہے کیونکہ دل میں کدورت کے اسباب سے زبان سے لغویات کا سرزد ہونا اور آنکھوں کا ناجائز طرف اٹھنا۔ اسی طرح باقی اعضاء سے گناہوں کا سرزد ہونا جب روزہ کی وجہ سے ان اعضاء میں نیکیاں آجائیں گی تو ان کے درجات بلند ہوں گے اور ان کی وجہ سے دل کی کدورت بھی جاتی رہے گی۔ دل میں جلا (صفائی) آئے گی۔

(۳) روزہ کی وجہ سے انسان کو غرباء وفقراء پر رحم کرنے اور مہربانی کرنے کا دل میں خیال آتا ہے اس لئے کہ جب روزہ کی حالت میں انسان کو خود بھوک کی وجہ سے تکلیف محسوس ہو گی تو غریب اور فقیر لوگوں کی بھوک کا بھی اسے احساس ہوگا اسی طرح یہ ان پر رحمت اور مہربانی کرے گا غربا پر مہربانی کرنا درحقیقت اس پر رب تعالیٰ کی مہربانی ہوگی نیکی کی توفیق حاصل ہونا اللہ تعالیٰ کی مہربانی سے ہی ہوگا۔

(۴) روزہ سے فقراء کی موافقت حاصل ہوگی جس طرح وہ کبھی کبھی بھوک میں اپنے اوقات گزار دیتے ہیں روزہ دار بھی بھوک برداشت کر کے ان کی موافقت کر رہا ہے " **وفی ذلک رفع حالہ عند اللہ** "روزہ کی حالت میں اللہ تعالیٰ کے ہاں ان کا مقام بلند ہوگا۔

حضرت بشر حافی کسی نیک شخص کے پاس جاتے ہیں دیکھتے کہ وہ سخت سردی میں کپڑا اوڑھے بغیر بیٹھے ہوئے سردی کی وجہ سے کانپ رہا ہے حالانکہ اس کے قریب ہی کپڑا لٹکا ہوا ہے۔ بشر حافی نے اس بزرگ کو کہا یہ وقت ہے کپڑا اتار کر لپیٹنے کا تا کہ تم سردی سے بچ سکو۔

" فقال یا اخی الفقراء کثیر ولیس لی طاقة مواساتھم بالثیاب فاواسیھم بتحمل البرد کما یتحملون "

تو وہ کہنے لگے اے میرے بھائی فقراء بہت ہیں ان کے پاس کپڑے نہیں اور مجھے طاقت حاصل نہیں کہ میں تمام کو کپڑے دے کر ان پر ایثار کرسکوں اس لئے جس طرح وہ سردی برداشت کر رہے ہیں میں بھی سردی برداشت کر کے جس حد تک ممکن ہے ان سے غمخواری کر رہا ہوں۔

اسی وجہ سے اولیاء عارفین میں سے ایک بزرگ کھانا کھاتے وقت یہ دعا کرتے تھے " **اللھم لا تؤاخذنی بحق الجائعین** "اے اللہ بھوکے لوگوں کے حق کی وجہ سے میری گرفت (پکڑ) نہ کرنا۔

حضرت یوسف علیہ السلام قحط کے سال میں سیر ہو کر کھانا نہیں کھاتے تھے تا کہ بھوک اور فاقہ میں مبتلاء لوگوں کو نہ بھول سکیں اور خود ان جیسی بھوک برداشت کریں۔ (از مرقاۃ کتاب الصوم ج ۴ ص ۲۲۹)

رمضان کے روزے کب فرض ہوئے؟

" کانت فرضیتہ صوم رمضان بعد ما صرفت القبلة الی الکعبة بشھر فی شعبان علی رأس ثمانیة عشر شھرا من الھجرة "

قبلہ کی تبدیلی کے ایک ماہ بعد ہجرت کے اٹھارہ ماہ بعد شعبان کے مہینہ میں رمضان شریف کے روزے فرض کر دیئے گئے یعنی ہجرت کے دوسرے سال روزے فرض ہوئے۔ (مرقاۃ حوالہ مذکور)

روزہ ایمان کا چوتھا حصہ ہے: نبی کریم ﷺ نے فرمایا " **الصوم نصف الصبر** " روزہ نصف

صبر ہے اور نبی کریم ﷺ کا ارشاد یہ ہے " **الصبر نصف الایمان** " صبر نصف ایمان ہے دونوں حدیثوں کو ملا کر پڑھنے سے نتیجہ واضح ہے کہ روزہ ایمان کا چوتھا حصہ ہے۔ (از احیاء العلوم ج اول ص ۱۴۴)

روزے کے تین درجے: عوام کا روزہ، خواص کا روزہ، اخص الخواص حضرات کا روزہ۔

عوام کا روزہ:

صبح صادق سے لے کر غروب آفتاب تک نیت روزہ سے جماع اور کھانے پینے سے رک جانا۔

خواص کا روزہ: کانوں اور آنکھوں اور زبان اور ہاتھ اور پاؤں اور تمام اعضاء کو بھی گناہوں سے بچانا یعنی خواص کا روزہ عوام کے روزہ پر بھی مشتمل ہوگا اور اس سے زائد بھی۔

اخص الخواص حضرات کا روزہ: عوام کے روزہ کے ساتھ خواص کا روزہ بھی پایا جائے گا اس سے زائد یہ کہ اس کا دل دنیا کی گھٹیا چیزوں سے دور ہوگا دنیاوی افکار اس میں نہیں پائی جائیں گی بلکہ خالص اللہ تعالیٰ کی طرف اس کی توجہ پائی جائے گی۔ (از احیاء العلوم ج اول ص ۱۴۶)

روزے میں کمال چھ چیزوں سے آئے گا:

نظر کو پست کرنا: غیر محرم عورتوں سے نظر نیچے رکھے ہر قسم کی برائی کی طرف نظر اٹھانے سے نظر کو بچا کر رکھے اس طرح نظر نہ اٹھے جو اللہ تعالیٰ کی طرف توجہ سے ہی پھیر دے۔

" **قال علیہ السلام النظرة سهم مسموم من سهام ابليس لعنه الله فمن تركها خو فامن الله اتاه الله عزوجل ايمانا يجد حلاوته** "

نبی کریم ﷺ نے فرمایا ابلیس ملعون کے تیروں میں سے زہر آلود تیر نظر ہے جو اللہ تعالیٰ کے خوف سے نظر بد کو چھوڑ دے اللہ تعالیٰ اس کو کامل ایمان پر قائم رکھے گا اور اسے ایمان کی حلاوت (مٹھاس) حاصل ہوگی۔

" **وروی جابر عن انس عن رسول الله ﷺ انه قال خمس یفطرن الصائم الکذب والغیبة والنمیمة والیمین الکاذبة والنظر بشهوة** "

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا پانچ چیزوں سے روزے دار کا روزہ افطار ہو جاتا ہے جھوٹ اور غیبت اور چغل خوری اور جھوٹی قسم اور شہوت سے نظر (غیر محرمہ کی طرف) کرنا۔

زبان کی حفاظت کرنا: روزے کا کمال اس میں ہے کہ زبان کو بیہودہ باتوں سے اور جھوٹ سے اور غیبت سے اور چغل خوری سے اور فحش کلام سے اور ظالمانہ کلام سے اور جھگڑے سے محفوظ رکھے اور خاموشی کو لازم پکڑے اور اللہ تعالیٰ کے ذکر میں مشغول رہے اور تلاوت قرآن پاک میں مشغول رہے یہ زبان کا روزہ ہے۔

" وقد قال سفیان الغیبة تفسد الصوم رواه بشر بن الحارث عنه "

بشر بن حارث نے سفیان رحمہ اللہ سے روایت کیا ہے کہ غیبت روزہ کو فاسد کر دیتی ہے۔لیث نے مجاہد سے روایت کیا " خصلتان یفسدان الصیام الغیبة و الکذب " دو چیزیں روزہ کو فاسد کر دیتی ہیں یعنی غیبت اور جھوٹ روزے کا فاسد کرنے کا مطلب یہ ہے کہ روزہ کا کمال فاسد ہو جاتا ہے۔

" قال ﷺ انما الصوم جنة فاذا کان احدکم صائما فلا یرفث ولا یجهل وان امرأ قاتله او شاتمه فلیقل انی صائم "

اور نبی کریم ﷺ نے فرمایا بیشک روزہ ڈھال ہے جب تم میں سے کوئی ایک روزہ دار ہو تو کسی کو گالی وغیرہ نہ دے اور نہ ہی کسی سے جاہلانہ کلام کرے اگر روزہ دار سے کوئی شخص جھگڑا کرے اور گالی دے تو یہ کہے کہ بیشک میں روزہ دار ہوں (میں تمہیں گالیوں کا جواب نہیں دیتا)۔

خبر میں آیا ہوا ہے کہ دو عورتیں نبی کریم ﷺ کے زمانہ میں روزہ دار تھیں شام کے قریب پچھلے پہر ان کا بھوک اور پیاس سے ان کا برا حال ہو گیا ہلاک ہونے کے قریب پہنچ گئیں انہوں نے نبی کریم ﷺ کے پاس پیغام بھیج کر روزہ توڑ دینے کی اجازت طلب کی آپ نے ان کی طرف ایک پیالہ بھیجا کہ اس میں دونوں قے کر دو (یعنی زبردستی منہ میں انگلی وغیرہ ڈال کر قے کرو) ان میں سے ایک نے قے کی جس میں خون اور گوشت کے لوتھڑے تھے دوسری نے قے کی اس کا بھی یہی حال تھا لوگوں نے اس پر تعجب کیا رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

" هاتان صامتا احل الله لهما وافطرتا علی ما حرم الله تعالیٰ علیهما قعدت احداهما الی الاخری فجعلتا یغتابان الناس فهذا ما اکلتا من لحومهم "

ان دونوں نے روزہ رکھا ہوا تھا ان چیزوں سے جو اللہ تعالیٰ نے حلال فرمائی ہیں اور افطار کر رہی

تھیں اس چیز سے جو اللہ تعالیٰ کی حرام کی ہوئی ہیں یعنی ایک دوسری کے پاس بیٹھ کر لوگوں کی غیبت کر رہی تھیں ان کے قے میں وہی گوشت کے ٹکڑے ہیں جو انہوں نے اپنے بہن بھائیوں کی غیبت کی وجہ سے ان کا گوشت کھایا تھا۔ خیال رہے کہ حدیث کی صحت اور عدم صحت کی دارومدار علامہ غزالی رحمہ اللہ پر ہے۔

کانوں کو بچانا: مکروہ قسم کے کلام کے سننے سے اپنے کانوں کو بچانا بھی روزہ کے کمال کا ذریعہ ہے "کل ما حرم قوله حرم الاصغاء اليه" ہر وہ کلام جس کا کرنا حرام ہے اس کا سننا بھی حرام ہے۔ رب تعالیٰ نے جھوٹ اور حرام کھانے کو ایک ساتھ ذکر کر کے دونوں کی حرمت اور قباحت کو ذکر فرما دیا ہے۔ "سماعون للكذب اكالون للسحت" وہ جھوٹ سنتے ہیں اور حرام کھاتے ہیں۔

مسئلہ: غیبت پر خاموش ہونا منع ہے بلکہ غیبت کرنے والے کو غیبت سے منع کرنا ضروری ہے نبی کریم ﷺ نے فرمایا "المغتاب والمستمع شريكان في الاثم" غیبت کرنے والا اور اس کے کلام کو سنے والا دونوں ہی گناہ میں شریک ہیں۔

باقی اعضاء کو گناہوں سے روکنا: یعنی روزہ کامل اس وقت ہوگا جب باقی اعضاء کو بھی گناہوں سے روکے ہاتھ اور پاؤں کو غیر شرعی افعال سے روک کر رکھے۔ اور پیٹ کو شبہات والی چیزوں سے منع کرے کیونکہ حلال چیزوں کے کھانے سے اس لئے رک جاتا کہ میں روزہ دار ہوں لیکن حرام چیزوں کے حاصل کرنے میں کوئی پرواہ نہ کرے اس کی مثال یہ ہے "من يبني قصرا ويهدم مصرا" کہ گھر بنا کر شہر برباد کر دیا جائے نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا "كم من صائم ليس له من صومه الا الجوع" کتنے ہی روزے دار ہیں جن کا روزہ سوائے بھوک کے نہیں۔

افطار کے وقت زیادہ طعام نہ کھائے: روزہ کے کامل ہونے کے لے اور یہ ضروری ہے کہ افطار کے وقت زیادہ مقدار میں کھانا تناول نہ کرے کیونکہ روزہ کا مقصد یہ ہے کہ نفس پر قہر کیا جائے کیونکہ وہ اللہ تعالیٰ کا دشمن ہے اور مقصد یہ ہے کہ نفس کی شہوت کو توڑا جائے۔ روزہ دار جب افطار کے وقت اتنا کھا لے کہ دن کے نہ کھانے کی کمی کو بھی پورا کر دے بلکہ عام عادت سے ہٹ کر طرح طرح کے کھانے کھائے تو مقصد فوت ہو گیا بلکہ نفس کو زیادہ قوت دے دی۔

افطار کے بعد خوف ورجاء میں ہو: یعنی روزہ کے کامل ہونے کا اور ذریعہ یہ ہے کہ اپنی طرف

سے مکمل کوشش کر کے روزہ میں جماع، کھانے پینے وغیرہ سے اجتناب کرنے کے ساتھ ساتھ اپنے اعضاء کو گناہوں سے بچانے کے بعد جب روزہ افطار کرے تو اس کا دل خوف اور امید کے درمیان مضطرب رہے:

"اذ لیس یدری ایقبل صومه فهو من المقربین او یرد علیه فهو من الممقوتین"

کیونکہ اسے معلوم نہیں کہ اس کا روزہ مقبول ہوا ہے کہ وہ مقربین کے درجہ میں پہنچ گیا یا اس کا روزہ مردود ہو گیا یہ ان لوگوں میں سے ہو گیا جن پر اللہ تعالیٰ کی ناراضگی ہوتی ہے۔ حضرت حسن بن ابی الحسن بصری رحمہ اللہ کا ایک قوم سے گزر ہوا وہ ہنس رہے تھے (یہ ماہ رمضان تھا) آپ نے فرمایا اللہ تعالیٰ نے ماہ رمضان کو گھوڑوں کی دوڑ کے میدان کی طرح بنا دیا ہے کہ لوگ اس میں طاعت کا مقابلہ کریں "فسبق قوم ففازوا وتخلف اقوام فخابوا" جو قوم طاعت میں سبقت لے گئی وہ کامیاب ہوگئی اور جو قومیں پیچھے رہ گئیں وہ رسوا ہو گئیں پھر آپ نے فرمایا بہت بڑا تعجب ہے ایسے لوگوں پر جو ایسے دن میں ہنس رہے ہیں اور کھیل رہے ہیں جس دن میں طاعت میں جلدی کرنے والے کامیاب ہو رہے ہیں اور باطل راہ پر چلنے والے رسوا ہو رہے ہیں:

"اما والله لو کشف الغطاء لا شتغل المحسن باحسانه والمسی باساءته ای کان سرور المقبول یشغله عن اللعب وحسرة المردود وتسد علیه باب الضحک"

خبردار قسم ہے اللہ تعالیٰ کی اگر پردے ہٹ جائیں یہ منظر سامنے آ جائے کہ احسان کرنے والا اپنے احسان میں مشغول ہے اور برائیاں کرنے والا اپنی برائیوں میں مشغول تو مقبول شخص کے سردار کو دیکھ کر ہنسنے اور کھیلنے والا شخص اپنی ہنسی اور کھیل سے اعراض کر لے اور اسے اپنے اوقات کے ضائع ہونے پر حسرت ہو اور ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اپنے آپ پر ہنسی کا دروازہ بند کر لے۔

ذرا مقام غور: ایک مرتبہ اس جملہ کو "فسبق قوم ففازوا وتخلف اقوام فخابوا" غور سے سمجھنے کی کوشش کی جائے کہ طاعت کرنے والوں کا جب ذکر کیا تو "قوم" واحد ذکر کیا۔ اور جب نافرمانوں کا ذکر کیا تو "اقوام" جمع ذکر کیا جس سے واضح ہو رہا ہے کہ ہر دور میں طاعت کرنے والے

تھوڑی تعداد میں رہے اور نافرمان زیادہ تعداد میں رہے۔ (راقم)

خلاصہ کلام: روزہ کی مقبولیت اور عدم مقبولیت علماء آخرت (صوفیاء کرام اولیاء عظام) کے نزدیک ہے یعنی انسان کو جب اللہ تعالیٰ کی صفت صمدیت (بے نیازی) کا عکس حاصل ہو جائے تو اس کا روزہ مقبول ہوگا کیونکہ شہوات کو ترک کرنے سے انسان مقام حیوانیت سے نکل کر مقام ملائکہ میں آ جاتا ہے صرف رب تعالیٰ کی طرف توجہ ہوتی ہے اور دوسری چیزوں سے بے نیاز ہو جاتا ہے۔

(تمام بحث ماخوذ از احیاء العلوم کتاب الصوم)

روزہ اور رمضان کے فضائل:

"عن ابی هریرة قال قال رسول الله ﷺ اذا دخل رمضان فتحت ابواب السماء وفی روایة فتحت ابواب الجنة☆ وغلقت ابواب جهنم وسلسلت الشیاطین وفی روایة فتحت ابواب الرحمة"

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جب رمضان داخل ہوتا ہے تو آسمانوں کے دروزے کھول دیئے جاتے ہیں ایک روایت میں ہے جنت کے دروازے کھول دیئے جاتے ہیں اور جہنم کے دروازے بند کر دیئے جاتے ہیں اور شیطانوں کو زنجیروں سے جکڑ دیا جاتا ہے اور ایک روایت میں ہے رحمت کے دروازہ کھول دیئے جاتے ہیں۔ (بخاری، مسلم مشکوۃ کتاب الصوم)

ایک روایت میں " صفدت الشیاطین " ہے قاضی عیاض رحمہ اللہ نے بیان فرمایا کہ یہ الفاظ اپنے ظاہری حقیقی معانی میں استعمال ہیں کہ حقیقت میں جنت کے دروازے کھول دیئے جاتے ہیں اور جہنم کے دروازے بند کر دیئے جاتے ہیں اور شیطانوں کو قید کر لیا جاتا ہے اس کی وجہ " علامة لدخول الشهر وتعظیم لحرمته ویکون التصفید لیمتنعوا من ایذاء المؤمنین والتهویش علیهم " ماہ رمضان کے داخل ہونے کی علامت ہے اور اس ماہ کی حرمت کی عظمت کا لحاظ ہے اور شیطانوں کو قید اس لئے کیا جاتا ہے کہ وہ مومنوں کو ایذاء نہ پہنچا سکیں اور ان کو نیک عمل کرنے میں پریشان نہ کر سکیں۔ اور یہ احتمال بھی ہے کہ مجازی معنی مراد ہو یعنی رحمت اور آسمانوں اور جنت کے دروازے کھولنے کا مطلب یہ ہو کہ کثیر ثواب عطا کیا جاتا ہے اور کثرت سے معاف کیا جاتا ہے اور

شیطان مومنوں کو کم بھٹکاتے ہیں اوران کو کم ایذاء پہنچاتے ہیں اس لئے گویا کہ وہ قید ہوتے ہیں:

" ویکون تصفیدھم عن اشیاء دون اشیاء ولناس دون ناس "

اوران کو بعض چیزوں سے روکا جاتا ہے اور بعض سے نہیں اور بعض لوگوں سے روکا جاتا ہے بعض سے نہیں دوسری حدیث میں ہے " صفدت مردة الشیاطین "سرکش شیطانوں کو قید کرلیا جاتا ہے۔

اب مسئلہ واضح ہوا کہ رمضان شریف میں بڑے بڑے سرکش شیطان قید ہوتے ہیں شطونگڑے کھلے ہوتے ہیں جن کی وجہ سے بعض لوگ بعض جرائم میں مبتلاء ہوتے ہیں اسی طرح نفس امارہ بھی جرائم کا ذریعہ ہوتا ہے۔ایک اور احتمال یہ ہے کہ جنت کے دروازے کھولنے کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ مومنوں کو توفیق عطا فرماتا ہے کہ وہ عبادات زیادہ کرتے ہیں روزے رکھتے ہیں رات کو تراویح کے لئے قیام کرتے ہیں اور ہر قسم کی نیکی کے کام زیادہ کرتے ہیں یہ جنت میں داخل ہونے کے ذرائع ہیں اور یہی جنت کے دروازے ہیں۔اور جہنم کے دروازے بند کئے جانے اور شیطانوں کو قید کرنے کا مطلب یہ ہے کہ رب تعالیٰ کی مہربانی سے رمضان میں مؤمنین کافی حد تک گناہوں سے باز رہتے ہیں۔

(ماخوذ از نووی مسلم ج اول ص ۳۶۶)

☆ " عن سهل بن سعد قال قال رسول الله ﷺ فی الجنة ثمانية ابواب منها باب يسمى الريان لا يدخله الا الصائمون "

سہل بن سعد رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جنت میں آٹھ دروازے ہیں ان میں سے ایک دروازے کا نام ''ریان'' ہے اس میں صرف روزے دار داخل ہوں گے۔

(بخاری مسلم مشکوۃ کتاب الصوم)

اور ایک روایت میں یہ الفاظ زائد ہیں:

" لا يدخل معهم احد غيرهم يقال اين الصائمون فيدخلون منه فاذا دخل آخرهم اغلق فلم يدخل منه احد " (مسلم)

اسی دروازہ میں روزے داروں کے ساتھ کوئی اور داخل نہیں ہوگا کہا جائے گا روزے دار کہاں ہیں جب روزے دار اس دروازے سے داخل ہوں گے جب آخری روزہ دار اس دروازے سے داخل ہوجائے گا تو دروازہ بند کردیا جائے گا کوئی اور اس سے داخل نہیں ہوسکے گا۔اس دروازہ کو ''ریان'' کہنے

کی وجہ یہ ہے کہ اس میں کثیر نہریں جاری ہوں گی تروتازہ پھل اور پھول اس میں ہوں گے اور وجہ یہ ہے کہ اس دروزہ سے داخل ہونے والے کو سیراب کر دیا جائے گا اسے کوئی پیاس محسوس نہیں ہوگی۔

(مرقاۃ)

☆ " عن ابی هریرة قال قال رسول الله ﷺ من صام رمضان ایمانا و احتسابا غفرله ما تقدم من ذنب و من قام رمضان ایمانا و احتسابا غفرله ما تقدم من ذنبه و من قام لیلة القدر ایمانا و احتسابا غفرله ما تقدم من ذنبه "

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس شخص نے رمضان کے روزے رکھے ایمان وخلوص سے اس کے پہلے گناہ معاف کر دیئے گئے اور جس شخص نے رمضان میں ایمان وخلوص سے قیام کیا (نماز تراویح ادا کی) تو اس کے پہلے گناہ معاف کر دیئے گئے اور جس شخص نے لیلۃ القدر میں ایمان وخلوص سے قیام کیا تو اس کے پہلے گناہ معاف کر دیئے گئے۔

وضاحت حدیث: ایمانا : سے مراد یہ ہے کہ وہ ایمان کی وجہ سے روزہ رکھتا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے روزہ کی فرضیت کا جو حکم فرمایا اس کی وہ تصدیق کرتا ہے اور اس کے ثواب کی وہ تصدیق کرتا ہے۔

احتسابا : کا مطلب یہ ہے کہ وہ طلب ثواب کے لئے روزہ رکھتا ہے اور اس میں خلوص پایا جاتا ہے لوگوں کے خوف اور لوگوں سے حیا اور چرچا کرنا اور لوگوں کو دکھانا اس کے روزہ رکھنے کے اسباب نہیں۔

"احتسابا" کا اور مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جن کاموں کا حکم دیا ہے ان پر صابر رہے جھوٹ اور غیبت وغیرہ سے باز رہے نیکی کے کام خوشی سے کرے جبر سے نہیں روزے کو بوجھ نہ سمجھے اور روزے کے دنوں کو لمبا سمجھ کر روزہ ترک نہ کرے۔

غُفِرَلَہٗ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِہٖ :

''اس کے پہلے گناہ معاف کر دیئے گئے'' اس کے متعلق علامہ نووی رحمہ اللہ نے فرمایا:

" ان المکفرات ان صادفت السیآت تمحوها اذا کانت صغائر و تخففها اذا کانت کبائر والا تکون موجبة لرفع الدرجات فی الجنات "

کہ جتنی عبادات بھی گناہوں کو مٹاتی ہیں ان کا مطلب یہ ہے کہ صغائر گناہوں کو مٹاتی ہیں اور کبیرہ گناہوں میں تخفیف پیدا کرتی ہیں اگر عبادت کرنے والا گناہوں سے محفوظ ہو تو اس کے درجات کو

بلند کرتی ہیں علامہ طیبی رحمہ اللہ بیان فرماتے ہیں کہ ان تین صورتوں کو ایک ہی صورت میں یوں پیش کیا جاسکتا ہے کہ عبادت کے ذریعے مومن کو وہ مغفرت کا درجہ حاصل ہو جاتا ہے:

" الغفران نتیجة الفتوحات الالهیة و مستتبع للعواطف الربانیة قال تعالیٰ انا فتحنا لک فتحا مبینا لیغفرلک الله "

کہ اس پر فتوحات الھیہ اور رب تعالیٰ کی مہربانیاں مرتب ہوتی ہیں رب تعالیٰ نے فرمایا: بیشک ہم نے آپ کو فتح مبین (واضح فتح) عطا کی تا کہ تمہاری وجہ سے اللہ تعالیٰ اگلے اور پچھلوں کے گناہ معاف کر دے۔

من قام رمضان : سے مراد رمضان کی راتوں کو کھڑے ہو کر نماز ادا کرنا رمضان کی راتوں کو معظم سمجھتے ہوئے تراویح ادا کرے قرآن پاک کی تلاوت کرے اور اللہ تعالیٰ کا ذکر کرے اور اگر مکہ مکرمہ میں ہو تو کعبہ شریف کا طواف کرے۔

" ومن قام لیلة القدر " سے مراد یہ ہے کہ اسے علم حاصل ہو یا نہ ہو رمضان کی ہر رات کو لیلۃ القدر سمجھتے ہوئے یا آخری دس راتوں کو لیلۃ القدر سمجھتے ہوئے یا آخری دس راتوں میں سے طاق راتوں کو "لیلۃ القدر" سمجھتے ہوئے یا ستائیسویں رات کو لیلۃ القدر سمجھتے ہوئے قیام کرے اور لیلۃ القدر کے وجود پر ایمان ہو اور یہ بھی ایمان ہو کہ اس میں عبادت کرنے سے اللہ تعالیٰ عظیم ثواب عطا فرماتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کے پہلے گناہ اپنی مہربانی سے معاف فرماتا ہے۔ (ماخوذ از مرقاۃ بزیادۃ)

☆ " وعن ابی هریرة قال قال رسول الله ﷺ کل عمل ابن آدم یضاعف الحسنة بعشر امثالها الی سبعمائة ضعف قال الله تعالیٰ الا الصوم فانه لی و انا اجزی به یدع شهوته و طعامه من اجلی للصائم فرحتان فرحة عند فطره و فرحة عند لقاء ربه و لخلوف فم الصائم اطیب عند الله من ریح المسک و الصیام جنة و اذا کان یوم صوم احدکم فلا یرفث و لا یصخب فان سابه احد او قاتله فلیقل انی امرؤ صائم "

(بخاری، مسلم، مشکوۃ کتاب الصوم)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا انسان کو ہر نیک عمل پر اس کی دس مثل سے لے کر سات سو مثل تک ثواب عطا کیا جاتا ہے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے سوائے روزے کے

بیشک وہ میرے لئے ہوتا ہے میں خود ہی اس کی جزاء عطا کروں گا وہ اپنی خواہشات اور کھانے کو میرے لئے چھوڑتا ہے روزے دار کے لئے دو خوشیاں ہیں ایک خوشی اس کو افطار کے وقت ہوتی ہے اور ایک خوشی اس کو رب تعالیٰ کی ملاقات کے وقت حاصل ہوگی ۔ روزے دار کے منہ کی بو اللہ تعالیٰ کے ہاں افضل ہے کستوری کی خوشبو سے اور روزے ڈھال ہیں اور تم میں سے جب کوئی شخص کسی دن روزہ رکھے ہوئے ہو تو وہ گالی نہ دے اور چلائے نہیں اگر کوئی شخص اسے گالی دے یا اس سے لڑائی کرے تو یہ کہے میں روزہ دار ہوں۔

وضاحت حدیث:

کل عمل ابن آدم : سے مراد ہے " کل عمل صالح لابن آدم " انسان کا ہر نیک عمل۔

یضاعف الحسنة : سے مراد یہ ہے کہ انسان جو بھی نیکی کا کام کرے تو اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے اسے زیادہ ثواب عطا فرماتا ہے۔

بعشر امثالها : وہ زیادتی دس مثل ہوتی ہے جیسا کہ رب تعالیٰ نے فرمایا ﴿ مَنْ جَآءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهٗ عَشْرُ اَمْثَالِهَا ﴾ جو ایک نیکی کا کام کرے تو اس کے لئے اس کی دس مثل ہیں۔

الیٰ سبعمائة ضعف: یعنی دس مثل ایک نیکی پر ثواب عطا کرنا کم از کم درجہ ہے ورنہ کبھی ایک نیکی پر سات سو مثل ثواب عطا کیا جاتا ہے " بل الی اضعاف کثیرة " بلکہ بہت ہی زیادہ ثواب عطا کیا جاتا ہے جیسا کہ رب تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ مَنْ ذَا الَّذِیْ یُقْرِضُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا فَیُضٰعِفَهٗ لَهٗ اَضْعَافًا كَثِیْرَةً ﴾

"جو شخص اللہ تعالیٰ کی راہ میں خلوص سے مال خرچ کرتا ہے اللہ تعالیٰ اسے کئی گنا ثواب زیادہ عطا فرماتا ہے"

قال اللہ تعالیٰ الا الصوم : "رب تعالیٰ نے فرمایا سوائے روزے کے" اس کلام کے دو مقصد ہو سکتے ہیں ایک یہ کہ نبی کریم ﷺ نے مطلق ارشاد فرمایا کہ ہر عبادت کا ثواب دس مثل سے لے کر سات سو مثل تک بلکہ اس سے بھی زیادہ رب تعالیٰ عطا فرماتا ہے دوران گفتگو ہی رب تعالیٰ کا ارشاد آ گیا ہو کہ روزے کو مستثنیٰ (علیحدہ) فرما دیں اسی وجہ سے آپ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ﴿ الا الصوم ﴾ سوائے روزے کے۔

دوسرا مقصد یہ ہوسکتا ہے کہ اگر چہ اس سے پہلے مستثنیٰ منہ صراحۃً ذکر نہیں لیکن پہلی عبارت سے سمجھ آرہا ہے کہ مطلب یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ مومن کو ہر عبادت پر دس مثل سے سات سو مثل تک بلکہ اس سے بھی زائد ثواب عطا کیا جائے گا سوائے روزہ کے۔

روزہ کا حکم علیحدہ کرنے کی وجہ: "فان ثوابه لا یقادر قدره ولا یحصی حصره الا الله تعالیٰ"

روزے کا ثواب اللہ تعالیٰ کے بغیر کوئی اندازہ نہیں لگا سکتا اور نہ ہی اس کے بغیر کوئی شمار کر سکتا ہے روزہ کو وہ خصوصیات حاصل ہیں جو اور کسی عبادت کو حاصل نہیں اسی وجہ سے اس کی جزاء رب تعالیٰ نے اپنے ذمہ کی ہے فرشتوں کے سپرد نہیں کی۔

روزہ کی فضیلت کی دو وجہ: ایک وجہ ان میں سے یہ ہے "انه سر لا یطلع علیه العباد بخلاف سائر العبادات" کہ یہ راز ہے کہ اس پر بندے مطلع نہیں ہو سکتے لیکن دوسری تمام عبادات پر بندے مطلع ہوتے ہیں نماز ادا کرے یا حج یا زکوٰۃ ان تمام پر کوئی نہ کوئی ضرور مطلع ہوتا ہے روزہ میں کوئی ریاء کاری کا شبہ نہیں پایا جاتا اس میں صرف رب تعالیٰ کی رضاء پائی جاتی ہے اسی وجہ سے رب تعالیٰ نے فرمایا ﴿فَاِنَّہٗ لِیْ﴾ بیشک روزہ میرے لئے رکھا جاتا ہے یعنی اس کی ظاہری طور پر کوئی علامات نہیں ہیں باقی تمام عبادات پر کوئی نہ کوئی علامت پائی جاتی ہے جسے دیکھ کر یہ کہا جاتا ہے کہ یہ شخص فلاں عبادت کر رہا ہے۔

وانا اجزی به: "ای وانا العالم بجزائه والی امره ولا اوکله الی غیری"

میں خود ہی اسے جزاء دیتا ہوں کیونکہ اس کی جزاء اور اس کے امور کو میں خود ہی جانتا ہوں اسی لئے اس کی جزاء میں کسی اور کے سپرد نہیں کرتا۔ دوسری وجہ روزہ کی فضیلت کی یہ ہے کہ روزہ سے نفس کی شہوات کو توڑا جاتا ہے اور کھانا پینا بند کر کے بظاہر بدن کو نقصان پہنچایا جاتا ہے باقی عبادات میں یہ کیفیت نہیں ہوتی اسی وجہ سے رب تعالیٰ نے روزہ دار کی تعریف فرمائی کہ "یدع شهوته وطعامه من اجلی" وہ خواہشات کو اور کھانے پینے کی اشیاء کو میری وجہ سے چھوڑتا ہے۔ "من اجلی" کا مطلب یہ ہے کہ وہ میرے حکم اور میری رضاء کو حاصل کرنے کے ارادہ سے اور مجھ سے اجر حاصل کرنے کے لئے وہ روزہ رکھتا ہے۔ روزہ میں نیت اور خلوص پایا جاتا ہے اور اسی خلوص اعتقاد کی وجہ سے یہ واضح

ہوجاتا ہے کہ " **لا ریاء فی الصوم اصلا** "روزے میں بالکل ریاءکاری نہیں پائی جاتی۔

ہاں البتہ زیادہ سے زیادہ یہ ہوسکتا ہے کہ وہ خبر دے کہ میں ''روزہ دار'' ہوں لیکن اس خبر سے اصل روزہ میں ریانہیں پائی گئی۔

للصائم فرحتان : روزہ دارکودوعظیم خوشیاں حاصل ہوتی ہیں ایک دنیامیں اورایک آخرت میں۔

فرحة عند فطره : فطر کے وقت خوشی کی ایک وجہ یہ ہوتی ہے کہ انسان سمجھتا ہے کہ رب تعالیٰ کی مہربانی سے میں نے فرض ادا کردیا ہے میں نے ذمہ داری پوری کردی۔اور دوسری وجہ یہ ہوتی ہے کہ انسان کوبھوک اور پیاس کے بعد جب کھانے پینے کی اجازت حاصل ہوتی ہے توانسان کوطبعی طور پرسرور حاصل ہوتا ہے۔اور تیسری وجہ یہ ہے کہ افطار کے وقت اسے اللہ تعالیٰ کی طرف سے کامل اجر حاصل ہونے کی امید پرخوشی ہوتی ہے کیونکہ حدیث شریف میں ہے " **ان للصائم عند افطاره دعوة مستجابة** " بیشک روزہ دار کی دعاافطار کے وقت قبول ہوتی ہے۔

وفرحة عند لقاء ربه : اورخوشی اسے حاصل ہوگی اپنے رب تعالیٰ کی ملاقات کے وقت۔اس لئے کہ رب تعالیٰ کی طرف سے روزہ دارکوخصوصی جزاءحاصل ہوگی اوررب تعالیٰ اپنے اس بندے کی خصوصی تعریف فرمائے گااورسب سے بڑی وجہ یہ ہے " **بنیل الفوز باللقاء** "کہ رب تعالیٰ سے ملاقات حاصل ہونے پرکامیابی حاصل کرکے خوشی ہوگی۔اسی وجہ سے بعض شارحین نے ﴿ **وانا اجزی بہٖ** ﴾ میں ''اجزیٰ'' کومضارع مجہول واحد متکلم کا صیغہ بھی پڑھا ہے کہ رب تعالیٰ فرماتا ہے کہ روزہ دار کی میں خود جزاءبن جاؤں گا کہ اسے اپنے خصوصی دیدار سے مشرف کروں گا۔

ولخلوف الصائم اطیب عند اللہ من ریح المسک :

روزے دار کے منہ کی بواللہ تعالیٰ کوکستوری کی خوشبو سے زیادہ پسند ہے۔''خلوف'' کی خاءپر ضمہ ہے اگرچہ بعض حضرات نے فتح بھی پڑھا ہے لیکن یہ درست نہیں " **خلوف من خلف فمه اذا تغیر رائحة فمه** " روزہ کی وجہ سے جب منہ کی بومیں تبدیلی آجائے اسے خلوف کہاجاتا ہے۔لیکن یہ خیال رہے کہ اس بوکی وجہ روزہ یعنی معدہ کا خالی ہونا ہے یہ بومسواک سے زائل نہیں ہوتی۔

اسی لئے امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک روزہ کے حال میں جس وقت چاہے مسواک کرے

جائز ہے البتہ امام شافعی رحمہ اللہ پچھلے پہر روزہ دار کے لئے مسواک کرنے کو منع قرار دیتے ہیں۔
''اطیب'' کا معنی افضل، ارضی، کا معنی احب ہے سب کا مطلب تقریباً ایک ہی ہے افضل، پسندیدہ اور محبوب ہونا۔ روزہ چونکہ عبادت ہے رب تعالیٰ کو عبادت پسند ہے جب کہ روزہ دار کے منہ کی بو روزہ کا اثر ہے تو رب تعالیٰ کو اثرِ عبادت بھی پسند ہے۔

والصیام جنۃ: اور روزے ڈھال ہیں " **جنة بضم الجیم وقایة** " جنۃ کی جیم پر پیش ہے اس کا معنی ہے بچانے کا آلہ روزے بھی انسان کو دنیا میں گناہوں سے بچاتے ہیں اور آخرت میں آگ سے بچائیں گے۔

فلا یرفث: فاء پر ضمہ ہے اور کسرہ بھی آتا ہے

ولا یصخب: خاء پر فتح ہے " **لا یرفع صوته بالهذیان** " مطلب واضح ہے کہ روزے کی حالت میں گالی گلوچ نہ نکالے بیہودہ قہقہے نہ لگائے زور زور سے نہ چیخے چلائے بیہودہ شور و غل نہ کرے بلکہ دوسرا کوئی اسے گالی دے یا لڑائی کرے تو پھر بھی جواب نہ دے بلکہ یہ کہہ کر خاموش ہو جائے کہ میں تو روزہ دار ہوں۔ جب تک دوسرا اس پر زیادتی کر رہا ہے یہ خاموش ہے اور صبر سے کام لے رہا ہے تو یہ اللہ تعالیٰ کی ذمہ داری میں ہے اور جب یہ خود اس کا جواب دے تو اس سے اللہ تعالیٰ کی ذمہ داری اٹھ جاتی ہے۔

☆ " **عن ابی هریرة قال قال رسول الله ﷺ اذا کان اول لیلة من شهر رمضان صفدت الشیاطین ومردة الجن وغلقت ابواب النار فلم یفتح منها باب وفتحت ابواب الجنة فلم یغلق منها باب وینادی مناد یا باغی الخیر اقبل ویا باغی الشر اقصر و لله عتقاء من النار وذلک کل لیلة** " (روه الترمذی وابن ماجه ورواه احمد عن رجل وقال الترمذی هذا حدیث غریب"

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جب ماہ رمضان کی پہلی رات آتی ہے تو شیطانوں اور سرکش جنوں کو قید کر لیا جاتا ہے اور جہنم کے دروازے بند کر دیئے جاتے ہیں کوئی دروازہ ان کیلئے کھلا نہیں ہوتا اور جنت کے دروازے کھول دیئے جاتے ہیں کوئی دروازہ ان سے بند نہیں کیا جاتا۔ اور ندا دینے والا ندا دیتا ہے اے نیکیوں کو حاصل کرنیوالے متوجہ ہوا ے گناہوں کو حاصل کرنیوالے پیچھے ہٹ جا اور اللہ کیلئے ہی آگ سے آزاد ہونیوالے ہیں یہ آواز تمام رات دی جاتی ہے۔

وضاحت حدیث: حدیث کے پہلے حصہ کی وضاحت تو پہلے ایک حدیث میں گزر چکی ہے۔

وینادی مناد : اور ندا دینے والا ندا دے گا یہ آواز زبان حال سے اللہ تعالیٰ کی طرف براہ راست آئے گی یا زبان مقال سے فرشتہ کے واسطہ سے یہ آواز دی جائے گی۔

یا باغی الخیر اقبل : اے عمل کو طلب کرنے والے نیکیوں کو حاصل کرنے والے اللہ تعالیٰ کی طرف اور اس کی اطاعت کی طرف متوجہ ہو جا اس کی عبادت میں زیادہ سے زیادہ کوشش کر کیونکہ یہی وقت ہے رب تعالیٰ کی خصوصی رحمت کا کہ تھوڑے عمل پر تجھے خیر کثیر عطا کیا جائے گا۔ گویا کہ رب تعالیٰ کی طرف سے اپنے بندوں کو کہا جاتا ہے کہ تم عبادت کے ذریعے میری طرف توجہ کرو میں اپنی مہربانیوں کے ذریعے تمہاری طرف اپنی رحمت کو متوجہ کروں گا کیونکہ " **فان الخیر کلہ تحت قدرتنا وارادتنا** " تمام خیر ہماری قدرت اور ہمارے اختیار میں ہے۔

ویاباغی الشر اقصر : اے گناہوں کی طرف قصد کرنے والے شخص گناہوں سے رک جا۔ اور اللہ تعالیٰ کی طرف توجہ کر اپنے گناہوں سے مغفرت طلب کر یہ دعا کی قبولیت اور مغفرت کا وقت ہے رمضان شریف میں اللہ تعالیٰ کی وسیع رحمت کے پیش نظر ہی لوگ زیادہ عبادت کرتے ہیں زیادہ رب تعالیٰ کی طرف رجوع کرتے ہیں اکثر لوگ روزے رکھتے ہیں یہاں تک کہ چھوٹے بچے بھی روزے رکھتے ہیں کئی گنہگار بھی روزے رکھتے ہیں نماز نہ پڑھنے والے بھی نماز پڑھتے ہیں حالانکہ روزے کی وجہ سے سستی اور نیند کا غلبہ بھی حاصل ہوتا ہے۔

" **ومع ذلک تری المساجد معمورة وباحیاء اللیالی مغمورة والحمد لله ولا حول ولا قوة الا بالله** "

باوجود اس کے تم مساجد کو نمازیوں سے آباد دیکھو گے رات کو مساجد بھری ہوئی نظر آئیں گی الحمدللہ یہ اللہ تعالیٰ کی رحمت ہی ہے جس کی وجہ سے انسان گناہوں سے بچ جاتے ہیں اور نیکی کی ان کو توفیق حاصل رہتی ہے۔

ولله عتقاء من النار : کثیر لوگ اللہ تعالیٰ کی مہربانی سے اس کی طرف رجوع کر کے آگ سے چھٹکارا حاصل کر لیتے ہیں۔

وذلک کل لیلۃ : اللہ تعالیٰ کی رحمت کا اعلان تمام رات ہی ہوتا رہتا ہے۔(ازمرقاۃ)

فائدہ : ﴿ولله عتقاء﴾ ای کثیرون ﴿من النار﴾ **فلعلک تکون منهم** " اللہ تعالیٰ نے جب اپنی رحمت سے رمضان میں خیر حاصل کرنے والوں اور شر سے اجتناب کرنے والوں کو آگ سے آزاد کرنا ہے تو اے انسان ہوسکتا ہے تو بھی ان میں سے ہی ہو اس لئے وقت کو ہاتھ سے نہ جانے دو (از مرقاۃ)

☆ "عن ابی هریرة قال قال رسول الله ﷺ اتاكم رمضان شهر مبارک فرض الله عليكم صيامه تفتح فيه ابواب السماء وتغلق فيه ابواب الجحيم وتغل فيه مردة الشياطين لله فيه خير من الف شهر من حرم خيرها فقد حرم "(رواه احمد والنسائی)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تمہارے پاس رمضان آ گیا جو برکت والا مہینہ ہے اللہ تعالیٰ نے تم پر روزے فرض کیے ہیں اس میں آسمانوں کے دروازے کھول دیئے جاتے ہیں اور جہنم کے دروازے بند کر دیئے جاتے ہیں اور سرکش شیاطین زنجیروں سے جکڑ دیئے جاتے ہیں اللہ تعالیٰ کے لئے اس میں ایک رات وہ ہوتی ہے جو ہزار مہینوں سے بہتر ہے جو اس کی بھلائی سے محروم کر دیا گیا وہ مکمل طور پر محروم کر دیا گیا۔ (مشکوۃ کتاب الصوم)

وضاحت حدیث:

اتاکم رمضان : تمہارے پاس رمضان کا وقت اور رمضان کے دن آ گئے۔

شهر رمبارک : زیادہ ظاہر مطلب تو یہ ہے کہ یہ "رمضان" سے بدل ہے یا عطف بیان ہے یعنی خبر دی گئی ہے " هو شهر مبارک " وہ برکت والا مہینہ ہے یعنی اس میں بہت مقدار میں حسی اور معنوی بھلائیاں پائی گئی ہیں جیسا کہ عام طور پر یہ بات مشاہدہ میں آتی ہے۔اس میں ایک احتمال یہ بھی ہے کہ یہ دعائیہ کلمہ ہو معنی یہ ہو " جعله الله مبارکا علینا وعلیکم " اللہ تعالیٰ اس مہینہ کو ہمارے اور تمہارے لئے برکت والا بنا دے۔

" وهو اصل فی التهنئة المتعارفة فی اول الشهور بالمباركة "

یہ اصل میں رمضان کی ابتداء میں اس کی برکت کی تہنیت (مبارک باد) دی گئی ہے۔

نبی کریم ﷺ رجب میں یہ دعا فرماتے تھے " اللھم بارک لنا فی رجب وشعبان وبلغنا رمضان " اے اللہ رجب اور شعبان میں ہمیں برکت عطا فرما اور ہمیں رمضان تک پہنچا۔ اس دعا میں اگرچہ اس طرف اشارہ ہے کہ رمضان خود ہی ذاتی طور پر برکت والا ہے اس کی برکت کی دعا کرنے کی ضرورت نہیں " ولکن لا مانع من قبول زیادۃ البرکۃ " لیکن زیادہ برکت کے لئے دعا کرنے میں کوئی حرج نہیں۔ بلکہ راقم کے نزدیک تو یہ صورت ہے کہ رمضان ذاتی طور پر برکت والا ہے لیکن اس کی برکت سے فائدہ حاصل کرنا قسمت والوں کو ہی نصیب ہوتا ہے۔ لہذا یہ دعا کرنا کہ اے اللہ تعالیٰ اسے ہمارے لئے برکت والا بنا۔ کہ ہمیں اس سے برکت حاصل کرنا نصیب ہو جائے یہ زیادہ ہی مفید اور باعث سعادت ہے۔

للہ فیہ لیلۃ خیر من الف شھر:

" یعنی رمضان کی راتوں میں ایک رات وہ ہے جو لیلۃ القدر کے نام سے مشہور ہے اس ایک رات کی عبادت ان ہزار مہینوں کی عبادت سے بہتر ہے جن میں لیلۃ القدر نہ ہو۔

ومن حرم خیرھا : (حرم مجہول اور خیرھا منصوب ہے) یعنی جس شخص کو یہ توفیق حاصل نہ ہوئی کہ وہ لیلۃ القدر کو جاگ کر عبادت کر سکے یا کسی طرح بھی لیلۃ القدر کی برکات کو حاصل نہ کر سکے۔

"فقد حرم ای منع الخیر کلہ" وہ مکمل طور پر بھلائی سے محروم ہو گیا لیکن مراد ثواب کامل سے محرومیت ہے اور اس مغفرت سے محرومیت ہے جو لیلۃ القدر سے حاصل ہونی تھی جس پر بہت بڑی کامیابی کی دارومدار ہے۔

فائدہ جلیلہ : " من صلی العشاء والصبح بجماعۃ فقد ادرک حظہ من لیلۃ القدر واما ما وقع فی شرح المسلم من انہ لا ینال فضلھا الا من اطلعہ اللہ علیھا فالمراد منہ فضلھا الکامل "

جس شخص نے عشاء کی نماز جماعت سے ادا کی اور صبح کی بھی جماعت سے ادا کی تحقیق اس نے لیلۃ القدر کا حصہ پالیا البتہ مسلم شریف کی شرح نووی میں جو یہ ذکر ہے کہ جو شخص لیلۃ القدر پر مطلع ہوا صرف اسی نے لیلۃ القدر کی فضیلت کو حاصل کیا اس سے مراد یہ ہے کہ کامل فضیلت اور کامل درجہ اسے

ہی حاصل ہوا جس کو رب تعالیٰ نے کشف وغیرہ کے ذریعے مطلع کر دیا اور اس نے وہ رات عبادت میں اور بیداری میں گزار دی۔ (از مرقاۃ)

یقیناً ہمارے جیسے انسانوں کے لئے یہی نفع مند ہے اور اسی سے دل کو تسلی ہوگی کہ ہر رات کو لیلۃ القدر سمجھتے ہوئے عشاء کی نماز جماعت سے ادا کرے اور صبح کی نماز بھی جماعت سے ادا کرے اور رمضان شریف میں خصوصی طور پر اس کا اور ہی زیادہ اہتمام کرے۔ (راقم)

☆ **" وعن عبد الله بن عمرو ان رسول الله ﷺ قال الصيام والقرآن يشفعان للعبد يقول الصيام اى انى منعته الطعام والشهوات بالنهار وشفعنى فيه ويقول القرآن منعته النوم بالليل فشفعنى فيه فيشفعان ، رواه البيهقى فى شعب الايمان "**

عبداللہ بن عمرو (بن العاص) رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں بیشک رسول اللہ ﷺ نے فرمایا روزے اور قرآن بندے کی شفاعت کریں گے روزے کہیں گے بیشک ہم نے اس کو دن میں کھانے اور خواہشات سے منع کیا تھا اس لئے اے اللہ اس شخص کے لئے ہماری شفاعت قبول فرما اور قرآن کہے گا میں نے اس کو رات کو سونے سے منع کیا تھا اس کے حق میں میری شفاعت قبول فرما تو ان دونوں کی شفاعت قبول کی جائے گی۔

وضاحت حدیث: کافی حد تک ترجمہ سے مطلب واضح ہے تاہم مختصر یہ سمجھا جائے کہ "الصیام" سے مراد رمضان کے روزے ہیں اگرچہ یہ جمع ہیں آگے صیغے واحد کے ہیں یعنی ہر روزہ کہے گا میں نے اسے کھانے پینے اور خواہشات سے منع کیا تھا راقم نے آسانی کے لئے جمع کا ترجمہ کر دیا۔ قرآن پاک تراویح میں پڑھنا اور سننا اور تہجد میں پڑھنا مراد ہے کیونکہ رات کو سونے سے منع کرنے کا یہی مطلب ہوسکتا ہے۔ (از مرقاۃ)

☆ **عن سلمان الفارسى قال خطبنا رسول الله ﷺ فى آخر يوم من شعبان فقال يا ايها الناس قد اظلكم شهر عظيم شهر مبارك شهر فيه ليلة خير من الف شهر جعل الله صيامه فريضة وقيام ليله تطوعا من تقرب فيه بخصلة من الخير كان كم ادى فريضة فيما سواه ومن ادى فريضة فيه كان كمن ادى سبعين فريضة فيما سواه وهو شهر الصبر والصبر ثوابه الجنة وشهر المواساة وشهر يزاد فيه رزق المؤمن من فطر فيه صائما كان له**

مغفرة لذنوبه وعتق رقبته من النار وكان له مثل اجره من غير ان ينتقص من اجره شئی قلنا يا رسول الله ليس كلنا نجد ما نفطر به الصائم فقال رسول الله ﷺ يعطی الله هذا الثواب من فطر صائما علی مذقة لبن او تمرة اوشربة من ماء ومن اشبع صائما سقاه الله من حوضی شربة لا يظمأ حتی يدخل الجنة وهو شهر اوله رحمة واوسطه مغفرة وآخره عتق من النار ومن خفف عن مملوكه فيه غفر الله له واعتقه من النار "

حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں ہمیں رسول اللہ ﷺ نے خطبہ دیا شعبان کے آخری دن میں تو فرمایا اے لوگو ایک عظیم مہینہ تمہارے قریب آ رہا ہے وہ برکت والا مہینہ ہے اس مہینہ میں ایک رات ہے جو ہزار مہینہ سے بہتر ہے اللہ تعالیٰ نے اس مہینہ میں روزے فرض کیے ہیں اور اس کی رات کو قیام فرض سے زائد عبادت بنائی ہے۔ جو شخص اس میں بھلائی کی کسی ایک عادت سے بھی قرب حاصل کرے وہ ایسا ہی ہے جیسا اس نے اس کے ماسواء میں فرض ادا کیا جس نے اس میں فرض ادا کیا وہ ایسے ہے جیسے اس کے ماسواء میں ستر فرض ادا کئے یہ ماہ صبر ہے اور صبر کا ثواب جنت ہے اور یہ ماہ مواسات ہے اور اس مہینہ میں مومن کا رزق زیادہ کیا جاتا ہے جس شخص نے روزہ دار کا روزہ افطار کرایا اس کے گناہ بخش دیئے جائیں گے اور اسے آگ سے آزاد کر دیا جائے گا روزہ دار کو روزہ افطار کرانے کا ثواب روزہ دار جیسا ہوگا اس کے ثواب میں کوئی کمی نہیں کی جائے گی۔ ہم نے کہا یا رسول اللہ ہم تمام روزہ دار کو روزہ افطار کرانے کی طاقت نہیں رکھتے۔ تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ تعالیٰ یہ ثواب اس شخص کو بھی عطا فرمائے گا جس نے روزہ دار کا روزہ ایک گھونٹ دودھ سے یا ایک کھجور سے یا ایک گھونٹ پانی سے افطار کرادیا جس شخص نے روزہ دار کو سیر کر کے کھلایا اللہ تعالیٰ اس کو میرے حوض سے پلائے گا وہ پیاسا نہیں ہوگا یہاں تک کہ جنت میں داخل ہوگا۔ یہ وہ مہینہ ہے جس کا اول حصہ رحمت ہے اور درمیانہ حصہ مغفرت ہے اور آخر حصہ آگ سے آزاد ہونا ہے جس شخص نے اپنے غلام پر تخفیف کی اللہ تعالیٰ اس کی مغفرت فرمائے گا اور اس کو آگ سے آزاد کرے گا۔

وضاحت حدیث:

قال خطبنا رسول الله ﷺ : اس خطبہ سے مراد جمعہ کا خطبہ ہو یا آپ نے وعظ ونصیحت

کے طور پر کسی وقت خطبہ دیا ہو۔

فقال یا ایها الناس : " **بعد ان حمد الله واثنى عليه** " یعنی نبی کریم ﷺ نے اللہ تعالیٰ کی حمد وثناء کے بعد لوگوں کو خطاب کیا چونکہ آپ کا ہر خطبہ رب تعالیٰ کی حمد وثناء کے بعد ہی ہوا کرتا تھا۔ حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ نے خطبہ میں حمد وثناء کا ذکر نہیں کیا اختصار سے کام لیا کیونکہ جو چیز مشہور ہوا سے ذکر نہ کرنے کے باوجود ہی اس کا علم حاصل ہو جاتا ہے۔

اس کے بعد علامہ ملا علی قاری رحمہ اللہ نے ذکر فرمایا کہ حضرت سلمان رضی اللہ عنہ نے اختصار سے کام نہیں لیا کہ حمد وثناء کو حذف کیا ہو بلکہ اقتصار سے کام لیا الفاظ تھوڑے ہیں مطلب مکمل ہے کیونکہ آپ نے ذکر فرمایا " **خطبنا** " **فان الخطبة هي الحمد والثناء كما هو المشهور عند العلماء والفقهاء** " خطبہ علماء وفقہاء کے نزدیک ہے ہی وہ جس میں حمد وثناء پائی جائے۔

قد اظلکم شهر عظیم : **ای اقبل علیکم ودنا منکم کانه القى عليكم ظله** " اے لوگو تمہاری طرف عظیم مہینہ متوجہ ہو رہا ہے جو تمہارے قریب آ چکا ہے گویا کہ وہ تم پر اپنا سایہ کرنے والا ہے۔

جعل الله صیامه فریضة : اللہ تعالیٰ نے اس مہینہ کے دنوں میں روزہ رکھنا فرض قطعی کر دیا۔

وقیام لیله تطوعا : قیام لیلہ سے مراد تراویح کی نماز کے لئے بیدار ہونا ہے اور " **تطوعا** " سے مراد سنت مؤکدہ ہے کیونکہ تراویح کی نماز ادا کرنا سنت مؤکدہ ہے۔

" **فمن فعله فاز بعظیم ثوابه ومن تركه حرم الخير وعوقب بعتابه** "

جس شخص نے تراویح کو ادا کیا وہ بہت بڑے ثواب سے عظیم کامیاب ہو گیا جس نے تراویح کو ادا نہ کیا وہ بھلائی سے یعنی رب تعالیٰ کی رحمت سے محروم ہو گیا اور رب تعالیٰ کی سرزنش کی سزا کا مستحق ہو گیا۔ رمضان شریف میں کسی قسم کا نفلی عبادت کا کام کرنا ثواب کے لحاظ سے ان فرضوں کے برابر ہو گا جو رمضان کے علاوہ ادا کئے جاتے ہیں اور رمضان شریف میں فرض ادا کرنے کا وہ ثواب حاصل ہو گا جو رمضان کے علاوہ ستر فرض ادا کرنے کا ثواب حاصل ہوتا ہے یعنی رمضان شریف میں عبادت کا ثواب ستر گناہ ہو جاتا ہے۔

وهو شهر الصبر : رمضان کے مہینے میں انسان کھانے اور پینے اور خواہشات سے رکا رہتا ہے اور رات کو زیادہ دیر تک بیدار رہتا ہے پھر سحری کے وقت اٹھتا ہے یہ تمام کام صبر کے ہیں اس لئے اسے

ماہ صبر کہا گیا ہے گویا کہ ﴿ وَاسْتَعِیْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوۃِ ﴾ کا ایک مطلب یہ ہو گیا کہ روزے اور نماز سے امداد طلب کرو " وفیہ اشارہ لطیفة بان باقی الاشھر شھور الشکر " رمضان کو ماہ صبر کہنے سے ایک اور لطیف اشارہ ملتا ہے کہ باقی مہینے شکر والے ہیں کہ ان میں ہر وقت نعمتوں کا استعمال کر کے رب تعالیٰ کا شکر ادا کرے۔اور رمضان ماہ صبر ہے " وکمال الصبر متضمن للشکر " اور کامل صبر بغیر شکر کے حاصل نہیں کیونکہ روزہ کے افطار کے وقت تکمیل عبادت کا شکر اور نعمتوں کے استعمال پر شکر لازم ہے۔اس طرح رمضان شکر و صبر کا مہینہ ہے جو تمام مہینوں کے کمال پر مشتمل ہے۔

وشھر المواساۃ : ''بھائی چارگی کا مہینہ'' مواساۃ، اصل میں ہمزہ سے جس کو واو سے تبدیل کیا گیا ہے اس کا معنی ہے " المساھمة والمشارکة فی المعاش والرزق " ایک دوسرے کے ساتھ حصہ ڈالنا اور رزق اور معیشت میں ایک دوسرے کے ساتھ شریک ہونا۔علامہ طیبی رحمہ اللہ نے ذکر فرمایا کہ رمضان کا نام مواساۃ رکھنے میں اس پر تنبیہ ہے کہ رمضان میں انسانوں کے تمام افراد پر احسان کیا جائے خصوصاً فقراء و غرباء پر زیادہ رحم کیا جائے۔

وشھر یزاد فیه رزق المومن : یہ وہ مہینہ ہے جس میں رب تعالیٰ رزق کی کثرت کر دیتا ہے خواہ غنی ہو یا فقیر " وھذا امر مشاھد فیه " اس معاملہ کا مشاہدہ پایا گیا ہے۔

" ویحتمل تعمیم الرزق بالحسی والمعنوی وفی الحدیث تشجیع علی الکرم "

اور یہ احتمال بھی ہے کہ رزق حسی اور معنوی کو عام کر دیا جاتا ہو کیونکہ حدیث شریف میں ہے کرم پر شجاعت عطا کر دی جاتی ہے۔

من فطر بتشید الطاء : یہاں سے روزہ افطار کرانے والے کے اجر و ثواب کو ذکر فرمایا لیکن اس کے ساتھ شرط یہ ہے " اطعمه او سقاہ عند افطارہ من کسب حلال " روزہ دار کو افطار کے وقت کھلانا اور پلانا اس وقت ثواب کا کام ہے جب وہ رزق حلال ہو دوسری روایت میں واضح طور پر رزق حلال کا ذکر ہے روزہ افطار کرانے کی فضیلت کو سن کر صحابہ کرام نے یہ سمجھا کہ شائد سیر ہو کر کھلانا مقصود ہے اسی لئے صحابہ کرام نے عرض کیا یا رسول اللہ ہم تمام تو روزہ افطار کرانے کی طاقت نہیں رکھتے۔

رسول اللہ ﷺ نے اس کی وضاحت فرمائی کہ دارومدار تو خلوص نیت پر ہے صرف دودھ کے ایک گھونٹ یا ایک کھجور یا ایک گھونٹ پانی سے افطار کرانے سے بھی اجر وثواب حاصل ہوتا ہے وہ اجر ثواب حصول مغفرت اور آگ سے آزاد ہونے کا ذریعہ ہے۔اور روزہ افطار کرانے والے کو روزہ دار جیسا ثواب حاصل ہوتا ہے جب کہ روزہ دار کے ثواب میں کوئی کمی نہیں ہوتی۔

بیہودہ سوچ: بعض لوگ روزہ نہ رکھنے والے سمجھتے ہیں کہ روزہ افطار کرانے سے ہمیں بھی روزہ دار کی طرح ثواب حاصل ہو جائے گا یہ سوچ ان کی بیہودہ ہے رب تعالیٰ کے احکام کو توڑنے کی جسارت کر کے کوئی یہ سمجھے کہ وہ رزق حرام یا رزق حلال سے روزہ دار کو پکوڑے کھلا کر روزہ کو حاصل کر رہا ہے یہ غلط ہے بلکہ گناہ پر گناہ ہے۔(راقم)

جس شخص نے رب تعالیٰ کے احکام کے مطابق خود بھی عمل کیا اور رزق حلال سے روزہ دار کو سیر ہو کر کھانا کھلایا اسے رب تعالیٰ حضور ﷺ کے حوض کوثر سے پلائے گا جنت میں داخل ہونے تک وہ پیاسا نہیں ہوگا۔

وھو شھر اولہ رحمۃ: رمضان کا وہ مہینہ ہے جس کا اول حصہ رحمت ہے یعنی پہلے دس دن رحمت کے ہیں۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے خصوصی رحمت کا نزول ہوتا ہے اسی وجہ سے مومنین روزہ رکھتے ہیں اور تراویح ادا کرتے ہیں ورنہ انسان طبعی طور پر ایسے مشکل کام کیسے کرسکتا ہے۔ "**لو لا اللہ ما اھتدینا ولا تصدقنا ولا صلینا**" اگر اللہ تعالیٰ کی رحمت نہ ہوتی تو نہ ہم ہدایت پر ہوتے اور نہ ہم صدقہ عطا کرتے اور نہ ہم نماز ادا کرتے **الحمد للہ الذی ھدانا لھذا وما کنا لنھتدی لو لا ان ھدانا اللہ**"

واوسطہ مغفرۃ: اور اس کا درمیانہ حصہ مغفرت ہے یعنی دوسرے دس دنوں میں رب تعالیٰ کی طرف سے مومنین کو مغفرت حاصل ہوتی ہے جس طرح کام کرانے والا مالک مزدوروں کو بھی وقت سے پہلے مزدوری دے دیتا ہے ایسے ہی اللہ تعالیٰ رمضان کو ختم ہونے سے پہلے ہی (اپنے لامحدود علم کی وجہ سے کہ یہ مخلصین مؤمنین ہیں انہوں نے رمضان کی آخر تک قدر کرنی ہے) مغفرت فرما دیتا ہے۔

وآخرہ عتق من النار: رمضان کے آخری دس دن آگ سے آزادی کے ہیں کیونکہ آخر میں

کامل اجر عطا کیا جاتا ہے:

" والکل بفضل الجبار وتوفیق الغفار للمؤمنین الابرار للاعمال الموجبة للرحمة والمغفرة والعتق من النار "

یہ سب کچھ اللہ تعالیٰ کے فضل سے ہے کہ وہ مومنوں کو ایسے نیک اعمال کی توفیق عطا فرماتا ہے جو ان کے لئے رحمت اور مغفرت اور آگ سے آزاد ہونے کا ذریعہ بن جاتے ہیں۔

ومن خفف : جس شخص نے اپنے مملوک غلام پر رحم کرتے ہوئے رمضان میں اس سے خدمت لینے میں تخفیف کی اور اس پر روزوں کی آسانی پیدا کرنے کے لئے اس سے تعاون کیا تو اللہ تعالیٰ اس کی مغفرت فرمائے گا اور اسے آگ سے آزاد کردے گا۔

" وفی روایة لابی الشیخ قال رسول اللہ ﷺ من فطر صائما فی شهر رمضان من کسب حلال صلت علیه الملائکة لیالی رمضان کلها وصافحه جبریل لیلة القدر ومن صافحه جبریل علیه السلام یرق قلبه وتکثر دموعه قال فقلت یا رسول اللہ من لم یکن عنده قال فقبضته من طعام قلت افرأیت ان لم یکن عنده لقمة خبز قال فمذقة لبن قلت افرأیت ان لم یکن عنده قال فشربة من ماء "

نبی کریم ﷺ نے فرمایا جو شخص رزق حلال سے رمضان میں کسی کا روزہ افطار کرا دے تو فرشتے اس پر رمضان کی تمام راتوں میں رحمت بھیجتے ہیں اور لیلۃ القدر میں جبریل اس سے مصافحہ کرتا ہے۔ اور جس سے جبریل مصافحہ کرے اس کا دل نرم ہو جاتا ہے اور اس کے آنسو زیادہ جاری ہوتے ہیں۔ راوی کہتے ہیں میں نے عرض کیا یا رسول اللہ ہم میں سے ہر شخص اس کی طاقت نہیں رکھتا آپ نے فرمایا طعام مٹھی بھر سے روزہ افطار کرا دے میں نے کہا اگر اس کی بھی کوئی شخص طاقت نہ رکھے تو پھر آپ کی کیا رائے ہے آپ نے فرمایا ایک گھونٹ دودھ دے دے میں نے کہا اگر اس کی بھی کسی کو طاقت نہ ہو؟ تو آپ نے فرمایا کہ ایک گھونٹ پانی ہی دے دے۔ (از مرقاۃ)

☆ " عن ابن عباس قال کان رسول اللہ ﷺ اذا دخل شهر رمضان اطلق کل اسیر واعطی کل سائل "

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ رمضان شریف کے آتے ہی ہر قیدی کو چھوڑ دیتے تھے اور ہر سائل کو عطا فرماتے تھے۔ (مشکوۃ باب الصوم)

وضاحت حدیث: اسیر، سے مراد ہر محبوس شخص خواہ وہ اللہ تعالیٰ کے حقوق کی وجہ سے قید کیا جاتا یا کسی بندے کے حقوق کی وجہ سے قید کیا جاتا۔

" بتخليصه منه تخلقا باخلاق الله تعالىٰ فان الاطلاق فى معنى الاعتاق "

اللہ تعالیٰ رمضان شریف میں بندوں کو آزاد کرتا ہے چونکہ نبی کریم ﷺ اللہ تعالیٰ کی صفات سے متصف ہیں اس لئے آپ قیدیوں کو آزاد کرتے تھے۔

واعطی کل سائل: اور آپ ہر سائل کو عطا فرماتے تھے اس سے مراد عادت سے زائد آپ رمضان شریف میں عطا فرماتے تھے ورنہ آپ نے کبھی سائل کو یہ نہیں کہا میں نہیں دیتا

" انه ما سئل شيئا الا اعطاه فجاء ه رجل فاعطاه غنما بين جبلين فرجع الى قومه فقال يا قوم اسلموا فان محمدا يعطى عطاء من لايخشى الفقر " (رواه مسلم)

نبی کریم ﷺ سے جب بھی سوال کیا گیا آپ نے ضرور عطا فرمایا ایک شخص آپ کے پاس حاضر ہوا آپ نے اسے دو پہاڑوں کے درمیان چرنے والی بھیڑ بکریاں (تمام یا کثیر) عطا فرمادیں۔ وہ شخص جب اپنی قوم کی طرف لوٹا تو اپنی قوم کو کہنے لگا اے میری قوم اسلام لے آؤ۔ بیشک محمد (ﷺ) تو اتنا دیتے ہیں کہ غربت کا خوف باقی نہیں رہتا۔

" وروى البخارى من حديث جابر ما سئل رسول الله ﷺ عن شئى قط فقال لا "

حضرت جابر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں ایسا نہیں کہ رسول اللہ ﷺ سے کسی چیز کے متعلق سوال کیا گیا تو آپ نے فرمایا ہو " لا " میں نہیں دیتا۔

" وكذا غير مسلم اى ما طلب منه شئى من امر الدنيا فمنعه "

مسلم شریف میں ہے نبی کریم ﷺ سے دنیا کے متعلق کوئی چیز بھی طلب کی گئی تو آپ نے اس سے منع نہیں فرمایا۔

فرزدق نے کہا:

ما قال لا قط الا فی تشھدہ　　　لو لا اتشھد کانت لاؤہ نعم

نبی کریم ﷺ نے سوائے تشہد کے " لا " (نہیں دیتا) نہیں فرمایا اگر تشہد نہ ہوتا تو آپ کا "لا" (نہیں) بھی "نعم" (ہاں) ہوتا۔

تنبیہ: شیخ عزالدین بن عبدالسلام رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کے "لا" نہ کہنے کا مطلب یہ ہے:

" لم یقل لا منعا للعطاء و لا یلزم من ذلک ان لا یقولھا اعتذارا "

کہ آپ نے کسی سائل کو منع کرنے کی غرض سے اور نہ دینے کے ارادہ سے " لا " ارشاد نہیں فرمایا البتہ عذر کے طور پر آپ نے " لا " ارشاد فرمایا۔ نبی کریم ﷺ کے پاس جنگ کے موقع پر صحابی حاضر ہوئے کہ ہمارے پاس سواریاں نہیں آپ ہمیں سواریاں عطا فرمائیں۔ تو آپ کے جواب کو رب تعالیٰ نے ذکر فرمایا" قلت لا اجد ما احملکم علیه " آپ نے فرمایا میں نہیں پاتا کہ تمہیں اس پر سوار کردوں۔

" و لا یخفی الفرق بین قول لا اجد ما احملکم و بین لا احملکم "

نبی کریم ﷺ نے فرمایا" لا اجد ما احملکم علیه " میرے پاس کوئی سواری نہیں کہ میں تمہیں سواری پر سوار کروں۔ آپ نے یہ ارشاد نہیں فرمایا " لا احملکم " میں تمہیں سواری عطا نہیں کرتا۔ دونوں کلاموں میں بہت بڑا فرق ہے:

" وفی حدیث ابن عباس عند الشیخین قال کان النبی ﷺ اجود الناس واجود ما یکون فی رمضان حین یلقاہ جبریل فیدا رسه القرآن فلرسول اللہ ﷺ حین یلقاہ جبریل اجود بالخیر من الریح المرسلة "

بخاری و مسلم نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے حدیث کو روایت کیا رسول اللہ ﷺ سب لوگوں سے زیادہ سخی تھے۔ اور رمضان شریف میں جب آپ سے جبریل ملتے اور قرآن پاک کا دور کرتے تو آپ اور ہی زیادہ سخاوت فرماتے۔ رسول اللہ ﷺ جبریل کی ملاقات کے وقت تیز چلنے والی ہوا سے بھی زیادہ سخاوت فرماتے۔ (از مرقاۃ)

☆ "عن ابن عمر ان النبی ﷺ قال ان الجنة تزخرف لرمضان من رأس الحول الی

حول قابل قال فاذا کان اول یوم من رمضان هبت ریح تحت العرش من ورق الجنة علی حور العین فیقلن یا رب اجعل لنا من عبادک ازواجا تقربهم اعیننا وتقرا عینهم بنا "
(رواه البیهقی الاحادیث الثلاثة فی شعب الایمان)

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں بیشک نبی کریم ﷺ نے فرمایا بیشک جنت کو ایک سال کے رمضان سے دوسرے سال کے رمضان تک آراستہ کیا جاتا ہے عرش کے نیچے سے جنت کے پتوں سے ہوا بڑی آنکھوں والی حوروں پر چلتی ہے وہ حوریں کہتی ہیں اے ہمارے رب اپنے بندوں سے ہمارے زوج بنا جن سے ہماری آنکھیں ٹھنڈی ہوں اور ہماری وجہ سے ان کی آنکھیں ٹھنڈی ہوں۔
(مشکوۃ کتاب الصوم)

وضاحت حدیث:

تزخرف : سونے وغیرہ سے مزین کرنا۔ **لرمضان** : رمضان کے آنے کے لئے۔
من رأس الحول الی حول قابل : اس میں دو احتمال ہیں ایک یہ ہے کہ محرم سے آنے والے محرم تک جنت کو سجایا جاتا ہے اور دوسرا احتمال یہ ہے کہ رمضان سے رمضان تک جنت کو سجایا جاتا ہے ہر صورت میں مطلب یہ ہے:

" وحاصله ان الجنة فی جمیع السنة من اولها الی آخرها مزینة لاجل رمضان وما یترتب علیه من کثرة الغفران ورفع درجات الجنان ما قبله وما بعده من الزمان "

کہ جنت کو تمام سال اول سے آخر تک سجائے رکھا جاتا ہے یعنی رمضان کے آنے اور اس پر کثیر مغفرت کے واقع ہونے اور جنتوں کا مقام بلند ہونے کی وجہ سے ان کو سجایا جاتا ہے۔ " ویناسبه کونه یوم عید وسرور " رمضان کی آمد جنت والوں کے لئے عید کا دن ہوتا ہے۔
فائدہ : جب رمضان کی آمد کے لئے جنت کو سجایا جاتا ہے اور رمضان کا آنا جنت والوں کے لئے عید کا دن ہوتا ہے تو اسی سے واضح ہوگیا کہ جس ذات کے طفیل رمضان ملا وہ ذات نبی کریم ﷺ کی ہے اس ذات کے آنے پر گھروں، گلیوں اور محلوں کو سجانا اور اس دن کو عید منانا فرشتوں کی سنت ہے۔ (راقم)

جب رمضان کا پہلا دن ہوتا ہے تو عرش کے نیچے سے معطر (خوشبودار) ہوا چلتی ہے جو جنت

کے درختوں سے ہوتی ہوئی جنتی حوروں کے سروں تک پہنچتی ہے باوجوداس کے کہ وہ ہوا خوشبودار ہوگی لیکن روزہ دار کے منہ کی بواس سے بھی زیادہ اللہ تعالیٰ کو پسند ہے اسی لئے حوریں بھی اللہ تعالیٰ کے نیک روزے دار بندوں کی زوجیت میں آنے کو پسند کریں گی۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: " **لو یعلم العباد ما رمضان لتمنت امتی ان تکون السنة کلها رمضان** " اگر بندوں کو پتہ چل جائے کہ رمضان (کی فضیلت) کیا ہے تو امت یہ تمنا کرتی کہ تمام سال رمضان ہوتا۔ (از مرقاۃ)

☆ " **عن ابی هریرة عن النبی ﷺ انه قال یغفر لامته فی آخر لیلة فی رمضان قیل یا رسول الله اهی لیلة القدر قال لا ولکن العامل انما یوفی فی اجره اذا قضی عمله** "

(رواہ احمد)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ آپ کی امت (کے روزہ داروں) کی رمضان کی آخری رات کو مغفرت کردی جاتی ہے صحابہ کرام نے پوچھا یارسول اللہ کیا وہ لیلۃ القدر ہوگی؟ آپ نے فرمایا نہیں لیکن عمل کرنے والا جب اپنا عمل مکمل کر لیتا ہے تو رب تعالیٰ کی طرف سے اسے مکمل اجر عطا کیا جاتا ہے۔ (مشکوۃ کتاب الصوم)

وضاحت: صحابہ کرام نے سمجھا شائد مغفرت کی وجہ آخری رات کا لیلۃ القدر ہونا ہے لیکن حضور ﷺ نے فرمایا کہ مغفرت کی وجہ روزے داروں کے عمل کی تکمیل ہوگی۔ لیلۃ القدر چونکہ معین بھی نہیں پھر آخری رات کا انتیس کی طاق رات ہونا بھی ضروری نہیں وہ تیس بھی ہوسکتی ہے پھر لیلۃ القدر ذاتی طور پر تو بخشش کا ذریعہ نہیں۔ بلکہ اس میں عبادت کی جائے تب وہ بخشش کا ذریعہ ہے۔ (از مرقاۃ)

☆ " **عن عبد الله بن مسعود قال خرجنا مع رسول الله ﷺ ونحن شباب لا نقدر علی شیء وقال یا معشر الشباب علیکم بالباءة فانه اغض للبصر واحصن للفرج فمن لم یستطع منکم الباءة فعلیه بالصوم فان الصوم له وجاء هذا حدیث حسن صحیح** "

(ترمذی ابواب النکاح)

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں ہم ایک مرتبہ نبی کریم ﷺ کے ساتھ نکلے اور ہم جوان تھے ہم کسی چیز پر قادر نہیں تھے آپ نے فرمایا اے جوانوں کے قبیلہ تم پر لازم ہے کہ شادی کرلو بیشک یہ نظر کو پست کرنے والی ہے اور فرج کی حفاظت کرنے والی ہے جو شخص تم میں سے شادی کی طاقت

نہیں رکھتا اس پر لازم ہے کہ وہ روزے رکھے بیشک روزہ اس کی شہوت کو کم کرنے کا ذریعہ ہے۔

یعنی حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ اور آپ کے ساتھ کچھ اور جوان بھی تھے یہ حضرات غربت کی وجہ سے شادی کرنے کی طاقت نہیں رکھتے تھے کہ مہر وغیرہ ادا کریں نبی کریم ﷺ کے ساتھ یہ لوگ چل رہے تھے تو آپ نے ان کو مشورہ دیا کہ شادی کر لو مطلب یہی تھا کہ تم محنت مزدوری کرو اور والدین کو بھی کہو کہ وہ بھی محنت مزدوری کر کے تمہاری شادی کا انتظام کرلیں۔ جب تک شادی کا انتظام نہیں ہوسکتا روزے رکھا کرو کیونکہ ان سے شہوت کم ہوتی ہے۔

"وجاء" اگرچہ معنی خصی بنا ہے تاہم یہاں مراد شہوت کا کم ہونا ہے۔ اور یہ بھی خیال رہے کہ نبی کریم ﷺ کا نوجوان صحابہ کرام کو روزہ رکھنے کا مشورہ دینا عام نفلی روزے رکھنے کے متعلق تھا کیونکہ رمضان کا روزہ تو ہر بالغ شخص پر فرض ہے۔

فَمَنْ كَانَ مِنكُم مَّرِيضًا اَوْ عَلٰى سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ اَيَّامٍ اُخَرَ :

"جو شخص تم میں سے ہو مریض یا سفر میں ہو تو اتنے اور دنوں میں" یعنی جو شخص مریض ہو یا سفر میں ہو روزہ نہ رکھ سکے تو جتنے روزے نہیں رکھ سکا اتنے دن روزہ قضا کرلے۔

مریض کب روزہ افطار کرسکتا ہے؟ جب اتنی شدید مرض ہو کہ روزہ سے ہلاک ہونے کا خطرہ ہو تو روزہ افطار کرنے کی شرعاً اجازت ہے۔ اگر مسلمان ماہر طبیب یہ کہے کہ روزہ رکھنے سے یہ مرض بڑھ جائے گی تو پھر بھی روزہ افطار کیا جاسکتا ہے۔ اسی طرح اگر مسلمان ماہر طبیب یہ بتائے کہ روزہ رکھنے سے یہ مرض لمبی ہوجائے گی دیر سے ٹھیک ہوگی تو اس صورت میں بھی روزہ افطار کیا جاسکتا ہے۔

اسی طرح تندرست شخص کو مسلمان ماہر طبیب یہ بتائے کہ روزہ رکھنے سے تم فلاں مرض میں مبتلا ہوجاؤ گے تو روزہ افطار کرنے کی اجازت ہے۔ (از تبیین الحقائق للزیلعی رحمہ اللہ)

مسافر کب روزہ افطار کرسکتا ہے؟ جب سفر کا ارادہ پایا جائے اور سفر کی وہ مقدار جو شرعاً انسان کو مسافر بناتی ہے اتنی مقدار سفر کرنے کا اردہ ہو۔ حکومت آج امریکی حکم پر تعمیل کرنے کی غرض سے دینی مدارس کے خلاف جو غیر اسلامی پروپیگنڈہ میں مشغول ہے بے دینوں کو دین دار بنانے کی فکر نہیں لیکن دین داروں کو بے دین بنانے کی فکر بہت شدت سے لاحق ہے۔ ہوٹلوں میں برتن دھونے والے بچوں کو

پڑھانے کی فکر نہیں، چھوٹے چھوٹے بچے کوڑے سے کاغذ اٹھا کر بیچ کر محنت مزدوری کر رہے ہیں ان کو تعلیم دینے کی فکر نہیں، جوتے پالش کرنے والے بچوں کو اور ادھر سے ادھر اٹھا کر سامان لے جانے والے بچوں کو پڑھانے کی فکر نہیں لیکن بے دینوں کو فکر ہے تو اس کی کہ قرآن پاک، حدیث پاک، فقہ، اصول فقہ، علم کلام، علم معانی، علم بیان، علم بدیع، علم صرف، علم نحو، علم منطق، فلسفہ، ادب، مناظرہ، نظم، عروض وغیرہ پڑھنے والوں کو انگلش پڑھا کر بکاؤ مال کیسے بنایا جائے امریکہ کا ہمنوا کیسے بنایا جائے لیکن انشاء اللہ علماء کرام علوم عصریہ کو پڑھ کر زیادہ ان کا وبال جان بنیں گے۔

راقم نے 1994ء میں لکھا: سراجی کے اردو حاشیہ کے آخر میں ''خیالات محشی'' کے عنوان سے ایک مضمون لکھا اس کا مختصر اقتباس دیکھیں ساتھ ساتھ ہی انشاء اللہ مقدار سفر بھی معلوم ہوگی اور علماء کے نظریات کا بھی پتہ چل جائے گا۔

سلف صالحین علوم شرعیہ نقلیہ میں جہاں بلند و بالا مقام رکھتے تھے وہاں علوم عقلیہ میں بھی ان کو مہارت تامہ حاصل تھی۔ منطق فلسفہ ہیئت ریاضی وغیرہ علوم میں ان کی تصنیفات کو دیکھنے سے ان کے جواہر علمی کا پتہ چلتا ہے لیکن یہ خیال رکھنا بھی ضروری ہے کہ فلسفہ میں علمی ابحاث کی ضرورت کیوں در پیش آئی؟ اس لئے کہ جب فلاسفہ بخت و اتفاق کے قائل ہوئے دہریئے ہوئے مالک الملک کا تصور چھوڑ بیٹھے تو سلف صالحین، علماء ربانین نے ان کا رد بلیغ فرمایا۔ حضرت علامہ مولنا فضل حق خیر آبادی رحمہ اللہ کا ''ھدیہ سعیدیہ'' اس پر شاہد ہے غرضیکہ فلسفی بحثوں میں عرق ریزی صرف وقتی تقاضا کے پیش نظر تھی سلف صالحین کی طرح ہر زمانہ میں علماء کرام وقتی تقاضا کو پیش نظر رکھیں پیمانہ بدلنے سے ذہن کا بدلنا ضروری ہے۔

فقہاء کرام نے مقدار سفر اڑتالیس میل بیان کی ہے لیکن اعلیٰ حضرت مولنا احمد رضا خان بریلوی رحمہ اللہ نے ساڑھے ستاون میل بیان کی ہے وجہ کیا ہے؟ وجہ صرف یہ ہے کہ آپ کو علمی کمالات کے ساتھ ذہنی فراست بھی حاصل تھی حقیقت یہ ہے کہ ایک حصہ علم کے ساتھ نو حصہ عقل کی بھی ضرورت ہے۔

فقہاء کرام کے بیان کردہ میل اور ہمارے مروج میل کی مقدار میں فرق ہے اس فرق کو سمجھا

جائے تو کوئی صاحب عقل اب بھی اڑتالیس میل کا فتوی نہ دے لیکن کچھ لکیر کے فقیر اب بھی اڑتالیس میل کا راگ الاپتے رہتے ہیں وہ فرق میں انشاء اللہ آگے واضح کر رہا ہوں۔ درحقیقت ذہنوں میں جمود طاری رہنا دائیں بائیں نہ دیکھنا، دائیں بائیں دیکھنے کو شجرہ ممنوعہ سمجھنا ہی اس قسم کی غلطیوں کا سبب ہے اس لئے میرے خیال میں موجودہ دور کے تقاضا کے مطابق علماء کرام کا مقصد عظیم مطمح نظر علوم دینیہ کو ہی سمجھیں لیکن جدید علوم، انگلش، سائنس ریاضی اور اکنامکس جیسے مضامین بھی پڑھیں۔

یہ حقائق روز روشن کی طرح واضح ہیں کہ انگریز کی سازش سے علوم دینیہ کو "العوام کالانعام" کی نظر میں حقیر کر کے دکھایا گیا۔ آج کل بھی کئی لوگوں کو کہتے سنا گیا کہ یہ لوگ مدارس میں ایک دو کتابیں پڑھاتے ہیں احمقوں کی جنت میں بسنے والے ان لوگوں کو معلوم نہیں کہ دینی مدارس میں بیس بائیس علوم پڑھائے جاتے ہیں یہ فقط دینی مدارس کا خاصہ ہے کہ ان کے مدرسین صرف اللہ تعالیٰ کی رضا کی خاطر بغیر کسی وقفہ کے پانچ چھ گھنٹے لگاتار پڑھاتے ہیں ہڑتالیں اور سہولیات کے مطالبات کا یہاں نام ونشان نہیں۔ سال کی دو ماہ کی چھٹیاں اور ہر جمعہ کی چھٹی نکال کر آپ حساب کریں تو یقیناً آپ کو تسلیم کرنا پڑے گا کہ سال میں تقریباً 240 دن تک پڑھائی کا جاری رہنا صرف دینی مدارس کا خاصہ ہے ورنہ دنیاوی مدارس سال میں 150 دن پڑھائی بھی مکمل نہیں کر پاتے۔ جن حضرات نے دینی تعلیم حاصل کی پھر دنیاوی تعلیم حاصل کر کے سکولوں کالجوں سے منسلک ہو گئے وہ بفضلہ تعالیٰ اسے تسلیم کرتے ہیں کہ حقیقت میں پڑھائی دینی مدارس میں ہے جہاں علوم کو علوم کر کے پڑھایا جاتا ہے خلاصے یاد کرا کے امتحان پاس کرانا ان کا شیوہ نہیں اب صرف اس پر کف دست (ہتھیلیاں) ملنا اور اظہار تاسف (افسوس) کرتے رہنا کہ "انگریز نے علوم دینیہ کی وقعت کو کم کر دیا" کافی نہیں بلکہ اس کا مقابلہ کرنا ضروری ہے۔

اس لئے عزیز طلباء کرام جور و جفا کی آندھیوں کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے مستقبل کو درخشاں کرنے کے لئے علوم دینیہ میں مہارت تامہ حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ علوم جدیدہ کو حاصل کرنے کے لئے قدم بڑھاؤ۔ بڑھتے چلے جاؤ انشاء اللہ برتری علوم دینیہ کو ہی حاصل رہے گی۔ تاکہ علوم جدیدہ کی وجہ سے کوئی کند ذہن دین کا باغی تمہیں جاہل کہنے کی جرات نہ کر سکے۔ بڑے بڑے ڈاکٹر بھی اپنی ڈاکٹریٹ کی ڈگری کو انشاء اللہ تمہارے علوم کے سامنے کم ترین سمجھیں گے۔

مقدار سفر کی تحقیق: " المیل وھو اربعة آلاف ذراع وھو اربع وعشرون اصبعا وھی ست شعیرات ظھر لبطن وھوست شعرات بغل " (شامی)

میل چار ہزار ذراع کا ہے ایک ذراع چوبیس انگلیوں کا ہے ایک انگلی چھ جو کی ہے جنؑ دعرضا رکھا جائے اور ایک جو خچر کے چھ بالوں کے برابر ہے۔ عام مشہور یہ ہے کہ ذراع ہاتھ کی انگلیوں سے لے کر کہنیوں تک ہے جو نصف گز ہے (ڈیڑھ فٹ ہے) اس لحاظ پر فقہی میل اور ہمارے مشہور میل میں فرق واضح ہو گیا اس فرق کو نکالنے سے واضح ہو جائے گا کہ مقدار سفر کیا ہے؟ وہ فرق یہ ہے

فقہی میل ۴۸×۲۰۰۰---۴۰×۱۷ (رواجی میل) = ۸۰ گز۔۴ فرلانگ۔۵۴ میل۔

راقم نے ۲۴ انگلیوں کی پیائش کی ہے جو انیس انچ سے کچھ زائد بنتی ہیں اسی وجہ سے جلیل القدر ہستیوں کے حساب میں تھوڑا فرق پایا گیا ہے مفکر اسلام مفسر قرآن حضرت پیر محمد کرم شاہ الازہری نے ضیاء القرآن میں مقدار سفر چون 54 میل لکھی ہے اور حضرت علامہ محمود احمد رضوی رحمہ اللہ نے فیوض الباری میں ستاون میل اور اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ نے فتاوی رضویہ میں ساڑھے ستاون میل ذکر فرمائی ہے راقم کو احتیاط ساڑھے ستاون میل میں ہی نظر آتی ہے اس مقدار کے مطابق آج کل پیائش کے نئے انداز کے مطابق مقدار سفر = بانوے کلومیٹر پانچ سو سینتیس میٹر ہے۔

مسافر روزہ رکھ سکے تو روزہ رکھنا بہتر ہے: مسافر نے صبح صادق سے پہلے سفر شروع کر لیا تو روزہ افطار کر سکتا ہے۔ اگر صبح صادق کے بعد سفر شروع کیا تو رزہ افطار کرنا درست نہیں تاہم اگر روزہ افطار کر لے تو اس پر کفارہ لازم نہیں آئے گا۔ مسافر کو اگر روزہ رکھنے سے ہلاکت کا خطرہ ہو تو اس پر واجب ہے کہ روزہ افطار کرے اگر ہلاکت کا خطرہ نہیں دوران سفر روزہ رکھ سکتا ہے تو روزہ رکھنا بہتر ہے کیونکہ جب تمام لوگ روزہ دار ہوں تو ان کے ساتھ روزہ رکھنا آسان ہوتا ہے اکیلے روزہ رکھنا مشکل ہے۔ لیکن اگر سفر کی مقدار مکمل ہے سفر بڑی آسانی کا ہو خواہ ہوائی جہاز پر سفر کر رہا ہو تو یہ روزہ افطار کرنا چاہے تو روزہ افطار کر سکتا ہے بعد میں قضاء کر لے۔ (از نور الایضاح وطحطاوی)

مرض اور سفر کے حکم میں فرق: سفر سے روزہ افطار کرنا مباح نہیں ہوتا اگر سفر کرنے کا ارادہ ہے تو

روزہ شروع میں رکھے ہی نہیں روزہ رکھ کر صبح صادق کے بعد سفر کرنے پر افطار کرنا جائز نہیں لیکن مریض ہو تو روزہ شروع میں نہ رکھے پھر بھی جائز ہے اور دن کے کسی وقت بھی مریض ہو جائے روزہ مکمل کرنا دشوار ہو تو روزہ افطار کر سکتا ہے۔ (از طحطاوی)

قضاء کا حکم: مریض حالت مرض میں اور مسافر حالت سفر میں اگر فوت ہو جائیں تو ان پر قضاء کرنا لازم نہیں اور نہ ہی فدیہ دینے کی وصیت کرنا لازم ہے کیونکہ اس نے قضاء کرنے کے دن پائے ہی نہیں۔ مریض درست ہو گیا، مسافر مقیم ہو گیا تو جتنا جلدی ہو سکے روزے قضا کر لے کیونکہ زندگی کا پتہ نہیں اپنے ذمہ سے فرض کو اتارنا ضروری ہے تاہم اگر وقفے وقفے سے روزے قضاء کرے تو جائز ہے لگاتار قضا کرنا لازم نہیں اگر قضاء میں اتنی دیر کر دے کہ دوسرا رمضان آ جائے تو پہلے وقتی رمضان کے روزے ادا کرے پھر رمضان کے بعد جن روزوں کی قضاء لازم تھی ان کو قضاء کرے۔ (از طحطاوی)

مسافر کے روزہ کے متعلق احادیث:

" عن عائشة قالت ان حمزة بن عمرو الاسلمی قال للنبی ﷺ اصوم فی السفر و کان کثیر الصیام فقال ان شئت فصم وان شئت فافطر "

(بخاری، مسلم، مشکوۃ باب صوم المسافر)

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ بیشک حمزہ بن عمرو اسلمی نے نبی کریم ﷺ کی خدمت میں عرض کیا کہ میں سفر میں روزہ رکھتا ہوں یہ بہت روزے رکھتے تھے نبی کریم ﷺ نے فرمایا اگر تم چاہو تو روزہ رکھ لو اور اگر تم چاہو تو افطار کر لو۔

وضاحت حدیث: صحابی کے سوال کا مطلب یہ تھا کہ میں سفر میں روزہ رکھتا ہوں اس کا حکم کیا ہے کیا میں گنہگار تو نہیں ہو رہا نبی کریم ﷺ نے فرمایا چاہو تو روزہ رکھ لو چاہو تو افطار کر لو یعنی تمہیں اختیار ہے:

" فقال بعضهم الصوم افضل وهو قول مالک والثوری والشافعی واصحاب ابی حنفیة "

بعض حضرات کا قول ہے کہ مسافر کے لئے روزہ رکھنا افضل ہے یہی قول امام مالک، سفیان

ثوری، امام شافعی اور احناف رحمہم اللہ کا ہے۔

اعتراض : نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے "لیس من البر الصیام فی السفر" سفر میں روزہ رکھنا نیکی کا کام نہیں اس سے تو پتہ چلتا ہے کہ روزہ رکھنا گناہ ہے۔

جواب : نبی کریم ﷺ کا یہ ارشاد ایک خاص موقع پر ہے:

"حین رأی زحما ورجلا قد ظلل علیه فقال ما هذا قالوا صائم فقال لیس من البر الصیام فی السفر"

جب کہ آپ نے دیکھا کہ لوگ ہجوم کئے ہوئے ہیں آپ نے دیکھا کہ ایک شخص پر لوگ سایہ کئے ہوئے ہیں (شدید گرمی روزہ کی وجہ سے ایک شخص بیہوش ہو گئے تھا اس حالت کو دیکھ کر) آپ نے فرمایا سفر کی حالت میں روزے رکھنا نیکی کا کام نہیں۔ آپ کا یہ ارشاد ہمارے موقف کے خلاف نہیں کیونکہ ہمارا موقف یہ ہے "واما الذی یجهده الصوم فی السفر ولا یطیقه فافطاره اولی" کہ جو شخص سفر میں روزہ رکھنے کی طاقت نہ رکھتا ہو بلکہ روزہ اسے مشقت میں ڈالے تو اس کے لئے روزہ افطار کرنا بہتر ہے۔ (از مرقاۃ)

☆ "وعن ابی سعید الخدری قال غزونا مع رسول الله ﷺ لست عشرة مضت من شهر رمضان فمنا من صام ومنا من افطر فلم یعب الصائم علی المفطر ولا المفطر علی الصائم" (رواه مسلم)

حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں ہم نے رسول اللہ ﷺ کے ساتھ مل کر غزوہ (جہاد) کیا جب کہ رمضان کے سولہ دن گزر گئے تھے بعض ہم میں سے روزہ دار تھے اور بعض ہم میں سے افطار کر رہے تھے روزہ دار افطار کرنے والے کا کوئی عیب نہیں بیان کر رہا تھا اور افطار کرنے والا روزہ دار کا کوئی عیب بیان نہیں کر رہا تھا۔ (مشکوۃ باب صوم المسافر)

وضاحت حدیث : اس حدیث پاک سے عظیم فائدہ یہ حاصل ہوا کہ جب کسی کام کے کرنے یا نہ کرنے کی شریعت نے اجازت دی ہو تو کوئی عمل کرے تو اس سے نہ پوچھا جائے کہ تم نے اس پر عمل کیوں کیا ہے؟ اور اگر کوئی عمل نہ کرے تو اس سے نہ پوچھا جائے کہ تو نے یہ عمل کیوں نہیں کیا کاش کہ اس حدیث پاک کو لوگ سمجھیں مستحبات اور مباحات میں جھگڑے پیدا کر کے اپنی بے وقوفی کا

اظہار نہ کریں اور لوگوں کو دین سے برگشتہ نہ کریں۔

☆ عن انس قال کنا مع النبی ﷺ فی السفر فمنا الصائم ومنا المفطر فنزلنا منزلا فی یوم حار فسقط الصوامون وقام المفطرون فضربوا الابنیة وسقوا الرکاب فقال رسول اللہ ﷺ ذھب المفطرون الیوم بالاجر" (بخاری ومسلم)

حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں ہم نبی کریم ﷺ کے ساتھ سفر میں تھے بعض ہم میں سے روزہ دار تھے اور بعض افطار کرنے والے تھے ہم ایک جگہ اترے سخت گرم دن تھا روزے دار گر گئے اور افطار کرنے والے قائم رہے انہوں نے ہی خیمے لگائے اور سواریوں کو پانی پلایا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا آج افطار کرنے والوں نے زیادہ اجر حاصل کرلیا۔ (مشکوۃ باب صوم المسافر)

وضاحت حدیث: سقط الصوامون، کا ظاہری معنی ہی مراد لے لیا جائے تو پھر بھی درست ہے کہ روزے دار نڈھال ہو کر گر گئے لیٹ گئے اور مجازی معنی زیادہ مناسب ہے کہ وہ حرکت کرنے یعنی چلنے پھرنے سے عاجز آ گئے یہاں تک کہ وہ اپنا کام خیمے لگانے اور اپنی سواریوں کو پانی پلانے کا بھی سرانجام نہ دے سکے۔ افطار کرنے والوں نے اپنا کام بھی کیا اور روزے داروں کا کام بھی کیا۔ اسی وجہ سے نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ وہ روزے داروں سے زیادہ اجر حاصل کر گئے۔

اس حدیث پاک سے یہ واضح ہوا کہ اگر سفر میں روزہ سفر کرنے سے رکاوٹ بنے یا مشقت کا سبب بنے تو ایسے حال میں روزہ افطار کرنا زیادہ بہتر ہے۔ (از مرقاۃ)

☆ عن ابن عباس قال خرج رسول اللہ ﷺ من المدینة الی مکة فصام حتی بلغ عسفان ثم دعا بماء فرفعه الی یده لیراه الناس فافطر حتی قدم مکة وذلک فی رمضان فکان ابن عباس یقول قد صام رسول اللہ ﷺ وافطر فمن شاء صام ومن شاء افطر"
(بخاری ومسلم، وفی روایة عن جابر انه شرب بعد العصر)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ مدینہ طیبہ سے مکہ مکرمہ کی طرف نکلے یہاں تک کہ آپ عسفان میں پہنچے تو آپ نے پانی طلب کیا جو اپنے ہاتھ میں لیا پھر ہاتھوں کو بلند کیا تاکہ لوگ دیکھ لیں تو آپ نے روزہ افطار کر دیا یہاں تک کہ مکہ مکرمہ میں آ گئے یہ رمضان میں افطار کیا گیا حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے تھے رسول اللہ ﷺ نے روزہ بھی رکھا اور افطار بھی کیا اس

لئے سفر کے حال میں جو چاہے روزہ رکھے اور جو چاہے افطار کردے۔ (مشکوۃ باب صوم المسافر)

وضاحت حدیث : عسفان (بضم العین وسکون السین) مکہ شریف سے دو مرحلے دور ایک جگہ کا نام ہے "ثم دعا بماء" (پھر پانی طلب کیا) فرفعه الی یده" کا معنی یہ بیان کیا گیا "فرفعه رفعا بلیغ منتهیا الی رفع یده" کہ پھر آپ نے وہ پانی اپنے ہاتھوں کو جہاں تک بلند کر سکتے تھے بلند کیا۔

لیراه الناس فافطر : لیعلموا جوازه او لیختاروا متابعته" پانی کو بلند کر کے روزہ افطار کرنے کی وجہ یہ تھی کہ لوگ دیکھ لیں کہ روزہ افطار کرنا جائز ہو چکا ہے تاکہ وہ بھی نبی کریم ﷺ کی متابعت کر سکیں۔

اعتراض : پہلے تو بیان کیا گیا ہے کہ مسافر کے لئے روزہ رکھ کر صبح صادق کے بعد سفر کرنے پر افطار کرنا جائز نہیں۔ تو وہ کس طرح درست ہے جب نبی کریم ﷺ نے سفر میں عصر کے وقت روزہ افطار فرما دیا۔

جواب : "وهو لحصول العذر الحادث وهو التهيؤ للقتال ان احتيج اليه في الاستقبال"

نبی کریم ﷺ کا روزہ افطار کرنا عذر کی وجہ سے تھا ایک تو یہ کہ لمبا سفر طے کیا جا چکا تھا پھر آنے والے وقت کو مدنظر رکھتے ہوئے کہ قتال کی تیاری کے لئے روزہ افطار کرنا بہتر ہے کیونکہ یہ فتح مکہ کے دوران واقع در پیش آیا۔ " وهو اما لبيان الجواز " اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ بیان جواز مقصود ہو کیونکہ جیسا پہلے بیان کیا جا چکا ہے کہ اگرچہ افطار درست تو نہیں لیکن اگر افطار کر دے تو کفارہ لازم نہیں جس سے یہ سمجھ آتا ہے کہ افطار نہ کرنا بہتر ہے اگر افطار کر لیا تو کسی حد تک جائز ہے نبی کریم ﷺ پر لازم تھا کہ آپ ہر اس فعل پر ایک مرتبہ عمل کریں جو جائز ہے۔ (از مرقاۃ)

تنبیہ : امت کے حق میں جو کام خلاف اولیٰ ہے لیکن جائز ہے وہ کام کرنا نبی کریم ﷺ پر بیان جواز کے لئے واجب ہوتا تھا۔ جب آپ پر واجب ہوتا تھا تو آپ کے حق میں وہ خلاف اولی نہیں ہوتا تھا۔ جاہل عشاق یہ فرق نہیں سمجھتے اگر کوئی یہ کہہ دے نبی کریم ﷺ نے بظاہر خلاف اولی کام کیا۔ تو اس

پر وہ اودھم مچا دیتے ہیں "بظاہر" کے باریک فرق کو سمجھنے سے قاصر ہیں۔

☆ " عن انس بن مالک الکعبی قال قال رسول الله ﷺ ان الله وضع عن المسافر شطر الصلوۃ والصوم عن المسافر وعن المرضع والحبلی رواہ ابو داؤد والترمذی والنسائی وابن ماجه "

حضرت انس بن مالک کعبی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا بیشک اللہ تعالیٰ نے مسافر سے نصف نماز کی تخفیف فرمائی۔ اور مسافر اور دودھ پلانے والی عورت اور حاملہ عورت سے روزوں میں تخفیف فرمائی۔ (مشکوۃ باب صوم المسافر)

وضاحت حدیث : سب سے پہلے تو راوی حضرت انس رضی اللہ عنہ کے متعلق یہ سمجھا جائے کہ یہ ابوامامہ انس بن مالک کعبی قشیری، عقیلی، عامری ہیں ان سے صرف یہ ایک حدیث مروی ہے۔ دوسرے انس، ابوحمزہ انس بن مالک انصاری، تجاری، خزرجی ہیں جو نبی کریم ﷺ کے مدینہ طیبہ میں رہنے کی تمام مدت خدمت گزاری میں رہے ان سے کثیر روایات مروی ہیں۔

" شطر الصلوۃ " سے مراد چار رکعت والی نمازوں میں نصف نماز یعنی دو رکعتیں معاف فرما دیں جن کی قضا نہیں۔ " والصوم عن المسافر والمرضع والحبلی " سے ایک اور مسئلہ کی طرف لطیف اشارہ ہے کہ دودھ پلانے والی عورت یا حاملہ عورت پر نماز دوگانہ نہیں۔ بلکہ صرف روزہ کا حکم ان پر، مسافر کی طرح ہے کہ اگر وہ روزہ نہ رکھ سکیں کہ ان کے روزہ سے ان کے مریض ہونے کا خطرہ ہے یا بچے کو اور کوئی چیز نہیں کھلائی اور پلائی جا سکتی تو وہ وقتی طور پر روزہ افطار کر لیں اور بعد میں قضاء کر لیں ان کو فدیہ دینا جائز نہیں کہ روزے کے بدلے فدیہ پر اکتفا کر لیں بلکہ قضا لازم ہے۔

اعتراض : تم نے پہلے ثابت کیا ہے کہ مسافر خواہ جہاز پر بھی سفر کر رہا ہو تو وہ روزہ افطار کر سکتا۔ حالانکہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد اس کے خلاف نظر آتا ہے وہ یہ ہے:

" عن سلمة بن المحبق قال قال رسول الله ﷺ من كان له حمولة تأوى الى شبع فليصم رمضان حيث ادركه رواه ابو داؤد "

سلمہ بن محبق فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس شخص کے پاس سواری رکے سیر

ہونے کی حالت میں (یعنی اس کے پاس زادہ راہ موجود ہو جہاں قیام کرے اسے کوئی مشکل درپیش نہ آئے) تو جہاں روزے کا وقت ہو جائے وہ روزہ رکھے۔ (مشکوۃ باب صوم المسافر)

اس حدیث سے تو یہ سمجھ آ رہا ہے کہ سواری میسر ہونے کی صورت میں اور کھانا حاصل ہونے کی صورت میں سفر میں روزہ رکھا جائے۔ سفر میں آسانی حاصل ہونے کے باوجود مسافر کو روزہ افطار کرنے کے جواز کا قول کیسے صحیح ہے؟

جواب: یہ حدیث پاک ہمارے موقف کے مخالف نہیں حدیث پاک کی وضاحت میں یہ بیان کیا گیا ہے:

" قال الطيبي الامر فيه محمول على الندب بالحث على الاولى والافضل للنصوص الدالة على جواز الافطار فی السفر مطلقا "

علامہ طیبی رحمہ اللہ نے فرمایا نبی کریم ﷺ کے ارشاد کا مطلب یہ ہے کہ مستحب ہے کہ جس شخص کے پاس سواری بھی اور زادہ راہ (خرچ) بھی ہو اس کے لئے چونکہ مشکل نہیں لہذا روزہ رکھنا اس کے لئے اولی اور افضل ہے البتہ افطار کرنا چاہے تو افطار کر لے افطار والی روایات مطلق ہیں بس یہی ہمارا موقف ہے کہ روزہ رکھ سکے تو سفر میں روزہ رکھنا افضل ہے۔ (از مرقاۃ)

☆ **" عن جابر ان رسول الله ﷺ خرج عام الفتح الى مكة فی رمضان فصام حتى بلغ كراع الغميم فصام الناس ثم دعا بقدح من ماء فرفعه حتى نظر الناس اليه ثم شرب فقيل له بعد ذلك ان بعض الناس قد صام فقال اولئك العصاة اولئك العصاة "** (رواہ مسلم)

حضرت جابر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں بیشک رسول اللہ ﷺ فتح مکہ کے سال (مدینہ طیبہ سے) نکلے رمضان کا مہینہ تھا آپ نے روزہ رکھا ہوا تھا یہاں تک کہ کراع غمیم میں آپ پہنچے لوگوں نے بھی روزہ رکھا ہوا تھا پھر آپ نے پانی کا پیالہ منگوایا اس پیالے کو بلند کیا یہاں تک لوگوں نے جب دیکھ لیا تو آپ نے پانی پی لیا (روزہ غروب آفتاب سے پہلے عصر کے وقت افطار کر دیا) پھر آپ کو بتایا گیا کہ بیشک بعض لوگوں نے روزہ رکھا ہوا ہے آپ نے فرمایا وہ لوگ نافرمان ہیں وہ لوگ نافرمان ہیں۔

وضاحت حدیث: کراع غمیم (بضم الكاف) کا ایک حصہ عسفان سے ملتا ہے اس لئے پہلے جو حدیث مذکور ہوئی اس میں عسفان کا ذکر ہے اور اس حدیث میں کراع غمیم کا ذکر ہے

واقعہ ایک ہے وجہ وہی ہے کہ سفر کی مشکل اور مستقبل میں قتال کی تیاری کے لئے آپ نے روزہ افطار فرمایا " اولئک العصاۃ " کے الفاظ کو نبی کریم ﷺ نے تاکیداً دو مرتبہ ذکر فرمایا جس کا معنی ہے "اولئک الکاملون فی العصیان " وہ لوگ کامل طور پر نافرمان ہیں۔ روزہ رکھنے والوں کو آپ نے کامل نافرمان کیوں فرمایا؟ اس کی دو وجہ ہیں ایک یہ ہے کہ:

" حیث عملوا بالظن مع القدرۃ علی الیقین بالسؤال منہ علیہ الصلوۃ والسلام "

انہوں نے اپنے گمان پر عمل کیا کہ روزہ رکھنا جائز ہے حالانکہ ان میں نبی کریم ﷺ تشریف فرما تھے آپ سے پوچھ کر وہ یقین پر عمل کر سکتے تھے۔

دوسری وجہ ان کی طرف نافرمانی منسوب کرنے کی یہ ہے:

" فان النبی ﷺ انما رفع قدح الماء لیراہ الناس فیتبعوہ فی قبول رخصۃ اللہ تعالیٰ فمن صام فقد بالغ فی عصیانہ "

کہ نبی کریم ﷺ نے پانی کا پیالہ بلند کیا تاکہ لوگ اسے دیکھ لیں اور آپ کی تابعداری کریں کہ اللہ تعالیٰ نے روزہ افطار کرنے کی رخصت دی ہے پھر جن لوگوں نے روزہ رکھا انہوں نے گویا کہ بہت نافرمانی کی۔

تنبیہ : یہ محبت کی وجہ سے زجر ہے (ڈانٹ ڈپٹ ہے) کیونکہ محبت کا تقاضا یہ تھا کہ محبوب کی ادا کو اپنایا جاتا۔ جو حضرات ایسا نہ کر سکے ان پر مصطفیٰ کریم ﷺ کا دل رنجیدہ ہوا گویا یوں کہا جائے کہ مصطفیٰ کریم ﷺ نے یہ فرمایا کہ اے میرے پیارو تم سے تو یہ توقع نہیں تھی کہ میرے عمل کے مطابق تم عمل نہیں کرو گے۔ ورنہ حقیقت میں صحابہ کرام کی کوئی غلطی نہ تھی:

" لان الظاھر ان ھذا وقع منھم بناء علی خطأ اجتھادھم اذ لم یقع امر صریح بافطارھم "

کیونکہ یہ ان سے اجتہادی خطا واقع ہوئی اجتہادی خطا گناہ نہیں اور نہ ہی کوئی ایسا جرم ہے کہ اس کے متعلق پوچھا جائے اس لئے کہ ان کو واضح طور پر روزہ رکھنے سے منع نہیں کیا گیا تھا۔ (از مرقاۃ)

سفر میں شدید تکلیف اٹھا کر روزہ رکھنا منع ہے:

" عن عبد الرحمن بن عوف قال قال رسول الله ﷺ صائم رمضان فی السفر كالمفطر فی الحضر رواہ ابن ماجه "

حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا رمضان میں سفر کے دوران روزہ رکھنا ایسے ہی ہے جس طرح مقیم شخص (بغیر کسی عذر کے) روزہ افطار کرلے۔

وضاحت حدیث: " صائم رمضان فی السفر ای مع احتمال المشقة المضرة "

رمضان میں سفر کے دوران جو شخص نقصان دہ مشقت اٹھا کر روزہ رکھے یعنی روزہ ہلاک کرنے والا ہو بیمار کرنے والا ہو، بیہوشی تک پہنچانے والا ہو ایسی صورت میں روزہ رکھنا اسی طرح گناہ ہوگا جیسا کہ مقیم شخص کو بلا عذر روزہ افطار کرنا گناہ ہے یعنی اللہ تعالیٰ نے انسان کو جب آسانی عطا فرمائی ہے تو انسان اپنے آپ کو مشقت میں نہ ڈالے۔ (از مرقاۃ)

ایک حدیث میں کیا خوب بیان:

" عن حمزة بن عمرو الاسلمی انه قال یا رسول الله انی اجد بی قوة علی الصیام فی السفر فهل علی جناح قال هی رخصة من الله عزوجل فمن اخذ بها فحسن ومن احب ان یصوم فلا جناح علیه " (رواہ مسلم)

حمزہ بن عمرو اسلمی نے عرض کیا یا رسول اللہ میں سفر میں روزہ رکھنے کی طاقت رکھتا ہوں کیا مجھ پر (روزہ رکھنا) گناہ ہے؟ آپ نے فرمایا یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے رخصت ہے جو شخص اس پر عمل کرے (رخصت سے فائدہ اٹھائے) تو اچھا ہے اور جس شخص کو روزہ محبوب ہو تو اس پر کوئی گناہ نہیں۔

(مشکوۃ باب صوم المسافر)

وضاحت: جب کسی کام پر عمل کرنا اصل ہو تو اس کیلئے لفظ عزیمۃ بولا جاتا ہے اکثر طور پر عمل عزیمۃ پر بہتر ہوتا ہے لیکن جس کام کو آسان کرنے کیلئے اس میں ڈھیل دی جائے اس کو نرم کیا جائے اس کو رخصۃ کہا جاتا ہے۔ اس پر عمل کرنا جائز ہوتا ہے لیکن اسکے مقابل صورت پر عمل کرنا اکثر اوقات بہتر ہوتا ہے۔ اس تمہید کے بعد نبی کریم ﷺ کے ارشاد کو دیکھئے آپ نے کیا خوب فرمایا" **قال هی رخصة من الله عزوجل** " کہ سفر کے دوران روزہ نہ رکھنا رخصت ہے اللہ تعالیٰ کی طرف سے۔ اسی ارشاد سے ضمناً یہ بات بھی سمجھ میں آ گئی " **فان الصوم عزيمة منه تعالىٰ لقوله فمن شهد منكم الشهر فليصمه** " کہ بیشک روزہ رکھنا اللہ تعالیٰ کی طرف سے عزیمت ہے۔ کیونکہ رب تعالیٰ نے رمضان کو پا لینے والے پر روزہ فرض کیا ہے۔ چونکہ سائل کے سوال کی دارومدار" **انی اجد قوة على الصيام فی السفر** " (بیشک میں سفر میں روزہ رکھنے کی طاقت رکھتا ہوں) پر ہے لہٰذا اسی سے واضح ہو گیا:

" **الافطار فی السفر رخصة ای تسهيل من الله عزوجل لعباده دفعا للمشقة عليهم (ما جعل عليكم فی الدين من حرج)** "

کہ سفر کے دوران افطار کی رخصت اس لئے دی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں سے مشقت کو اٹھا کر آسانی پیدا فرمائی ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے دین میں مشکل نہیں پیدا فرمائی۔" **فمن اخذ بها فحسن** " (جس نے رخصت پر عمل کیا تو اچھا ہے) اس کا مطلب یہ ہے:

" **فعله حسن مرضی لاجناح عليه للحديث الآخر ان الله يحب ان يؤتی رخصة كما يحب ان يؤتی عزائمه** "

کہ رخصت پر عمل کرنا بھی اچھا اور پسندیدہ ہے یعنی کبھی کبھی رخصت پر عمل بھی کیا جائے تا کہ رخصت کا مقصد فوت نہ ہو جائے۔ کیونکہ ایک اور حدیث میں ہے بیشک اللہ تعالیٰ کو پسند ہے کہ رخصت پر بھی ایسے ہی عمل کیا جائے جیسے عزیمت پر عمل کیا جاتا ہے۔" **ومن احب ان يصوم فلا جناح عليه** " اور جسے روزہ رکھنے سے محبت ہو اس پر کوئی گناہ نہیں کہ روزہ رکھے:

" **وفی مغايرة العبارة بين الشرطين اشارة لطيفة الى افضلية الصوم** "

دونوں شرطوں کی علیحدہ علیحدہ عبارتوں سے لطیف اشارہ اس طرف کر دیا گیا ہے کہ روزہ رکھنا افضل

ہے۔وہ کیسے؟ وہ اس طرح کہ رخصت کا ذکر نبی کریم ﷺ نے ان الفاظ مبارکہ سے کیا " فمن اخذ بها فحسن " جس نے رخصت پر عمل کیا تو اچھا ہے لیکن جب عزیمت کا ذکر فرمایا تو ارشاد فرمایا" ومن احب ان یصوم فلا جناح علیه " جس شخص کو روزہ رکھنا محبوب ہو وہ روزہ رکھے اس پر کوئی گناہ نہیں۔

" فمن اخذ بها " (جو اس پر عمل کرے) ومن احب (اور جسے محبت ہو) کے الفاظ کو ذرا غور سے دیکھیں خود بخود سمجھ آ جائے گا کہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد کس لطافت اور فصاحت پر مبنی ہے۔

اعتراض: حدیث پاک میں تو رخصت پر عمل کرنے کو "حسن" کہا گیا ہے اور روزے رکھنے کی صورت میں " فلا جناح علیه " کہہ کر صرف گناہ کی نفی کی گئی ہے اس میں روزہ کی افضلیت کیسے ثابت ہے؟

جواب: ایک وجہ تو پہلے ثابت کی جا چکی ہے کہ " ومن احب " کے الفاظ سے روزہ کی افضلیت روز روشن کی طرح ثابت ہے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ جب رخصت کے لئے " حسن " کا لفظ استعمال کیا تو اسی سے اشارہ فرما دیا کہ جب کوئی شخص عزیمت پر عمل کرے گا اور روزہ اسے محبوب ہوگا تو یقینا روزہ رکھنا احسن ہوگا۔ ابھی راقم نے جو مفہوم پیش کیا ہے اسے ملا علی قاری رحمہ اللہ کے ان الفاظ میں دیکھا جائے "لان الرخصة اذا كانت حسنا فالعزيمة اولى بذلک " اس لئے کہ رخصت پر عمل کرنا جب حسن ہوگا تو عزیمت پر عمل کرنا اس سے بھی زیادہ بہتر ہوگا اور سب سے عظیم وجہ یہ ہے:

" ولعله عليه السلام علم بنور النبوة ان مراد السائل بقوله فهل على جناح اى فى الصوم ويدل عليه المقدمة المتقدمة من قوله انى اجدبى قوة على الصيام "

کہ اگرچہ سائل نے " فهو على جناح " میں وضاحت نہیں کی کہ وہ کس چیز کے متعلق سوال کر رہا ہے کہ مجھ پر کس چیز کا گناہ نہیں لیکن نبی کریم ﷺ سے نور نبوت سے یہ معلوم کر لیا تھا کہ سائل کا مقصد یہ ہے کہ دوران سفر کیا روزہ رکھنے کا مجھ پر گناہ تو نہیں۔ نیز اس کے پہلے الفاظ بھی اس پر دلالت کر رہے ہیں کہ اس نے یہ کہا کہ میں دوران سفر روزہ رکھنے کی طاقت پاتا ہوں۔

روزے کی قضاء کے متعلق احادیث مبارکہ:

" عن عائشة قالت كان يكون على الصوم من رمضان فما استطيع ان

اقضی الا فی شعبان قال یحی بن سعید تعنی الشغل من النبی او

بالنبی ﷺ "...... بخاری و مسلم (مشکوۃ باب القضاء)

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ مجھ پر رمضان کے روزے ہوتے جو میں قضا کی طاقت نہیں رکھتی تھی یہاں تک کہ شعبان آ جاتا تو میں روزے قضا کرتی۔ یحی بن سعید (روای حدیث) کہتے ہیں کہ اس کی وجہ کہ نبی کریم ﷺ کے ساتھ مشغولیت تھی۔

وضاحت حدیث : حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا پر رمضان کے روزے لازم ہونے کی وجہ وہی تھی جو ہر عورت کو لاحق ہوتی ہے یعنی حیض کے دنوں میں چونکہ روزے رکھنے منع ہیں ان کو قضاء کرنا پڑتا ہے۔ نبی کریم ﷺ کے ساتھ مشغولیت کا کیا مطلب؟ اس کا مطلب یہ ہے:

" انها کانت مهیئة نفسها لرسول الله ﷺ لا ستمتاعه فی جمیع اوقاتها ان اراده بذلک ذکره الطیبی "

علامہ طیبی رحمہ اللہ نے بیان فرمایا کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے مدنظر نبی کریم ﷺ کا ادب واحترام تھا کہ آپ کہیں نفع حاصل کرنے کا مطالبہ کریں تو میں روزہ کا عذر نہ پیش کروں بلکہ ہمہ وقت نبی کریم ﷺ کی خواہشات کا خیال ان کے دل میں رہتا تھا۔

شعبان میں آپ روزے قضاء کرتی تھیں اس کی وجہ تو یہ تھی کہ آپ کے دل میں خیال ہوتا تھا کہ آنے والے رمضان سے پہلے وہ روزے قضاء کر لئے جائیں جو کہ سابق رمضان کے آپ کے ذمہ ہیں کیونکہ آنے والے رمضان میں وہی عذر پھر اور روزے میرے ذمہ لازم کرنے کا سبب بنے گا اس طرح بوجھ بڑھتا چلا جائے گا۔ لیکن شعبان میں روزے قضا کرنے کی عظیم وجہ یہ تھی:

" ان النبی ﷺ کان یصوم اکثر شعبان علی ما روی انه کان یصوم شعبان الا قلیلا، ولا یحتاج الیها فیه "

کہ شعبان کے مہینے میں نبی کریم ﷺ بہت روزے رکھتے تھے جیسا کہ روایت میں آتا ہے کہ نبی کریم ﷺ شعبان میں کم ہی افطار کرتے تھے زیادہ روزے رکھتے تھے۔ اس وجہ سے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو بھی روزے قضاء کرنے کا وقت آسانی سے مل جاتا ہے۔

☆ " وعن ابی هریرة قال قال رسول الله ﷺ لا یحل للمرأة ان تصوم وزوجها شاهد

الا باذنه ولا تأذن فی بیته الا باذنه " (رواہ مسلم)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کسی عورت کے لئے جائز نہیں کہ وہ روزہ رکھے جب اس کا خاوند موجود ہو تو اس سے پہلے اجازت طلب کرے اور زوج کے گھر میں زوج کے بغیر کسی اور سے اجازت طلب نہ کرے۔ (مشکوۃ باب القضاء)

وضاحت حدیث : حدیث پاک میں جو روزے نہ رکھنے کا ذکر ہے اس سے مراد یہ ہے:

" لا ینبغی ان تصوم قضاء رمضان او قضاء صوم النفل اذا کان الوقت متسعا "

مناسب نہیں کہ عورت خاوند کی اجازت کے بغیر رمضان کے روزے قضاء کرے۔ یا نفلی روزہ کہیں رکھ کر توڑ دیا تھا تو اس کی قضاء کرے البتہ شرط یہ ہے کہ وقت میں وسعت ہو۔ اور یہ بھی قانون شریعت واضح ہے کہ خاوند کو چاہئے کہ وہ زوجہ کو فرائض اور واجبات سے منع نہ کرے۔ اس لئے کسی دن تو منع کر سکتا ہے ہر دن ہی منع کرنا اس کے لئے جائز نہیں ہوگا۔ ضمنی طور پر اس سے یہ بھی ثابت ہو گیا کہ عورت نفلی روزے خاوند کی اجازت کے بغیر نہ رکھے:

" ولا تاذن فی بیته الا باذنه " یعنی ولا یحل لها ان تأذن احدا من الاجانب او الاقارب حتی النساء "

یعنی عورت کے لئے یہ جائز نہیں کہ وہ خاوند کے بغیر دوسرے اجنبی یا قریبی لوگوں سے اجازت طلب کرے بلکہ اس کے لئے یہ بھی جائز نہیں کہ وہ عورتوں سے اجازت طلب کرے یہ اجازت صرف خاوند سے طلب کرے " الا باذنه وفی معناه العلم برضاه " خاوند سے اجازت صراحۃً طلب کرنا ضروری نہیں بلکہ جب یہ علم حاصل ہو کہ خاوند روزوں کی قضاء یا نفلی روزے رکھنے پر راضی ہے تو یہ اجازت ہی ہوگی۔ (از مرقاۃ)

حیض کی حالت میں چھوٹ جانے والی نمازوں اور روزں کا حکم:

" وعن معاذة العدوية انها قالت لعائشة ما بال الحائض تقضی الصوم ولا تقضی الصلوة قالت کان یصیبنا ذلک فتؤمر بقضاء الصوم ولا نؤمر بقضاء الصلوة " (رواہ مسلم)

حضرت معاذہ عدویہ نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے سوال کیا کہ حیض والی عورتوں کا کیا حال

ہے کہ وہ روزہ قضاء کرتی ہیں اور نمازیں قضاء نہیں کرتیں۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا ہمیں یہ (حیض) پہنچتا تو ہمیں حکم دیا جاتا کہ ہم روزے قضا کریں اور ہمیں نمازیں قضا کرنے کا حکم نہیں دیا جاتا تھا۔
(مشکوۃ باب القضاء)

وضاحت حدیث: ایک تو یہ خیال کیا جائے کہ حیض اور نفاس کے احکام نماز اور روزے کے ایک ہیں۔ اس لئے سوال کا تعلق گویا کہ دونوں سے رہے گا۔ حضرت معاذۃ عدویہ کا سوال تعجب کی وجہ سے تھا کہ نماز بھی فرض ہے اور روزہ بھی فرض ہے نماز اور روزہ کے چھوٹ جانے کی وجہ ایک ہے پھر کتنا ہی مقام تعجب ہے کہ نمازوں کو قضاء نہیں کیا جاتا اور روزوں کو قضاء کیا جاتا ہے۔

اگر چہ اس کا عقلی جواب بھی اہل علم نے دیا ہے کہ نمازیں زیادہ رہ جاتی ہیں ان کے قضاء کرنے میں حرج لازم آتی ہے اس لئے حرج کو اٹھایا گیا ہے لیکن روزے سال میں ایک دفعہ آتے ہیں تھوڑی مقدار میں روزوں کا رہ جانا پھر ان کی سال میں قضاء کوئی مشکل نہیں۔ لیکن حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا جواب بہت ہی خوب حکمت بھرا جواب ہے کہ شریعت تو رب تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کے حکم کا نام ہے جب ہمیں حکم ہی یہ دیا گیا ہے کہ ہم روزے قضاء کریں اور نمازیں قضا نہ کریں تو ہم نے وہی کام کرنا ہے جس کا ہمیں حکم دیا گیا۔

سبحان اللہ کیا خوب علم تھا صحابیات کا سوال بھی حکمت بھرا جو باعث تعجب تھا۔ جواب بھی بہت خوب حکمت وفصاحت پر مبنی دراصل سوال کرنے والی صحابیہ کا مقصد ہی یہ تھا کہ اس کے متعلق کیا تم نے نبی کریم ﷺ سے کچھ سنا ہے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے جواب کا مطلب یہ ہے کہ ہاں جو سنا ہے اسی پر عمل کر رہے ہیں۔ (از مرقاۃ)

وَعَلَى الَّذِيْنَ يُطِيْقُوْنَهٗ فِدْيَةٌ طَعَامُ مِسْكِيْنٍ:

''اور جنھیں اس کی طاقت نہ ہو وہ بدلہ دیں ایک مسکین کا کھانا'' ان الفاظ مبارکہ میں ﴿وَعَلَى الَّذِيْنَ يُطِيْقُوْنَهٗ﴾ کا ترجمہ اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ نے فرمایا ''اور جنہیں اس کی طاقت نہ ہو۔ اور راقم نے بھی یہی ترجمہ نقل کیا ہے۔ راقم نے تراجم کا تقابلی جائزہ اپنی کتاب ''تسکین الجنان فی محاسن کنز الایمان'' میں پیش کیا ہے اسی کو یہاں نقل کر رہا ہوں کافی حد تک مفہوم بھی سمجھ آ جائے گا اور دوسرے حضرات کا ترجمہ مثبت ہے ''جو طاقت رکھتے ہیں'' تراجم میں فرق بھی سمجھ آ جائے گا۔

مختلف تراجم:

☆ اور جن کو طاقت ہے روزہ کی ان کے ذمہ بدلا ہے ایک فقیر کا کھانا۔ (محمود الحسن صاحب)

☆ جو لوگ روزہ رکھنے کی قدرت رکھتے ہوں (پھر نہ رکھیں) تو وہ فدیہ دیں۔ (مودودی صاحب)

☆ اور جو لوگ اسے مشکل سے برداشت کر سکیں ان کے ذمہ فدیہ ہے کہ (وہ) ایک مسکین کا کھانا ہے۔ (عبد الماجد صاحب)

☆ اور جو لوگ روزہ رکھنے کی طاقت رکھیں (لیکن رکھیں نہیں) وہ روزے کے بدلے محتاج کو کھانا کھلائیں۔ (فتح محمد صاحب)

☆ اور اوپر ان لوگوں کے کہ طاقت رکھتے ہیں اس کا بدلہ ہے کھانا ایک فقیر کا۔ (شاہ رفیع الدین صاحب)

☆ اور جنہیں اس کی طاقت نہ ہو وہ بدلہ دے ایک فقیر کا کھانا۔ (اعلیٰ حضرت)

یہاں روزے کا فدیہ دینے کا ذکر ہے آیا فدیہ وہ شخص دے جو روزہ رکھ سکتا ہے پھر یہ حکم منسوخ ہو گیا یا یہ کہ حکم ابھی باقی ہے فدیہ دینے کا حکم اس شخص کو جو روزہ رکھنے کی طاقت نہیں رکھتا۔ اس مقام پر اعلیٰ حضرت کا دوسرا قول ہے یہ ہی زیادہ معتبر ہے۔ اگرچہ پہلے قول کو بھی ذکر کیا گیا ہے:

﴿ وَعَلَى الَّذِيْنَ ﴾ لا ﴿ يُطِيْقُوْنَهٗ ﴾ لكبر او مرض لا يرجى برؤه " (جلالین)

فدیہ ان لوگوں پر ہے جو روزہ رکھنے کی طاقت نہیں رکھتے بڑھاپے کی وجہ سے یا مرض دائمی کی وجہ سے حاشیہ جلالین میں اس طرح مذکور ہے:

" قوله ﴿ وَعَلَى الَّذِيْنَ يُطِيْقُوْنَهٗ ﴾ اى لايطيقونه واعلم ان عند اكثر المفسرين فيه قولان احدهما ان المراد بالذين يطيقونه الاصحاء المقيمون خيرهم فى ابتداء الاسلام بين الامرين بين ان يصوموا وبين ان يفدوا ويفدا لئلا يشق عليهم لانهم كانوا لم يتعودوا ثم نسخ التخيير ونزلت العزيمة بقوله فمن شهد منكم الشهر فليصمه وثانيهما ان يكون لا محذوفا وهو واقع فى كثير من استعمال الفصحاء كما فى قوله تعالىٰ ﴿ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اَنْ تَضِلُّوْا ﴾ وكان المعنى وعلى الذين لا يطيقونه فدية طعام مسكين "

بے شک اکثر مفسرین کے اس میں دو قول ہیں ایک یہ ہے کہ اس سے مراد وہ لوگ ہیں جو طاقت رکھتے ہیں صحیح ہوں مقیم ہوں ان کو ابتداء اسلام میں دو امروں میں اختیار دیا گیا تھا کہ وہ روزہ رکھیں یا افطار کریں اور فدیہ دے دیں تا کہ ان پر شاق نہ ہو کیونکہ ان کو روزہ رکھنے کی پہلے عادت نہ تھی پھر اس اختیار کو منسوخ کر دیا گیا ﴿ فَمَنْ شَهِدَ مِنكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ ﴾ سے۔

دوسرا قول یہ ہے کہ یہاں ''لا'' محذوف ہے فصحاء کے استعمال میں ایسا کثیر الوقوع ہے جیسے اللہ تعالیٰ کے ارشاد گرامی ﴿ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اَنْ تَضِلُّوْا ﴾ میں بھی " لا " محذوف ہے اور معنی ﴿ ان لا تضلوا ﴾ ہے (بیان کرتا اللہ تعالیٰ کا تمہارے لئے تا کہ تم گمراہ نہ ہو)۔ زیر بحث آیۃ کریمہ میں۔ "وعلی الذین یطیقونہ فدیة " اس معنی میں ہے۔ " وعلی الذین لایطیقونہ فدیة "اور جنہیں اس کی طاقت نہ ہو وہ فدیہ دیں۔ اس نفی والے قول پر ایک اور صورت پیش کی گئی، قولہ یطیقونہ قال فی تفسیر الشیخ یطیق من اطاق فلان اذا زالت طاقتہ والھمزة للسلب ای لایقدرون علی الصوم یطیقونہ " کہ ﴿ يُطِيْقُوْنَهٗ ﴾ باب افعال سے ہے جس کا ہمزہ کبھی سلب کے لئے آتا ہے اس صورت میں بھی معنی یہ ہوگا جو روزہ رکھنے کی طاقت نہیں رکھتے ان پر فدیہ ہے۔ زیادہ پسندیدہ قول یہی ہے کہ یہ حکم منسوخ نہیں بلکہ شیخ فانی کے حق میں موجود ہے۔ (تسکین الجنان ص ۶۱، ۶۲)

فدیہ کب لازم آئے گا: ایک وجہ تو مندرجہ بالا سے سمجھ آئی کہ جو شخص شیخ فانی ہو (یعنی ایسی عمر میں کہ روزہ نہ رکھ سکے اور نہ ہی آئندہ روزہ رکھنے کی کوئی امید ہو) وہ روزہ کی جگہ فدیہ دے دے۔ جو شخص مریض تھا یا مسافر تھا روزے نہیں رکھ سکا۔ پھر صحیح ہو گیا یا مقیم ہو گیا روزے قضاء کرنے کا وقت مل گیا لیکن قضاء نہ کر سکا تو اس پر لازم ہے کہ وصیت کر جائے کہ اس کے روزوں کا فدیہ ادا کر دیا جائے اگر اس نے وصیت کر دی تو اس کے تہائی مال سے اس کے روزوں کا فدیہ ادا کرنا واجب ہو جائے گا۔ تہائی حصہ سے زائد مال بطور فدیہ تمام ورثاء اتفاق سے اور خوشی سے ادا کر دیں تو جائز ہے۔ اگر اس شخص نے وصیت تو نہیں کی لیکن ورثاء کو معلوم تھا کہ اس کے ذمے اتنے روزے تھے وہ اپنی مرضی سے اس کا فدیہ ادا کر دیں تو اللہ تعالیٰ سے قوی امید رکھی جائے کہ وہ اس فدیہ کو قبول فرمائے گا۔ (از شامی)

فدیہ کی مقدار کیا ہے؟ یا تو ایک روزے کے بدلے ایک مسکین کو دو وقت کا کھانا کھلا دے یا ہر روزہ

کے بدلے ایک صاع جو یا ایک صاع کھجور دے یا نصف صاع گندم، یا نصف صاع کشمش ادا کرے یا ان میں سے کسی ایک چیز کی قیمت حساب کر کے ادا کرے۔ اصل مسئلہ یہ ہے کہ فدیہ کی مقدار وہی ہے جو صدقۃ الفطر کی ہے صدقۃ الفطر کی مقدار وہی ہے جو بیان کر دی گئی ہے۔

صاع کیا ہے؟ صاع ایک پیمانہ ہے۔ جس کے متعلق سید الاولیاء حضرت قبلہ عالم پیر سید مہر علی شاہ رحمہ اللہ گولڑوی فرماتے ہیں جس کی مقدار فقہاء کرام نے یہ بیان کی ہے "**وھو ای صاع المعتبر ما یسع الفا واربعین درھما من ماش اوعدس**" (درمختار) صاع وہ ہے جس میں ایک ہزار چالیس درھم کے وزن کے برابر ماش یا مسور سما سکیں۔ ایک ہزار چالیس درھم کے تین ہزار چھ سو چالیس ماشے ہوتے ہیں جس کے تین سو تین تولہ چار ماشے بنتے ہیں اور اس کے کلدار روپے تین سو سولہ روپے چھ آنے ہوتے ہیں پس بحساب فی سیر اسی روپیہ کلدار ایک صاع کا وزن تین سیر تین پاؤ سوا تین چھٹانک ہوتا ہے علماء کرام نے صاع کا وزن احتیاطاً پورے چار سیر رکھا ہے۔ (فتاوی مہریہ)

اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ نے صاع کی مقدار چار سیر سات چھٹانک بیان کی ہے یہ اختلاف دراصل صاع کی مقدار میں فقہاء کرام کے مختلف اقوال ہیں بلکہ شامی کے ایک قول کے مطابق صاع میں آٹھ رطل ہوتے ہیں ہر رطل ایک سو چالیس درھم کا وزن ہوتا ہے اس قول کے مطابق صاع چار سیر سات چھٹانک ہے بعض حضرات نے اس قول کو بھی پیش کیا ہے۔ کسی قول کو رد کرنا تو ممکن نہیں صرف یہ کہا جاسکتا ہے کہ وہ وزن جو سب سے زیادہ بیان کیا گیا ہے اس میں احتیاط ہے لیکن آج کل وزن کلو اور گرام سے ہو رہا ہے سیر اور چھٹانک سے نہیں ہو رہا۔

کلو، سیر سے تقریباً ڈیڑھ چھٹانک بڑا ہے اس لئے آج کل کے حساب سے اعلیٰ حضرت کے قول کے مطابق بھی نصف صاع کا وزن دو کلو بیان کیا جائے تو کافی ہے اس کے اوپر دس بارہ گرام بنتے ہیں ان کی قیمت لوگ پانچ روپے بنا دیتے ہیں حالانکہ آج کل دس روپے فی کلو کے حساب سے دس گرام کی قیمت دس پیسے بنتی ہے۔

تنبیہ: یہ ضروری نہیں کہ فدیہ صرف گندم کا حساب کر کے ہی دیا جائے۔ چار کلو جو کی قیمت دے دیں بلکہ اغنیاء چار کلو کھجور یا دو کلو کشمش کی قیمت دے دیں تو اور ہی زیادہ بہتر ہے۔ یہ بھی خیال رہے کہ

فدیہ صدقہ فطر کی طرح ہی ہے مقدار وغیرہ میں البتہ صدقہ فطر کے مکمل احکام کو بھی کسی مناسب جگہ انشاء اللہ ذکر کر دیا جائے گا۔

مسئلہ : ایک روزہ کا فدیہ ایک ہی مسکین کو دے تو جائز ہوگا۔ اگر وہ مختلف مساکین پر تقسیم کر دے ایک روپیہ ایک کو دیا اور دوسرا دوسرے کو دیا تو یہ جائز نہیں۔

مسئلہ :ہر روزہ کا فدیہ ہر دن ایک فقیر کو دے خواہ وہی فقیر ہو جسے کل دیا تھا یہ بھی جائز ہے اگر تمام روزوں کا فدیہ ایک ہی دن ایک ہی مسکین کو دے دے تو یہ بھی جائز ہے۔ ان دونوں مسئلوں کا بیان علامہ شامی رحمہ اللہ کی اس عبارت میں دیکھیں:

" قال القهستانی واطلاق کامله یدل علی انه لو دفع الی فقیر جملة جاز ولم یشترط العدد ولا المقدار لکن لو دفع الیه قال من نصف صاع لم یعتد به وبه یفتی " (شامی ج ۲ ص ۱۲۸)

فدیہ کی جگہ دوسرا شخص روزہ نہیں رکھ سکتا: جس شخص پر فدیہ لازم ہو تو اس کا وارث ولی فدیہ نہ ادا کرے بلکہ اس کے ذمہ جتنے روزے تھے وہ روزے رکھ دے تو یہ جائز نہیں اس پر حدیث پاک کو دیکھیں:

" عن مالک بلغه ان ابن عمر کان یسأل هل یصوم احد عن احد او یصلی احد عن احد فیقول لا یصوم احد عن احد ولا یصلی احد عن احد "

(رواہ فی الموطا)

حضرت امام مالک رحمہ اللہ فرماتے ہیں مجھے یہ روایت ملی کہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے سوال کیا جاتا تھا کہ کوئی دوسرا شخص کسی کی طرف سے روزے رکھ دے یا کسی کی طرف سے نماز ادا کر دے تو اس کا حکم کیا ہے؟ تو آپ اس کا جواب دیتے کہ کوئی شخص دوسرے کے روزے کے بدلے روزے نہیں رکھ سکتا اور نہ ہی دوسرے کے بدلے نماز ادا کر سکتا ہے۔ (مشکوۃ باب القضاء)

بلکہ فدیہ کا حکم ہی صراحۃ قرآن پاک میں زیر بحث آیۃ مقدسہ میں ذکر کیا گیا ہے اور حدیث شریف میں بھی فدیہ کا حکم دیا گیا ہے:

" عن نافع عن ابن عمر النبی ﷺ قال من مات وعلیه صیام شهر رمضان فلیطعم عنه مکان کل یوم مسکین رواه الترمذی وقال

والصحیح انه موقوف علی ابن عمر "

حضرت نافع ابن عمر (رضی اللہ عنہم) سے روایت کرتے ہیں نبی کریم ﷺ نے فرمایا جو شخص فوت ہوگیا اور اس پر رمضان کے روزے تھے تو اس کی طرف سے ہر روزہ ایک مسکین کو (دو وقت) کھانا کھلایا جائے۔(مشکوۃ باب القضاء) یہ حدیث اس سند سے مرفوع ہے ترمذی نے اسے موقوف کہا ہے تاہم حدیث قابل حجت ہے خواہ مرفوع ہو یا موقوف۔

اعتراض: ایک اور حدیث شریف میں تو اجازت دی گئی ہے کہ ولی اپنے شخص کی جانب سے روزہ رکھ سکتا ہے اور نماز ادا کرسکتا ہے بخاری و مسلم میں حدیث حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے:

" جاء رجل الی النبی ﷺ فقال ان امی ماتت وعلیها صوم شهر افاقضیه عنها فقال لو کان علی امک دین اکنت قاضیه عنها قال نعم قال فدین الله احق "

ایک شخص نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا عرض کیا کہ بیشک میری والدہ فوت ہوگئی اس کے ذمہ ایک ماہ کے روزے تھے کیا میں اس کی طرف سے روزے قضاء کردوں؟ تو آپ نے فرمایا کیا تمہاری ماں پر قرض ہوتا تو تم ادا کرتے؟ وہ شخص عرض کرنے لگا ہاں (ادا کرتا) آپ نے فرمایا اللہ تعالیٰ کے قرض کو ادا کرنا زیادہ حق ہے۔

اس حدیث سے تو پتہ چلتا ہے کہ جس کے ذمہ روزے یا نمازیں ہوں اس کا رشتہ دار اس کی طرف سے ادا کرسکتا ہے۔

جواب: یہ حدیث قابل حجت نہیں کیونکہ اس میں نماز کا ذکر نہیں لہٰذا اس سے یہ ثابت کرنا ممکن نہیں کہ کوئی شخص کسی دوسرے کی جانب سے نماز ادا کرسکتا ہے۔ پھر قانون یہ ہے کہ راوی جب اپنے ہی روایت کے خلاف فتویٰ دے تو وہ روایت یقیناً راوی کے نزدیک منسوخ ہوگی ورنہ اس کا فتویٰ اس کے خلاف نہ ہوتا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے ہی نسائی نے سنن کبریٰ میں یہ روایت نقل کی ہے:

" لا یصلی احد عن احد ولا یصوم احد عن احد "

کوئی ایک کسی دوسرے کی طرف سے نماز نہ ادا کرے اور نہ ہی کوئی شخص دوسرے کی طرف سے

روزہ رکھے۔ پھر حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت سنن کبری میں درحقیقت آپ کا ایک فتوی ہے اسی لئے ملاعلی قاری رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

" وفتوی الراوی علی خلاف مروية بمنزلة روايته للناسخ ونسخ الحكم يدل على اخراج المناط عن الاعتبار "

راوی کا فتوی جب اس کی روایت کے خلاف ہوتو اس کی وہ پہلی روایت منسوخ ہو جاتی ہے جب کسی حکم کومنسوخ کر دیا جائے تو اس کا اعتبار ختم ہو جاتا ہے۔ اور اس مسئلہ پر اجماع امت ہے کیونکہ امام مالک رحمہ اللہ نے اپنے موطا میں ذکر فرمایا ہے:

" ولم اسمع عن احد من الصحابة ولا من التابعين بالمدينة ، ان احدا منهم امر احد يصوم عن احد ولا يصلی احد عن احد "

کہ میں نے نہیں سنا کہ مدینہ طیبہ میں کسی صحابی یا کسی تابعی نے یہ کہا ہو کہ کوئی شخص دوسرے کی طرف سے روزہ رکھ سکتا ہے اور نہ ہی میں نے یہ سنا کہ کوئی شخص دوسرے کی طرف سے نماز ادا کر لے۔ اور جو روایت نبی کریم ﷺ سے ثابت ہے:

" ان من البر بعد البر بالوالدين ان تصلی لهما مع صلاتک وتصوم لها مع صومک "

والدین سے بھلائی اور فرمانبرداری یہ ہے کہ تم ان کے لئے نماز پڑھو اور ان کے لئے روزہ رکھو۔ اس سے مراد یہ ہے کہ " انه يدعو لهما " بیٹا اپنے والدین کو نفلی نمازوں اور نفلی روزں کا ثواب پہنچائے اور ان کے لئے دعا کرے۔ بلکہ محب طبری جو متاخرین شوافع سے ہیں انہوں نے عبادات واجبہ اور نافلہ کا ثواب میت کو پہنچانے کا ذکر فرمایا ہے:

" ويصل للميت ثواب كل عبادة فعلت عنه واجبة او مندوبة "

تمہاری ہر عبادت کا ثواب میت کو پہنچتا ہے خواہ وہ عبادت واجب ہو یا مستحب۔ اور ہمارے اصحاب احناف ارشاد فرماتے ہیں " ان للانسان ان يجعل ثواب عمله لغيره صلوة او غيرها " کہ بیشک انسان کے لائق یہ ہے کہ انسان اپنے اعمال کا ثواب دوسرے کو پہنچائے خواہ اس کے اعمال نمازیں ہوں یا اور عبادات اس قسم کی کثیر عبارات احناف کے علماء وفقہاء کی موجود ہیں بلکہ " هـذا

مذهب اهل السنة والجماعة " یہی مذہب اہل سنت وجماعت کا ہے۔
اور بخاری ومسلم میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا" من مات وعلیه صوم صام عنه ولیه " جو شخص فوت ہو جائے اس کے ذمہ روزہ ہو تو اس کا ولی اس کی طرف سے روزہ رکھے اس حدیث پاک کی وضاحت علامہ طیبی رحمہ اللہ ان الفاظ سے فرماتے ہیں " انه یتدارک ذلک ولیه بالاطعام فکأنه صام " اس شخص کا رشتہ دار اس کی طرف سے طعام بطور فدیہ دے کر اس کا تدارک (اس کے چھوٹ جانے والے روزہ کا بدل دے کر اس کی کمی کو پورا کر دینا تدارک کہلاتا ہے) کرے تو گویا کہ اس نے اس میت کی جانب سے روزہ رکھ دیا۔
(از مرقاۃ ج ۴ ص ۲۸۲، ۲۸۳)

حاصل کلام یہ ہے: کہ عبادت کا ثواب میت کو پہنچانا جائز ہے لیکن کسی کی نماز کے بدلے کوئی دوسرا نماز ادا نہیں کر سکتا۔ اور نہ ہی کوئی دوسرا کسی کے بدلے روزہ رکھ سکتا ہے روزے کا فدیہ دینا ہی ضروری ہوگا۔

فَمَنْ تَطَوَّعَ خَيْرًا فَهُوَ خَيْرٌ لَّهُ': "پھر جو اپنی طرف سے زیادہ نیکی کرے وہ اسکے لئے بہتر ہے۔ یعنی جو شخص مقرر مقدار سے زیادہ فدیہ دے تو اس کے لئے بہتر ہے۔

فائدہ: اسی سے یہ فائدہ واضح طور پر حاصل ہوا کہ نیکی کا کام جتنا زیادہ کرے گا اسے اتنا ہی زیادہ ثواب حاصل ہوگا۔ نوافل، مستحبات کی کوئی حد مقرر نہیں ہاں البتہ جن اوقات میں نوافل ادا کرنا منع کیا گیا ہے ان اوقات میں وہ منع رہیں گے اسی طرح فرائض میں زیادتی حرام ہوگی کہ کوئی شخص کہے صبح کے دو فرض کی جگہ تین یا چار پڑھ لئے جائیں اس طرح کی زیادتی عبادات میں ناجائز ہے۔

وَاَنْ تَصُوْمُوْا خَيْرٌ لَّكُمْ: "اور تمہارا روزہ رکھنا تمہارے لئے بہتر ہے" " وان تصوموا فی السفر والمرض غیر الشاق" یعنی سفر اور مرض کی حالت میں جب زیادہ مشقت نہ ہو روزہ تکلیف کا سبب نہ بنے تو تمہارا روزہ رکھنا تمہارے لئے بہتر ہے۔ (قرطبی)

اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ: "اگر تم جانتے ہو" یعنی اگر تمہیں علم ہو کہ روزہ کب رکھنا بہتر ہے تو اس وقت روزہ رکھو (مظہری) ضمناً یہ سمجھ آ گیا کہ جب تمہیں معلوم ہو کہ اب روزہ رکھنا منع ہے تو اس وقت اپنے آپ کو ہلاکت سے بچانے کے لئے روزہ نہ رکھنا بہتر ہے۔ (راقم)

﴿ شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِیٓ اُنْزِلَ فِیْهِ الْقُرْاٰنُ هُدًی لِّلنَّاسِ وَبَیِّنٰتٍ مِّنَ الْهُدٰی وَالْفُرْقَانِ فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْیَصُمْهُ وَمَنْ كَانَ مَرِیْضًا اَوْ عَلٰی سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ اَیَّامٍ اُخَرَ یُرِیْدُ اللّٰهُ بِكُمُ الْیُسْرَ وَلَا یُرِیْدُ بِكُمُ الْعُسْرَ وَلِتُكْمِلُوا الْعِدَّةَ وَلِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰی مَا هَدٰىكُمْ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ﴾

۱) ''رمضان کا مہینہ جس میں قرآن اترا لوگوں کے لئے ہدایت اور راہنمائی اور فیصلہ کی روشن باتیں تو تم میں جو کوئی یہ مہینہ پائے ضرور اس کے روزے رکھے اور جو بیمار یا سفر میں ہو تو اتنے روزے اور دنوں میں اللہ تم پر آسانی چاہتا ہے اور تم پر دشواری نہیں چاہتا۔ اور اس لئے کہ تم گنتی پوری کرو اور اللہ کی بڑائی بولو اس پر کہ اس نے تمہیں ہدایت کی اور کہیں تم حق گزار ہو''۔

۲) ماہ رمضان وہ ہے کہ نازل کیا گیا اس میں قرآن جو ہدایت ہے لوگوں کے لئے اور وہ واضح دلیلیں ہیں ہدایت کی اور فرق کرنے والا ہے (حق و باطل میں) تو جو شخص حاضر ہو تم میں سے اس مہینہ میں تو وہ روزے رکھے اس کے اور جو شخص مریض ہو یا سفر میں ہو تو وہ اتنے ہی اور دنوں میں (روزے رکھے) ارادہ کرتا ہے اللہ تم پر آسانی کا اور نہیں ارادہ کرتا تم پر مشکل کا اور مکمل کرو تم گنتی اور تم بڑائی بیان کرو اللہ کی اس پر جو ہدایت دی اس نے تمہیں اور تاکہ تم شکر کرو''۔

شَهْرُ رَمَضَانَ : ''ماہ رمضان'' اہل تاریخ نے بیان کیا ہے کہ سب سے پہلے رمضان کے روزے نوح علیہ السلام نے رکھے جب آپ کشتی سے باہر تشریف لائے۔ راقم کے نزدیک '' لما خرج من السفینة '' کے الفاظ اس پر دلالت کر رہے ہیں کہ آپ نے وہ روزے کشتی کے صحیح وسلامت کنارے پر لگنے پر بطور شکر رکھے ہیں اس سے یہ پتہ چلا کہ کسی نعمت کے حاصل ہونے پر رب تعالیٰ کی عبادت کرنا بطور شکر سنت انبیاء کرام ہے۔ اور حضرت مجاہد رحمہ اللہ کا قول یہ ہے کہ '' کتب اللہ رمضان علی

کل امة " اللہ تعالیٰ نے ہر امت پر رمضان کے روزے فرض کئے۔ چونکہ نوح علیہ السلام سے پہلے بھی امتیں تھیں اس لئے واضح ہوا کہ رمضان کے روزے حضرت آدم علیہ السلام کے زمانہ سے آ رہے ہاں البتہ روزں کی تعداد میں کمی وبیشی ہوسکتی ہے۔ (ماخوذ از قرطبی)

شہر کی وجہ تسمیہ: شہر کا لفظ ہے شھرۃ سے، جب کوئی چیز ظاہر ہو مشہور ہو تو کہا جاتا ہے " شھر الشئی یشھر شھرۃ و شھرا " اسی طرح کہا جاتا ہے " شھرت السیف " میں نے تلوار کو سونت کر بلند کیا۔ مطلب اس کا بھی ظاہر کرنا ہے۔

رمضان کو یا دوسرے مہینوں کو " شھر " کہا جاتا ہے کیونکہ ہر مہینہ لوگوں پر ظاہر ہوتا ہے مخفی نہیں رہتا لوگ یاد رکھتے ہیں کیونکہ لوگوں کی مہینے کی پہچان سے اغراض اور حاجات وابستہ ہوتی ہیں۔ دفتری حاجات، روزے، حج، عیدین وغیرہ مختلف محافل ومجالس کا تعلق مہینوں سے ہی ہوتا ہے اس لئے لوگوں پر ہر مہینہ ظاہر ہوتا ہے تو مہینہ کو " شھر " کہہ لیا جاتا ہے۔ (از قرطبی کبیر) کہا جاتا ہے " اشھر " ایک مہینہ گزرا " اشھرنا فی ھذا المکان " اس مکان میں ہم نے مہینہ گزارا " اشھرت المرأۃ " عورت کا ولادت کے مہینہ میں داخل ہونا، شاھرہ مشاھرۃ مہینہ کے لئے نوکر رکھنا۔ (المنجد)

رمضان کی وجہ تسمیہ:

(۱) اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ رمضان کا لفظ مشتق ہے " رمضاء " بسکون المیم سے۔ "رمضاء" گرمی کے آخر اور خریف کی ابتداء میں برسنے والی بارش کو کہتے ہیں اس بارش سے زمین کا گرد وغبار صاف ہوجاتا، زمین دھل جاتی ہے۔

" فکذلک شھر رمضان یغسل ابدان ھذہ الامۃ من الذنوب و یطھر قلوبھم "

اس معنی کی مناسبت سے رمضان کا نام رمضان رکھنے کی یہ وجہ ہے کہ یہ نبی کریم ﷺ کی امت سے روزے رکھنے والے خوش بخت مسلمانوں کے بدنوں کو گناہوں سے دھو دیتا ہے۔ جس کی وجہ سے ان کے جسم پاک وصاف ہوجاتے ہیں اور ان کے دل پاک ہوجاتے ہیں۔

(۲) اور وجہ یہ ہے کہ "رمضان" ماخوذ ہے " رمض " سے جس کا معنی ہے سورج کی گرمی سے

پتھروں کا گرم ہوجانا اس سے اسم آتا ہے " رمضاء " جس کا معنی ہے گرمی کی تیز کی دھوپ کی تیزی کی وجہ سے گرم زمین۔

☆ اس معنی کی مناسبت سے ''رمضان'' کا مطلب ہوگا بھوک کی حرارت کی وجہ سے انسان کے دل میں حرارت کا پیدا ہونا۔

☆ اسی معنی کی مناسبت سے یہ بھی کہا گیا ہے کہ مہینوں کے نام جس وقت میں وہ آئے اس کی مناسبت سے نام رکھ لئے گئے۔ " **فوافق هذا الشهر ايام رمض الحر** " چونکہ سب سے پہلے دنیا میں جب رمضان واقع ہوا وہ سخت گرمی کے دن تھے اس مناسبت سے اس کا نام ''رمضان'' رکھ دیا گیا۔

☆ اسی معنی کی مناسبت سے اور وجہ یہ بیان کی گئی کہ ''رمضان'' بندوں کے گناہوں کو جلا دیتا ہے اس لئے اسے رمضان کہا جاتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے " **انما سمی رمضان لأنه یرمض ذنوب عباد الله** " کہ رمضان کا نام اس لئے رمضان رکھا گیا ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کے بندوں کے گناہوں کو جلا کر رکھ دیتا ہے۔

(۳) رمضان کے نام رکھنے کی اور وجہ یہ ہے کہ یہ لفظ ماخوذ ہے " **رمضت النصل** " میں نے تلوار کے پھل کو کوٹا۔ چونکہ وہ لوگ رمضان میں اپنی تلواروں کے پھل (لوہے کا پترا) کو کوٹ کے باریک کر لیتے تھے۔ اس وجہ سے اس مہینے کا نام ہی رمضان رکھ لیا گیا۔

(۴) اگر یہ قول صحیح ثابت ہو جائے کہ ''رمضان'' اللہ تعالیٰ کا اسم گرامی ہے تو اس معنی کے لحاظ سے مطلب یہ ہوگا کہ رمضان کے مہینے کا نام اللہ کے نام پر رکھ لیا گیا:

" فالمعنى ان الذنوب تتلاشى فى جنب رحمة الله حتى كانها احترقت
وهذا الشهر ايضا رمضان بمعنى ان الذنوب تحترق فى جنب بركته "

اب اس کا معنی یہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ کی رحمت کی وجہ سے گناہ جل کر نیست و نابود ہو جاتے ہیں یہ مہینہ بھی رب تعالیٰ کے نام سے شریک ہونے کی برکت سے گناہوں کو جلا دیتا ہے۔ (کبیر)

تنبیہ : علامہ رازی رحمہ اللہ نے چوتھی وجہ رمضان نام رکھنے کی بیان کرتے ہوئے ارشاد فرمایا:

" الرابع ، لو صح قولهم ان رمضان اسم الله تعالىٰ "

چوتھی وجہ رمضان نام رکھنے کی اگر اہل علم حضرات کا یہ قول صحیح ثابت ہو جائے کہ ''رمضان'' اللہ تعالیٰ کا اسم گرامی ہے اگر صحیح ثابت ہو جائے، سے اس طرف اشارہ کر دیا کہ جس حدیث سے یہ ثابت کیا جاتا ہے کہ ''رمضان'' اللہ تعالیٰ کا اسم گرامی ہے وہ ضعیف ہے۔ ملا علی قاری رحمہ اللہ واضح طور پر بیان کرتے ہیں وہ حدیث پاک جس کا ذکر پہلے ہو چکا ہے:

" عن ابی هريرة قال قال رسول الله ﷺ من صام رمضان ايمانا واحتسابا غفرله ما تقدم من ذنبه "

اس کی وضاحت میں فرماتے ہیں:

" وفيه انه لا يكره ان يقال رمضان بدون شهر و كرهه بعض العلماء لخبر انه من اسماء الله تعالىٰ وهو شاذ لان الخبر الضعيف لا يثبت اسم الله "

(مرقاة ج ۴ ص ۲۳۱ کتاب الصوم)

اس حدیث پاک سے ثابت ہوا کہ یہ کہنا رمضان آ گیا میں نے رمضان کے روزے رکھے جائز ہے بیشک اس کے ساتھ مہینہ کا لفظ نہیں ذکر کیا البتہ بعض علماء نے کہا ہے کہ یہ نہ کہا جائے کہ رمضان آ گیا بلکہ یہ کہا جائے ماہ رمضان آ گیا کیونکہ حدیث پاک سے یہی ثابت ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کا نام ہے۔ لیکن ملا علی قاری رحمہ اللہ نے فرمایا یہ قول شاذ ہے جس حدیث کا ذکر کیا جاتا ہے وہ ضعیف ہے ضعیف حدیث سے اللہ تعالیٰ کا اسم گرامی ثابت نہیں کیا جا سکتا۔ (مرقاة) علامہ آلوسی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

" ومنع بعضهم ان يقال رمضان بدون شهر لما اخرجه ابن ابی حاتم وابو الشيخ وابن عدی والبيهقی والديلمی عن ابی هريرة مرفوعا وموقوفا ﴿ لا تقولوا ﴾ رمضان فان رمضان اسم من اسماء الله تعالىٰ ولكن قولوا شهر رمضان، والى ذلك ذهب مجاهد والصحيح الجواز فقد روی ذلك فی الصحيح والاحتياط لا يخفى "

بعض حضرات نے صرف رمضان کہنا بغیر مہینہ یا ماہ کے ملانے کے منع قرار دیا ہے کہ ابن ابی حاتم اور ابو الشیخ اور ابن عدی اور بیہقی اور دیلمی نے حضرت ابو ہریرۃ رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی ہے جو بطریق مرفوع اور موقوف بیان ہے کہ تم نہ کہو رمضان بیشک رمضان اللہ تعالیٰ کے اسماء میں سے ایک اسم ہے لیکن تم کہو ماہ رمضان، یہی قول مجاہد رحمہ اللہ کا بھی ہے۔

علامہ آلوسی رحمہ اللہ اپنا مختار بیان کرتے ہیں کہ صحیح یہ ہے کہ صرف ''رمضان'' کہنا صحیح ہے اس لئے کہ صحیح بخاری اور صحیح مسلم میں فقط رمضان بغیر شہر کے آیا ہوا ہے البتہ احتیاط مخفی نہیں یعنی اگر احتیاط کے طور پر ماہ رمضان کہے صرف رمضان نہ کہے تو بہتر ہے۔ کیا خوب علم تھا محققین کا کہ حدیث پاک کے ضعف کو بیان کر دیا لیکن احتیاطی طور پر عمل کرنے کا حکم بھی دے دیا۔ آج کل کے جاہل مصنفین اور مقررین جب احادیث پر بحث کرنے کی بجائے کتب احادیث کو ہی ضعیف کہہ دیتے ہیں تو ان کی جہالت روز روشن کی طرح آشکارا ہوتی ہے۔

اَلَّذِیْ اُنْزِلَ فِیْهِ الْقُرْاٰنُ :

''وہ کہ نازل کیا گیا اس میں قرآن'' یعنی رمضان وہ ہے جس میں قرآن نازل کیا گیا۔

مقام توجہ:

'' نزل صحف ابراھیم فی اول لیلة من رمضان وانزلت التوراة لست مضین والانجیل لثلاث عشرة والقرآن لا ربع وعشرین ''

ابراہیم علیہ السلام پر صحیفے رمضان کی پہلی رات کو نازل ہوئے۔ اور توراۃ نازل ہوئی جب رمضان کے چھ دن گزر چکے تھے۔ اور انجیل نازل ہوئی تیرہ رمضان کو اور قرآن نازل ہوا چوبیس رمضان کو۔ (کبیر)

اور یہ بھی مشہور ہے کہ قرآن پاک کا نزول ایک مرتبہ نہیں ہوا بلکہ **'' وانمانزل علیه فی مدة ثلاث وعشرین سنة منجما مبعضا ''** بلکہ آہستہ آہستہ تھوڑی تھوڑی مقدار میں تیئس سال نازل ہوتا رہا۔ اور یہ بھی مشہور ہے کہ نبی کریم ﷺ پر قرآن پاک بیس سال نازل ہوتا رہا۔ اور حدیث پاک سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ قرآن پاک چوبیس رمضان کو نازل ہوا۔ اور قرآن پاک میں یہ بھی ہے:

﴿ اِنَّا اَنْزَلْنٰهُ فِیْ لَیْلَةِ الْقَدْرِ ﴾ ''بیشک ہم نے نازل کیا اسے قدر والی رات میں''

اس سے مراد مشہور لیلۃ القدر ہے ان تمام میں تطبیق کیسے ہے۔

جواب : قرطبی، روح المعانی، کبیر وغیرہ تفاسیر اور شروح احادیث کو دیکھنے سے مختلف جگہ سے عبارات لے کر جمع کرنے سے نتیجہ یہ نکلتا ہے۔ قرآن پاک کی سورۃ اقراء کی ابتدائی آیات مبارکہ پہلے

نازل ہوئیں پھر تین سال کے بعد سورۃ مدثر کی ابتدائی آیات نازل ہوئیں پھر نزول کا سلسلہ جاری رہا تیئس سال ابتداء وحی سے انتہاء وحی تک ہیں اور بیس سال مسلسل وحی کا نزول ہے یہ سوال کی ایک شق کا جواب آ گیا۔ پھر بعض مفسرین کرام نے " انا انزلناه فی لیلة مبارکة " سے اور انا انزلناه فی لیلة القدر " سے مراد ایک ہی رات لی ہے جسے لیلۃ القدر کہا جاتا ہے۔

بعض مفسرین کرام نے دونوں راتوں کو علیحدہ علیحدہ کہا ہے اگر علیحدہ علیحدہ راتیں مراد ہوں (جیسا راقم کا بھی موقف ہے) تو صورت مسئلہ یہ ہوگی کہ قرآن پاک ''لوح محفوظ'' سے نازل ہو کر صحف ملائکہ میں پندرھویں شعبان کی رات میں منتقل ہو گیا پھر لیلۃ القدر جو رمضان میں ہوتی ہے (زیادہ حضرات کا یہی قول ہے) رمضان کی لیلۃ القدر میں صحف ملائکہ سے نازل ہو کر آسمان دنیا میں بیت العزۃ میں منتقل ہو گیا پھر وہاں سے ابتدا وحی یا تین سال کے بعد مسلسل وحی کا جاری رہنا والا سلسلہ چوبیس رمضان کو شروع ہوا ہو۔ بلکہ بعض حضرات نے اس حدیث سے چوبیس رمضان کی رات کو لیلۃ القدر کہا ہے تاہم راقم کے نزدیک لیلۃ القدر کا جس طرح واضح طور پر تعین نہیں فرمایا گیا اسی طرح مبہم رکھنا ہی بہتر ہے۔ مذکورہ بالا بحث سے واضح ہو گیا کہ قرآن پاک میں تعارض نہیں بلکہ سمجھنے کی حد تک کمی ہے جس سے تعارض سمجھ آتا ہے۔

فائدہ : اسی مذکورہ بحث سے واضح ہو گیا کہ قرآن پاک ایک مرتبہ ہی لوح محفوظ سے صحف ملائکہ میں اور ایک مرتبہ ہی صحف ملائکہ سے آسمان دنیا میں منتقل ہوا اسی وجہ سے قرآن پاک کے نزول کے لئے "انزلناه " ذکر کیا کیونکہ انزال کا مطلب ہوتا ہے ایک مرتبہ نازل کرنا۔ لیکن قرآن پاک نبی کریم ﷺ پر آہستہ آہستہ بھی نازل ہوتا رہا اسی وجہ سے فرمایا ﴿ نزل علی محمد ﴾ اس لئے کہ تنزیل کا مطلب ہوتا ہے آہستہ آہستہ اتارنا۔

قرآن کی وجہ تسمیہ: اس میں دو مذہب ہیں ایک یہ ہے قرآن بروزن فعال ہے اس میں ہمزہ نہیں اور دوسرا مذہب یہ ہے کہ قرآن کا وزن فعلان ہے اس میں ہمزہ پایا گیا ہے پہلے مذہب والے جن کے نزدیک ہمزہ نہیں وہ کہتے ہیں یہ مشتق ہے " قرن " سے کہا جاتا ہے " قرنت الشئی بالشئی " میں نے ایک چیز کو دوسری چیز سے ملایا۔ قرآن پاک میں سورتیں سورتوں سے اور آیات، آیات سے

اور حروف، حروف سے ملے ہوئے ہیں اس لئے اس کا نام قرآن رکھا گیا۔

اور وجہ یہ ہے کہ اس میں احکام وشرائع بعض بعض کے ساتھ ملے ہوئے ہیں اسلئے اس کا نام قرآن رکھا گیا اور وجہ یہ ہے کہ اس میں وہ دلائل جو اس پر دلالت کر رہے ہیں کہ یہ کلام اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے وہ دلائل آپس میں ایک دوسرے سے ملے ہوئے ہیں۔ وہ دلائل یہ ہیں: کہ قرآن پاک فصاحت کی تمام وجوہ پر مشتمل ہے بلکہ قرآن پاک کو دیکھ کر ہی تو علم بیان اور علم معانی معرض وجود میں آئے پھر قرآن پاک عجیب وغریب اسلوب پر مشتمل ہے پھر قرآن پاک میں غیبی خبریں موجود ہیں پھر قرآن پاک کثیر علوم پر مشتمل ہے۔

ابھی تک جو وجہ ذکر کی گئی ہیں ان سے واضح ہوا کہ قرآن میں ہمزہ نہیں یہ " قرن " سے بنایا گیا ہے اور اگر اس میں ہمزہ ہو اور نام قرآن ہو تو فراء کے نزدیک اس کا معنی " قرائن " سے لیا ہوا ہے یہ معنی قرآن پاک پر اس طرح سچا آتا ہے کہ بعض آیات دوسری بعض آیات کی تصدیق کرتی ہیں اس مقام پر ''قرائن'' کا یہی مطلب ہے۔ رب تعالیٰ کا ارشاد گرامی بھی اس پر دلالت کر رہا ہے:

﴿ وَلَوْ كَانَ مِنْ عِنْدِ غَيْرِ اللّٰهِ لَوَجَدُوْا فِيْهِ اخْتِلَافًا كَثِيْرًا ﴾

''اور اگر یہ اللہ تعالیٰ کے بغیر کسی اور طرف سے ہوتا تو اس میں کثیر اختلاف پاتے''

ہمزہ کی صورت میں یہ مشتق ہوگا " قراءۃ " سے جس کا معنی ہے پڑھنا۔ یہ مصدر مفعول کے معنی میں استعمال ہے قرآن مصدر ہے جیسے رجحان، نقصان، خسران اور غفران مصادر ہیں۔ اسی معنی میں یہ آیۃ استعمال ہے ﴿ اِنَّ قُرْاٰنَ الْفَجْرِ كَانَ مَشْهُوْدًا ﴾ بیشک صبح کے قرآن پڑھنے میں فرشتے حاضر ہوتے ہیں۔ اور ہمزہ کی صورت میں اور احتمال یہ ہے کہ یہ مشتق ہو " قرء " سے جس کا معنی ہے جمع کرنا۔ قرآن پاک میں اولین وآخرین کے علوم مجتمع ہیں اس لئے اسے قرآن کہا گیا اور یہ کہ تمام مسلمان خواہ وہ مشرق میں ہوں یا مغرب میں شمال میں ہوں یا جنوب میں ان تمام کو قرآن پاک ایمان واسلام کی ایک سلک (لڑی) میں پرو کر جمع کر دیتا ہے۔ (از کبیر)

قرآن پاک کے فضائل مقدمہ میں اور ﴿ وَاِنْ كُنْتُمْ فِيْ رَيْبٍ ﴾ آیۃ میں بیان ہو چکے ہیں۔

هُدًى لِّلنَّاسِ وَبَيِّنٰتٍ مِّنَ الْهُدٰى وَالْفُرْقَانِ : ''جو ہدایت ہے لوگوں کے لئے اور وہ

واضح دلیلیں ہیں ہدایت کی اور فرق کرنے والا (حق و باطل میں)۔ راقم نے ترجمہ علامہ رازی رحمہ اللہ کی اس عبارت سے لیا ہے:

" ای انزل وھو ھدایة للناس الی الحق وھو آیات واضحات مکشوفات بما یھدی الی الحق ویفرق بین الحق والباطل "

وہ قرآن ہدایت ہے لوگوں کے لئے اور وہ قرآن واضح کھلی دلیلیں ہیں حق کی اور وہ قرآن حق و باطل میں فرق کرنے والا ہے۔

اعتراض : ﴿ هُدًى لِّلنَّاسِ ﴾ کہنے کے بعد ﴿ وَبَيِّنَاتٍ مِّنَ الْهُدَىٰ ﴾ کہنے کا کیا مطلب ہے

پہلا جواب: پہلے ذکر فرمایا کہ قرآن پاک لوگوں کے لئے ہدایت ہے اور اس کے بعد اس طرف اشارہ فرما دیا کہ ہدایت کی دو قسمیں ہیں کبھی وہ ہدایت واضح اور جلی ہوتی ہے لوگوں کے لئے۔ اور کبھی ہدایت تو ہوتی ہے لیکن واضح نہیں بلکہ مخفی اور یہ یقینی بات ہے کہ وہ ہدایت افضل ہے جو واضح ہوگی۔ گویا کہ یہ کہا گیا ہے " ھو ھدی لانہ ھو البین من الھدی " وہ قرآن لوگوں کے لئے ہدایت ہے کیونکہ وہ واضح ہدایت ہے" والفرقان" وہ قرآن حق و باطل میں فرق کرنے والا ہے۔

حاصل کلام یہ ہوا کہ پہلے جنس ہدایت کو ذکر کیا گیا پھر اس پر اس کی انواع میں سے ایک نوع کا عطف کیا گیا ہے وہ ہے واضح ہدایت اس کے بعد ﴿ وَالْفُرْقَانِ ﴾ کو بطور عطف ذکر کیا ایک اور نوع کو ذکر کیا کہ وہ قرآن ایسی ہدایت دیتا ہے کہ حق و باطل میں فرق کر دیتا ہے۔ پھر ﴿ بَيِّنَاتٍ ﴾ جمع ذکر کر کے یہ مسئلہ سمجھا دیا گیا کہ قرآن پاک کی ہر آیۃ روشن دلیل ہے یعنی قرآن پاک میں جتنی آیات ہیں وہ تمام ہی واضح دلیلیں ہیں۔

خیال رہے کہ متشابہات بھی واضح دلیلیں ہیں کیونکہ ان پر سقوط اختیار کرنا اپنے علمی گھوڑے نہ دوڑانا بھی ان کے روشن دلیل ہونے کی علامت ہے۔

دوسرا جواب: جس طرح نبی کریم ﷺ کو تمام انبیاء کرام کے اوصاف و کمالات حاصل ہیں اسی طرح قرآن پاک کو تمام آسمانی کتابوں کے کمالات حاصل ہیں۔ یعنی مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے گویا کہ یہ بیان فرمایا:

" ان القرآن مع کونہ ھدی فی نفسہ ففیہ ایضا ھدی من الکتب

المتقدمة التی ھی ھدی و فرقان "

کہ قرآن پاک خود بذاتہ بھی منبع ہدایت ہے اوراس میں پہلی کتابوں کی ہدایت بھی موجود ہے کیونکہ پہلی کتابیں بھی ہدایت اور فرقان ہیں۔اس لئے کہ توراۃ وانجیل کے متعلق رب تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ وَاَنْزَلَ التَّوْرَاةَ وَالْاِنْجِیْلَ مِنْ قَبْلُ هُدًی لِّلنَّاسِ وَالْفُرْقَانِ ﴾

''اور رب تعالیٰ نے نازل فرمایا توراۃ وانجیل کو اس سے پہلے (قرآن سے پہلے) جو ہدایت ہیں لوگوں کے لئے اور فرق کرنے والی ہیں حق وباطل میں''

تیسرا جواب: " ان یحمل الاول علی اصول الدین والھدی الثانی علی فروع الدین "

رب تعالیٰ نے فرمایا ﴿ هُدًی لِّلنَّاسِ ﴾ سے یہ واضح فرمایا کہ قرآن پاک میں اصول دین کا ذکر فرمایا جن اصولوں پر چل کر ہی انسان کے اعتقادات درست ہو سکتے ہیں یعنی قرآن پاک میں اعتقادیات کا ذکر ہے اور ﴿ وَبَیِّنٰتٍ مِّنَ الْهُدٰی وَالْفُرْقَانِ ﴾ سے یہ ثابت فرمایا کہ قرآن پاک میں فروع دین کا ذکر بھی ہے یعنی احکام جن کا تعلق عملیات سے ہے۔(ماخوذ از کبیر)

سبحان اللہ قرآن پاک کی عظمت پر قربان ایک ہی جملہ سے کتنے کتنے عظیم معانی بیان کر دیئے گئے۔

فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْیَصُمْهُ : ''تو جو شخص حاضر ہو تم میں سے اس مہینہ میں تو روزے رکھے اس کے'' " شھد ، حضر ، والشھود ای الحضور " شہود کا معنی ہے حضور اور شھد کا معنی حاضر ہوا۔

راقم کے نزدیک مطلب یہ ہے کہ جو شخص حاضر ہو تم میں اس مہینہ میں اہلیت کے ساتھ تو وہ اس مہینہ کے روزے رکھے مسافر کو روزہ رکھنے کی اہلیت حاصل ہے تو وہ روزہ رکھے اگر روزہ رکھنے کی اہلیت نہیں تو وہ روزہ نہ رکھے جب مقیم ہو جائے تو روزے قضاء کرلے۔

مریض کو روزہ رکھنے کی اہلیت حاصل ہو یعنی مرض کے بڑھنے ،مرض کے زیادہ ہونے اور مرض سے ہلاک ہونے کا کوئی خطرہ نہ ہو تو وہ روزہ رکھے اگر روزہ رکھنے کی اہلیت نہیں تو روزے نہ رکھے بعد میں صحت یاب ہو تو روزے قضا کرلے۔ بچے اور مجنوں (پاگل) میں روزہ رکھنے کی اہلیت ہی نہیں پائی

جاتی اس لئے ان پر روزے فرض نہیں۔علامہ رازی رحمہ فرماتے ہیں۔" فمن شهد منکم البلد او بيته بمعنى لم يكن مسافرا" کہ آیۃ کریمہ ﴿ فَمَنْ شَهِدَ ﴾ کا ایک مطلب یہ ہے کہ جو شخص تم میں سے اس مہینہ میں اپنے گھر یا اپنے شہر میں حاضر ہو مسافر نہ ہو وہ اس مہینہ کے مکمل روزے رکھے۔اور دوسرا مطلب یہ ہے کہ "من شاهد الشهر بعقله و معرفته فليصمه" جو شخص اس مہینہ میں اپنی عقل اور معرفت سے حاضر ہو وہ پورا مہینہ روزے رکھیں بچہ اور مجنون کامل عقل و معرفت نہیں رکھتے اس لئے ان پر روزے فرض نہیں۔ (کبیر)

جواب: کبھی جزاء شرط کے مجموعہ پر مرتب ہوتی ہے اور کبھی شرط کے اجزاء پر مرتب ہوتی ہے، اس مقام میں اجزاء پر حکم مرتب ہے، مطلب یہ ہے "من شهد جزأ من اجزاء الشهر فليصم" کہ جو شخص رمضان کا جو دن پالے اس دن روزہ رکھے اگر کل دن رمضان کے پالے تو تمام مہینہ روزے رکھے۔

(ماخوذ از کبیر)

طلباء کرام توجہ فرمائیں: "من" شرطیہ ہے اور "فليصمه" جزاء ہے قانون یہ ہے کہ شرط کے پائے جانے پر جزا مرتب ہوتی ہے جب "شهر" سے مراد ﴿ شَهْرُ رَمَضَانَ ﴾ "ماہ رمضان" ہے تو یہاں شرط کے پائے جانے پر جزاء کا مرتب ہونا کیسے صحیح ہوا؟ کیونکہ مطلب تو یہ بنے گا کہ جب رمضان کا مہینہ گزر جائے تو روزے رکھو، یہ کیسے صحیح ہے؟

جواب: کبھی جزاء شرط کے مجموعہ پر مرتب ہوتی ہے اور کبھی شرط کیجزاء پر مرتب ہوتی ہے، اس مقام میں اجزاء پر حکم مرتب ہے، مطلب یہ ہے "من شهدجزأ من اجزاء الشهر فليصم" کہ جو شخص رمضان کا جو دن پالے اس دن روزہ رکھے اگر کل دن رمضان کے پالے تو تمام مہینہ روزے رکھے۔

(ماخوذ از کبیر)

ماہ رمضان کو پالینے کا کیا مطلب ہے؟ رمضان شریف کو پالینے کا مطلب یہ ہے کہ یا خود چاند دیکھ لے یا چاند کی شہادت اسے مل جائے تو اس نے رمضان کو پالیا ہے وہ ماہ رمضان کے روزے رکھے۔

رمضان کی چاند کی شہادت: اگر شعبان کے تیس دن مکمل ہو جائیں تو مطلع صاف ہو یا بادل چھائے ہوئے ہوں ہر حال میں بغیر کسی شہادت یا خبر کے روزہ رکھنا فرض ہوگا اس لئے کہ پہلا مہینہ تیس

دن کے مکمل ہونے پر مکمل ہو چکا ہے۔ اگر ایک شخص نے اکیلے رمضان کا چاند دیکھا حاکم وقت نے اس کی شہادت کو قبول نہیں کیا تو وہ شخص جس نے چاند دیکھا وہ روزہ رکھے کیونکہ اسے اس دن رمضان ہونے میں کوئی شک نہیں۔ لیکن اگر اس نے روزہ رکھ کر توڑ دیا تو اس پر کفارہ لازم نہیں کیونکہ حاکم نے جب اس کی شہادت کو رد کر دیا تو اس کے حق میں بھی حکم قطعی نہ رہا۔ اگر ایک مسلمان شخص رمضان کے چاند دیکھنے کی خبر دے جب کہ آسمان ابر آلود ہو دھند ہو، گرد و غبار چھایا ہوا ہو تو اس ایک مسلمان کی خبر کو قبول کر لیا جائے روزہ رکھنے کا حکم دیا جائے خواہ وہ خبر دینے والا نیک ہو یا گنہگار ہو۔

" قال ابن عباس جاء اعرابی الی النبی ﷺ فقال انی رأیت الهلال یعنی هلال رمضان فقال اتشهد ان لا اله الا الله قال نعم قال اتشهد ان محمد رسول الله قال نعم قال یا بلال اذن فی الناس فلیصوموا غدا "

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں ایک اعرابی نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو انہوں نے کہا بیشک میں نے رمضان کا چاند دیکھا ہے تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کیا تم شہادت دیتے ہو کہ اللہ کے بغیر کوئی معبود نہیں؟ انہوں نے کہا ہاں آپ نے فرمایا کیا تم شہادت دیتے ہو محمد اللہ کے رسول ہیں انہوں نے کہا ہاں۔ رسول اللہ ﷺ نے حضرت بلال کو کہا لوگوں میں اعلان کر دو کہ کل روزہ رکھیں۔

اس حدیث پاک سے یہ مسئلہ ثابت ہو گیا کہ ایک مسلمان کی خبر رمضان کے چاند کے متعلق قبول ہے جب کہ آسمان ابر آلود ہو۔ ہاں البتہ یہ بات یاد رہے کہ وہ شخص جو دیہات سے آئے تھے وہ اس وقت آئے تھے جب کہ روزے کی نیت کا وقت ختم ہو چکا تھا۔ یعنی ظہر کا وقت ہو چکا تھا۔

اگر آسمان صاف ہے ابر آلود نہیں تو رمضان کے چاند دیکھنے کی شہادت اتنے لوگ دیں جن پر اعتبار آ جائے کہ یہ سچے ہوں گے جھوٹ نہیں بول رہے تو ان کی شہادت قبول ہو گی۔

عید الفطر کے چاند کی شہادت: اگر رمضان کے تیس دن مکمل ہو جائیں تو آسمان صاف ہو یا ابر آلود ہو چاند دیکھنے کی کوئی خبر دے یا نہ دے عید الفطر ثابت ہو جائے گی۔

اگر ایک شخص کہے کہ میں نے چاند دیکھا ہے تو اس کی شہادت قبول نہیں کی جائے گی خواہ آسمان

صاف ہو یا ابر آلود ہو بلکہ وہ شخص جو کہہ رہا ہے کہ میں نے چاند دیکھا ہے اسے بھی روزہ رکھنا پڑے گا کیونکہ اسے کے چاند دیکھنے کی شہادت جب رد ہوگئی تو اس کے چاند دیکھنے میں اشتباہ پڑ گیا۔ اگر آسمان ابر آلود ہو تو عید الفطر کے چاند دیکھنے کی شہادت دو مسلمان آزاد مردوں کی قبول ہوگی یا ایک مسلمان آزاد مرد اور دو مسلمان آزاد عورتوں کی گواہی قبول ہوگی۔ اگر آسمان صاف ہوا تو عید الفطر کے چاند دیکھنے کی اتنے آدمیوں کی شہادت قبول ہوگی جن پر اعتبار آ جائے کہ یہ سچے ہیں اتنے لوگ جھوٹ پر متفق نہیں ہو سکتے۔

فائدہ : عید الاضحیٰ کا چاند دیکھنے کا حکم وہی ہے جو عید الفطر کا ہے بلکہ رمضان کے علاوہ تمام مہینوں کا حکم یہی ہے۔ (نور الایضاح مع ذریعۃ النجاح)

رؤیۃ ھلال : "چاند دیکھنا" چاند دیکھنے کے متعلق احادیث اور فقہی کتب سے چند مسائل ذکر کئے جاتے ہیں۔

☆ **" عن ابن عمر قال قال رسول اللہ ﷺ لا تصوموا حتی تروا الھلال و لا تفطروا حتی تروہ فان غم علیکم فاقدروالہ وفی روایۃ قال الشھر تسع و عشرون لیلۃ فلا تصوموا حتی تروہ فان غم علیکم فاکملوا العدۃ ثلاثین "** (بخاری و مسلم)

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا روزہ نہ رکھو یہاں تک کہ چاند دیکھ لو اور فطر نہ کرو (یعنی عید الفطر نہ کرو) یہاں تک کہ چاند دیکھ لو۔ اگر مطلع ابر آلود ہو تو اس کی قدر مکمل کرو۔ ایک روایت میں (وضاحت سے بیان کیا گیا) مہینہ انتیس راتوں کا ہے روزہ نہ رکھو یہاں تک کہ چاند دیکھ لو اگر آسمان ابر آلود ہو جائے تو تیس دن مکمل کرو۔ (مشکوۃ باب رؤیۃ الھلال)

وضاحت حدیث : **" لا تصوموا حتی تروا الھلا ل "** روزہ نہ رکھو یہاں تک کہ چاند دیکھ لو، حدیث پاک کے ان الفاظ کا یہ مطلب نہیں کہ ہر شخص چاند دیکھ لے جو دیکھے وہ روزے رکھے اور جو نہ دیکھے وہ روزے نہ رکھے بلکہ مطلب یہ ہے **" حتی یثبت عندکم رؤیۃ ھلال رمضان "** یہاں تک کہ تمہارے نزدیک رمضان کا چاند دیکھنا ثابت ہو جائے خواہ خود دیکھ لو یا شہادت مل جائے کہ چاند نظر آ گیا تو چاند کا دیکھنا ثابت ہو گیا۔

ولا تفطروہ حتی تروہ : اور فطر نہ کرو (عید الفطر نہ کرو) یہاں تک کہ چاند دیکھ لو، حدیث پاک کے ان الفاظ مبارکہ کا بھی یہی مطلب ہے جو ابھی رمضان کے چاند کے متعلق بیان کر دیا گیا کہ چاند کا ثبوت مل جائے خواہ خود دیکھنے سے یا چاند کی خبر ملنے سے۔

فان غم علیکم فاقدر والہ : ''غم'' کا معنی ہے " **غطی الھلال بالغیم** " بادلوں کی وجہ سے چاند چھپ جائے دکھائی نہ دے " فاقدروا " دال کے نیچے کسرہ ہے ضمہ کا قول مغرب (کتاب کا نام) میں رد کیا گیا ہے معنی اندازہ لگاؤ " **فان غم علیکم فاقدروا لہ** " اور دوسری روایت میں الفاظ مبارکہ " **فان غم علیکم الھلال فاکملوا العدۃ ثلاثین** " کا مطلب ایک ہی ہے کہ اگر آسمان پر بادل وغیرہ چھائے ہوئے ہوں چاند تم سے پوشیدہ ہو جائے دکھائی نہ دے یعنی چاند کے ثبوت کی کوئی شہادت بھی نہ ملے تو تیس دن مکمل کرو۔ یعنی اگر شعبان کا مہینہ ہے تو تیس دن مکمل کر کے روزے رکھو اور اگر رمضان کا مہینہ ہے تو تیس دن مکمل کر کے عید الفطر کرو۔

تنبیہ : عام طور پر ہم اپنے محاورات اور کلام کرنے کے انداز کو دیکھیں تو بات واضح ہو جائے کہ ایک ہی مطلب کو بیان کرنے کے لئے ہم مختلف الفاظ استعمال کرتے ہیں آج کوئی اور لفظ بول دیئے کل کوئی اور لیکن مقصد کلام کا آج بھی وہی ہے جو کل تھا اگر چہ الفاظ وہ نہیں جو کل تھے۔ ہر زبان کا یہی طریقہ تھا اسی طرف تکلم (کلام کے انداز) پر ایک حدیث شریف " **فاقدر والہ** " اور دوسری حدیث شریف میں " **فاکملوا العدۃ** " کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں معنی دونوں کا ایک ہے۔ آیئے دیکھئے محققین اہل علم نے "**فاقدر والہ**" کے معانی کیا بیان کئے ہیں۔

ایک معنی یہ بیان کیا گیا " **اجعلوا الشھر ثلاثین یوما** " اگر چاند بادل میں چھپ جائے دکھائی نہ دے تو مہینہ تیس دنوں کا بناؤ۔ دوسرا معنی یہ بیان کیا گیا ہے:

" **قال الزرکشی یعنی حققوا مقادیر ایام شعبان حتی تکملوہ ثلاثین یوما** "

علامہ زرکشی رحمہ اللہ نے فرمایا اس کا معنی یہ ہے کہ شعبان کے دنوں کی مقدار کو ثابت کرو یہاں تک کہ تیس دن مکمل کرو۔ " **وفی شرح السنۃ معناہ التقدیر باکمال العدد** " تیسرا معنی شرح السنۃ میں بیان کیا گیا ہے کہ " **فاقدر والہ** " کا معنی یہ ہے کہ مہینہ کے (تیس دن) دنوں کی تعداد مکمل کرنے کا تحقیق

اندازہ کرو۔ جتنے معانی بیان کئے گئے ہیں ان میں اگرچہ الفاظ مختلف ہیں لیکن مقصد سب نے ایک ہی بیان کیا ہے۔

غلط فہمی : جب محققین اہل علم نے جو معانی ذکر فرمائے ان کو دیکھا جائے تو بعض حضرات جو "فاقدروا له" کے الفاظ سے غلط فہمی کا شکار ہوئے ہیں ان کی غلط فہمی آشکارا ہو جائے گی ان کی غلطی کی وجہ سے دوسرے بھی غلطی کا شکار نہ ہو جائیں۔ ہر زمانہ میں جن لوگوں کے ذہنوں پر فلسفہ اور سائنس سوار ہے وہ راہ راست سے بھٹکتے رہے فلسفہ نے بعض ان لوگوں کو بھی راہ راست سے بھٹکا دیا جو دین کا علم رکھتے تھے جو دینی علوم سے بھی خالی ہیں ان کو فلسفہ اگر بھٹکا کر دین سے برگشتہ کر دے تو کوئی مقام تعجب نہیں۔

آیئے فلسفہ کی زد میں آنے والوں نے ''فاقدروا له'' کا کیا معنی کیا ہے ذرا دیکھئے:

" ذهب بعض الى ان المراد به التقدير بحساب القمر فى المنازل اى اقدروا منازل القمر فانه يدلكم على ان الشهر تسع وعشرون او ثلاثون "

بعض حضرات نے کہا نبی کریم ﷺ کے ارشاد " فاقدروا له " کا مطلب یہ ہے کہ چاند کے حساب سے اندازہ کرو یعنی چاند کی منزلوں سے حساب کرو تو تمہیں پتہ چل جائے گا کہ مہینہ انتیس دن کا ہے یا تیس دن کا۔

غلط فہمی کا ازالہ: کسی مہینہ کی ابتدائی تاریخ یا انتہائی تاریخ کو ستاروں کا حساب لگانے والے علم ہئیت والوں کا اعتبار نہیں کیا جائے گا" والاجماع على عدم الاعتداد بقول المنجمين ولو اتفقوا على انه يرى " کیونکہ اس مسئلہ پر محققین اہل علم کا اجماع ہے کہ صرف چاند کی منازل اور ستاروں کی منازل کا حساب کرنے والوں پر اعتبار نہیں کیا جائے گا اگرچہ وہ سب اس پر اتفاق بھی کر لیں کہ آج چاند دکھائی دینے کی تاریخ ہے۔ اس لئے کہ رب تعالیٰ نے صرف حساب دانوں کو ''خیر امۃ'' سے خطاب نہیں کیا۔ بلکہ نبی کریم ﷺ کی تمام امت کو فرمایا ﴿ كُنتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ ﴾ تم بہتر امت ہو ان تمام امتوں میں سے جو لوگوں میں ظاہر ہوئیں۔ پھر تمام امت کو ہی یہ حکم فرمایا:

﴿ فَمَنْ شَهِدَ مِنكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ ﴾

''جو شخص حاضر ہو تم میں سے اس مہینہ میں تو وہ روزے رکھے''

یعنی جو شخص تم میں سے اس مہینہ کو چاند دیکھنے سے پا لے یا شہادت سے پا لے تو وہ روزے رکھے۔ اس آیۃ کریمہ میں صرف حساب لگانے والوں کو حکم نہیں دیا۔ پھر رسول اللہ ﷺ کے ارشادات گرامی بھی تمام امت کو ہیں یہی حدیث پاک جسے ذکر کیا جا رہا ہے اس میں بھی حکم عام ہے اور احادیث کو بھی دیکھئے جن میں حکم عام ہے:

☆ " عن ابی هریرة قال رسول الله ﷺ صوموا لرؤیته وافطروا لرؤیته فان غم علیکم فاکملوا عدة شعبان ثلاثین بخاری ومسلم " (مشکوۃ باب رؤیۃ الھلال)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا روزہ رکھو چاند دیکھ کر اور افطار کرو چاند دیکھ کر پھر اگر بادل میں چاند آ کر تم سے چھپ جائے تو تیس دنوں شعبان کی گنتی مکمل کرو (پھر رمضان کا روزہ رکھو) حدیث شریف میں حکم عام ہے صرف حساب لگانے والوں کو نہیں پھر آپ نے واضح طور پر دیکھنے کا حکم فرمایا حساب لگانے کا نہیں:

" قال ابن الهمام وعند ابی داؤد والترمذی حسنه ، فان حال بینکم وبینه سحاب فکملوا العدة ثلاثین ولا تستقبلوا الشهرا استقبالا "

ابن ہمام فرماتے ہیں ابوداؤد اور ترمذی نے حدیث ذکر فرمائی اور ترمذی نے اسے حسن کہا ہے وہ حدیث یہ ہے اگر تمہارے اور چاند کے درمیان بادل حائل ہو جائے تو تیس دنوں کی تعداد مکمل کرو اور مہینے کا استقبال نہ کرو۔ یعنی جلدی جلدی بغیر چاند دیکھنے بغیر شہادت کے انتیس دنوں پر پہلے مہینہ کو ختم کر کے نئے کا استقبال نہ کرو۔

احادیث کے مختلف الفاظ کا مطلب ایک ہے: ابھی جو حدیث بیان کی یا جو پہلے بیان کی گئیں ہیں سب کا مطلب یہی ہے کہ چاند نہ دکھائی دینے پر اور شہادت نہ ملنے پر تیس دن مکمل کرو:

☆ ایک روایت میں ہے: " فان حال بینکم وبینه سحاب فکملوا العدة ثلاثین "

☆ ایک اور روایت میں ہے: "فان اغمی علیکم فاکملوا عدة شعبان ثلاثین یوما ثم صوموا "

☆ ایک اور روایت میں ہے: " فان اغمی علیکم الشهر فعدوا ثلاثین ثم صوموا "

☆ ایک اور روایت میں ہے: " کان ﷺ یتحفظ من شعبان مالا یتحفظ من غیره ثم

يصوم لرؤية رمضان فان غم عليه عد ثلاثين يوما ثم صام"

ان تمام روایات کے متعلق ملا علی قاری رحمہ اللہ بیان فرماتے ہیں " وهذه روايات صحيحة لا تقبل التاويل " یہ سب روایات صحیح ہیں ان میں تاویل کی کوئی گنجائش نہیں۔ سب کا مطلب یہی ہے کہ چاند دیکھ کر روزہ رکھو، چاند دیکھ کر فطر (عید الفطر) کرو۔ اگر چاند بادل میں آ جائے دکھائی نہ دے تو تیس دن مکمل کرو جلد بازی سے نئے مہینہ کو نہ شروع کرلو۔

مندرجہ بالا بحث سے ایک اور قول رد ہو گیا: فلسفہ کی زد میں آنے والے اہل علم نے ایک اور ٹھوکر کھائی تھی اس کی حیثیت بھی پانی کے ایک بلبلہ سے زائد نہ رہی وہ قول یہ ہے:

" قال ابن سريج فاقدروا خطاب عنه خصه الله بهذا العلم وقوله فاكملوا العدة خطاب للعامة "

ابن سریج نے کہا نبی کریم ﷺ کا ارشاد " فاقدروا " علم ہیئت والوں کو خطاب ہے کہ وہ حساب لگائیں اور " فاكملوا العدة " کا خطاب عوام کو ہے کہ وہ تیس دن مکمل کریں۔ یہ قول سرے سے باطل ہے کیونکہ شرع میں احکام سب کے لئے برابر ہیں عوام وخواص کا کوئی فرق نہیں۔ بلکہ راقم کے نزدیک تو خواص ہی وہ ہیں جو مصطفیٰ کریم ﷺ کے ارشاد پر سر جھکا دیں وہ خواص کیسے جو ارشادات نبوی کی غلط تاویلیں کر کے عقلی گھوڑے دوڑائیں۔ ایک اور حدیث پاک دیکھئے جس میں بہت واضح کر دیا گیا کہ مہینہ انتیس دن کا یا تیس دن کا ہوتا ہے۔

☆ " وعن ابن عمر قال قال رسول الله ﷺ انا امة امية لا نكتب ولا نحسب الشهر هكذا وهكذا وهكذا وعقد الا بهام في الثالثة ثم قال الشهر هكذ وهكذا وهكذا يعني تمام الثلاثين يعني مرة تسعا وعشرين ومرة ثلاثين " (بخاری ومسلم)

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہم امی لوگ ہیں حساب وکتاب نہیں جانتے (تین دفعہ دونوں ہاتھوں کو اٹھا کر انگلیاں کھول کر فرمایا) مہینہ اس طرح ہے اور اس طرح ہے پھر آپ نے تیسری مرتبہ ایک ہاتھ کے انگوٹھے کو بند کر کے فرمایا مہینہ اس طرح ہے اور اس طرح اور اس طرح اس کے بعد راوی نے وضاحت کر دی یعنی پہلی مرتبہ جو ارشاد فرمایا اس سے تیس دن مکمل مراد لئے۔

راوی نے پھر مزید وضاحت کر دی کہ نبی کریم ﷺ کے ارشاد کا مطلب یہ ہے کہ مہینہ یا تو انتیس دنوں کا ہوگا کیونکہ دوسری مرتبہ ایک انگوٹھے کو بند کرنے کا یہ مطلب ہی تھا اور آپ نے فرمایا کہ مہینہ کبھی تیس دنوں کا ہوگا کیونکہ پہلی مرتبہ تینوں دفعہ دونوں ہاتھ کھلے رکھ کر یہی مسئلہ سمجھایا۔

(مشکوۃ باب رؤیۃ الھلال)

حدیث پاک سے مسئلہ روز روشن کی طرح واضح ہو گیا کہ آپ نے قیامت تک آنے والی اپنی امت کے متعلق فرمادیا کہ میری امت میں کئی لوگ وہ ہوں گے جو حساب و کتاب ہی نہیں جانتے ہوں گے۔ ان کو چاند کی منازل کے حساب کے بھنور میں نہیں پھنسایا جا سکتا۔ وہ چاند دیکھ کر یا شہادت ملنے پر چاند کی تاریخوں کا تعین کر لیا کریں انتیس کو چاند نظر آ جائے تو ٹھیک ہے اگر مطلع صاف ہونے پر یا ابر آلود ہونے پر انتیس کو چاند نظر نہ آئے تو تیس دن مکمل کر لیں۔

" فالمعنی ان العمل علی ما یعتاده المنجمون لیس من هدینا وسنتنا بل علمنا یتعلق برؤیة الهلال فانا نراه مرة تسعا وعشرین ومرة ثلاثین "

حدیث پاک کا مطلب یہ ہے کہ چاند کی منازل کے حساب سے چاند کی تاریخ متعین کرنے کی نہ ہی ہم نے ہدایت دی اور نہ ہی یہ ہماری سنت اور ہمارا طریقہ ہے بلکہ ہم تو یہ بتا رہے ہیں کہ چاند دیکھ کر تاریخ متعین کرنا۔ مہینہ کبھی انتیس دنوں کا ہوگا اور کبھی تیس دنوں کا۔

قال اکثر ائمتنا لا یعمل بحساب المنجم وهو من یری ان اول الشهر طلوع النجم الفلانی "

اس کا کبھی اعتبار نہیں کیا جائے گا کہ چاند اور ستاروں کی منازل کا حساب کرنے والوں کی بات کو مان لیا جائے کہ فلاں دن چاند نظر آنے کی تاریخ ہے اس حساب کا کوئی اعتبار نہیں اعتبار ہے تو رسول اللہ ﷺ کے ارشاد کا ہے۔

انتیس کا چاند نظر آنے پر ثواب میں کوئی کمی نہیں:

" عن ابی بکرة قال قال رسول الله ﷺ شهرا عید لا ینقصان رمضان وذو الحجة " (بخاری ومسلم مشکوة باب رؤیة الهلال)

حضرت ابوبکرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا عید کے دونوں مہینے رمضان اور ذوالحجہ میں کوئی کمی نہیں کرتے " لا ینقصان ثوابا ولا نقصا عددا " یعنی رمضان کے انتیس دن مکمل ہونے پر اگر عید الفطر کا چاند نظر آجائے تو باوجود دنوں کی تعداد کی کمی کے رمضان کے ثواب میں کمی نہیں آئے گی کیونکہ یہ رعایت خود رب تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کی طرف سے حاصل ہے۔

اسی طرح ذی الحج کی انتیس تاریخ کو چاند نظر آجائے تو ذی الحج کے ثواب اور خیر و برکت میں کوئی کمی واقع نہیں ہوگی۔ خیال رہے کہ حدیث شریف میں ذوالحج کو عید کا مہینہ کہنا تو واضح ہے کہ اس میں عید الاضحیٰ ہوتی ہے لیکن رمضان کو عید کا مہینہ کہنے کی وجہ یہ ہے کہ عید اس کے مجاور (متصل) ہوتی ہے تو مجازاً عید کا مہینہ کہہ لیا گیا۔ (مرقاۃ ج ۴ ص ۴۴۵)

تنبیہ : یہ تصور باطل ہے کہ رمضان ہر سال ضرور ہی تیس دنوں کا ہو بات چاند دیکھنے کی ہے۔

" فصح عن جماعة من الصحابة صمنا مع رسول الله ﷺ تسعا وعشرين اكثر مما صمنا معه ثلاثين "

صحابہ کرام کی ایک جماعت سے ثابت ہے کہ ہم نے رسول اللہ ﷺ کی معیت میں انتیس روزے زیادہ رکھے بنسبت تیس کے۔

" ومن صام قال بعض الحفاظ صام رسول الله ﷺ تسع رمضانات منها رمضا نان فقط ثلاثون كذا فى شرح ابن حجر "

اسی وجہ سے بعض حفاظ حدیث نے کہا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے نو رمضانوں کے روزے رکھے جن میں صرف دو رمضان تیس دنوں کے آئے۔

شک کے دن روزہ رکھنے کی ممانعت:

" عن ابى هريرة قال قال رسول الله ﷺ لا يتقد من احدكم رمضان بصوم يوم او يومين الا ان يكون رجل كان يصوم يوما فليصم ذلك اليوم "
(متفق عليه ، مشكوة باب رؤية الهلال)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تم میں سے کوئی ایک بھی

رمضان سے ایک دن یا دو دن پہلے روزہ نہ رکھے ہاں مگر وہ شخص جو پہلے اس دن رکھتا تھا تو رمضان سے پہلے ایک دن وہی دن تھا تو روزہ رکھ لے۔

☆ " عن عمار بن یاسر قال من صام الیوم الذی یشک فیہ فقد عصی ابا القاسم ﷺ "
(ابو داؤد ، ترمذی ، نسائی ، ابن ماجہ ، دارمی)

حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں جس نے شک کے دن روزہ رکھا اس نے رسول اللہ ﷺ کی نافرمانی کی۔

ہاں البتہ یہ ذہن میں رہے کہ چاند نظر آنے اور چاند کی شہادت کے بغیر رمضان کی نیت کرنا یا یہ نیت کرنا کہ اگر رمضان کا روزہ ہوا تو میرا روزہ رمضان کا ہوگا اور اگر رمضان نہ ہوا تو میرا روزہ کوئی اور ہوگا یہ منع ہے۔ ہاں اگر کسی نے بغیر شک کے خالص نفلی روزہ کی نیت کر لی تو یہ جائز ہے اس میں کسی قسم کی کوئی وعید نہیں۔ اسی طرح اگر اس دن قضاء یا نذر کا روزہ رکھے تو جائز ہے۔

چاند کے بڑا ہونے یا چھوٹا ہونے کو دیکھ کر شک نہ کرے:

" عن ابی البختری قال خرجنا للعمرۃ فلما نزلنا ببطن نخلۃ تراء ینا الھلال فقال بعض القوم ھو ابن ثلاث وقال بعض القوم ھو ابن لیلتین فلقینا ابن عباس فقلنا انا رأینا الھلال فقال بعض القوم ھو ابن ثلاث وقال بعض القوم ھو ابن لیلتین فقال ای لیلۃ رأیتموہ قلنا لیلۃ کذا و کذا فقال ان رسول اللہ ﷺ مدۃ للرؤیۃ فھو لیلۃ رأیتموہ وفی روایۃ عنہ قال اھللنا رمضان ونحن بذات عرق فارسلنا رجلا الی ابن عباس یسألہ فقال ابن عباس قال رسول اللہ ﷺ ان اللہ تعالیٰ قد امدہ لرؤیتہ فان اغمی علیکم فاکملوا العدۃ " (رواہ مسلم ، مشکوۃ باب رؤیۃ الھلال)

ابوالبختری کہتے ہیں ہم عمرہ کیلئے نکلے جب ہم بطن نخلہ میں پہنچے تو ہم نے چاند دیکھا بعض لوگ کہنے لگے کہ چاند تین راتوں کا ہے بعض کہنے لگے دو راتوں کا ہے تو ہم حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کو ملے ہم نے کہا بیشک ہم نے چاند دیکھا ہے تو ہم میں سے بعض نے کہا ہے کہ چاند تین راتوں کا ہے اور بعض نے کہا دو راتوں کا ہے تو حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے پوچھا تم نے کس رات کو چاند دیکھا؟ ہم

نے کہا ہم نے فلاں رات کو چاند دیکھا تو آپ نے فرمایا وہی رات ہے چاند دیکھنے کی کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے چاند دیکھنے کی رات کو ہی دیکھنے کی مدت قرار دیا۔

اور ایک روایت ابوالبختری سے ہی مروی ہے کہ ہم نے ذات عرق میں رمضان کا چاند دیکھا تو ہم نے ایک شخص کو حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے پاس بھیجا کہ ان سے چاند کے متعلق سوال کرو۔ تو انہوں نے کہا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ تعالیٰ نے چاند کی مدت کو تمہارے دیکھنے کی مدت تک بڑھا دیا ہے اگر مطلع ابر آلود ہو تو گنتی (تیس دن) مکمل کرو۔

واضح ہوا کہ چاند انتیس تاریخ کو دیکھ لیا یا شہادت مل گئی تو روزہ رکھ لیا جائے اور عید کر لی جائے اگر ابر آلود ہو چاند کے دیکھنے کی کوئی شہادت نہ ملے تو تیس دن مکمل کئے جائیں بعد میں چاند دیکھ کر شک میں پڑنا منع ہے کہ یہ کہے کہ یہ چاند تو بڑا ہے پچھلی تاریخ کا ہونا چاہیے یہ کہنا منع کیوں ہے؟ اس لئے کہ جب نبی کریم ﷺ نے چاند کا اعتبار دیکھنے سے کر دیا ہے تو جب دیکھے گا وہی تاریخ معتبر ہوگی۔

مقام توجہ: ایک روایت میں ذات عرق کا ذکر ہے اور ایک روایت میں بطن نخلہ کا ذکر ہے کیا ایک ہی واقع ہے یا دو واقعات ہیں؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ ایک ہی واقعہ ہے کہ چاند انہوں نے مقام ذات عرق میں دیکھا اور ان کا نزاع ہوا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے پاس آدمی بھیجنا اور ان کا جواب دینا بطن نخلہ میں واقع ہوا۔

مسئلہ: حدیث شریف میں "للیلۃ رأیتموہ" مذکور ہے (جس رات کو تم چاند دیکھو وہی مدت دیکھنے کی ہوگی) اس سے واضح ہوا کہ دن کو چاند دیکھنے کا کوئی اعتبار نہیں۔ اگر کسی شخص نے تیس شعبان کو دن کو چاند دیکھا خواہ زوال سے پہلے یا بعد تو بقیہ دن کھانے پینے سے رکنے کی ضرورت نہیں یعنی وہ دن رمضان کا نہیں۔ اور اگر تیس رمضان کو دن کو چاند دیکھ لیا تو اسی وقت افطار کرنا جائز نہیں بلکہ غروب آفتاب تک روزہ مکمل کرنا ضروری ہوگا۔ (مرقاۃ ج ۴ ص ۲۵۰)

اختلاف مطالع کا مسئلہ: ایک جگہ چاند نظر آئے تو کیا دوسری جگہ روزہ رکھنا لازم ہے یا نہیں؟ اسی طرح ایک جگہ چاند نظر آئے تو دوسری جگہ عید ہو سکتی ہے یا نہیں۔ اس مسئلہ میں فقہاء کرام کی مختلف عبارات ہیں جن کی وجہ سے عام لوگ غلطی کا شکار ہو جاتے ہیں۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ مسئلہ میں

اختلاف نہیں صرف سمجھنے کی ضرورت ہے۔

فقہاء کرام کی ایک عبارت یہ ہے " **ولا عبرة باختلاف المطالع** " اختلاف مطالع کا کوئی اعتبار نہیں اس سے پتہ چلتا ہے کہ دنیا کے کسی ایک شہر میں چاند نظر آ جائے تو تمام دنیا کے شہروں میں روزہ رکھنا ضروری ہوگا۔

اورایک عبارت فقہاء کرام کی یہ ہے " **وقیل یعتبر** " بعض حضرات نے کہا اختلاف مطالع کا اعتبار ہے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ ہر شہر میں چاند دیکھنا ضروری ہے ایک شہر میں چاند دیکھنے سے دوسرے شہر میں روزہ رکھنا یا عید کرنا درست نہیں۔ لیکن حقیقت میں اختلاف نہیں بلکہ دونوں قولوں میں تطبیق یہ ہے " **وان کان بینهما تقارب بحیث لا تختلف المطالع یجب وان کان بحیث تختلف لا یجب** " اگر ایک شہر اور دوسرے شہر میں زیادہ دوری نہ ہو بلکہ وقت کا معمولی فرق ہو تو ایک شہر میں چاند نظر آ جائے تو دوسرے میں اس کا حکم ثابت ہو جائے گا۔

یہ بات نہ بھولیں کہ انتیس کا چاند صرف پچاس منٹ نظر آ سکتا ہے وہ بھی ابتدائی پانچ منٹ نظر آنا مشکل ہوتا ہے۔ اس لئے جن دو شہروں میں پینتالیس منٹ یا اس سے کم وقت کی تقدیم و تاخیر ہو تو وہ معتبر ہوگا کہ ایک شہر میں چاند نظر آئے تو دوسرے شہر میں اس کا اعتبار کر لیا جائے۔ لیکن اگر اس سے زائد وقت کا فرق ہو تو ایک شہر میں چاند دیکھنے سے دوسرے شہر میں روزہ رکھنا لازم نہیں ہوگا اور نہ ہی عید کرنا جائز ہوگی۔ یعنی جب دونوں شہروں کے وقت میں پینتالیس منٹ سے زیادہ تقدیم و تاخیر ہو تو اس کا حکم یہ ہے:

> **" والاشبه ان یعتبر لان کل قوم مخاطبون بما عندهم وانفصال الهلال عن شعاع الشمس یختلف باختلاف الاقطار کما ان دخول الوقت وخروجه یختلف باختلاف الاقطار حتی اذا زالت الشمس فی المشرق لایلزم منه ان نزول فی المغرب وکذا طلوع الفجر وغروب الشمس بل کلما تحرکت الشمس درجة فتلک طلوع الفجر لقوم وطلوع الشمس لآخرین وغروب لبعض ونصف لیل لغیرهم "**

کہ زیادہ صحیح یہی ہے کہ ہر قوم کو خطاب ان کے مطابق ہوگا کیونکہ چاند کا سورج کی شعاؤں سے جدا ہونا مختلف قطروں (مراد علاقہ اور جگہ ہے) کے لحاظ پر مختلف ہوتا ہے جس طرح وقت کا نکلنا اور داخل ہونا مختلف ہوتا ہے یہاں تک کہ مشرق میں جب سورج ڈھل جائے تو لازم نہیں کہ مغرب میں بھی ڈھل جائے۔ اسی طرح سورج کے طلوع ہونے اور غروب ہونے کا بھی یہی حکم ہے ایک جگہ سورج نکل کر ایک درجہ بلند ہو کر حرکت کر رہا ہوتا ہے اور اسی وقت دوسری جگہ فجر طلوع ہو رہی ہوتی ہے اور اسی وقت دوسری جگہ سورج نکل رہا ہوتا ہے اور دوسری جگہ غروب ہو رہا ہوتا اور کہیں آدھی رات ہو جاتی ہے۔

واضح ہوا کہ ایک علاقہ میں جس وقت صبح کی نماز ہو رہی ہو تو لازم نہیں کہ دوسرے علاقہ میں بھی صبح کی نماز ہو رہی ہو اسی طرح یہ ضروری نہیں کہ ایک جگہ مغرب ہو تو دوسری جگہ بھی مغرب ہو۔

" وروی ان ابا موسی الضریر الفقیہ صاحب المختصر قدم الاسکندریۃ فسئل عمن صعد علی منارۃ الاسکندریۃ فیری الشمس بزمان طویل بعد ما غربت عندھم فی البلد ایحل لہ ان یفطر فقال لا ویحل لاھل البلد لان کلا مخاطب بما عندہ "

اور روایت کیا گیا ہے کہ بیشک ابو موسیٰ ضریر فقیہ اسکندریہ میں آئے تو ان سے پوچھا گیا کہ ایک شخص اسکندریہ کے مینار پر چڑھے تو وہ سورج کو دیکھ رہا ہو لیکن شہر والوں کے نزدیک سورج غروب ہو چکا ہو تو وہ مینار والا شخص کیا اس وقت روزہ افطار کر سکتا ہے؟ تو انہوں نے کہا نہیں وہ تو افطار نہیں کر سکتا البتہ شہر والے افطار کر سکتے ہیں کیونکہ ہر ایک کا اپنا اپنا حکم ہے۔ جن کے نزدیک سورج غروب ہو گیا ان کے لئے افطار کرنا جائز ہے اور جن کے نزدیک غروب نہیں ہوا ان کے لئے جائز نہیں۔ مطالع کے اعتبار پر اور دلیل یہ ہے:

" عن کریب ان ام الفضل بعثتہ الی معاویۃ بالشام فقال فقدمت الشام وقضیت حاجتھا واستھل علی شھر رمضان وانا بالشام فرأیت الھلال لیلۃ الجمعۃ ثم قدمت المدینۃ فی آخر الشھر فسألنی عبد اللہ بن عباس ثم ذکر الھلال فقال متی رأیتم الھلال فقلت رأیناہ لیلۃ الجمعۃ فقال انت رأیتہ فقلت نعم وراہ الناس وصاموا وصام معاویۃ فقال لکنا رأیناہ لیلۃ

السبت فلا نزال نصوم حتی نکمل ثلاثین او نراه فقلت اولا تکتفی برؤیة معاویة وصیامه فقال لا هکذا امرنا رسول اللہ ﷺ"

(قال فی المنتقی رواہ الجماعة الا البخاری وابن ماجه)

حضرت کریب کہتے ہیں کہ بیشک ام الفضل رضی اللہ عنہا نے مجھے شام میں حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے پاس بھیجا میں شام کو آ گیا ان کے کام سے فارغ ہوا رمضان کا چاند میں نے وہاں ہی پالیا جب کہ میں شام میں ہی تھا۔ میں نے چاند جمعہ کی رات کو دیکھا پھر میں مدینہ طیبہ میں مہینہ کے آخر میں آ گیا تو مجھ سے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے سوال کیا (یعنی تم کہاں گئے تھے، کیوں گئے تھے وغیرہا) پھر چاند کا ذکر آ گیا تو آپ نے فرمایا تم نے کب چاند دیکھا تھا؟ تو میں نے کہا ہم نے جمعہ کی رات کو چاند دیکھا تھا تو آپ نے کہا کیا تم نے بھی دیکھا تھا تو میں نے کہا ہاں (یعنی میں نے دیکھا) اور لوگوں نے بھی دیکھا اور انہوں نے روزہ رکھا اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے بھی روزہ رکھا۔ تو حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا لیکن ہم نے تو ہفتہ کی رات کو دیکھا ہم روزے رکھیں گے چاند نظر آ گیا (انتیس کو) تو بہتر ورنہ ہم تیس دن مکمل کریں گے۔ تو میں نے کہا کیا آپ کو حضرت معاویہ کا چاند دیکھنا اور روزہ رکھنا کافی نہیں؟ (کہ آپ اس کا اعتبار کر کے ایک دن روزہ قضاء کرنے کا حکم دیں) آپ نے کہا نہیں یعنی وہ رؤیت کافی نہیں اسی طرح رسول اللہ ﷺ نے فرمایا۔ (از تبیین الحقائق للزیلعی)

تنبیه : آج کل شام کا علاقہ محدود ہے جب کہ پہلے وسیع تھا شام میں ہی فلسطین، بعلبک، حلب، طرابلس، انطاکیہ، دمشق اور طرطوس تھے۔ اور یہ بھی خیال رہے کہ زمین گول ہے اس کا چوتھائی حصہ آبادی ہے مغرب اور مشرق کے درمیان خط استواء کے ساتھ اقلیم اول ہے اسی میں مکہ مکرمہ ہے اور اس کے ساتھ شمالی جانب اقلیم دوم ہے اسی کے وسط میں مدینہ طیبہ ہے اس دوسری اقلیم کا سب سے بڑا دن پونے چودہ گھنٹے کا ہے۔ اور پہلے جو علاقہ شام کا تھا اس کے بعض شہر تیسری اقلیم میں آتے ہیں جو دوسری اقلیم کے شمال میں واقع ہے اس میں واقع شہروں کا سب سے بڑا دن ساڑھے چودہ گھنٹہ کا ہے۔ اور پہلے جو علاقہ شام کا تھا اس کے بعض علاقے چوتھی اقلیم میں آتے ہیں جو تیسری اقلیم کے شمال میں واقع ہے ان علاقوں میں سب سے بڑا دن پونے پندرہ گھنٹے کا ہے۔ (از غیاث اللغات)

اسی سے واضح ہوا کہ شام کا وسیع علاقہ جو پہلے تھا اس کے بعض شہروں اور مدینہ طیبہ میں پینتالیس منٹ کا فرق تھا اور بعض میں ایک گھنٹہ کا اسی وجہ سے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے شام کے علاقہ میں دیکھے جانے والے چاند کا مدینہ طیبہ میں اعتبار نہیں کیا وجہ اس کی وہی ہے جو ذکر کر دی گئی کہ ہر علاقہ کا مطلع (مقام طلوع چاند) علیحدہ علیحدہ ہے اگر وقت کا اتنا فرق ہو کہ ایک جگہ دکھائے دینے والا چاند اسی وقت دوسری جگہ نہیں دکھائی دے سکتا تو یقیناً ایک جگہ چاند دیکھنے سے دوسری جگہ اس کا حکم جاری نہیں ہوگا۔

امید ہے کہ اس بحث کے بعد انصاف کی نظر سے دیکھنے والے یہ رٹ لگانا چھوڑ دیں گے کہ سعودیہ میں جس دن روزہ ہو اسی دن پاکستان میں بھی روزہ ہو اور جس دن سعودیہ میں عید ہو اسی دن پاکستان میں بھی عید ہو۔ جب سعودیہ اور پاکستان کے اوقات میں دو گھنٹہ کا فرق ہے نمازوں کے اوقات مختلف ہیں تو روزہ اور عید ان کے ساتھ رکھنے کا کیا مطلب ہو سکتا ہے؟

وَمَنْ كَانَ مَرِيضًا أَوْ عَلٰى سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ أَيَّامٍ أُخَرَ :

''اور جو شخص مریض ہو یا سفر میں ہو تو وہ اتنے ہی اور دنوں میں (روزہ رکھے) اس سے پہلی آیۃ میں مریض اور مسافر کا ذکر تفصیلی طور پر بیان کیا جا چکا ہے البتہ اللہ تعالیٰ نے دوبارہ ان الفاظ مبارکہ کا ذکر کیا ہے اس کی دو وجہ ہیں۔ ایک وجہ یہ ہے کہ پہلے ذکر فرمایا ﴿ فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ ﴾ تو جو شخص حاضر ہو تم میں سے اس مہینہ میں تو اس کے روزے رکھے۔ چونکہ مسافر اور مریض بھی رمضان کے مہینہ کو پا لیتے ہیں اس لئے بظاہر یہ سمجھ آ رہا ہے کہ شائد ان پر بھی روزے فرض ہوں گے تو ان الفاظ مبارکہ سے مریض اور مسافر کو خاص کیا کہ ان کے لئے روزہ افطار کرنا جائز ہے۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ پہلے ذکر ہوا ﴿ وَعَلَى الَّذِينَ يُطِيقُونَهٗ ﴾ جب ان الفاظ مبارکہ کا یہ مفہوم ہو کہ جو لوگ روزہ رکھنے کی طاقت رکھتے ہوں وہ فدیہ دے دیں۔ یعنی ایک قول کے مطابق ابتداء اسلام میں روزہ رکھنے کی طاقت کے باوجود فدیہ دینا جائز تھا لیکن بعد میں اسے منسوخ کر دیا گیا۔ اس لحاظ پر مسافر اور مریض کا حکم دوبارہ ذکر کر کے واضح کر دیا کہ ان کے حق میں جو حکم ثابت ہے وہ محکم ہے اسے منسوخ نہیں کیا گیا ہے۔

یہاں سے تین چیزیں ثابت ہوگئیں ایک یہ کہ جو شخص حالت اسلام اور بلوغ میں رمضان کو پا

لے اس پر روزے فرض ہیں۔ دوسرا یہ ثابت ہوا کہ مسافر اور مریض کے لئے رخصت ہے کہ وہ روزے نہ رکھیں تاہم یہ حکم ان کے لئے واجب نہیں۔ تیسری چیز یہ ثابت ہوئی کہ مریض کے صحت یاب ہونے پر اور مسافر کے مقیم ہونے پر ان پر روزے کی قضاء کرنا لازم ہے۔ (بیضاوی، خفاجی، شیخ زادہ)

يُرِيْدُ اللّٰهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَلَا يُرِيْدُ بِكُمُ الْعُسْرَ :

''ارادہ کرتا ہے اللہ تعالیٰ تم پر آسانی کا اور نہیں ارادہ کرتا تم پر مشکل کا'' لغاية رأفته وسعة رحمته" یعنی اللہ تعالیٰ اپنی بہت بڑی مہربانی اور وسعت رحمت کی وجہ سے تم پر آسانی کا ارادہ کرتا ہے اور تم پر مشکل کا ارادہ نہیں فرماتا۔ (ابوالسعود) اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے مریض اور مسافر کو افطار کی اجازت دی کہ وہ حالت مرض اور سفر میں روزہ نہ رکھیں بلکہ صحت اور اقامت میں قضاء کرلیں۔ (بیضاوی)

☆ " اخرج احمد عن الاعرج انه سمع النبی ﷺ یقول ان خیر دینکم ایسره ان خیر دینکم ایسره " (درمنثور)

حضرت اعرج فرماتے ہیں کہ انہوں نے نبی کریم ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا بیشک تمہارے دین میں بہتر وہ ہے جو آسان ہے یہ الفاظ آپ نے دو مرتبہ دہرائے۔ کیونکہ خود نبی کریم ﷺ جو کام دین کے مطابق ہوتا مخالف نہ ہوتا لیکن آسان ہوتا اسی کو اختیار فرماتے ہاں اگر آسانی شریعت کے خلاف کام میں ہوتی تو آپ اس سے دور بھاگتے۔

☆ " واخرج البزار عن انس ان رسول الله ﷺ قال یسروا ولا تعسروا وسکنوا ولا تنفروا " (در منثور)

حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں بیشک رسول اللہ ﷺ نے فرمایا آسانی پیدا کرو مشکل نہ پیدا کرو اور تسلی دو اور نفرت نہ پیدا کرو۔

☆ " واخرج احمد عن انس قال قال رسول الله ﷺ ان هذا الدين متين فاوغلوا فيه برفق " (در منثور)

حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا بیشک یہ دین پختہ دین ہے اس میں نرمی سے جدوجہد کرو۔

☆ " واخرج الطبرانی والبیهقی عن سهل بن ابی امامة بن سهل بن حنیف عن ابیه عن جده ان رسول الله ﷺ قال لا تشددوا علی انفسکم فانما هلک من کان قبلکم

بتشدیدهم علی انفسهم وستجدون بقایاهم فی الصوامع والدیارات" (درمنثور)

سہل بن ابی امامۃ اپنے باپ، دادا سے روایت کرتے ہیں بیشک رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تم اپنے نفسوں پر سختی نہ کرو بیشک تم سے پہلے لوگ اپنے نفسوں پر سختی کی وجہ سے ہی ہلاک ہو چکے ہیں اور عنقریب تم ان کے بقایا (آثار ونشانات) کو گرجا اور دیر کے مقامات پر پاؤ گے۔

☆ " واخرج البیهقی عن ابن عمر ان رسول الله ﷺ قال ان الله یحب ان تؤتی رخصته کما یحب ان تؤتی عزائمه" (درمنثور)

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں بیشک رسول اللہ ﷺ نے فرمایا بیشک اللہ تعالیٰ پسند فرماتا ہے کہ رخصت پر عمل کیا جائے جس طرح پسند کرتا ہے کہ عزیمت پر عمل کیا جائے۔

☆ " واخرج احمد والبزار وابن خزیمة وابن حبان والطبرانی فی الاوسط والبیهقی عن ابن عمر قال قال رسول الله ﷺ ان الله یحب ان تؤتی رخصة کما لا یحب ان تؤتی معصیة" (درمنثور)

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا بیشک اللہ تعالیٰ پسند فرماتا ہے کہ اس کی طرف دی گئی رخصت پر عمل کیا جائے یہ نہیں پسند فرماتا کہ معصیت پر عمل کیا جائے۔

☆ " واخرج الطبرانی عن عبد الله بن یزید بن ادیم قال حدثنی ابو الدرداء وواثلة بن الاسقع وابو امامة وانس بن مالک ان رسول الله ﷺ قال ان الله یحب ان تقبل رخصة کما یحب العبد مغفرة ربه" (درمنثور)

بیشک رسول اللہ ﷺ نے فرمایا بیشک اللہ تعالیٰ پسند فرماتا ہے کہ رخصت کو قبول کیا جائے جس طرح بندہ پسند کرتا ہے کہ رب تعالیٰ اس کی مغفرت کردے۔

☆ " واخرج الحکیم الترمذی فی نوادر الاصول عن الحسن قال ان دین الله وضع دون الغلو وفوق التقصیر" (درمنثور)

حضرت حسن (بصری) فرماتے ہیں بیشک اللہ تعالیٰ کے دین میں میانہ روی ہے نہ ہی اس میں غلو ہے اور نہ ہی اس میں کوتاہی ہے کمی سے اوپر اور غلو سے نیچے وسط درجہ میں ہے۔

وَلِتُكْمِلُوا الْعِدَّةَ : ''اور مکمل کروتم گنتی''

گنتی کے مکمل کرنے کے دو مطلب ہیں ایک یہ کہ سفر کے دوران یا مرض کی حالت میں جو روزے تمہارے رہ گئے ہیں ان کو قضاء کرتے وقت ان کی گنتی مکمل کروان میں کمی نہ ہو۔

اور دوسرا مطلب ہے کہ چاند دیکھواگر انتیس کا چاند نظر آ جائے تو بہتر ورنہ تیس دن مکمل کرو۔ (قرطبی)

علامہ سیوطی رحمہ اللہ نے دوسرے قول کو ہی ترجیح دی ہے اسی کے مطابق درمنشور میں احادیث نقل کی ہیں۔

☆ " اخرج ابن ابی حاتم عن الربیع فی قوله ﴿ وَلِتُكْمِلُوا الْعِدَّةَ ﴾ قال عدة رمضان " (درمنشور)

ربیع کہتے ہیں رب تعالیٰ کے ارشاد ﴿ وَلِتُكْمِلُوا الْعِدَّةَ ﴾ کا مطلب یہ ہے کہ رمضان کی گنتی مکمل کرو

☆ واخرج ابو داؤد والنسائی وابن المنذر والدار قطنی فی سنه عن حذیفة قا ل قال رسول الله ﷺ لا تقدموا الشهر حتی تروا الهلال او تکملوا العدة ثلاثین ثم صوموا حتی تروا الهلال او تکملوا العدة ثلاثین " (درمنشور)

حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا مہینہ کو مقدم نہ کرو یہاں تک کہ چاند دیکھ لو یا تیس دن مکمل کرلو۔ پھر روزہ رکھو یہاں تک کہ چاند دیکھ لو یا تیس دن مکمل کرلو۔

☆ " واخرج ابو داؤد والترمذی والنسائی عن ابن عباس قال قال رسول الله ﷺ لاتقدموا الشهر بصیام یوم ولا یومین الا ان یکون شئی یصومه احدکم ولا تصوموا حتی تروه ثم صوموا حتی تروه فان حال دونه غمام فاتموا العدة ثلاثین ثم افطروا " (درمنشور)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا (رمضان کے) مہینہ کو ایک یا دو دن پہلے روزہ رکھ کر مقدم نہ کرو ہاں مگر یہ کہ کوئی شخص اس دن روزہ رکھتا ہو روزہ نہ رکھو یہاں تک کہ چاند دیکھ لو پھر روزہ رکھو یہاں تک کہ چاند دیکھ لو اگر موسم ابر آلود ہو جائے تو تیس دن مکمل کرو پھر افطار کرو۔

☆ " واخرج الدار قطنی عن رافع بن خدیج قال قال رسول الله ﷺ احصوا عدة شعبان لرمضان ولا تقدموا الشهر بصوم فاذا رایتموه فصوموا واذا رایتموه فافطروا فان غم علیکم فاکملوا العدة ثلاثین یوما ثم افطروا فان الشهر هکذا وهکذا وهکذا او هکذا وهکذا وهکذا وحبس ابهامه فی الثالثة " (درمنشور)

رافع بن خدیج کہتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا شعبان کے دن رمضان کے لئے شمار کرو

(رمضان کے) مہینہ کو روزہ رکھ کر مقدم نہ کرو جب تم دیکھو تو روزہ رکھو اور جب تم دیکھو تو افطار کرو اگر تم پر بادل چھا جائیں تو تیس دن مکمل کرو پھر افطار کرو بیشک مہینہ اس طرح اور اس طرح اور اس طرح ہے (آپ نے دونوں ہاتھوں کی انگلیوں سے اشارہ کر کے بتایا تین مرتبہ دس دس انگلیوں سے اشارہ کر کے بتایا کہ مہینہ تیس دنوں کا ہے) اور یا مہینہ اس طرح ہے اور اس طرح ہے اور اس طرح ہے تیسری مرتبہ آپ نے ایک انگوٹھے کو بند کر لیا (یعنی دو مرتبہ دس دس انگلیوں سے اشارہ کیا اور تیسری مرتبہ نو انگلیوں سے اشارہ کیا بتایا کہ یا مہینہ انتیس دنوں کا ہوتا ہے)۔

☆ " واخرج الدار قطنی عن عبد الرحمن بن زید بن الخطاب قال انا صحبنا اصحاب النبی ﷺ وانهم حدثونا ان النبی ﷺ قال صوموا لرؤیته وافطروا لرؤیته فان اغمی علیکم فعدوا ثلاثین فان شهد ذو عدل فصوموا وافطروا ونسکوا " (درمنشور)

عبدالرحمٰن بن زید بن خطاب کہتے ہیں کہ ہم نبی کریم ﷺ کے صحابہ کی مصاحبت میں تھے انہوں نے ہمیں بتایا کہ بیشک نبی کریم ﷺ نے فرمایا چاند دیکھ کر روزہ رکھو اور دیکھ کر افطار کرو اگر تم پر بادل چھا جائیں تو تیس دن مکمل کرو اگر عادل شخص گواہی دے دیں تو روزہ رکھو اور افطار کرو اور قربانی کرو (شہادت کا ذکر پہلے تفصیلی طور پر بیان ہو چکا ہے)۔

☆ "واخرج الدار قطنی عن ابی مسعود الانصاری ان النبی ﷺ اصبح صائما لتمام الثلاثین من رمضان فجاء اعرابیان فشهد ان لا اله الا الله وانهما اهلا بالامس فامرهم فافطروا " (درمنشور)

حضرت ابو مسعود انصاری فرماتے ہیں بیشک نبی کریم ﷺ نے رمضان کے تیس دن مکمل کرنے کی غرض سے صبح روزہ رکھا تھا دو اعرابی آئے انہوں نے اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کی شہادت دی پھر بتایا کہ ہم نے کل چاند دیکھا تھا تو آپ نے لوگوں کو حکم دیا کہ روزہ افطار کر لو۔

☆ " واخرج ابن جریر عن الضحاک فی قوله ولتکملوا العدة قال عدة ما فطر المریض والمسافر " (درمنشور)

ضحاک کہتے ہیں اللہ تعالیٰ کے ارشاد ﴿ وَلِتُكْمِلُوا الْعِدَّةَ ﴾ کا مطلب یہ ہے کہ مریض اور مسافر ہونے کی حالت میں جو روزے تم افطار کرو وہ مکمل کرو۔

وَلِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰى مَا هَدٰكُمْ : "اورتم بڑائی بیان کرواللہ کی اس پر جو ہدایت دی اس نے تمہیں"
وَلِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ سے مراد تکبیر: یعنی ایک قول یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ارشاد کا مطلب یہ ہے کہ فطر کی رات تکبیر پڑھو۔

☆ " قال ابن عباس حق علی المسلمین اذا رأوا هلال شوال ان یکبروا "

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں مسلمانوں پر یہ حق ہے کہ وہ جب شوال کا چاند دیکھیں تو تکبیر پڑھیں۔ (کبیر)

☆ " اخرج ابن المنذر وابن ابی حاتم والمروزی فی کتاب العیدین عن زید بن اسلم فی قوله ﴿ وَلِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰى مَا هَدٰكُمْ ﴾ قال لتکبروا یوم الفطر " (درمنثور)

حضرت زید بن اسلم فرماتے ہیں اللہ تعالیٰ کے ارشاد گرامی ﴿وَلِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰى مَا هَدٰكُمْ ﴾ کا مطلب یہ ہے کہ فطر کے دن تکبیر پڑھو۔

☆ " واخرج الطبرانی فی المعجم الصغیر عن انس قال قال رسول الله ﷺ زینوا اعیادکم بالتکبیر " (درمنثور)

حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں ۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تم اپنی عیدوں کو تکبیر کے ذریعے مزین کرو۔

☆ " واخرج المروزی والدار قطنی والبیهقی فی السنن عن ابی عبد الرحمن السلمی قال کانوا فی الفطر اشد منهم فی الاضحی یعنی فی التکبیر " (درمنثور)

ابوعبدالرحمٰن سلمی فرماتے ہیں صحابہ کرام بنسبت اضحیٰ کے فطر میں زیادہ تکبیر کا اہتمام کرتے تھے یعنی تکبیر کہنے میں۔

کون سی تکبیر پڑھی جائے؟ زیادہ طور پر تو یہی قول ہے اہل علم کا کہ جو عیدالاضحیٰ اور ایام تشریق میں تکبیر پڑھی جاتی ہے وہی تکبیر پڑھی جائے تاہم کچھ مختلف الفاظ بھی ملتے ہیں۔

☆ " واخرج سعید بن منصور وابن ابی شیبه والمروزی عن ابن مسعود انه کان یکبر الله اکبر الله اکبر لا اله الا الله والله اکبر ولله الحمد " (درمنثور)

حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ یہ تکبیر پڑھتے تھے " الله اکبر الله اکبر لا اله الا الله والله

اکبر و للہ الحمد "

☆ واخرج ابن ابی شیبة والمروزی والبیھقی فی سننه عن ابن عباس انه کان یکبر اللہ اکبر کبیرا اللہ اکبر کبیرا اللہ اکبر وللہ الحمد واجل اللہ اکبر علی ما ھدانا "

(درمنثور)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ یہ تکبیر پڑھتے تھے اللہ اکبر کبیرا اللہ اکبر کبیرا اللہ اکبر وللہ الحمد واجل اللہ اکبر علی ما ھدانا "

☆ " واخرج البیھقی عن ابی عثمان النھدی قال کان عثمان یعلمنا التکبیر اللہ اکبر اللہ اکبر کبیرا اللھم انت اعلی واجل من ان یکون لک صاحبة او یکون لک ولد او یکون لک شریک فی الملک او یکون لک ولی من الذل وکبرہ تکبیرا اللھم اغفرلنا اللھم ارحمنا "

(درمنثور)

ابوعثمان نہدی کہتے ہیں حضرت عثمان (ذوالنورین) رضی اللہ عنہ ہمیں یہ تکبیر سکھاتے تھے۔

" اللہ اکبر اللہ اکبر کبیرا اللھم انت اعلی واجل من ان یکون لک صاحبة او یکون لک ولدا او یکون لک شریک فی الملک او یکون لک ولی من الذل وکبرہ تکبیرا اللھم اغفرلنا اللھم ارحمنا "

کیسے تکبیر کہے؟ امام شافعی رحمہ اللہ اور صاحبین (امام ابو یوسف اور امام محمد رحمھما اللہ) کے نزدیک بلند آواز سے تکبیر کہنا مستحب ہے اور امام اعظم ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک آہستہ آواز سے تکبیر کہنا مستحب ہے۔

تکبیر کب کہے: شوال کا چاند جب نظر آجائے تو رات کو تکبیر پڑھے اور صبح بھی تکبیر پڑھے۔

(از کتب فقہ)

تکبیر کیوں کہے؟ اس لئے کہ پہلے ذکر فرمایا کہ جو شخص رمضان کے مہینہ میں حاضر ہو یعنی مسلمان اور بالغ ہونے کی حالت میں رمضان کو پالے وہ روزے رکھے پھر مسافر اور مریض کو افطار کرنے کی رخصت دی پھر ان کو قضاء کرنے کا حکم دیا پھر ارشاد فرمایا ﴿ وَلِتُكْمِلُوا الْعِدَّةَ ﴾ علة الامر بمراعاة العدة " گنتی پوری کرو اس میں تعداد کی رعایت کا حکم دیا گیا ہے۔ پھر تعداد کی رعایت میں وہی دو صورتیں ہیں جن کا پہلے ذکر کر دیا گیا ہے یعنی رمضان کی گنتی مکمل کر و یا جو روزے سفر اور مرض کی

حالت میں تم سے قضاء ہو گئے تھے ان کی گنتی پوری کرو۔ پھر فرمایا:

﴿ وَلِتُكَبِّرُوا اللهَ ﴾ علة ما علم من كيفية القضاء والخروج عن عهدة الفطر "

یعنی جب تمہیں قضاء کی کیفیت اور فطر کی ذمہ داری سے نکلنے کا علم عطا کیا گیا ہے تو تمہیں چاہئے کہ جس ذات نے تمہیں علم عطا کیا ہے اس کی بڑائی بیان کرو۔ (از مدارک، وکبیر)

﴿ وَلِتُكَبِّرُوا اللهَ ﴾ بمشاهدته بعد استكما لها ليلة العيد وفجرها شكرا"

اللہ تعالیٰ نے جب تمہیں روزے مکمل کرنے کی توفیق عطا فرمائی ہے تو تم چاند دیکھ کر رات کو اور فجر کو بھی اللہ تعالیٰ کی بڑائی بیان کرو تا کہ تم اپنی وسعت کے مطابق کچھ نہ کچھ شکر ادا کرسکو اگر چہ حقیقی طور پر شکر ادا کرنے سے انسان قاصر ہے۔ (از تبصیر الرحمٰن)

وَلِتُكَبِّرُوا اللهَ بمعنی تعظیم باری تعالیٰ:

" ان المراد منه التعظيم لله شكرا على وفق هذه الطاعة "

اللہ کی بڑائی بیان کرو یعنی اللہ تعالیٰ کی عظمت بیان کرو اس کی تعظیم بجالاؤ، کیونکہ جب اس منعم ذات نے تمہیں اس طاعت کی توفیق عطا فرمائی ہے تو تم پر بھی اس کا شکر کرنا ضروری ہے۔ (از کبیر)

خیال رہے کہ اعلیٰ حضرت کا ترجمہ ایسا خوب ہے کہ علامہ رازی رحمہ اللہ کے دونوں معانی کو حاوی ہے (اور اللہ کی بڑائی بولو) اس کا مطلب خواہ یہ لیں کہ اللہ کی تکبیر کہو یا یہ مطلب لیں کہ اللہ کی تعظیم بجالاؤ دونوں معانی ہی درست ہیں۔ راقم نے بھی اعلیٰ حضرت کے ترجمہ کو ہی معمولی تبدیلی سے نقل کیا ہے (اور تم بڑائی بیان کرو اللہ کی)۔

اللہ کی بڑائی میں تین چیزیں پائی جائیں:

" واعلم ان تمام هذا التكبير انما يكون بالقول والاعتقاد والعمل "

یہ جاننا ضروری ہے کہ اللہ تعالیٰ کی بڑائی اس وقت مکمل ہو گی اور صحیح معتبر ہو گی جب زبان سے بھی اس کی بڑائی بیان کی جائے اور عقیدہ بھی اس کی بڑائی کا ہو اور عمل بھی اس کے مطابق ہو۔

قول سے بڑائی بیان کرنا:

" اما القول فالاقرار بصفاته العلی واسمائه الحسنی وتنزیهه عما لایلیق به من ند وصاحبة وولد وشبه بالخلق "

زبان سے اللہ تعالیٰ کی بڑائی بیان کرنے کا مطلب یہ ہے کہ اس کی بلند صفات کا اقرار کرے اور اس کے اسماء حسنیٰ (اچھے ناموں) کا ذکر کرے اور اللہ تعالیٰ کی شریکوں سے اور زوجہ سے اور اولاد اور مخلوق کی مشابہت سے پاکیزگی بیان کرے۔

بڑائی کا اعتقاد رکھنا: " وکل ذلک لا یصح الا بعد صحة الاعتقاد بالقلب "

جن چیزوں کا قول میں ذکر کیا ہے ان تمام کا عقیدہ رکھنا کیونکہ جب دل سے اعتقاد صحیح ہوگا تب ہی ان کا اقرار بھی کیا جائے گا۔

عمل سے بڑائی بیان کرنا: " واما العمل فالتعبد بالطاعات من الصلوة والصیام والحج "

لیکن عمل سے رب تعالیٰ کی بڑائی بیان کرنے کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی عبادت کرے اس کی فرمانبرداری کرے یعنی نماز ادا کرے اور روزے رکھے اور حج ادا کرے اور زکواۃ ادا کرے۔ غرضیکہ تمام عبادات کو بجالانا اور تمام ممنوعات سے بچ جانا اور زبان سے رب تعالیٰ کی عظمت بیان کرنا اور رب تعالیٰ کی عظمت کا اعتقاد رکھنا اور تکبیرات کا پڑھنا یہ تمام چیزیں ﴿ ولتکبروا اللہ ﴾ میں آجاتی ہیں۔

عَلٰی مَا هَدٰىكُمْ : لفظ "ما" میں دو احتمال ہیں ایک یہ کہ "ما" موصولہ ہو اس صورت میں مطلب یہ ہوگا:

" علی الذی ارشدکم الیه مما تکسبوا به مرضات ربکم وفراغ ذمتکم وجزیل المثوبة "

(اور تم بڑائی بیان کرو اللہ کی) اس پر جو ہدایت دی اس نے تمہیں جس کے ذریعے تم رب تعالیٰ کی رضاء مندی حاصل کرتے ہو اور اپنی ذمہ داریوں سے فراغت حاصل کرتے ہو اور زیادہ ثواب حاصل کرتے ہو۔ اور دوسرا احتمال یہ ہے کہ "ما" مصدریہ ہو اس صورت میں معنی یہ ہوگا " علی ارشادکم " اور تم بڑائی بیان کرو اس کی راہنمائی پر۔ (از مظہری)

خیال رہے کہ اعلیٰ حضرت کا ترجمہ ''ما'' موصولہ کے مطابق ہے راقم نے بھی اسی کو آسان سمجھ کر نقل کر دیا ہے تاہم طلباء کرام ''ما'' مصدریہ کے مطابق بھی ترجمہ ذہن نشین کر لیں۔

ہدایت دینے کا مطلب کیا؟ اگر معنی یہ کیا جائے کہ اس نے ''طاعت کی تخلیق کر کے تمہیں ہدایت دی'' تو یہ معنی وسیع تر ہوگا جو تمام معانی کو شامل ہوگا تاہم اسے یوں بیان کرنا بھی مناسب ہوگا کہ اس نے تمہیں دنیا میں عظیم انعامات عطا کر کے اور دلائل عطا کر کے اور چیزوں کی پہچان کرا کے اور تمہیں نیکیوں کی توفیق عطا کر کے اور گناہوں سے بچا کر ہدایت عطا کی۔ (از کبیر بتصرف)

وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ : ''اور تاکہ تم شکر کرو''

ان الفاظ مبارکہ کا اس مقام پر ذکر کرنے کا یہ فائدہ ہے کہ انسان کو جب رب تعالیٰ نے یہ حکم دیا کہ ''تم اللہ کی بڑائی بیان کرو'' تو یہ اس وقت تک مکمل نہیں ہو سکتا جب تک بندہ اللہ تعالیٰ کے جلال اور اس کی کبریائی اور اس کی عزت اور اس کی عظمت کو نہ جان لے اور بندے کو یہ علم حاصل ہو:

'' ان الله اکبر من ان تصل الیه عقول العقلاء واوصاف الواصفین وذکر الذاکرین''

کہ بیشک اللہ تعالیٰ بہت بڑا ہے اس تک بڑے بڑے عقلمندوں کی عقلوں کی رسائی نہیں اور اس کے اوصاف بیان کرنے والے اس سے قاصر ہیں کہ اس کے اوصاف کما حقہ بیان کر سکیں اور اس کا ذکر کرنے والے اس کے ذکر سے قاصر ہیں:

'' ثم یعلم انه سبحانه مع جلاله وعزته واستغنائه عن جمیع المخلوقات فضلا عن هذا المسکین خصه الله بهذه الهدایة العظیمة ''

پھر بندے کو یہ معلوم ہونا چاہئے کہ اللہ تعالیٰ اپنے جلال اور عظمت کی وجہ سے تمام مخلوق سے مستغنی ہے چہ جائیکہ اس مسکین کو اللہ تعالیٰ نے جو اس ہدایت عظیمہ سے خاص کیا ہے اس سے مستغنی نہ ہو ایسا ممکن نہیں جب انسان کو یہ علم حاصل ہوگا تو وہ اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرنے میں مشغول ہوگا اور اپنی طاقت اور وسعت کے مطابق رب تعالیٰ کا شکر کرے گا۔ اسی وجہ سے رب تعالیٰ نے فرمایا ﴿ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ ﴾ ''اور تاکہ تم شکر کرو'' (از کبیر) اور مطلب یہ ہے:

'' ولکی تشکروا علی وجوب الصوم فانه وسیلة لنیل الدرجات وعلی

اباحة الفطر للمریض والمسافر فان فیه تخفیفا ورخصة "(مظهری)

اور تا کہ تم روزے کے وجوب پر شکر ادا کرو کہ اللہ تعالیٰ نے تم پر روزے فرض کئے ہیں کیونکہ روزہ رکھنا درجات کی بلندی کے حاصل کرنے کا ذریعہ ہے اور تم مریض اور مسافر کی تخفیف اور رخصت کی وجہ سے روزہ کے افطار کرنے کی اجازت کا شکریہ ادا کرو کہ اللہ تعالیٰ نے تمہارے لئے آسانی پیدا کر دی۔ شکر کرنے کا اور فائدہ یہ ہوگا:

﴿ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ﴾ هذا التخفیف فیجبرا لشکر ما نقصر من تلک الایام بالاجر "

کہ تم اللہ تعالیٰ کی طرف سے حاصل ہونے والی تخفیف کا شکر ادا کرو تا کہ شکر کی وجہ سے بظاہر رمضان کی فضیلت جو حاصل نہ ہو سکی وہ کمی پوری ہو جائے اور اجر کی تکمیل ہو جائے۔ (تیسیر الرحمٰن)

نفلی روزہ کے متعلق احادیث مبارکہ:

" عن عائشة قالت کان رسول الله ﷺ یصوم حتی نقول لا یفطر ویفطر حتی نقول لا یصوم وما رأیت رسول الله ﷺ استکمل صیام شهر قط الا رمضان وما رأیته فی شهر اکثر منه صیاما فی شعبان وفی روایة قالت کان یصوم شعبان کله وکان یصوم شعبان الا قلیلا " (بخاری ومسلم، مشکوۃ باب صیام التطوع)

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں رسول اللہ ﷺ روزے رکھتے تھے تو ہم کہتے آپ افطار نہیں کریں گے۔ اور آپ افطار کرتے تو ہم کہتے آپ روزہ نہیں رکھیں گے اور میں نے رسول اللہ ﷺ کو نہیں دیکھا کہ آپ نے کسی مہینے کے مکمل روزے رکھے ہوں سوائے رمضان کے اور میں نے آپ کو نہیں دیکھا کہ آپ نے شعبان کے مہینے سے زیادہ کسی اور مہینے میں روزے رکھے ہوں۔ اور ایک روایت میں ہے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں حضور ﷺ شعبان کا کل مہینہ روزہ رکھتے تھے اور شعبان کے روزے رکھتے تھے سوائے تھوڑوں کے۔

وضاحت حدیث: نبی کریم ﷺ رمضان کے روزے مکمل رکھتے تھے لیکن نفلی روزے کبھی چاہا تو کسی دن لگاتار رکھ لئے اور کبھی چاہا تو کئی دن افطار کر لئے۔ جب آپ کئی دن لگاتار روزہ رکھتے تو

سمجھ یہ آتا کہ آپ افطار نہیں کریں گے اور جب کئی دن روزہ نہ رکھتے تو سمجھ یہ آتا کہ آپ روزہ نہیں رکھیں گے۔ رمضان کے بغیر کسی اور مہینہ میں اگر آپ زیادہ روزے رکھتے تھے تو وہ شعبان کا مہینہ ہوتا۔

ہاں البتہ بظاہر اس پر اعتراض وارد ہوتا ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی روایت کے مطابق تو یہ سمجھ آتا ہے کہ آپ شعبان کا مہینہ مکمل ہی روزہ رکھتے۔ اور دوسری روایت سے پتہ چلتا ہے کہ آپ شعبان کے مہینہ کے اکثر دن روزہ رکھتے ان دونوں میں تعارض نظر آتا ہے۔ تو اس کا جواب یہ ہے:

" وقيل المراد انه يصومه كله فی سنة واكثره فی سنة اخری فالمعنی علی العطف وهو اقرب لظاهر اللفظ "

کہ آپ ایک سال شعبان کا مکمل مہینہ روزہ رکھتے اور دوسرے سال شعبان کے اکثر دن روزہ رکھتے یہ معنی بظاہر الفاظ کے مطابق ہے جس میں عطف کا لحاظ کیا گیا ہے۔ البتہ اس توجیہ کے مطابق حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے اس ارشاد " کہ آپ نے مکمل مہینہ صرف رمضان کے روزے رکھے " کا مطلب یہ ہوگا کہ ہمیشہ ہر سال مکمل مہینے کے روزے صرف رمضان کے رکھے البتہ شعبان کے کبھی مکمل مہینہ روزے رکھے اور کبھی شعبان کے زیادہ دنوں کے روزے رکھے۔ (از مرقاۃ)

☆ " عن عبد الله بن شقيق قال قلت لعائشة اكان النبی ﷺ يصوم شهرا كان قالت ما علمته صام شهرا كله الا رمضان ولا افطره كله حتی يصوم منه حتی مضی لسبيله "

(رواه مسلم ، مشكوة باب صيام التطوع)

عبداللہ بن شقیق کہتے ہیں میں نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے سوال کیا۔ کیا نبی کریم ﷺ تمام مہینہ روزہ رکھتے تھے تو انہوں نے جواب دیا کہ مجھے علم نہیں کہ حضور ﷺ نے تمام مہینہ روزے رکھے ہوں سوائے رمضان کے اور نہ ہی آپ نے تمام مہینہ افطار کیا یہاں تک کہ آپ روزہ رکھتے آپ کا یہی عمل رہا یہاں تک کہ آپ دنیا سے تشریف لے گئے۔

وضاحت حدیث : اس حدیث پاک کا یہی مطلب ہے کہ باقاعدگی سے ہمیشہ تو آپ نے صرف رمضان کے روزے ہی رکھے البتہ شعبان کے کبھی مکمل مہینہ کے روزے رکھے اور کبھی شعبان کے زیادہ دن روزے رکھے۔ یہ مطلب پچھلی حدیث سے ثابت ہوا۔ اور آپ نے کسی مہینہ کے مکمل دن افطار بھی نہیں کیا بلکہ ہر مہینہ کے ایام بیض یعنی ہر چاند کی تیرہ چودہ اور پندرہ تاریخ کو آپ نے روزے رکھے۔ (از مرقاۃ)

☆ " وعن ابن عباس قال حین صام رسول اللہ ﷺ یوم عاشوراء وامر بصیامه قالوا یارسول اللہ ﷺ انه یوم یعظمه الیهود والنصاری فقال رسول اللہ ﷺ لئن بقیت الی قابل لاصو من التاسع " (رواہ مسلم مشکوۃ باب صیام التطوع)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں جب رسول اللہ ﷺ نے عاشورہ (دس محرم) کے دن روزہ رکھا اور اس دن روزہ رکھنے کا حکم دیا صحابہ کرام نے عرض کیا یا رسول اللہ اس دن کی یہود اور نصاریٰ تعظیم کرتے ہیں۔ تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اگر میں آنے والے سال تک باقی رہا تو نو محرم کو بھی روزہ رکھوں گا۔

وضاحت حدیث: نبی کریم ﷺ اور صحابہ کرام جب مکہ مکرمہ سے مدینہ طیبہ میں تشریف لائے تو دیکھا کہ یہود عاشورہ کے دن روزہ رکھتے ہیں آپ نے ان سے پوچھا کہ تم اس دن کیوں روزہ رکھتے ہو؟ تو انہوں نے کہا:

" هذا یوم نعظمه اظفر اللہ فیه موسی علیه الصلوۃ والسلام وبنی اسرائیل علی فرعون "

ہم اس دن کی تعظیم اس لئے کرتے ہیں کہ اس دن موسیٰ علیہ السلام اور بنی اسرائیل کو اللہ تعالیٰ نے فرعون پر کامیاب کیا یعنی ان کو فرعون اور قبطیوں سے نجات دی۔ " فقال النبی ﷺ نحن اولی بموسی " تو نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ ہم زیادہ حق رکھتے ہیں کہ موسیٰ علیہ السلام کی موافقت کریں آپ نے خود بھی روزہ رکھا اور صحابہ کرام کو بھی روزہ رکھنے کا حکم دیا۔ شروع شروع میں عاشوراء کا روزہ فرض رہا پھر اس کی فرضیت کو منسوخ کر دیا اور استحباب باقی رہا۔

یہ سلسلہ دس ہجری تک چلتا رہا۔ ہجرت کے دسویں سال صحابہ کرام نے عرض کیا " اذ تجب مخالفتهم فکیف نوافقهم علی تعظیمه " کہ جب یہود و نصاریٰ کی مخالفت کا حکم ہے تو ہم عاشوراء کے دن کی تعظیم کر کے ان کی موافقت کیوں کر رہے ہیں۔ صحابہ کرام نے ظاہر کا خیال کیا کہ ہمیں یہود کی مخالفت کرنی چاہئے لیکن نبی کریم ﷺ حقیقت کا اعتبار کر رہے تھے کہ اس میں یہود کی موافقت کا لحاظ نہیں بلکہ یہ سمجھا جائے کہ عاشورہ کے دن ہمارا روزہ رکھنا تو صرف موسیٰ علیہ السلام اور ان

کے ساتھ ان کی قوم کو فرعون اور فرعونیوں سے نجات دینے کی وجہ سے ہے لیکن پھر صحابہ کرام کی تسلی کے لئے آپ نے فرمایا کہ اگر میں آئندہ سال رہا تو نو تاریخ کا بھی ہم روزہ رکھیں گے۔ آپ نے دس تاریخ کے روزہ کو ختم نہیں کیا بلکہ نو تاریخ کے روزہ کو ساتھ ملانے کا حکم دیا:

" قال الطیبی لم یعش رسول اللہ ﷺ الی القابل بل توفی فی الثانی عشر من ربیع الاول فصار الیوم التاسع من المحرم سنة وان لم یصمه لانه عزم علی صومه "

علامہ طیبی رحمہ اللہ نے فرمایا کہ نبی کریم ﷺ آنے والے محرم تک ظاہری حیات میں نہ رہے بلکہ ربیع الاول میں ہی آپ کا وصال ہو گیا لیکن پھر بھی نو محرم کا روزہ رکھنا سنت ہے اگر آپ نے نو محرم کا روزہ رکھا تو نہیں لیکن آپ نے روزہ رکھنے کا پختہ ارادہ فرما لیا تھا لہٰذا اس تاریخ کو روزہ رکھنا مسنون ہو گیا۔

مسئلہ واضح ہے کہ صرف عاشورہ کے دن کا روزہ رکھنا مکروہ ہے بلکہ نو محرم کا روزہ ساتھ رکھنا مسنون ہے تاہم کراہیت سے بچنے کے لئے اگر نو تاریخ کو روزہ نہ رکھے بلکہ گیارہ تاریخ کو دس کے ساتھ روزہ رکھ لے تو کافی ہے۔ (از مرقاۃ)

یوم عرفہ کے روزہ کا حکم:

" عن ام الفضل بنت الحارث ان ناسا تماروا عندها یوم عرفة فی صیام رسول اللہ ﷺ فقال بعضهم هو صائم وقال بعضهم لیس بصائم فارسلت الیه بقدح لبن وهو واقد علی بیعه فشر به "

(بخاری ومسلم ،مشکوۃ باب صیام التطوع)

ام الفضل بنت حارث فرماتی ہیں کہ میرے قریب کچھ لوگ عرفہ کے دن (نو ذی الحج) بحث کر رہے تھے نبی کریم ﷺ کے روزہ کے متعلق۔ کچھ حضرات کہہ رہے تھے آپ نے روزہ رکھا ہوا ہے کچھ حضرات کہہ رہے تھے آپ کا روزہ نہیں میں نے ایک پیالہ دودھ کا نبی کریم ﷺ کے پاس بھیجا آپ اپنے اونٹ پر سوار تھے تو آپ نے وہ دودھ پی لیا۔

وضاحت:

یوم عرفہ کے روزہ رکھنے میں اگرچہ کئی اقوال ہیں صحیح قول وہ ہے جو حضرت ابن ہمام رحمہ اللہ کا ہے:

" صوم یوم عرفة لغیر الحاج مستحب وللحاج ان کان یضعفه عن الوقوف والدعوات فالمستحب ترکه "

یوم عرفہ کو روزہ رکھنا اس شخص کے لئے مستحب ہے جو حاجی نہیں اور حاجی کو روزہ اگر کمزور کردے جس کی وجہ سے اسے مقام عرفات میں ٹھہرنا اور دعائیں کرنا مشکل ہو اور باعث ضعف ہو تو روزہ کو ترک کرنا اس کے لئے مستحب ہے۔

تاہم علامہ نووی رحمہ اللہ نے حاجی کے لئے مطلقاً روزہ رکھنا مکروہ قرار دیا ہے کیونکہ اس دن میں روزہ رکھنے سے نہی آئی ہوئی ہے فقہاء کرام نے زیادہ اسی قول کو پسند کیا ہے۔ (از مرقاۃ)

پیر کے دن روزہ رکھنا مسنون ہے:

" وعن ابی قتادہ قال سئل رسول اللہ ﷺ عن صوم الاثنین فقال فیه ولدت فیه انزل علی " (رواہ مسلم، مشکوۃ باب صیام التطوع)

حضرت ابو قتادہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ سے پیر کے دن روزہ رکھنے کے متعلق سوال کیا گیا تو آپ نے فرمایا اسی دن میری ولادت ہوئی اور اس دن مجھ پر وحی نازل کی گئی۔

وضاحت: سوال کرنے والے نے اس لئے سوال کیا تھا کہ حضور ﷺ اس دن اکثر طور پر روزہ رکھتے تھے تو آپ سے اس دن کی فضیلت کی وجہ پوچھی گئی تو آپ نے فرمایا کہ یہ دن تمہارے نبی کے دنیا میں موجود ہونے کا دن ہے اور تمہاری کتاب کے نزول کا پہلا دن ہے یعنی حسن ظاہری اور حسن باطنی کے آفتاب کے طلوع ہونے کا دن ہے۔ (از مرقاۃ)

اسی سے واضح ہوا کہ نعمت کے حصول پر خوشی کا اظہار کرنا مسنون ہے۔ خود نبی کریم ﷺ نے اپنا یوم ولادت روزہ رکھ کر منایا۔

شوال کے چھ روزے:

" وعن ابی ایوب الانصاری انه حدثه ان رسول اللہ ﷺ قال من صام رمضان ثم اتبعه ستامن شوال کان کصیام الدهر "

(روہ مسلم، مشکوۃ باب صیام التطوع)

حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں بیشک رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس شخص نے رمضان کے روزے رکھے پھر ان کے پیچھے چھ روزے شوال کے رکھے تو اسے زمانہ بھر کے روزوں کا ثواب مل گیا۔

وضاحت : مراد یہ ہے کہ جس شخص نے ہر سال یہ عمل کیا تو اسے زندگی بھر کے روزوں کا ثواب مل جائے گا کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ﴿ مَنْ جَآءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهٗ عَشْرُ اَمْثَالِهَا ﴾ جس شخص نے ایک نیکی کی اسے دس دنوں کا ثواب حاصل ہوگا۔ اس رمضان کے تیس روزوں کا ثواب تین سودنوں کا ہوگیا اور شوال کے چھ روزوں کا ثواب ساٹھ دنوں کے روزوں کا ثواب حاصل ہو جائے گا۔
اس طرح ایک سال کے روزوں کا ثواب مل گیا۔ اسی طرح ہر سال اگر کوئی شخص اس پر عمل کرے گا تو زندگی بھر کے روزوں کا ثواب حاصل ہو جائے گا۔

فائدہ: ابن ماجہ وغیرہ نے حضرت ثوبان رضی اللہ عنہ سے مرفوع حدیث بیان کی ہے: " **من صام ستة ایام بعد الفطر کأنه صام السنة ثم قال وان فرقها جاز** " جس شخص نے عید الفطر کے بعد شوال کے چھ روزے رکھے گویا کہ اس نے سال کے روزے رکھے پھر انہوں نے فرمایا اگر متفرق طور پر روزے رکھے تو جائز ہے۔ خیال رہے بعض حضرات نے عید الفطر کے بعد چھ دن مسلسل روزے رکھنے مستحب بیان کئے ہیں لیکن وہ صرف اسلئے کہ زندگی کا پتہ نہیں نیکی کا کام جتنا جلدی ہو سکے بہتر ہے۔ لیکن اگر شوال کے مہینہ میں چھ روزے مکمل کرلے بیشک علیحدہ علیحدہ روزے رکھے مسلسل نہ رکھے تو ثواب وہی حاصل ہوگا کیونکہ حدیث شریف میں عید الفطر کے متصل اور مسلسل رکھنے کا کوئی حکم نہیں پایا گیا
(از مرقاۃ)

پیر اور جمعرات کو روزہ رکھنا:

" **عن عائشة قال کان رسول اللہ ﷺ یصوم الاثنین والخمیس** "
(رواہ الترمذی والنسائی)

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں رسول اللہ ﷺ پیر اور جمعرات کو روزہ رکھتے تھے۔

" **وعن ابی هریرة قال قال رسول اللہ ﷺ تعرض الاعمال یوم الاثنین والخمیس فاحب ان یعرض عملی وانا صائم** " (رواہ الترمذی)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اعمال پیر اور جمعرات کو پیش کیے جاتے ہیں تو میں پسند کرتا ہوں میرے عمل پیش کیے جائیں تو میں روزہ دار ہوں۔
(مشکوۃ باب صیام التطوع)

وضاحت: پیر کو روزہ رکھنے کی ایک وجہ پہلے گزر گئی کہ نبی کریم ﷺ کی پیدائش کا دن ہے اور نزول وحی کی ابتداء کا دن ہے اور دوسری وجہ اس حدیث میں ذکر ہو گئی کہ جمعرات اور پیر کو (**تعرض الاعمال**) **ای علی الملک المتعال** " لوگوں کے اعمال اللہ تعالیٰ کے حضور پیش کیے جاتے ہیں اس لئے آپ روزہ رکھتے تھے تا کہ جب میرے اعمال اللہ تعالیٰ کے حضور پیش ہوں تو میں روزہ دار ہوں۔
اس کی وجہ یہ تھی " **طلبا لزیادۃ رفعۃ الدرجۃ** " کہ حضور ﷺ درجات کی بلندی کے لئے نفلی نیک اعمال زیادہ سے زیادہ فرماتے تھے اور مقصود تعلیم امت بھی ہوا کرتا کہ امت کے لوگ بھی نفلی عبادات پر عمل کریں تا کہ ان کے مدارج بھی بلند ہوں۔

ایام بیض کے روزے: ایام بیض چاند کی تیرہ، چودہ اور پندرہ تاریخ کے دنوں کو کہا جاتا ہے

☆ " **وعن ابی ذر قال قال رسول اللہ ﷺ یا اباذر اذا صمت من الشھر ثلاثۃ ایام فصم ثلاث عشرۃ واربع عشرۃ وخمس عشرۃ** "
(رواہ الترمذی والنسائی، مشکوۃ باب صیام التطوع)

حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اے ابوذر جب تم مہینہ میں تین دن روزے رکھو تو تیرہ اور چودہ اور پندرہ تاریخوں کو رکھو۔

جمعہ کے دن روزہ رکھنا: " **عن عبد اللہ بن مسعود قال کان رسول اللہ ﷺ یصوم من غرۃ کل شھر ثلاثۃ ایام وقلما کان یفطر یوم الجمعۃ** "
(رواہ الترمذی والنسائی، مشکوۃ باب صیام التطوع)

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ ہر مہینہ کی روشن تین راتوں کے دنوں میں روزہ رکھتے تھے اور جمعہ کے دن آپ کم ہی افطار کرتے تھے۔

وضاحت: **غرۃ** ، کا معنی ہے روشن اور چمکدار اور " **بیض** "، جمع ہے ابیض اور بیضاء کی جس کا معنی ہے سفید چونکہ تیرہ اور چودہ اور پندرہ تاریخوں کی راتوں میں چاند روشن ہوتا ہے تو اصل میں وہ

راتیں سفید اور چمکدار ہوتی ہیں تو اسی مناسبت سے دنوں کو بھی " ایام بیض اور ایام غرة " کہہ لیا گیا
نبی کریم ﷺ جمعہ کے دن اکثر روزہ رکھتے تھے کبھی کبھی جمعہ کے دن روزہ کو ترک بھی فرمالیتے تھے۔

اعتراض : جمعہ کے دن روزہ رکھنے سے تو نبی کریم ﷺ نے منع فرمایا ہے جب تک جمعہ سے پہلے دن یا دوسرے دن روزہ نہ رکھے تو خود نبی کریم ﷺ جمعہ کو روزہ کیوں رکھتے تھے؟ ممانعت کی حدیث یہ ہے۔

" عن ابی هريرة قال قال رسول الله ﷺ لا يصوم احدكم يوم الجمعة الا ان يصوم قبله او يصوم بعده " (بخاری ومسلم مشکوۃ باب صیام التطوع)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تم میں سے کوئی ایک جمعہ کے دن روزہ نہ رکھے مگر یہ کہ اس سے پہلے دن روزہ رکھے یا اس کے بعد والے دن روزہ رکھے۔

جواب : **" قال ابن همام ولا بأس بصوم يوم الجمعة منفردا عند ابی حنيفة ومحمد رحمهما الله تعالیٰ "**

حضرت ابن ہمام رحمہ اللہ نے بیان فرمایا کہ صرف جمعہ کے دن کا روزہ رکھنا منع نہیں اور نہ ہی اس میں کوئی حرج ہے یہی مذہب امام ابوحنیفہ وامام محمد رحمہما اللہ کا ہے۔ صرف جمعہ کے دن روزہ رکھنا اس وقت مکروہ ہے جب صرف جمعہ کی تعظیم کے لئے روزہ رکھے اور جمعہ کو خاص کر لے عبادت کے لئے دوسرے کسی دن عبادت کو جائز نہ سمجھے جیسا کہ یہود ہفتہ کے دن کی تعظیم کرتے تھے اور نصاریٰ صرف اتوار کی تعظیم کرتے تھے۔ اگر یہ عقیدہ نہ ہو بلکہ صرف یہ عقیدہ ہو کہ جمعہ کا دن افضل ہے اس میں روزہ رکھ لیا جائے یا اور نفلی عبادت کر لی جائے تو ثواب ہوگا اگرچہ اور دنوں میں بھی نفلی روزہ اور نماز کا ثواب حاصل ہوتا ہے تو یہ جائز ہے کوئی مکروہ نہیں۔ اسی پر نبی کریم ﷺ کا یہ ارشاد گرامی دلالت کر رہا ہے:

" عن ابی هريرة قال قال رسول الله ﷺ لا تختصوا ليلة الجمعة بقيام من بين الليالی ولا تختصوا يوم الجمعة بصيام من بين الايام الا ان يكون فی صوم يصومه احدكم " (رواہ مسلم ، مشکوۃ باب صیام التطوع)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا راتوں میں سے صرف جمعہ کی رات کو قیام کے لئے (نوافل ادا کرنے کے لئے) خاص نہ کرو اور دنوں میں سے صرف جمعہ کے دن کو روزہ کے لئے خاص نہ ہو ہاں مگر کوئی شخص اس تاریخ کو روزہ رکھتا ہو۔

اس سے واضح ہوا کہ باقی راتوں کو چھوڑ کر صرف جمعہ کی رات کو عبادت کے لئے خاص کرنے کا اعتقاد ہو اور باقی دنوں کو چھوڑ کر صرف جمعہ کے دن روزہ رکھنے سے خاص کرنا اچھا نہیں ۔ یہ عقیدہ نہ ہو صرف جمعہ کی رات اور جمعہ کے دن کو افضل سمجھ کر عبادت کرنے میں کوئی ممانعت نہیں البتہ بہتر یہی ہے کہ اور دنوں میں بھی کبھی کبھی عبادت کر لی جائے تاکہ بظاہر عمل سے تخصیص کے عقیدہ کا وہم نہ ہو۔

دوسرا جواب: نبی کریم ﷺ کا جمعہ کے دن روزہ رکھنا جو ثابت ہے اس میں یہ ذکر نہیں کہ آپ جمعہ کے دن سے پہلے یا بعد میں روزہ رکھ لیتے ہوں ۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ آپ کی اس میں تخصیص ہو کہ آپ روزہ صرف جمعہ کو رکھ لیتے ہوں یہ وجہ بھی واضح ہے کہ آپ جمعہ کو روزہ رکھ کر جمعہ کو تعظیم میں خاص نہیں کرتے تھے بلکہ نبی کریم ﷺ کا تمام دنوں میں روزہ رکھنا اس حدیث سے ثابت ہے:

" عن عائشة قالت كان رسول الله ﷺ يصوم من الشهر السبت والاحد والاثنين ومن الشهر الآخر الثلاثاء والاربعاء والخميس "

(رواه الترمذی ، مشکوة باب صیام التطوع)

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں رسول اللہ ﷺ کسی مہینہ میں ہفتہ اور اتوار اور پیر کو روزہ رکھ لیتے تھے اور کسی مہینہ میں منگل اور بدھ اور جمعرات کو روزہ رکھ لیتے تھے۔

تین روزے بغیر معین تاریخوں کے:

" عن معاذة العدوية انها سألت عائشة اكان رسول الله ﷺ يصوم من كل شهر ثلاثة ايام قالت نعم فقلت لها من اى ايام الشهر كان يصوم قالت لم يكن يبالى من اى ايام الشهر يصوم " (رواه مسلم ، مشكوة باب صيام التطوع)

حضرت معاذہ عدویہ کہتی ہیں کہ میں نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے پوچھا کیا رسول اللہ ﷺ ہر مہینہ میں تین دن روزے رکھتے تھے؟ تو انہوں نے فرمایا ہاں ۔ تو میں نے کہا مہینہ کے کون سے دنوں میں روزہ رکھتے تھے؟ تو انہوں نے فرمایا کہ آپ یہ پرواہ نہیں فرماتے تھے کہ آپ کس دن روزہ رکھ رہے ہیں۔

وضاحت: نبی کریم ﷺ نے ایام بیض کو روزے رکھے اور پسند فرمایا کہ آپ کی امت کے

لوگ بھی ایام بیض کو روزے رکھیں تاہم کبھی آپ نے مہینہ میں تین روزے رکھے لیکن وہ تاریخیں معین نہیں فرمائیں بلکہ بغیر معین کرنے کے تین دن روزے رکھے وجہ وہی ہوسکتی ہے کہ صرف ایام بیض کی تعظیم کا اعتقاد کر کے دوسرے دنوں میں عبادت کو کوئی نہ چھوڑے۔

داؤد علیہ السلام کے روزوں کو نبی کریم ﷺ نے پسند فرمایا:

"وعن عبد الله بن عمرو بن العاص قال قال لی رسول الله ﷺ یاعبدالله الم اخبر انک تصوم النهار وتقوم اللیل فقلت بلی یا رسول الله قال فلا تفعل صم وافطر وقم ونم فان لجسدک علیک حقا وان لعینک علیک حقا وان لزوجک علیک حقا وان لزورک علیک حقا لا صام من صام الدهر صوم ثلاثة ایام من کل شهر صوم الدهر کله صم کل شهر ثلاثة ایام واقرأ القرآن فی کل شهر فقلت ان اطیق اکثر من ذلک قال صم افضل الصوم صوم داؤد صیام یوم وافطار یوم واقرأ کل سبع لیال مرة ولا تزد علی ذلک"

(بخاری ومسلم ، مشکوۃ باب صیام التطوع)

حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص کہتے ہیں مجھے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اے عبداللہ کیا مجھے یہ خبر نہیں ملی کہ بیشک تم دن کو روزہ رکھتے ہو اور رات کو قیام کرتے ہو (نوافل ادا کرتے ہو) تو میں نے کہا ہاں ایسا ہی ہے یارسول اللہ آپ نے فرمایا ایسا نہ کرو (بلکہ) روزہ رکھو اور افطار کرو اور قیام کرو اور سو جایا کرو بیشک تمہارے جسم کا تم پر حق ہے اور بیشک تمہاری آنکھ کا تم پر حق ہے اور بیشک تمہاری زوجہ کا تم پر حق ہے اور بیشک تمہاری زیارت کرنے والوں کا تم پر حق ہے اس شخص کا روزہ نہیں جس نے ہمیشہ روزہ رکھا ہر مہینہ کے تین دن روزے رکھنا ہمیشہ روزے رکھنا ہے اور ہر مہینہ میں (ایک مرتبہ) قرآن پڑھو تو میں نے کہا میں اس سے زیادہ کی طاقت رکھتا ہوں آپ نے فرمایا (اچھا پھر) تم افضل روزے رکھو جو حضرت داؤد علیہ السلام رکھتے تھے ایک دن روزہ رکھتے تھے اور ایک دن افطار کرتے تھے اور قرآن سات راتوں میں ایک مرتبہ پڑھو اور اس سے زیادہ نہ کرو۔

وضاحت حدیث: نبی کریم ﷺ کا ارشاد "الم اخبر انک تصوم النهار وتقوم

اللیل " کیا مجھے خبر نہیں دی گئی کہ تم دن کو روزہ رکھتے ہو یعنی تم ہر دن روزہ رکھتے ہو کسی دن افطار نہیں کرتے۔ اور رات کو قیام کرتے ہو یعنی تمام رات نوافل ادا کرتے رہتے ہو کبھی سوتے نہیں۔

حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص نے جب عرض کیا ہاں ایسا ہی ہے یا رسول اللہ تو حضور ﷺ نے فرمایا:

فلا تفعل : ''ایسا نہ کرو'' کیونکہ اس میں تمہارے لئے ضرر ہے یعنی ہمیشہ دن کا روزہ اور ہر رات کا قیام تمہارے بدن کو ضعیف کردیں گے جس کی وجہ سے تم سے عبادات ضرور یہ بھی چھوٹ جائیں گی۔

صم و افطر : یعنی روزہ رکھو جب تمہیں چستی حاصل ہو اور بعض دنوں میں روزہ رکھو اور جب نفس کی شہوت کا غلبہ ہو تو روزہ رکھو تا کہ شہوت کا دبدبہ ختم ہو جائے۔ اور سستی کے وقت افطار کرو اور جب ملال حاصل ہو اور نفس کی شہوت کی آگ بجھ جائے اور شہوت ماند پڑ جائے تو افطار کرو۔ اور یہ مطلب بھی ہوسکتا ہے کہ جن دنوں کی فضیلت حاصل ہے ان میں روزہ رکھ لیا کرو تا کہ ثواب بھی زیادہ حاصل ہو جائے اور دوسرے دنوں میں افطار کرلیا کرو تا کہ بدن کو تقویت حاصل ہو جائے اس طرح کبھی روزہ اور کبھی افطار سے اخلاق حسینہ حاصل ہوں گے اور عادات اچھی ہوں گی۔

وقم و نم : یعنی تم رات کے اول حصہ اور آخر حصہ میں قیام کرلیا کرو اور درمیان میں سو جایا کرو:

" واسمع نصيحة الطبيب الحبيب من غير معرفة العلة فكيف وقد بينها بقوله " فان لجسدك عليك حقا "

طبیب حبیب کی نصیحت کو سن کر قبول کرنا چاہئے اگر وہ بیماری کا ذکر نہ بھی کرے لیکن نبی کریم ﷺ نے تو علتوں (اسباب) کا ذکر بھی فرمادیا ہے کہ تمہارے جسم کا تم پر حق ہے اس لئے تم کھاؤ اور پیو اور قیام کرو اور سو جایا کرو تا کہ تمہیں روزے رکھنے اور قیام کرنے کی ہمیشہ کے لئے مناسب طاقت رہے کیونکہ بہت زیادہ اپنے آپ پر بوجھ ڈال کر عبادات فریضہ سے بھی اپنے آپ کو عاجز نہ کرلو "والحاصل اعتدل فی الامور کلها" حاصل یہ ہے کہ تمام امور میں اعتدال سے کام لو۔

و ان لعينك عليك حقا : اور بیشک تمہاری آنکھ کا تم پر حق ہے۔ اس میں تاکید پائی گئی ہے اس لئے کہ پہلے ذکر ہو چکا ہے۔ آنکھ کا حق یہ ہے کہ دیکھنے کی ضرورت پر دیکھے یہ اسی وقت ہوگا جب انسان بیدار ہو اور آنکھ کھلی ہو لیکن آرام کے لئے آنکھ کا بند کرنا بھی اس کا حق ہے مطلب یہ ہے کہ

کبھی سو جایا کو اور کبھی جاگ کر عبادت کر لیا کرو۔

وان لزوجک علیک حقا : ''اور بیشک تمہاری زوجہ کا تم پر حق ہے''۔یعنی تمہاری زوجہ نے تم سے منافع حاصل کرنے ہیں اسلئے تم ہمیشہ تمام رات قیام نہ کرو اور نہ ہی ہر دن روزہ رکھو بلکہ کبھی لیٹ جاؤ تا کہ وہ تم سے نفع حاصل کر سکے اسی طرح ہر دن روزہ رکھ کر اپنی قوت شہوانیہ کو ضائع نہ کر دو۔

وان لزورک علیک حقا ، بفتح الزاء وسکون الواو ای لاصحابک الزائرین واحبانک القادمین''

اور بیشک تم پر تمہاری زیارت کرنیوالے احباب کا بھی حق ہے اور تمہارے پاس آنیوالے دوستوں کا بھی حق ہے۔مطلب واضح ہے کہ ہمیشہ تمام رات قیام کرنے اور ہر دن روزہ رکھنے سے تھکاوٹ حاصل ہوگی اور ضعف بدن حاصل ہوگا جس کی وجہ سے انسان کے دنیاوی مشاغل معطل ہو جائیں گے لوگوں سے ملنے کی وجہ سے کچھ ان سے علمی نفع حاصل کرنا اور کچھ انہیں علمی نفع پہنچانا اور نیک لوگوں کی زیارت کرنا اور نیک شخص کا دوسروں کو زیارت شرف بخشنا یہ سب کام رہ جائیں گے۔اسلئے مناسب مقدار میں قیام ہو اور روزے مناسب مقدار میں رکھے جائیں تا کہ یہ تمام کام معطل نہ ہوں۔

لا صام من صام الدھر : ''اس شخص کا روزہ نہیں جس نے ہمیشہ ہر دن روزہ رکھا''۔

مطلب اس کا یہ ہے کہ اگر اپنے آپ کو مشقت میں ڈال کر ہمیشہ روزہ رکھے جو دوسری ضروری عبادت کے کاموں میں خلل ڈالیں تو روزے میں وہ کامل ثواب حاصل نہ ہوا جو دینی علوم کی تعلیم دینے یا دینی علوم کے حاصل کرنے سے ثواب حاصل ہونا تھا۔پھر رب تعالیٰ نے جب انسان کو آسانی عطا فرمائی ہے تو انسان اپنے لئے مشکلات کیوں پیدا کرے ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ یرید اللہ بکم الیسر و لا یرید بکم العسر ﴾

''اللہ تعالیٰ تم پر آسانی کا ارادہ فرماتا اور تم پر تنگی کا ارادہ نہیں فرماتا''

اور نبی کریم ﷺ کا بھی ارشاد ہے '' و لا تشددوا فیشدد اللہ علیکم '' اور تم اپنے آپ پر سختی نہ کرو (ورنہ) اللہ تعالیٰ تم پر سختی فرمائے گا۔ہاں یہ خیال رہے کہ ہمیشہ روزہ رکھنے کی ممانعت کی وجوہ نبی کریم ﷺ نے جب بیان فرمادی ہیں تو اتنا واضح ہوا کہ ہمیشہ روزہ رکھنے میں کمال نہیں تاہم زوال بھی

نہیں یعنی مطلقا منع بھی نہیں نفی کمال ثواب کی ہے مطلق ثواب کی نفی نہیں۔

صوم ثلاثة ایام من کل شهر صوم الدهر کله صم کل شهر ثلاثة ایام :

''ہر مہینہ کے تین دن روزہ رکھنا ہر دن روزہ رکھنے کے برابر ہے تم ہر مہینے کے تین دن روزہ رکھ لیا کرو''۔

یعنی ایک نیکی دس نیکیوں کے برابر ہے تو ہر مہینہ میں تین دن روزہ رکھنا ثواب کے لحاظ پر اور حکماً تیس روزوں کے برابر ہوگا۔لہذا تم ہر مہینہ کے تین روزے رکھ لیا کرو تمہیں تمام مہینہ کا ثواب حاصل ہو جائے گا۔یہی عمل تم زندگی بھر جاری رکھو گے ''صائم الدهر'' (زمانہ بھر روزہ رکھنے والا) ہونے کا شرف حاصل ہو جائے گا۔اور قرآن پاک مہینہ میں ایک مرتبہ پڑھ لیا کرو۔

جب حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ نے کہا میں اس سے زیادہ کی طاقت رکھتا ہوں تو نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ تم حضرت داؤد علیہ السلام کی طرح روزے رکھ لیا کرو یعنی ایک دن روزہ رکھ لیا کرو اور ایک دن افطار کر لیا کرو کیونکہ حضرت داؤد علیہ السلام اسی طرح روزے رکھتے تھے یہی افضل ہیں کہ ان میں طاقت رہتی ہے۔اور قرآن پاک سات راتوں میں ایک مرتبہ پڑھ لیا کرو۔یہ بھی ہمیشہ ہر رات کو ختم کرنے کی ممانعت ہے کہ اس سے ضعف بدن نہ حاصل ہو جائے اور فرائض نہ چھوٹ جائیں۔

ولا تزد علی ذلک : کے کئی مطالب ہیں ایک احتمال یہ ہے **''ولا تزد علی المذکور من الصوم والختم''** کہ جو مقدار روزں اور ختم کی بیان کی گئی ہے اس سے زیادہ نہ کرو۔

دوسرا احتمال یہ ہے **''ولا تزد علی ذلک من السؤال''** جو تمہیں بتا دیا ہے اسی پر عمل کرو اور زیادہ سوال نہ کرو تیسرا احتمال یہ ہے **''ولا تزد علی ذلک دعوی زیادة الطاقة''** اور اس سے زیادہ اپنی طاقت کے زائد ہونے کا دعویٰ نہ کرو۔

جن دونوں میں روزہ رکھنا منع ہے : عید الفطر اور عید الاضحیٰ اور عید الاضحیٰ کے تین دن بعد جن کو ایام تشریق کہا جاتا ہے ان پانچ دنوں میں روزہ رکھنا منع ہے۔

☆ **''عن ابی سعید الخدری قال قال رسول الله ﷺ لا صوم فی یومین الفطر والاضحی''**

(بخاری ومسلم، مشکوة باب صیام التطوع)

حضرت ابو سعید الخدری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا دو دنوں میں روزہ نہیں

یعنی عید الفطر اور عید الاضحیٰ کے دن (روزہ نہ رکھا جائے)۔

☆ " وعن نبيشة (مصغر) الهذلی قال قال رسول الله ﷺ ايام التشريق ايام اكل وشرب وذكر الله " (رواه مسلم مشكوة باب صيام التطوع)

نبیشہ ہذلی کہتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ایام تشریق کھانے اور پینے اور اللہ کے ذکر کے دن ہیں۔

وضاحت حدیث: ایام تشریق عید الاضحیٰ کے بعد تین دن یعنی گیارہ اور بارہ اور تیرہ ذی الحج ہیں۔ ان دنوں کو ایام تشریق اس لئے کہتے ہیں کہ ان دنوں میں گوشت کو دھوپ پر رکھ کر خشک کیا جاتا تھا یہ بھی خیال رہے کہ عید کے دن بھی روزہ رکھنا منع ہے بلکہ وہ ممانعت میں اصل ہے اور ایام تشریق اس کے تابع ہیں۔ لیکن یوم النحر کا دوسری حدیث میں ذکر موجود ہے اس لئے اس کی ممانعت ثابت ہے۔

" قال ابن الملک اتفقوا علی حرمة صومها وانما حرم صوم يوم العيد وايام التشريق لان الناس اضياف الله فيها "

ابن الملک رحمہ اللہ علیہ نے فرمایا کہ اس مسئلہ میں اتفاق ہے کہ عید کے دن اور ایام تشریق میں روزہ رکھنا حرام ہے کیونکہ لوگ ان دنوں میں اللہ تعالیٰ کے مہمان ہوتے ہیں اللہ تعالیٰ کے مہمانی سے اعراض کرنا مومن کی شان نہیں۔

تنبیہ: نوروز اور مہر جان کو روزہ رکھنا مکروہ ہے کیونکہ ان دنوں کو کفار معظم سمجھتے تھے لیکن یہ اسی وقت مکروہ ہے جب مسلمان بھی کفار کی طرح ان دنوں کو معظم سمجھیں۔ اگر ایک شخص چاند کی کسی تاریخ میں روزہ رکھتا ہے وہ تاریخ نوروز یا مہر جان کو آئے تو اس شخص کے لئے روزہ رکھنا جائز ہے نوروز چیت کی نو تاریخ اور مہر جان اسوج کی نو تاریخ کو کہا جاتا ہے۔

مسئلہ: " ولو وقع الاحتلام فی حال الصيام لا يضر مع ان الانبياء عليهم الصلوة والسلام سالمون من الاحتلام لانه علامة تأتی الشيطان فی حال المنام " (مرقاة ج ص ٢٦١)

اگر روزے کی حالت میں احتلام ہو جائے تو روزے میں کوئی نقصان نہیں ہوتا۔ ہاں یہ خیال رہے کہ انبیاء کرام احتلام سے محفوظ ہوتے ہیں کیونکہ خواب کی صورت میں مجامعت اور انزال شیطان کی جانب سے پایا جاتا ہے اور انبیاء کرام شیطان کی دخل اندازی سے محفوظ ہوتے ہیں۔

البتہ یہ بھی خیال رہے کہ انبیاء کرام کو سوتے ہوئے انزال ہو جائے خواب میں کوئی مجامعت نہ پائی جائے تو یہ جائز ہے اور ممکن ہے۔ کیونکہ یہ بدن کے سیر ہونے کی وجہ سے ہوتا ہے یہ پیدائشی اور عادی امور کی وجہ سے ہوتا ہے اس میں شیطان کی دخل اندازی نہیں ہوتی اسی وجہ سے انبیاء کرام کے لئے یہ پایا جانا ممکن ہے۔ لیکن علامہ علی قاری رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ بھی احتمال ہے کہ ایسا پایا جا سکتا ہے اس کے پائے جانے کا کوئی یقین نہیں۔ " **وفیہ ان الاحتمال غیر مفید فی موضع الاستدلال** " جب کسی چیز میں فقط احتمال پایا جائے تو وہ استدلال کے لئے مفید نہیں۔ (حوالہ مذکور)

مسئلہ : روزہ کی حالت میں زوجہ کا بوسہ لینا جائز ہے جب کہ انزال نہ ہو اور فتنہ سے خالی ہو لیکن اجتناب بہتر ہے۔

☆ " **وعن عائشة قالت کان رسول الله ﷺ یقبل ویباشر وھو صائم وکان املککم لأربه** " (بخاری ومسلم مشکوۃ باب)

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں رسول اللہ ﷺ روزہ کی حالت میں بوسہ لے لیتے تھے اور (اپنی ازواج کے ساتھ لیٹ جاتے تھے جس کی وجہ سے) آپ کا جسم آپ کی ازواج کے جسم سے مس کرتا تھا اور آپ تم سے زیادہ اپنی حاجت پر مالک ہوتے تھے۔

وضاحت حدیث: روزہ کی حالت میں بوسہ لینے کے متعلق حکم یہ ہے:

" کرہ القبلة واللمس والمباشرة فی ظاھر الروایة ان خاف علی نفسه الجماع او الانزال "

روزہ کی حالت میں اپنی زوجہ کا بوسہ لینا اور ہاتھ وغیرہ سے چھونا اور (ننگے) جسم کا جسم سے ٹکرانا جائز تو ہے لیکن جب اپنے نفس پر خوف ہو کہ ان حالات میں جماع پر عمل ہو جائے گا یا انزال (شہوت سے منی کا خروج) ہو جائے گا تو ایسی صورت میں مکروہ ہے " **وقال محمد تکرہ القلبة مطلقا لانھا لا تخلو عن الفتنة** " حضرت امام محمد رحمہ اللہ نے احتیاطی طور پر اپنے اس قول سے فتوی دیا کہ روزہ کی حالت میں بوسہ مطلقاً مکروہ ہے کیونکہ یہ فتنہ سے خالی نہیں ہو سکتا ہے معاملہ جماع اور انزال سے پہلے نہ رکے۔

" وقال ابن عباس یکرہ للشاب ویرخص للشیب " حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما بھی اس مسئلہ میں احتیاط سے کام لیتے ہوئے یہ ارشاد فرماتے تھے کہ جوانوں کے لئے روزہ کی حالت میں اپنی زوجہ کا بوسہ لینا یا چھونا یا بغل وغیرہ میں لینا مکروہ ہے کیونکہ یہ صورتیں فتنہ سے خالی نہیں لیکن بوڑھوں کے لئے جائز ہے اس لئے کہ ان کی شہوت زائل ہو چکی ہوتی ہے۔

" فلا ینبغی ان یقاس به علیه الصلوة والسلام فی ذلک لقولها رضی الله عنها (وکان املکم لأ ربه) من ملک اذا قدر علی شئی او صار حاکما علیه "

نبی کریم ﷺ کے بوس و کنار پر اپنے آپ کو قیاس نہ کیا جائے کیونکہ آپ کا وصف حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے یوں بیان فرمایا کہ آپ ان حالات میں تم سے زیادہ اپنی حاجت پر مالک ہوتے تھے یعنی جماع پر قادر ہونے کے باوجود جماع سے دور رہنا آپ کا وصف خاص تھا اس لئے کہ آپ اپنی حاجات کے حاکم تھے آپ کی حاجات آپ کے تابع تھیں جب کہ دوسرے لوگ حاجات کے تابع ہوتے ہیں اور خواہشات سے مغلوب ہوتے ہیں لیکن آپ اپنی شہوات پر غالب رہتے تھے۔

(از مرقاة ج ۴ ص ۲۶۰)

مسئلہ : کوئی شخص جنبی ہو اس نے روزہ رکھنا ہے تو بہتر یہ ہے کہ پہلے غسل کر لے پھر کھانا کھائے اور روزہ رکھے۔ لیکن اگر وقت کم ہو تو وضوء کر کے کھانا کھائے، روزہ رکھ لے اور بعد میں غسل کر لے بلکہ صرف ہاتھ دھو کر کلی کر کے کھانا کھا لے تو پھر بھی جائز ہے۔

☆ " وعن عائشة قالت کان رسول الله ﷺ یدرکه الفجر فی رمضان وهو جنب من غیر حلم فیغتسل ویصوم " (بخاری ومسلم مشکوۃ کتاب الصوم)

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں رسول اللہ ﷺ رمضان میں حالت جنابت میں بغیر احتلام کے ہوتے تو فجر کو پا لیتے تو آپ غسل فرماتے اور روزہ رکھ لیتے۔

وضاحت حدیث: ایک مسئلہ تو اس حدیث کی شرح سے پہلے بیان کر دیا گیا ہے کہ انبیاء کرام احتلام سے محفوظ تھے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے ارشاد میں اسکی وضاحت کر دی گئی ہے " وهو جنب من غیر حلم " کہ آپ حالت جنابت میں ہوتے (جماع وغیرہ سے) لیکن احتلام کی حالت نہیں ہوتی تھی۔

دوسرا مسئلہ یہ واضح ہو گیا کہ آپ بعض اوقات حالت جنابت میں ہوتے صبح کو پا لیتے اس حدیث کے ظاہری الفاظ مبارکہ سے تو یہ سمجھ آ رہا ہے کہ اسی حالت میں صبح ہو جاتی اور آپ غسل بعد میں فرما لیتے اور روزہ رکھ لیتے اس میں دو احتمال ہیں کہ بغیر کھانے اور پینے کے صرف نیت سے ہی روزہ رکھ لیتے یا یہ مطلب ہے کہ آپ حالت جنابت میں وضو کر کے کھا لیتے اور روزہ رکھ لیتے پھر غسل فرما لیتے تھے۔

فیغتسل ویصوم :"ظاهر الحديث قول عامة العلماء من اصبح جنبا اغتسل واتم صومه"

اکثر اہل علم حضرات کا قول یہ ہے کہ ظاہر حدیث پاک سے یہی مطلب حاصل ہو رہا ہے کہ جو شخص جنابت کی حالت میں صبح کو پالے وہ غسل کر لے اور روزہ کو مکمل کر لے اس میں دو احتمال وہی ہیں جن کا ذکر ابھی نبی کریم ﷺ کے فعل کے ضمن میں کر دیا گیا ہے:

" وقال البيضاوى فى قوله تعالىٰ ﴿ فَالْآنَ بَاشِرُوْهُنَّ ﴾ فى تجويز المباشرة الى الصبح الدلالة على جواز تأخير الغسل اليه وصحة صوم المصبح جنبا "

قاضی بیضاوی رحمہ اللہ نے آیۃ کریمہ ﴿ فَالْآنَ بَاشِرُوْهُنَّ ﴾ کی تفسیر میں بیان فرمایا ہے کہ جب رات کو مجامعت کا جواز صبح صادق تک ہے یعنی ایک لمحہ پہلے تک تو اس سے واضح ہو گیا کہ غسل میں تاخیر جائز ہے اور جنابت کی حالت میں صبح کرنے والے کا روزہ صحیح ہے۔

لیکن یہ خیال رہے کہ جب جماع صبح سے ایک لمحہ پہلے تک کرے گا تو اس صورت میں یا جماع سے پہلے کھا اور پی لے یا پھر بغیر کھانے اور پینے کے صرف نیت سے روزہ رکھ لے کیونکہ اس صورت میں جماع کے بعد وضو کر کے کھانے اور پینے کا تو وقت ہی نہیں۔

اعتراض : بخاری رحمہ اللہ نے تو یہ بیان فرمایا ہے "من اصبح جنبا فلا صوم له" جس شخص نے جنابت کی حالت میں صبح کو پایا اس کا روزہ نہیں۔ ان دونوں احادیث میں بظاہر تعارض پایا جاتا ہے تو کس طرح دوسری حدیث پر اہل علم نے فتوی دیا ہے؟

جواب اول: " واجابوا عنه بانه منسوخ واستحسنه ابن المنذر "

اہل علم حضرات نے اس کا جواب یہ دیا ہے کہ جو حدیث بخاری نے بیان کی ہے کہ "جس شخص

نے حالت جنابت میں صبح کی اس کا روزہ نہیں'' وہ بخاری اور مسلم کی زیر بحث حدیث سے منسوخ ہے جس میں نبی کریم ﷺ کا حالت جنابت میں صبح کو پالینا اور غسل کرنا اور روزہ کو مکمل کرنے کا ذکر ہے یہی جواب ابن منذر رحمہ اللہ نے بھی مستحسن سمجھا ہے۔

جواب دوم: " او محمول علی من اصبح مجامعا واستدام الجماع "

بعض حضرات نے بخاری کی حدیث " من اصبح جنبا فلا صوم له '' کی تاویل یہ کی ہے کہ اس کا مطلب یہ بھی ہوسکتا ہے کہ جس شخص نے جماع ایسے وقت میں کیا کہ حالت جماع میں ہی صبح صادق ہوگئی تو اس کا روزہ نہیں۔ یہ بہت واضح ہے کہ کھانے، پینے اور جماع کرنے کی حد صبح صادق ہے صبح صادق سے لحہ بھر پہلے ختم کرنا ضروری ہے۔ (از مرقاۃ ج ۴ ص ۲۶۱)

بھول کر کھانے اور پینے اور جماع سے روزہ نہیں ٹوٹتا:

☆ " عن ابی هريرة قال قال رسول الله ﷺ من نسی وهو صائم فأكل او شرب فليتم صومه فانما اطعمه الله وسقاه " (بخاری، مسلم مشکوة كتاب الصوم)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جو شخص بھول گیا اور اس نے روزہ کی حالت میں کھا اور پی لیا تو وہ روزہ کو مکمل کرے بیشک اسے اللہ تعالیٰ نے کھلایا اور پلایا ہے۔

اسی حکم کو دوسری حدیث پاک سے بھی تائید حاصل ہے " رفع عن امتی الخطاء والنسيان وما استكرهوا عليه "میری امت سے خطا اور نسیان اور جبر اٹھالیا گیا ہے۔

یعنی ان حالتوں میں کوئی مواخذہ نہیں لیکن یہ خیال رہے کہ خطا کی حالت میں روزہ ٹوٹ جائے گا البتہ کفارہ لازم نہیں آئے گا۔ خطا یہ ہے کہ روزہ یاد ہو لیکن بے احتیاطی ہو جائے جیسا کہ کلی کرتے ہوئے بے اختیار پانی حلق میں چلا جائے اسی طرح کسی نے جبراً کھلا اور پلا دیا تو روزہ ٹوٹ جائے گا لیکن کفارہ لازم نہیں آئے گا۔ (از مرقاۃ بزیادۃ)

فائدہ : اگر کسی شخص نے بھول کر کھانا اور پینا شروع کر دیا اور وہ شخص روزہ رکھنے کی طاقت رکھتا ہے تو دوسرا شخص اسے یاد کرا دے کہ تمہارا روزہ ہے لیکن اگر وہ روزہ مشکل سے رکھے ہوئے تھا اور بھول گیا تو

ایسی حالت میں دوسرا شخص اسے یاد نہ دلائے کیونکہ اسے اللہ تعالیٰ کھلا اور پلا رہا ہے تو اسے کھانے پینے دیا جائے کہ اس کا روزہ بھی مکمل ہو جائے اور مشکل سے بھی بچ جائے۔ (از طحاوی)

عمداً (جان بوجھ کر) روزہ توڑنے سے قضاء اور کفارہ لازم آئے گا:

"عن ابی هريرة قال بينما نحن جلوس عند النبی ﷺ اذ جاءه رجل فقال يا رسول الله هلكت قال مالك قال وقعت علی امرأتی وانا صائم قال رسول الله ﷺ هل تجد رقبة تعتقها قال لا قال فهل تستطيع ان تصوم شهرين متتابعين قال لا قال هل تجد اطعام ستين مسكينا قال لا قال اجلس ومكث النبی ﷺ فبينا نحن علی ذلک اتی النبی ﷺ بعرق فيه تمر والعرق المكتل الضخم قال اين السائل قال انا قال خذ هذا فتصدق به فقال الرجل اعلی افقر منی يا رسول الله فو الله ما بين لا بتيها يريد الحرتين اهل بيت افقر من اهل بيتی فضحک النبی ﷺ حتی بدت انيابه ثم قال اطعمه اهلک"

(بخاری ومسلم، مشکوۃ کتاب الصوم)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں ہم ایک مرتبہ نبی کریم ﷺ کی خدمت میں بیٹھے ہوئے تھے ایک شخص آ گئے تو کہنے لگے یا رسول اللہ میں ہلاک ہو گیا حضور ﷺ نے پوچھا تمہیں کیا ہو گیا؟ وہ عرض کرنے لگے میں نے روزے کی حالت میں اپنی عورت سے جماع کر لیا رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کیا تم کوئی غلام پاتے ہو کہ وہ آزاد کر دو وہ عرض کرنے لگے نہیں (میں کسی غلام اور غلامہ کا مالک تو نہیں) آپ نے فرمایا کیا تم دو ماہ لگا تار روزے رکھ سکتے ہو؟ وہ کہنے لگے نہیں۔ آپ نے فرمایا کیا تم ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلا سکتے ہو؟ وہ کہنے لگے نہیں آپ نے فرمایا بیٹھ جاؤ اور کچھ دیر نبی کریم ﷺ ٹھہرے اور ہم بھی ایسی حالت میں رہے نبی کریم ﷺ کے پاس کھجوروں کا ایک بڑا ٹوکرہ لایا گیا آپ نے فرمایا وہ مسئلہ پوچھنے والا شخص کہاں ہے وہ کہنے لگے میں ہوں آپ نے فرمایا یہ (کھجوروں کا ٹوکرہ) لے لو اور اسے صدقہ کر دو۔ وہ شخص عرض کرنے لگے کیا میں اپنے سے زیادہ محتاج پر (صدقہ کروں) قسم ہے اللہ تعالیٰ کی مدینہ طیبہ کے اطراف میں کسی گھر والے بھی میرے گھر والوں سے زیادہ محتاج نہیں تو نبی کریم ﷺ

مسکرائے یہاں تک کہ آپ کی داڑھیں ظاہر ہوگئیں پھر آپ نے فرمایا اپنے اہل وعیال کو کھلا دو۔

وضاحت حدیث: واضح ہو گیا کہ جان بوجھ کر روزہ توڑنے پر قضاء اور کفارہ لازم ہے یہ بھی پتہ چل گیا کہ کفارہ کیا ہے۔

بخاری اور مسلم کی ایک حدیث میں ہے:

"عن ابی هريرة انه عليه الصلوة والسلام امر رجلا افطر فی رمضان ان يعتق رقبة او يصوم شهرين متتابعين او يطعم ستين مسكينا"

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے ایک شخص کو حکم دیا جس نے رمضان میں روزہ توڑ دیا تھا کہ وہ غلام آزاد کرے یا دو ماہ لگا تار روزے رکھے یا ساٹھ مسکینوں کو طعام کھلائے:

"وروی الدار قطنی عن ابی هريرة ان رجلا اكل فی رمضان فامره النبی ﷺ ان يعتق رقبة او يصوم شهرين متتابعين او يطعم ستين مسكينا"

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں بیشک ایک شخص نے رمضان میں کھا لیا تو نبی کریم ﷺ نے اسے غلام آزاد کرنے یا دو ماہ لگا تار روزے رکھنے یا ساٹھ مسکینوں کو طعام کھلانے کا حکم فرمایا

"المكتل (بكسر الميم) الضخم، بڑا تھیلا یا کھجور کے پتوں کا بنا ہوا بڑا ٹوکرہ۔

ما بين لا بيتها: کا مطلب "الحرتين" لیا گیا ہے مراد چھوٹے چھوٹے سیاہ پتھروں والے دو مقام شرقی اور غربی یعنی مدینہ طیبہ کے اطراف۔

نبی کریم ﷺ کا اختیار واضح طور پر ثابت ہوا کہ آپ نے خود ہی کھجوریں دیں وہ بھی تھوڑی مقدار میں تیس صاع بلکہ زیادہ صحیح یہ ہے کہ وہ پندرہ صاع تھیں پھر وہ بھی اس شخص کو اپنے گھر والوں کو کھلانے کی جازت دی۔ (از مرقاۃ)

راقم نے کئی احادیث کو دیکھ کر ایک اندازہ لگایا ہے کہ صحابہ کرام نے نبی کریم ﷺ کی رحمت کو دیکھ کر زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھانے کی کوشش کی جیسا کہ اس حدیث میں مسئلہ پوچھنے والے شخص نے فائدہ اٹھایا۔

روزہ کی حالت میں قے کا حکم:

(۱) قے خود بخود آئے خواہ تھوڑی مقدار میں آئے یا زیادہ اس سے روزہ نہ ہی ٹوٹتا ہے اور نہ ہی

مکروہ ہوتا ہے البتہ شرط یہ ہے کہ قے کو اس نے واپس نہ لوٹایا ہو یا پھر نگل نہ لیا ہو۔

(۲) اگر خود بخود واپس لوٹ جائے اس شخص نے قے کو خود نہیں لوٹایا تو پھر بھی روزہ نہیں ٹوٹتا خواہ وہ قے منہ بھر کر ہی کیوں نہ ہو۔

(۳) اگر قے کو خود جان بوجھ کر واپس لوٹایا تو روزہ بالاتفاق ٹوٹ جائے گا خواہ وہ قے تھوڑی تھی یا زیادہ یعنی ایک چنے کی مقدار کو بھی واپس لوٹانا روزہ کو توڑ دیتا ہے اگر چہ امام ابو یوسف رحمہ اللہ نے فرمایا کہ جان بوجھ کر قے کو لوٹانا اس وقت روزہ کو توڑے گا جب قے منہ بھر کر آئے پھر خواہ تھوڑی مقدار میں لوٹائے یا زیادہ مقدار میں لوٹائے۔ فتوی کے لحاظ پر مختار اس قول کو سمجھا گیا ہے اور تقوی کے لحاظ پر یہ قول مختار ہے کہ قے تھوڑی مقدار میں آئے یا زیادہ قے کو لوٹانے سے روزہ ٹوٹ جائے گا خواہ تھوڑی مقدار میں لوٹائے یا زیادہ مقدار میں۔

(۴) اگر کوئی شخص جان بوجھ کر زبردستی منہ میں انگلی وغیرہ ڈال کر قے کو لائے اور روزہ بھی یاد ہو تو منہ بھر کر قے کو لانے سے روزہ ٹوٹ جائے گا اور کم مقدار سے روزہ ٹوٹے گا تو نہیں البتہ اس میں کراہیت پائی جائے گی۔ (از درمختار و شامی)

☆ " عن ابی هريرة قال قال رسول الله ﷺ من ذرعه القی وهو صائم فليس عليه قضاء ومن استقاء عمدا فليقض " (رواہ الترمذی وابو داؤد وابن ماجه والدارمی، مشکوۃ کتاب الصوم)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس شخص کو روزے کی حالت میں خود بخود قے آ جائے اس پر روزہ کی قضا لازم نہیں اور جان بوجھ کر جس نے قے کو لایا وہ روزہ کی قضا کرے۔ وجہ اصل میں یہ ہے کہ خود بخود قے کا آنا غیر اختیاری ہے انسان کے فعل کا اس میں دخل نہیں اور انسان نے اس میں کوئی کوتاہی نہیں کی اسلئے روزہ نہ ٹوٹا اور جان بوجھ کر قے کو لانے میں کوتاہی اس کی جانب سے پائی گئی اس نے اپنے اختیار سے قے کو لوٹایا ہے اسلئے اس کا روزہ ٹوٹ گیا۔

ہاں البتہ یہ خیال رہے مندرجہ بالا صورتوں میں جن میں روزہ کے ٹوٹنے کا ذکر ہے ان میں صرف قضا لازم ہے کفارہ لازم نہیں۔

روزہ کی حالت میں خون نکلوانے کا حکم:

خون نکلوانے سے روزہ نہیں ٹوٹتا۔ ہاں البتہ بغیر کسی عذر شدید کے اتنی مقدار میں خون نکلوانا

مکروہ ہے جس سے کمزوری ہو جائے اور روزہ رکھنا دشوار ہو جائے۔

☆ " وعن ابن عباس قال ان النبی ﷺ احتجم وھو محرم واحتجم وھو صائم "

(بخاری ومسلم ، مشکوۃ کتاب الصوم)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں بیشک نبی کریم ﷺ نے حالت احرام میں خون نکلوایا اور روزہ کی حالت میں خون نکلوایا۔

وضاحت حدیث: حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی حدیث میں بھی ایک ہی واقعہ کا ذکر ہے کیونکہ حدیث ابی داؤد میں ہے "احتجم صائما محرما" اور ترمذی میں ہے " احتجم وھو محرم صائم " سب روایات کا ایک ہی مطلب ہے کہ نبی کریم ﷺ نے حالت احرام میں روزہ رکھا ہوا تھا اسی احرام اور روزہ کی حالت میں آپ نے خون نکلوایا۔ (از مرقاۃ ج ۴ ص ۲۶۱)

☆ " عن شداد بن اوس ان رسول اللہ ﷺ اتی رجلا بالبقیع وھو یحتجم وھو آخذ بیدی لثمانی عشرۃ خلت من رمضان فقال افطر الحاجم والمحجوم "

(رواہ ابو داؤد وابن ماجہ والدارمی مشکوۃ کتاب الصوم)

شداد بن اوس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رمضان کے اٹھارہ دن گزر چکے تھے (یعنی انیسویں روزہ کو) آپ نے میرے ہاتھ کو پکڑا ہوا تھا اسی حال میں آپ بقیع (مدینہ طیبہ کا قبرستان) میں تشریف لائے وہاں ایک شخص خون نکلوا رہا تھا تو آپ نے فرمایا خون نکالنے والے اور نکلوانے والے کا روزہ فاسد ہونے کے قریب ہو جاتا ہے۔

وضاحت حدیث: راقم نے جو ترجمہ کیا ہے اسے غور سے پڑھنے سے ہی واضح ہو جاتا ہے کہ یہ مراد نہیں کہ خون نکالنے والے اور نکلوانے والے کا روزہ ٹوٹ جاتا ہے بلکہ مراد یہ ہے کہ روزہ ٹوٹنے کے قریب ہو جاتا ہے۔ جیسا کہ کہا جاتا ہے " ھلک فلان " تو مطلب یہ لیا جاتا ہے کہ وہ ہلاکت کے قریب ہو گیا اس نے اپنے آپ کو ہلاکت پر پیش کر دیا اس حدیث کی وضاحت صاحب مصابیح محی السنۃ رحمہ اللہ نے ان الفاظ سے بیان فرما دی:

" تاولہ بعض من رخص فی الحجامۃ ای تعرضا للافطار المحجوم للضعف والحاجم لأنہ لا یامن من ان یصل شئی الی جوفہ الملازم "

کہ جن حضرات کا مسلک یہ ہے کہ روزہ کی حالت میں خون نکلوانے کی رخصت پائی گئی ہے (صحیح یہی ہے) ان حضرات نے فرمایا کہ حدیث پاک کا مطلب یہ ہے کہ خون نکلوانے والے کا روزہ اس لئے افطار کے قریب ہو جاتا ہے کہ اسے کمزوری لاحق ہو جائے گی وہ روزہ نہیں رکھ سکے گا تو گویا کہ اس نے خود اپنے آپ کو روزہ کے افطار کے قریب پہنچا دیا ہے اور خون نکالنے والے (چونکہ دوسرے کے جسم میں آلہ چبھو کر خون چوس کر نکالتے تھے) کا روزہ اس لئے ٹوٹنے کے قریب ہو جاتا ہے کہ اس کے آلہ سے اس کے خون کا پیٹ میں پہنچنے کا گمان ہوتا ہے:

" الملازم وهو بفتح الميم جمع الملزمة بكسر الميم قاروة الحجام التي يجمع فيها الدم وسميت لانها تلزم على المحل "

ملازم جمع ہے ملزمۃ کی جمع کی صورت میں میم پر فتحہ (زبر) ہے اور اس کے واحد میں میم کے نیچے کسرہ (زیر) ہے۔ اس سے مراد خون نکالنے والا آلہ ہے جس میں خون جمع ہو جاتا ہے (اور وہ آلہ محل کے ساتھ چمٹا رہنے کی وجہ سے ملازمہ کہلاتا ہے)

مختصر مسئلہ یہ ہے کہ روزہ کی حالت میں اتنی مقدار میں خون نکلوانا جس سے کمزوری نہ ہو جائز ہے لیکن زیادہ مقدار میں خون نکلوانا جس سے کمزوری ہو جائے مکروہ ہے۔

روزہ کی حالت میں ٹیکہ کا حکم:

بازو کے گوشت میں ٹیکہ لگوانا جائز ہے اس سے روزہ نہ ٹوٹے گا نہ ہی مکروہ ہوگا ہر وہ رگ جس کا تعلق معدہ یا دماغ سے ہو اس رگ میں ٹیکہ لگوانے سے روزہ ٹوٹ جائے گا۔ اگر کسی رگ کا تعلق براہ راست معدہ یا دماغ سے نہیں تو پھر بھی رگ میں ٹیکہ لگوانے سے اجتناب بہتر ہے۔ کسی ماہر سرجن سے پوچھ لیا جائے کہ کون سی رگ کا تعلق معدہ یا دماغ سے ہے ایسی رگوں میں روزہ کی حالت میں ٹیکہ لگوانا جائز نہیں ہوگا۔ فقہاء کرام نے ایک رگ ''جائفہ'' کا ذکر کیا ہے جس کا تعلق معدہ سے ہے اور ایک رگ ''آمۃ'' کا ذکر کیا ہے جس کا تعلق دماغ سے ان میں دوا ڈالنے سے روزہ کے ٹوٹ جانے کا حکم دیا ہے۔

فتاوی نوریہ میں اسی مسئلہ کو ایک استفتاء کے جواب میں شیخ کامل فقیہ العصر حضرت علامہ مولنا نور اللہ بصیر پوری رحمہ اللہ فرماتے ہیں۔

الاستفتاء : کیا فرماتے ہیں علماء دین ومفتیان شرع متین اس مسئلہ میں کہ روزہ دار شخص ٹیکہ چیچک یا بخاری یا ہیضہ وغیرہ کا بحالت روزہ کراسکتا ہے یا نہیں؟ ٹیکہ کرانے سے روزہ فاسد ہوگا یا نہیں؟ اگر ہوگا تو صرف قضاء لازم ہوگی یا قضاء وکفارہ ہر دو براھین قاطعہ ودلائل ساطعہ سے مسئلہ کو واضح فرمایا جائے "بینوا توجروا"۔

الجواب اللّٰھم اجعل لی النور والصواب :

(۱) اگر مریض ہے اور غروب شمس کا انتظار کرے تو ہلاک جان یا فساد عضو یا زیادتی مرض یا درازی مرض کی علامت صادقہ یا تجربہ صحیحہ یا طبیب وڈاکٹر مسلمان غیر ظاہر الفسق کی خبر سے گمان غالب ہو جائے۔ تو ٹیکہ کراسکتا ہے کہ یہ عذر افطار ہیں اور ایسے ہی اگر تندرست کو ظنِ غالب ہو جائے کہ فوری ٹیکہ نہ کرائے تو بیمار ہو جائے گا فتاوی عالمگیری وغیرہا اسفارِ مذہب مہذب میں مصرح ہے:

" والنظم من الھندیة ج ۱ ص ۱۰۶ المریض اذا خاف علی نفسه التلف او ذھاب عضو یفطر بالاجماع وان خاف زیادة العلة فلکذلک عندنا وعلیه القضا اذا افطر کذا فی المحیط "

اگر کوئی خطرہ نہ ہو اور عدم افطار بھی ثابت ہو جائے تو روا ورنہ نہیں۔ (یعنی مریض کو جب اپنی جان کی ہلاکت کا خطرہ ہو یا کسی عضو کے ضائع ہونے کا خطرہ ہو تو بالاتفاق اس کے لئے روزہ افطار کرنا جائز ہے اور اگر بیماری کے زیادہ ہونے کا خطرہ ہو تو پھر بھی یہی حکم ہے ہمارے نزدیک اور اس پر قضاء لازم ہوگی جب افطار کرے)۔

(۲) اگر بدن کے کسی منفذ ومسلک سے بذریعہ ٹیکہ جوف (پیٹ) یا دماغ میں دوائی پہنچ جاتی ہے تو روزہ فاسد ہو جاتا ہے اور اگر مسامات سے سرایت کرتی ہے تو نہیں اگرچہ ذائقہ یا اندورن جوف ودماغ میں اثر پایا جائے۔ البحر الرائق ج ۲ ص ۲۷۳ والھندیة ج ۱ ص ۱۰۴ ومراقی الفلاح شرح نور الایضاح وحاشیة الطحطاوی علی المراقی ص ۳۹۸ اور شامی، حاشیہ طحطاوی کے انہی صفحات میں ہے:

" والنظم للطحطاوی والداخل من المسام لاینا فیه ای الصوم بحروشامی میں ہے والنظم منھا

لوافطر شیأ من الدواء فی عینه لا یفسد صومه عندنا وان وجد طعمه فی حلقه واذا بزق فرأی اثر الکحل ولونه فی بزاقه عامة المشائخ علی انه لا یفسد صومه کذا فی الذخیرة وهو الاصح هکذا فی التبیین اور چونکه وصول من المنفذ اوالمسام (براہ راست پیٹ یا دماغ تک پہنچنے یا مساموں کے ذریعے پہنچنے) کا مسئلہ تشریح البدن (سرجنی) اور طب کا ہے۔لہذا اس کا حل ماہرین اطباء اور ڈاکٹروں کے حوالہ کیا جاتا ہے۔اور مبنی اختلاف علماء یہ ہے) علماء کے اختلاف کی وجہ اصل میں یہ ہے) کہ جس صاحب نے " وصول من المنفذ " (براہ راست دوا کے پیٹ اور دماغ تک پہنچنے کو) سمجھا مفسد فرمایا (کہ روزہ ٹوٹ جاتا ہے) اور جس نے "وصول من المسام " (مساموں کے ذریعے دوا کے پہنچنے کا) خیال کیا مفسد قرار نہ دیا (کہ اس کا روزہ نہیں ٹوٹا) (اس لیے اس مسئلہ کو ماہر سرجن کے حوالہ کر دیا جائے تفصیل شروع میں ذکر کر دی گئی)

اس کی نظیر فقہی ہمارے ائمہ کرام کا اختلاف " واصل الی المثانة " (مثانہ تک دوا کا پہنچنا) کے مفسد اور غیر مفسد ہونے میں ہے عند امامنا الاعظم (ہمارے امام اعظم رحمہ اللہ کے نزدیک) مفسد نہیں کہ جوف (پیٹ) اور مسامہ کے درمیان مسام ہیں اور منفذ نہیں اور امام ابو یوسف رحمہ اللہ کے نزدیک مفسد ہے کہ منفذ ہے۔وقول محمد مضطرب علیهم الرحمة (اور امام محمد رحمہ اللہ کا قول اس مسئلہ میں مضطرب ہے) فتح القدیر ج ۲ ص ۲۶۷ بحر الرائق ج ۲ ص ۲۷۹ مراقی الفلاح ص ۳۹۹ ، شامی ج ۲ ص ۱۳۷ میں ہے والنظم للشامی والاختلاف مبنی علی انه هل بین المثانة والجوف منفذ اولا (یہ اختلاف اصل میں اسی وجہ سے ہے کہ مثانہ اور پیٹ کے درمیان براہ راست تعلق ہے یا نہیں۔لیکن آج کل انسان کو چیر پھاڑ کر سرجن حضرات کو ایک ایک رگ وغیرہ کے متعلق معلوم ہوتا ہے کہ براہ راست تعلق ہے یا مساموں کے ذریعے)

کفایه ج ۲ ص ۲۶۷ ، بحر الرائق ج ۳ ص ۲۷۹ میں ہے والنظم من البحر قال فی الهدایة وهذا لیس من باب الفقه لانه متعلق بالطب حاشیه طحطاوی میں ہے قوله کذا تقوله الاطباء انما اسنده الیهم لان هذا المقام یرجع الیهم فیه لکونه من التشریح (یہ مسئلہ فقہ کا نہیں بلکہ علم طب کا ہے طبیب حضرات جو فیصلہ کریں ان کی طرف رجوع کیا جائے کیونکہ حقیقت میں اس مسئلہ کا تعلق اپریشن کے علم سے ہے لہذا اسے سرجن حضرات ہی جانتے

ہیں)۔اگر (سرجن حضرات کے کہنے پر) مفسد ہونا ثابت ہو جائے تو صرف قضاء لازم ہوگی۔

(فتاوی نوریہ ج ۲ ص ۸۷، ۸۸)

اس کے بعد فتاوی نوریہ میں تفصیلی طور پر اس مسئلہ پر بحث کی گئی ہے تاہم خلاصہ اس کا وہی ہے جو ذکر کر دیا گیا ہے۔ البتہ اس بحث سے اتنے الفاظ ذہن میں رہیں بعض حضرات کہتے ہیں کہ ٹیکہ سے دواء گوشت میں پہنچ کر خون سے مل کر جسم کے تمام حصوں میں پہنچ جاتی ہے تو لامحالہ معدہ میں بھی پہنچ جاتی ہے اور جس طرح معدہ کی ظاہری سطح پر رگیں ہوتی ہیں یونہی باطن میں بھی رگیں ہوتی ہیں تو ان رگوں کے ذریعے باطن میں بھی دواء پہنچ جاتی ہے اور وریدی (رگ کا) ٹیکہ میں تو یہ بات اور واضح ہے لہٰذا روزہ ٹوٹ جاتا ہے تو یہ کہنا بھی صحیح نہیں کیونکہ جب خون خود ہی معدہ کے اندر نہیں پہنچتا تو اس کے اندر ملی ہوئی دوا کیسے پہنچے گی؟ اور یہ کہنا کہ باطن میں رگیں ہیں مفید نہیں کیونکہ یہ رگیں معدہ میں نہیں بلکہ معدہ کی اندورنی سطح میں ہوتی ہیں اور معدہ میں کھلتی بھی نہیں کہ خون براہ راست معدہ میں گرے جیسے حوض میں نالی کے ذریعے پانی گرتا ہے بلکہ دواء کا اثر صرف مسامات کے ذریعے پہنچ سکتا ہے حالانکہ مسامات سے پہنچی ہوئی چیز کا مفسد نہ ہونا آفتاب و ماہتاب کی طرح واضح ہے۔ (فتاوی نوریہ ج ۲ ص ۱۰۱)

روزہ کی حالت میں آنکھ میں سرمہ لگانا یا دوا ڈالنے کا حکم:

روزہ کی حالت میں سرمہ لگانا جائز ہے اور سرمہ کی طرح خشک دوا لگانا جائز ہے لیکن تر دوا (ڈراپ وغیرہ) کا استعمال جائز نہیں۔

☆ "عن انس قال جاء رجل الی النبی ﷺ قال اشتکیت عینی انا اکتحل وانا صائم قال نعم" (رواہ الترمذی مشکوۃ کتاب الصوم)

حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں ایک شخص نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کرنے لگے کہ میری آنکھوں میں درد ہے کیا میں روزے کی حالت میں سرمہ لگا لیا کروں؟ آپ نے فرمایا ہاں (لگا لیا کرو)" **قال المظهر الاکتحال لیس بمکروہ للصائم** " مظہر رحمہ اللہ نے بیان فرمایا سرمہ لگانا روزہ دار کے لئے مکروہ نہیں۔

تنبیہ: آنکھ کا تعلق براہ راست معدہ یا دماغ سے ہے یا نہیں اگرچہ فقہاء کرام نے بیان کیا ہے:

" قال ابن الهمام ولو اکتحل لم یفطر سواء وجد طعمه فی حلقه اولا لان

الموجود فی حلقه اثر ہ داخلا من المسام و المفطر الداخل من المنافذ
کالمدخل و المخرج لا من المسام الذی ھو جمیع البدن للاتفاق "

(مرقاۃ ج ۴ ص ۲۶۹)

ابن ہمام رحمہ اللہ نے بیان فرمایا ہے کہ اگر کوئی روزہ دار سرمہ لگائے تو اس کا روزہ نہیں ٹوٹتا خواہ حلق میں ذائقہ پائے یا نہ پائے کیونکہ حلق میں جو اثر پایا گیا ہے وہ مساموں کے ذریعے داخل ہوا ہے براہ راست نہیں روزہ اس چیز سے ٹوٹتا ہے جو براہ راست پیٹ یا دماغ تک پہنچے مساموں کا تعلق کل بدن سے ہے براہ راست پیٹ اور دماغ سے نہیں اس لئے مساموں کے ذریعے سرمہ کا اثر حلق میں آجائے تو روزہ نہیں ٹوٹتا۔

لیکن آج کل ڈاکٹر سرجن حضرات کی تحقیق یہ ہے کہ آنکھ کا تعلق براہ راست حلق سے ہے اور حلق کا تعلق براہ راست معدہ سے ہے اس لئے اب دوسرے مسئلہ کو مدنظر رکھنا پڑے گا وہ یہ ہے کہ جائفہ پیٹ تک پہنچنے والے زخم یا رگ اور آمہ دماغ تک پہنچنے والے زخم یا رگ میں خشک دوا ڈالنے سے روزہ نہیں ٹوٹتا کیونکہ وہ منجمد ہو جاتی ہے صرف اسکے اثر یا ذائقہ سے روزہ نہیں ٹوٹتا لیکن تر دوا سے روزہ ٹوٹ جاتا ہے کیونکہ وہ براہ راست پیٹ یا دماغ تک پہنچ جاتی ہے اسی مسئلہ سے آنکھ کا مسئلہ سرجن حضرات کی تحقیق کے مطابق یوں بیان کیا جائے کہ سرمہ لگانا جائز ہے کیونکہ یہ خشک دوا ہے اور خصوصاً نبی کریم ﷺ کا روزہ کی حالت میں سرمہ لگانا اور سرمہ لگانے کی اجازت دینا واضح کررہا ہے کہ سرمہ لگانا جائز ہے لیکن تر دوا براہ راست حلق میں آجاتی ہے اس لئے اگر کوئی شخص بہت احتیاط سے کام لے کہ بار بار دوا کے اثر کو تھوکتا رہے معدہ میں نہ جانے دے تو روزہ ٹوٹے گا نہیں البتہ مکروہ ہوگا کیونکہ کسی چیز کا روزہ دار کو بغیر عذر کے چکھنا مکروہ ہے لیکن اگر احتیاط سے کام نہ لے آنکھ میں ڈالی ہوئی دوا براہ راست حلق میں آگئی اور معدہ میں پہنچ گئی تو روزہ ٹوٹ جائے گا۔

اعتراض : جس حدیث سے سرمہ لگانا جائز ثابت کیا گیا ہے اس کے متعلق تو ترمذی نے یہ تحریر کیا ہے " لیس اسنادہ بالقوی و ابو عاتکۃ الراوی یضعف " اس حدیث کے راویوں میں ابوعاتکہ راوی پائے گئے جن کو ضعیف قرار دیا گیا ہے لہذا اس حدیث کی سند قوی نہ رہی۔ جب حدیث کا

ضعیف ہونا ثابت ہو گیا تو اس سے حکم جواز کیسے ثابت ہے جب کہ اصول حدیث میں واضح طور پر قانون موجود ہے کہ ضعیف احادیث سے احکام ثابت نہیں ہو سکتے۔

جواب: ضعیف حدیث جب متعدد طرف سے ثابت ہو جائے تو وہ حسن لغیرہ بن جاتی ہے اس سے احکام ثابت ہو سکتے ہیں۔" **واخرج الترمذی عن عائشة قالت اکتحل النبی ﷺ وهو صائم**" حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں نبی کریم ﷺ نے روزہ کی حالت میں سرمہ لگایا ہے۔ "**واخرجه البیهقی مرفوعا بسند ضعیف**" بیہقی نے سند ضعیف سے یہی حدیث جو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت کی گئی ہے مرفوع طور پر ذکر کی ہے " **واخرجه ابو داؤد موقوفا علی انس**" اور ابو داؤد نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے موقوف حدیث بیان کی ہے:

"**فهذه عدة طرق وان لم یحتج بواحد منها فالمجموع یحتج به لتعدد الطرق**"

یہ حدیث (سرمہ لگانے والی) متعدد طرق سے ثابت ہے اگر چہ ایک ایک حدیث سے علیحدہ علیحدہ طور پر حجت نہیں پکڑی جا سکتی لیکن متعدد طرق کے مجموع کو دلیل بنایا جا سکتا ہے۔

اعتراض:

ابو داؤد کی ایک حدیث میں تو روزہ دار کے لئے سرمہ لگانے کی ممانعت ہے تو جواز کس طرح ثابت ہوگا:

"**ما فی ابی داؤد انه علیه الصلوة والسلام امر بالاثمد عند النوم وقال لیتقه الصائم**"

بیشک نبی کریم ﷺ نے سوتے وقت سرمہ لگانے کا حکم دیا اور فرمایا کہ روزہ دار سرمہ لگانے سے بچ جائے۔

جواب: یہ حدیث ضعیف ہے اس کو دوسری ضعیف احادیث کی تائید بھی خاص نہیں کہ حسن لغیرہ بن جائے۔ لیکن سرمہ لگانے والی احادیث ضعیف ہونے کے باوجود متعدد طرق سے ثابت ہیں وہ اس درجہ میں ہیں کہ حسن لغیرہ ان کو کہا جا سکتا ہے اور ان سے احکام ثابت کرنے کے لئے استدلال درست ہے۔

"**انه علیه الصلوة والسلام کان یکتحل بالاثمد وهو صائم**" (بیهقی، حاکم)

بیشک نبی کریم ﷺ روزہ کی حالت میں سرمہ لگاتے تھے:

"**وعن ابن عمر رضی الله عنهما قال خرج علینا رسول الله ﷺ**

وعيناه مملؤ تان من الكحل وذلك في رمضان"

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ رمضان شریف میں ایک مرتبہ تشریف لائے تو آپ کی آنکھیں سرمہ سے پر تھیں۔ یہ دونوں حدیثیں بھی ضعیف الاسناد ہونے کے باوجود سرمہ لگانے والی دوسری احادیث کی تائید کرتی ہیں۔ (ازمرقاۃ)

کان اور ناک میں روزہ دار کا دوا ڈالنا:

ناک کا تعلق براہ راست دماغ اور معدہ سے ہے اس لئے ناک میں دوا ڈالنا منع ہے کیونکہ اگر دوا دماغ یا پیٹ تک پہنچ گئی تو روزہ ٹوٹ جائے گا۔ اگر چہ کان میں پردہ ہے براہ راست دماغ اور پیٹ سے تعلق تو نہیں لیکن فقہاء کرام نے کان میں دوا ڈالنے سے منع کیا ہے لہذا کان میں دوا ڈالنے سے اجتناب کیا جائے۔

گرمی اور پیاس کی وجہ سے روزہ دار کا سر پر پانی ڈالنا:

" وعن بعض اصحابه النبي ﷺ قال قد رأيت النبي ﷺ بالعرج يصب على رأسه الماء وهو صائم من العطش او من الحر "

(رواہ مالک وابو داؤد، مشکوۃ کتاب الصوم)

نبی کریم ﷺ کے ایک صحابی فرماتے ہیں کہ تحقیق میں نے دیکھا نبی کریم ﷺ کو مقام عرج میں پیاس یا گرمی کی وجہ سے روزہ دار ہونے کے باوجود اپنے سر پر آپ پانی ڈال رہے ہیں۔

وضاحت حدیث : اگر چہ حدیث پاک کی سند میں راوی صحابی کا نام نہیں ذکر کیا لیکن ابن حجر عسقلانی رحمہ اللہ مواہب اللدنیہ میں فرماتے ہیں " الجهالة بالصحابی لاتضر ای لان الصحابة كلهم عدول " صحابی کا نام نہیں ذکر کیا اور صرف یہ کہہ دینا کہ یہ حدیث ایک صحابی سے مروی ہے کافی ہے کیونکہ صحابی کے مجہول ہونے سے کوئی فرق نہیں پڑھتا اس لئے کہ تمام صحابہ کرام عادل ہیں ان کی روایات معتبر ہیں۔

حدیث پاک سے یہ واضح ہوا کہ گرمی کی شدت سے بچنے کے لئے غسل کرنا سر پر پانی ڈالنا اور کپڑا اتر کر کے سر پر رکھنا جائز ہے۔

اعتراض : نبی کریم ﷺ نے جب روزہ کی حالت میں گرمی اور پیاس سے بچنے کے لئے اپنے سر پر پانی ڈالا تو امام اعظم رحمہ اللہ اسے مکروہ کیوں کہتے ہیں؟

جواب : " وھو علیہ الصلوۃ والسلام فعل ذلک لبیان الجواز من اظھار العجز للرحمة علی ضعفاء الامة "

نبی کریم ﷺ نے یہ فعل جواز ثابت کرنے کے لئے کیا ہے کہ جب میری امت کے لوگ روزہ کی تکمیل سے عاجز ہو جائیں تو اس پر عمل کر لیں آپ کا یہ فعل درحقیقت امت پر رحمت کے لئے تھا۔ یہ بھی خیال رہے کہ بعض کام خلاف اولیٰ ہوتے ہیں یعنی ان پر عمل کرنا بہتر نہیں ہوتا لیکن ان کا جواز ثابت کرنے کے لئے نبی کریم ﷺ پر واجب ہوتا ہے کہ آپ اس پر عمل کریں۔ آپ جب اس پر عمل کریں گے اس کا ثواب وجوب والا حاصل ہوگا اور وہی کام امت کے لئے جائز ہونے کے باوجود بہتر نہیں ہوگا اسی وجہ سے امام اعظم ابو حنیفہ رحمہ اللہ نے فرمایا کہ روزہ کی حالت میں عبادت سے ضجر اور تنگی محسوس کرتے ہوئے سر پر پانی بہانا اور تر کپڑا لپیٹنا خلافِ اولیٰ ہے لیکن انسان جب اپنے آپ کو عاجز سمجھتے ہوئے یہی کام کرے تو امام اعظم رحمہ اللہ بھی اسے خلافِ اولیٰ نہیں کہتے۔ (از مرقاۃ ج ۴ ص ۲۶۹)

فوائد : " عن ام ھانی قالت لما کان یوم الفتح فتح مکة جاء ت فاطمة فجلست علی یسار رسول اللہ ﷺ وام ھانی عن یمینه فجاء ت الولیدة باناء فیه شراب فناولته فشرب منه ثم ناوله ام ھانی فشربت منه فقالت یا رسول اللہ لقد افطرت وکنت صائمة فقال لھا اکنت تقضین شیئا قالت لا قال فلا یضرک ان کان تطوعا رواہ ابو داؤد والترمذی والدارمی وفی روایة لاحمد والترمذی .نحوہ وفیه فقالت یا رسول اللہ اما ان کنت صائمة فقال الصائم المتطوع امیر نفسه ان شاء صام وان شاء افطر " (مشکوۃ کتاب الصوم)

حضرت ام ہانی رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں فتح مکہ کے دن میں نبی کریم ﷺ کی دائیں جانب بیٹھی ہوئی تھی اور حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا آئیں اور آپ کی دوسری جانب بیٹھ گئیں اتنے میں ایک لڑکی پانی کا پیالہ لائی تو نبی کریم ﷺ نے اس سے کچھ پیا پھر ام ہانی رضی اللہ عنہا کو دیا انہوں نے اس سے پیا پھر عرض کیا یا رسول اللہ میں نے افطار کر لیا حالانکہ میں روزہ دار تھی تو آپ نے فرمایا کیا تم کوئی چیز قضاء کر رہی تھی انہوں نے کہا نہیں آپ نے فرمایا اگر یہ روزہ نفلی تھا تو تمہارا اس میں کوئی نقصان نہیں ہوا۔ ترمذی

کی روایت میں یہ بھی ہے کہ انہوں نے عرض کیا یارسول اللہ میں تو روزہ دار تھی تو آپ نے فرمایا نفلی روزہ رکھنے والا اپنے نفس کا امیر ہوتا ہے چاہے تو روزہ رکھے اور چاہے تو افطار کرلے۔

وضاحت حدیث: حضرت ام ہانی رضی اللہ عنہا ابوطالب کی بیٹی ہیں اور رسول اللہ ﷺ کی چچازاد بہن اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کی بہن ہیں۔

حضرت فاطمۃ الزہرا رضی اللہ عنہا نے نبی کریم ﷺ کی بائیں جانب بیٹھنا کیوں پسند کیا؟ اسکی کئی وجوہ ہیں:

(۱) نبی کریم ﷺ نے خود ارشاد فرمایا ہو کہ ادھر بیٹھ جاؤ۔

(۲) انہوں نے خود خیال کیا ہو کہ نبی کریم ﷺ کا دل تو بائیں جانب ہے لہذا اسی جانب بیٹھنے کو ترجیح دی کہ دل کی توجہ ادھر ہی زیادہ ہوگی۔

(۳) ممکن ہے کہ آپ بائیں طور بطور عجز بیٹھ گئی ہو کہ ام ہانی میرے خاوند کی بہن ہیں اور میرے بچوں کی پھوپھی ہیں اور میرے والد محترم کے چچا کی بیٹی ہیں اور یہ بھی ممکن کہ وہ آپ سے بڑی ہوں تو ان کے بڑے ہونے کا بھی لحاظ کیا ہو۔

(۴) اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ حضور ﷺ کی دائیں جانب جگہ نہ ہو تو بائیں جانب بیٹھ گئی ہوں۔

"فجاءت الولیدۃ باناء فیہ شراب" اس مقام میں "شراب" کا معنی "پانی" لیا گیا ہے کیونکہ مطلق "شراب" جب عربی زبان میں استعمال ہو تو اس سے مراد پانی ہوتا ہے۔ نبی کریم ﷺ نے پہلے مشروب حضرت ام ہانی رضی اللہ عنہا کو دیا کیونکہ وہ دائیں جانب تھیں نبی کریم ﷺ دائیں جانب سے ہی ابتداء کو پسند فرماتے تھے۔ حضرت ام ہانی رضی اللہ عنہا نے پانی پینے کے بعد نبی کریم ﷺ کی خدمت میں عرض کیا کہ میں روزہ دار تھی میں نے روزہ افطار کرلیا پہلے کیوں نہیں بتایا۔ اس کی دو وجہ ہیں۔

(۱) " قال ابن حجر وانما لم تذکر ھذا قبل تناولھا ایثارا لما آثرھا بہ من التقدیم علی بنتہ سیدۃ النساء وذلک عندھا اشرف واعلی من الصوم "

ابن حجر رحمہ اللہ نے فرمایا کہ حضرت ام ہانی رضی اللہ عنہا نے پانی پینے سے پہلے نہیں بتایا کیونکہ جب رسول اللہ ﷺ نے اپنی بیٹی سیدۃ النساء حضرت فاطمۃ الزہراء رضی اللہ عنہا سے پہلے ان کو مشروب دیا تو انہوں نے روزہ سے اعلیٰ اور اشرف پانی سمجھا اسی لئے پہلے جلدی سے پی لیا پھر بتایا۔

(۲) " او قصدها فانها لم تذکر خوفا عن فوت سؤرہ علیه الصلوۃ والسلام "

یا انہوں نے ارادہ تو کیا ہو کہ پہلے بتا دیں لیکن پھر اس ڈر سے نہ بتایا ہو کہ نبی کریم ﷺ کے بقیہ پانی (جوٹھے) سے کہیں محروم نہ ہو جاؤں " اکنت تقضین شیأ " کا مطلب یہ ہے کہ کیا تمہارے ذمہ کوئی روزے واجب تھے کہ ان کی قضاء کا یہ روزہ رکھ رہی تھی؟ انہوں نے کہا نہیں یہ روزہ قضاء کا تو نہیں تھا۔ تو حضور ﷺ نے فرمایا اگر نفلی روزہ تھا تو تمہیں کوئی ضرر لاحق نہیں ہوا یعنی کوئی گناہ نہیں ہوا۔ نفلی روزہ بغیر عذر کے نہیں توڑنا چاہئے اور عذر کی وجہ سے توڑا جا سکتا ہے۔ اگر عذر یا بغیر عذر کے نفلی روزہ توڑ دے تو اس کی قضاء لازم ہوگی کفارہ لازم نہیں آئے گا۔ (از مرقاۃ)

☆ " وعن الزهری عن عروۃ عن عائشة قالت کنت انا وحفصة صائمتین فعرض لنا طعام اشتهیناہ فاکلنا منه فقالت حفصة یا رسول الله انا کنا صائمتین فعرض لنا طعام اشتهیناہ فاکلنا منه قال اقضیا یوما آخر مکانه " (رواہ الترمذی، مشکوۃ کتاب الصوم)

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ میں اور حفصہ روزہ دار تھیں ہمیں طعام دیا گیا (ہمیں سخت بھوک کی وجہ سے) خواہش غالب ہوئی تو ہم نے طعام کھا لیا۔ تو حضرت حفصہ نے عرض کیا یا رسول اللہ ہم دونوں روزہ دار تھیں۔ ہمیں طعام دیا گیا ہم پر (بھوک کی وجہ سے) خواہش غالب ہوئی تو ہم نے اس طعام سے کھا لیا۔ حضور ﷺ نے فرمایا اس کی جگہ ایک دن روزہ قضاء کر لینا۔

اس حدیث سے بھی واضح ہوا کہ عذر کی وجہ سے نفلی روزہ توڑا جا سکتا ہے لیکن قضاء کرنا لازم ہے۔

روزہ دار کا افطار والوں کے پاس صابر رہنا باعث اجر و ثواب ہے:

☆ " وعن ام عمارۃ بنت کعب ان النبی ﷺ دخل علیها فدعت له بطعام فقال لها کلی فقالت انی صائمة فقال النبی ﷺ ان لصائم اذا اکل عندہ صلت علیه الملائکة حتی یفرغوا " (رواہ احمد والترمذی وابن ماجه والدارمی مشکوۃ کتاب الصوم)

ام عمارہ بنت کعب کہتی ہیں بیشک نبی کریم ﷺ ہمارے گھر تشریف لائے تو انہوں نے آپ کیلئے طعام طلب کیا تو آپ نے ان کو کہا تم بھی کھاؤ تو انہوں نے کہا میں روزہ دار ہوں تو نبی کریم ﷺ نے فرمایا بیشک روزہ دار کے پاس جب کھایا جائے تو اس کے لئے فرشتے رحمت بھیجتے ہیں یہاں تک کہ وہ (کھانے والے کھانے سے) فارغ ہو جائیں۔

حدیث شریف کا مطلب واضح ہے کہ باقی لوگ روزہ افطار کرنے والے ہوں ان کے کھانے کے دوران روزہ دار صبر سے بیٹھا رہے تو فرشتے اس کے لئے رحمت کی دعا کرتے رہتے ہیں یہاں تک کہ کھانے والے لوگ کھانے سے فارغ ہو جائیں۔

☆ "عن بريدة قال دخل بلال على رسول الله ﷺ وهو يتغدى فقال رسول الله ﷺ الغداء يا بلال قال انى صائم يا رسول الله فقال رسول الله ﷺ نأكل رزقنا وفضل رزق بلال فى الجنة اشعرت يا بلال ان الصائم يسبح عظامه ويستغفر له الملائكة ما اكل عنده"

(رواه البيهقى فى شعب الايمان ، مشكوة كتاب الصوم)

حضرت بریدہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں حضرت بلال رضی اللہ عنہ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے رسول اللہ ﷺ صبح کا کھانا کھا رہے تھے تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اے بلال صبح کا کھانا حاضر ہے حضرت بلال نے کہا یا رسول اللہ میں روزہ دار ہوں، تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہم اپنا رزق کھا رہے ہیں اور بلال کا جنت میں فاضل رزق ہے اے بلال کیا تمہیں معلوم ہے بیشک روزہ دار کی ہڈیاں تسبیح پڑھتی ہیں اور فرشتے اس کے لئے استغفار کرتے ہیں جب تک اس کے پاس کھایا جائے۔

وضاحت حدیث: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا" نأكل رزقنا " ہم اپنا رزق کھاتے ہیں" اى رزق الله تعالى الذى اعطانا الآن " یعنی اللہ تعالیٰ نے ہمیں جو رزق اب عطا کیا ہے وہ ہم کھا رہے ہیں " وفضل رزق بلال " یعنی بلال کو ہمارے کھانے سے اعلیٰ اور فضیلت والا کھانا جنت میں حاصل ہوگا اسے روزے کی جزاء حاصل ہوگی کیونکہ روزے نے ابھی اسکو کھانے سے روک رکھا ہے:

" ما اكل عنده " اى ما دام يؤكل عند الصائم جزاء على صبره حال جوعه "

یعنی جب تک روزہ دار کے پاس دوسرے لوگ کھانا کھاتے رہیں وہ بھوک پر صابر رہے تو اسے یہ جزاء حاصل ہوتی ہے کہ اس کی ہڈیاں اللہ تعالیٰ کی تسبیح پڑھتی ہیں جس کا ثواب اس شخص کو حاصل ہوتا ہے اور فرشتے اس کے لئے استغفار کرتے ہیں۔ (از مرقاۃ)

سبحان اللہ روزہ دار کا کیا عظیم مقام ہے کہ وہ ہستیاں اس کے لئے بخشش طلب کرتی ہیں جن کی دعا کی قبولیت یقینی ہوتی ہے۔

وَاِذَا سَاَلَکَ عِبَادِیْ عَنِّیْ فَاِنِّیْ قَرِیْبٌ اُجِیْبُ دَعْوَۃَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ فَلْیَسْتَجِیْبُوْا لِیْ وَلْیُؤْمِنُوْا بِیْ لَعَلَّھُمْ یَرْشُدُوْنَ

۱) ''اور اے محبوب جب تم سے میرے بندے مجھے پوچھیں تو میں نزدیک ہوں دعا قبول کرتا ہوں پکارنے والے کی جب مجھے پکارے تو انہیں چاہئے میرا حکم مانیں اور مجھ پر ایمان لائیں کہ کہیں راہ پائیں''

۲) ''اور جب سوال کریں آپ سے (اے میرے حبیب) میرے بندے میرے متعلق تو بیشک میں قریب ہوں قبول کرتا ہوں دعا، دعا کرنے والے کی جب دعا مانگے مجھ سے تو چاہئے کہ وہ مجھ سے قبولیت طلب کریں اور مجھ پر ایمان لائیں تا کہ وہ ہدایت پا جائیں''۔

شان نزول : چند واقعات کے درپیش آنے کے بعد اس آیۃ کریمہ کا نزول ہوا گویا کہ تمام وجوہ اجتماعی طور پر وجہ نزول ہیں۔

☆ '' اخرج ابن جریر والبغوی فی معجمہ وابن ابی حاتم وابو الشیخ وابن مردویہ من طریق الصلت بن حکیم عن رجل من الانصار عن ابیہ عن جدہ قال جاء رجل الی رسول اللہ ﷺ فقال یا رسول اللہ اقریب ربنا فنناجیہ ام بعید فننادیہ فسکت النبی ﷺ فانزل اللہ ﴿ وَاِذَا سَاَلَکَ عِبَادِیْ عَنِّیْ فَاِنِّیْ قَرِیْبٌ ......الخ) (درمنثور)

ایک شخص نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے عرض کرنے لگے یا رسول اللہ کیا ہمارا رب مقرب ہے کہ ہم اس سے آہستہ دعا کریں یا دور ہے کہ ہم پکار پکار کر دعا کریں؟ تو نبی کریم ﷺ (وحی کی انتظار میں) خاموش رہے تو اللہ تعالیٰ نے اس آیۃ کریمہ کو نازل فرمایا:

☆ " واخرج عبد الرزاق وابن جریر عن الحسن قال سأل اصحابہ النبی ﷺ این ربنا فانزل اللہ ﴿ وَاِذَا سَاَلَکَ عِبَادِیْ عَنِّیْ فَاِنِّیْ قَرِیْبٌ الایۃ ﴾ (درمنثور)

حضرت حسن بصری فرماتے ہیں نبی کریم ﷺ کے صحابہ کرام نے پوچھا ہمارا رب کہاں ہے تو اللہ تعالیٰ نے اس آیۃ کریمہ کو نازل فرمایا۔

☆ " وروی الکلمی عن ابی صالح عن ابن عباس قال قالت الیهود کیف یسمع ربنا دعاء نا وانت تزعم ان بیننا وبین السماء خمسمائة عام فغلظ کل سماء مثل ذلک فنزلت هذه الایة " (قرطبی)

یہود نے کہا ہمارا رب کس طرح ہماری دعاؤں کو سنتا ہے جو تم یہ گمان کرتے ہو کہ ایک آسمان اور دوسرے آسمان کے درمیان پانچ سو سال کی راہ ہے اور ہر آسمان کی موٹائی پانچ سو سال کی راہ ہے تو یہ آیۃ کریمہ نازل ہوئی۔

☆ " اخرج عبد بن حمید وابن المنذر عن عبد اللہ بن عبید قال لما نزلت هذه الآیة ﴿ اُدْعُوْنِیْٓ اَسْتَجِبْ لَکُمْ ﴾ قالوا کیف لنا به ان نلقاه حتی ندعوه فانزل الله ﴿ وَاِذَا سَاَلَکَ عِبَادِیْ عَنِّیْ فَاِنِّیْ قَرِیْبٌ ﴾ الآیة ، فقالوا صدق ربنا وهو بکل مکان " (درمنثور)

عبداللہ بن عبید کہتے ہیں جب یہ آیۃ کریمہ نازل ہوئی ﴿اُدْعُوْنِیْٓ اَسْتَجِبْ لَکُمْ ﴾ مجھ سے دعا کرو میں تمہاری دعا کو قبول کروں گا۔ تو صحابہ کرام نے عرض کیا ہم کس طرح اللہ تعالیٰ کی ملاقات کر سکتے ہیں کہ ہم اس سے دعا کریں تو اللہ تعالیٰ نے اس آیۃ کریمہ کو نازل کیا، تو صحابہ کرام نے کہا ہمارے رب تعالیٰ نے سچ فرمایا ہے کہ وہ ہر جگہ پر موجود ہے۔

☆ " واخرج وکیع وعبد بن حمید وابن جریر وابن المنذر وابن حاتم عن عطاء بن ابی رباح انه بلغه لما انزلت ﴿ وَقَالَ رَبُّکُمُ ادْعُوْنِیْٓ اَسْتَجِبْ لَکُمْ ﴾ قالوا لو نعلم ای ساعة ندعو فنزلت ﴿ وَاِذَا سَاَلَکَ عِبَادِیْ عَنِّیْ فَاِنِّیْ قَرِیْبٌ ﴾ الی قوله ﴿ یَرْشُدُوْنَ ﴾ "

عطاء بن ابی رباح کہتے ہیں کہ انہیں یہ خبر ملی ہے کہ جب رب تعالیٰ نے اس آیۃ کریمہ کو نازل فرمایا ﴿ وَقَالَ رَبُّکُمُ ادْعُوْنِیْٓ اَسْتَجِبْ لَکُمْ ﴾ (اور تمہارے رب نے کہا مجھ سے دعا کرو میں تمہاری دعا کو قبول کروں گا) تو صحابہ کرام نے عرض کیا کاش کہ ہمیں یہ معلوم ہو جائے کہ ہم کس گھڑی میں دعا کریں تو یہ آیۃ کریمہ نازل ہوئی۔

وَاِذَا سَاَلَکَ عِبَادِیْ عَنِّیْ : اور جب سوال کریں آپ سے (اے میرے حبیب) میرے بندے میرے متعلق ضمیر منصوب متصل (ک) نبی کریم ﷺ کی طرف راجع ہے اسی لئے اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ نے ترجمہ میں "اے محبوب" ذکر فرمایا اور حضرت پیر محمد کرم شاہ رحمہ اللہ نے ذکر فرمایا "اے

میرے حبیب'' راقم نے بھی ترجمہ ضیاء القرآن سے لیا ہے اس لئے'' اے میرے حبیب'' ہی ذکر کیا ہے۔

ماقبل سے ربط :

اللہ تعالیٰ نے پہلے روزے کی فرضیت کا ذکر فرمایا اور روزے کے احکام ذکر فرمائے پھر ارشاد فرمایا:

﴿ وَلِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰى مَا هَدٰىكُمْ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ﴾

''اور اللہ تعالیٰ کے بڑائی بیان کرو جو اس نے تمہیں ہدایت دی ہے اور تا کہ تم شکر گزار بن جاؤ''۔

جب بندے کو بڑائی بیان کرنے اور شکر کرنے کا حکم دیا ہے تو اس آیۃ کریمہ میں گویا کہ:

" بین انه سبحانه بلطفه ورحمته قريب من العبد مطلع على ذكره وشكره فيسمع نداء ه ويجيب دعاء ه ولا نجيب رجاء ه "

بیان فرمایا کہ بیشک اللہ تعالیٰ اپنے لطف اور اپنی رحمت کے لحاظ پر بندے کے قریب ہے اور جو اسے یاد کرے اور جو اس کا شکریہ ادا کرے وہ اس پر مطلع ہوتا ہے بندے کی نداء کو سنتا ہے اور اس کی دعا کو قبول فرماتا ہے اور اس کی امید سے اسے رسوا نہیں کرتا۔ اور وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے پہلے تکبیر کا حکم دیا پھر دعا میں رغبت دلائی " تنبيها على ان الدعاء لا بدوان يكون مسبوقا بالثناء الجميل "اس پر متنبہ کرتے ہوئے کہ بیشک دعا کے لئے ضروری ہے کہ پہلے اللہ تعالیٰ کی تعریف کرے پھر دعا کرے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے پہلے اللہ تعالیٰ کی ثناء کی پھر دعا کی، ثناء ان الفاظ مبارکہ سے کی:

﴿ اَلَّذِیْ خَلَقَنِیْ فَهُوَ یَهْدِیْنِ ☆ وَالَّذِیْ هُوَ یُطْعِمُنِیْ وَیَسْقِیْنِ ☆ وَاِذَا مَرِضْتُ فَهُوَ یَشْفِیْنِ ☆ وَالَّذِیْ یُمِیْتُنِیْ ثُمَّ یُحْیِیْنِ ☆ وَالَّذِیْٓ اَطْمَعُ اَنْ یَّغْفِرَلِیْ خَطِیْٓئَتِیْ یَوْمَ الدِّیْنِ ﴾

وہ جس نے مجھے پیدا کیا تو وہ مجھے راہ دے گا اور وہ جو مجھے کھلاتا اور پلاتا ہے اور جب میں بیمار ہوں تو وہی مجھے شفا دیتا ہے اور وہی مجھے وفات دے گا پھر مجھے زندہ کرے گا اور وہ جس کی مجھے آس لگی ہے کہ میری خطائیں قیامت کے دن بخشے گا۔ اللہ تعالیٰ کی اتنے الفاظ مبارکہ سے ثناء کرنے کے بعد ان الفاظ مبارکہ سے دعا کی:

﴿ رَبِّ هَبْ لِیْ حُكْمًا وَّاَلْحِقْنِیْ بِالصّٰلِحِیْنَ ☆ وَاجْعَلْ لِّیْ لِسَانَ صِدْقٍ فِی الْاٰخِرِیْنَ ☆ وَاجْعَلْنِیْ مِنْ وَّرَثَةِ جَنَّةِ النَّعِیْمِ ﴾

''اے میرے رب مجھے حکم عطا کر اور مجھے ان سے ملا دے جو تیرے قرب خاص کے سزاوار ہیں اور میری سچی ناموری رکھ پچھلوں میں اور مجھے ان میں سے کر جو چین کے باغوں کے وارث ہیں۔

(الشعراء ۷۸ تا ۸۵)

فَاِنِّیْ قَرِیْبٌ: ''تو بیشک میں قریب ہوں'' یعنی اے میرے حبیب جب آپ سے میرے بندے میرے متعلق سوال کریں تو آپ ان کو بتا دیں کہ بیشک میں قریب ہوں۔

تنبیہ: شان نزول میں جب مختلف وجوہ ذکر کردی گئیں تو ان سے ہی واضح ہو گیا کہ رب تعالیٰ کے متعلق سوال کرنے والوں کے مختلف انداز تھے۔ بعض نے سوال کیا اللہ تعالیٰ کی ذات کے متعلق کہ وہ کیسی ذات ہے، کیا اسے کسی چیز سے تشبیہ دی جاسکتی ہے یا نہیں کیا وہ کسی مکان کے لحاظ پر قریب ہے یا بعید ہے کیا اس کی ذات قریب ہے یا بعید۔ بعض کا سوال اس کی صفات کے متعلق تھا کہ کیا اللہ تعالیٰ ہماری دعا کو سنتا ہے؟ ہم دعا کریں تو کیا واقعی یہ سمجھ لیں کہ اس رب تعالیٰ سے دعا کر رہے جو سمیع ہے؟ اسی طرح صفات کے متعلق سوال کرنے والوں کا یہ مطلب بھی تھا کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے دعاء کرنے کی کس طرح اجازت ہے کیا اس کی طرف سے دعا کرنے کی اجازت بھی ہے یا نہیں۔ کیا ہم اس کے تمام اسماء سے اسے پکار کر دعا کر سکتے ہیں یا بعض معین اسماء کو ہی دعا میں شامل کر سکتے ہیں۔ کیا ہم اللہ تعالیٰ سے ہر قسم کی دعا کر سکتے ہیں یا خاص قسم کی دعا کر سکتے ہیں۔

تو رب تعالیٰ نے اس آیۃ کریمہ کو نازل فرما کر اور نبی کریم ﷺ نے وضاحت فرما کر تمام سوالوں کا جواب دے دیا۔ اللہ تعالیٰ جسم سے پاک ہے اپنی رحمت کے لحاظ پر قریب اس کے تمام نام ہی پاکیزہ ہیں جس نام سے چاہو اسے پکار لو۔ جب چاہو اس سے دعا کرو کوئی وقت معین نہیں۔ جو چاہو اس سے مانگو البتہ حرام چیزیں اس سے نہ مانگو۔ اجمالی طور پر جن چیزوں کو ابھی ذکر کیا ہے ان کو تفصیلی طور پر ان شاء اللہ ساتھ ہی ذکر کیا جا رہا ہے۔

اللہ تعالیٰ کے قریب ہونے کا کیا مطلب؟

" فهنا قرب معنوى لا حسى فليس الله مادة ولا جسما ولا عرضا وانما هو مقدس عن المادة يتعالى عن النور " (جو اهر طنطاوى)

یہاں قرب سے مراد قرب معنوی ہے، حسی نہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ نہ مادہ ہے اور نہ ہی جسم ہے اور نہ

ہی عرض ہے وہ مادہ سے مقدس ہے وہ نور سے بلند ذات ہے لہذا یہ بیان کرنا ممکن ہی نہیں کہ یہ کہا جائے کہ وہ ذات فلاں مادہ سے بنی ہوئی ہے:

" اعلم انه ليس المراد من هذا القرب بالجهة والمكان بل المراد منه القرب بالعلم والحفظ "

اس مقام میں قرب سے مراد یہ نہیں کہ اس کی جہت کا ذکر ہو یا اس کے مکان کا ذکر ہو کہ وہ فلاں جہت یا فلاں مکان میں قریب ہے بلکہ مراد یہ ہے کہ وہ علم اور حفاظت اور رحمت اور دعا کی قبولیت کے لحاظ پر قریب ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ کا قرب مکانی ثابت کیا جائے تو اسکی طرف اشارہ کرنا بھی ممکن ہوگا اور جس چیز کی طرف اشارہ ہو سکے وہ منقسم بھی ہو سکتا ہے یہ تمام چیزیں حدوث پر دلالت کرتی ہیں جب کہ اللہ تعالیٰ حدوث سے پاک ہے۔ اس لئے اللہ تعالیٰ کا قرب اس طرح ثابت کیا جائے جو اس کی شان کے لائق ہے یعنی جب وہ سوال کریں " اين ربنا " ہمارا رب کہاں ہے تو ان کو جواب دو " فانی قریب " بیشک میں مکان اور جسم سے پاک ہوں ہر جگہ پر موجود ہونے کے لحاظ پر قریب ہوں اگر وہ سوال کریں " هل يسمع ربنا دعاء نا " کیا ہمارا رب ہماری دعا سنتا ہے؟ تو ان کو جواب دیا جائے:

﴿ فَاِنِّیْ قَرِیْبٌ ﴾ فان القريب من المتكلم يسمع كلامه "

کہ بیشک میں قریب ہوں جو متکلم کے قریب ہوتا ہے وہ اس کے کلام کو بھی سنتا ہے اور اگر وہ سوال کریں کہ ہم دعا بلند آواز سے کریں یا آہستہ " صح ان يجيب بقوله ﴿ فَاِنِّیْ قَرِیْبٌ ﴾ تو صحیح یہ ہے کہ ان کو میرے قول سے ہی جواب دیا جائے ﴿ فَاِنِّیْ قَرِیْبٌ ﴾ بیشک میں قریب ہوں۔

" وان سالوه انه هل يعطينا مطلوبنا بالدعاء ؟ صلح هذا الجواب "

اگر وہ سوال کریں کہ کیا اللہ تعالیٰ دعا سے ہمیں مطلوب عطا کرے گا یا نہیں تو یہی جواب دو کہ میں قریب ہوں دعا کرنے والے کی دعا کو قبول کرتا ہوں۔ اگر وہ سوال کریں کہ اگر ہم گناہ کر کے توبہ کر لیں تو کیا وہ ہماری توبہ قبول فرماتا ہے تو اس کا جواب بھی یہی دیا جائے:

" فانی قریب ای فانا القريب بالنظر لهم والتجاوز عنهم وقبول التوبة منهم "

بیشک میں قریب ہوں یعنی میں ان کی طرف نظر رحمت فرمانے کے لحاظ پر اور ان سے تجاوز کرنے پر اور ان کی توبہ قبول کرنے کے لحاظ پر قریب ہوں۔ (از کبیر)

اُجِیبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ : دعا کرنے والا جب مجھ سے دعا کرتا ہے تو میں اس کی دعا قبول کرتا ہوں'' " الداع " ناقص واوی ہے واو یاء سے بدل جاتی ہے " الداعی " بن جاتا ہے اور "دعان" بھی اصل میں " دعانی " ہے یاء متکلم ضمیر متصل مفعول ہے:

" قرأ ابو عمرو وقالون عن نافع ﴿ الداعی اذا دعانی ﴾ باثبات الیاء فیهما فی الوصل و الباقون بحذ فها فالاولی علی الوصل و الثانیة علی التخفیف "

ابو عمرو اور قالون نے نافع کی قراءت کے مطابق دونوں مقاموں میں یاء کو ثابت رکھ کر پڑھا ہے ﴿ الداعی اذا دعانی ﴾ اور باقی حضرات نے یاء کو حذف کیا ہے، یاء کو باقی رکھ کر پڑھنا بہتر ہے اگرچہ حذف میں تخفیف ہے۔

اعتراض : آیۃ کریمہ سے یہ ثابت ہو رہا ہے کہ ہر شخص کی دعا قبول ہوتی ہے حالانکہ کتنے لوگ دعا کرتے ہیں ان کی دعا قبول نہیں ہوتی تو اس آیۃ کریمہ کا کیا مطلب ہے؟

پہلا جواب: دعاء کی قبولیت کے تین طریقے ہیں ان میں سے کسی ایک طریقہ پر دعا قبول ہو جاتی ہے بندہ سمجھتا ہے شائد دعاء قبول نہیں ہوئی حالانکہ دعا قبول ہو چکی ہوتی ہے وہ تین طریقے یہ ہیں یا تو دعا دنیا میں ہی قبول ہو جائے یعنی جس چیز کا مطالبہ کر رہا ہے وہ چیز حاصل ہو جائے یا وہ دعا اس کی خطاؤں اور لغزشوں کا کفارہ بن جائے یا اس دعا کو آخرت کے لئے ذخیرہ بنا دیا جائے کہ اسے آخرت میں اس دعا کا نفع حاصل ہو جائے۔

اسی قول پر حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ کی ایک روایت شاہد ہے وہ فرماتے ہیں:

" قال رسول الله ﷺ ما من مسلم یدعو بدعوة لیس فیها اثم ولا قطیعة رحم الا اعطاه الله بها احدی ثلاث اما ان یعجل له دعوته و اما ان یدخرله و اما ان یکف عنه من السوء بمثلها قالوا اذن نکثر قال الله اکثر "

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کوئی مسلمان ایسا نہیں جو دعا کرے اس کی دعا گناہ پر مبنی نہ ہو اور اس کی دعا میں قطع رحم کا مطالبہ نہ ہو تو سوائے اس کے کہ اللہ تعالیٰ اسے اس دعا کے ذریعے تین چیزوں میں ایک چیز عطا کرتا ہے۔ یا اس کی دعا کو جلدی قبول کر لیتا ہے یا اس کی دعا کو ذخیرہ بنا لیا جاتا ہے یا اس کی دعا کی مثل اسے گناہوں سے روک دیا جاتا ہے۔ صحابہ کرام نے کہا (یا رسول اللہ) اب تو ہم زیادہ دعا کریں

گے آپ نے فرمایا اللہ تعالیٰ بھی تمہیں زیادہ عطا کرے گا۔

☆ یہ حدیث ابوعمر بن عبدالبر نے تخریج کی اور اسے ابومحمد عبدالحق نے صحیح کہا ہے اور یہ مؤطاً میں بھی منقطع السند (سند کے انقطاع سے) موجود ہے اور ابوعمر نے کہا ہے یہ حدیث اللہ تعالیٰ کے ارشاد گرامی ﴿اُدْعُوْنِیْٓ اَسْتَجِبْ لَكُمْ﴾ کی تفسیر میں مسند طور پر بھی مذکور۔ اس حدیث سے یہ واضح ہو گیا کہ ہر دعا قبول ہوتی ہے:

☆ "وقال ابن عباس كل عبد دعا استجيب له فان كان الذى يدعو به رزقاله فى الدنيا اعطيه وان لم يكن رزقا له فى الدنيا ذخرله"

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں ہر شخص کی دعا قبول کی جاتی ہے اگر وہ شخص جو دعا کر رہا ہے اس کا حصہ دنیا میں ہے تو دنیا میں ہی وہ چیز اسے عطا کر دی جاتی ہے اور اگر اس کا حصہ دنیا میں نہیں تو وہ اس کے لئے (آخرت میں) ذخیرہ بنا دی جاتی ہے۔

☆ "عن ابن عمر النبى ﷺ من فتح له فى الدعاء فتحت له ابواب الجنة"

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں نبی کریم ﷺ نے فرمایا جس شخص کے لئے دعا کا دروازہ کھول دیا گیا اس کے لئے جنت کے دروازے کھول دیئے گئے۔

☆ "واوحى الله تعالى الى داؤد ان قل للظلمة من عبادى لا يدعونى فانى اوجبت على نفسى ان اجيب من دعانى وانى اذا اجبت الظلمة لعنتهم"

اور اللہ تعالیٰ نے حضرت داؤد علیہ السلام کی طرف وحی کی کہ میرے ظالم بندوں کو کہو کہ مجھ سے دعا نہ کریں کیونکہ میں نے اپنے کرم سے اپنے نفس پر واجب کر دیا ہے کہ میں دعاؤں کو قبول کروں گا بیشک جب ظالموں کی دعا میں قبول کروں گا تو ان پر لعنت کروں گا۔

یہاں یہ بھی خیال رہے کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ ظالم اپنے ظلم پر رہتے ہوئے مجھ سے کسی چیز کا مطالبہ نہ کریں ورنہ ان کی دعا کو ضرور قبول کیا جائے گا لیکن ان پر اس کے بدلے لعنت بھیجی جائے گی۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ ظالم ظلم کو چھوڑ کر مجھ سے گناہوں کی معافی طلب نہ کریں اللہ تعالیٰ خوش ہوتا ہے کہ اس سے گناہوں کی معافی طلب کی جائے۔

دوسرا جواب: اللہ تعالیٰ دعا کو قبول کرتا ہے لیکن شرط یہ ہے کہ اس میں کوئی مانع موجود نہ ہو اگر کوئی مانع موجود ہو تو پھر دعا کی قبولیت اللہ تعالیٰ کی مشیت پر موقوف ہے رب تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

﴿ فَيَكْشِفُ مَا تَدْعُوْنَ اِلَيْهِ اِنْ شَاءَ ﴾

''اگر اللہ چاہے تو تمہاری دعا کو قبول کر کے تمہارے ضرر دور کردے''

☆ ''عن ابی هريرة قال قال رسول الله ﷺ لا يزال يستجاب للعبد ما لم يدع باثم او قطيعة مالم يستعجل قيل يا رسول الله ما الاستعجال قال يقول قد دعوت وقد دعوت فلم ار يستجيب لی فيستحسر عند ذلک ويدع الدعاء'' (رواہ مسلم)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا بندے کی دعا ہمیشہ قبول کی جاتی ہے جب تک وہ گناہ کی حصول کی دعا نہ کرے اور قطع رحم کی دعا نہ کرے اور جلدی نہ کرے صحابہ کرام نے عرض کیا یا رسول اللہ جلدی کرنے کا کیا مطلب ہے؟ آپ نے فرمایا ایک شخص دعا کرے تو یہ کہے کہ میری دعا تو قبول نہیں ہو رہی وہ اس دعا سے ملال میں پڑ جائے، تھک جائے اور دعا کرنی ہی چھوڑ دے

اسی طرح ایک روایت بخاری، مسلم اور ابو داؤد نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے بیان کی:

''ان رسول الله ﷺ قال يستجاب لاحدكم ما لم يعجل يقول دعوت فلم يستجب لی''

بیشک رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تم میں سے ہر ایک کی دعاء کو قبول کیا جاتا ہے جب تک کہ وہ جلدی نہ کرے یعنی یہ کہے کہ میں نے دعا کی وہ قبول نہیں کی گئی (اس کا یہ کہنا دعا کی قبولیت سے مانع ہے)

واضح ہوا کہ گناہوں کے حصول کی دعا اور قطع رحم کی دعا اور دعا سے ملال میں پڑ کر دعا کو چھوڑ دینا یہ سب ذرائع ہیں دعا کے قبول نہ ہونے کے۔ اور دعا کے نہ قبول ہونے کا سبب حرام مال کا کھانا بھی ہے رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی اس کی وضاحت کر رہا ہے:

''قال ﷺ الرجل يطيل السفر اشعث اغبر يمديديه الی السماء يا رب يا رب ومطعمه حرام ومشربه حرام وملبسه حرام وغذی بالحرام فانی يستجاب لذلک''

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ایک شخص لمبا سفر کرتا ہے بال اسے کے بکھرے ہوئے اور غبار آلود

ہوتے ہیں وہ اپنے ہاتھوں کو آسمان کی طرف پھیلاتا ہے اور کہتا ہے اے میرے رب اے میرے رب اس کی دعا کب قبول ہوگی جب کہ اس کا کھانا حرام ہے اور پینا حرام ہے اور اس کا لباس حرام ہے اور اسے حرام غذا حاصل ہو رہی ہے۔

☆ " وقيل لا براهيم بن ادهم ما بالنا ندعو فلا يستجاب لنا ؟ قال لانكم عرفتم الله فلم تطيعوه وعرفتم الرسول فلم تتبعوا سنته وعرفتم القرآن فلم تعملوا به واكلتم نعم الله فلم تؤدوا شكرها وعرفتم الجنة فلم تطلبوها وعرفتم النار فلم تهربوا منها وعرفتم الشيطان فلم تحاربوه ووافقتموه وعرفتم الموت فلم تستعدوا له ودفنتم الاموات فلم تعتبروا وتركتم عيوبكم واشتغلتم بعيوب الناس "

حضرت ابراہیم بن ادہم رحمہ اللہ سے پوچھا گیا ہمارا کیا حال ہے ہم دعا کرتے ہیں ہماری دعا قبول نہیں کی جاتی ؟ آپ نے فرمایا وجہ یہ ہے کہ تم اللہ تعالیٰ کو پہچانتے ہو لیکن اس کی اطاعت نہیں کرتے اور تم رسول اللہ ﷺ کو پہچانتے ہو لیکن تم ان کی سنت کی تابعداری نہیں کرتے اور تم قرآن کو پہچانتے ہو لیکن اس پر عمل نہیں کرتے ہو اور تم اللہ تعالیٰ کی نعمتیں کھاتے ہو لیکن تم ان نعمتوں کا شکر ادا نہیں کرتے اور تم جنت کو پہچانتے ہو لیکن اسے طلب نہیں کرتے (یعنی ایسے عمل نہیں کرتے جس سے جنت حاصل ہو جائے) اور تم آگ کو پہچانتے ہو لیکن اس سے بھاگتے نہیں (یعنی ان اعمال سے بچنے کی کوشش نہیں کرتے جو جہنم سے بچانے والے ہیں) اور تم شیطان کو پہچانتے ہو لیکن اس سے لڑائی نہیں کرتے (یعنی اس کی مخالفت نہیں کرتے) بلکہ اس کی موافقت کرتے ہو (اس کے کہنے پر چلتے ہو) اور تم موت کو پہچانتے ہو لیکن اس کے لئے تیاری نہیں کرتے اور تم فوت شدہ حضرات کو دفن تو کرتے ہو لیکن خود ان سے تم عبرت حاصل نہیں کرتے اور تم اپنے عیوب کی پرواہ نہیں کرتے ہو لیکن لوگوں کے عیبوں کو تلاش کرنے میں مشغول رہتے ہو۔ (از قرطبی تغیر)

دعا کرنے والے کے لئے شرائط: دعا کرنے والے کے لئے یہ علم حاصل ہونا ضروری ہے " لا قادر علی حاجته الا الله " کہ اس کی حاجت کو حقیقی طور پر پورا کرنے والا صرف اللہ تعالیٰ ہی ہے اور اس کے علم میں ہونا یہ بھی ضروری ہے " وان الوسائط فی قبضته ومسخرة بتسخيره " کہ تمام اسباب اللہ تعالیٰ کے قبضہ قدرت میں ہیں اور اللہ تعالیٰ جن کو چاہے وہ اسباب ان کے تابع کر دے

یعنی مجازی طور پر بعض اسباب سے جن چیزوں کو حصول ہوتا ہے ان کے متعلق بھی معلوم ہونا چاہئے کہ یہ سب اللہ تعالیٰ کے قبضہ قدرت میں ہیں۔اور یہ ہے کہ دعا کرنے والا سچی نیت اور حضور قلب سے دعا کرے کیونکہ " فان اللہ لا یستجیب دعاء من قلب غافل لاہ " بیشک اللہ تعالیٰ اس شخص کی دعا قبول نہیں فرماتا جو غافل دل اور لہولعب میں مشغول دل سے دعا کرے۔اور دعا کرنے والے کیلئے ضروری ہے کہ " وان یکون مجتنبا لأکل الحرام "حرام چیزوں کے استعمال سے اجتناب کرے یہاں یہ بھی خیال رہے کہ " اکل الحرام " کا بامحاورہ ترجمہ حرام اشیاء کا استعمال ہے۔اور دعا کرنیوالے کیلئے یہ ضروری ہے " وان لا یمل من الدعاء " کہ دعا کرنے سے ملال میں نہ پڑے ایسا نہ ہو کہ یہ کہے میری دعا تو قبول نہیں ہوتی لہذا میں دعا کو ہی چھوڑ دیتا ہوں۔ (ازقرطبی)

مطلوب چیز کے لئے شرط: جس چیز کو دعا میں طلب کر رہا ہے وہ شرعاً جائز ہو اس پر عمل کرنا جائز ہو کیونکہ نبی کریم ﷺ نے دعا کی قبولیت کو اس سے مشروط کیا ہے " ما لم یدع باثم او قطیعة رحم" کہ ہر دعا کرنے والے کی دعا قبول ہوتی ہے جب کہ وہ دعا گناہ کی اور قطع رحم کی نہ کرے " فیدخل فی الاثم کل ما یاثم به من الذنوب " نبی کریم ﷺ کا ارشاد گرامی مطلق ہے اس لئے ہر قسم کے گناہوں کی دعا کرنا منع ہے کسی انسان کو ناحق نقصان پہنچانے کی دعا، چوری، ڈاکہ، غضب، جیب تراشی قتل وغارت، حصول رشوت اور حصول مظالم وغیرھا کی دعا حرام ہے۔

" ویدخل فی الرحم جمیع حقوق المسلمین ومظالمهم " نبی کریم ﷺ نے جو ارشاد فرمایا کہ قطع رحم کی دعا نہ کی جائے اس میں مسلمانوں کے تمام حقوق داخل ہیں کہ مسلمانوں کے حقوق کو پائمال کرنے کی دعا نہ کرے اور اس میں تمام مظالم داخل ہیں کہ لوگوں پر ظلم کرنے کی دسترس کی دعا نہ کرے۔ (ازقرطبی)

شروط دعاء سات ہیں:

(۱) عاجزی سے دعا کرے۔ (۲) دعا کرنے والے کے دل میں خوف ہو۔

(۳) دعا کرنے والا دعا کی قبولیت کی امید کرے۔

(۴) دعا ہمیشہ کرتا ہی رہے، دعا سے دل ہٹائے نہیں۔

(۵) دعا کرنے والا خشوع سے دعا کرے۔

(۶) دعا کرنے والا عام لوگوں کے لئے دعا کرے صرف اپنے لئے دعا نہ کرے جب دعا میں عموم پایا جائے گا تو اور لوگوں کے لئے بھی اس میں بھلائی ہوگی اور ممکن ہے کہ کسی اور کے حق میں دعا کی قبولیت اس کے حق میں بھی قبولیت کا سبب بن جائے۔

(۷) اور دعا کرنے والا حلال چیزوں کا استعمال کرے۔ (از قرطبی)

دعاء کے آداب: دعا کے بہت سے آداب ہیں جن میں سے ہم کچھ عرض کرتے ہیں:

(۱) دعا کے وقت چاہئے کہ ہتھیلیاں آسمان کی طرف پھیلی ہوں دونوں ہاتھوں میں کچھ فاصلہ ہو نہ بہت نیچے ہوں اور نہ بہت اونچے بلکہ کندھے کے مقابل رہیں اور دعا کے بعد ان کو منہ پر پھیر لیا جائے۔ (مشکوٰۃ)

(۲) ضروری ہے کہ دعا کرنے والے کا رزق حلال ہو صوفیاء کرام فرماتے ہیں کہ دعا آسمان کے دروازہ کی کنجی ہے اور غذا حلال اس کنجی کے دانتے۔ (روح البیان)

(۳) دعا کے وقت دل حاضر ہو۔

(۴) دعا کے وقت قبول کی قوی امید ہونا ناامیدوں کی دعا قبول نہیں ہوتی۔

(۵) طریقہ دعا یہ ہے کہ اولاً حمد الٰہی کرے پھر حضور ﷺ پر درود بھیجے پھر اپنے گناہوں کو یاد کر کے توبہ کرے اور پھر عرض حاجات کرے پھر درود شریف پر ختم کرے دعا کے وقت اپنے مقصد کو دھیان میں رکھے کیونکہ خیال کا بڑا اثر پڑتا ہے۔ (روح البیان)

(۶) بہتر ہے کہ صرف اپنے لئے دعا نہ کرے بلکہ اور مسلمانوں کے لئے بھی دعا کرے مگر ابتدا اپنے سے کرے۔ (نعیمی)

فائدہ: حضرت ابن عطار رحمہ اللہ فرماتے ہیں بیشک دعا کے لئے کچھ ارکان ہیں اور کچھ پر ہیں اور کچھ اسباب ہیں اور کچھ اوقات ہیں:

" فان وافق ارکانہ قوی وان وافق اجنحتہ طار فی السماء وان وافق مواقیتہ فازوان وافق اسبابہ انجح "

جب دعا کے ارکان پائے جائیں گے تو دعا کو قوت حاصل ہوگی اور اگر دعا کے پر پائے گئے تو دعا کو آسمانوں تک اڑان حاصل ہوگی اور اگر دعا اوقات قبولیت میں پائی گئی تو کامیابی حاصل ہوگی اور اگر دعا میں اسباب پائے گئے تو دعا کی قبولیت میں کامیابی حاصل ہوگی۔

" فارکانه حضور القلب والرأفة والاستكانة والخشوع ، واجنحته الصدق ومواقيته الاسحار واسبابه الصلوة على محمد "

دعا کے ارکان یہ ہیں کہ دعا حضورِ قلب (حاضر دل) سے کرے دعا کرتے وقت نرمی، عجز اور خشوع پایا جائے اور دعا کا پر صدق ہے سچے دل سے دعا کرے اور صداقت سے کام لے اور کذب سے بچ جائے اور اس کے قبولیت کے اوقات میں سے سحری کا وقت خصوصی اہمیت رکھتا ہے اور دعا کی قبولیت کا سبب دعا سے پہلے اور دعا کے بعد درود شریف پڑھنا ہے:

" وقيل شرائطه اربع اولها حفظ القلب عند الوحدة وحفظ اللسان مع الخلق وحفظ العين عن النظر الى ما لا يحل وحفظ البطن من الحرام "

بعض حضرات نے بیان فرمایا ہے کہ دعا کی قبولیت کی شرائط چار ہیں ان میں سے پہلی یہ ہے کہ انسان جب اکیلا ہو تو اپنے دل کی حفاظت کرے کہ دل کو غفلت سے بچائے۔ اور جب مخلوق کے ساتھ اس کا معاملہ ہو تو زبان کو بچائے یعنی گالی گلوچ سے، غیبت سے، چغلخوری سے اور جھوٹ سے زبان کو محفوظ رکھے اور آنکھ کو ان چیزوں سے محفوظ رکھے جن کی طرف دیکھنا حلال نہیں۔ اور اپنے پیٹ کو حرام چیزوں سے بچا کر رکھے۔

" وقد قيل ان من شرط الدعا ان يكون سليما من اللحن "

دعا کی قبولیت کی اور شرط یہ ہے کہ دعا میں لحن نہ پایا جائے کیونکہ سریلی آواز سے، ترنم سے دعا کرنے میں توجہ آواز کی طرف مبذول ہوتی ہے اس میں خشوع نہیں پایا جاتا۔ دعا کرنے والا یہ دعا نہ کرے: " اللهم اعطنی ان شئت اللهم اغفرلی ان شئت اللهم ارحمنی ان شئت " اے اللہ اگر تو چاہتا ہے تو مجھے عطا کر اگر تو چاہتا ہے تو میری مغفرت فرما اگر تو چاہتا ہے تو مجھ پر رحم فرما۔

(از قرطبی)

خیال رہے کہ جو شرائط اور آداب ذکر کیے گئے ہیں وہ مجموعی طور پر دعا میں پائے جائیں تو دعا

میں مقبولیت پائی جاتی ہے۔

اوقات دعاء: بعض اوقات وہ ہیں جن میں غالباً دعا قبول ہوتی ہے وہ اوقات یہ ہیں۔ سحری کا وقت، افطار کا وقت، اذان اور اقامت کے درمیان، بدھ کے دن ظہر اور عصر کے درمیان، پریشانی کے وقت، دوران سفر، مرض کی حالت میں، بارش کے نازل ہونے کے وقت اور جہاد کی صف میں۔ (قرطبی)

تنبیہ: بعض حضرات دعا نہ کرنے کے قائل ہیں انہوں نے اپنے دلائل قائم کئے ہیں ان کے دلائل بمع جوابات کے ذکر کئے جا رہے ہیں تاکہ اصل مسئلہ نکھر کر سامنے آئے۔

ان حضرات کی پہلی دلیل یہ ہے کہ اگر کام نے عنداللہ ہونا ہے تو ضروری ہے کہ وہ کام ہو جائے گا اور اگر کام نے نہیں ہونا تو یقیناً نہیں ہوگا دعا کرنے کا مقصد کیا ہے۔ ان حضرات کی دوسری دلیل یہ ہے کہ حوادثات بغیر مؤثر کے تو پائے نہیں جا سکتے اور حوادثات مؤثر قدیم سے پائے جا سکتے ہیں جن کی انتہاء آخرت میں ہوگی تو اس سے بھی پتہ چلا کہ حوادثات نے واقع ہونا ہی ہے۔ پھر دعا کرنے کا مقصد کیا ہے اور خصوصاً تقادیر تو لوح محفوظ میں لکھ دی گئی ہیں جب ان میں کمی اور زیادتی نہیں تو دعا کرنے کا کوئی فائدہ نہیں اور نبی کریم ﷺ کا ارشاد یہ ہے:

" قدر الله المقا دیر قبل ان یخلق الخلق بکذا و کذا عاما "

اللہ تعالیٰ نے مخلوق کی تخلیق سے پہلے کئی سال تقادیر کو مقدر کر دیا ہے۔ اور نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا " جف القلم بما هو کائن " جس کام نے ہونا ہے قلم (اسے لکھ کر) خشک ہو چکی ہے ان حضرات کی اور دلیل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ علام الغیوب ہے " یعلم خائنة الاعین وما تخفی الصدور " وہ آنکھ کی خیانت اور سینوں کی چھپی چیزوں کو جانتا ہے۔ پھر دعا کرنے کی کیا ضرورت جب کہ وہ ہمارے حالات سے باخبر ہے۔ اور ان کی دلیل یہ ہے کہ مطلوب دعا میں اگر بندوں کی مصلحت ہے تو پھر بھی دعا کا فائدہ نہیں اللہ تعالیٰ جواد ہے وہ اپنے بندوں کی مصلحتوں کو کیسے چھوڑے گا وہ تو اپنی صفت کریمی کی وجہ سے خود ہی اپنے بندوں پر رحم فرمائے گا۔ اور ان حضرات کی دلیل یہ ہے کہ عقل اس بات پر شاہد ہے اور احادیث صحیحہ سے یہ بات ثابت ہے کہ صدیقین کا اعلیٰ مقام یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی تقدیر پر راضی ہونا اور دعا اس کے منافی ہے۔ ان حضرات کی اور دلیل یہ ہے کہ امر اور نہی کے صیغے دعا

میں استعمال ہوتے ہیں تو بندہ مولی کے حضور امر یا نہی کے صیغے استعمال کرے تو اس میں بے ادبی ہے۔

ان حضرات کی اور دلیل یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

﴿ من شغله ذکری عن مسألتی اعطیته افضل ما اعطی السائلین ﴾

''جو شخص مجھ سے سوال کرنے کے بجائے میری ذکر میں مشغول رہے تو میں اسے سوال کرنے والوں سے زیادہ عطا کرتا ہوں''۔

ان دلائل کے جوابات یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے علم کی کیفیت اور اس کی قضاء وقدر کی کیفیت عقلوں سے غائب ہے۔

" والحکمة الالهیة تقتضی ان یکون العبد معلقا بین الرجاء والخوف اللذین بهما تتم العبودیة "

اور اللہ تعالیٰ کی حکمت کا تقاضا یہ ہے کہ بندہ امید اور خوف کے درمیان معلق ہو کیونکہ امید اور خوف سے ہی عبودیت مکمل ہوتی ہے۔ اسی مسئلہ پر تکالیف کی دار و مدار ہے باوجود اس کے کہ اللہ تعالیٰ کا علم تمام چیزوں کا احاطہ کیا ہوا اور تمام چیزیں اللہ تعالیٰ کی قضا وقدر میں ہیں لیکن پھر بھی اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کو امر و نہی کا مکلف بنایا۔ اسی اشکال کے پیش نظر صحابہ کرام نے رسول اللہ ﷺ سے پوچھا یا رسول اللہ آپ اس کے متعلق کیا فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ہمارے اعمال کی تقادیر سے فارغ ہو چکا ہے یا کہ بعد میں وہ لکھے گا؟ آپ نے فرمایا وہ تقادیر سے فارغ ہو چکا ہے تو صحابہ کرام نے عرض کیا: '' ففیم العمل اذن '' پھر ہم عمل کیوں کریں " قال اعملوا فکل میسر لما خلق له '' آپ نے فرمایا عمل کرو جس کے لئے انسان پیدا کیا گیا ہے اپنے عمل سے اس کے لئے آسانی پیدا کرے۔

حدیث شریف میں پہلے تقدیر سے فراغت کا ذکر کیا گیا ہے جس میں خوف دلایا گیا ہے پھر عمل کرنے کا حکم دیا گیا ہے کہ اپنی زندگی میں عمل کر کے تقدیر کے مطابق آسانی پیدا کرے " الا انک تحب ان تعلم ههنا فرق ما بین المیسر والمسخر '' خبردار بیشک تمہیں معلوم ہونا چاہئے کہ میسر اور ہے مسخر اور ہے یعنی عمل اس لئے کرو کہ تمہیں رب تعالیٰ نے مختار بنایا ہے اور عمل کا حکم دیا ہے تمہارے عمل پر جنت کو لازم نہیں کیا گیا۔

یہی حال رزق کا ہے اگر چہ رزق بھی تقدیر میں مقسوم اور معین ہے لیکن پھر بھی انسان کو کسب حلال کا حکم دیا گیا ہے اور دعا میں مقصد یہ نہیں ہوتا کہ اللہ تعالیٰ کو علم حاصل نہیں کہ اسے بتایا جائے وہ یقیناً عالم الغیب ہے بلکہ دعا میں مقصد اظہار عبودیت اور عجز وانکساری کا اظہار اور کامل طور پر اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرنا مقصود ہوتا ہے۔ اور دعا میں عجز وانکساری کے اظہار کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی تقدیر وقضاء پر راضی ہونا مقصود ہے یہ بہت بڑا مقام ہے کیونکہ " الرضاء بالقضاء "عظیم عبادت ہے پھر دعا کرنا بھی عبادت ہے۔ (کبیر)

ہاں البتہ اللہ تعالیٰ کے ذکر میں مشغول رہنا اور اس خیال سے دعا نہ کرنا کہ وہ خود ہی مہربانی فرمادیگا میں تو عجز وانکساری سے اسکی عبادت کر ہی رہا ہوں یہ مستحسن امر ہے قابل اعتراض نہیں۔ (مرقاۃ ج ۵ ص ۳۲)

دعا کے عبادت ہونے اور دعا کے افضل ہونے کو احادیث مبارکہ کی روشنی میں دیکھا جائے تو دعا کا اہم ہونا واضح ہو جائے گا۔

دعا کے متعلق احادیث مبارکہ:

" عن ابی هريرة رضی الله عنه قال قال رسول الله ﷺ لكل نبی دعوة مستجابة فتعجل كل نبی دعوته وانی اختبأت دعوتی شفاعة لامتی الی يوم القيامة فهی نائلة ان شاء الله من مات من امتی لا يشرک بالله شيئا "

(روه مسلم والبخاری اقصر منه ، مشكوة كتاب الدعوات)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہر نبی کو ایک قبول ہونے والی دعا عطا کی گئی ہر نبی نے اس دعا میں جلدی کر لی اور بیشک میں نے اپنی دعا کو چھپا کر رکھ لیا ہے یعنی قیامت تک اسے اپنی امت کو شفاعت کے لئے مؤخر کر دیا ہے۔ وہ (میری شفاعت) میری امت کے ہر شخص کو پہنچے گی بشرطیکہ اس نے اللہ تعالیٰ سے کوئی شریک نہ ٹھہرایا ہو۔

وضاحت حدیث :

" (لكل نبی دعوة مستجابة) ای فی حق مخالفی امته جميعهم بالاستئصال "

یعنی ہر نبی کو ایک قبول ہونے والی وہ دعا عطا کی گئی جس سے وہ اپنی امت میں سے اپنے مخالفین

کوتباہ و برباد کردے۔ مطلب یہ ہے کہ ہر نبی کو ایک خصوصی دعا کرنے کا حق دیا گیا اور ساتھ ساتھ بتا دیا گیا کہ یہ دعا تمہاری ضرور قبول کی جائے گی۔ باقی دعائیں اگرچہ انبیاء کرام کی شرف قبولیت حاصل کر لیتی ہیں لیکن ان کی قبولیت کا وعدہ نہیں کیا گیا۔

" **فتعجل کل نبی دعوته** " (ہر نبی نے اپنی اپنی دعا میں جلدی کر لی) یعنی نوح علیہ السلام نے اپنی قوم کی ہلاکت کی دعا کی تو اللہ تعالیٰ نے آپ کی قوم کو غرق کر دیا۔ اور ہود علیہ السلام نے اپنی قوم کی ہلاکت کی دعا کی تو اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کی زوردار گرجدار آواز سے ان کو ہلاک کر دیا۔

" **وانی اختبأت دعوتی** " اور میں نے اپنی دعا کو چھپا کر رکھ لیا ہے یعنی اسے ذخیرہ بنا لیا ہے قیامت کے لئے اسے جمع کر لیا ہے " **وهو الاختفاء بالصبر علی اذی قومه لانی بعثت رحمة للعالمین** " یعنی آپ کے ارشاد کا یہ مطلب ہے کہ میں نے اپنی قوم کی اذیت پر صبر کر کے اپنی دعا کو مخفی کر لیا ہے کیونکہ مجھے رحمۃ للعالمین بنا کر بھیجا گیا۔

" **شفاعة لامتی الی یوم القیامة ای مؤخرة الی ذلک الیوم** "

" میرے پیارے حبیب علیہ السلام نے اپنی رحمۃ کاملہ کی وجہ سے اپنی دعا کو اپنی امت کی شفاعت کیلئے قیامت تک مؤخر کر دیا ہے "۔ جن لوگوں نے آپ کی دعوت پر ایمان لایا اور پھر شرک نہیں کیا تو ان تمام کو مصطفیٰ کریم ﷺ کی شفاعت سے فائدہ حاصل ہوگا۔ (از مرقاۃ ج ۵ ص ۳۳)

☆ " **عن ابی هریرة قال قال رسول الله ﷺ اذا دعا احدکم فلایقل اللهم اغفرلی ان شئت ارحمنی ان شئت ارزقنی ان شئت ولیعزم مسئلته انه یفعل ما یشاء ولا مکره له** "
(رواہ البخاری، مشکوۃ کتاب الدعوات)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جب تم میں سے کوئی ایک دعا کرے یہ نہ کہے اے اللہ اگر تو چاہتا ہے تو میری مغفرت فرما اگر تو چاہتا ہے تو مجھے رزق عطا فرما اگر تو چاہتا ہے تو مجھ پر رحم فرما بلکہ وہ پختہ عزم سے سوال کرے اللہ تعالیٰ جو چاہتا ہے وہی کرتا اور اللہ پر کوئی جبر نہیں کر سکتا۔

وضاحت حدیث: " ان شئت " کہنے سے ممانعت کی وجہ کیا ہے؟ " **لانه شک فی القبول والله تعالٰی کریم لا بخل عنده فلیستیقن بالقبول** " وجہ اس کی یہ ہے کہ اگر دعا میں یہ کہا جاتا

اگر تو چاہتا ہے تو میرا یہ کام کر تو اس دعا کرنے والے نے اللہ تعالیٰ کی قبولیت میں شک کیا ہے اور اللہ تعالیٰ کریم ہے وہ بخیل (کنجوس) نہیں لہذا رب تعالیٰ سے جب دعا کرے تو اس کی قبولیت کا یقین کرے۔

" ولیعزم مسئلته ، ای لیطلب جازما من غیر شک " یعنی اللہ تعالیٰ سے جو چیز طلب کرے اس میں شک نہ کرے بلکہ یقین رکھے اور پختہ ارادہ سے اس سے سوال کرے۔

☆ " عن ابی هریرة قال قال رسول الله ﷺ اذا دعا احدکم فلا یقل اللهم اغفرلی ان شئت ولکن لیعزم ولیعظم الرغبة فان الله لا یتعاظمه شئی اعطاه "

(رواه مسلم مشکوة کتاب الدعوات)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جب تم میں سے کوئی ایک شخص دعا کرے تو یہ نہ کہے اے اللہ اگر تو چاہتا ہے تو میری مغفرت فرما لیکن پختہ ارادہ سے دعا کرے اور عظیم رغبت سے دعا کرے بیشک اللہ تعالیٰ جو عطا فرماتا ہے اس کے سامنے وہ چیز کوئی عظیم نہیں ہوتی۔

وضاحت حدیث:

پہلے الفاظ کی وضاحت تو مندرجہ بالا حدیث میں گزر چکی ہے البتہ آگے الفاظ کی وضاحت کی جاتی ہے:

" (ولیعظم) بالتشدید علی (الرغبة) ای المیل فیه بالالحاح والوسائل "

یعنی انسان رب تعالیٰ سے عظیم رغبت سے دعا کرے عاجزی سے گڑگڑا کر دعا کرے اور دعا کی قبولیت کے تمام وسائل (جن کو پہلے ذکر کر دیا گیا ہے) کو اپنے کام میں لائے۔ " فان الله لا یتعاظمه شئی اعطاه " بیشک اللہ تعالیٰ کا کوئی چیز عطا کرنا اس کے سامنے عظیم نہیں۔

" لا یعظم علیه اعطاه شئی بل جمیع الموجودات فی امره یسیر وهو علی کل شئی قدیر"

اللہ تعالیٰ کسی کو کچھ عطاء کرے تو اس پر وہ چیز عطا کرنا بھاری نہیں ہوتا بلکہ وہ تمام مخلوق کو جو چیز عطا کرتا ہے اس پر وہ آسان ہوتا ہے کیونکہ وہ ہر چیز پر قادر ہے۔ ایک اور حدیث شریف میں ہے:

" لو اجتمع الاولون والآخرون علی صعید واحد فسال کل مسالته واعطیه ایاها ما نقص ذلک من ملکی شیأ "

اگر پہلے اور پچھلے تمام لوگ ایک میدان میں جمع ہو جائیں رب تعالیٰ سے اپنے اپنے سوال کریں

تو رب تعالیٰ فرماتا ہے کہ میں ہر ایک کو اس کے سوال کے مطابق عطا کر دوں تو میری بادشاہی میں ذرا بھر کسی چیز کی کمی نہیں ہوتی۔

☆ "وعن ابی الدرداء قال قال رسول اللہ ﷺ دعوۃ المرء المسلم لاخیه بظهر الغیب مستجابة عند رأسه ملک موکل کلما دعا لاخیه بخیر قال الملک لموکل به آمین ولک بمثل" (رواہ مسلم، مشکوۃ کتاب الدعوات)

حضرت ابو الدرداء رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا مسلمان شخص اپنے مومن بھائی کے لئے اس کی غیر موجودگی میں دعا کرے تو اس دعا کو قبول کیا جاتا ہے اس دعا کرنے والے کے سر پر ایک فرشتہ موکل ہوتا ہے جب وہ اپنے بھائی کے لئے خیر کی دعا کرتا ہے تو وہ موکل فرشتہ آمین کہتا ہے اور تمہارے لئے بھی اسی کی مثل۔

وضاحت: کافی حد تک حدیث پاک کا مطلب ترجمہ سے ہی سمجھ آ رہا ہے کہ کوئی مسلمان مرد یا عورت اپنے مسلمان بھائی یا بہن کے لئے اس کی غیر موجودگی میں دعا کرے تو اس دعا کو شرف قبولیت زیادہ حاصل ہوتا ہے کیونکہ اس دعا میں خلوص پایا جاتا ہے وہ دکھلاوے اور چرچے سے پاک ہوتی ہے کسی کے سامنے دعا کرنے میں احتمال پایا جاتا ہے کہ ہو سکتا ہے یہ دکھلاوے سے کام لے رہا ہو۔ اگر کسی کے سامنے دعا بھی خلوص سے کی جائے تو یقیناً اسے بھی قبولیت حاصل ہو گی۔ اصل قبولیت کی وجہ کو مدنظر رکھا جائے تو راقم کی وضاحت سمجھ آ جائے گی۔

ایک فرشتہ اس کی دعا پر آمین کہنے کے لئے مقرر کر دیا جاتا ہے جب وہ اپنے مومن بھائی کے لئے اس کی غیر موجودگی میں دعا کرتا ہے تو فرشتہ آمین کہتا ہے یعنی جس کے لئے دعا کی جاتی ہے اس کیلئے بھی آمین کہتا ہے اور دعا کرنے والے کے لئے اسی کی مثل وہ فرشتہ دعا کرتا ہے اور آمین کہتا ہے۔

☆ "وعن جابر قال قال رسول اللہ ﷺ لا تدعوا علی انفسکم ولا تدعوا علی اولادکم ولا تدعوا علی اموالکم لاتوا فقوا من اللہ ساعة یسئل فیها عطاء فیستجیب لکم" (رواہ مسلم، مشکوۃ کتاب الدعوات)

حضرت جابر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اپنی جانوں کے خلاف دعا نہ کرو اور اپنی اولاد کے خلاف دعا نہ کرو اور اپنے مالوں کے خلاف دعا نہ کرو اور اپنی دعا کو اس گھڑی کے موافق نہ کر جس میں اللہ تعالیٰ سے سوال کیا جائے تو وہ عطا کرتا ہے۔

وضاحت حدیث: یعنی دن رات میں ایک گھڑی وہ بھی آتی ہے جس میں رب تعالیٰ سے جوطلب کیا جائے وہ عطا کرتا ہے اس گھڑی کو معین نہیں فرمایا گیا اس لئے تم اپنی ہلاکت یا اپنی اولاد کی ہلاکت اور اپنے مالوں (یعنی غلاموں اور باندیوں اور جانوروں) کی ہلاکت کی دعا نہ کرو ہوسکتا ہے وہ گھڑی مقبولیت کی ہوجس میں تم دعا کر رہے ہو کہ میں ہلاک ہوجاؤں برباد ہوجاؤں۔ یا تم دعا میں اولاد کے متعلق یہ کہہ رہے ہو کہ تم ہلاک ہو جاؤ تمہارے پاس کچھ نہ رہے تم اندھے ہو جاؤ تمہارے ہاتھ پاؤں ٹوٹ جائیں۔ یا تم دعا کر رہے ہو کہ یہ مال ہلاک ہو جائے وغیرہ تو اس مقبولیت کی گھڑی میں تمہاری دعا مقبول ہوکر تمہاری اور تمہاری اولاد کے لئے اور تمہارے مالوں کے لئے بربادی کا سبب نہ بن جائے۔

☆ " عن النعمان بن بشير قال قال رسول الله ﷺ الدعاء هو العبادة ثم قرأ وَقَالَ رَبُّكُمُ ادْعُوْنِيْ اَسْتَجِبْ لَكُمْ "

(رواه احمد والترمذی وابوداؤد والنسائی وابن ماجه، مشکوٰة کتاب الدعوات)

نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا دعا عبادت ہی ہے پھر آپ نے پڑھا " وَقَالَ رَبُّكُمُ ادْعُوْنِيْ اَسْتَجِبْ لَكُمْ " اور آپ کے رب نے کہا مجھ سے دعا کرو میں تمہاری دعا کو قبول کروں گا۔

وضاحت حدیث: " الدعاء هو العبادة " میں مبتدا اور خبر دونوں معرفہ ہیں درمیان میں ضمیر ہے اس میں حصر پائی گئی ہے یعنی دعا عبادت ہی ہے راقم کا یہ ترجمہ قصر الصفة علی الموصوف کے ضابطہ کے مطابق ہے جس کو دینی طلباء کرام بخوبی سمجھتے ہیں۔ دعا عبادت حقیقیہ ہے یعنی دعا میں یہ اہلیت پائی گئی ہے کہ اسے عبادت کہا جائے اس کی وجہ یہ ہے:

" لدلالته على الاقبال على الله والاعراض عما سواه بحيث لا يرجو ولا يخاف الا اياه قائما بوجوب العبودية معترفا بحق الربوبية عالما بنعمة الا يجاد طالبا لمدد الامداد على وفق المراد وتوفيق الاسعاد "

کہ دعا میں انسان کی کامل توجہ اللہ تعالیٰ کی طرف ہوتی ہے اور اللہ تعالیٰ کے ماسواء سے وہ اعراض کر رہا ہوتا کہ اس لحاظ پر کہ وہ اللہ تعالیٰ کے بغیر کسی سے امید نہیں کر رہا ہوتا کسی کا خوف اسے نہیں ہوتا، وہ وجوب عبودیت کو قائم کرنے والا ہوتا ہے حق ربوبیت کا معترف ہوتا ہے، وہ ایجاد کی نعمت کو

جاننے والا ہوتا ہے، وہ اپنی مراد کے مطابق رب تعالیٰ سے ہی کامل امداد طلب کر رہا ہوتا ہے اور اسی سے نیک بختی کی توفیق طلب کر رہا ہوتا ہے۔ پھر نبی کریم ﷺ نے اپنے ارشاد پر اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد سے دلیل پیش فرمائی: " وَقَالَ رَبُّكُمُ ادْعُوْنِیْ اَسْتَجِبْ لَكُمْ " کیونکہ رب تعالیٰ نے دعا کرنے کا حکم دیا ہے " والمامور به عبادة " جس چیز کا رب تعالیٰ کی طرف سے حکم دیا جائے وہ عبادت ہوتا ہے۔

قاضی عیاض رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ آیۃ کریمہ سے مقصد بیان یہ تھا کہ آیۃ کریمہ کے الفاظ مبارکہ اس پر دلالت کر رہے ہیں۔ کہ جزاء مرتب ہے شرط پر اور مُسبب مرتب ہے سبب پر۔ جس سے یہ واضح ہوا " ویکون اتم العبادات " کہ دعا عبادات کی تکمیل کا ذریعہ ہے جس پر دوسری حدیث "الدعاء مخ العبادۃ" (دعا عبادت کا مغز ہے) دلالت کر رہی ہے۔

چونکہ یہ پہلے بیان کیا گیا ہے کہ دعا میں عبودیت کا حق ادا کرنا ہے اور عبودیت کے متعلق علامہ راغب اصفہانی رحمہ اللہ بیان فرماتے ہیں " العبودیة اظهار التذلل " عبودیت عجز کا اظہار ہے اور کوئی عبادت اس سے زیادہ افضل نہیں کیونکہ سب سے زیادہ عجز کا اظہار اس ذات کے سامنے ہوگا "من له غاية الافضال وهو الله تعالیٰ " جس کو بہت بڑی فضیلت حاصل ہوگی سب سے زیادہ افضل اور سب سے زیادہ فضل فرمانے والا صرف اللہ تعالیٰ ہی ہے۔

علامہ طیبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کے ارشاد " الدعا هو العبادة " میں عبادت کا لغوی معنی لینا بھی ممکن ہے کیونکہ عبادت کا لغوی معنی یہ ہے " هو غاية التذلل والافتقار والاستكانة " کہ جس میں بہت زیادہ عجز اور محتاجی اور مسکینی پائی جائے وہ عبادت ہے اور یہ بھی واضح ہے " وما شرعت العبادة الا للخضوع للبارئی واظهار الافتقار " کہ عبادت کو مشروع ہی اس لئے کیا گیا ہے کہ باری تعالیٰ کے حضور اظہار عجز کرے اور اپنی احتیاج کا اظہار اسی سے کرے۔ آیۃ کریمہ کے بعد والے الفاظ اس پر دلالت کر رہے ہیں:

﴿ اِنَّ الَّذِيْنَ يَسْتَكْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِیْ سَيَدْخُلُوْنَ جَهَنَّمَ دَاخِرِيْنَ ﴾

"بیشک وہ لوگ جو میری عبادت سے تکبر کرتے ہیں وہ جہنم میں ذلیل ہو کر داخل ہوں گے"۔

رب تعالیٰ نے بندوں کے عجز کے اظہار نہ کرنے اور اپنے احتیاج کو اس کے حضور نہ پیش کرنے

کو تکبر سے تعبیر فرمایا کہ وہ لوگ متکبر ہیں " ووضع عبادتی موضع دعائی "اور " عن عبادتی " کو " عن دعائی " کی جگہ رکھ کر یہ ثابت فرمایا کہ میری عبادت یعنی مجھ سے دعا کرنے میں تکبر کرنے والے جہنم میں ذلیل ہو کر داخل ہوں گے۔

جگہ جگہ پر دعا سے روکنے والے فرضوں کے بعد دعا نہیں، نماز سے فارغ ہونے پر دعا نہیں، جنازہ کے بعد دعا نہیں، میت کے ایصال ثواب کے لئے دعا نہیں، چوتھے دن، چالیسویں دن دعا نہیں، کوئی فوت ہو جائے تو اس کے اقرباء کے پاس جا کر دعا کرنا ثابت نہیں۔ ایسے لوگ متکبر ہیں عبادت سے منہ موڑنے والے ہیں، ذلیل ہیں جہنم کا ایندھن ہیں خود تو گمراہ ہیں لیکن دوسروں کو بھی گمراہ کرتے ہیں ایسے ذلیلوں سے بچ کر رہیں صرف اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول اللہ ﷺ کے حکم پر عمل کرتے ہوئے زیادہ سے زیادہ دعا کریں کیونکہ جتنی زیادہ دعا کریں گے اتنی ہی زیادہ عبادت پائی جائے گی۔

تنبیہ : علامہ میرک رحمہ اللہ نے " الدعاء هو العبادة " میں خبر کے معرف باللام ہونے اور مبتدا اور خبر کے درمیان ضمیر فصل لانے سے حصر کا معنی ثابت کرتے ہوئے یہ بیان فرمایا کہ ان الفاظ گرامی کا مطلب یہ ہے " ان العبادة ليست غير الدعاء " کہ بیشک عبادت سوائے دعا کے نہیں۔ اس میں مبالغہ پایا گیا ہے اور معنی یہ ہے " ان الدعاء معظم العبادة " بیشک دعا عظیم عبادت ہے۔ جس طرح نبی کریم ﷺ نے فرمایا: " الحج عرفة " (حج عرفہ ہے) اس کا مطلب یہ ہے کہ حج کے ارکان میں سے عرفہ عظیم رکن ہے اسی طرح مطلب اس حدیث کا یہ ہو گا کہ عبادات میں سے عظیم عبادت دعا ہے۔ یہ معنی قصر الموصوف علی الصفۃ کے ضابطہ کے مطابق ہے لیکن راقم نے جو ترجمہ قصر الصفۃ علی الموصوف کا کیا ہے اسے علامہ ابن حجر رحمہ اللہ سے تائید حاصل ہے کیونکہ انہوں نے کہا " وصوابه ان الدعاء ليس غير العبادة " درست معنی یہ ہے کہ بیشک دعا عبادت کا غیر نہیں۔ اگر چہ علامہ ابن حجر رحمہ اللہ کے قول پر ملا علی قاری رحمہ اللہ نے بحث بھی کی ہے لیکن راقم کا ذہن جس بزرگ کا قول قبول کرے اسے نقل کر دیتا ہے یہ کبھی نہیں دیکھا کہ کس نے کیا کہا ہے اور کس نے کیا کہا ہے۔

اور یہ بھی خیال رہے کہ اس حدیث کو ترمذی نے " حديث حسن صحيح " (یہ حدیث حسن صحیح ہے) اور حاکم نے بھی اس حدیث کو ذکر کر کے صحیح الاسناد کہا ہے اور اس حدیث کو طبرانی نے بھی

کتاب الدعا میں ذکر کیا ہے۔ (از مرقاۃ)

☆ " عن انس قال قال رسول اللہ ﷺ الدعاء مخ العبادۃ "

(رواہ الترمذی، مشکوۃ کتاب الدعوات)

حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا دعا عبادت کا مغز ہے۔

" والمعنی ان العبادۃ لا تقوم الا بالدعاء کما ان الانسان لا یقوم الا بالمخ " (مرقاۃ)

حدیث کا مطلب یہ ہے کہ عبادت بغیر دعا کے قائم نہیں ہو سکتی جس طرح انسان بغیر دماغ کے قائم نہیں ہو سکتا۔ " مخ الشئی خالصہ وما یقوم بہ " کسی چیز کا جس سے قیام ہو اور جو اس کے لئے خالص ہو اسے " مخ " کہا جاتا۔ جس طرح انسان کا قیام دماغ سے ہے تو اس مغز کو "مخ" کہا جائے گا گویا انسان میں خالص چیز وہی ہے اسی طرح آنکھ کی پتلی آنکھ کے لئے " مخ " ہے اور ہڈیوں کی چربی ہڈیوں کے لئے " مخ " ہے۔

☆ " وعن ابی ھریرۃ قال قال رسول اللہ ﷺ لیس شئی اکرم علی اللہ من الدعاء "

(رواہ الترمذی وابن ماجہ وقال الترمذی ھذا حدیث حسن غریب، مشکوۃ کتاب الدعوات)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ تعالیٰ کے ہاں دعا سے افضل کوئی چیز نہیں۔

وضاحت: اس حدیث پر بظاہر یہ وہم ہوتا ہے کہ رب تعالیٰ کا ارشاد گرامی ہے ﴿ اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰہِ اَتْقٰکُمْ ﴾ بیشک تم میں زیادہ مکرم اللہ تعالیٰ کے ہاں وہ ہے جس میں تقوی زیادہ پایا جائے ان میں تعارض ہے۔ حدیث پاک سے ثابت ہے کہ دعا اکرم و افضل ہے اور قرآن پاک سے ثابت ہے کہ تقوی اکرم و افضل ہے ان میں تطبیق کیسے پائی جائے گی تو اس کا جواب یہ ہے کہ ان میں کوئی تعارض نہیں کیونکہ دعا عبادت ہے اور عبادت سے تقوی حاصل ہوتا ہے لہذا معلوم ہوا کہ دعا اکرم ہے کیونکہ عبادت ہے اور اسی عبادت سے حاصل ہونے والا تقوی بھی یقیناً مکرم ہوگا۔

☆ " وعن سلمان الفارسی قال قال رسول اللہ ﷺ لا یرد القضاء الا الدعاء ولا یزید فی العمر الا البر "

(رواہ الترمذی، مشکوۃ کتاب الدعوات)

حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا قضاء رد نہیں ہوتی

سوائے دعا کے اور عمر میں زیادتی نہیں ہوتی سوائے نیکی کے۔

وضاحت حدیث: قضاء سے مراد امر مقدر یعنی جو چیز تقدیر میں ہے تقدیر رد ہونے کا ایک مطلب یہ ہے کہ انسان کسی مکروہ (ناپسندیدہ، مصیبت) چیز کے واقع ہونے کا خوف رکھتا ہو تو اس شے سے بچنے کی کوشش میں اللہ تعالیٰ نے اسے دعا کی توفیق عطا فرمادی اس دعا کے ذریعے اللہ تعالیٰ نے اس کو بچالیا۔ مجازی طور پر اسے تقدیر کے ٹلنے سے تعبیر کر دیا رسول اللہ ﷺ نے دم کرنے کو تقدیر کا حصہ قرار دیا پھر مریض کو دواء لینے کا حکم دیا اور دعا کرنے کا حکم دیا۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ شام کے علاقہ میں گئے تو آپ کو پتہ چلا کہ وہاں طاعون کی مرض پھیلی ہوئی ہے آپ وہاں سے لوٹ پڑے۔ تو حضرت ابوعبیدہ نے کہا " **اتفر من القضاء یا امیر المؤمنین** " اے امیر المؤمنین کیا تم تقدیر سے بھاگ رہے ہو؟ تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا اے ابوعبیدہ " **لو غیرک قالها** " کاش تمہارا غیر یہ کہتا۔ یعنی کوئی جاہل یہ بات کرتا تو تعجب نہ ہوتا لیکن تم تو صاحب علم شخصیت ہو تم نے یہ کیا کہا ہے؟ اس پر تعجب ہے ہاں یہ بات سن لو " **نعم نفر من قضاء الله الی قضاء الله** " ہم اللہ تعالیٰ کی تقدیر سے اللہ کی تقدیر کی طرف بھاگے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ ہمارا یہاں آنا بھی تقدیر کے مطابق ہے اور ہمارا یہاں سے جانا بھی تقدیر کے مطابق ہے۔ " **ولا یزید فی العمر الاالبر** " عمر میں زیادتی نہیں ہوتی سوائے نیکی کے " **البر** " **بکسر الباء وهو الاحسان والطاعة** " **البر** " کا معنی احسان اور طاعت ہے۔

عمر کی زیادتی سے کیا مراد ہے؟ بعض حضرات نے نے کہا حقیقی طور پر عمر کی زیادتی ہوتی ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد اس پر دلالت کر رہا ہے " **وما یعمر من معمر ولا ینقص من عمره الا فی کتاب** " کسی کی عمر میں زیادتی نہیں کی جاتی اور کسی کی عمر کو کم نہیں کیا جاتا مگر یہ کہ وہ کتاب (لوح محفوظ) میں ہے۔

اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے " **یمحو الله ما یشاء ویثبت وعنده ام الکتاب** " اللہ تعالیٰ مٹاتا ہے جو چاہے اور ثابت رکھتا ہے جو چاہے ام الکتاب (لوح محفوظ) اسی کے پاس ہے۔ اور کشاف میں ذکر کیا گیا ہے " **انه لا یطول عمر انسان ولا یقصر الا فی کتاب** " بیشک کسی انسان کی

عمر لمبی نہیں ہوتی اور نہ ہی چھوٹی ہوتی ہے مگر یہ کہ وہ کتاب میں (لوح محفوظ میں) پائی جاتی ہے۔

صورت اس کی یہ ہے کہ لوح محفوظ میں لکھا جاتا ہے کہ اگر فلاں نے حج نہ کیا یا جہاد میں شریک نہ ہوا تو عمر اس کی (مثال کے طور پر) چالیس سال ہوگی اور اگر اس نے حج کرلیا یا جہاد میں شریک ہوگیا تو اس کی عمر ساٹھ سال ہوگی۔ گویا کہ جب اس نے نیکی کے کام پر عمل کیا تو عمر بڑھ گئی اور نیکی کا کام نہ کیا تو عمر کم ہوگئی۔ عمر کی زیادتی کا اور مطلب یہ ہے " **انه اذا بر لا یضیع عمره فکأنه زاد** " کہ بیشک جب وہ نیکی کرے گا تو اس کی عمر ضائع نہیں ہوگی (اور گناہ کرنے کی وجہ سے گویا کہ عمر ضائع ہوجائے گی)۔

عمر کی زیادتی کا اور مطلب یہ ہے کہ نیکی کے اعمال عمر کی زیادتی کا سبب ہیں یہ بھی تقدیر میں موجود ہے جیسا کہ دعا کا رد البلاء ہونا بھی تقدیر میں موجود ہے:

" **فالدعاء للوالدین وبقیة الارحام یزید فی العمر اما بمعنی انه یبارک له فی عمره فیسیر له فی الزمن القلیل من الاعمال الصالحة مالا یتسیر لغیره من العمل الکثیر** "

یعنی والدین کی دعا اور قریبی رشتہ داروں کی دعا عمر میں زیادتی کرتی ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ اس شخص کی عمر میں برکت پائی جاتی ہے تھوڑے سے وقت میں وہ اتنے زیادہ نیک عمل کرلیتا ہے جتنے عمل دوسرا کوئی شخص نہیں کرسکتا۔ (از مرقاۃ)

☆ " **وعن ابن عمر قال قال رسول اللہ ﷺ ان الدعاء ینفع مما نزل ومما لم ینزل فعلیکم عباد اللہ بالدعاء** " (رواہ الترمذی ورواہ احمد عن معاذ بن جبل وقال الترمذی ھذا حدیث غریب

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا بیشک دعا اس چیز میں بھی نفع دیتی ہے جو واقع ہوچکی ہے اور جو واقع نہیں ہوئی اسمیں بھی نفع دینی والی ہے اے اللہ کے بندوں تم پر لازم ہے کہ دعا کرو۔

وضاحت حدیث: یعنی جو مصیبت وغیرہ واقع ہوجائے اسے صبر سے برداشت کرے اور دعا کرتا رہے تو اللہ تعالیٰ اس میں آسانی پیدا فرمائے گا اور جو مصیبت واقع نہیں ہوئی جب دعا کرے گا تو اللہ تعالیٰ اسے پھیر دے گا وہ مصیبت واقع ہونے سے مندفع ہوجائے (ٹل جائے گی)۔ جب دعا کا یہ

مقام ہے تو اے اللہ کے بندو تم پر لازم ہے کہ دعا کرو " لانہ من لوازم العبودیة التی ھی القیام بحق الربوبیة " اس لئے کہ دعا میں عبودیت یعنی عجز وانکساری پائی جاتی ہے انسان کے لئے لازم ہے کہ وہ رب تعالیٰ کی ربوبیت کا اپنی عبودیت کے ذریعے حق ادا کرے۔

☆ " وعن ابن مسعود قال قال رسول اللہ ﷺ سلوا اللہ من فضلہ فان اللہ یحب ان یسئل وافضل العبادة انتظار الفرج " (رواہ الترمذی وقال ھذا حدیث غریب)

حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ تعالیٰ سے اس کے فضل کا سوال کرو بیشک اللہ تعالیٰ پسند فرماتا ہے کہ اس سے سوال کیا جائے اور افضل عبادت یہ ہے کہ کشادگی کی انتظار کی جائے۔

وضاحت حدیث: جب اللہ تعالیٰ وسیع فضل کا مالک ہے اور وہ کامل صفات کا مالک ہے یعنی " انہ کریم منعم وھاب معط غنی مغن باسط " وہ ذات کریم ہے انعام عطا فرمانے والا ہے اور بخشیش عطا فرمانے والا ہے اور عطیات عطاء کرنے والا ہے اور غنی ہے اور غنی کرنے والا ہے اور کشادگی عطاء کرنے والا ہے "یحب ان یسأل " اس لئے وہ پسند فرماتا ہے کہ اس سے اس کے فضل کو طلب کیا جائے " وفیہ ایماء الی ان احدا لم یقدر علی عدلہ " اسی سے یہ بھی واضح ہو گیا کہ ہر انسان اللہ تعالیٰ سے اس کے فضل کو ہی طلب کرے کسی انسان کی یہ مجال نہیں کہ وہ اس کے عدل کا سامنا کر سکے۔

" وافضل العبادة انتظار الفرج " یعنی افضل عبادت یہ ہے کہ انسان مصیبت اور حزن کے جانے کی انتظار کرے کیونکہ انسان جب اپنی مصیبتوں کی شکایت اللہ تعالیٰ کے غیر کی طرف نہیں کرے گا تو یہ افضل عبادت ہوگی۔

" وکونہ افضل العبادة لان الصبر فی البلاء انقیاد للقضاء وذلک فضل اللہ یؤتیہ من یشاء "

کیونکہ مصیبت پر صبر کرنا، تقدیر پر راضی ہونا بہت بڑی افضل عبادت ہے اور یہ اللہ تعالیٰ کا فضل ہے جسے چاہے عطا کرتا ہے۔

☆ " عن ابی هریرة قال قال رسول اللہ ﷺ من لم یسأل اللہ یغضب علیہ "

(رواہ الترمذی ، مشکوۃ کتاب الدعوات)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جو شخص اللہ تعالیٰ سے سوال نہیں کرتا اللہ تعالیٰ اس پر غضب فرماتا ہے۔

وضاحت حدیث : " لان ترک السؤال تکبر واستغناء وھذا لا یجوز للعبد "

اس لئے کہ رب تعالیٰ سے سوال نہ کرنا علامت ہے۔ (از مرقاۃ) اس بات کی کہ وہ شخص متکبر ہے اور مستغنی ہے بندے کیلئے یہ جائز نہیں کہ وہ اپنے آپ کو رب تعالیٰ سے مستغنی سمجھے اور اس کے سامنے تکبر کا اظہار کرے۔ حدیث شریف میں "غضب" کا جو ذکر ہے اس سے مراد سزا دینا ہے۔ علامہ طیبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

" وذلک لان اللہ یحب ان یسأل من فضلہ فمن لم یسأل اللہ یبغضہ والمبغوض مغضوب علیہ لا محالة "

کہ دونوں احادیث کا مطلب یہ ہے کہ بیشک اللہ تعالیٰ پسند فرماتا ہے کہ اس سے اس کے فضل کو طلب کیا جائے جو شخص اللہ تعالیٰ سے سوال نہیں کرتا اللہ تعالیٰ اس پر ناراض ہوتا ہے اور اللہ تعالیٰ جس سے ناراض ہوگا یقیناً اس پر اللہ تعالیٰ کا غضب بھی ہوگا۔ اللہ تعالیٰ سے مانگنے اور بندوں سے مانگنے کو کسی شاعر نے کیا خوب بیان فرمایا:

اللہ یغضب ان ترکت سؤالہ	وبنی آدم حین یسئل یغضب
اللہ سے سوال کرنا چھوڑ دو تو وہ اس پر ناراض ہوتا	اور بندوں سے سوال کرو تو وہ اس پر ناراض ہوتے ہیں

دعا خواہ لسان مقال (زبان) سے کرے یا لسان حال (دل کی توجہ) سے کرے ہر حال میں بہتر ہے بلکہ بلند پایہ شخصیات کی دعا لسان حال سے ہی زیادہ ثابت ہے " یعنی ان السؤال بلسان الحال ادعی الی وصول الکمال من بیان المقال " زبان حال سے سوال کرنا بنسبت زبان مقال سے سوال کرنے کے زیادہ کمال تک پہنچانے والا ہے۔ حدیث صحیح میں ہے " من شغلہ ذکری عن مسئلتی اعطیتہ افضل ما اعطی السائلین " اللہ تعالیٰ سوال کرنے والوں کی بنسبت اسے زیادہ عطا کرتا ہے جو اس کے ذکر میں مشغول ہے (یعنی دل کی توجہ سے اس سے سوال کرے)۔

اسی لئے ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا " حسبی من سؤالی علمه بحالی " میرے سوال کی بنسبت اس کا علم میرے حال کو کافی ہے کیا خوب کسی شاعر نے کہا ہے:

اذا اثنی علیک المرء یوما　　　کفاه من تعرضه الثناء

جب کوئی شخص تمہاری کسی دن تعریف کرے تو اس کا تعریف کے درپے ہونا ہی اس کی کفایت کا تقاضا کرتا ہے۔

☆ " وعن ابن عمر قال قال رسول الله ﷺ من فتح له منکم باب الدعاء فتحت له ابواب الرحمة وما سئل الله شیأ یعنی احب الیه من ان یسأل العافیة "

(رواہ الترمذی، مشکوۃ کتاب الدعوات)

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس شخص کے لئے دعا کا دروازہ کھول دیا جائے اس کے لئے رحمت کے دروازے کھول دیئے جاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ سے جب بھی کسی چیز کا سوال کرو تو اسے یہ پسند ہے کہ اس سے عافیت کا سوال کیا جائے۔

وضاحت حدیث: حدیث پاک سے بہت واضح طور پر سمجھ آیا کہ دعا کرنا ذریعہ رحمت ہے۔ اور آخری الفاظ راوی کی وضاحت ہے کہ سب چیزوں سے زیادہ رب تعالیٰ کو پسند یہ ہے کہ اس سے عافیت کا سوال کیا جائے۔ تاہم یہ خیال رہے کہ عافیت سے مراد اخروی اور دینی عافیت ہے اس سے مراد دنیاوی اور جسمانی عافیت نہیں۔ ایک شخص میرے سردار شیخ ابوالعباس مرسی کے پاس آیا آپ کو تکلیف تھی درد لاحق تھا اس شخص نے آپ کے لئے دعا کی " عافاک یا سیدی " اے میرے سردار اللہ تعالیٰ آپ کو عافیت عطا فرمائے۔ آپ سن کر خاموش رہے آپ نے کوئی جواب نہ دیا اس شخص نے پھر وہی دعا کی تو شیخ نے فرمایا کہ درد کے آرام کی میں نے تو دعا نہیں کی تم نے میرے درد کے آرام کی دعا کی ہے " والذی انا فیه وهو العافیة " قسم ہے ذات باری تعالیٰ کی میں جس حال میں ہوں وہی عافیت ہے۔ وجہ اصل میں یہ ہے کہ بیماری اور تکالیف مدارج کی بلندی کا ذریعہ ہیں:

" وقد سال رسول الله ﷺ العافیة وقال ما زالت اکلة خیبر تعاودنی فالآن قطعت ابهری "

نبی کریم ﷺ نے اللہ تعالیٰ سے عافیت کا سوال کیا تو آپ پر خیبر میں زہر آلود بکری کے گوشت

کے زہر کا اثر لوٹ آیا آپ کی انتڑیاں اسے کٹنے لگیں۔ اسی زہر کے اثر سے آپ کو منصب شہادت حاصل ہو گیا اخروی عافیت اس سے بڑھ کر اور کیا ہو سکتی تھی۔ " وابوبکر سأل العافیة ومات مسموما " حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے عافیت کا سوال کیا تو آپ پر غار ثور میں سانپ کے ڈسنے کی زہر کا اثر لوٹ آیا آپ کو منصب شہادت حاصل ہو گیا جو اخروی لحاظ پر عظیم عافیت تھی۔ " وعمر سأل العافیة ومات مطعونا " حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے عافیت کا سوال کیا اور آپ نیزے کے زخم سے شہید ہو گئے آپ کے حق میں اخروی لحاظ پر یہی عافیت عظیمہ تھی۔ " وعثمان سأل العافیة ومات مذبوحا " اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے عافیت کا سوال کیا تو آپ کو ذبح کر کے شہید کر دیا گیا اس طرح آپ نے بھی اخروی نعمت عظیمہ کو حاصل کر لیا " وعلی سأل العافیة ومات مذبوحا" حضرت علی رضی اللہ عنہ نے عافیت کا سوال کیا تو آپ کو بھی شہادت نصیب ہوئی گویا کہ آپ کے لئے یہی عافیت تھی جو آپ کو عطا کر دی گئی۔

اس مندرجہ بالا بحث سے یہ فائدہ حاصل ہوا:

" فاذا سألت اللہ العافیة فسئله العافیة من حیث یعلم انها لک عافیة "

جب تو اللہ تعالیٰ سے عافیت کا سوال کر تو یہ عرض کر اے اللہ میرے حق میں جس عافیت کو تو بہتر جانتا ہے وہی عافیت مجھے عطاء فرما اس کا یہ فائدہ ہوگا کہ اگر انسان کی مرض کو دور کر کے اسے زندہ رکھنا اس کے لئے مفید ہو تو اللہ تعالیٰ سے اسے جسمانی راحت حاصل ہو گی اور اگر اس کے حق میں اس کے لئے موت بہتر ہوئی تو اسے موت عطا کر دی جائے گی۔ چونکہ " العافیة دفع العفاء وهو الهلاک " عافیت ہلاک کو دور کرنے کا نام ہے اس لئے اتنی روزی عطاء کرنا جو کفایت کر جائے وہ بھی عافیت ہے۔ اور بدن کو قوت عطاء کرنا جس سے انسان عبادت ادا کر سکے یہ بھی عافیت ہے اور دین کے کاموں میں علم وعمل کے لحاظ پر مشغول رکھنا بھی عافیت ہے اور جو کام انسان کے لئے بہتر نہ ہو اسے چھوڑ دینا بھی عافیت ہے اور جو کام غیر ضروری ہوں ان کو چھوڑ دینا بھی عافیت ہے اس لئے عافیت کی دعا کرتے ہوئے معین نہ کرے بلکہ یہ کہے کہ اللہ تعالیٰ میرے حق میں جو جو عافیت بہتر ہے وہ عطاء فرما۔

☆ " وعن ابی هریرة قال قال رسول اللہ ﷺ من سره ان یستجیب اللہ له عند

الشدائد فلیکثر الدعاء فی الرخاء"

(رواہ الترمذی وقال ھذا حدیث غریب، مشکوۃ کتاب الدعوات)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس شخص کو یہ پسند ہو کہ اللہ تعالیٰ اس کی مشکلات میں اس کی دعا کو قبول کرلے تو وہ آسانی میں زیادہ دعا کرے۔

وضاحت حدیث: یعنی مومن کی یہ شان ہے " **یلتجی الی اللہ تعالیٰ قبل مس الاضطرار** " کہ وہ اللہ تعالیٰ کے حضور رجوع کرتا ہے اور اسی سے پناہ پکڑتا ہے مصیبت کے پہنچنے سے پہلے، بخلاف کافر کے اسے جب مصیبت پہنچتی ہے۔ تو وہ اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرتا ہے اور جب اسے خوشحالی ہوتی ہے تو اللہ تعالیٰ سے روگردانی کرتا ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے:

﴿ **واذا مس الانسان ضردعا ربه منیبا الیه ثم اذا خوله نعمة منه نسی ما کان یدعو الیه من قبل** ﴾

"اور جب آدمی کو کوئی تکلیف پہنچتی ہے اپنے رب کو پکارتا ہے اسی طرف جھکا ہوا پھر جب اللہ نے اسے اپنے پاس سے کوئی نعمت دی تو بھول جاتا ہے جس لئے پہلے پکارتا تھا۔ آیۃ کریمہ میں آدمی سے مراد مطلقا کافر یا خاص ابوجہل یا عتبہ بن ربیعہ مراد ہے۔ (خزائن العرفان)

☆ " **وعن مالک بن یسار قال قال رسول اللہ ﷺ اذا سألتم اللہ فاسألوه ببطون اکفکم ولا تسألوه بظهورها وفی روایة ابن عباس قال سلوا اللہ ببطون اکفکم ولا تسألوه بظهورها فان فرغتم فامسحوا بها وجوهکم** " (رواہ ابو داؤد)

حضرت مالک بن یسار رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جب تم اللہ تعالیٰ سے سوال کرو تو اپنی ہتھیلیوں کے اندرونی حصہ سے سوال کرو ان کی پیٹھ سے سوال نہ کرو۔ ایک روایت حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے اس میں یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ سے اپنی ہتھیلیوں کے اندورنی حصہ سے سوال کرو اور ان کی پیٹھ سے سوال نہ کرو۔ پھر جب تم فارغ ہو جاؤ تو اپنے ہاتھ اپنے مونہوں پر پھیرلو۔

وضاحت حدیث: عام حالات میں دعا سیدھے ہاتھوں سے کی جائے البتہ " **قیل فی دفع البلاء یجعل ظهر الکف فوق بطنها تفاؤلا** " مصیبت کو مندفع کرنے کے لئے بعض حضرات نے الٹے ہاتھوں سے دعا کرنا مناسب سمجھا ہے کہ اس میں نیک شگونی پائی جاتی ہے۔ کہ انسان جب الٹے ہاتھوں سے دعا کرتا ہے پھر منہ پر پھیرنے کے لئے ہاتھ سیدھے کرتا ہے تو گویا کہ وہ زبان حال

سے یہ کہہ رہا ہوتا ہے کہ اللہ جس طرح میں نے ہاتھوں کو الٹا کر کے پھر سیدھا کر کے منہ پر پھیر دیا ہے اس طرح تو میرے الٹے حالات کو سیدھا کر دے۔ ایک روایت میں ہے " انہ علیہ الصلوۃ والسلام اشار فی الاستسقاء بظھر کفیہ " کہ بیشک نبی کریم ﷺ بارش کی طلب کی دعاء میں ہاتھوں کی پیٹھ سے اشارہ فرمایا۔ بعض حضرات نے تو اس کا ظاہر معنی ہی لیا ہے کہ بارش کے لئے الٹے ہاتھوں سے دعا کی جائے۔

لیکن علامی طیبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

" ومعناہ انہ رفع یدیہ رفعا بلیغا حتی ظھر بیاض ابطیہ وصارت کفاہ محاذین لرأسہ ملتمسا ان یغمرہ برحمتہ من رأسہ الی قدمیہ "

اور معنی اس کا یہ ہے کہ بیشک آپ نے بارش کی دعا کے لئے بہت بلند ہاتھ اٹھائے یہاں تک کہ آپ کی بغلوں کی سفیدی ظاہر ہوگئی۔ اور آپ کی ہتھیلیاں آپ کے سر کے برابر تھیں وجہ اس کی یہ تھی کہ آپ گویا کہ رب تعالیٰ سے یہ مطالبہ کر رہے تھے کہ اے اللہ جس طرح میں نے اپنے ہاتھوں کو سر تک اٹھایا اسی طرح تو اپنی رحمت سے ہمیں سر سے قدموں تک ڈھانپ دے۔

راقم کا موقف اس میں یہ ہے کہ بارش کی دعا میں ہاتھ بلند کر کے سر تک اٹھائے اور ہاتھ سیدھے رکھے یا الٹے ہاتھوں سے دعا کرے دونوں صورتیں جائز ہیں جو شارحین نے بیان فرمائی ہیں:

﴿ فَاِذَا فَرَغْتُمْ فَامْسَحُوْا بِهَا وُجُوْهَكُمْ ﴾

''جب تم دعا سے فارغ ہو جاؤ تو اپنے ہاتھ منہ پر پھیرو''

چہرے پر ہاتھ پھیرنے کی وجہ یہ ہے " فانھا تنزل علیھا آثار الرحمۃ فتصل برکتھا الیھا " بیشک دعا کی وجہ سے رحمت کے آثار ہاتھوں تک پہنچتے ہیں اس لئے ہاتھوں کو منہ پر پھیرنے کا حکم ہے کہ ہاتھوں سے برکت چہرے پر پہنچ جائے۔

فائدہ : قال ابن حجر استفید من ھذا الحدیث والذی قبلہ انہ یسن رفع الیدین الی السماء فی کل دعاء وصحت بہ الاحادیث الکثیرۃ عنہ علیہ الصلوۃ والسلام من غیر حصر قال النووی ومن ادعی حصرھا فقد غلط غلطا فاحشا "

حضرت ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں اس حدیث اور اس سے پہلی حدیث سے یہ فائدہ حاصل ہوا

کہ ہر دعا میں آسمانوں کی طرف ہاتھوں کو اٹھانا سنت ہے نبی کریم ﷺ کی کثیر احادیث اس مسئلہ کو ثابت کر رہی ہیں جو شمار میں ہی نہیں۔ اگر کوئی چند احادیث میں اس مسئلہ کو منحصر کرے تو اسکی فاحش غلطی ہوگی۔

اعتراض : "عن انس قال كان النبي ﷺ لا يرفع يديه في شئي من دعائه الا في الاستسقاء فانه يرفع حتى يرى بياض ابطيه" (بخاری ومسلم، مشکوۃ باب الاستسقاء)

حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں نبی کریم ﷺ کسی دعا میں اپنے ہاتھ نہیں اٹھاتے تھے سوائے بارش طلب کرنے کی دعا کے بیشک آپ اس میں ہاتھ اٹھاتے یہاں تک کہ آپ کی بغلوں کی سفیدی نظر آتی۔ اس حدیث پاک سے ثابت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے سوائے استسقاء کے کسی دعا میں ہاتھ نہیں اٹھائے تو کس طرح کہنا ثابت ہے کہ ہر دعا میں ہاتھ اٹھائے جائیں۔

پہلا جواب: کہ جن احادیث میں ہاتھ اٹھانے کا ذکر ہے وہ مثبت ہیں اور جن میں ہاتھ نہ اٹھانے کا ذکر ہے وہ منفی ہیں۔ قانون یہ ہے کہ مثبت مقدم ہوتی ہے نافی روایت سے لہٰذا دعا میں ہاتھ اٹھانے والی احادیث راجح ہیں۔

دوسرا جواب: "ان المراد انه كان لا يبالغ في رفع يديه في شئي من الدعاء الا الاستسقاء"

جس حدیث میں نفی ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ نے دعا میں ہاتھ اٹھانے میں اتنا مبالغہ نہیں کیا جتنا استسقاء میں کیا ہے کہ سر تک ہاتھ اٹھائے ہیں۔ (مرقاۃ ج۵ص۳۳۳)

" وقال القاضي لا يرفعهما كل الرفع حتى يجاوز رأسه ويرى بياض ابطيه لو لم يكن عليه ثوب الا في الاستسقاء لانه ثبت استحباب رفع اليدين في الادعية كلها اى غالبها " (مرقاۃ ج ۳ ص ۳۳۳)

قاضی عیاض رحمہ اللہ نے فرمایا کہ آپ دعا میں اتنے زیادہ ہاتھ نہیں اٹھاتے کہ آپ کے سر سے ہاتھ تجاوز کر جاتے اور آپ کی بغلوں کی سفید نظر آتی جب کہ آپ پر کپڑا نہ ہوتا سوائے استسقاء کے کیونکہ تمام دعاؤں میں آپ کا غالباً ہاتھ اٹھانا ثابت ہے۔

" وفيه ان الجزرى عد في الحصن من جملة آداب الدعاء مسح وجهه بيديه بعد فراغه " (مرقاۃ ج ۵ ص ۴۲)

علامہ جزری نے اپنی کتاب حصن میں آداب دعا ذکر فرمائے ان میں یہ بھی ذکر فرمایا کہ دعا سے

فارغ ہونے کے بعد اپنے ہاتھ منہ پر پھیر لے۔

☆ "وعن سلمان قال قال رسول الله ﷺ ان ربكم حي كريم يستحي من عبده اذا رفع يديه اليه ان يردهما صفرا" (رواه الترمذی وابو داؤد والبیہقی فی الدعوات الكبر)

حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا بیشک تمہارا رب حیاء فرمانے والا ہے (جو اس کی شان کے لائق ہے) اور کریم ہے اپنے بندے سے حیاء فرماتا ہے جب وہ اپنے ہاتھ اس کی طرف اٹھاتا ہے کہ ان کو خالی لوٹا دے۔

وضاحت حدیث: حیی (فعیل کا وزن ہے) حیاء فرمانے والا، رب تعالیٰ کے حیاء کرنے کا مقصد یہ ہے کہ جو کام بندے کے لئے نفع مند ہو وہ کرتا ہے اور جو کام نقصان دہ ہو اسے چھوڑ دیتا ہے۔

"كريم" وهو الذى يعطى من غير سؤال فكيف بعده"

اللہ تعالیٰ کے کریم ہونے کا مطلب یہ ہے کہ وہ بغیر سوال کے عطا کرتا ہے سوال کے بعد کس طرح عطا نہیں کرے گا۔ "صفرا" (بكسر الصاد و سكون الفاء) خالی ہونا، فارغ ہونا۔

حدیث شریف کا مطلب واضح ہے کہ اللہ تعالیٰ کی شان کے جو لائق ہے وہ حیاء فرماتا ہے اور وہ کریم ہے اس لئے بندہ جب اس کے حضور اپنے ہاتھ اٹھاتا ہے تو وہ اپنے بندے کے ہاتھوں کو خالی لوٹانے سے حیاء فرماتا ہے یعنی وہ اپنے بندے کی دعا قبول فرماتا ہے۔

☆ "وعن عمر قال كان رسول الله ﷺ اذا رفع يديه فى الدعاء لم يحطهما حتى يمسح بهما وجهه" (رواه الترمذی، مشکوۃ کتاب الدعوات)

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا رسول اللہ ﷺ دعا میں جب اپنے ہاتھ اٹھاتے تو ان کو واپس نہیں لوٹاتے تھے یہاں تک کہ ان کو اپنے منہ پر پھیر لیتے۔

وضاحت حدیث: "قيل حكمة الرفع الى السماء انها قبلة الدعاء ومهبط الرزق والوحى والرحمة والبركة"

ہاتھوں کو آسمانوں کی طرف اٹھانے میں حکمت یہ ہے کہ وہ دعا کا قبلہ ہے اور رزق وہاں سے اترتا ہے اور وحی کے آنے کا مقام ہے کیونکہ قرآن پاک ایک مرتبہ ہی لوح محفوظ سے آسمان دنیا پر نازل ہوا ہے پھر وہاں سے ضرورت کے مطابق بذریعہ وحی نازل ہوتا رہا:

" قال الغزالی ولایرفع بصرہ الی السماء لخبر فیہ "

علامہ غزالی رحمہ اللہ نے فرمایا دعا میں نظر آسمانوں کی طرف نہ اٹھائے۔

" وقد عد الجزری فی الحصن من آداب الدعاء ان لا یرفع بصرہ الی السماء "

جزری رحمہ اللہ نے بھی آداب دعا میں یہی ذکر کیا ہے کہ دعا میں اپنی نظر کو آسمانوں کی طرف نہ اٹھائے۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ کوئی یہ نہ سمجھے کہ اللہ تعالیٰ آسمانوں میں ہے حالانکہ وہ تو مکان سے پاک ہے۔ "ہاتھ نیچے واپس لوٹانے سے پہلے اپنے چہرے پر پھیرے" وجہ اس کی وہی ہے جو پہلے ذکر کر دی گئی کہ اس کے ہاتھ رحمت و برکت سے بھر جاتے ہیں پھر وہ چہرے پر پھیر دیئے جائیں تا کہ چہرہ بھی رحمت و برکت کے انوار سے منور ہو جائے۔ (از مرقاۃ)

☆ " وعن عائشة قالت کان رسول اللہ ﷺ یستحب الجوامع من الدعاء ویدع ماسوی ذلک " (رواہ ابوداؤد ، مشکوۃ کتاب الدعوات)

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں رسول اللہ ﷺ دعا میں سے جوامع کو پسند فرماتے تھے اور اس کے ماسوا کو چھوڑ دیتے تھے۔

وضاحت حدیث: " الجوامع " کے مختلف مطالب بیان کئے گئے ہیں جو تمام ہی مراد ہیں۔ اس کا ایک مطلب یہ ہے کہ آپ ایسی دعا فرماتے جو نیک اغراض کی جامع ہوتی۔ اور اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ ایسی دعا فرماتے جو اللہ تعالیٰ کی ثناء کی جامع ہوتی۔ اور یہ مطلب ہے کہ آپ ایسی دعا فرماتے جو آداب مسئلہ کی جامع ہوتی۔ علامہ مظہر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ "جوامع" کا یہاں بھی وہی معنی ہے جو آپ کے خصوصی صفت جوامع الکلم کا معنی ہے وہ یہ ہے:

" ما لفظہ قلیل ومعناہ کثیر شامل لامور الدنیا والآخرۃ "

جس کے لفظ قلیل ہوں اور معانی کثیر ہوں جو امور دنیا اور آخرت پر مشتمل ہو۔ نبی کریم ﷺ مختصر دعائیں کرتے جو کثیر معانی پر مشتمل ہوتیں وہ یہ ہیں:

﴿ رَبَّنَا اٰتِنَا فِی الدُّنْیَا حَسَنَةً وَّفِی الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً وَّقِنَا عَذَابَ النَّارِ ﴾

﴿ اللھم انی اسألک العفو والعافیة فی الدین والدنیا والآخرۃ ﴾

﴿ اللھم ان اسألک الھدی والتقی والعفاف والغنی ﴾

اور جو دعا جامع نہیں ہوتی تھی وہ دعا آپ نہیں فرماتے تھے اور آپ صرف اپنی ذات کے لئے دعا نہیں فرماتے تھے بلکہ اپنی دعا میں اور لوگوں کو بھی شامل کرتے تھے۔

☆ " وعن عمر بن الخطاب قال استأذنت النبی ﷺ فی العمرة فاذن لی وقال اشركنا یا اخی فی دعائک ولا تنسنا فقال كلمة ما یسرنی ان لی بها الدنیا "

(رواه ابو داؤد والترمذی وانتهت روایته عند قوله و لا تنسنا مشكوة كتاب الدعوات)

حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں میں نے عمرہ میں نبی کریم ﷺ سے اجازت طلب کی تو آپ نے مجھے اجازت دے دی اور آپ نے فرمایا اے میرے پیارے بھائی ہمیں اپنی دعا میں شریک رکھنا اور ہمیں بھلانا نہیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے وہ کلمہ ارشاد فرمایا جو میرے لئے تمام دنیا سے زیادہ خوش کرنے والا تھا۔

وضاحت حدیث : یہ اس عمرہ کی بات ہے جو آپ نے زمانہ جاہلیت میں نذر مانی تھی کہ میں عمرہ ادا کروں گا۔ اگر چہ وہ نذر پوری کرنی آپ پر واجب نہ تھی لیکن عبادت خواہ مستحب ہو عبادت ہی ہوتی ہے اس لئے کہ رسول اللہ ﷺ نے آپ کو اجازت فرما دی۔

" وقال اشركنا " میں " نا " ضمیر جمع متکلم کی ہے جو مفعول ہے اشرک امر کا صیغہ ہے۔ جمع متکلم کی ضمیر کے ذکر کرنے کی دو مطلب ہو سکتے ہیں " یحتمل نون العظمة وان یرید نحن واتباعنا " کہ نون عظمت پر دلالت کر رہا ہو یا آپ کی مراد یہ ہو کہ مجھے اور میرے متبعین تمام کو اپنی دعا میں شریک رکھنا یعنی ہمارے لئے بھی دعا کرنا۔ " یا اخی " تصغیر کا صیغہ ہے جو لطف و مہربانی پر دلالت کر رہا ہے۔ اگر چہ تصغیر کبھی تحقیر کے لئے بھی آتی ہے لیکن وہ یہاں معتبر نہیں۔ نبی کریم ﷺ کا یہ فرمانا کہ ہمیں اپنا دعا میں شریک رکھنا اس سے چند فوائد حاصل ہوئے:

(۱) " فیه اظهار الخضوع والمسكنة فی مقام العبودیة بالتماس الدعاء ممن عرف له الهدایة "

نبی کریم ﷺ نے مقام عبودیت میں اپنے عجز اور اپنی مسکینی کا اظہار فرمایا کہ آپ اس شخص سے دعا کرنا کا التماس کر رہے ہیں کہ جس کے متعلق آپ کو معلوم ہے کہ وہ ہدایت کے اعلیٰ منصب پر قائم ہیں۔

(۲) " وحث للامة علی المرغبة فی دعاء الصالحین واهل العبادة "

اور آپ نے اپنی امت کو اس پر برانگیختہ کیا کہ وہ نیک اور عبادت گزار لوگوں سے دعا کرانے میں رغبت رکھیں۔

(۳) " وتنبیه لهم علی ان لا یخصوا انفسهم بالدعاء ولا یشارکوا فیه اقاربهم واحیاء هم لا سیما فی مظان الاجابة "

اور اس پر متنبہ فرمایا کہ دعا کرتے وقت صرف اپنے لئے دعا نہ کرو اور ایسی دعا نہ کرو جس میں اپنے رشتہ داروں اور اپنے احباب کو شریک نہ کرو خاص کر کے اس دعا میں جس کی قبولیت کی قوی امید ہو۔یعنی دعا کرتے وقت اپنے ساتھ اپنے رشتہ داروں اور اپنے احباب اور تمام مسلمانوں کو شریک کرے۔

(۴) " وتفخیم لشان عمر " اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی شان بیان کی گئی ہے کہ آپ کی دعا کی قبولیت کی قوی امید پائی گئی ہے۔ " ولا تنسنا " (اور ہمیں بھلائیں نہیں) یہ الفاظ تاکید پر دلالت کر رہے ہیں کہ عمرہ کرتے ہوئے تمام احوال میں ہمیں یاد رکھنا ہمیں نہ بھلانا۔

" فقال کلمة ما یسرنی ان لی بها الدنیا " ان الفاظ مبارکہ میں " قال " کا فاعل " عمر " ہیں اور " کلمة " مفعول ہے فعل محذوف کا یعنی " تکلم النبی ﷺ کلمة "۔" ما " نافیه ہے اور " بها " میں باء بدلیت کے لئے ہے۔اب عبارت کا مطلب یہ ہوگا:

"قال عمر تکلم النبی ﷺ کلمة لا یعجبنی ولا یفرحنی کون جمیع الدنیا لی بدلها "

کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ نبی کریم ﷺ نے ایسا کلمہ ارشاد فرمایا کہ تمام دنیا اگر اس کے بدلہ میں مجھے مل جائے تو تمام دنیا کا مال و دولت مجھے اتنا خوش نہیں کر سکتا جتنا اس ایک کلمہ نے مجھے خوش کیا (خیال ہے راقم نے ان الفاظ کا ترجمہ اوپر مرادی ذکر کیا ہے لفظوں کے مطابق تفصیلی ترجمہ یہی ہے جو ذکر کر دیا گیا۔

☆ " وعن ابی هریرة قال قال رسول الله ﷺ ثلاثة لا ترد دعوتهم الصائم حین یفطر والامام العادل ودعوة المظلوم یرفعها الله فوق الغمام وتفتح لها ابواب السماء ویقول الرب وعزتی لا نصرنک ولو بعد حین " (رواه الترمذی، مشکوة کتاب الدعوات)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تین شخصوں کی دعا کو رد نہیں

کیا جاتا روزہ دار جب افطار کے وقت دعا کرے اور عادل امام جب دعا کرے اور مظلوم کی دعا کو اللہ تعالیٰ بادلوں سے اوپر اٹھالیتا ہے اور اس کے لئے آسمانوں کے دروازے کھول دیئے جاتے ہیں اور رب تعالیٰ کہتا ہے مجھے میری عزت کی قسم میں تمہاری ضرور بر ضرور امداد کروں گا اگر چہ کچھ وقت کے بعد۔

وضاحت حدیث : تین اشخاص کا جو ذکر کیا گیا ہے ان میں دعا کی قبولیت کو منحصر نہیں کیا بلکہ بعد میں آنے والی احادیث میں اور اشخاص کا بھی ذکر ہے یہ قید اتفاقی ہے " **لا ترد دعوتهم** " (ان کی دعا کو رد نہیں کیا جاتا) اس سے یہ واضح ہوا کہ دعا کی جلدی قبولیت دعا کرنے والے کی نیکی سے ہوتی ہے یا دعا میں خلوص اور عجز وانکساری پائے جائیں۔ چونکہ روزہ دار بھی صرف اللہ تعالیٰ کی رضاء کے لئے روزہ رکھتا ہے۔ اس کی عبادت میں خلوص پایا جاتا ہے اس لئے اس عبادت کی تکمیل کے وقت اس کی دعا کو قبول کیا جاتا ہے۔

" **والامام العادل اذ عدل ساعة منه خير من عبادة ستين ساعة كما فى حديث** "

عادل حاکم کی دعا کو اس لئے قبول کیا جاتا ہے کہ اس کا ایک گھڑی عدل کرنا ساٹھ سال کی عبادت سے بہتر ہے اسی طرح حدیث پاک میں مذکور ہے۔ مظلوم کی دعا کو اس لئے قبول کیا جاتا ہے کہ ظلم کی آگ اس کی انتڑیوں کو جلا دیتی ہے وہ نہایت عاجزی اور انکساری سے رب تعالیٰ کے حضور دعا کرتا ہے اس لئے اس کی دعا کی قبولیت کا بڑا وثوق دلایا جاتا ہے رب تعالیٰ فرماتا ہے:

" **وعزتي لا نصرنك ولو بعد حين** " مجھے اپنے عزت کی قسم میں تمہاری ضرور امداد کروں گا اگر چہ کچھ وقت کے بعد۔ گویا کہ رب تعالیٰ کی طرف سے کہا جاتا ہے کہ تمہارا حق ضائع نہیں کیا جائے گا تمہاری دعا کو رد نہیں کیا جائے گا اگر چہ کچھ وقت بھی گزر گیا کیونکہ میں حلیم ہوں میں اپنے بندوں کو جلدی سزا نہیں دیتا ہو سکتا ہے کہ وہ ظلم سے باز آجائے تائب ہو جائے اسی سے پتہ چلا " **انه تعالىٰ يمهل الظالم ولا يهمله** " بیشک اللہ تعالیٰ ظالم کو مہلت تو دیتا ہے لیکن ظالم کو چھوڑتا نہیں اسی پر رب تعالیٰ کا ارشاد گرامی دلالت کر رہا ہے۔

﴿ وَلَا تَحْسَبَنَّ اللّٰهَ غَافِلًا عَمَّا يَعْمَلُ الظّٰلِمُوْنَ ﴾

"اور ہرگز گمان نہ کرو کہ اللہ غافل ہے اس سے جو ظالم عمل کرتے ہیں"۔

یعنی رب تعالیٰ ظالموں کے ظلم سے غافل نہیں بلکہ ان کو انجام تک پہنچاتا ہے رب تعالیٰ کے دربار میں دیر ہے اندھیر نہیں۔ (از مرقاۃ)

☆ " وعن ابی هريرة قال قال رسول الله ﷺ ثلاث دعوات مستجابات لا شک فیهن دعوة الوالد ودعوة المسافر ودعوة المظلوم "

(رواہ الترمذی وابوداؤد وابن ماجه، مشکوۃ کتاب الدعوات)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تین دعاؤں کو قبول کیا جاتا ہے جن کی قبولیت میں کوئی شک نہیں والد کی دعا اور مسافر کی دعا اور مظلوم کی دعا۔

وضاحت حدیث: ان تین دعاؤں کی قبولیت کی وجہ بھی یہ ہے " لا لتجاء هؤلاء الثلاثة الی الله تعالیٰ بصدق الطلب ورقة القلب وانكسار الخاطر " کہ یہ لوگ بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سچی طلب اور رقتِ قلب (دل کی نرمی) اور شکستہ دل سے التجاء کرتے ہیں لہٰذا ان کی دعائیں ان کے عجز اور خلوص کی وجہ سے قبول کی جاتی ہیں۔ والد اپنی اولاد کے حق میں دعا کرے یا اولاد کے خلاف دعا کرے اللہ تعالیٰ اسے قبول فرماتا ہے والد کا ذکر حدیث پاک میں کیا گیا ہے والدہ کا ذکر نہیں کیا گیا اسکی وجہ یہ ہے کہ اکثر مقامات میں قرآن پاک اور حدیث پاک میں مذکر کے صیغے استعمال ہیں۔ ان میں بالتبع مؤنث کا ذکر بھی پایا جاتا ہے دوسری وجہ یہ ہے " ان حقها اکثر فدعاؤها اولی بالاجابة " کہ بیشک ماں کا حق زیادہ ہے اس لئے اس کی دعا میں شرف قبولیت بھی زیادہ ہے اس مسئلہ کو واضح ہونے کی وجہ سے ذکر نہیں کیا گیا۔ تاہم راقم کے نزدیک پہلی وجہ زیادہ قوی ہے۔ مسافر کی دعا کی قبولیت کی وجہ یہ ہے کہ مسافر رقتِ قلب سے دعا کرتا ہے خواہ کسی کے حق میں دعا کرے کہ اس پر کسی نے مہربانی کی ہو یا وہ کسی کے خلاف دعا کرے کہ اس پر کسی نے ظلم کیا ہے یا اسے کسی نے ستایا ہے۔ (از مرقاۃ)

☆ " وعن ابن عباس عن النبی ﷺ قال خمس دعوات يستجاب لهن دعوة المظلوم حتى ينتصر ودعوة الحاج حتى يصدر ودعوة المجاهد حتى يقعد ودعوة المريض حتى يبرأ ودعوة الاخ لاخيه بظهر الغيب ثم قال واسرع هذه الدعوات اجابة دعوة الاخ بظهر الغيب "

(رواہ البیهقی فی الدعوات الکبیر، مشکوۃ کتاب الدعوات)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں نبی کریم ﷺ نے فرمایا پانچ دعائیں قبول کی جاتی ہیں مظلوم کی دعا یہاں تک کہ وہ اپنی امداد خود کرلے۔ حاجی کی دعا یہاں تک کہ وہ لوٹ آئے اور مجاہد کی دعا یہاں تک کہ وہ (جہاد سے ہٹ کر) بیٹھ جائے۔ اور مریض کی دعا یہاں تک کہ وہ صحت یاب ہو جائے اور بھائی کی اپنے (مؤمن) بھائی کے لئے دعا اس کی غیر موجودگی میں کی جائے۔

وضاحت حدیث : مظلوم کی دعا جلدی قبول ہوتی ہے بشرطیکہ مظلوم ظالم سے انتقام نہ لے اگر اس نے زبان سے یا ہاتھ سے انتقام لے لیا تو اس نے اپنا حق حاصل کرلیا اب دعا کی قبولیت کا وہ مقام نہ رہا جو مظلومیت کے حال میں تھا۔ یہ بھی خیال رہے کہ اگر مظلوم نے اپنے سے زیادہ زیادتی کر لی تو اب یہ ظالم ہو گیا اور ظالم مظلوم ہو گیا اس لئے جتنی اس سے زیادتی کی گئی اس سے بڑھ کر انتقام لینا جائز نہیں۔ حاجی کی دعائیں دوران حج جلدی قبول ہوتی ہیں جب وہ اپنے گھر اور اپنے اہل وعیال میں لوٹ کر آجائے تو وہ مقام مقبولیت اسے حاصل نہیں رہتا جو اسے حج کے دوران حاصل تھا۔

مجاہد جب تک جہاد میں شریک ہوتا ہے اسوقت تک اسکی دعا میں جو قبولیت ہوتی ہے وہ جہاد سے فارغ ہونے کے بعد نہیں ہوتی۔ مریض کی دعا اسکی مرض میں جو شرف قبولیت حاصل کرتی ہے وہ مرض سے صحت یاب ہونے کے بعد نہیں۔ جب کوئی مومن شخص اپنے مومن بھائی کی غیر موجودگی میں اسکے حق میں دعا کرے تو وہ زیادہ جلدی قبول ہوتی ہے۔ کیونکہ اس میں خلوص نیت پائی جاتی ہے ریاء سے خالی ہوتی ہے اسی لئے مروی ہے " ان اللہ فی عون العبد ما دام العبد فی عون اخیہ المسلم " بیشک اللہ تعالیٰ بندے کا معاون ہوتا ہے جب تک وہ اپنے مسلمان بھائی کی امداد کرتا ہے۔ (از مرقاۃ)

☆ " وعن انس قال ان رسول اللہ ﷺ یرفع یدیہ فی الدعاء حتی یری بیاض ابطیہ "

☆ " وعن سہل بن سعد عن النبی ﷺ قال کان یحمل اصبعیہ حذاء منکبیہ ویدعو "

☆ " وعن السائب بن یزید عن ابیہ ان النبی ﷺ کان اذا دعا رفع یدیہ مسح وجہہ بیدیہ "

(رواہ البیہقی الاحادیث الثلاثۃ فی الدعوات الکبیر ، مشکوۃ)

مندرجہ بالا تین حدیثیں بیہقی نے دعوات کبیر میں ذکر فرمائی ہیں۔ پہلی حدیث حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے رسول اللہ ﷺ دعا میں اپنے ہاتھ اٹھاتے تھے یہاں تک کہ آپ کی بغلوں کی سفیدی نظر آتی۔ عام طور پر دعا کرتے وقت سینے کے برابر رہنے چاہئیں لیکن جواز ثابت کرنے کے لئے آپ نے کبھی کبھی ہاتھ زیادہ بلند بھی کئے ہیں۔ یا یہ بھی ممکن ہے کہ اس حدیث میں استسقاء کے وقت دعا

کرنے کا ذکر ہو۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ اس حدیث میں مصیبت کے وقت دعا کرتے ہوئے زیادہ بلند کرنے کا ذکر ہو۔

دوسری حدیث میں حضرت سہل بن سعد رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ دعا کرتے وقت اپنی انگلیوں کو کندھوں کے برابر کرتے۔ اس حدیث پاک میں یا تو یہی ذکر ہے کہ آپ دعا میں جب ہاتھ اٹھاتے تو ہتھیلیاں سینہ کے برابر ہوتیں اور انگلیاں کندوں کے برابر ہوتیں۔ اور یا یہ مطلب ہے " وهي حالة المبالغة والالحاح في الدعاء والمسئلة " کہ آپ دعا جب زیادہ گڑگڑا کر کرتے اور اہم سوال کرتے اور بار بار عاجزی سے دعا کرتے تو ہاتھ زیادہ بلند کر کے اٹھاتے۔ تیسری حدیث سائب بن یزید اپنے باپ سے روایت کرتے ہیں کہ بیشک نبی کریم ﷺ اپنے ہاتھوں کو اٹھاتے تو پھر اپنے دونوں ہاتھ اپنے چہرے پر پھیر لیتے۔

☆ " عن عكرمة عن ابن عباس قال المسئلة ان ترفع يديك حذو منكبيك او نحوهما والاستغفار ان تشير باصبع واحد والابتهال ان تمد يديك جميعا وفي رواية قال والابتهال هكذا ورفع يديه وجعل ظهورها مما يلي وجهه "

(رواه ابو داؤد، مشكوة كتاب الدعوات)

حضرت عکرمہ حضرت ابن عباس (رضی اللہ عنہم) سے روایت کرتے ہیں سوال یہ ہے (دعا کے آداب میں سے یہ ہے) کہ تم اپنے ہاتھ کندھے تک یا اس کے قریب اٹھاؤ۔ اور استغفار کے وقت ایک انگلی سے اشارہ کرو اور زیادہ عجز کے وقت اپنے ہاتھوں کو اٹھاؤ اور ان کی پیٹھ اپنے چہرہ کی طرف کرو۔

وضاحت حدیث : حدیث شریف میں " المسئلة " سے مراد سوال اور دعا ہے یعنی دعا کرتے وقت ہاتھوں کی انگلیاں کندھے کے برابر رہیں اور ہتھیلیاں سینہ کے برابر رہیں۔ اور استغفار کے وقت ایک انگلی سے اشارہ کرے یعنی " ادب الاستغفار الاشارة بالسبابة سبها للنفس الامارة والشيطان والتعوذ منهما " استغفار کے آداب میں سے ایک یہ ہے کہ اپنی سبابہ (شہادت کی انگلی) سے اشارہ کرنا مقصد اس میں شیطان اور نفس امارہ کو گالیاں دینا ہوگا اور ان دونوں سے پناہ پکڑنا ہوگا۔ اور یہ بھی خیال رہے کہ استغفار کرتے وقت ایک انگلی سے اشارہ کرے دو انگلیوں سے اشارہ نہ کرے۔

" لما روى انه عليه الصلوة والسلام رأى رجلا يشير بهما فقال له احد احد "

کیونکہ مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ایک شخص کو دیکھا جو دو انگلیوں سے اشارہ کر رہا ہے تو آپ نے فرمایا ایک انگلی سے اشارہ کرو ایک انگلی سے اشارہ کرو۔

" والابتهال ای التضرع والمبالغة فی الدعاء فی دفع المکروہ عن النفس "

ابتہال کا معنی یہ ہے کہ عاجزی کرے اور اپنے نفس سے مصیبت کے دور کرنے میں مبالغہ سے دعا کرے۔ یعنی مصیبت کے دور کرنے میں دعا کرتے وقت بہتر یہ ہے کہ ہاتھ بہت زیادہ بلند کرے اور ایک روایت میں یہ ہے " وجعل ظهورهما مما یلی وجهه " اس عبارت کے دو مطلب ہیں کہ ہاتھ بہت زیادہ بلند کرے سر کے برابر کردے تاکہ اسکے ہاتھوں کی پیٹھ اسکے چہرہ کے برابر ہو جائے اور دوسرا مطلب یہ ہے کہ الٹے ہاتھوں سے دعا کرے دونوں وجوہ شارحین کے اقوال سے ملتی ہیں۔

☆ " عن ابی هریرة قال قال رسول الله ﷺ ان الله عزوجل لیرفع الدرجة للعبد الصالح فی الجنة فیقول یا رب انی لی هذه فیقول باستغفار ولدک "

(رواہ احمد ، مشکوۃ کتاب الاستغفار والتوبة)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا بیشک اللہ تعالیٰ جنت میں ایک نیک بندے کے درجات کو بلند فرمائے گا تو وہ کہے گا اے میرے رب مجھے یہ درجات کہاں سے مل گئے؟ تو رب تعالیٰ فرمائے گا تیری اولاد کی استغفار کی وجہ سے۔ اس حدیث سے واضح ہوا کہ اولاد کی استغفار اور والدین کے حق میں دعا سے والدین کے مدارج بلند ہوتے ہیں۔

☆ " وعن عبد الله بن عباس قال قال رسول الله ﷺ المیت فی القبر الا کالغریق المتغوث ینتظر دعوة تلحقه من اب او ام او اخ او صدیق فاذا لحقه کان احب الیه من الدنیا وما فیها وان الله تعالیٰ لیدخل علی اهل القبور من دعاء اهل الارض امثال الجبال وان هدیة الاحیاء الی الاموات الاستغفار لهم "

(رواہ البیهقی فی شعب الایمان مشکوۃ باب الاستغفار والتوبة)

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا قبر میں کوئی میت نہیں مگر یہ کہ غرق ہونے والے فریاد طلب کرنے والے کی طرح ہوتا ہے۔ وہ دعا کی انتظار میں ہوتا ہے کہ اسے دعا ملے اس کے باپ یا ماں یا بھائی یا دوست کی طرف سے جب اسے وہ دعا لاحق ہوتی ہے تو دنیا اور دنیا کی تمام چیزوں سے اسے وہ زیادہ محبوب ہوتی ہے بیشک اللہ تعالیٰ قبروں والوں کے پاس

زمین والوں کی دعا سے پہاڑوں کی طرح ثواب داخل کرتا ہے۔اور بیشک زندہ لوگوں کی طرف سے مردوں کے لئے ہدیہ یہ ہے کہ ان کے لئے بخشش طلب کریں۔

وضاحت حدیث : کالغریق ،غرق ہونے کے قریب یعنی ڈوب رہا ہو " المتغوث " فریاد طلب کرنے والا امداد طلب کرنے والا ، پناہ پکڑنے والا ، بلند آواز سے قرب وجوار کے لوگوں کو پکارنے والا کہ کوئی اسے آ کر بچائے۔

حدیث پاک کا مفہوم واضح ہے کہ قبر میں میت ڈوبنے والے کی طرح فریاد کر رہا ہوتا ہے امداد کرنے کی درخواست کر رہا ہوتا ہے " **کالغریق یتعلق بکل حشیش** " جیسا کہ ڈوبنے والا ہر تنکے کا سہارا لیتا ہے۔جس طرح ڈوبنے والا اس انتظار میں ہوتا ہے کہ کوئی شخص کنارے پر ہو یا میری آواز سن رہا ہو تو وہ میری امداد کرے اسی طرح قبر والا شخص اس انتظار میں ہوتا ہے کہ اس کا باپ یا ماں یا بھائی یا اولاد اور دوست احباب اس کے لئے مغفرت کی دعا کریں۔قبر والے شخص کو دنیا اور دنیا کی تمام چیزوں سے زیادہ پسندیدہ پیچھے رہنے والوں کی دعا ہے۔

پیچھے رہنے والوں کی دعا کی وجہ سے اس کے اعمال میں ترقی ہوتی رہتی ہے یہی وجہ ہے کہ جب پیچھے رہنے والے اس کے لئے زیادہ سے زیادہ دعا کریں گے تو اسے پہاڑوں جتنا ثواب جب حاصل ہوگا تو وہ تعجب سے رب تعالیٰ سے سوال کرے گا کہ یہ ثواب مجھے کہاں سے حاصل ہو گیا میرے اعمال تو اس قابل نہیں تو اسے بتایا جائے گا کہ یہ وہ ہدیہ ہے جو زندہ لوگوں کی طرف سے مردہ حضرات کی بخشش طلب کی گئی۔

فَلْيَسْتَجِيبُوا لِي : ''تو چاہیے کہ وہ میرا حکم مانیں''

اس کا ایک معنی مجاہد وغیرہ نے یہ بیان کیا ہے:

" فلیجیبوا الی فیما دعوتھم الیہ من الایمان ای الطاعۃ والعمل "

کہ میں ان کو ایمان کی دعوت دیتا ہوں اسے قبول کریں اس کی فرمانبرداری کریں اور اس پر عمل کریں " **اجاب واستجاب بمعنی** " اجاب اور استجاب ایک ہی معنی میں استعمال ہوتے ہیں۔

اعلیٰ حضرت و پیر محمد کرم شاہ رحمھما اللہ نے اسی کے مطابق ترجمہ کیا ہے۔لیکن ابو رجاء خراسانی رحمہ

اللہ نے یہ ترجمہ کیا ہے " فلیدعوالی " وہ مجھ سے ہی دعا کریں۔ اور ابن عطیہ نے یہ ترجمہ کیا ہے "فلیطلبوا ان اجیبھم " وہ مجھ سے طلب کریں کہ میں ان کی دعا کو قبول کروں ان دونوں قولوں کے مطابق ترجمہ یہ ہوگا تو چاہئے کہ وہ مجھ سے قبولیت طلب کریں (طلباء کرام یہ ترجمہ بھی یاد کرلیں) راقم کا یہی ترجمہ ہے) اس صورت میں سین اور تاء طلب کیلئے ہیں پہلی صورت سین زائد ہے اور لام امر کا لام ہے۔ (قرطبی)

وَلْيُؤْمِنُوا بِي : "اور مجھ پر ایمان لائیں" ﴿فَلْيَسْتَجِيبُوا لِي وَلْيُؤْمِنُوا بِي﴾ ان دونوں جملوں کا ماقبل سے ربط یہ ہے کہ گویا کہ اللہ تعالیٰ یہ ارشاد فرماتا ہے:

" انا اجیب دعاءک مع انی غنی عنک مطلقا فکن انت ایضا مجیبا لدعائی مع انک محتاج الی من کل الوجوہ فما اعظم ھذا الکرم "

کہ میں تمہاری دعا کو قبول کرتا ہوں باوجود اس کے کہ میں تم سے مطلقاً غنی ہوں تم بھی میرے حکم کو مانو اور دعا کرو باوجود اس کے تم ہر طرح میرے محتاج ہو رب تعالیٰ کا یہ کہنا بہت عظیم کرم ہے۔ اور اس میں عجیب نکتہ یہ پایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے یہ نہیں فرمایا" اجب دعائی حتی اجیب دعاءک " (تم میرا حکم مانو تو میں تمہاری دعا کو قبول کروں گا):

" وھذا تنبیہ علی ان اجابۃ اللہ عبدہ فضل منہ ابتداء وانہ غیر معلل بطاعۃ العبد "

یہاں یہ واضح کردیا گیا کہ اللہ تعالیٰ کا دعا کو قبول کرنا اس سے ابتدائی طور پر فضل ہے اس قبولیت کی دارومدار بندے کی طاعت پر موقوف نہیں بلکہ رب تعالیٰ اپنے فضل سے بعض اوقات بندے کی طاعت میں مشغولیت سے پہلے ہی دعا قبول فرمالیتا ہے۔

تنبیہ : اجابۃ کی نسبت بندے کی طرف بھی ہے اور اللہ تعالیٰ کی طرف بھی ہے لیکن " الاجابۃ من العبد للہ الطاعۃ و اجابۃ اللہ لعبدہ اعطاؤہ ایاہ مطلوبہ " جب نسبت بندے کی طرف ہوگی تو معنی ہوگا" طاعت" یعنی بندہ اللہ تعالیٰ کے حکم کو مانتا ہے اور جب نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف کی جائے تو معنی ہوگا" قبول کرنا" یعنی اللہ تعالیٰ اپنے بندے کی دعا کو قبول کر کے اس کا مطلوب اسے ادا کرے گا۔

اعتراض : اگر ﴿فَلْيَسْتَجِيبُوا لِي﴾ میں " استجابۃ " کو بمعنی" اجابۃ " لیا جائے تو "اجابۃ " کا معنی کیا جائے گا؟ اگر معنی یہ ہو کہ دل اور زبان سے میرا حکم ہونا" فذاک ھو الایمان " تو

یہ عین ایمان ہے۔ تو اس صورت میں ﴿فَلْيَسْتَجِيبُوا لِي وَلْيُؤْمِنُوا بِي﴾ میں تکرار محض ہوگا۔ اگر "اجابة" کا معنیٰ "طاعت" لیا جائے تو معاملہ الٹ ہو جائے گا کیونکہ ایمان پہلے ہے اور طاعت بعد میں یہاں طاعت پہلے ہو جائے گی اور ایمان بعد میں۔

جواب: استجابة کا معنیٰ ہے اطاعت و فرمانبرداری اور ایمان دل کی صفت ہے۔ اگرچہ یہ بات درست ہے کہ اصل ایمان پہلے ہے اور طاعت بعد میں لیکن مراد تو کمال ایمان اور نور ایمان ہے:

" فهذا يدل على ان العبد لا يصل الى نور الايمان وقوته الا بتقدم الطاعات والعبادات "

تو یہ اس پر دلالت کرتا ہے کہ بندہ نور ایمان اور قوت ایمان تک اس وقت تک نہیں پہنچ سکتا جب تک طاعات اور عبادت کو مقدم نہ کیا جائے گویا کہ حکم یوں ہو گیا کہ میرے بندوں کو چاہئے کہ وہ میری فرمانبرداری کریں میرا حکم مانیں اور کامل ایمان مجھ پر ہی رکھیں اور میرے احکام مان کر نور ایمان حاصل کریں۔ (از کبیر)

لَعَلَّهُمْ يَرْشُدُونَ : "تا کہ وہ ہدایت پا جائیں" رشد مقابل ہے غی کے ہدایت کے معنی میں استعمال ہوتا ہے جیسا اسی آیۃ میں استعمال ہے اسی طرح " فان آنستم منهم رشدا " میں بھی تقریباً اسی معنی میں استعمال ہے۔ یہ خیال رہے کہ " رشد " (بفتح الراء والشين) خاص ہے بنسبت "رشد" (بضم الراء وسكون الشين) کے اس لئے کہ " رشد " (بضم الراء) استعمال ہوتا ہے امور دنیوی اور اخروی دونوں میں اور رشد (بفتح الراء) کا استعمال صرف امور اخروی میں ہے راشد اور رشید دونوں ہی ہدایت پر چلنے کے معنی میں استعمال ہیں جیسا کہ اللہ تعالیٰ کے ارشاد گرامی ﴿أُولَٰئِكَ هُمُ الرَّاشِدُونَ﴾ اور " وما امر فرعون برشيد " سے واضح ہو رہا ہے۔
(از مفردات راغب)

" ومعنى الآية انهم اذا استجابوا لي وآمنوا بي اهتدوا لمصالح دينهم ودنياهم "

آیۃ کریمہ کا معنیٰ یہ ہے کہ بیشک میرے بندے جب میرے احکام مانیں گے یا مجھ سے ہی دعا کی قبولیت کی درخواست کریں گے اور مجھ پر ایمان لائیں تو ان کو دینی اور دنیاوی مصلحتوں کی ہدایت حاصل ہو جائے گی اس لئے کہ رشد کا معنیٰ ہی ہدایت ہے۔ (کبیر)

☆☆☆☆☆

﴿ اُحِلَّ لَكُمْ لَيْلَةَ الصِّيَامِ الرَّفَثُ اِلٰى نِسَآئِكُمْ هُنَّ لِبَاسٌ لَّكُمْ وَاَنْتُمْ لِبَاسٌ لَّهُنَّ عَلِمَ اللّٰهُ اَنَّكُمْ كُنْتُمْ تَخْتَانُوْنَ اَنْفُسَكُمْ فَتَابَ عَلَيْكُمْ وَعَفَا عَنْكُمْ فَالْئٰنَ بَاشِرُوْهُنَّ وَابْتَغُوْا مَا كَتَبَ اللّٰهُ لَكُمْ وَكُلُوْا وَاشْرَبُوْا حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَكُمُ الْخَيْطُ الْاَبْيَضُ مِنَ الْخَيْطِ الْاَسْوَدِ مِنَ الْفَجْرِ ثُمَّ اَتِمُّوا الصِّيَامَ اِلَى الَّيْلِ وَلَا تُبَاشِرُوْهُنَّ وَاَنْتُمْ عَاكِفُوْنَ فِي الْمَسَاجِدِ تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ فَلَا تَقْرَبُوْهَا كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ اٰيٰتِهٖ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَّقُوْنَ ﴾

۱) ''روزوں کی راتوں میں اپنی عورتوں کے پاس جانا تمہارے لئے حلال ہوا وہ تمہاری لباس ہیں اور تم ان کے لباس اللہ نے جانا کہ تم اپنی جانوں کو خیانت میں ڈالتے تھے تو اس نے تمہاری توبہ قبول کی اور تمہیں معاف فرمایا تو اب ان سے صحبت کرو اور طلب کرو جو اللہ نے تمہارے نصیب میں لکھا ہو اور کھاؤ اور پیو یہاں تک کہ تمہارے لئے ظاہر ہو جائے سفیدی کا ڈورا سیاہی کے ڈورے سے پوپھٹکر پھر رات آنے تک روزے پورے کرو اور عورتوں کو ہاتھ نہ لگاؤ جب تم مسجدوں میں اعتکاف سے ہو یہ اللہ کی حدیں ہیں ان کے پاس نہ جاؤ اللہ یوں ہی بیان کرتا ہے لوگوں سے اپنی آیتیں کہ کہیں انہیں پرہیز گاری ملے''۔

۲) ''حلال کیا گیا ہے تمہارے لئے روزوں کی راتوں میں تمہارا اپنی عورتوں کے پاس جانا وہ لباس ہیں تمہارا اور تم لباس ہو ان کا اللہ کو معلوم ہے بیشک تم خیانت میں ڈالتے ہو اپنے نفسوں کو تو اس نے تمہاری توبہ قبول فرمائی اور تمہیں معاف کیا تو اب ان سے صحبت کرو اور طلب کرو جو

لکھا ہے اللہ نے تمہارے لئے اور کھاؤ اور پیو یہاں تک کہ ظاہر ہو جائے تمہارے لئے دھاگہ سفید دھاگے سیاہ سے یعنی فجر سے پھر پورا کرو تم روزوں کو رات تک اور ہاتھ نہ لگاؤ ان (عورتوں) کو ایسے حال میں کہ جب تم اعتکاف میں ہو مساجد میں یہ اللہ کی حدیں ہیں تو نہ قریب جاؤ ان کے اسی طرح بیان کرتا ہے اللہ اپنی نشانیاں لوگوں کے لئے تا کہ وہ پرہیز گار ہو جائیں"۔

شان نزول : چند واقعات کے درپیش آنے کے بعد اس آیۃ کریمہ کا نزول ہوا وہ تمام واقعات مجموعی طور پر اس آیت کے نزول کا سبب ہیں اور " اُحِلَّ لَکُمْ " کے الفاظ بھی اس پر دلالت کر رہے ہیں کہ جو کام پہلے حرام تھا اسے حلال کر دیا گیا:

☆ " روی ابو داؤد عن ابن ابی لیلی قال وحدثنا اصحابنا قال و کان الرجل اذا فطر فنام قبل ان یأکل لم یأکل حتی یصبح قال فجاء عمر فاراد امرأته فقالت انی قد نمت فظن انها تعتل فاتاها ، فجاء رجل من الانصار فاراد طعاما فقالوا حتی نسخن لک شیأ فنام فلما اصبحوا انزلت هذه الآیة "

ایک وجہ شان نزول کی ابوداود نے ابولیلی سے روایت جو ذکر کی ہے اس میں ہے کہ جب کوئی شخص افطار کرتا تو کھانے سے پہلے اگر سو جاتا تو پھر وہ صبح تک کھا نہیں سکتا تھا (یہی حکم جماع کا بھی تھا) حضرت عمر رضی اللہ عنہ گھر تشریف لائے تو اپنی زوجہ سے جماع کا ارادہ فرمایا تو آپ کی زوجہ نے کہا بیشک میں تو سو گئی تھی آپ نے خیال کیا کہ یہ ویسے ہی حیلہ و بہانہ کر رہی ہے آپ اس کے پاس آ گئے یعنی آپ نے اس سے جماع کر لیا۔ اسی طرح ایک اور وجہ یہ ہے کہ ایک شخص انصاری نے طعام کا ارادہ کیا تو گھر والوں نے کہا ہم تمہارے لئے کوئی چیز (کھانے کی) گرم کرتے ہیں تو اتنی دیر میں وہ سو گئے جب صبح ہوئی تو یہ آیۃ کریمہ نازل ہوئی۔

☆ " وروی البخاری عن البراء قال کان اصحاب محمد ﷺ اذا کان الرجل صائما فحضر الافطار فنام قبل ان یفطر لم یاکل لیلته ولا یومه حتی یمسی وان قیس بن صرمة الانصاری کان صائما ، وفی روایة کان یعمل فی النخیل بالنهار و کان صائما فلما حضر الافطار اتی امراته فقال لها اعندک طعام ؟ قالت لا ولکن انطلق فاطلب لک

وکان یومه یعمل فغلبته عیناه فجاء ته امرأته فلما رأته قالت خیبة لک فلما انتصف النهار غشی علیه فذکر ذلک للنبی ﷺ فنزلت هذه الآیة (احل لکم لیلة الصیام الرفث الی نسائکم) ففرحوا فرحا شدیدا ونزلت وکلوا واشربوا حتی یتبین لکم الخیط الابیض من الخیط الاسود من الفجر "

بخاری نے حضرت براء رضی اللہ عنہ سے روایت ذکر کی کہ نبی کریم ﷺ کا جو صحابی بھی روزہ رکھتا تو جب روزہ کے افطار کا وقت ہوتا تو اگر وہ افطار سے پہلے سو جاتا تو رات اور دن کو وہ کچھ نہ کھا سکتا بلکہ پھر شام ہونے پر افطار کرتا حضرت قیس بن صرمۃ انصاری روزہ دار تھے اور ایک روایت میں یہ ہے کہ وہ دن کو کھجوروں کے باغ میں کام کرتے اور روزہ دار تھے جب افطار کا وقت ہوا تو آپ اپنی زوجہ کے پاس آئے ان سے پوچھا کیا تمہارے پاس کوئی کھانے کی چیز ہے؟ انہوں نے کہا پاس تو کچھ نہیں البتہ (گھر) چل کر دیکھتی ہوں کہ تمہارے لئے کوئی چیز مل جائے چونکہ وہ دن کو کام کرتے تھے اس لئے ان کی آنکھوں پر نیند کا غلبہ ہو گیا تو آپ کے پاس جب آپ کی عورت آئی (اور کھانے کی کوئی چیز لائی) تو اس نے کہا تم تو محروم ہو چکے ہو (تو انہوں نے کچھ نہ کھایا) جب نصف دن گزرا تو ان پر بیہوشی طاری ہو گئی تو یہ نبی کریم ﷺ کے سامنے ذکر کیا گیا اس وقت یہ آیۃ کریمہ نازل ہوئی یعنی ﴿ اُحِلَّ لَكُمْ لَیْلَةَ الصِّیَامِ الرَّفَثُ اِلٰی نِسَآئِكُمْ ﴾ تک الفاظ مبارکہ نازل ہوئے تو صحابہ کرام بہت زیادہ خوش ہوئے اس کے بعد ﴿وَكُلُوْا وَاشْرَبُوْا ﴾ (الی) مِنَ الْفَجْرِ ﴾ الفاظ مبارکہ نازل ہوئے۔

☆ " وفی البخاری ایضا عن البراء قال لما نزل صوم رمضان کانوا لا یقربون النساء رمضان کله وکان رجلا یخونون انفسهم فانزل الله تعالیٰ ﴿ عَلِمَ اللّٰهُ اَنَّكُمْ كُنْتُمْ تَخْتَانُوْنَ اَنْفُسَكُمْ فَتَابَ عَلَیْكُمْ وَعَفَا عَنْكُمْ ﴾

بخاری شریف میں حضرت براء رضی اللہ عنہ سے مروی ہے جب رمضان کے روزں کا حکم نازل ہوا تو صحابہ کرام اپنی عورتوں کے قریب تمام رمضان میں نہیں جاتے تھے تاہم بعض حضرات نے اپنے نفسوں کو خیانت میں ڈال لیا تو یہ الفاظ مبارکہ نازل فرمائے ﴿ عَلِمَ اللّٰهُ اَنَّكُمْ كُنْتُمْ تَخْتَانُوْنَ اَنْفُسَكُمْ فَتَابَ عَلَیْكُمْ وَعَفَا عَنْكُم ﴾ (خیانت کا ذکر انشاء اللہ بعد میں آئے گا)

☆ " وذکر الطبری ان عمر رضی الله تعالیٰ عنه رجع من عند النبی ﷺ وقد سمر

عنده لیلة فوجد امرأته قد نامت فارادها فقالت له قد نمت فقال لها مانمت فوقع بها وصنع کعب بن مالک مثله فغدا عمر علی النبی ﷺ فقال اعتذر الی اللہ والیک فان نفسی زینت لی فواقعت اهلی فهل تجد لی من رخصة فقال لی لم تکن حقیقا بذلک یا عمر فلما بلغ بیته ارسل الیه فأنبأ بعذره فی آیة من القران "

طبری نے ذکر کیا حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ایک رات نبی کریم ﷺ سے گفتگو فرماتے رہے جب گھر لوٹے تو آپ کی عورت سو کر اٹھی آپ نے اس کی طرف ارادہ فرمایا تو اس نے کہا کہ میں تو سو چکی تھی تو آپ نے اسے کہا تم نہیں سوئی تھی تو آپ نے جماع کر لیا۔ یہی صورت حضرت کعب بن مالک رضی اللہ عنہ سے بھی درپیش آ چکی تھی صبح حضرت عمر رضی اللہ عنہ نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے عرض کیا میں اپنا عذر اللہ تعالیٰ کے حضور اور آپ کے حضور پیش کر رہا ہوں بیشک میں نے اپنی زوجہ سے جماع کر لیا۔ تو آپ نے فرمایا اے عمر تمہیں حق نہیں تھا۔ جب آپ اپنے گھر پہنچے تو آپ کو خبر دی گئی کہ قرآن پاک کی آیۃ نازل ہوگئی جس میں تمہارے عذر کو قبول کر لیا گیا۔

اُحِلَّ لَكُمۡ لَيۡلَةَ الصِّيَامِ الرَّفَثُ اِلٰى نِسَآئِكُمۡ :

''حلال کیا گیا ہے تمہارے لئے روزوں کی راتوں میں تمہارا اپنی عورتوں کے پاس جانا'' '' الرفث '' سے مراد کنایۃً جماع ہے چونکہ اللہ تعالیٰ کریم ہے اس لئے وہ ارشاد کنایۃً فرمایا ہے اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ نے بھی کنایۃً ترجمہ کیا ہے ''عورتوں کے پاس جانا۔

زجاج نے کہا ہے کہ " الرفث " کا معنی عام ہے تمام ان مقاصد کو شامل ہے " ما یرید الرجل من امرأته " جو مرد اپنی عورت سے ارادہ کرتا ہے۔" وقال ابن عرفة ، الرفث ههنا الجماع " ابن عرفہ نے کہا ہے کہ " الرفث " کا معنی یہاں جماع ہے " وقیل الرفث اصله قول الفحش ،، بعض حضرات نے بیان کیا "الرفث " کا اصل میں معنی بری باتیں کرنا ہے" رفث " اور " ارفث " لفظ اس کے لئے استعمال ہوتے جو قبیح کلام کرے کسی شاعر نے ذکر کیا ہے:

رب اسراب حجیج کظم عن اللغا ورفث التکلم

کتنے ہی ریگستان پر چلنے والے حاجی (اپنی آپ کو) روک کر رکھتے ہیں لغو کاموں اور قبیح کلام

کرنے سے۔ (از قرطبی) لیکن خیال رہے کہ اس آیۃ کریمہ میں مراد جماع ہی ہے فحش کلامی یا عورتوں سے عشقیہ کلام کرنا مراد نہیں۔

دینی طلباء کرام توجہ فرمائیں: یہاں بظاہر اعتراض کہ " الرفث "کو " الی " سے متعدی کیا گیا ہے اور کہا گیا ہے ﴿ اَلرَّفَثُ اِلٰی نِسَآئِکُمْ ﴾ حالانکہ " الرفث "کو " الی " سے متعدی نہیں کیا جاتا یہ نہیں کہا جاتا " رفثت الی النساء " تو یہاں متعدی الی سے کرنا کیسے صحیح ہے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ یہاں قاعدہ تضمین جاری ہے کہ " الرفث "کو " الافضاء " کے معنی میں لیا گیا جو " الیٰ " سے متعدی ہوتا ہے جیسا کہ رب تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ وَقَدْ اَفْضٰی بَعْضُکُمْ اِلٰی بَعْضٍ ﴾ ''اور تحقیق بعض تمہارا بعض کی طرف پہنچا ہے''

یہاں بھی مراد عورتوں کی طرف جانا ہے لیکن پھر مراد ملابست یعنی مجامعت ہے۔ (از قرطبی)

عجیب نکتہ : الرفث کا اصل معنی قبیح کلام ہے پھر اس کا مجازی معنی عورتوں کی موجودگی میں ان سے عشقیہ کلام کرنا پھر مجازی معنی جماع کرنا اور جماع کے دواعی (جماع کے دعوت دینے والے) بوس و کنار، چھونا وغیرہ۔ اب بظاہر اس پر اعتراض یہ ہوتا ہے کہ ایسا لفظ جس کا حقیقی معنی فحش کلامی ہے اس سے کنایۃ جماع معنی کیوں لیا گیا جب کہ جماع کے لئے کنایۃ الفاظ مبارکہ قرآن پاک میں اور بھی استعمال ہیں جیسا کہ

" وَقَدْ اَفْضٰی بَعْضُکُمْ اِلٰی بَعْضٍ فَلَمَّا تَغَشّٰهَا / اولا مستم النساء / دخلتهم بهن / فاتوا حرثکم / من قبل ان تمسوهن ، فما استمتعتم به منهن ،ولا تقربوهن "

" جوابه السبب فيه استهجان ما وجد منهم قبل الاباحة كما سماه اختيانا لانفسهم "

اس کا جواب یہ ہے کہ چونکہ صحابہ کرام سے حکم کے مباح ہونے سے پہلے بھول واقع ہوتی رہی جس کو رب تعالیٰ نے خیانت سے تعبیر فرمایا تو اسی طرح جماع کے حلال ہونے کے لئے وہ لفظ ذکر فرمایا کہ جو قباحت پر دلالت کرتا ہے ضمناً اس طرف توجہ دلائی گئی اگرچہ تم سے خیانت واقع ہوئی جو حقیقت میں قباحت تھی لیکن اب اسے حلال کر دیا گیا ہے۔ (از کبیر)

اعتراض: ﴿لَيْلَةَ الصِّيَامِ﴾ میں " لیلة " واحد ذکر ہے حالانکہ مراد جمع ہے (روزوں کی راتوں میں عورتوں کے پاس جانا حلال کردیا گیا) تو " لیالی " کیوں نہیں ذکر کیا گیا۔

جواب: کئی مقام پر واحد کو جماعت کے لئے استعمال کرتے ہیں جیسا کہ العباس بن مرداس کے قول میں ہے " فقلنا اسلموا انا اخوکم " ہم نے کہا اسلام لے آؤ تو بیشک ہم تمہارے بھائی ہوں گے یہاں بھی "اخوانکم" کی جگہ " اخوکم " ذکر ہے۔ (کبیر)

هُنَّ لِبَاسٌ لَّكُمْ وَاَنْتُمْ لِبَاسٌ لَّهُنَّ: "وہ لباس ہیں تمہارا اور تم لباس ہو ان کا" عورتوں کو مردوں کا لباس اور مردوں کو عورتوں کا لباس قرار دینے میں چند وجوہ ہیں۔

ان میں سے ایک وجہ یہ ہے کہ لباس بمعنی تسکین کے ہے " هن سکن لکم وانتم سکن لهن " کہ وہ تمہارے لئے باعث تسکین ہیں اور تم ان کے لئے باعث تسکین ہو۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے جب نافع بن ارزق نے آیۃ کریمہ میں لباس کا معنی پوچھا تو آپ نے یہی معنی بیان فرمایا اور اس پر ذبیانی کا ایک شعر بطور دلیل پیش کیا:

اذا ما الضجیع ثنی عطفه ثنثت علیه فکانت لباسا

جب پاس لیٹنے والا اپنی کروٹ پھیرتا ہے تو میں اس کی طرف کروٹ پھیر دیتا ہوں جو ایک دوسرے کے لئے تسلی کا سبب بنتا ہے۔

اور وجہ تشبیہ یہ ہے کہ جب مرد اور عورت ایک دوسرے سے گلے ملتے ہیں تو ایک دوسرے پر اس طرح لپٹ جاتے ہیں جس طرح لباس لپٹا ہوتا ہے ربیع نے کہا " هن فراش لکم وانتم لحاف لهن " عورتیں تمہارا فراش (بچھونا) ہیں اور تم ان کا لحاف ہو۔

اور وجہ تشبیہ یہ ہے کہ ہر ایک زوجین میں سے دوسرے کے لئے پردہ بن جاتا ہے اور اس کو فجور سے روکتا ہے حدیث شریف میں آیا ہوا ہے " ومن تزوج فقد احرز ثلثی دینه " جس شخص نے شادی کرلی تحقیق اس نے اپنے دین کے دو تہائی حصہ کو بچالیا۔

اور وجہ تشبیہ یہ ہے کہ مرد عورت ایک دوسرے کا لباس اس لئے ہیں کہ انسان جس طرح لباس اپنے لئے مختص کرتا ہے اسی طرح زوج اپنی زوجہ کو اور زوجہ اپنے زوج کو اپنے لئے مختص کرتے ہیں۔

اور وجہ تشبیہ یہ ہے کہ جس طرح لباس پورے بدن پر چھا جاتا ہے اسی طرح مرد کا بدن عورت کے تمام بدن سے مل جاتا ہے اور عورت کا بدن مرد کے تمام بدن سے مل جاتا ہے۔

اور وجہ تشبیہ یہ ہے کہ جس طرح لباس انسان کو گرمی اور سردی اور کیڑوں مکوڑوں سے بچاتا ہے اسی طرح انسان کی زوجہ اس کے گھر کو مفاسد سے بچاتی ہے گھر کی محافظ ہوتی ہے اسکے مال کی محافظ ہوتی ہے اسلئے انسان کو اجنبی عورتوں کے میل جول سے بچالیتی ہے۔ گھر کے مال کو بربادی سے بچاتی ہے گویا کہ مال اور جان اور آبرو کی محافظ ہوتی ہے۔ اسی طرح یقیناً مرد عورت کو مفاسد سے بچاتا ہے یعنی اجنبی مردوں سے بچاتا ہے اور عورت کو ذریعہ معاشی کیلئے در بدر دھکے کھانے سے بچاتا ہے یقیناً مرد کہلانے کا وہی حق دار ہے جو اپنے اہل وعیال کے خرچ کیلئے ذمہ دار ہو۔ وہ شخص نکھد گھٹیا بلکہ انسانیت سے دور ہے جو یہ تمنا کرے کہ میرے خرچ اور اپنے خرچ اور اولاد کے خرچ کو عورت اپنی محنت ومزدوری سے چلائے۔

(از روح المعانی و کبیر)

آیئے ضیاء القران سے مفکر اسلام مفسر قرآن پیر محمد کرم شاہ رحمہ اللہ کا اس آیۃ کریمہ کی تفسیر سے ایک اقتباس دیکھیئے کیا خوب آپ نے بیان فرمایا، کیا ایک اچھی بیوی اپنے خاوند کے لئے اور ایک اچھا خاوند اپنے بیوی کے لئے پردہ، زینت اور راحت نہیں؟ یقیناً ہے جس ملت کے ہر گھر میں زوجیت کا یہ بلند تصور اور اعلیٰ معیار ہو اس کے لئے یہ دنیا جنت نہیں تو اور کیا ہے اسلام پر یہ اعتراض کرنے والے کہ اس نے عورت کے حقوق کو پامال کر دیا ہے اگر آیت کے اسی حصہ پر نظر ڈالیں تو انہیں اپنی غلطی کا احساس ہو جائے گا ہاں اسلام نے ملت ابراہیمی کی بیٹیوں کے چہروں سے شرم وحیا کا نقاب نوچنے کا حکم نہیں دیا۔ اس نے عورت کو محفل رقص وسرور کی زینت بننے کی اجازت نہیں دی اس کی وجہ یہ ہے کہ اسلام ایک مستقل دین ہے اس کا اپنا نظام، اپنا قانون اور اپنا ضابطہ حیات ہے اور اس کے استقلال کی یہی علامت ہے کہ وہ ہر حالت میں اسی ضابطے کا پابند رہے کسی کو پسند آئے یہی بات یا نہ، کوئی خوش ہو یا ناخوش، اسلام کو ہر دل عزیز بنانے اور اسے تہذیب مغرب سے ہم آہنگ کرنے کے لئے اس کے سادہ لوح بہی خواہوں نے اس کے فطری خدوخال میں جس وقت قطع وبرید (کانٹ چھانٹ) گوارا کر لی اس دن اسلام بحیثیت ایک مستقل ضابطہ حیات کے ہم سے چھن جائے گا اللہ تعالیٰ اس روز بد (برے

دن) سے بچائے۔ (ضیاء القرآن)

یہ الفاظ مبارکہ یعنی ﴿ هُنَّ لِبَاسٌ لَّكُمْ وَاَنْتُمْ لِبَاسٌ لَّهُنَّ ﴾ ماقبل کے مضمون کا بیان ہیں کہ مرد عورتوں کے محتاج ہیں اور ان میں صبر کم پایا جاتا ہے اور عورتوں میں بھی صبر کم پایا جاتا اور ان کا اجتناب مشکل ہوتا ہے بلکہ مردوں کی بنسبت عورتوں میں صبر کی کمی زیادہ پائی جاتی ہے حدیث شریف میں آتا ہے:

" لا خیر فی النساء ولا صبر عنهن یغلبن کریما ویغلبهن لیئم واحب ان اکون کریما مغلوبا ولا احب ان اکون لیئما غالبا "

نبی کریم ﷺ نے فرمایا عورتوں میں خیر نہیں اور نہ ان میں صبر ہے وہ کریم شخص پر غالب آجاتی ہیں اور ذلیل شخص ان پر غالب آجاتا ہے۔ میں پسند کرتا ہوں کہ میں کریم اور مغلوب ہو جاؤں اور یہ نہیں پسند کرتا کہ میں غالب اور ذلیل ہو جاؤں۔ (از روح المعانی)

عَلِمَ اللّٰهُ اَنَّكُمْ كُنْتُمْ تَخْتَانُوْنَ اَنْفُسَكُمْ فَتَابَ عَلَيْكُمْ وَعَفَا عَنْكُمْ:

''اللہ کو معلوم ہے بیشک تم خیانت میں ڈالتے ہو اپنے نفسوں کو تو اس نے تمہاری توبہ قبول فرمائی اور تمہیں معاف کیا''۔

﴿ عَلِمَ اللّٰهُ اَنَّكُمْ كُنْتُمْ تَخْتَانُوْنَ ﴾ ای تفعلون خفیة فعل الخائن فتظلمون ﴿ اَنْفُسَكُمْ ﴾ بتعریضها للعقاب ونقص حظها من الثواب باشر عمر رضی الله عنه بعد العشاء فندم واعتذر الی النبی ﷺ فقام رجال واعترفوا بمثله ثم ندموا علیه ﴿ فَتَابَ عَلَيْكُمْ ﴾ ای قبل توبتکم ﴿ وَعَفَا عَنْكُمْ ﴾ ای جاوز عنکم تحریمه بلا کراهة "(تبصیر الرحمن)

اللہ تعالیٰ کو معلوم ہے کہ تم پوشیدہ طور پر خائن کی طرح فعل کر کے اپنی نفسوں پر ظلم کر رہے ہو اور اپنے آپ کو عذاب کے لئے پیش کر رہے ہو اور اپنے ثواب کا حصہ کم کر رہے ہو چونکہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے عشاء کے بعد مباشرت کر لی پھر اس پر نادم ہو گئے تو نبی کریم ﷺ کے سامنے عذر پیش کیا تو کئی صحابہ کرام کھڑے ہو گئے اسی قسم کا معاملہ در پیش آنے کا اعتراف کیا پھر سب نادم ہو گئے تو اللہ تعالیٰ نے ان کی توبہ کو قبول فرما لیا اور ان کو معاف کر دیا یعنی تم سے حرمت کو اٹھا لیا گیا یہاں تک کہ اس میں کراہیت کو بھی باقی نہیں رکھا۔

تنبیه : راقم تو اس مسئلہ میں اس بات کا قائل ہے کہ صحابہ کرام سے خطا ہوئی یعنی بلا ارادہ غلطی ہوئی جیسا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی زوجہ نے بتایا کہ میں سو چکی تھی لیکن آپ نے سمجھا کہ یہ بہانہ بنا رہی ہے تو آپ نے اس کی بات کی پرواہ نہ کرتے ہوئے جماع کر لیا بعد میں جب یقین ہو گیا کہ زوجہ نے تو سچ کہا تھا غلطی تو مجھ سے ہی سرزد ہوئی تو آپ نادم ہو گئے تو بہ کی اللہ تعالیٰ نے آپ کی توبہ کو قبول فرمایا۔

راقم کے خیال کو علامہ قرطبی رحمہ اللہ کی تفسیر سے بہت زیادہ تقویت ملتی ہے آپ رقم طراز ہیں:

﴿ عَلِمَ اللّٰہُ اَنَّکُمْ کُنْتُمْ تَخْتَانُوْنَ اَنْفُسَکُمْ ﴾ یستامر بعضکم فی مواقعة المحظور من الجماع والاکل بعد النوم فی لیالی الصوم "

یہاں خیانت کا یہ مطلب ہے کہ تم ایک دوسرے سے پوچھتے ہو کہ روزوں کی راتوں کو سونے کے بعد جماع اور کھانے پینے کی ممانعت کب اٹھے گی تمہارا ایک دوسرے سے مخفی طور پر پوچھنا خیانت کی طرح ہے۔ ﴿ فَتَابَ عَلَیْکُمْ ﴾ میں دو احتمال ہیں ایک ان میں سے یہ ہے " قبول التوبة من خیانتهم لانفسهم " کہ اس نے تمہاری توبہ کو قبول کیا جو تم نے اپنے نفسوں کو خیانت میں ڈالا اگرچہ بلا ارادہ خطا تھی لیکن صحابہ کرام کا مقام بلند تھا زیادہ تحقیق کی ضرورت تھی اور دوسرا احتمال یہ ہے "التخفیف عنهم بالرخصة والاباحة" توبہ قبول کرنے کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے رخصت عطا فرمائی اور مباشرت اور کھانے پینے کو مباح قرار دیا۔ یہ ایسا ہی ہے جیسا کہ (علم ان لن تحصوہ فتاب علیکم) میں ﴿ فَتَابَ عَلَیْکُمْ ﴾ کا معنی " خفف عنکم " ہے کہ اس نے تم سے تخفیف فرمائی۔ اسی طرح رب تعالیٰ نے فرمایا ﴿ لَقَدْ تَّابَ اللّٰہُ عَلَی النَّبِیِّ ﴾ وان لم یکن من النبی ما یوجب التوبة منه " نبی کریم ﷺ سے تو کوئی ایسا کام سرزد نہیں ہوا جو توبہ کرنے کا ذریعہ بنتا البتہ آپ کا ذکر صحابہ کرام مہاجرین وانصار کے ساتھ ان کی دل جوئی کے لئے ذکر فرما دیا لہذا نبی کریم ﷺ کی طرف توبہ کی نسبت کا مطلب ہی وسعت امر ہے:

﴿ وَعَفَا عَنْکُمْ ﴾ یحتمل العفو من الذنب ویحتمل التوسعة والتسهیل قول النبی ﷺ اول الوقت رضوان اللہ وآخرہ عفو اللہ یعنی تسهیلة وتوسعته "

معاف کرنے کے بھی دو ہی مطلب ہیں ایک یہ کہ گناہوں کو معاف کرنا اور دوسرا احتمال یہ ہے کہ وسعت اور آسانی کا عطا کرنا جیسا کہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے اول وقت میں رب تعالیٰ کی رضامندی پائی جاتی ہے اور آخر میں عفو اس مقام میں عفو کا معنی آسانی اور وسعت عطا کرنا ہی ہے۔

(از قرطبی)

تاہم اس مسئلہ کو حضرت مفتی احمد یار خان رحمہ اللہ نے اعتراض و جواب کی صورت میں مستحسن انداز پر پیش کیا۔

اعتراض: اس آیۃ سے معلوم ہوا کہ حضرت عمرو دیگر صحابہ خیانت کرتے تھے اور خائن خلافت کے قابل نہیں۔ لہذا ان کی خلافت باطل ہے نیز تمہارا یہ عقیدہ بھی باطل ہے کہ کوئی صحابی فاسق نہیں اس آیۃ سے ان کی خیانت ثابت ہوئی جو کہ اولی درجہ کا فسق ہے۔ (رافضی)

جواب: ہم صحابہ کرام کو معصوم نہیں مانتے عادل مانتے ہیں یعنی وہ گناہ پر قائم نہیں رہتے بلکہ اگر غلطی ہو جائے تو توبہ کر کے رب سے معافی حاصل کر لیتے ہیں یہاں بھی یہ ہی ہوا۔ نیز یہاں خیانت سے مراد انسانی امانت میں خیانت مراد نہیں بلکہ فقط بے اختیاری گناہ مراد ہے کیونکہ انہوں نے کسی کا مال نہیں مارا تھا اپنی حلال بیبیوں سے جماع کیا تھا اسی لئے فرمایا گیا ﴿ اَنۡفُسَكُمۡ ﴾ اپنے نفسوں کی خیانت کی کسی کا مال یا کسی کا باپ نہ مارا نیز جب رب انہیں معافی کا پروانہ دے چکا تو تمہیں انکے عیب نکالنے کا کیا حق ہے رب تو معاف کرے اور تم شور مچاؤ بلکہ اس آیۃ سے ان کی عظمت ثابت ہوتی ہے کیونکہ رب نے ان کے نفسوں کو اپنی ملک قرار دیا اور فرمایا اے عمر تمہارا نفس تو جنت کے عوض خرید چکا اب تو نام تمہارا رہ گیا چیز ہماری ہوگئی تم نے مجھ سے بغیر پوچھے اپنے اختیار سے جماع بھی قبول کر لیا، سبحان اللہ کوئی ایسا خوش نصیب بھی تو ہو جس کو رب اپنی ملک بتائے اسکی تفسیر وہ آیۃ ہے ﴿ اِنَّ اللّٰهَ اشۡتَرٰى مِنَ الۡمُؤۡمِنِيۡنَ اَنۡفُسَهُمۡ ﴾ (نعیمی)

فائدہ: حضرت ابن عربی رحمہ اللہ فرماتے ہیں علماء زہد و تقوی نے بیان فرمایا:

"وكذا فلتكن العناية وشرف المنزلة خان نفسه عمر رضي الله عنه فجعلها الله تعالىٰ شريعة وخفف من اجله عن الامة فرضي الله عنه وارضاه"

رب تعالیٰ کی طرف سے کتنی ہی مہربانی اور کتنی ہی بلندی مرتبت پائی گئی کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ

نے اپنے نفس کو خیانت میں ڈالا تو اللہ تعالیٰ نے اسکو شریعت کا حصہ بنا دیا آپ کی وجہ سے تمام امت پر مہربانی پائی گئی۔ آپ نے اللہ تعالیٰ کے حضور عذر پیش کر کے اسے راضی کرلیا اور رب آپ سے راضی ہو گیا۔

(قرطبی)

فَالْئٰنَ بَاشِرُوْهُنَّ : "تو اب ان سے صحبت کرو"

جب حرمت منسوخ ہوگئی تو اب تم اپنی عورتوں سے مباشرت کر سکتے ہو خیال رہے کہ یہ امر وجوب کے لئے نہیں بلکہ اباحت کے لئے ہے" ﴿ الآن ﴾ اصل میں " آن " بمعنی " حان " ہے فعل ہے پھر اس کو زمانہ حاضر کے لئے اسم بنا لیا گیا اور معرف باللام بنا لیا گیا اور فتحہ باقی رکھا گیا:

" والمباشرة الزاق بالبشرة كنى بها عن الجماع الذى يلتزمها "

مباشرت کا معنی ہے چمڑے کا چمڑے سے ملنا، کنایۃً اس کا معنی جماع لیا گیا ہے جس کو چمڑے کا ملنا لازم ہے اسی طرح اس مباشرت کے حکم میں جماع کے دواعی یعنی بوسہ لینا اور معانقہ وغیرہ داخل ہیں اس سے ایک اور مسئلہ ثابت ہو گیا کہ حدیث کا قرآن پاک سے منسوخ ہونا ثابت ہو گیا کہ رمضان کی راتوں کو سونے کے بعد کھانے پینے اور جماع کرنے کی حرمت حدیث پاک سے ثابت تھی لیکن قرآن پاک سے اسے منسوخ کر دیا گیا۔

البتہ بعض حضرات نے کہا کہ ان چیزوں کی حرمت پہلی شریعتوں سے ثابت تھی اور قرآن پاک کی اس آیۃ سے پہلی شریعتوں کے احکام کو منسوخ کر دیا گیا لیکن یہ قول درست نہیں کیونکہ پہلی شریعتوں کے احکام ہم پر لازم ہی نہیں۔ (از روح البیان)

وَابْتَغُوْا مَا كَتَبَ اللّٰهُ لَكُمْ : "اور طلب کرو جو لکھا ہے اللہ نے تمہارے لئے" یعنی اللہ تعالیٰ نے جو اولاد تمہاری تقدیر میں لکھ دی ہے اور لوح محفوظ میں ثابت ہے وہ طلب کرو۔ اسی سے یہ مسئلہ سمجھ آ گیا کہ مباشرت میں مقصد اولاد اور نسل کی طلب ہو کیونکہ شہوت کے پیدا کرنے اور نکاح کی مشروعیت میں حکمت ہی یہی ہے صرف خواہشات کو پورا کرنا مقصود نہ ہو حدیث شریف میں ہے:

" عن معقل بن يسار قال قال رسول الله ﷺ تزوجوا الودود الولود فانى مكاثر بكم الامم "

(ابو داؤد، نسائی)

حضرت معقل بن یسار رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا محبت کرنے والی اور بچے جننے والی عورتوں سے نکاح کرو بیشک میں دوسری امتوں پر تمہاری کثرت پر فخر محسوس کروں گا۔ اور مسئلہ یہ سمجھ آیا کہ جماع صرف قبل یعنی مولد میں ہوسکتا ہے دبر میں نہیں ہوسکتا کیونکہ وہ مقام اولاد نہیں۔ اور مسئلہ یہ سمجھ آیا " ان العزل مکروہ " کہ عزل مکروہ ہے۔ (از روح البیان ومظہری)

عزل، برتھ کنٹرول، خاندانی منصوبہ بندی:

عزل کے مسئلہ کو علامہ سید محمود احمد رضوی شارح بخاری نے رضوان ماہ نومبر 1991ء میں یوں ذکر کیا:

(۱) حدیث وفقہ کی تقریباً تمام کتب میں مستقل طور پر باب العزل کا عنوان قائم ہے اور شارحین نے عزل کے متعلق شرح وبسط کے ساتھ گفتگو کی ہے شارحین حدیث اور فقہاء کرام نے عزل کے معنی یہ کئے ہیں کہ اپنی بیوی سے جماع کے وقت ایسا طریقہ اختیار کیا جائے کہ مادہ باہر گرے۔ مقصد اس عمل کا یہ ہے بچے پیدا نہ ہوں۔

جہاں تک میرے علم وعقل کا تعلق ہے میں سمجھتا ہوں کہ عزل اور برتھ کنٹرول یا دوسرے لفظوں میں خاندانی منصوبہ بندی کا مطلب ومقصد ایک ہی ہے۔ فی زمانہ (اس دور میں) برتھ کنٹرول کے مختلف طریقے ہیں ادویہ کا استعمال وغیرہ وغیرہ زمانہ رسالت میں مانع حمل ادویہ اور دیگر اشیاء ایجاد نہیں ہوئی تھیں اس لئے صرف عزل کے ذریعے بچہ کی پیدائش کو روکا جاتا تھا۔

(۲) صحابہ کرام کے عزل کی وجوہ:

ایک وجہ اس کی یہ ہے کہ وہ لونڈی سے عزل کرتے تھے تاکہ اس کی اولاد نہ ہو کیونکہ جس لونڈی کی اولاد ہو جائے وہ شرعاً ام ولد ہو جاتی ہے اس کی بیع (اسے بیچنا) ممنوع وناجائز قرار پاتی ہے چنانچہ بخاری ومسلم وابوداؤد ومسند احمد وابن ماجہ کی متعدد احادیث میں اس وجہ کا واضح طور پر ذکر ہے۔

دوسری وجہ اپنی بیوی سے عزل کرنا، صحابہ کرام اپنی بیویوں سے اس لئے عزل کرتے تھے تاکہ اولاد زیادہ نہ ہو۔ چنانچہ مسلم ومسند احمد کی حدیث میں ہے کہ حضرت اسامہ فرماتے ہیں کہ بحضور نبوی ایک شخص حاضر ہوا عرض کی:

"انی اعزل من امرأتی فقال له ﷺ لم تفعل ذلک فقال اشفق علی ولدھا او علی اولادھا" (مسلم)

میں اپنی بیوی سے عزل کرتا ہوں نبی کریم ﷺ نے فرمایا عزل کیوں کرتے ہو اس نے جوابا عرض کی کہ اس کے بچہ یا اولاد پر شفقت کی بناء پر۔ علامہ شوکانی نے اس حدیث کی شرح میں لکھا ہے کہ اس میں عزل کی وجوہات میں سے ایک وجہ کا ذکر ہے اور وہ یہ کہ کثرت اولاد سے بچا جائے۔
(نیل الاوطار ج ۶ ص ۱۹۸)

اس حدیث سے واضح ہوا کہ صحابہ کرام اپنی ازواج سے عزل (برتھ کنٹرول) کرتے تھے اور اس لئے کرتے تھے تا کہ اولاد کی کثرت نہ ہو۔ ثابت ہوا کہ کثرت اولاد کی مشکلات سے بچنے کے لئے اپنی بیوی سے عزل جائز ہے۔ (یعنی عقیدہ کی صحت و سلامتی کے ساتھ اللہ تعالیٰ کو قادر و قدیر اور خالق و رازق سمجھتے ہوئے) محض سبب کے طور پر عزل کے عمل کو اپنانا جائز ہے شرط صرف یہ ہے کہ اس عمل کو مؤثر حقیقی نہ سمجھے اور یہ عقیدہ رکھے کہ خواہ کوئی بھی طریقہ اختیار کیا جائے جسے پیدا کرنا اللہ تعالیٰ کو مقصود ہو بہر حال اور بہر صورت پیدا ہوگا۔

چنانچہ یورپ میں جن عورتوں نے مانع حمل گولیاں استعمال کیں اخبارات شاہد ہیں کہ ان کے ایک نہیں دو بچے بھی پیدا ہوئے ہیں یہی وجہ ہے کہ حضور اقدس ﷺ سے جب کسی صحابی نے عزل کے متعلق سوال کیا۔ تو آپ نے بڑے حکیمانہ انداز میں انہیں بتایا کہ عزل محض ایک سبب ہے اسے مؤثر حقیقی نہ سمجھا جائے اور اللہ تعالیٰ کے خالق و رازق ہونے کے عقیدہ کو ذہنوں سے اوجھل نہ ہونے دیا جائے۔ چنانچہ بخاری و مسلم و ابوداؤد و مسند احمد و مؤطا امام محمد کی احادیث میں اس امر کی تصریح ہے۔

حضرت جابر سے روایت ہے کہ ایک شخص نے بحضور نبوی عرض کی میں اس بات کو اچھا نہیں سمجھتا کہ میری لونڈی حاملہ ہو نبی علیہ السلام نے فرمایا" اعزل عنها ان شئت فانه سيأتيها ما قدر لها" اگر تو چاہتا ہے تو عزل کر مگر اس کے باوجود جو مقدر ہے وہ ضرور پیدا ہوگا۔ (موطا امام محمد)

اسی طرح امام احمد اور بزار نے باسناد حسن حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت کی کہ ایک شخص نے عزل کے متعلق نبی علیہ السلام سے سوال کیا تو آپ نے فرمایا وہ پانی جس سے بچے کی

پیدائش اللہ کومنظور ہے " اھرقتہ علی صخرۃ لاخرج اللہ منھا ولدا ویخلقن اللہ نفسا ھو خالقھا " (موطاامام محمد) اسے تو پتھر پر بھی ڈال دے تو اس صورت میں بھی اللہ تعالیٰ بچہ پیدا فرما دے گا یا نفس کو پیدا فرمادے گا جس کا وہ خالق ہے۔

عزل جائز ہے لیکن مکروہ تنزیہی: موطاامام محمد کی شرح التعلیق الممجد میں حضرت مولنا عبدالحی لکھنوی علیہ الرحمۃ زیر عنوان باب العزل لکھتے ہیں کہ صحابی رسول حضرت ابن عباس وجابر بن عبداللہ وسعد بن ابی وقاص وزید بن ثابت وحضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہم اپنی بیوی اور لونڈی سے عزل جائز قرار دیتے ہیں البتہ حضرت عمر وحضرت علی وحضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہم نے کراہت کا قول کیا ہے۔ (یعنی یہ حضرات عزل کو جائز تو قرار دیتے ہیں مگر اس عمل کو اچھا نہیں سمجھتے یعنی مکروہ تنزیہی قرار دیتے ہیں اور مکروہ تنزیہی فعل جائز ہے حرام یا مکروہ تحریمی یا گناہ ہر گز نہیں)

" ونقل ابن عبد البر وابن ھبرۃ الاجماع علی انہ ما لا یعزل عن الزوجۃ الحرۃ الا باذنھا " (التعلیق الممجد)

علامہ ابن عبدالبر اور علامہ ابن ہبرہ نے لکھا ہے کہ اپنی بیوی کی اجازت سے عزل کے جواز پر اجماع ہے۔

اسقاط حمل کی وجوہ: " قال حافظ ابن حجر ینتزع من حکم العزل معالجۃ المرأۃ اسقاط النطفۃ قبل نفخ الروح " (التعلیق الممجد)

حافظ ابن حجر شارح بخاری میں فرماتے ہیں عزل کے جواز سے بغرض علاج اسقاط حمل کا جواز بھی واضح ہو جاتا ہے مگر شرط یہ ہے کہ بچہ میں روح نہ پڑی ہو۔

" قال ابن الھمام یباح الاسقاط النطفۃ قبل نفخ الروح " (التعلیق الممجد)

علامہ ابن ہمام رحمہ اللہ فتح القدیر میں لکھتے ہیں کہ اسقاط حمل مباح ہے جب تک اعضاء نہ بنے ہوں اور روح نہ پڑی ہو (یعنی اگر حاملہ بیوی کو حمل کی وجہ سے جان کا خطرہ پیدا ہو جائے یا سخت بیماری کا تو جب تک بچہ میں جان نہ پڑی ہو اسقاط حمل جائز ہے)۔

بلا عذر اسقاط حمل ناجائز:

" لا اقول انہ یباح الاسقاط مطلقا ان یلحقھا اثم منھا اذا اسقطت من غیر عذر " (التعلیق الممجد)

فقہ حنفی کی مشہور کتاب خانیہ (قاضی خان) میں ہے کہ اپنی بیوی کا اسقاط حمل اس صورت میں ناجائز اور گناہ ہے جب کہ عذر شرعی نہ ہو (یعنی حاملہ کی جان یا سخت وشدید بیماری کا خطرہ نہ ہو)۔

" قال فی البحر ینبغی الاعتماد علیہ لان لہ اصلا صحیحا یقاس علیہ " (التعلیق الممجد)

اور صاحب البحر الرائق نے فرمایا بضرورت اسقاط حمل جائز ہے کیونکہ اس کے لئے دلیل صحیح موجود ہے جس پر اسقاط حمل کو قیاس کیا جائے۔صحابی رسول حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ سے ابن فہید یمنی نے اپنی لونڈی سے عزل کے متعلق سوال کیا تو آپ نے فرمایا:

" ھو حرثک ان شئت عطشتہ وان شئت سقیتہ " (موطا امام محمد ص ۱۹۵)

وہ تیری کھیتی ہے اب یہ تیری مرضی ہے خواہ اس کو پیاسا رکھ یا سیراب کردے۔امام محمد رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا:

" لا نری بالعزل بأسا عن الامۃ امام الحرۃ فلا ینبغی ان یعزل عنھا الا باذن " (موطا امام محمد ص ۱۹۵)

ہمارا موقف بھی یہی ہے کہ لونڈی سے عزل میں حرج نہیں البتہ اگر بیوی حرہ (آزاد) ہو تو اس کی اجازت سے عزل کرنا جائز ہے (یہ بھی خیال رہے آج کل تمام عورتیں آزاد ہیں بین الاقوامی قوانین کی وجہ سے کوئی لونڈی نہیں)۔مولنا عبدالحی لکھنوی موطا امام محمد کی ان روایات کی شرح میں لکھتے ہیں کہ حضرت امام مالک اور امام احمد کا بھی یہی مذہب ہے۔

سید المفسرین حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے قرآن مجید کی آیۃ ﴿ نِسَآءُ کُمْ حَرْثٌ لَّکُمْ ﴾ سے عزل کے جواز کا استدلال فرمایا ہے آیۃ میں ﴿ اَنّٰی شِئْتُمْ ﴾ بمعنی " کیف شئتم " ہے اور آیۃ کے اس جملہ سے عزل کا جواز ثابت ہوتا ہے مکمل عبارت مندرجہ ذیل ہے:

" ان جواز العزل مستنبط من الکتاب فانه تعالیٰ قال فی باب وطی النساء نساء کم حرث لکم فاتوا حرثکم انی شئتم فسمی بضع المراۃ حرثا ومن المعلوم ان الحرث یستخیر فیه الانسان بین ان یسقیه وان لا یسقیه فکذلک بضع النساء وبل قبل ان نزول انی شئتم ای کیف شئتم کان لبیان جواز العزل " (طبرانی وحاکم)

بیشک عزل کا جواز قرآن پاک سے مستنبط ہے بیشک اللہ تعالیٰ نے عورتوں کے ساتھ وطی کا ذکر فرماتے ہوئے فرمایا تمہاری بیویاں تمہاری کھیتیاں ہیں اپنی کھیتی میں آؤ جسطرح تم چاہو، عورت کی فرج کو کھیتی کہا اور یہ بات یقیناً معلوم ہے کہ کھیتی میں انسان کو اختیار حاصل ہے چاہے تو اسے سیراب کرے یا نہ کرے یہی حکم عورت کی بضع کا بھی ہے یعنی مادہ کو اندر گرائے یا باہر اور بلکہ دوسری دلیل یہ بھی پیش کی گئی ہے کہ آیہ کریمہ میں ﴿ اَنّٰی شِئْتُمْ ﴾ بمعنی "کیف شئتم" کے ہے یعنی جیسے تم چاہو۔اس سے بھی عزل کا اختیار حاصل ہونا سمجھ آتا ہے۔اور حضرت ابن مسعود وحضرت ابن عباس وحضرت ابن عمر وحضرت امیر المؤمنین فاروق اعظم رضی اللہ عنہم سے ابن ابی شیبہ وعبد الرزاق وبیہقی نے مرفوع احادیث روایت کی ہیں جن میں لونڈی سے اس کی اجازت کے بغیر اور اپنی حرہ بیوی سے اس کی اجازت سے عزل کا جائز ہونا واضح ہے۔

اسی طرح ابن ماجہ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے مرفوع حدیث اور علامہ ابن حجر نے تلخیص الجبیر میں اور امام طحاوی علیہ الرحمۃ نے شرح معانی الآثار میں متعدد احادیث وآثار نقل کئے ہیں جن سے عزل کا جواز ثابت ہوتا ہے۔اور حضرت عمر نے جو یہ فرمایا ہے کہ لوگ اپنی لونڈیوں سے عزل کرتے ہیں جو لونڈی میرے پاس آئے گی اور اس کا آقا یہ اعتراف کرے گا کہ میں نے اس سے جماع کیا ہے تو یہ اولاد آقا ہی کی قرار دوں گا۔اب یہ تمہاری مرضی ہے کہ تم عزل کرو یا نہ کرو تو حضرت عمر نے اپنے اس فرمان میں لونڈی سے حرمت کا قصد نہیں فرمایا کیونکہ وہ بھی لونڈی سے عزل کو جائز قرار دیتے ہیں۔

حدیث جدامہ میں نبی کریم ﷺ نے عزل کو واد خفی یعنی کم درجہ کا زندہ درگور کرنا قرار دیا تھا۔ اگرچہ حدیث کے اس جملہ سے شارحین نے کراہۃ تنزیہی مراد لی ہے تاہم صاحب فتح القدیر نے صحابہ

کرام کے درمیان عزل کے متعلق ایک علمی مذاکرے کا ذکر کیا ہے جس میں حضرت عمر۔ وحضرت زبیرو حضرت سعد بن ابی وقاص اور دیگر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم بھی موجود تھے انہوں نے آپس میں عزل کا ذکر کیا اور سب نے کہا کہ اس میں کوئی جرم نہیں۔ حاضرین میں سے کسی نے کہا کہ لوگوں کا خیال ہے کہ عزل مؤدہ صغریٰ ہے تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے جواب دیا کہ مؤدہ صغریٰ نہیں جب تک اس پر سات ادوار نہ گزر جائیں یعنی (۱) سلالہ (۲) نطفہ (۳) علقہ (۴) مضغہ (۵) عظام (۶) لحم (۷) خلق آخر (یعنی روح پڑ جانے پر زندہ درگور کرنے کا حکم ثابت ہوگا پہلے نہیں) اس پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے فرمایا کہ آپ نے سچ کہا اللہ تعالیٰ آپ کی عمر دراز کرے۔

نوٹ: یہ تمام مضمون موطا امام محمد اور اس کی شرح تعلیق مجد کا خلاصہ ہے جسے ہم نے آسان زبان میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ (موطا امام محمد ص ۱۹۴، ۱۹۵)

مولنا عبدالحی لکھنوی علیہ الرحمۃ نے احادیث پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ بعض صحابہ کرام نے عزل کو مکروہ اس لئے قرار دیا کہ عزل کی کراہت کا قول کرنے سے ایک تو حق زوجہ کو تقویت ملتی ہے اور دوم یہ کہ عزل کا عمل قضاء وقدر کے معاند (مخالف) ہے۔ حق زوجہ کی تقویت کی دلیل حدیث احمد وابن ماجہ ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

" قال نهى رسول الله ﷺ ان يعزل عن الحرة الا باذنها "

(نیل الاوطار ج ۶ ص ۱۹۶)

نبی کریم ﷺ نے آزاد بیوی سے اس کی اجازت کے بغیر عزل سے منع فرمایا ہے۔ اور قضاء وقدر کے معاند کی دلیل حدیث جابر وانس ہے " فافهم " (سمجھئے) (التعليق الممجد)

واضح ہوا حدیث جدامہ سے عزل کی ممانعت کا قول کیا جاتا ہے جس میں عزل کے متعلق سوال کے جواب میں نبی علیہ السلام نے فرمایا " ذلک الواد الخفی " (یہ ہلکا زندہ درگور کرنا ہے) (احمد ومسلم) اور حدیث ابوسعید میں ہے یہود نے عزل کو " المؤدة الصغریٰ " قرار دیا اس پر نبی علیہ السلام نے فرمایا " کذبت یهود " یہود جھوٹ بولتے ہیں۔ یہ دونوں حدیثیں آپس میں معارض ہیں ایک سے عزل کا

جواز اور دوسری سے ممانعت ثابت ہوتی ہے۔

اسی طرح بخاری شریف کی حدیث میں ہے حضور ﷺ سے عزل کے متعلق سوال ہوا تو آپ نے فرمایا "ما علیکم ان لا تفعلوا" حدیث کے اس جملہ سے بھی ممانعت کا قول کیا گیا ہے۔ شارح مسلم حضرت امام نووی علیہ الرحمۃ اور علامہ ابن قیم نے ان احادیث میں تطبیق دی ہے فرماتے ہیں:

"ثم هذه الاحاديث مع غيرها يجمع بينهما بان ما ورد في النفي محمول على كراهة التنزيه وما ورد في الاذن في ذلك محمول على انه ليس بحرام" (حاشیہ مسلم ج ۱ ص ۴۶۴)

جن احادیث میں عزل کی ممانعت ہے وہ کراہیت تنزیہی پر محمول ہیں اور جن میں عزل کی اجازت ہے وہ اس پر محمول ہیں کہ یہ فعل حرام نہیں۔ غرضیکہ شارحین کرام نے ممانعت کی احادیث میں نہی کو نہی تنزیہی قرار دیا ہے اور جو فعل مکروہ تنزیہی ہو وہ جائز ہوتا ہے۔

علامہ ابن ہمام علیہ الرحمۃ نے اس مسئلہ پر تفصیلی گفتگو فرماتے ہوئے لکھا ہے کہ صحیح یہ ہے کہ عزل جائز ہے اور عامۃ العلماء کا یہی مذہب ہے دس صحابہ کرام حضرت علی، سعد بن ابی وقاص، زید بن ثابت، ابو یوب، جبر، ابن عباس، حسن بن علی، خباب بن ارت، ابو سعید خدری اور عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہم سے عزل کا جائز ہونا مروی ہے۔ (فتح القدیر ج ۳ ص ۲۷۲)

"عن جابر قال كنا نعزل والقرآن ينزل زاد اسحق قال سفيان لو كان شيا ينهى عنه لنهانا عنه القرآن"

حضرت جابر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ہم عزل کیا کرتے تھے اور قرآن کا نزول جاری تھا سفیان نے کہا اگر عزل کا عمل ممنوع ہوتا تو قرآن مجید میں اس کی ممانعت آجاتی۔ (مسلم)

"عن جابر قال كنا نعزل على عهد رسول الله ﷺ فبلغ ذلك نبي الله ﷺ فلم ينهانا"

حضرت جابر فرماتے ہیں کہ ہم عہد نبوی میں عزل کرتے تھے نبی کریم ﷺ کو اس کی اطلاع ہوئی تو آپ نے منع نہیں فرمایا۔ (مسلم ج ۱ ص ۴۶۵)

فقہاء کرام، ائمہ دین اور شارحین حدیث نے بخاری و مسلم کی ان ہی احادیث کی بناء پر عزل کو جائز و مباح قرار دیا ہے اس لئے اس عمل کو مطلقاً حرام و ناجائز قرار دینا سخت زیادتی ہے۔

البتہ ایک احتیاط کی سخت ضرورت ہے: اور یہ حکومت کا کام ہے کہ وہ عزل اور برتھ کنٹرول کی ادویہ وآلات وغیرہ صرف شادی شدہ افراد کے لئے مختص کر دے اور ایسا انتظام کیا جائے کہ یہ ادویہ وآلات وغیرہ غیر شادی شدہ مرد و عورت نہ حاصل کر سکیں تا کہ کوئی ان سے ناجائز فائدہ نہ اٹھا سکے۔

اور یہ بھی ضروری ہے کہ خاندانی منصوبہ بندی کی تشہیر کے ساتھ ساتھ ان احادیث کو بھی بیان کیا جائے جن میں نبی کریم ﷺ نے یہ فرمایا ہے جسے پیدا کرنا اللہ تعالیٰ کو مقصود ہے وہ بہر حال و بہر صورت پیدا ہوگا تا کہ لوگ عقیدہ کی درستگی کے ساتھ اس عمل کو اپنانا چاہیں تو اپنا لیں مگر اسے محض ایک سبب سمجھیں اور مؤثر حقیقی صرف اور صرف خداوند قدوس کو جانیں۔ (انتھی)

وَكُلُوا وَاشْرَبُوا حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَكُمُ الْخَيْطُ الْاَبْيَضُ مِنَ الْخَيْطِ الْاَسْوَدِ مِنَ الْفَجْرِ : ''اور کھاؤ اور پیو یہاں تک کہ ظاہر ہو جائے تمہارے لئے دھاگہ سفید دھاگے سیاہ سے یعنی فجر سے''۔ آیۃ کریمہ میں سفید دھاگہ سے مراد صبح صادق ہے اور سیاہ دھاگہ سے مراد صبح کاذب اور '' مِنَ الْفَجْرِ '' اس کا بیان ہے یہاں سے کھانے پینے کی انتہاء اور روزہ کی ابتداء بیان کی گئی۔ یعنی صبح کاذب میں تم کھا پی سکتے ہو اور صبح صادق میں کھانے پینے سے رک جاؤ سفید اور سیاہ دھاگہ سے فجر کی دونوں قسمیں ہیں۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے نافع ازرق نے رب تعالیٰ کے ارشاد گرامی ﴿ حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَكُمُ الْخَيْطُ الْاَبْيَضُ مِنَ الْخَيْطِ الْاَسْوَدِ ﴾ کے متعلق سوال کیا کہ اس کا کیا مطلب ہے؟ تو آپ نے فرمایا: '' بیاض النھار من سواد اللیل وھو الصبح '' اس سے مراد صبح ہے یعنی رات کی تاریکی سے جو دن کی سفیدی ظاہر ہوتی ہے۔ مطلب واضح ہے کہ آپ نے فرمایا سیاہ دھاگہ سے مراد رات کی تاریکی ہے جو صبح کاذب میں بھی رہتی ہے اور سفید دھاگہ سے مراد صبح صادق کی سفیدی ہے۔

سوال کرنے والے شخص نے کہا کیا یہ محاورہ عرب حضرات کے کسی کلام میں بھی استعمال ہے؟

آپ نے فرمایا ہاں کیا تم نے امیہ کا قول نہیں سنا:

الخیط الابیض ضوء الصبح منفلق والخیط الاسود لون اللیل مکموم

سفید دھاگہ صبح کی روشنی یعنی پو پھٹنا ہے اور سیاہ دھاگہ رات کی تاریکی کا چھپا (چھپایا ہوا ہونا)

☆ " واخرج البخاری ومسلم والنسائی وابن جریر وابن المنذر وابن ابی حاتم والبیھقی فی سننه عن سھل بن سعد قال انزلت ﴿ وَكُلُوْا وَاشْرَبُوْا حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَكُمُ الْخَيْطُ الْاَبْيَضُ مِنَ الْخَيْطِ الْاَسْوَدِ ﴾ ولم ینزل ﴿ مِنَ الْفَجْرِ ﴾ فکان رجال اذا ارادوا الصوم ربط احدھم فی رجلیه الخیط الابیض والخیط الاسود فلا یزال یا کل ویشرب حتی یتبین له رؤیتھما فانزل الله بعد ﴿ مِنَ الْفَجْرِ ﴾ فعلموا انما یعنی اللیل والنھار "

بخاری، مسلم اور نسائی وغیرہ نے بیان کیا ہے کہ حضرت سہل بن سعد کہتے ہیں جب آیۃ کریمہ کے یہ الفاظ مبارکہ نازل ہوئے ﴿وَكُلُوْا وَاشْرَبُوْا حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَكُمُ الْخَيْطُ الْاَبْيَضُ مِنَ الْخَيْطِ الْاَسْوَدِ ﴾ اس وقت ﴿ مِنَ الْفَجْرِ ﴾ کے الفاظ نازل نہیں ہوتے تھے تو لوگ جب روزہ رکھنے کا ارادہ کرتے تو اپنے ایک پاؤں (یعنی ٹانگ) سے سفید دھاگہ باندھ لیتے اور دوسرے سے سیاہ دھاگہ باندھ لیتے دونوں دھاگوں کو دیکھتے رہتے جب تک واضح طور پر دونوں میں فرق نظر آتا اس وقت تک کھاتے پیتے رہتے تو اللہ تعالیٰ نے ﴿ مِنَ الْفَجْرِ ﴾ کے الفاظ نازل فرمائے تو سمجھ گئے کہ سیاہ دھاگہ سے مراد رات اور سفید دھاگہ سے مراد صبح ہے۔

☆ " واخرج سفیان بن عیینه وسعید بن منصور وابن ابی شیبة واحمد والبخاری ومسلم وابو داود والترمذی وابن جریر وابن المنذر والبیھقی عن عدی بن حاتم قال لما انزلت ھذه الآیة ﴿ وَكُلُوْا وَاشْرَبُوْا حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَكُمُ الْخَيْطُ الْاَبْيَضُ مِنَ الْخَيْطِ الْاَسْوَدِ ﴾ عمدت الی عقالین احدھما اسود والآخر ابیض فجعلتھما تحت وسادتی فجعلت انظر الیھما فلا یتبین لی الابیض من الاسود فلما اصبحت غدوت علی رسول الله ﷺ فاخبرته بالذی صنعت فقال ان وسادک اذا لعریض انما ذاک بیاض النھار من سواد اللیل "

بخاری مسند احمد، مصنف ابن ابی شیبہ، مسلم، ابو داود اور ترمذی وغیرہ میں ہے کہ عدی بن حاتم کہتے ہیں کہ جب آیۃ کریمہ میں یہ الفاظ نازل ہوئے ﴿وَكُلُوْا وَاشْرَبُوْا حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَكُمُ الْخَيْطُ الْاَبْيَضُ مِنَ الْخَيْطِ الْاَسْوَدِ ﴾ تو میں نے اونٹ باندھنے والی دو رسیاں ایک سیاہ اور سفید اپنے

تکیہ (سرہانے) کے نیچے رکھ لیں ان کو دیکھنے لگ گیا سفید اور سیاہ میں فرق نظر نہیں آ رہا تھا۔ صبح میں رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا میں نے آپ کو خبر دی کہ میں نے ایسے کیا تھا تو آپ نے فرمایا کہ پھر تو تمہارا تکیہ بہت چوڑا (وسیع) ہوگا، حالانکہ اس سے مراد تو دن کی سفیدی اور رات کی سیاہی ہے مطلب یہ تھا کہ کیا تمہارا تکیہ اتنا وسیع ہوسکتا ہے کہ اس میں دن کی سفیدی اور رات کی تاریکی سما سکیں۔

☆ " واخرج عبد بن حميد والبخاری وابن جرير عن عدی بن حاتم قال قلت يا رسول الله ما الخيط الابيض من الخيط الاسود اهما الخيطان فقال انک لعريض القفا ان ابصرت الخيطين ثم قال لا بل هو سواد الليل وبياض النهار "

بخاری وغیرہ نے بیان کیا ہے کہ عدی بن حاتم کہتے ہیں میں نے کہا یا رسول اللہ سفید دھاگے اور سیاہ دھاگے سے مراد کیا دو دھاگے ہی ہیں؟ آپ نے فرمایا اگر تم حقیقۃً دو دھاگے ہی سمجھ رہے ہو تو تم چوڑی گدی والے ہو (یعنی بے وقوف ہو) آپ نے فرمایا اس سے مراد دھاگے نہیں بلکہ رات کی سیاہی اور دن کی سفیدی مراد ہے۔ (درمنثور)

خیال رہے " عريض القفا " کا کنایۃً معنی بے وقوف لیا جاتا ہے " قفا " سر کے پچھلے حصہ کو کہا جاتا ہے۔

فائدہ: زیر بحث الفاظ مبارکہ ﴿ كُلُوْا وَاشْرَبُوْا ...... الخ ﴾ سے ایک مسئلہ یہ سمجھ آیا کہ طلوع فجر تک کھانا جائز ہے۔ اور اسی سے یہ سمجھ آیا کہ سحری کے وقت کھانا تناول کرنا مستحب ہے البتہ رخصت ہے اگر کوئی نہ کھائے تو مؤاخذہ نہیں لیکن اس پر عمل کرنا مستحب ہے۔ (از صابونی)

سحری کے کھانے کے متعلق احادیث مبارکہ:

" عن انس قال قال رسول الله ﷺ تسحروا فان فی السحور بركة "

(بخاری ومسلم، مشکوۃ کتاب الصوم)

حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا سحری کا کھانا تناول کرو بیشک سحری کے کھانے میں برکت ہے۔

وضاحت حدیث: (تسحروا) امر ندب كما اجمعوا عليه " سحری کے کھانے کا حکم وجوبی نہیں بلکہ استحبابی ہے یعنی سحری کے وقت کچھ نہ کچھ کھا لینا مستحب ہے دوسری حدیث شریف

میں ہے " تسحروا ولو بجرعة ماء " سحری کرو اگرچہ پانی کے ایک گھونٹ سے بھی کیوں نہ ہو۔ ابن حبان نے اس حدیث " تسحروا ولو بجرعة ماء " کو صحیح قرار دیا " وقیل انه ضعیف لکنه یعمل به فی فضائل الاعمال " البتہ بعض حضرات نے اس کو ضعیف کہا ہے لیکن ضعیف ہونے کے باوجود بھی اس پر عمل ہوگا کیونکہ فضائل اعمال میں ضعیف حدیث معتبر ہے۔

یہاں سے یہ بھی واضح ہو گیا کہ ہر حدیث کو ضعیف کہہ کر عبادات سے روکنا اور فضائل کو کم کرنا سوائے حماقت و جہالت کے اور کچھ نہیں۔ اور ساتھ یہ بھی خیال کریں کہ اگر ایک حدیث کو بعض حضرات صحیح قرار دیں اور بعض ضعیف تو دیکھا جائے اگر اس کا تعلق نیک اعمال اور فضائل انبیاء واولیاء سے ہے تو اس پر عمل کیا جائے یہی تقوی ہے ہاں اگر اس کا تعلق کچھ اعمال کی ممانعت سے ہے اور اس کے مقابل کوئی اور مثبت روایت نہیں تو پھر البتہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ تقوی یہ ہے کہ اس سے اجتناب کر لیا جائے لیکن حرمت ثابت کرنا پھر بھی ناجائز ہوگا۔

قاموس میں ذکر ہے " السحر هو قبیل الصبح " صبح سے تھوڑا پہلے وقت سحری کا وقت ہے اور کشاف میں ہے " هو السدس الاخیر من اللیل " رات کا آخری چھٹا حصہ ہے " وقیل وقته یدخل بنصف اللیل " اور یہ بیان کیا گیا ہے کہ سحری کا وقت آدھی رات سے داخل ہو جاتا ہے " السحور " سین پر فتح ہے سحری کے وقت کھانے، پینے کی اشیاء پر یہ لفظ بولا جاتا ہے " فان فی السحور برکة " بیشک سحری کے کھانے میں برکت ہے اس میں برکت کی ایک وجہ یہ ہے " لان فیه اجرا عظیما باقامة السنة " کہ سحری کھانا سنت ہے سنت پر عمل کرنا عظیم اجر و ثواب کا ذریعہ ہے۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ سحری کے وقت کھانے سے دن میں روزہ رکھنے کی طاقت حاصل ہوگی روزہ کو زیادہ بوجھ نہیں سمجھا جائے گا بلکہ خوش دلی سے عبادت سمجھ کر ادا کیا جائے گا جس سے اجر و ثواب حاصل ہوگا۔

علمی بحث کثیر فوائد پر مشتمل:

نہایہ میں ذکر کیا گیا ہے کہ حدیث شریف میں " سحور " کا جو ذکر ہے اس میں زیادہ طور پر مشہور سین کا فتح ہے :" **وقیل الصواب بالضم لانہ المصدر والاجر فی الفعل لافی الطعام** " بعض حضرات نے کہا کہ درست اس میں سین کا ضمہ ہے کیونکہ اس صورت میں مصدر ہے اور اجر مصدری معنی یعنی تناول کرنے میں ہے نہ کہ سحری کے وقت کھانے والی اشیاء (چیزوں) میں۔

ملا علی قاری رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ درست فتحہ ہے کیونکہ فعل پر ثواب اسی وقت حاصل ہوتا ہے جب وہ سنت کے مطابق ہو " **فاذا اثیب علی اثرہ فبا لاولی علی نفسہ** " جب ثواب ایک چیز کے اثر پر یعنی تناول کرنے پر ہوگا تو اس چیز پر ثواب تو یقیناً بہتر طریقہ سے حاصل ہوتا ہے۔

واضح ہوا کہ کھانے کی چیزیں حاصل کرنا اور ان کو تیار کرنا بھی باعث برکت ہے سحری کے وقت کھایا جانے والا کھانا بھی مبارک ہے اور اس کا تناول کرنا بھی باعث برکت ہے " **کما ورد فی الحدیث مداد العلماء افضل من دماء الشہداء** " جس طرح حدیث شریف میں ہے علماء کی سیاہی شہداء کے خون سے افضل ہے۔

واضح ہوا کہ علماء کا علمی اور فقہی مسائل لکھنا بھی افضل ہے اور لکھنے کے لئے استعمال ہونے والی سیاہی بھی افضل ہے۔ ابن ہمام رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ برکت سے مراد تقوی ہے کہ سحری کے کھانے میں روزہ رکھنے کی تیاری اور نیت پائی گئی جو تقوی کا سبب ہے اسی کو برکت سے تعبیر کر دیا گیا۔ اور سحری کے کھانے میں اس لئے بھی برکت ہے کہ نبی کریم ﷺ کی سنت پر عمل پایا جاتا ہے۔

(ماخوذ از مرقاۃ ج ۴ ص ۲۵۱)

☆ " **وعن عمرو بن العاص قال قال رسول اللہ ﷺ فصل ما بین صیامنا وصیام اھل الکتاب اکلۃ السحر** " (رواہ مسلم۔ مشکوۃ کتاب الصوم)

حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہمارے اور اہل کتاب کے روزوں میں فرق سحری کے کھانے سے ہے۔

وضاحت حدیث: " اکلة "ہمزہ کے فتحہ سے مصدری معنی کا بھی احتمال ہے جیسا کہ راقم نے ترجمہ کیا ہے اور یہ بھی احتمال ہے کہ "ایک مرتبہ کھانا" معنی لیا جائے اور ہمزہ کے ضمہ سے لقمہ معنی بھی لیا جا سکتا ہے تاہم راقم کے نزدیک وہی معنی درست ہے جو تحریر کر دیا۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اہل کتاب پر سونے کے بعد کھانا پینا حرام کر دیا تھا یا مطلقاً افطار کے بعد پھر دوبارہ ان پر کھانا پینا منع کر دیا تھا لیکن اللہ تعالیٰ نے ہم پر ابتداء اسلام میں حرام کر دیا تھا لیکن بعد میں اس حرمت کو اٹھا لیا گیا" **ومخالفتنا ایاھم تقع موقع الشکر لتلک النعمة** " اس لئے ہم پر اللہ تعالیٰ نے یہ انعام فرمایا ہے تو اس انعام کے لحاظ سے ہمارا ان سے مختلف ہونا تقاضا کرتا ہے کہ ہم اس کا شکر کریں۔ (مرقاۃ ج ۴ ص ۲۵۱)

☆ " **وعن العرباض بن سارية قال دعانی رسول الله ﷺ الی السحور فی رمضان فقال هلم الی الغداء المبارک** "

(رواه ابو داود والنسائی ، مشکوة کتاب الصوم)(ورواه ابن خزیمه وابن حبان فی صحیحیها)

حضرت عرباض بن ساریہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں مجھے رسول اللہ ﷺ نے رمضان میں سحری کے کھانے کی طرف بلایا اور فرمایا آؤ صبح کے مبارک کھانے کی طرف۔

وضاحت حدیث: " هلم "مبنی بر فتحہ ہے اس کا معنی ہے " **تعال** " آؤ۔ کبھی اس کا معنی ہوتا ہے لاؤ حاضر کرو جیسا کہ " **هلم شهداء کم** "میں معنی لیا گیا ہے " **احضروهم** " گواہ حاضر کرو۔ یہ لفظ واحد، تثنیہ، جمع اور مذکر و مؤنث سب کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ "الغداء" (غین کے فتحہ سے) صبح کے کھانے کو کہا جاتا ہے سحری کے کھانے کو صبح کا کھانا کہنے میں یہ حکمت تھی کہ یہ کھانا چونکہ صبح کے کھانے کی طرح دن میں کفایت کرتا ہے۔

☆ " **عن ابی هريرة قال قال رسول الله ﷺ نعم سحور المؤمن التمر** "

(رواه ابو داود ، مشکوة کتاب الصوم)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا مؤمن کا سحری کا بہترین کھانا کھجور ہے۔

وضاحت حدیث: علامہ ابن طیبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے سحری کے وقت کھجور کھانے کی تعریف بیان فرمائی، حالانکہ سحری کے وقت کوئی چیز بھی کھائی جائے تو اس میں برکت

ہوتی ہے " وتخصیصه بالتمر بركة علی بركة " اور کھجور کے ساتھ خاص کرنے میں برکت پر برکت ہے۔ پھر خاص کر کے اگر کھجور کے ساتھ افطار بھی کرے تو اس میں اور ہی زیادہ برکت ہو گی "لیكون المبدؤه به والمنتهی الیه البركة " کیونکہ روزہ کی ابتداء بھی بابرکت چیز سے ہو گی اور انتہاء بھی بابرکت چیز ہے۔ (مرقاۃ ج ۴ ص ۲۵۹)

مسئلہ : جب صبح صادق تک کھانے، پینے اور جماع کرنے کی اجازت دی گئی ہے تو اگر یقین ہو جائے کہ صبح صادق ہو چکی ہے تو روزہ رکھنے والے کے لئے اس وقت کھانا پینا حرام ہو گا۔ یہی حکم ظن غالب کا ہے یعنی جب غالب گمان ہو کہ صبح صادق ہو چکی ہو گی اس وقت کھانا، پینا اور جماع کرنا منع ہے اس وقت کھانے اور پینے سے روزہ نہیں ہو گا۔ اور اگر غالب گمان ہو کہ صبح نہیں ہوئی تو اس وقت کھانا اور پینا مباح ہے لیکن اگر غالب گمان تھا کہ صبح نہیں ہوئی کھا، پی لیا بعد میں صبح ہونے کا یقین ہو گیا کہ صبح ہو جانے پر میں نے کھانا کھا لیا تھا تو اس روزہ کی قضاء لازم ہے۔ (از کبیر) یہی مطلب ہے اس حدیث کا:

" عن ابی هریرة قال قال رسول الله ﷺ اذا سمع النداء احدكم والاناء فی یده فلا یضعه حتی یقض حاجته منه "

(رواه ابو داؤد، مشكوة كتاب الصوم)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جب کوئی ایک تم سے نداء (اذان) سنے ایسے حال میں کہ برتن اس کے ہاتھ میں ہو تو برتن نہ رکھے یہاں تک کہ اس سے اپنی حاجت پوری کر لے۔

وضاحت حدیث : بظاہر مطلب یہ ہے کہ روزہ رکھنے والا شخص جب اذان سنے تو اس کے ہاتھ میں کھانے، پینے والا برتن ہو تو کھا، پی لے اسی وقت رکھ نہ دے لیکن یہ حکم مطلق نہیں بلکہ اس کا مطلب یہ ہے " وهذا اذا علم او ظن عدم الطلوع " یہ حکم اس وقت ہے جب یہ یقین ہو جائے یا غالب گمان ہو کہ صبح طلوع نہیں ہوئی۔ اس سے زیادہ واضح عبدالمالک رحمہ اللہ کا قول ہے وہ فرماتے ہیں:

" هذا اذا لم یعلم طلوع الصبح اما اذا علم انه قد طلع او شک فیه فلا "

یہ حکم اس وقت ہے کہ جب صبح صادق کے طلوع ہونے کا یقین نہ ہو۔ لیکن جب یقین ہو جائے کہ صبح طلوع ہو چکی ہے یا شک واقع ہو رہا ہو صبح کے طلوع ہونے میں تو کھانا، پینا چھوڑ دینا لازم ہے۔

نبی کریم ﷺ کا دوسرا ارشاد گرامی اسی وضاحت کی تائید کررہا ہے آپ فرماتے ہیں:

" ان بلا لا یؤذن بلیل فکلوا واشربوا حتی یؤذن ابن ام مکتوم "

بیشک بلال رات کو اذان کہتے ہیں اس وقت کھاؤ اور پیو یہاں تک کہ ابن ام مکتوم اذان کہیں۔

یعنی حضرت بلال رضی اللہ عنہ سحری کے وقت تہجد کی نماز کے لئے اذان کہتے تھے اس وقت روزہ رکھنے کی غرض سے کھانا، پینا جائز تھا لیکن حضرت عبداللہ بن ام مکتوم صبح صادق کے وقت اذان کہتے تھے اس وقت پہلے کلمہ کے ساتھ ہی کھانے اور پینے سے رک جانا لازم تھا۔

راقم کا موقف تو یہ ہے کہ آج کل گھڑیوں کا دور ہے صبح صادق کا وقت معین ہوتا ہے لیکن پھر بھی احتیاط اسی میں ہے کہ معین وقت سے تین چار منٹ پہلے کھانے سے رک جائیں۔ راقم خود پانچ منٹ پہلے ضرور کھانا، پینا چھوڑ دیتا ہے۔ یعنی اصل مسئلہ اذان کی ہونے یا نہ ہونے سے متعلق نہیں بلکہ " ان المعتبر اول طلوع الصبح عند جمهور العلماء " جمہور علماء کے نزدیک صبح صادق کا طلوع ہونا ہی معتبر ہے کہ اس وقت کھانا پینا چھوڑ دے۔ (ماخوذ از مرقاۃ ج ۴ ص ۲۵۴، ۲۵۵)

دینی طلباء کرام کی توجہ کے لئے:

﴿ مِنَ الْفَجْرِ ﴾ میں " من " بیانیہ ہے اسلئے راقم نے اس کا معنیٰ "یعنی" کیا ہے:

" ومن الفجر بيان للخيط الابيض كانه قيل الخيط الابيض الذى هو الفجر "

یعنی آیۂ کریمہ میں ﴿ مِنَ الْفَجْرِ ﴾ بیان ہے " الخيط الابيض " کا گویا کہ کہا گیا ہے کہ کھاؤ اور پیو یہاں تک کہ ظاہر ہوجائے تمہارے لئے سفید دھاگہ، سفید دھاگہ وہ فجر ہے اس کو مختصر طور پر یعنی فجر ہے سے راقم نے بیان کردیا۔

" من " بیانیہ لانے کی ضرورت اسی لئے درپیش آئی کہ ذکر تشبیہ کا تھا لیکن بعض صحابہ کرام نے حقیقی سمجھ کر دھاگے ہی مراد لے لئے تھے تو اسے واضح کردیا گیا اب بظاہر وہم یہ ہے کہ ﴿ مِنَ الْفَجْرِ ﴾ تو صرف ﴿ اَلْخَيْطُ الْاَبْيَضُ ﴾ کا بیان ہوسکتا ہے ﴿ اَلْخَيْطُ الْاَسْوَدِ ﴾ کا نہیں ہوسکتا۔ تو چاہیے تھا کہ ﴿ اَلْخَيْطُ الْاَسْوَدِ ﴾ کا بیان " مِنَ الَّيْلِ " سے آتا ایسا کیوں نہیں کیا گیا؟ اس کا جواب یہ

ہے کہ جب ایک لفظ کا بیان آ گیا تو اتنا واضح ہو گیا کہ سفید دھاگہ سے مراد حقیقی دھاگہ نہیں بلکہ تشبیہ کے طور پر مراد فجر ہے اسی سے خود واضح ہو گیا کہ سیاہ دھاگہ سے مراد رات ہے۔ (از شیخ زادہ)

ثُمَّ اَتِمُّوا الصِّيَامَ اِلَى الَّيْلِ : ''پھر تم پورا کرو روزں کو رات تک'' "بیان آخر وقتہ واخراج اللیل عنه ونفی صوم الوصال" (بیضاوی) یعنی یہاں سے تین مسئلے ذکر کئے گئے ہیں ایک یہ کہ روزہ کا آخری وقت رات کا آ جانا ہے۔ دوسرا یہ ثابت کیا گیا کہ رات خود روزے میں داخل نہیں۔ یہ شان نزول سے واضح ہو چکا ہے۔ اور تیسرا مسئلہ یہ ثابت ہوا کہ صوم وصال منع ہے۔ تینوں مسائل کو واضح طور پر انشاءاللہ بیان کیا جا رہا ہے۔

رات سے مراد کیا ہے: اس مسئلہ کو سمجھنے کے لئے ایک حدیث پاک اور اس کی شرح کی طرف توجہ فرمائیں:

☆ "وعن عمر قال قال رسول الله ﷺ اذا اقبل الليل من ههنا وادبر النهار من ههنا وغربت الشمس فقد افطر الصائم" (بخاری، مسلم مشکوۃ کتاب الصوم)

حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جب یہاں سے رات آ جائے اور یہاں سے دن پیٹھ پھیر جائے اور سورج غروب ہو جائے تو روزہ دار روزہ افطار کر لے۔

وضاحت حدیث : (اذا اقبل الليل) ای ظلامه (من ههنا) ای جانب الشرق" جب یہاں سے رات آ جائے کا مطلب یہ ہے کہ آپ نے مشرقی جانب اشارہ کر کے فرمایا کہ مشرقی جانب جب اندھیرا ہو جائے۔

(وادبر النهار) ای ضياءه (من ههنا) ای جانب الغرب"

پھر مغربی جانب اشارہ کرتے ہوئے فرمایا کہ ادھر سے دن کی روشنی پیٹھ پھیر جائے (وغربت الشمس) بفتح الراء ای غابت الشمس كلها" پھر اس کی اور وضاحت فرمائی کہ سورج مکمل طور پر غروب ہو جائے۔ یعنی ایسا نہ ہو کہ سورج ابھی تک مکمل غروب ہی نہ ہو تو روزہ افطار کر کے تمام دن کی محنت کو ضائع کر بیٹھو۔

رات کے دو وصف ذکر کر کے یہ واضح کیا:

"ان غروبها عن العيون لا يكفى لانها قد تغيب ولا تكون غربت حقيقة فلا بد من اقبال الليل"

کہ صرف آنکھوں سے سورج کا چھپ جانا کافی نہیں کیونکہ کبھی حقیقۃً غروب نہیں ہوتا اس لئے ضروری ہے کہ رات متوجہ ہو اور دن پیٹھ پھیرے۔ (مرقاۃ ج ۴ ص ۲۵۲)

" والمراد بالغروب زمان غیبوبة جرم الشمس بحیث تظهر الظلمة فی جهة الشرق قال ﷺ اذا اقبل اللیل من ههنا فقد افطر الصائم ای اذا وجدت الظلمة حسا فی جهة المشرق فقد ظهر وقت الفطر "
(شامی ج ۲ ص ۸۹)

روزہ صبح صادق سے لے کر غروب آفتاب تک ہے غروب سے مراد سورج کی ٹکیہ کا چھپ جانا ہے اس لحاظ پر کہ مشرقی جانب تاریکی ہو جائے کیونکہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا جب رات ادھر سے چھا جائے تو روزہ دار روزہ افطار کرلے یعنی جب مشرقی جانب تاریکی محسوس ہونے لگے تو فطر کا وقت ظاہر ہوگا۔

رات روزہ کے حکم سے خارج ہے:

چونکہ آیۃ کریمہ میں " الی اللیل " غایۃ امتداد ہے غایۃ امتداد اپنے مغیا سے خارج ہوتی اس لئے روزہ رات کو نہیں رکھا جاتا بخلاف اس کے کہ وضو کے حکم میں کلائیوں کے دھونے کی غایۃ " الی المرافق " ذکر کی گئی اور پاؤں کے دھونے کی غایۃ " الی الکعبین " ذکر کی گئی لیکن ان دونوں مقاموں میں " غایة اسقاط " ہے جہاں غایۃ اسقاط ہو وہاں غایۃ اپنے مغیا میں داخل ہوتی ہے اس لئے وضو میں کہنیوں اور ٹخنوں کا دھونا فرض ہے۔ (اس بحث کا تعلق دینی طلباء کرام سے ہے)۔

روزہ جلدی افطار کرے:

" عن سهل قال قال رسول الله ﷺ لا یزال الناس بخیر ما عجلوا الفطر " (بخاری ، مسلم ، مشکوۃ کتاب الصوم)

حضرت سہل رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا یہ لوگ ہمیشہ بھلائی پر قائم رہیں گے جب تک وہ جلدی افطار کرتے رہیں گے۔ روزہ کے جلدی افطار کرنے کو کیوں پسند کیا گیا؟

" فان فی التعجیل مخالفة اهل الکتاب فانهم یؤخروه الی اشتباک النجوم "

جلدی افطار کرنے کو اس لئے مختار قرار دیا گیا کہ اس میں اہل کتاب کی مخالفت پائی گئی کیونکہ وہ

ستاروں کے خلط ملط ہونے تک افطار میں تاخیر کرتے تھے " ثم صار عادة لاهل البدعة فی ملتنا " پھر ہماری ملت میں اہل بدعت نے اپنی عادت یہ بنالی کہ وہ روزہ دیر سے افطار کرتے ہیں۔

بعض حضرات نے یہ کہا تھا کہ اگر روزہ اس لئے دیر سے افطار کرے کہ وہ اپنے نفس پر تنگی کررہا ہے روزہ افطار کرنے میں تاخیر کے واجب ہونے کا عقیدہ نہیں رکھتا تو اس میں کوئی حرج نہیں، کوئی ضرر نہیں لیکن ملا علی قاری رحمہ اللہ اسے رد کرتے ہیں " اقول بل یضرہ حیث یفوتہ السنة " فرماتے ہیں کہ میں کہتا ہوں اس میں سنت کی ترک کی وجہ سے ضرر (نقصان) لازم آتا ہے مزید آپ بیان فرماتے ہیں:

" ان فی التعجیل اظهار العجز المناسب للعبودیة ومبادرة الی قبول الرخصة "

کہ روزہ جلدی افطار کرنے میں اظہار وعجز پایا جائے گا کیونکہ اس میں اپنی عبودیت کا اقرار پایا جاتا ہے اور رخصت کی قبولیت کی طرف جلدی پائی جاتی ہے " ویؤیده ما صح ان الصحابة کانوا اعجل الناس افطارا وابطاهم سحورا " اور اس کو صحابہ کرام کے عمل سے تائید ملتی ہے کہ وہ جلدی افطار کرتے تھے اور سحری میں تاخیر کرتے تھے۔ (از مرقاۃ ج ۴ ص ۲۵۲) بعض حضرات کا قول یہ ہے کہ رات کا کچھ حصہ گزر جائے تاکہ دن کا گزرنا یقینی ہو جائے تو پھر روزہ افطار کیا جائے۔ اس کے متعلق علامہ بدالدرین ابو محمد محمود بن احمد عینی رحمہ اللہ لکھتے ہیں " ولا یجب امساک جزء من اللیل لتحقق مضی النهار " رات کے کچھ حصہ میں افطار سے رکنا کوئی واجب نہیں کہ دن کا گزرنا یقینی طور پر ثابت ہو جائے۔ (عمدۃ القاری ج ۱۱ ص ۶۵)

☆ " عن ابی هریرة قال قال رسول اللہ ﷺ قال اللہ تعالیٰ احب عبادی الی اعجلهم فطرا "
(رواہ الترمذی۔ مشکوۃ کتاب الصوم)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ تعالیٰ فرماتا ہے میرے بندوں میں سے وہ مجھے پسند ہیں جو جلدی افطار کرتے ہیں۔

وضاحت حدیث:

" وقال الطیبی ولعل السبب فی هذه المحبة المتابعة للسنة

والمباعدة عن البدعة والمخالفة لاهل الکتاب ''

علامہ طیبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ جلدی افطار کرنے والوں کو اللہ اس لئے پسند کرتا ہے کہ وہ سنت کی تابعداری کرتے ہیں اور بدعت سے دور رہتے ہیں اور اہل کتاب کی مخالفت کرتے ہیں ۔ اور اس امت کی افضلیت ثابت ہوئی کہ وہ حدیث پاک کی متابعت کرنے کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کے محبوب بن جاتے ہیں اور اس آیہ کریمہ کا مصداق بن جاتے ہیں:

﴿ قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ ﴾

'' اے محبوب تم فرمادو کہ لوگو اگر تم اللہ کو دوست رکھتے ہو تو میرے فرمانبردار ہو جاؤ اللہ تمہیں دوست رکھے گا'' ۔

(مرقاۃ ج ۴ ص ۲۵۵)

☆ '' عن ابی عطیة قال دخلت انا و مسروق علی عائشة فقلنا یا ام المؤمنین رجلان من اصحاب محمد ﷺ احدهما یعجل الافطار ویعجل الصلوة والآخر یؤخر الافطار ویؤخر الصلوة قالت ایهما یعجل الافطار ویعجل الصلوة فقلنا عبد الله بن مسعود قالت هکذا صنع رسول الله ﷺ والآخر ابو موسی '' (رواہ مسلم ، مشکوۃ کتاب الصوم)

حضرت ابو عطیہ کہتے ہیں میں اور مسروق (دونوں تابعی ہیں) حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے پاس حاضر ہوئے اور ہم نے کہا اے ام المؤمنین (مومنوں کی ماں) نبی کریم ﷺ کے دو صحابیوں میں سے ایک جلدی افطار کرتے ہیں اور جلدی (مغرب کی) نماز ادا کرتے ہیں اور دوسرے دیر سے افطار کرتے ہیں اور دیر سے نماز ادا کرتے ہیں آپ نے فرمایا ان دونوں میں سے کون جلدی افطار کرتے ہیں اور جلدی نماز ادا کرتے ہیں تو ہم نے کہا وہ عبداللہ بن مسعود ہیں آپ نے فرمایا اسی طرح رسول اللہ ﷺ نے کیا ہے (یعنی وہ بھی جلدی کرتے تھے) اور دوسرے صحابی (جو دیر کرتے تھے وہ) ابوموسیٰ اشعری ہیں۔

وضاحت حدیث : '' قال الطیبی الاول عمل بالعزیمة والسنة والثانی بالرخصة ''

علامہ طیبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کا عمل عزیمت (عمل میں فوقیت) پر تھا اور حضرت ابوموسی اشعری رضی اللہ عنہ کا عمل رخصت پر تھا۔ ملا علی قاری رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

'' والاحسن ان یحمل عمل ابن مسعود علی السنة وعمل ابی موسی علی

بیان الجواز کما سبق من عمل عمرو عثمان رضی اللہ عنہم اجمعین "

بہتر یہ ہے کہ یہ کہا جائے کہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کا عمل سنت کے مطابق تھا اور حضرت ابوموسی اشعری رضی اللہ عنہ کا عمل بیان جواز پر تھا۔ جیسا کہ حضرت عثمان اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما کا بھی دیر سے افطار کرنا بیان جواز کے لئے تھا۔ اگر چہ بعض حضرات نے یہ کہا تھا کہ حضرت ابوموسی اشعری رضی اللہ عنہ کی تاخیر کی وجہ عذر ہو کہ آپ تک یہ بات نہ پہنچی ہو کہ نبی کریم ﷺ جلدی افطار کرتے تھے۔ لیکن اس قول کو علامہ ابن حجر عسقلانی رحمہ اللہ نے رد کیا ہے کہ یہ درست نہیں۔ (مرقاۃ ج ۴ ص ۲۵۹)

☆ " عن ابی هریرة قال قال رسول الله ﷺ لا یزال الدین ظاهرا ما عجل الناس الفطر لان الیهود والنصاری یؤخرون " (رواه ابو داؤد وابن ماجه ، مشکوة کتاب الصوم)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا دین ہمیشہ ظاہر رہے گا جب تک لوگ جلدی افطار کرتے رہے کیونکہ یہود ونصاری روزہ دیر سے افطار کرتے تھے۔

وضاحت حدیث : (ظاهرا) ای غالبا وعالیا او واضحا ولائحا "

دین ہمیشہ ظاہر رہے گا ظاہر کا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ دین ہمیشہ غالب رہے گا اور دین ہمیشہ بلند رہے گا۔ اور یہ معنی بھی مراد لیا جا سکتا ہے کہ دین ہمیشہ ظاہر، واضح اور روشن رہے گا جب تک لوگ جلدی افطار کرتے رہے کیونکہ یہود ونصاری دیر سے افطار کرتے ہیں۔ اسی سے یہ واضح ہوا:

" ان قواما الدین الحنیفی علی مخالفة الاعداء من اهل الکتاب وان موافقتهم تلفاللدین "

کہ بیشک دین حنیف کا قیام دشمن اہل کتاب کی مخالفت پر ہے اور یہود ونصاری کی موافقت پر دین کو ضائع کرنا لازم آئے گا۔

راقم کا موقف:

راقم خود تو اگر چہ روزہ افطار کرنے میں تعجیل کا قائل ہے لیکن محققین اہل سنت و جماعت جو تاخیر کے قائل ہیں ان پر زبان طعن دراز کرنے کو بھی حماقت سمجھتا ہے۔ جب صحابہ کرام میں سے حضرت ابوموسی اشعری، حضرت عمر اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہم بھی تاخیر پر عمل کرتے تھے بلکہ ایک روایت میں

حضرت عثمان اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما کا نماز کے بعد بھی روزہ افطار کرنا ثابت ہے۔

(طحاوی ج اول باب مواقیت الصلوۃ ص ۱۰۷)

تو تحقیق کے اختلاف کو تحقیق پر مبنی ہی قرار دیا جائے۔

جب میں شیخ الاسلام خواجہ قمر الدین سیالوی، استاذی المکرم حضرت مولانا حافظ عطاء محمد بندیالوی اور مفکر اسلام اور مفسر قرآن حضرت پیر محمد کرم شاہ رحمھم اللہ جیسی ہستیوں کو تاخیر کا قائل دیکھتا ہوں تو سمجھتا ہوں کہ یہ اختلاف رحمت ہے اور صحابہ کرام کے مختلف اعمال کے مطابق ہی یہ اختلاف بھی ہے۔

پیر صاحب فرماتے ہیں "پہلے روزہ کی ابتداء کا وقت بتایا اب اس کے اختتام کا وقت بتایا جارہا ہے صبح صادق سے لے کر رات کے آنے تک روزہ رکھو۔ حضور علیہ السلام نے اپنے ارشاد سے وضاحت فرما دی " اذا ادبر النھار من ھھنا واقبل اللیل من ھھنا " جب ادھر (مغرب) سے دن پیٹھ پھیر دے اور ادھر (مشرق) سے رات آجائے وہ وقت ہے افطار کا۔ بعض لوگ روزے کے افطار میں اتنی جلدی کرنے لگے ہیں کہ سورج بھی صحیح طور پر غروب نہیں ہوتا کہ وہ افطار کا نقارہ بجادیتے ہیں۔

(ضیاء القرآن)

راقم ایک سال سلانوالی ضلع سرگودھا میں بھی استاذی المکرم حضرت ابو الحسنات محمد اشرف سیالوی مدظلہ العالی سے پڑھتا رہا وہاں رمضان میں رہنے والے طلباء نے بتایا کہ ایک دن روزہ جلدی افطار کرانے والوں نے افطار کرادیا جب کہ ابھی سورج مکمل غروب نہیں ہوا تھا۔ راقم نے بھی تین سال پہلے رمضان میں پولی کلینک اسلام آباد سے واپس آتے ہوئے صدر روڈ پر یہی کیفیت دیکھی کہ ایک مسجد سے اذان کی آواز آرہی ہے جب کہ سورج کا ایک کنارہ غروب ہونے سے رہتا ہے خدارا اتنا ظلم عظیم بھی نہ کیا جائے۔

خیال رہے کہ راقم کا خاندان کئی پشتوں سے علمی چلا آرہا ہے راقم کے پردادا قاضی غلام نبی رحمہ اللہ کے دو بیٹے تھے قاضی فیض احمد اور قاضی رسول احمد رحمھما اللہ ان کا زمانہ تو راقم نے نہ پایا البتہ قاضی فیض احمد صاحب کے دو بیٹے قاضی عبدالعزیز رحمہ اللہ (راقم کے والد) اور قاضی غلام ربانی رحمہ اللہ اور قاضی رسول احمد رحمہ اللہ کے دو بیٹے قاضی عبدالواحد اور قاضی عبدالخالق رحمھما اللہ کا زمانہ پایا۔ تمام ہی

فقہی مسائل میں بہت زیادہ سمجھ رکھتے تھے۔ان چار بھائیوں میں تین سوائے قاضی عبد الخالق رحمہ اللہ کے سب ہی تاخیر کے قائل تھے۔ بلکہ قاضی عبد الواحد رحمہ اللہ نے یہی حدیث جو بھی ضیاء القرآن کے حوالہ سے پیش کی بیان کرنے کے بعد فرمایا کہ بزرگ (قاضی رسول احمد صاحب) بھی اسی کے قائل تھے۔ ۔تاہم راقم گاؤں میں تین سال امام رہا ایک مرتبہ چچا صاحب، قاضی عبد الخالق رحمہ اللہ نے میرے تاخیر سے روزہ افطار کرانے پر ناراضگی کا اظہار فرمایا جب میں نے عرض کیا کہ چچا عبد الواحد صاحب نے تو مجھے مسئلہ اس طرح بتایا اور ساتھ یہ بھی بتایا کہ والد رحمہ اللہ بھی اسی کے قائل تھے تو آپ نے اپنی عادت شریفہ کے مطابق بڑے پیار ومحبت سے فرمایا بچے جی تحقیق کا اختلاف رحمت ہے۔اسی وقت سے راقم کا موقف بدل گیا پھر کچھ خود بھی کتابوں کو دیکھنے کی صلاحیت حاصل ہوگئی۔تاہم بزرگوں کے خلاف لب کشائی کا قائل نہیں۔

صوم وصال کی ممانعت:

" وعن ابی هریرة قال نهی رسول الله ﷺ عن الوصال فی الصوم فقال له رجل انک تواصل یا رسول الله قال وایکم انی ابیت یطعمنی ربی ویسقینی " (بخاری، مسلم، مشکوة کتاب الصوم)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں نبی کریم ﷺ نے صوم وصال سے منع فرمایا تو ایک شخص نے عرض کیا یا رسول اللہ بیشک آپ خود تو صوم وصال رکھتے ہیں آپ نے فرمایا تم میں سے میری مثل کون ہوسکتا ہے۔ بیشک میں رات (اپنے رب کے ہاں) گزارتا ہوں میرا رب مجھے کھلاتا اور پلاتا ہے۔

وضاحت حدیث: صوم وصال کیا ہیں؟ " تتابع الصوم من غیر افطار باللیل " صوم وصال یہ ہیں کہ روزہ رکھا جائے اور افطار کے وقت روزہ افطار نہ کیا بلکہ بغیر افطار کرنے کے دن کے روزہ کے ساتھ رات کا روزہ بھی پایا جائے صوم وصال کے منع کرنے میں حکمت یہ تھی کہ اسطرح روزہ رکھنے سے ضعف پیدا ہوگا ملال ہوگا عبادت کی ادائیگی میں کوتاہی واقع ہوگی اور یہ بھی خیال رہے کہ مختار مذہب یہ ہے کہ صوم وصال سے نہی تحریم پر مبنی ہے۔

ایک صحابی نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ آپ خود تو صوم وصال رکھتے ہیں۔ صحابی کا یہ کہنا تعجب کی وجہ سے تھا کہ اس میں حکمت کیا ہے کہ آپ خود تو صوم وصال رکھتے ہیں اور ہمیں منع کرتے ہیں۔ نبی کریم ﷺ کا جواب کیا ہی حکیمانہ تھا "ایکم مثلی" تم میں سے میری مثل کون ہو سکتا ہے۔ یعنی میں صوم وصال رکھوں تو میری طاقت میں کوئی کمی نہیں ہو سکتی مجھے ایسا ضعف لاحق نہیں ہو سکتا جو عبادت سے روکنے کا ذریعہ بنے پھر اس کی وضاحت ان الفاظ سے فرمادی "ان ابیت یطعمنی ربی ویسقینی" بیشک میں رات گزارتا ہوں میرا رب مجھے کھلاتا اور پلاتا ہے۔

بعض حضرات نے کھلانے اور پلانے سے مراد جنت کے کھانے اور مشروبات لئے ہیں لیکن مولنا عبدالحلیم رحمہ اللہ نے قمر الاقمار حاشیہ نور الانوار میں اسے رد کیا ہے اور ملا علی قاری رحمہ اللہ بھی بیان فرماتے ہیں "وان الوصال مع تناول الطعام والشراب من المحال" بیشک کھانے اور پینے کے ساتھ ساتھ صوم وصال کا پایا جانا محال ہے صوم وصال تو وہی ہو سکتے ہیں کہ افطار کے وقت نہ کھایا جائے اور نہ پیا جائے۔ پھر اس کھلانے اور پلانے سے کیا مراد ہے؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ اس سے مراد یہ ہے کہ میں اللہ تعالیٰ کے انوار کی تجلیات کا مشاہدہ کرتا ہوں تو مجھے کھانے اور پینے کی حاجت ہی نہیں رہتی۔

ایک اور طویل حدیث حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے جس میں یہ الفاظ آتے ہیں:

"فاخذ یو اصل رسول اللہ ﷺ وذلک فی آخر الشهر فاخذ رجال من اصحابه واصلون فقال النبی ﷺ ما بال رجال واصلون انکم لستم مثلی اما واللہ لو تماد بی الشهر لو اصلت وصالا یدع المتعمقون بتعمقهم"

کہ نبی کریم ﷺ نے رمضان کے آخر میں صوم وصال شروع کئے تو صحابہ کرام نے بھی صوم وصال شروع کئے تو حضور ﷺ نے فرمایا لوگوں کا کیا حال ہے کہ وہ صوم وصال رکھتے ہیں بیشک تم میری مثل نہیں ہو سکتے۔ خبردار قسم ہے اللہ تعالیٰ کی میں ایک مہینہ بھی صوم وصال رکھنا چاہوں تو رکھ سکتا ہوں بڑی گہرائی میں ڈوب کر عبادت کرنے والے گہرائی میں ڈوبنا چھوڑ دیں (یعنی انہیں اس کی طاقت ہی

حاصل نہیں ہوگی)۔

یہ بھی خیال رہے کہ صحابہ کرام کے صوم وصال کی وجہ سے ضعف کو دیکھ کر نبی کریم ﷺ نے منع فرمایا:" ان النبی ﷺ واصل باصحابه یومین حین ابوا ان ینتهوا " بیشک نبی کریم ﷺ نے اپنے صحابہ کرام کے صوم وصال پر خاموشی رکھی یعنی ان کو ابتدائی طور پر اجازت دے رکھی لیکن وہ دوسرے دن ہی نڈھال ہو گئے دوسرے دن روزہ کو مکمل کرنے کی طاقت نہیں رہی۔

(از عمدۃ القاری ج ۱۱ ص ۷۲)

اعتراض: اس آیۃ کریمہ سے معلوم ہوا کہ روزہ رات میں افطار کیا جائے تو جس جگہ کئی کئی ماہ کا دن ہوتا ہے وہاں روزہ کی کیا صورت ہوگی؟

جواب: اس کے چند جواب ہیں ایک یہ کہ ایسی جگہ آبادی ہی نہیں کیونکہ وہاں سردی سخت ہے دوسرا جواب اگر وہاں آبادی بھی ہو تو وہاں کے باشندے ماہ رمضان پائیں گے ہی نہیں لہذا ان پر روزہ واجب ہی نہیں۔ جیسے کہ بہت سے علماء کرام نے فتوی دیا ہے کہ جس زمانہ میں بلغار یا لندن میں عشاء کا وقت آتا ہی نہ ہو یعنی شفق غائب ہی نہ ہوتا ہو ان پر نماز عشاء واجب ہی نہیں کیونکہ انہوں نے وقت ہی نہیں پایا۔ یا جیسے کہ جس شخص کے ہاتھ و پاؤں نہ ہوں اس پر وضو کے فرض فقط دو ہیں منہ دھونا اور سر کا مسح کیونکہ اس کے پاس باقی فرضوں کا محل ہی نہیں۔ (شامی کتاب الصلوۃ)

راقم کہتا ہے یہ اس وقت ہے جب کٹے ہوئے ہاتھوں سے منہ دھو سکے اور سر کا مسح کر سکے اگر ایسا نہ کر سکے تو اس سے وضوء مکمل ساقط ہو جائے گا کیونکہ وضو میں غیر سے امداد طلب کرنی امام اعظم رحمہ اللہ کے نزدیک واجب نہیں)۔ رب فرماتا ہے:

﴿ فَمَنْ شَهِدَ مِنكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ ﴾ "جو رمضان پائے وہ روزہ رکھے"۔

انہوں نے رمضان پایا ہی نہیں لہذا روزہ واجب نہیں۔

تیسرا جواب ایسے لوگوں پر روزہ کا فدیہ واجب ہے اور ان پر یہ آیۃ صادق ہے ﴿ وَعَلَى الَّذِينَ يُطِيقُونَهُ فِدْيَةٌ طَعَامُ مِسْكِينٍ ﴾ یہ جواب اعلیٰ حضرت مولنا احمد رضا خان رحمہ اللہ نے دیا ہے اور یہی قوی ہے۔

اعتراض: جب ماہ رمضان روزہ کا سبب ہے اور وہ انہیں نہ ملا تو ان پر فدیہ کیونکر واجب ہوا فدیہ تو روزہ کا عوض ہے۔

جواب: حدیث شریف میں ہے کہ دجال کے ظہور کا پہلا دن ایک سال کا ہوگا دوسرا ایک ماہ کا صحابہ کرام نے پوچھا کہ اس دن میں نمازوں کا کیا حکم ہے؟ آپ نے فرمایا حساب لگا کر پڑھنا۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ نماز کے لئے اس دن حکمی وقت معتبر ہے اور چونکہ وہ دن ایک سال کا ہے لہذا روزے بھی ضرور رکھیں جائیں گے کیونکہ روزہ بھی نماز کی طرح فرض ہے۔ (نعیمی)

راقم کے نزدیک نمازیں اوقات کا حساب کر کے پڑھی جائیں روزہ کی ابتداء اور انتہاء کا وقت محسوس ہو خواہ بہت قلیل ہی کیوں نہ ہو تو روزہ رکھے ورنہ فدیہ دے۔

وَلَا تُبَاشِرُوْهُنَّ وَاَنْتُمْ عَاكِفُوْنَ فِي الْمَسَاجِدِ: ''اور ہاتھ نہ لگاؤ ان (عورتوں) کو ایسے حال میں کہ جب تم اعتکاف میں ہو مساجد میں''۔ آیئے سب سے پہلے راقم کی تسکین الجنان فی محاسن کنز الایمان کا ایک ورق دیکھیے۔

فَالْآنَ بَاشِرُوْهُنَّ:

- ☆ ''پھر ملو اپنی عورتوں سے'' (محمود الحسن صاحب)
- ☆ ''اب تم اپنی بیویوں کے ساتھ شب باشی کرو''۔ (مودودی صاحب)
- ☆ ''سو اب تم ان سے ملو ملاؤ'' (عبد الماجد صاحب)
- ☆ ''اب (تم کو اختیار ہے کہ) ان سے مباشرت کرو''۔ (فتح محمد صاحب)
- ☆ ''پس اب ملا کرو ان سے'' (شاہ رفیع الدین صاحب)
- ☆ ''تو اب ان سے صحبت کرو''۔ (مولانا احمد رضا خان رحمہ اللہ)

وَلَا تُبَاشِرُوْهُنَّ:

- ☆ ''اور نہ ملو عورتوں سے'' (محمود الحسن صاحب)
- ☆ ''تو بیویوں سے مباشرت نہ کرو'' (مودودی صاحب)
- ☆ ''بیویوں سے صحبت نہ کرو'' (عبد الماجد صاحب)

☆ ''ان سے مباشرت نہ کرو'' (فتح محمد صاحب)

☆ ''اور مت ملوان سے'' (شاہ رفیع الدین صاحب)

☆ ''اور عورتوں کو ہاتھ نہ لگاؤ'' (مولنا احمد رضا خان رحمہ اللہ)

یہاں اعلیٰ حضرت مولنا احمد رضا خان رحمہ اللہ کے ترجمہ اور دوسروں میں فرق سمجھنے کیلئے ایک تو یہ خیال کیا جائے کہ ''عورتوں سے ملو'' یا ان سے صحبت کرو یا ان سے شب باشی کرو، ایک ہی معنی میں استعمال ہوئے ہیں یعنی جماع کرنا اور ''نہ ملو عورتوں سے یا ان سے مباشرت نہ کرو'' یہ اسی پہلے معنی کی نفی ہے یعنی جماع نہ کرو۔ لیکن اعلیٰ حضرت کے ترجمہ ''صحبت کرو'' پر نفی نہیں کہ ترجمہ یہ ہوتا ''ان سے صحبت نہ کرو'' لیکن آپ نے ترجمہ کیا ہے ''اور عورتوں کو ہاتھ نہ لگاؤ'' وجہ فرق کیا ہے اس مسئلہ کو سمجھنے سے پہلے یہ سمجھا جائے کہ ﴿ بَاشِرُوْهُنَّ ﴾ میں امر کا تعلق رمضان کی راتوں سے ہے اور ﴿ ولا تباشروهن ﴾ کی نہی کا تعلق اعتکاف سے ہے ﴿ بَاشِرُوْهُنَّ ﴾ کا ترجمہ سمجھنے سے پہلے اصل وجہ نزول کو ذہن میں رکھیں:

" عن ابن عباس کانوا علی عهده ﷺ اذا صلوا العشاء حرم علیهم الطعام والشراب والنساء وفی البخاری عن البراء کون المنع مقیدا بالنوم قال الحافظ یحتمل ان یکون التقید بالحقیقة انما هو بالنوم وذکر صلوة لکون ما بعدها مظنة النوم غالبا " (حاشیه جلالین بحواله کمالین)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کہ نبی کریم ﷺ کے زمانہ مین عشاء کی نماز ادا کرنے کے بعد کھانا، پینا جماع کرنا منع تھا بخاری شریف میں حضرت براء رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ یہ حکم سونے کے بعد تھا۔ ان دونوں حدیثوں میں محاکمہ اس طرح کیا گیا ہے کہ حکم حقیقۃً نیند سے ہی مقید تھا لیکن چونکہ بعد از نمازِ عشاء عام طور پر سویا جاتا ہے لہٰذا ایک جگہ نماز عشاء کا ذکر ہے اور دوسری جگہ نیند کا۔

لیکن یہ حکم کئی صحابہ کرام کی معذوریت پر منسوخ کر دیا گیا اور جماع کو یا کھانے پینے کو رات میں جائز کر دیا گیا۔ لیکن رمضان کے دن میں شہوت سے ہاتھ لگانا اور بوس وکنار منع نہیں جب کہ انسان کو اپنے آپ پر اعتماد ہو کہ انزال نہیں ہوگا یا وہ بے صبری سے کام لے کر غلطی نہ کر دے یعنی جماع نہ کر دے۔

لیکن اعتکاف کی حالت میں جس طرح صحبت کرنا منع ہے اسی طرح اس کے دواعی (ہاتھ لگانا

شہوت سے اور بوس و کنار) بھی منع ہیں اب اس مسئلہ کی حقیقت جاننے کے بعد تراجم کی طرف توجہ کریں یہ مسئلہ صرف اعلیٰ حضرت کے ترجمہ سے واضح ہوگا کہ رمضان شریف میں جماع کی قید کو اٹھایا گیا ہے لیکن اعتکاف کی حالت میں جماع سے اور اس کے اسباب سے بھی ممانعت ہے ہدایۃ کتاب الصوم میں دیکھیں:

" ولا بأس بالقبلة اذا امن علی نفسه ای الجماع والانزال ویکره اذا لم یأمن "

روزے کی حالت میں جماع یا انزال کی فکر نہ ہو تو بوسہ لینے میں کوئی حرج نہیں لیکن اگر یہ خطرہ ہو تو مکروہ ہے ہاں یہ بھی خیال رہے کہ انزال ہو جائے تو روزہ ٹوٹ جائے گا البتہ کفارہ نہیں ہوگا اور اگر جماع کر لیا تو روزہ ٹوٹ گیا قضاء بھی لازم ہوگی اور کفارہ بھی۔

لیکن اعتکاف میں کیا حکم ہے؟ دیکھئے ہدایۃ باب الاعتکاف:

" ویحرم علی المعتکف الوطی لقوله تعالیٰ ولا تباشروهن وانتم عاکفون فی المساجد وکذا اللمس والقبلة لانه دواعیه فیحرم علیه اذ هو محظوره کما فی الاحرام بخلاف الصوم لان الکف رکنه لا محظوره فلم یتعد الی دواعیه "

حالت اعتکاف میں وطی حرام ہے اور اسی طرح بوسہ لینا اور چھونا بھی منع ہے جس طرح احرام میں منع ہیں لیکن یہ حکم روزے کا نہیں کیونکہ وہاں صرف جماع سے رکنا رکنِ صوم ہے بوسہ لینے اور مس کرنے سے رکنا روزے کا رکن نہیں۔ یہ فرق واضح کرنے کے لئے اعلیٰ حضرت کا ترجمہ موزوں ترین ہے ارباب نظر خدارا انصاف کریں اسی فقہی فرق پر کون سا ترجمہ دال ہے اور کون سے کوسوں دور ہیں۔

اسی پر شیخ زادہ کی عبارت بھی شاہد ہے:

" واما اذا لمسها بشهوة او قبلها او باشر فیما دون الفرج فهو حرام علی المعتکف "

شہوت کے ساتھ عورت کو چھونا اور بوسہ لینا تفخیذ وتبطین سب ہی اعتکاف والے پر حرام ہیں۔

(تسکین الجنان ص ۵۹، ۶۰)

اعتکاف کے مسائل وفضائل: اعتکاف کالفظ **عکف یعکف (بکسر الکاف وضمها)** سے لیا ہوا ہے۔لغوی معنی یہ ہے''کسی چیز پر رک جانا،اور سانس کو روکنا اور اصطلاح شرع میں مسجد میں رکنا اور عورتوں کا اپنے گھر میں نماز کی جگہ رکنا۔اعتکاف کی تین قسمیں ہیں: واجب، مستحب، سنت۔

اعتکاف واجب: اس وقت ہوتا ہے جب کہ انسان نذر مانے کہ میں اتنے دنوں کا اعتکاف کروں گا۔اتنے دن اور اتنی ہی راتیں اعتکاف واجب ہو جائے گا۔اور ہر دن روزہ رکھنا بھی ضروری ہوگا۔

اعتکاف مستحب: بہتر تو یہ ہے کہ بغیر کسی نذر کے کم از کم ایک دن ایک رات کا اعتکاف ہو روزہ بھی رکھے زیادہ جتنے دن چاہے اعتکاف کرے اور روزہ بھی رکھے۔تاہم مسجد میں جتنی دیر رہے اتنی دیر کی نیت اعتکاف کی کرلے تو یہ بھی اعتکاف مستحب ہوگا:

" وقال محمد من اصحابنا فی اعتکاف النفل فینبغی اذا دخل المسجد ان یقول نویت الاعتکاف ما دمت فی المسجد "

اور امام محمد رحمہ اللہ نے نفلی اعتکاف کے متعلق ارشاد فرمایا کہ لائق یہ ہے کہ جب کوئی شخص مسجد میں داخل ہو تو یہ کہے''میں اعتکاف کی نیت کرتا ہوں جب تک مسجد میں رہوں'' بلکہ زیادہ بہتر یہی ہے کہ مسجد میں نماز کی انتظار میں بیٹھنے والا شخص، یا دنیاوی اور اخروی کام کے لئے مسجد میں ہے تو اعتکاف کی نیت کرلے " **فاذا خرج ثم دخل یجدد النیة** " جب مسجد سے نکلے پھر مسجد میں داخل ہو تو اعتکاف کی نیت دوبارہ از سر نو کرلے۔

اعتکاف سنۃ: رمضان شریف کے آخری دس دن اعتکاف سنۃ مؤکدہ کفایہ ہے یعنی جو شخص اعتکاف کریگا ثواب تو اسے ہی حاصل ہوگا دوسرے کو ثواب تو حاصل نہیں تاہم کسی ایک کے اعتکاف سے دوسروں پر سنۃ مؤکدہ کے ترک کی وجہ سے جو ملامت لازم ہوتی تھی وہ نہیں ہوگی۔ (ماخوذ از مرقاۃ ج ۴ ص ۳۲۵)

یہ بھی خیال رہے کہ شہر میں کوئی ایک مرد یا عورت اعتکاف کرلے تو تمام شہر والوں پر ترک سنۃ کا بوجھ لازم نہیں رہے گا فقہاء کرام کی صحیح تحقیق یہی ہے ہر مسجد میں یا ہر محلّہ میں اگر کوئی معتکف نہ ہو تو دوسروں پر بوجھ ہوگا یہ قول معتبر نہیں۔ نبی کریم ﷺ کے وصال کے بعد صحابہ کرام کو جنگوں کا سامنا کرنا پڑا۔ان کی تیاری وغیرہ کی وجہ سے مرد حضرات اعتکاف نہ کر سکے صرف ازواج مطہرات کے اعتکاف پر

اکتفا کرلیا گیا۔

مسئلہ : اعتکاف ایسی مسجد میں کیا جائے جس میں پانچ نمازیں جماعت سے ادا کی جاتی ہوں کیونکہ جماعت سے نماز ادا کرنا واجب ہے لیکن اعتکاف سنت ہے ایسا درست نہیں کہ سنت پر عمل کرنے کی وجہ سے واجب کی ترک لازم آجائے۔

مسئلہ : عورت کا مسجد میں اعتکاف مکروہ ہے عورت اپنے گھر میں جو مقام نماز ادا کرنے کے لئے اس نے مختص کیا ہوا ہے اسی میں اعتکاف کرے۔

" عن عائشة ان النبی ﷺ کان یعتکف العشر الاواخر من رمضان حتی توفاہ اللہ ثم اعتکف ازواجہ من بعدہ " (بخاری ومسلم، مشکوۃ باب الاعتکاف)

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں بیشک نبی کریم ﷺ رمضان کے آخری دس دنوں کا اعتکاف کرتے تھے یہاں تک کہ آپ کا اللہ تعالیٰ نے وصال فرمایا پھر آپ کے بعد آپ کی ازواج (بیبیوں) نے اعتکاف کیا:

" ثم اعتکف ازواجہ ای فی بیوتھن لعدم رضانہ علیہ الصلوۃ والسلام لفعلھن ولذا قال الفقھاء یستحب للنساء ان یعتکفن فی مکانھن (من بعدہ) ای من بعد موتہ احیاء لسنتہ وابقاء لطریقتہ "

نبی کریم ﷺ کی ازواج نے اپنے گھروں میں اعتکاف کیا کیونکہ نبی کریم ﷺ نے اپنی ظاہری حیات میں ان کے مسجد میں اعتکاف کو ناپسند فرمایا تھا۔ نبی کریم ﷺ کی ازواج مطہرات نے آپ کے بعد اعتکاف کیا تاکہ آپ کی سنت زندہ رہے اور آپ کا طریقہ باقی رہے۔ نبی کریم ﷺ نے ازواج مطہرات کے مسجد میں اعتکاف کو ناپسند فرمایا اس پر حدیث پاک کو دیکھیں:

" عن عائشة قالت کان النبی ﷺ اذا اراد ان یعتکف صلی الصبح ثم دخل المکان الذی یرید ان یعکتف فیہ فاراد ان یعتکف العشر الاواخر من رمضان فامر فضرب لہ خباء فامرت عائشة بخباء فضرب لھا وامرت حفصة بخباء فضرب لھا فلما رأت زینب خباء ھما امرت بخباء فضرب لھا فلما رأی ذلک رسول اللہ ﷺ قال البر تردن فلم یعتکف فی رمضان واعتکف عشرا من شوال " (ابن ماجہ باب الاعتکاف)

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں نبی کریم ﷺ جب اعتکاف کرنے کا ارادہ فرماتے صبح نماز ادا کرتے پھر اس جگہ داخل ہوتے جہاں اعتکاف کا ارادہ کرتے آپ نے رمضان کے آخری دس دنوں کے اعتکاف کا ارادہ فرمایا تو آپ نے حکم فرمایا آپ کے لئے خیمہ لگا دیا گیا (یعنی اعتکاف کے لئے چادریں تان دی گئیں) پھر حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے حکم دیا ان کے لئے خیمہ لگایا گیا۔ پھر حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا نے حکم دیا ان کے لئے خیمہ لگا دیا گیا۔ پھر حضرت زینب رضی اللہ عنہا نے ان دونوں کے خیموں کو دیکھا تو انہوں نے حکم دیا ان کے لئے خیمہ لگا دیا گیا۔ جب رسول اللہ ﷺ نے اسے دیکھا تو آپ نے فرمایا کیا نیکی صرف یہی ہے جو تم ارادہ رکھتی ہو۔ آپ نے اس رمضان میں اعتکاف نہ کیا بلکہ شوال میں دس دن اعتکاف کیا۔

وضاحت حدیث : اس حدیث پاک سے یہ واضح ہوا کہ نبی کریم ﷺ نے عورتوں کا مسجد میں اعتکاف بیٹھنا ناپسند فرمایا۔ اور واضح ہو گیا کہ اگرچہ ضروری تو صرف اعتکاف کی حالت میں مسجد میں رہنا ہے چادریں تاننا فرض یا واجب تو نہیں لیکن مسنون ہے کہ اس سے یکسوئی حاصل ہوتی ہے عام آدمی پاس بیٹھ کر باتیں نہیں کرتے۔

نبی کریم ﷺ اپنے اعتکاف کے مقام پر صبح ہی تشریف لے جاتے حالانکہ مغرب سے پہلے اعتکاف کی جگہ پر پہنچ جانا ضروری ہے تو اس کی وجہ یا آپ کی تخصیص تھی کہ آپ وقت سے زیادہ اعتکاف فرما لیتے تھے کیونکہ کمی درست نہیں لیکن زیادتی میں کوئی حرج نہیں۔

لیکن راقم کے نزدیک یہ کوئی ثابت نہیں کہ آپ اعتکاف کی جگہ صبح تشریف لے جاتے تھے پھر وہیں آخری رمضان تک قیام فرماتے ممکن ہے صبح اعتکاف کی جگہ کا جائزہ لیتے ہوں اور پھر مغرب سے پہلے آکر بیٹھ جاتے ہوں (واللہ اعلم بالصواب)۔

مسئلہ : اعتکاف بیٹھنے والا مرد ہو یا عورت ان کیلئے ضروری ہے کہ وہ مسلمان ہوں عاقل ہوں (پاگل نہ ہوں) اور جنابت سے پاک ہوں اور عورت کیلئے حیض و نفاس سے پاک ہونا بھی ضروری ہے۔

تنبیہ : رمضان شریف کے آخری دس دن اعتکاف سنۃ مؤکدہ علی الکفایۃ ہے لیکن اگر کوئی شخص رمضان کے آخری دس دنوں میں ایک دن یا تین دن یا پانچ دن کا اعتکاف بیٹھنا چاہتا ہے تو درست ہے اس کا اعتکاف مستحب ہوگا۔ بظاہر یہاں اعتراض یہ ہوتا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے مدینہ طیبہ میں اعتکاف

ہر رمضان کے آخری دس دن کیا ہے ایک مرتبہ (جس کا ذکر کیا جا چکا ہے) چھوڑا لیکن وہ بھی شوال میں قضا کیا ہے اس سے تو پتہ چلتا ہے کہ اعتکاف واجب ہونا چاہئے:

" والجواب کما فی العنایة انه علیه الصلوة والسلام لم ینکر علی من ترکه ولو کان واجبا لأنکر، وحاصله ان المواظبة انما تفید الوجوب اذا اقترنت بالانکار علی التارک"

تو اس کا جواب یہ ہے کہ کوئی کام نبی کریم ﷺ نے ہمیشہ کیا ہو اور اس کے تارک پر وعید فرمائی ہو اور ترک کرنے کی اجازت نہ دی تو وہ کام واجب ہوتا ہے یہاں تارک پر انکار نہیں فرمایا لہذا سنۃ مؤکدہ ہے واجب نہیں۔ (شامی)

☆ عن ابی هریرة قال کان یعرض علی النبی ﷺ القرآن کل عام مرة فعرض علیه مرتین فی العام الذی قبض وکان یعتکف کل عام عشر فاعتکف عشرین فی العام الذی قبض" (رواه البخاری، مشکوة کتاب الاعتکاف)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ سے ہر سال ایک مرتبہ قرآن پاک کا دور کیا جاتا تھا۔ جس سال آپ کا وصال ہو گیا اس سال آپ سے دو مرتبہ دور کیا گیا۔ آپ ہر سال دس دن اعتکاف بیٹھتے تھے لیکن جس سال آپ کا وصال ہو گیا اس سال آپ بیس دن اعتکاف بیٹھے۔

وضاحت حدیث: نبی کریم ﷺ سے ہر رمضان میں جبریل دور کرتے تھے۔ جس رمضان کے بعد پھر رمضان نہیں آنا تھا اس میں دو مرتبہ دور کیا اسی طرح نبی کریم ﷺ ہر رمضان کے آخری دس دن اعتکاف بیٹھتے تھے لیکن آپ نے اپنی زندگی کے آخری رمضان میں بیس دن کا اعتکاف کیا۔

اس حدیث سے یہ بھی واضح ہو رہا ہے کہ نبی کریم ﷺ کو اپنے وصال کا علم تھا کہ اس رمضان کے بعد آپ پر آپ کی ظاہری حیات میں اور رمضان نہیں آئیگا۔ اور آپ نے اپنی امت کو یہ درس دیا کہ ہر انسان اپنی زندگی کے آخری ایام میں زیادہ سے زیادہ نیک اعمال کرے اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کے حضور جانے اور اس سے ملاقات کے قابل بنائے۔ اور یہ بھی ثابت ہوا کہ حفاظ کا قرآن پاک کا دور کرنا سنت جبریل اور سنت نبی کریم ﷺ ہے یعنی حفاظ کو دور کرنے سے سنت پر عمل کا ثواب بھی حاصل ہوتا ہے۔

(مرقاة)

مسئلہ : مرد کا مسجد سے اور عورت کا گھر کی نماز کی جگہ (جہاں وہ اعتکاف میں ہو) سے بغیر ضرورت انسانیہ اور بغیر ضرورت شرعیہ کے نکلنا منع ہے انسانی حاجات یہ ہیں پیشاب، پاخانہ کے لئے نکلنا اور اگر احتلام ہو جائے تو تیمم کر کے مسجد سے نکل جائے اور مسجد سے باہر غسل کرے۔ اور حاجات شرعیہ یہ ہیں۔ اگر اذان کہنی ہو اور اذان کا مینارہ مسجد کے باہر ہو تو اعتکاف والے کا اذان کہنا جائز ہوگا۔ اس طرح جس مسجد میں اعتکاف بیٹھا ہوا ہے اس میں جمعہ ادا نہیں ہوتا تو اتنا وقت لے کر جامع مسجد میں چلا جائے کہ وہاں سنتیں ادا کر سکے اور خطبہ سن سکے اور جمعہ کے فرض ادا کر سکے۔ فرضوں کے بعد والی سنتیں اپنی اعتکاف والی مسجد میں ادا کرے تو بہتر ہے۔ لیکن اگر فاصلہ زیادہ ہو واپس آ کر سنتیں ادا نہ کر سکے یا جامع مسجد سے نکلنا دشوار ہو تو وہاں ہی سنتیں ادا کر لے۔

☆ " وعن عائشة قالت كان رسول الله ﷺ اذا اعتكف ادنى الى رأسه وهو فى المسجد فارجله وكان لا يدخل البيت الا لحاجة الانسان "

(بخاری، مسلم، مشکوۃ باب الاعتکاف)

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ جب اعتکاف بیٹھتے تھے تو اپنا سر میرے قریب کرتے آپ خود مسجد میں ہی رہتے تو میں آپ کی کنگھی کرتی آپ گھر میں سوائے حاجت انسانیہ کے داخل نہیں ہوتے تھے۔

وضاحت حدیث: ادنی کا معنی قریب کرنا دنو سے لیا ہوا ہے مطلب یہ ہوا " اخرج رأسه من المسجد الى حجرتى " کہ نبی کریم ﷺ مسجد میں ہی تشریف فرما ہوتے اور سر مبارک کھڑکی سے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے حجرہ میں کر دیتے کیونکہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا یہی حجرہ تھا جو اب نبی کریم ﷺ کا روضہ مطہرہ ہے تو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نبی کریم ﷺ کی کنگھی کر دیتیں۔

اور مسئلہ یہ ثابت ہوا کہ اعتکاف والا شخص اگر اپنے بعض اعضاء کو مسجد سے نکالے اور خود مسجد میں رہے تو اس کا اعتکاف ٹوٹتا نہیں۔ اور مسئلہ یہ سمجھ آیا کہ بڑا برتن (ٹپ) وغیرہ رکھ کر اس میں بیٹھ کر غسل کرے جب مسجد ملوث نہ ہو تو جائز ہے۔ حاجت انسانیہ سے مراد پیشاب پاخانہ ہے یعنی حضور ﷺ قضاء حاجت کے لئے مسجد سے نکل کر گھر تشریف لائے۔

مسئلہ : اعتکاف والا شخص اگر قضا حاجت کے لئے گھر آئے تو گھر میں کسی بیمار سے چلتے چلتے پوچھ لے کہ تمہارا کیا حال ہے تو یہ جائز ہے۔

☆ " وعن عائشة قالت كان رسول الله ﷺ يعود المريض وهو معتكف فيمر كما هو فلا يعرج يسال عنه " (رواه ابو داود وابن ماجه ، مشكوة باب الاعتكاف)

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں رسول اللہ ﷺ مریض کی عیادت کرتے تھے جب آپ اعتکاف میں ہوتے تھے لیکن چلتے چلتے آپ رک کر اس سے سوال نہیں کرتے تھے۔

وضاحت حدیث : اس حدیث پاک سے واضح ہوا کہ مریض مسجد سے باہر ہو تو اعتکاف والا شخص اپنی حاجت انسانیہ کے لئے مسجد سے نکلے تو چلتے چلتے مریض کی عیادت کر لے تو جائز ہے:

" فيمر كما هو " اى يمر مرورا فلا يميل الى الجوانب ولا يقف وقولها (فلا يعرج) اى لا يمكث بيان للجمل لان التعريج الاقامة "

یعنی چلتے چلتے عیادت کی جائے دائیں بائیں نہ پھرے اپنے راستے پر چلتے ہوئے بغیر رکنے کے عیادت کرے اگر راستہ سے ہٹ کر دائیں بائیں جا کر مریض کی عیادت کرے یا مسجد سے باہر رک کر عیادت کرے تو یہ نا جائز ہے۔ (از مرقاۃ)

☆ " عن عائشة قالت السنة على المعتكف ان لا يعود مريضا ولا يشهد جنازة ولا يمس المرأة ولا يباشرها ولا يخرج لحاجة الا لما لا بد منه ولا اعتكاف الا بصوم ولا اعتكاف الافى المسجد جامع " (رواه ابو داود ، مشكوة باب الاعتكاف)

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں اعتکاف والے شخص کے لئے سنت یہ ہے کہ وہ مریض کی عیادت نہ کرے اور نماز جنازہ میں حاضر نہ ہو اور کسی عورت کو مس نہ کرے اور عورت سے مباشرت نہ کرے کسی کام کے لئے مسجد سے باہر نہ نکلے سوائے ضرورت کے۔ اور اعتکاف بغیر روزہ کے صحیح نہیں اور اعتکاف سوائے اس مسجد کے نہیں جس میں جماعت ہوتی ہے۔

وضاحت حدیث : حدیث پاک میں " سنة " کا لفظ جو ذکر ہے اس سے مراد دین اور شرع اور وہ راہ جس پر چلا جائے۔ یعنی اعتکاف والے کے لئے شرعی طریقہ یہ ہے کہ مسجد سے باہر کسی کی جا کر عیادت نہ کرے ہاں البتہ حاجت انسانیہ کے لئے نکلے تو چلتے چلتے مریض کی عیادت کر لے۔

اور مسجد سے باہر جنازہ ادا کرنے کے لئے نہ نکلے۔ اور اعتکاف میں روزہ رکھنا ضروری ہے ایک دن ایک رات کا بھی اعتکاف ہو تو روزہ رکھنا لازم ہوگا ہاں البتہ کچھ دیر کے لئے اعتکاف کی نیت کرے دن رات سے کم ہو تو اس میں روزہ رکھنا ضروری نہیں۔

اعتکاف کے لئے ضروری ہے کہ مسجد میں ہو اور اس میں جماعت ہوتی ہو۔ اگر مسجد میں جماعت نہ ہوتی ہو تو ایسی مسجد میں اعتکاف نہ بیٹھے۔ حدیث شریف میں " الا فی مسجد جامع " کا مطلب یہ کہ وہ مسجد جس میں جماعت ہوتی ہو اس سے مراد جامع مسجد (جس میں جمعہ ہوتا ہو) نہیں۔

(از مرقاۃ)

معتکف کو معتکف کہنے کی وجہ:

" عن ابن عباس ان رسول اللہ ﷺ قال فی المعتکف هو یعتکف الذنوب و یجری له من الحسنات کعامل الحسنات کلها "

(رواه ابن ماجه، مشکوۃ باب الاعتکاف)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں بیشک رسول اللہ ﷺ نے فرمایا معتکف وہ ہے جو گناہوں سے بچ جائے۔ اور اس کو (مسجد میں بیٹھنے کی وجہ سے) نیکیوں کا ثواب ملتا رہتا ہے جیسا کہ نیکیوں پر عمل کرنے والے کو ثواب ملتا ہے۔

وضاحت : حدیث پاک کا مطلب واضح ہے کہ اعتکاف والا شخص دنیا سے کنارہ کش ہو کر مسجد میں بیٹھ جاتا ہے اور اپنے آپ کو گناہوں سے بچا لیتا ہے پھر اس کا ہر لمحہ نیکی میں گزر رہا ہوتا ہے خواہ وہ اٹھے یا بیٹھے جاگے یا سوئے۔ یعنی اس کا جاگنا بھی عبادت اور اس کا سونا بھی عبادت ہے۔

مسئلہ : اعتکاف والے شخص کیلئے مسجد میں کھانا اور پینا جائز ہے بلکہ وہ مسجد سے باہر نکل کر کھا اور پی نہیں سکتا یہ اس کیلئے جائز ہی نہیں اور اعتکاف کے دنوں میں وہ لازماً مسجد میں ہی سوئے گا اعتکاف والا شخص اگر کسی چیز کو خریدنے یا بیچنے کا محتاج ہو یعنی بہت ضرورت درپیش آئے تو اس چیز کو مسجد میں نہ لایا البتہ زبانی طور پر وہ سودا کر سکتا ہے ہاں بغیر عذر کے تجارت کی غرض سے خرید و فروخت منع ہوگی۔ (درمختار، شامی)

مسئلہ : اعتکاف کی حالت میں قرآن پاک پڑھے، درود شریف پڑھے ہر قسم کا وہ ذکر کرے جو

قرآن وحدیث میں ہو دعائیں کرے لیکن اس عقیدہ سے بالکل خاموش ہو کر نہ بیٹھے کہ خاموش رہنا بھی عبادت ہے پہلی قوموں پر خاموشی کا روزہ بھی عبادت سمجھا جاتا تھا لیکن نبی کریم ﷺ کی شریعت میں اسے منسوخ کر دیا گیا:

"عن ابی هريرة قال ان النبی ﷺ نهی عن صوم الوصال وعن صوم الصمت"

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں بیشک نبی کریم ﷺ نے صوم وصال سے اور خاموشی کے روزے سے منع فرمایا۔ ہاں البتہ لغو کلام سے بچنے کے لئے خاموش رہنا بہتر ہے بلکہ کہیں فرض اور واجب ہوتا ہے کہ خاموش رہا جائے۔ حدیث شریف میں ہے "من صمت نجا" جو خاموش رہا اس نے نجات حاصل کر لی۔ اور حدیث شریف میں ہے:

"رحم الله امرأ تكلم فغنم او سكت فسلم"

اللہ تعالیٰ اس شخص پر رحم کرے جو کلام کرے تو غنیمت حاصل کر لے (یعنی کلام سے نفع حاصل کرے، کلام خیر ہو) یا خاموش رہے تو سلامتی میں رہے۔ خیال رہے غیبت سے بچنا اور جھوٹ سے بچنا فرض ہے اور برے اشعار پڑھنے سے بچنا اور سامان تجارت کو لوگوں کو سامنے خالص اور کھرا بیان کرنے کے لئے اللہ کے ذکر سے بچنا واجب ہے۔

خیال رہے کہ برا کلام نہ ہو تو وہ مباح ہے لیکن اعتکاف والے کے لئے مباح کلام کرنا بھی مکروہ ہے ہاں البتہ قرآن پاک اور حدیث پاک کا درس دے اور طلباء کو پڑھائے اور انبیاء کرام کے واقعات بیان کرے اور نیک لوگوں کی حکایات بیان کرے اور دینی مسائل پر مشتمل کتاب لکھے فتوی لکھے یہ سب کام جائز اور مستحسن ہیں۔ (از درمختار، شامی)

مسئلہ : اگر ایک شخص نذر مانے کہ میں اتنے دن اعتکاف بیٹھوں گا تو اتنی راتیں بھی تو وہ اس پر لازم ہو جائیں گے اور روزہ رکھنا بھی لازم ہو جائے گا اور اگر راتوں کی نذر مانے کہ میں اتنی راتیں اعتکاف بیٹھوں گا تو اتنے دن بھی خود بخود لازم ہو جائیں گے۔ ہاں اگر نذر میں یہ کہے میں صرف دن دن کا اعتکاف بیٹھوں گا رات کو اعتکاف نہیں کروں گا تو صرف دن کا اعتکاف لازم ہوگا۔ (درمختار، شامی)

مسئلہ : اگر کسی عذر، یعنی شدید بیماری وغیرہ کی وجہ سے اعتکاف توڑ دیا تو جتنے دن اس کی نیت کے مطابق اعتکاف کے رہتے تھے اتنے دن اعتکاف کی قضاء کرنی لازم ہوگی اور روزہ رکھنا بھی لازم ہوگا۔ یہ بھی خیال رہے کہ یہ اعتکاف کے دن مستقل طور پر روزہ رکھنا لازم ہوگا کوئی شخص یہ خیال کرے کہ وہ پھر آنے والے رمضان میں اعتکاف قضاء کرلے گا یہ درست نہیں ہوگا کیونکہ رمضان میں تو روزہ رکھنا ہی ہے وہ مستقل روزہ اعتکاف کی قضا کی وجہ سے نہیں رکھا جاتا۔

مسئلہ : اگر ایک مسجد شہید ہونے کا خطرہ لاحق ہو جائے یا وہاں کے بدمعاش لوگ اسے نکال دیں کہ وہ کسی کو اعتکاف نہیں بیٹھنے دیتے تو دوسری مسجد میں منتقل ہونا جائز ہے۔

مسئلہ : اعتکاف کی حالت میں مسجد میں رہنا ضروری ہے خواہ کمرے میں ہو یا صحن میں یا مسجد کی چھت میں ہو لیکن مسجد سے نکلنا منع ہے وضو والی جگہ مسجد سے باہر ہوتی ہے اس لئے وضو کرنے کی اجازت ہے لیکن برتن صاف کرنے کے لئے وضو کی جگہ بیٹھنا منع ہے۔ بغیر مجبوری یعنی جنابت کے غسل کے بغیر جمعہ وغیرہ کا غسل کرنا منع ہے کیونکہ بلاوجہ مسجد سے باہر نکلنا لازم آئے گا۔

تنبیہ : مسجد کا محراب آج کل کے رواج کے مطابق مسجد کا حصہ ہی سمجھا جاتا ہے اس لئے مسجد کے محراب کو مسجد کے غیر کا حکم دینا درست نہیں۔ ہاں مسجد بناتے وقت محراب کو یا کسی حصہ کو مسجد سے باہر شمار کرلیا گیا تو اس جگہ اعتکاف والے شخص کا بیٹھنا وغیرہ منع ہوگا۔ مسجد کا ہی حصہ شمار کیا جائے درمیان میں دیوار وغیرہ دے کر اعتکاف والوں کے لئے علیحدہ جگہ منتخب کرلی تو جائز ہے۔ ایسی سیڑھی جو مسجد سے باہر ہو اسے استعمال کرکے مسجد کی چھت پر معتکف کو جانا منع ہوگا۔ محراب کے متعلق راقم نے اپنا خیال ظاہر کیا ہے، کوئی اتفاق کرے یا نہ کرے۔

تِلْکَ حُدُوْدُ اللّٰہِ فَلَا تَقْرَبُوْھَا : ''یہ اللہ کی حدیں ہیں تو نہ قریب جاؤ ان کے'' ﴿ حد ﴾ کا معنی ہے کسی چیز کی انتہاء کسی چیز کے منقطع ہونے کا مقام، جو شخص رزق سے محروم ہو اسے بھی محدود کہا جاتا ہے کہ اس سے رزق کو منقطع کرلیا گیا۔ اور دربان کو حداد کہا جاتا ہے کہ وہ لوگوں کو اندر داخل ہونے سے روکتا ہے اور کہتا ہے تمہارے آنے کی حد دروازہ ہی ہے اور حد الدار کا مطلب ہوتا ہے یہاں غیر کا

داخل ہونا منع ہے۔اور اللہ تعالیٰ کی حدود سے مراد وہ چیزیں اور وہ احکام ہیں جن کی مخالفت منع ہے۔ (از کبیر)

اعتراض : "تِلْکَ" کا اشارہ ہے پہلے احکام مذکورہ کی طرف وہ تمام تو حرام نہیں بلکہ بعض ان میں سے مباح ہیں تو سب کے متعلق یہ کہنا کس طرح درست ہے ﴿ فَلَا تَقْرَبُوْهَا ﴾ ان کے قریب نہ جاؤ۔

جواب : اگر چہ پہلے کئی احکام کا ذکر ہے لیکن قریب ﴿ وَلَا تُبَاشِرُوْهُنَّ وَاَنْتُمْ عَاكِفُوْنَ فِي الْمَسَاجِدِ ﴾ ہے کہ تم عورتوں کو ہاتھ نہ لگاؤ جب کہ تم مساجد میں معتکف ہو۔

اسی طرح ذکر ہے ﴿ ثُمَّ اَتِمُّوا الصِّيَامَ اِلَى الَّيْلِ ﴾ "پھر تم پورا کرو روزوں کو رات تک" اس سے پتہ چلا کہ رات آنے سے پہلے روزہ افطار کرنا حرام ہے اس لئے یہ کام جو حرام ہیں وہی "تلک" کا مشار الیہ ہیں ان کے قریب جانے سے منع کیا گیا ہے۔ (خازن)

اعتراض : اعتراض اس آیۃ کریمہ میں ذکر ہے

﴿ تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ فَلَا تَقْرَبُوْهَا ﴾ "یہ اللہ کی حدیں ہیں ان کے قریب نہ جاؤ۔

دوسرے مقام پر فرمایا:

﴿ تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ فَلَا تَعْتَدُوْهَا ﴾ "یہ اللہ کی حدیں ہیں ان سے تجاوز نہ کرو"۔

ایک اور مقام پر فرمایا:

﴿ وَ مَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَيَتَعَدَّ حُدُوْدَهٗ ﴾

"اس میں بھی حدود سے تجاوز کرنے پر وعید فرمائی تو یہ وجہ فرق کیا ہے؟

جواب : جو شخص اللہ تعالیٰ کی طاعت میں ہو اور اللہ تعالیٰ کے فرائض کی ادائیگی میں ہو وہ مقام حق میں ہے اسے منع کیا گیا کہ حدود سے تجاوز کر کے باطل مقام میں داخل نہ ہونا پھر اور زیادہ تاکید کی گئی کہ حق اور باطل کے درمیان حدود کے قریب بھی نہ جانا کہ کہیں بے خبری اور بے احتیاطی کی وجہ سے باطل راہ میں داخل نہ ہو جانا۔جیسا کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

" الحلال بین والحرام بین وبینهما امور مشتبهات لا یعلمها کثیر من الناس فمن اتقی المشتبهات استبرأ لعرضه ودینه ومن وقع فی

المشتبهات وقع فی الحرام کراع یرعی حول الحمی یوشک ان یواقعه الا وان لکل ملک حمی الا وان حمی الله فی ارضه محارمه "

(متفق علیہ)

حلال چیزیں واضح ہیں اور حرام بھی واضح ہیں اور ان کے درمیان کچھ امور مشتبہ ہیں کثیر لوگ ان کو نہیں جانتے۔ جو شخص مشتبہ چیزوں سے بچ گیا اس نے اپنی عزت اور اپنے دین کو بچالیا اور جو شخص مشتبہ چیزوں میں واقع ہوگیا وہ حرام میں واقع ہوگیا جیسا کہ جانوروں کو چرانے والا جب حد بندی کے اردگرد جانوروں کو چرائے تو قریب ہے کہ اس کے جانور (اس حد بندی کے اندر) واقع ہو جائیں بیشک ہر بادشاہ کی حد بندی ہے خبردار اللہ تعالیٰ کی زمین میں اس کی حد بندی اس کے محارم ہیں۔

مطلب واضح ہے کہ جس طرح جانوروں کو چرانے والا کسی کی زمین کی حد کے ساتھ جانوروں کو چرائے تو ممکن ہے کہ وہ جانور دوسرے کے فصل میں واقع ہوکر فصل برباد کردیں اسی طرح جن امور کے متعلق شک ہو کہ ہوسکتا ہے یہ حرام ہوں تو ان سے دور رہے کیونکہ اگر ان میں واقع ہوگا تو ہوسکتا ہے کہ عین حرام کاموں میں واقع ہوجائے۔ اور جن کاموں کا حرام ہونا یقینی ہو تو ان کے قریب بھی نہ آئے تا کہ ان سے مکمل بچ سکے۔ (ماخوذ از خازن ومظہری)

كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ آيَاتِهٖ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَّقُوْنَ :

" اسی طرح بیان کرتا ہے اللہ تعالیٰ اپنی نشانیاں لوگوں کے لئے تا کہ وہ پرہیز گار ہو جائیں "۔

﴿كَذٰلِكَ﴾ میں کاف محل نصب میں ہے اور مصدر محذوف کی صفت ہے حاصل کلام یہ ہے:

" کذلک ای بیانا مثل هذا البیان الوافی والواضح "

اور آیات سے مراد دلائل دین اور نصوص احکام اور مقصد بیان یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی اپنے بندوں پر جو رحمت اور اس کی طرف سے ان کو ہدایت حاصل ہے اس کی عظمت کو واضح کرنا ہے۔ یعنی جس طرح اللہ تعالیٰ نے یہاں احکام واضح طور پر بیان فرمائے ہیں اسی طرح تمام دلائل دین اور احکام پر نصوص کو واضح طور پر بیان فرماتا ہے تا کہ لوگ ہدایت پا جائیں اور اس کی رحمت سے فائدہ حاصل کریں تا کہ اس کے اوامر ونواہی کی مخالفت سے بچ جائیں۔

تقوی کا پہلا درجہ شرک سے بچنا ہے پھر گناہوں سے بچنا، پھر شہوات سے بچنا ہے پھر بے فائدہ چیزوں سے بچنا ہے حدیث شریف میں ہے:

" لا یبلغ العبد درجة المتقین حتی یدع مالا باس به حذرا مما باس به "

بندہ اس وقت تک متقین کے درجہ کو نہیں پا سکتا جب تک ان چیزوں کو نہ چھوڑ دے جن میں کوئی حرج نہیں ان سے بچنے کی غرض سے جن میں حرج پائی جاتی ہے۔ شیخ سعدی رحمہ اللہ نے کیا خوب فرمایا:

ترا آنکه چشم ودهان داد وگوش اگر عاقلی در خلافش مکوش

تجھے جس ذات نے آنکھیں اور منہ اور کان دیئے اگر تو عقل مند ہے تو اس کے خلاف کام کرنے کی کوشش نہ کر:

چوں پاك آفريدت بهش باش وپاك که ننگست ناپاك رفتن بخاك

جب رب تعالیٰ نے تجھے پاک پیدا کیا ہے تو ہوش میں رہ اور پاک ہی رہ۔ کہ مقام شرم ہے ناپاک ہو کر خاک میں جانا:

مرو زیر باره گناه ای پسر که حمال عاجز بود درسفر

اے لڑکے گناہوں کا بوجھ اٹھا کر نہ جا کہ بوجھ اٹھانے والا سفر میں عاجز ہو جاتا ہے

مکن عمر ضائع بافسوس وحیف که فرصت عزیز است ووقت سیف

اپنی عمر بے مقصد ضائع نہ کر دے کہ فرصت عزیز ہے اور وقت تلوار (کی طرح چمکنے والا جانے والا ہے)

(از روح البیان)

وَلَا تَأْكُلُوْا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ وَتُدْلُوْا بِهَا اِلَى الْحُكَّامِ لِتَأْكُلُوْا فَرِيْقًا مِّنْ اَمْوَالِ النَّاسِ بِالْاِثْمِ وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ

۱) ''اور آپس میں ایک دوسرے کا مال ناحق نہ کھاؤ اور نہ حاکموں کے پاس ان کا مقدمہ اس لئے پہنچاؤ کہ لوگوں کا کچھ مال ناجائز طور پر کھالو جان بوجھ کر''

۲) ''اور نہ کھاؤ تم ایک دوسرے کا مال آپس میں ناحق طریقہ سے اور نہ پیش کروان کو حاکموں کی طرف کہ تم کھاؤ مال لوگوں کے مالوں میں سے ناجائز طور پر حالانکہ تم جانتے ہو''۔

شان نزول:

(۱) عبدان حضرمی نے امرؤالقیس کندی پر زمین کا دعوی کیا لیکن عبدان حضرمی کے پاس گواہ نہیں تھے جو یہ گواہی دیں کہ یہ زمین جو امرؤالقیس کے پاس ہے وہ عبدان حضرمی کی ہے۔ تو رسول اللہ ﷺ نے امرؤالقیس کو حکم فرمایا کہ وہ قسم اٹھائے اس نے قسم اٹھانے کا ارادہ کرلیا تو نبی کریم ﷺ نے یہ آیۃ کریمہ تلاوت کی:

﴿ اِنَّ الَّذِيْنَ يَشْتَرُوْنَ بِعَهْدِ اللهِ وَاَيْمَانِهِمْ ثَمَنًا قَلِيْلًا اُولٰٓئِكَ لَا خَلَاقَ لَهُمْ فِى الْاٰخِرَةِ وَلَا يُكَلِّمُهُمُ اللهُ وَلَا يَنْظُرُ اِلَيْهِمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَلَا يُزَكِّيْهِمْ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴾

بیشک وہ لوگ جو اللہ کے عہد اور اپنی قسموں کے بدلے گھٹیا دام (یعنی حقیر دنیا کا مال) لیتے ہیں آخرت میں ان کا کچھ حصہ نہیں اور اللہ نہ ان سے بات کرے نہ ان کی طرف نظر فرمائے قیامت کے دن اور نہ انہیں پاک کرے اور ان کے لئے دردناک عذاب ہے۔

امرؤالقیس نے جب نبی کریم ﷺ کی زبان مبارک سے اس آیۃ کریمہ کو سنا تو قسم اٹھانے سے رک گیا اور زمین فی الواقع حقدار عبدان حضرمی کو دے دی۔ ایک اس واقعہ کے درپیش آنے کے بعد یہ آیۃ کریمہ (زیر بحث) نازل ہوئی۔

۲) " روی انه اختصم الیه خصمان فقال علیه السلام انما انا بشر مثلکم و انتم تختصمون

الی ولعل بعضکم الحن بحجته من بعض فاقض له علی نحو ما اسمع منه فمن قضیت له بشئی من حق اخیه فانما اقضی له قطعة من نار فبکیا فقال کل واحد منهما حقی لصاحبی"

نبی کریم ﷺ کی خدمت میں دو شخصوں کا جھگڑا پیش ہوا تو آپ نے فرمایا بیشک میں تمہاری طرح بشر ہوں اور تم جھگڑا میرے پاس لے کر آتے ہو، ہوسکتا ہے تم میں سے بعض دوسرے بعض سے اپنے دلائل اچھی طرح پیش کر دے تو میں اس کے حق میں فیصلہ کر دوں اگر میں نے کسی شخص کے حق میں فیصلہ کر دیا اور اسے اس کے دوسرے بھائی کا حق دے دیا تو میں نے اسے آگ کا ٹکڑا دے دیا۔ یہ سن کر دونوں صحابی رونے لگے ہر ایک یہی کہہ رہا تھا کہ یہ میرے بھائی کا حق ہے۔ میرا اس میں کوئی حق نہیں۔ (یہ واقعہ بھی در پیش آنے کے بعد اس آیۃ کریمہ کا نزول ہوا)۔ (از تفسیر ابی السعود)

سبحان اللہ تعلیمات مصطفویہ کا کیا خوب اثر ہوا کہ جھگڑا کرنے والے خود ہی اپنے اپنے حق سے دستبردار ہو کر آپس میں شیر و شکر ہو گئے اور نبی کریم ﷺ نے ایک قانون کی طرف اشارہ کر دیا کہ قاضی فیصلہ اپنے علم کے مطابق نہیں کر سکتا بلکہ مدعی کے گواہ یا مدعی علیہ کی قسم کے مطابق فیصلہ کرتا ہے۔ ہوسکتا ہے کوئی شخص جھوٹے گواہوں کے ذریعے یا جھوٹی قسم کے ذریعے ناحق فیصلہ کرا لے اور اپنے دوسرے بھائی کے حق پر ناجائز قابض ہو جائے تو اس کا یہ عمل جہنم میں جانے کا ذریعہ ہے اس لئے اس نے اپنے حق میں جہنم کی آگ کے ٹکڑے کا فیصلہ کرا لیا۔

نبی کریم ﷺ کو اگرچہ حقی اور ملکی حیثیت بھی حاصل تھی لیکن تعلیم امت کیلئے آپ کا فیصلہ بشری حیثیت میں ہوا کرتا تھا۔

وَلَا تَأْكُلُوْٓا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ : بظاہر مطلب ﴿ وَلَا تَأْكُلُوْٓا اَمْوَالَكُمْ ﴾ کا یہ ہے کہ تم اپنے مال باطل طریقے سے نہ کھاؤ۔ لیکن مراد یہ ہے کہ تم آپس میں ایک دوسرے کا مال باطل طریقہ سے نہ کھاؤ کیونکہ ایک دوسرے کے مال کی حفاظت تم پر لازم ہے اپنے ہی بھائیوں کا مال ناجائز طور پر کھانا گویا کہ اپنا مال ہی باطل طریقے سے کھانا ہے جس سے منع فرمایا گیا بہت حسین اشارہ کیا گیا کہ اپنے بھائیوں کے مال کو اپنا مال سمجھو نہ اپنے مال میں ناجائز تصرف کرو اور نہ ہی اپنے بھائیوں کے مال میں ناجائز تصرف کرو۔ (از تحبیر الرحمٰن)

﴿ وَلَا تَأْكُلُوٓا ﴾ کا معنی تو ہے ''اور نہ کھاؤ'' لیکن مراد عام ہے کہ " اخذ اور استیلاء " کو بھی شامل ہے۔ یعنی مطلب یہ ہے کہ تم آپس میں ایک دوسرے کا مال باطل طور پر کسی طرح بھی نہ حاصل کرو کسی کے مال پر ناجائز غلبہ حاصل نہ کرو۔ البتہ کھانے کی ممانعت اس لئے کی ہے کہ عام طور پر مال کھانے میں سرف کیا جاتا ہے اور غیر کا مال زیادہ طور پر کھا کر برباد کیا جاتا ہے۔ (از روح المعانی)

﴿ بِالْبَاطِلِ ﴾ باطل کا لغوی معنی ہے زائل ہونا، چلا جانا (بطل الشئی بطولا فھو باطل) باطل کی جمع بواطل آتی ہے اور البطولۃ، پھر البطولۃ کی جمع اباطیل آتی ہے عرب حضرات کہتے ہیں " بطل الاجیر " مزدور نے لہو ولعب میں مشغول ہو کر چھٹی کر کے اپنی مزدوری زائل کر دی۔ (از کبیر)

باطل سے مراد کیا ہے؟ باطل طریقہ سے مال نہ کھانے سے مراد کیا ہے؟ ضابطہ تو اس میں روح المعانی کے یہ الفاظ ہیں " کل ما لم یأذن بأخذه الشرع " ہر وہ چیز جس کی شریعت نے اجازت نہ دی ہو یعنی غیر شرع طور پر مال کا استعمال باطل کہلاتا ہے جو ناجائز ہے۔ مختلف تفاسیر کو دیکھنے سے جزئیات کئی واضح ہو جاتی ہیں:

" والا کل بالباطل علی وجھین احدھما ان یأکله علی وجه الظلم بنحو الغصب والسرقة والیمین الکاذبة والثانی ان یاکله علی جهة الهزؤ واللعب کالذی یؤخذ فی القمار والملاهی وغیر ذلک "

باطل طریقے سے مال حاصل کرنے کی دو صورتیں ہیں ایک یہ کہ ظلم سے کسی کا مال حاصل کرے جیسا کہ کسی کا مال غصب کر لے یا چوری کر لے، یا جھوٹی قسم اٹھا کر کسی کا مال ناحق طور پر لے لیا۔

دوسری صورت یہ ہے کہ مال مزاح اور لہو ولہب سے حاصل کر لے یعنی جوابازی سے مال حاصل کرے یا کھیل کود وغیرہ سے شرط لگا کر مال حاصل کرے۔ (شیخ زادہ)

قاضی محمد ثناء اللہ مظہری فرماتے ہیں باطل طریقہ سے مال حاصل کرنے کی کئی مثالیں ہیں جھوٹے دعوی سے مال حاصل کرے۔ جھوٹی گواہی سے مال حاصل کرے حق کا انکار کرنے کے بعد جھوٹی قسم اٹھا کر مال حاصل کرے، کسی کا مال غصب کرے کسی کا مال اچک لے، چوری سے مال حاصل کرے۔ خیانت کے ذریعے مال حاصل کرے جوابازی سے مال حاصل کرے گانا گا کر اجرت سے مال

حاصل کرے فاحشہ عورت بدکاری کے ذریعے مال حاصل کرے، کاہن اور نجومی لوگ اپنے اس فن سے جو مال حاصل کرتے ہیں اور نر جانور کو مادہ کے گابھن کرنے کے لئے مادہ پر چڑھانے کی اجرت۔ اور ہر قسم کی فاسد بیع سے مال حاصل کرنا اور رشوت کے ذریعے مال حاصل کرنا سب حرام اور باطل ہیں یہ مثالیں ذکر کرنے کے بعد آپ نے بھی یہ فرمایا" وغیر ذلک من الوجوه التی لا یبیحه الشرع " اس کے علاوہ وہ تمام وجوہ جن کی شریعت نے اجازت نہیں دی ان سے مال حاصل کرنا باطل اور حرام ہے۔ (مظہری)

تنبیه : " ومن الاکل بالباطل ان یقضی القاضی لک وانت تعلم انک مبطل فالحرام لا یصیر حلالا بقضاء القاضی لانه انما یقضی بالظاهر "

اگر قاضی نے گواہوں کی گواہی کو سن کر یا مدعی علیہ کی قسم کا لا اعتبار کر کے فیصلہ کر دیا جس کے حق میں فیصلہ کیا گیا وہ جانتا ہے کہ میں نے ناحق فیصلہ کرا لیا ہے تو اس صورت میں قاضی تو گنہگار نہیں ہوگا البتہ وہ شخص باطل اور حرام طریقہ سے مال حاصل کر رہا ہے کیونکہ قاضی نے ظاہر طور پر فیصلہ کیا ہے اس سے حرام حلال نہیں ہوا اور نہ ہی حلال چیز قاضی کے فیصلہ سے حرام ہوتی ہے۔

مقام توجه : تفسیر صاوی نے باطل طریقہ سے مال کھانے کی چند مثالیں دی ہیں جو مظہری کے حوالہ سے نقل کی جا چکی ہیں البتہ انہوں نے ایک اور مثال "مکس" (ٹیکس) بھی دی ہے۔ یعنی ظالمانہ ٹیکس مقرر کرنا بھی باطل اور حرام ہے ہاں اگر لوگوں کے نفع کے لئے کوئی حاکم ایمانداری سے کوئی کام کرنا چاہے نہر کھدوانی ہے، ڈیم بنانا ہے وغیرہ تو لوگوں پر ٹیکس مقرر کیا جا سکتا ہے لیکن مقام افسوس یہ ہے کہ سارا نظام برباد اس وجہ سے کہ ٹیکس مقرر غرباء پر ہوتا ہے یا زمیندار پر ہوتا یا تاجر پر ہوتا ہے۔ یا تنخواہ دار پر ہوتا ہے یہی لوگ ملک کو چلانے والے ہیں یہی ملک کی ریڑھ کی ہڈی ہیں لیکن وہ پیسہ کھانے والے لنگے تلنگے، غاصب لیٹرے ہوتے ہیں۔

کسی منصوبہ پر اربوں روپے یا کروڑوں روپے خرچ کرنے کا اعلان ہوتا ہے کبھی آپ نے سوچا کہ وہ پیسہ صرف دس فیصد خرچ ہوتا ہے نوے فیصد مختلف ہاتھوں میں چلا جاتا ہے۔ ملک کو قرضے میں جکڑ دیا گیا ہے قرض پر قرض لئے جا رہے ہیں اب حالت یہ ہے کہ صرف سود ادا کرنے کے لئے بھی قرض لینے کی ضرورت پڑتی ہے وہ قرض ہم بے مقصد کاموں پر صرف کر دیتے ہیں ایک ایک محفل پر کروڑوں روپے خرچ ہو جاتے ہیں کہ صدر صاحب آ رہے ہیں، وزیر اعظم صاحب آ رہے ہیں۔

اسمبلیوں کے ممبران کی تعداد بڑھا بڑھا کر ان کی مراعات بڑھا بڑھا کر ملک کو کنگال کیا جا رہا ہے وزراء کی مراعات بڑھائی جا رہی ہیں صدر اپنی ہی قلم سے اپنی مراعات بڑھا دیتا ہے کیا یہ سب کچھ ظلم ہے یا نہیں؟

باطل طریقے سے مال کھانے پر مختلف ارشادات:

﴿ یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَاْکُلُوْٓا اَمْوَالَکُمْ بَیْنَکُمْ بِالْبَاطِلِ اِلَّآ اَنْ تَکُوْنَ تِجَارَۃً ﴾

''اے ایمان والو نہ کھاؤ آپس میں ایک دوسرے کے مال باطل طریقے سے سوائے اس کے کہ تجارت سے (نفع حاصل) ہو''

﴿ اَلَّذِیْنَ یَاْکُلُوْنَ اَمْوَالَ الْیَتٰمٰی ظُلْمًا اِنَّمَا یَاْکُلُوْنَ فِیْ بُطُوْنِھِمْ نَارًا وَّسَیَصْلَوْنَ سَعِیْرًا ﴾

''وہ لوگ جو یتیموں کا مال کھاتے ہیں وہ اپنے پیٹوں میں آگ کھاتے ہیں اور عنقریب جہنم کی بھڑکتی آگ میں جلیں گے''۔

﴿ یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰہَ وَذَرُوْا مَا بَقِیَ مِنَ الرِّبٰوٓا اِنْ کُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ ﴾

''اے ایمان والو اللہ سے ڈرو اور باقی سود چھوڑ دو اگر تم مومن ہو''۔

ان آیات میں حرام، ناحق، باطل طریقے سے مال کھانے پر وعید فرمائی اور ساتھ ہی ایمان والوں کو حلال اور پاکیزہ مال کھانے کا حکم دیا۔

﴿ یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا کُلُوْا مِنْ طَیِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰکُمْ ﴾

''اے ایمان والو کھاؤ پاکیزہ، حلال مال جو ہم نے تمہیں عطا کیا ہے''

اور یہی حکم رب تعالیٰ نے اپنے برگزیدہ بندوں یعنی رسولوں کو دیا ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ یٰٓاَیُّھَا الرُّسُلُ کُلُوْا مِنَ الطَّیِّبٰتِ ﴾ ''اے رسولو کھاؤ پاکیزہ، حلال مال''

حلال و حرام کی پہچان میں ایک شاندار ضابطہ:

شیخ ابو حامد محمد غزالی رحمہ اللہ نے خوبصورت ضابطہ بیان فرمایا علامہ رازی رحمہ اللہ نے تفسیر کبیر میں بھی ذکر فرمایا۔ زمین میں پائی جانی والی اشیاء جن کو کھایا جاتا ہے وہ تین قسم کی ہیں: معدنیات،

نباتات اور حیوانات۔

معدنیات کا حکم: معدنیات وہ چیزیں ہیں جو زمین کے اجزا ہیں یا زمین سے نکلتی ہیں وہ تمام حلال ہیں جب تک کھانے والے کو نقصان نہ پہنچائیں۔ اگر کھانے والے کو نقصان پہنچائیں تو نقصان پہنچانے کی وجہ سے ان کا استعمال ناجائز ہوگا۔ کیونکہ بعض معدنیات میں زہریلے اثرات پائے جاتے ہیں۔ اس ضابطہ کے مطابق " والخبز لو کان مضرا الحرام اکله " اگر کوئی ماہر طبیب بتائے کہ تمہارے لئے روٹی کھانا زہر قاتل ہے تو اس شخص کے لئے روٹی کھانا بھی حرام ہو جائے گا۔

مٹی بھی اجزاء ارض سے ہونے کی وجہ سے معدنیات سے تعلق رکھتی ہے مٹی کا کھانا بھی مضر صحت کی وجہ سے حرام ہے حالانکہ پاک مٹی پر کھانے کی کوئی چیز گر جائے تو اسے اٹھا کر صاف کر کے کھانے کا حکم ہے۔

نباتات کا حکم: نباتات تمام ہی حلال ہیں ہاں البتہ وہ نباتات جو عقل کو زائل کر دیں یا زندگی کو زائل کر دیں یا صحت کو زائل کریں وہ حرام ہوں گی۔ عقل کو زائل کرنے والی چیزیں جو حرام ہیں وہ یہ ہیں بھنگ، شراب اور تمام نشہ دینے والی چیزیں۔ زندگی کو زائل کرنے والی اشیاء یعنی نباتات میں سے کوئی چیز جس میں زہریلے اثرات ہوئے جس سے زندگی ختم ہونے کا خطرہ ہو وہ حرام ہے۔ صحت کو زائل کرنے والی چیزیں حرام ہیں جیسا کہ دوا بغیر وقت کے اور بغیر طبیب کے مشورہ کے استعمال کرنا جو صحت کو زائل کر دے۔

تنبیہ: " والمسکرات فان الذی لا یسکر منها ایضا حرام مع قلته لعینه ولصفته وهی الشدة المطربة "

نشہ آور چیزیں تمام حرام ہیں ان کو تھوڑا استعمال کرے یا زیادہ استعمال کرے کیونکہ ان میں ذاتی طور پر نشہ پایا گیا ہے لہٰذا یہ کہنا باطل ہے کہ نشہ آور چیز اتنی مقدار میں جائز ہے جس سے نشہ نہ آئے۔ ہاں البتہ کسی دوا وغیرہ کے تابع ہو تو اس کا حکم ﴿ فَمَنِ اضْطُرَّ غَيْرَ بَاغٍ ﴾ کے تحت ذکر کیا جا چکا ہے۔

فائدہ: زہر کا زہریلا اثر ختم ہو گیا یا اس کے کم ہونے کی وجہ سے یا کسی اور دوا وغیرہ میں ملا کر اس سے کوئی کشتہ تیار کر لیا گیا جس سے اس کے اثرات زائل ہو گئے تو اس کا استعمال جائز ہے۔

حیوانات کا حکم: بعض جانوروں کا گوشت کھانا حلال ہے اور بعض کا حرام۔ کئی جانوروں کے حلال ہونے اور حرام ہونے کو قرآن پاک یا احادیث مبارکہ میں واضح کر دیا گیا ہے تاہم ہر درندہ خواہ حیوانات سے ہو یا پرندوں سے ہو حرام ہے۔ ہر جانور جو پنجے سے پکڑ کر چونچ سے کھائے حرام ہے ہمیشہ بلوں میں بسیرا کرنے والے جانور حرام ہیں۔ لیکن یہ بھی خیال ہے کہ حلال جانوروں کو شرعی ضابطہ کے مطابق ذبح کیا جائے یا شکار کیا جائے تو وہ حلال ہوتے ہیں ورنہ وہ حلال ہونے کے باوجود حرام ہو جائیں گے ہاں البتہ مچھلی اور مکڑی بغیر ذبح کے حلال ہیں۔ پانی والے جانور سوائے مچھلی کے باقی تمام حرام ہیں سوائے ان جانوروں کے جن کی مثال خشکی میں حلال ہو جیسا کہ بھینس، مینڈھا وغیرہ، یہ دریائی بھی حلال ہیں۔

حرام طریقہ سے حاصل کیا ہوا مال حرام ہے:

اس میں کل چھ قسمیں ہیں پھر ہر ایک میں دو دو صورتیں ہیں ایک حلال اور ایک حرام۔

(۱) معدنیات کو حاصل کرنا اور شکار کرنا اور لکڑیاں حاصل کرنا اگر کسی مالک کی زمین ہے تو اس سے اجازت طلب کر کے یا حکومت کی ملکیت ہے تو حکومت سے اجازت طلب کر کے یہ کام کیے گئے تو حلال ہیں۔ یا جنگل میں سے شکار کرنے کی ہر شخص کو اجازت ہے اسی طرح لکڑیاں حاصل کرنے کی اجازت ہے تو یہ کام جائز ہیں اگر زبردستی یا چوری سے یہ کام کیے ہیں تو ناجائز ہیں۔

(۲) مال غنیمت اور مال فئی اور کافروں کی املاک پر مسلمانوں کا قبضہ ہوا حاکم نے شرعی قوانین کے مطابق انہیں تقسیم کیا تو جس کے حصہ میں جو آیا حلال ہے اور اگر خود ہی ناجائز طور پر قبضہ کر لیا تو اس سے نفع حاصل کرنا منع ہے۔

(۳) کسی شخص سے مال اس کی رضامندی سے حاصل کیا تو حلال ہے اور جبری طور پر لے لیا چوری کر لیا یا کسی قسم کے فراڈ سے مال لے لیا تو حرام ہے۔

(۴) اگر کسی سے مال خریدا یا کرایہ پر لیا تو اس میں شرعی حدود و قیود کا لحاظ پایا گیا تو جائز ہے اور اگر شریعت کے خلاف کوئی شرائط وغیرہ پائی گئیں تو ناجائز ہوگا۔

(۵) اگر کسی نے مال ہبہ کیا یا وصیت کی تو اس میں بھی شرعی امور کا لحاظ رکھا گیا ہے تو درست ہے اور

شرعی امور کا لحاظ نہیں کیا گیا تو ناجائز ہے۔

(۲) وراثت کے طور پر مال ملا اور اپنا حق شرعی ہی لیا تو حلال ہے اور اگر شرعی حق سے تجاوز کر کے کسی کا حق غصب کیا تو حرام ہے۔ (ماخوذ از احیاء العلوم ج ۲ ص ۵۳، ۵۴)

فضیلت حلال اور مذمت حرام بیان میں:

چند آیات کا پہلے ذکر کر دیا گیا ہے، اب چند احادیث و آثار کی طرف توجہ کی جائے۔

☆ " **روی ابن مسعود رضی الله عنه عن النبی ﷺ انه قال طلب الحلال فریضة علی کل مسلم** "

حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں نبی کریم ﷺ نے فرمایا ہر مسلمان پر حلال چیزوں کا طلب کرنا فرض ہے۔ دوسری حدیث میں فرمایا " **طلب العلم فریضة علی کل مسلم** " ہر مسلمان پر علم کا طلب کرنا فرض ہے۔ لیکن اس علم سے مراد کون سا علم ہے؟ " **طلب علم الحلال والحرام** " حلال اور حرام کا علم طلب کرنا فرض ہے۔ گویا کہ دونوں حدیثوں کا مطلب ایک ہی ہے علم سے مراد دینی علم ہے جس سے حلال اور حرام میں تمیز حاصل ہوتی ہے۔ ایسا علم مراد نہیں جس سے رشوت اور لوٹ کھسوٹ اور ملک کی چلتی حکومت کو توڑ کر خود قابض ہو جانے اور ساری عسکریہ کو لوگوں کی نفرت کا نشانہ بنانے کا علم حاصل ہو۔

☆ " **وقال ﷺ من سعی علی عیاله من حله فهو کالمجاهد فی سبیل الله ومن طلب الدنیا حلالا فی عفاف کان فی درجة الشهداء** "

نبی کریم ﷺ نے فرمایا جو حلال مال کی طلب میں اہل وعیال کے لئے کوشش کرتا ہے وہ اللہ کی راہ میں جہاد کرنے والے کی طرح ہے اور جو پاک دامن رہتے ہوئے دنیا کا حلال مال طلب کرے وہ درجہ شہداء میں ہے۔

☆ " **وقال ﷺ من اکل الحلال اربعین یوما نور الله قلبه واجری ینابیع الحکمة من قلبه علی لسانه** "

نبی کریم ﷺ نے فرمایا جس شخص نے چالیس دن رزق حلال کھایا اللہ تعالیٰ اس کے دل کو منور کر

دے گا اور اس کے دل سے اس کی زبان پر حکمت کے چشمے جاری کر دیتا ہے۔

☆ " روی ان سعیدا سأل رسول الله ﷺ ان یسأل الله تعالیٰ ان یجعله مجاب الدعوة فقال له اطب طعمتک تستجب دعوتک "

حضرت سعید رضی اللہ عنہ نے نبی کریم ﷺ کی خدمت میں عرض کیا یا رسول اللہ آپ اللہ تعالیٰ سے میرے لئے سوال کریں کہ مجھے مستجاب الدعوات بنا دے (یعنی میری دعاؤں کو وہ قبول کرے) تو آپ نے فرمایا تم اپنا مال حلال اور پاکیزہ رکھو تو تمہاری دعاؤں کو قبول کیا جائے گا۔

☆ " ولما ذکر ﷺ الحریص علی الدنیا قال رب اشعث اغبر مشردا فی الاسفار مطعمه حرام وملبسه حرام وغذی بالحرام یرفع یدیه فیقول یا رب یا رب فانی یستجاب لذلک "

جب نبی کریم ﷺ کے سامنے دنیا کے حریص کا ذکر کیا گیا تو آپ نے فرمایا کتنے پراگندہ حال اور غبار آلود اور سفر میں بغیر کسی مونس کے ہوتے ہیں طعام ان کا حرام ہوتا ہے اور لباس ان کا حرام ہوتا ہے اور غذا ان کی حرام ہوتی ہے وہ اپنے ہاتھوں کو اٹھاتا ہے عرض کرتا ہے اے میرے رب اے میرے رب تو اس کی دعا کیسے قبول کی جائے گی۔

مطلب یہ تھا کہ ایک شخص مسافر بھی ہو اکیلا ہو پریشان حال ہو پراگندہ حالت ہو، کپڑے غبار آلود ہوں یا سے شخص کی دعا زیادہ قبول ہوتی ہے لیکن شرط یہ ہے کہ اس کا رزق حلال ہو اگر رزق حرام ہو تو اس کی دعا کی قبولیت کی امید نہیں کی جا سکتی۔

☆ " وقال ﷺ کل لحم بنت من حرام فالنار اولی به "

نبی کریم ﷺ نے فرمایا جس کے گوشت کی نشو ونما حرام مال سے ہوئی آگ اسکے زیادہ قریب ہوگی۔

☆ " وقال ﷺ من لم یبال من این اکتسب المال لم یبال الله من این ادخله بالنار "

نبی کریم ﷺ نے فرمایا جو شخص یہ پرواہ نہیں کرتا کہ اس کا مال کہاں سے آ رہا ہے تو اللہ تعالیٰ بھی کوئی پرواہ نہیں کرتا کہ اسے کس جانب سے آگ میں داخل کرے۔ یعنی اس کے لئے جہنم کے دروازے ہر طرف سے کھلے ہوں گے جس طرف سے رب چاہے گا اسے آگ میں داخل کر دے گا۔

(از احیاء العلوم ج ۲ ص ۵۲)

بعض حضرات نے کسی ابدال کی خدمت میں طعام پیش کیا تو انہوں نے کھانے سے انکار کر دیا انہوں نے ابدال سے نہ کھانے کے متعلق سوال کیا تو اس نے کہا (ہم وہ کھانا نہیں کھاتے جس میں اشتباہ ہو کہ حرام ہے یا حلال):

" نحن لا ناکل الا فلذلک نستقیم قلوبنا ویدوم حالنا ونکاشف بالملکوت ونشاهد الآخرة ولو اکلنا مایاکلون ثلاثة ایام لما رجعنا الی شئی من علم الیقین ولذهب الخوف والمشاهدة من قلوبنا "

ہم صرف حلال مال کھاتے ہیں (یعنی جس کے حلال ہونے کا یقین ہو) اسی وجہ سے ہمارے دل درست رہتے ہیں اور ہمارا حال ہمیشہ ایک طرح کا ہوتا ہے اور ملکوت کا ہمیں کشف حاصل ہوتا ہے اور آخرت کا ہم مشاہدہ کرتے ہیں اور اگر ہم تین دن وہ چیزیں کھائیں جو عام لوگ کھاتے ہیں (یعنی حلال وحرام کی تحقیق کے بغیر) تو ہم کبھی علم یقین کا درجہ نہیں پا سکتے اور ہمارے دل سے رب تعالیٰ کا خوف جاتا رہے گا اور ہمارے دلوں کا مشاہدہ زائل ہو جائے گا۔ (احیاء العلوم ج ۲ ص ۵۳)

وَتُدْلُوْا بِهَا اِلَى الْحُكَّامِ : ''اور نہ پیش کرو ان کو حاکموں کی طرف''

" ادلاء " کا معنی ہے ڈول ڈالنا کہ پانی حاصل کرے پھر کسی کی طرف بات پیش کرنا اور فعل پیش کرنا بھی اس کا معنی لیا جاتا ہے اسی طرح کہا جاتا ہے " ادلی بحجته " اس نے اپنی دلیل پیش کی ﴿وَتُدْلُوْا بِهَا﴾ کا عطف منہی عنہ پر ہے اور معطوف علیہ سے پہلے جو ''لا'' ہے وہ معطوف سے پہلے بھی مراد ہوگا۔ اب تقدیر عبارت یہ ہوگی:

﴿ وَلَاتَاْكُلُوْا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ وَلَا تُدْلُوْا بِهَا اِلَى الْحُكَّامِ ﴾

''اور تم آپس میں ایک دوسرے کے مال ناحق نہ کھاؤ اور نہ پیش کرو ان کو حکام کی طرف''

"بھا" ضمیر کا مرجع کیا ہے؟ اس میں دو احتمال ہیں (بھا) ای بحکومتها او بالاموال رشوة "

ایک احتمال یہ ہے کہ حکام سے حکومت جو سمجھ آ رہا ہے وہ مرجع ہو تو اب معنی یہ ہوگا کہ اپنے مقدمات حاکموں کے پاس اس لئے نہ لے جاؤ کہ (ان سے غلط فیصلے کرا کے) لوگوں کا مال گناہ سے کھالو۔

دوسرا احتمال یہ ہے کہ ضمیر کا مرجع " اموال " ہو اب معنی یہ ہوگا کہ حاکموں کے پاس اپنے مال بطور رشوت نہ پیش کرو کہ ان کے ذریعے لوگوں کا مال گناہ سے کھاؤ۔ (جلالین)

خیال رہے اعلیٰ حضرت کا ترجمہ پہلے احتمال کے مطابق ہے اور راقم کا ترجمہ مطلق ہے تاکہ عموم المجاز کے مطابق دونوں احتمالوں کو شامل ہو جائے۔ یعنی مطلب جب یہ ہو کہ ان کو حاکموں کی طرف باطل طریقہ سے نہ پیش کرو خواہ وہ باطل مقدمات ہوں یا رشوت کے طور پر دیا ہوا باطل مال ہو۔

سبحان اللہ راقم نے اپنا موقف پیش کرنے کے بعد تفسیر کبیر کو دیکھا تو اپنے قول کے مطابق پا کر رب تعالیٰ کا شکرادا کیا کہ اس نے مجھے صحیح سمجھنے کی توفیق عطا کی۔ آپ پہلے تو یہ بیان کرتے ہیں:

"هو ان يدفع الى الحكام رشوة وهذا اقرب الى الظاهر"

حاکموں کو رشوت کے طور پر مال دینے سے منع کیا گیا ہے اور یہ قول مراد لینا زیادہ بہتر ہے۔ اس کے بعد آپ فرماتے ہیں:

"ولا يبعد ايضا حمل اللفظ على الكل لانها باسرها اكل بالباطل"

یہ کوئی بعید بات نہیں کہ مفسرین کے تمام اقوال ہی مراد ہوں حکام کے پاس باطل طریقہ سے کسی چیز کو پیش کر کے لوگوں کا مال ناحق کھانا منع ہے۔

فائدہ: رشوت پیش کرنے کی ممانعت کو ڈول ڈالنے سے تشبیہ اس لئے دی گئی کہ رشوۃ اور رشاء کا مادہ ایک ہی ہے رشاء کا معنی ہے رسہ۔ جس طرح بھرا ہوا ڈول دور سے یعنی کنوئیں کی نیچے جانب سے رسے کے واسطہ سے قریب لایا جاتا ہے کہ اسے کنویں کی اوپر جانب کی طرف لایا جاتا ہے۔ ایسے ہی رشوت کے ذریعے دور والے مقصد کو قریب کیا جاتا ہے۔

دوسری وجہ تشبیہ کی یہ ہے کہ جس طرح ڈول ڈال کر پانی حاصل کر لیا جاتا ہے یہ نہیں دیکھا جاتا کہ کنویں والا پانی لینے سے ناراض تو نہیں یہ نہیں دیکھا جاتا کہ کنواں پاک ہے یا ناپاک اسی طرح رشوت لینے والا حاکم یہ نہیں دیکھتا کہ میں فیصلہ حق کے مطابق کر رہا ہوں یا ناحق فیصلہ کر رہا ہوں۔ اس نے تو رشوت دینے والے کے حق میں فیصلہ کرنا ہی ہے۔ (ماخوذ از کبیر)

لِتَاْكُلُوْا فَرِيْقًا مِّنْ اَمْوَالِ النَّاسِ بِالْاِثْمِ: "کہ کھاؤ تم مال لوگوں کے مالوں میں سے ناجائز طور پر" "فریقا" کا اکثر مفسرین نے "طائفة" سے ترجمہ کیا ہے (کچھ مال) اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ کا بھی یہی ترجمہ ہے لیکن تفسیر تبصیر الرحمٰن میں علامہ علی بن احمد بن ابراہیم بن اسمٰعیل رحمہم اللہ بیان

فرماتے ہیں (فریقا) ای طائفة عظیمة " حاکموں کے پاس باطل طریقہ سے مقدمات نہ لے جاؤ یا ان کو رشوت دے کر اپنے حق میں باطل فیصلہ اس لئے نہ کراؤ کہ لوگوں کا بہت بڑا مال ناجائز طریقہ سے کھالو۔

روح المعانی میں علامہ ابوالفضل شہاب الدین السید محمود آلوسی بغدادی فرماتے ہیں (فریقا) قطعة او جملة " (کچھ مال یا کل مال) تمام تفاسیر کے مجموعہ سے نتیجہ یہ نکلا کہ لوگوں کا کل مال یا زیادہ مال یا کچھ مال غلط مقدمات کے ذریعے یا رشوت کا مال دے کر کھانا حرام ہے اسی لئے راقم نے ترجمہ میں " کچھ" کا لفظ نہیں شامل کیا " بالاثم " (گناہ کے ذریعے، ناجائز طریقہ سے) یعنی جھوٹے گواہ پیش کر کے ، جھوٹی قسمیں اٹھا کر ، جان بوجھ کر ناجائز مقدمات پیش کر کے ، رشوت کا مال دے کر اپنے حق میں مقدمات کا فیصلہ کرنا گناہ کا سبب ہے ایسے ناجائز طریقہ سے مال حاصل کرنے سے اجتناب کا حکم دیا

وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ: " حالانکہ تم جانتے ہو" "جملة حالية من فاعل تاكلوا " یہ جملہ اسمیہ "تاکلوا " کے فاعل سے حال واقع ہو رہا ہے۔ (صاوی)

ایسے حال میں کہ تم جانتے ہو کہ تم باطل طریقہ پر ہو:

" ولا شک ان الاقدام على القبيح مع العلم بقبح اقبح وصاحبه بالتوبيخ احق "

اسمیں کوئی شک نہیں کہ بیشک برے کام کا علم رکھنے والے کا اقدام اس برائی کی طرف زیادہ برا ہے اور صاحب علم کا برائی کا ارتکاب توبیخ (زجر، ڈانٹ) کا زیادہ حق رکھتا ہے۔

☆ " روى عن ابى هريرة رضى الله عنه انه قال اختصم رجلان الى النبى ﷺ عالم بالخصومة وجاهل بها فقضى رسول الله ﷺ للعالم فقال من قضى عليه يا رسول الله والذى لا اله الا هو انى محق فقال ان شئت اعاوده فعاوده فقضى للعالم فقال المقضى عليه مثل ما قال اولاثم عاوده ثالثا ، ثم قال عليه الصلوة والسلام " من اقتطع حق امرئ مسلم بخصومته فانما اقتطع قطعة من النار " فقال العالم المقضى له " يا رسول الله ان الحق حقه " فقال عليه الصلوة والسلام ، من اقتطع بخصومته وجد له حق غير فليتبوأ مقعده من النار "

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں بیشک دو شخصوں نے نبی کریم ﷺ کے پاس اپنا جھگڑا لایا۔ ایک شخص مقدمہ لڑنے کا طریقہ جانتا اور دوسرا نہیں جانتا تھا۔ رسول اللہ ﷺ نے فیصلہ اس شخص کے حق میں کر دیا جو مقدمہ کا علم رکھتا تھا جس کے خلاف فیصلہ ہوا اس نے عرض کیا قسم ہے اس ذات کی جس کے بغیر کوئی معبود نہیں میں حق پر ہوں تو حضور ﷺ نے اسے پھر مقدمہ لوٹانے کی اجازت دی اس شخص نے مقدمہ لوٹایا لیکن پھر فیصلہ اسی کے حق میں ہو گیا جو مقدمہ کا طریقہ جانتا تھا۔ جس کے خلاف فیصلہ ہوا اس نے پھر کہا قسم ہے اس ذات کی جس کے بغیر کوئی معبود نہیں بیشک میں حق پر ہوں۔ (آپ نے اسے پھر مقدمہ لوٹانے کی اجازت دے دی) اس نے پھر مقدمہ لوٹایا تو نبی کریم ﷺ نے فرمایا جو شخص جھگڑا کر کے (اپنا مقدمہ چرب زبانی سے پیش کر کے جھوٹے گواہ پیش کر کے، جھوٹی قسم کے ذریعے) اپنے مسلمان بھائی کا حق لے لیا تو اس نے اپنے لئے آگ کا ٹکڑا کاٹ کر رکھ لیا۔ (یہ سن کر) وہ شخص جو مقدمہ کرنے کا علم رکھتا تھا جس کے حق میں فیصلہ ہو چکا تھا (اس کے دل میں خوف طاری ہو گیا) کہنے لگا یا رسول اللہ بیشک یہ اسی کا حق ہے پھر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس شخص نے دوسرے کا حق جھگڑا کر کے حاصل کر لیا اس نے اپنا ٹھکانا جہنم بنا لیا۔

امام اعظم رحمہ اللہ کے تقویٰ کی شاندار مثال:

امام اعظم ابوحنیفہ رحمہ اللہ نے کسی مجوسی سے قرض لینا تھا آپ قرض کا مطالبہ کرنے کے لئے اس کے دروازے پر تشریف لے گئے جب آپ اس کے دروازے پر پہنچے آپ کا جوتا نجاست (گوبر وغیرہ) پر واقع ہو گیا تو آپ نے اپنے جوتے کو جھاڑا، جوتے سے نجاست گر کر مجوسی کی دیوار پر پڑ گئی تو امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ حیران ہو گئے اور دل ہی دل میں یہ کہہ رہے ہیں:

"ان ترکتها کان ذلک شینا یقبح جدار ذلک المجوسی و ان حککتها احضر التراب"

اگر یہ نجاست دیوار پر ہی رہنے دیتا ہوں تو دیوار اس مجوسی کی قبیح (بدزیب) نظر آئے گی اور اگر میں اسے کھرچتا ہوں تو اس کی مٹی بھی ساتھ کھرچی جائے گی (مٹی کے کھرچے جانے سے دیوار کا نقصان ہوگا) آپ نے دروازہ کھٹکھٹایا اندر سے ایک غلامہ باہر آئی آپ نے اسے کہا اپنے مولیٰ سے جا کر کہو کہ ابوحنیفہ دروازہ پر ہے وہ مجوسی باہر نکلا اس نے گمان کیا کہ آپ قرض کا مطالبہ کریں گے تو اس

نے پہلے ہی عذر پیش کرنا شروع کر دیا تو امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ نے فرمایا کہ اب تو میں ایک عذر پیش کرنے کا زیادہ حقدار ہوں۔ پھر آپ نے دیوار پر نجاست لگنے کا واقع بیان کیا اور پوچھا " وانہ کیف السبیل الی التطہیر " اب اس کو پاک کرنے کا کیا طریقہ ہے (یعنی تمہاری اجازت ہو تو مٹی کھرچ دوں) "فقال المجوسی فانا ابدأ بتطہیر نفسی فاسلم فی الحال " مجوسی نے حضرت امام اعظم رحمہ اللہ کے تقوی کو دیکھ کر کہا میں پہلے اپنے نفس کو پاکیزہ کرلوں تو اسی وقت اس نے اسلام قبول کرلیا۔

اس واقعہ سے مطلب یہ حاصل ہوا کہ جب لوگوں کا ناحق مال کھانا ظلم ہے تو یقیناً ظلم میں واقع ہونا باعث نقصان اور باعث ذلت ہے اور " فمن احترز عن الظلم نال سعادۃ الدارین " جو شخص ظلم سے بچ گیا اس نے دونوں جہانوں کی سعادت کو حاصل کرلیا یہی وجہ ہے:

" ان ابا حنفیۃ لما احترز عن ظلم ذلک المجوسی فی ذلک القدر
القلیل فلاجل برکۃ ذلک اسلم المجوسی ونجا من شقاوۃ الابد "

کہ بیشک امام اعظم ابوحنیفہ رحمہ اللہ نے جب مجوسی پر معمولی ظلم کرنے سے اجتناب کیا اور اس کے معذرت طلب کی تو وہ اس کی برکت کی وجہ سے اسلام لے آیا اور ہمیشہ کی بدبختی سے نجات حاصل کرگیا۔
(از روح البیان)

تنبیہ : دنیا میں تین قسم کی چیزیں پائی جاتی ہیں حلال، حرام، شبہ۔
" فالحرام یوجب العقاب " حرام اشیاء کی وجہ سے رب تعالیٰ کی طرف سے عذاب ہوگا یعنی شدید مؤاخذہ ہوگا " والشبہۃ توجب العتاب " اور شبہات کی وجہ سے عتاب ثابت ہوگا یعنی ڈانٹ ڈپٹ، زجر و توبیخ ہوگی۔ (شبہات وہ چیزیں ہوں گی جن میں واضح طور پر حلت و حرمت کی کوئی دلیل تو نہیں ہوگی البتہ ان میں شک پایا جائے کہ ہوسکتا ہے کہ یہ ناجائز ہو ورنہ جس میں شک نہیں اور شریعت میں ان کو منع بھی نہیں کیا گیا وہ اشیاء مباح ہیں۔
" والحلال یوجب الحساب " اور حلال اشیاء کا بھی حساب ہوگا یعنی ضرورت سے زائد بے جا استعمال سے گریز کیا جائے۔ حکیم سنائی نے کیا خوب کہا:

این جہاں بر مثال مردا است گرگساں اندروں ہزار ہزار
یہ جہاں (دنیا) مردار کی طرح ہے اس میں ہزاروں گدھیں پائی جاتی ہیں

ایں مرآں رابمی زند فحلب   وآں مر ایں رابمی زند منقار

کوئی ادھر سے اسے پنجے مار رہی ہے   اور کوئی ادھر سے اسے چونچ مار رہی ہے

آخر الامر بگذر ندبمه وزبمه باز ماند ایں مردار

آخر کار سب گزر جائیں گے   اور یہ مردار سب سے باقی رہ جائے گا۔

یعنی دینادار گدھوں کی طرح دنیا کے مال و دولت پر جھپٹیں گے جو مردار کی طرح ہے۔ کوئی ادھر سے مال بٹورنے کی طرف ہاتھ پاؤں مارے گا کوئی ادھر سے تگ و دو کرے گا۔ حلال وحرام کی پرواہ نہیں کریں گے صرف مال حاصل کرنا ان کا وطیرہ ہوگا۔ لیکن یہ دنیا یہیں رہ جائے گی لوگ دنیا سے چلے جائیں گے اس لئے " **فعلی العاقل ان یجتنب عن حقوق العباد و المظالم** " عقل مند آدمی پر لازم ہے کہ وہ حقوق العباد کا خیال کرے لوگوں کے حقوق نہ دبائے اور لوگوں پر ظلم کرنے سے اجتناب کرے۔

حکایت : نوشیرواں نے وصیت کی کہ جب میں مر جاؤں تو میرے تابوت کو میری مملکت کے مختلف اطراف میں پھیرا جائے اور اعلان کیا جائے کسی شخص کا کوئی حق بادشاہ پر ہو تو وہ آ جائے اور اس کا وہ حق ادا کیا جائے۔ بادشاہ کی وصیت کے مطابق ایسا ہی کیا گیا لیکن کسی شخص نے آ کر ایک درہم کا سوال بھی نہ کیا یہی وجہ ہے کہ نوشیرواں کے عدل وانصاف کی وجہ سے اس کا نام آج تک زندہ ہے۔

حکایت: ایک نصرانی (عیسائی) اپنی زوجہ کو گدھے پر سوار کر کے کہیں جا رہا تھا اس کا گزر مسلمانوں کی ایک بستی سے ہوا تو ایک نشہ میں مست شخص نے اس کے گدھے کی دم کو نیچے سے کاٹ دیا گدھا درد کے مارے اضطراب میں آ گیا گدھے کی چھلانگ سے عورت گر گئی اس کا ہاتھ ٹوٹ گیا اور اس کا حمل گر گیا۔

وہ عیسائی اس بستی کے قاضی کے پاس گیا قاضی نے اس نشئی کو بلایا اور کہا ابھی گدھا تم اپنے پاس رکھ لو جب گدھے کی دم اگ آئے (صحیح ہو جائے) تو پھر اس کو گدھا واپس کر دینا۔ اور اسکی عورت کو بھی اپنے پاس رکھ لے جب یہ پھر حاملہ ہو جائے اور اس کا ہاتھ درست ہو جائے تو اسکی عورت واپس کر دینا۔

نصرانی نے کہا" **اهکذا حکم شریعتکم** " کیا تمہاری شریعت کا یہی حکم ہے؟ پھر اس نے سر آسمانوں کی طرف اٹھایا اور کہا:

" الهی انت حلیم ولاصبر لی علی هذا فاحکم یا ناظر الملهوفین
ویاناصر المظلومین فمسخ الله ذلک القاضی فصار حجرا من ساعته "

اے اللہ تو حلیم ہے مجھے اس پر صبر حاصل نہیں اے اللہ تو ہی فیصلہ فرما۔ اے مظلوموں پر نظر رحمت فرمانے والے اور اے مظلوموں کی امداد کرنے والے تو بہتر فیصلہ فرمادے تو اللہ تعالیٰ نے اس قاضی کو پتھر بنادیا۔ اس واقعہ سے دو فائدے حاصل ہوئے " **الاول ان هذا القاضی بظلمه وقع فیما وقع من البلاء العظیم** " پہلا فائدہ یہ حاصل ہوا کہ قاضی ظلم کی وجہ سے بہت بڑی مصیبت میں گرفتار ہوا۔ (ظالموں کا انجام یہی ہوتا ہے لیکن افسوس کہ ظالموں کو بروقت عقل نہیں آتی ساتھ ساتھ یہ بھی پتہ چلا کہ شریعت کے احکام سے عدولی کر کے اپنی مرضی کے فیصلے کرنے والے ملک وملت کے لئے باعث ننگ وعار (شرم وحیا کا سبب) ہیں ایسے قاضی ملک کو برباد کرتے ہیں۔

اور دوسرا فائدہ یہ حاصل ہوا " **یجب الاحتراز عن الظلم وان کان الظالم** " ظلم سے اجتناب ضروری ہے کسی کافر پر بھی ظلم نہ کیا جائے، مظلوم کی آہ سے عرش الٰہی کانپتا ہے مظلوم کی دعا قبول ہوتی ظالم اپنے انجام کو پہنچتا ہے اگرچہ اس میں دیر ہی کیوں نہ ہو۔

آیۃ کریمہ میں لطیف اشارہ:

مال انسان کی مصلحت کے لئے پیدا کیا گیا ہے کہ انسان اس سے اپنے بدن کو درست کر سکے۔
اور نفس کو اس لئے پیدا کیا گیا کہ وہ حق عبودیت ادا کر سکے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنَ ﴾

"اور نہیں پیدا کیا میں نے جنوں اور انسانوں کو مگر یہ کہ میری عبادت کریں"

﴿ لیعلموا ان الاموال والانفس لله فلا یتصرفون فیهما الا بامر الله ﴾

"ہر انسان کو یہ معلوم ہونا چاہئے کہ بیشک اس کا مال اور اس کی جان اللہ تعالیٰ کے لئے ہے اس لئے وہ مال اور جان میں اللہ کے امر کے خلاف کوئی تصرف نہ کریں"۔ (از روح البیان)

☆☆☆☆☆

يَسْئَلُوْنَکَ عَنِ الْاَهِلَّةِ قُلْ هِیَ مَوَاقِیْتُ لِلنَّاسِ وَالْحَجِّ وَلَیْسَ الْبِرُّ بِاَنْ تَاْتُوا الْبُیُوْتَ مِنْ ظُهُوْرِهَا وَلٰکِنَّ الْبِرَّ مَنِ اتَّقٰی وَاْتُوا الْبُیُوْتَ مِنْ اَبْوَابِهَا وَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّکُمْ تُفْلِحُوْنَ

۱) ''تم سے نئے چاند کو پوچھتے ہیں تم فرمادو وہ وقت کی علامتیں ہیں لوگوں اور حج کے لئے اور یہ کچھ بھلائی نہیں کہ گھروں میں پچھیت توڑ کر آؤ ہاں بھلائی تو پرہیزگاری ہے اور گھروں میں دروازوں سے آؤ اور اللہ سے ڈرتے رہو اس امید پر کہ فلاح پاؤ''۔

۲) ''سوال کرتے ہیں آپ سے چاند کی حالتوں کا، فرمادیجئے وہ وقت کی علامتیں ہیں لوگوں اور حج کے لئے اور یہ نہیں ہے نیکی کہ تم آؤ گھروں کو ان کی پچھلی جانب سے اور لیکن نیکی تو اسے حاصل ہے جس شخص نے تقوی اختیار کیا، اور گھروں میں آؤ ان کے دروازوں سے اور ڈرو اللہ سے تاکہ تم کامیاب ہو جاؤ''۔

شان نزول:

۱) حضرت معاذ بن جبل اور ثعلبہ بن غنم نے سوال کیا کہ کیا وجہ ہے چاند شروع میں دھاگے کی طرح باریک ہوتا ہے پھر زیادہ ہوتا ہے یعنی آہستہ آہستہ بڑھتا رہتا ہے یہاں تک کہ مکمل ہو جاتا ہے پھر آہستہ آہستہ کم ہونا شروع ہوتا ہے یہاں تک کہ اپنی پہلی حالت کی طرف لوٹ آتا ہے اس میں حکمت کیا ہے۔
(تفسير ابی السعود)

" وقال الربيع بلغنا انهم قالوا يا رسول الله لم خلقت الاهلة فانزل الله ، يسئلونک عن الاهلة ......الخ "

(۲) ربیع فرماتے ہیں کہ ہمیں یہ خبر ملی ہے کہ صحابہ کرام نے پوچھا یا رسول اللہ چاند کو کیوں پیدا کیا گیا تو اس کے جواب میں یہ آیۃ کریمہ نازل کی گئی۔ (صابونی)

ہلال کو ہلال کہنے کی وجہ:

ہلال کا معنی ہے آواز بلند کرنا، پیدائش کے بعد بچے کے رونے کو بھی استهلال کہا جاتا ہے:

" وھواول حال القمر حین یراہ الناس یقال لہ ھلال لیلتین من اول
الشھر ھلالا و کذلک لیلتین من آخر الشھر " (کبیر)

چاند کی اول حالت کو ہلال کہا جاتا ہے جب کہ لوگ دیکھ کر کہیں وہ چاند ہے پہلی دوراتوں میں چاند کو ہلال کہا جاتا ہے اور آخری دوراتوں کو بھی چاند کو ہلال کہا جاتا ہے یا تو اس وجہ سے کہ پہلی اور آخری راتوں میں چاند ایک جیسا ہوتا ہے یا یہ وجہ ہے کہ آخری راتوں میں صبح کے وقت چاند نکلنے پر لوگ دیکھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ وہ چاند ہے سمجھ آتا ہے کہ چاند انتیس کا ہوگا اور کبھی کہا جاتا ہے کہ سمجھ آتا ہے کہ چاند تیس کا ہوگا:

" وھو اول حال القمر حین یراہ الناس اول لیلۃ من الشھر "

چاند کی پہلی حالت جس وقت لوگ چاند کو دیکھتے ہیں اور مہینے کی پہلی رات کے چاند کو ہلال کہتے ہیں۔ اعلیٰ حضرت نے اسی لئے ترجمہ یہ کیا ہے تم سے نئے چاند کو پوچھتے ہیں۔ لیکن راقم نے شان نزول کی مدنظر رکھتے ہوئے یعنی:

" لم تبدو دقیقۃ ثم تزید حتی تمتلی نورا ثم تعود کما بدت و لا تکون
علی حالۃ واحدۃ کالشمس "

سوال یہ تھا کہ چاند کیوں باریک ظاہر ہوتا ہے پھر نور سے کامل روشن ہوتا ہے پھر لوٹ کر پہلی حالت کی طرف آجاتا ہے سورج کی طرح ایک حالت پر کیوں نہیں رہتا۔ (جلالین) اور روح المعانی کی اس عبارت کو مدنظر رکھتے ہوئے:

" وان کانت فی الظاھر سوالا عن التعدد الا انھا فی الحقیقۃ متضمنۃ
للسؤال عن اختلاف التشکلات النوریۃ لان التعدد یتبع اختلافھا اذ
لو کان الھلال علی شکل واحد لا یحصل التعدد کما لا یخفی "

(جمع کا صیغہ " اھلۃ " استعمال کیا گیا ہے بظاہر یہ معنی ہے کہ سوال کرتے ہیں آپ سے چاندوں کے بارے میں، مگر حقیقت میں مراد یہ ہے کہ وہ نورانیت کے لحاظ سے چاند کی شکل اور حالت کے بدلنے کے متعلق سوال کر رہے تھے اگر چاند کی ایک ہی حالت رہتی تو تعدد حاصل نہ ہوتا) ترجمہ کیا ہے سوال کرتے ہیں آپ سے چاند کی حالتوں کا۔

تنبیہ : صحابہ کرام کے سوال میں دو احتمال ہیں:

" والسؤال يحتمل ان يكون عن الغاية والحكمة وان يكون عن السبب والعلة "

ایک احتمال یہ ہے کہ ان کے سوال کا مقصد یہ تھا کہ یہ بتایا جائے کہ چاند کی حالتوں کے بدلنے میں حکمت کیا ہے اور اس کا مقصد کیا ہے؟ دوسرا احتمال یہ ہے کہ سوال ہو سبب اور علت کے متعلق کہ چاند کے گھٹنے اور بڑھنے کی وجہ اور سبب کیا ہے " ولا نص في الآية والخبر على احدهما " قرآن پاک اور حدیث پاک میں کسی احتمال پر کوئی نص موجود نہیں۔ ظاہر یہی ہے کہ سوال حکمت کے متعلق ہی تھا اسی احتمال کو ابوالسعود رحمہ اللہ نے بھی ترجیح دی ہے اور جواب " قل هي مواقيت للناس والحج " بھی اس پر دلالت کرتا ہے کیونکہ علامہ آلوسی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ رب تعالیٰ کا ارشاد ﴿قُلْ هِيَ مَوَاقِيتُ لِلنَّاسِ وَالْحَجِّ﴾ اسی احتمال کے مطابق بظاہر نظر آتا ہے کہ حکمت بیان کی گئی ہے کہ چاند کی حالتوں کے بدلنے میں مقصد یہ ہے " وهي ان يكون معالم للناس يوقتون بها " کہ یہ لوگوں کے لئے وقت علامتیں ہیں کہ وہ اپنے دنیاوی امور کے لئے وقت مقرر کر سکیں اور اپنی کھیتی باڑی اور تجارت اور عبادات مقررہ کے اوقات کی علامتیں مقرر کر سکیں مثلاً روزوں کی تاریخوں اور افطار کی تاریخوں کا تعین کر سکیں اور خصوصاً حج کے وقت کی علامتیں ہیں اگر چاند ایک ہی حالت میں رہتا تو یہ فوائد حاصل نہ ہوتے۔

اگر دوسرا احتمال مراد ہو تو جواب پھر بھی حکمت کے بیان کا دیا گیا ہے اور اس پر متنبہ کیا گیا ہے کہ سوال حکمت کے متعلق ہونا چاہئے نہ کہ اسباب کے متعلق کیونکہ چاند کی تبدیلی کے اسباب کا تعلق ان کی زندگی سے متعلق نہیں نہ ہی دنیاوی زندگی اور نہ ہی اخروی زندگی سے اس کا تعلق ہے۔ اور نبی کریم ﷺ کو بھی اس لئے مبعوث کیا گیا ہے کہ آپ لوگوں کے سامنے وہ مسائل ذکر فرمائیں جو ان کے لئے دنیا اور آخرت میں نفع مند ہوں آپ کو علم ہیئت کے مسائل بیان کرنے کے لئے مبعوث نہیں کیا گیا۔ چاند کی حالتوں کی تبدیلی کی حکمت بیان کرنے کی یہی وجہ ہے:

" لا لان الصحابة رضي الله عنهم ليسوا ممن يطلع على دقائق علم

الهیئة الموقوفة علی الارصاد والادلة الفلسفیة کما وهم"

اس کا یہ مطلب نہیں کہ اس لئے علم ہیئت کا مسئلہ نہیں بیان کیا گیا کہ فلسفہ والوں کے دلائل پر جو علم ہیئت موقوف ہے صحابہ کرام اسے سمجھ نہیں سکتے تھے یہ گمان جن لوگوں نے کیا ان کا گمان باطل ہے کیونکہ صحابہ کرام:

" اولئک المشاؤون فی رکاب النبوة والمرتاضون فی رواق الفتوة والفائزون باشراق الانوار والمطلعون بارصاد قلوبهم علی دقائق الاسرار "

تو وہ ہستیاں جن کو نبی کریم ﷺ کے ہمرکاب ہو کر چلنے کے مواقع میسر ہوئے صحابہ کرام تو وہ ہیں جن کو مصطفیٰ کریم ﷺ کے کرم کے باغ سے پھول اور کلیاں حاصل کرنے کا مقام ملا وہ تو حضور ﷺ کی نورانیت سے منور ہو کر کامل طور پر کامیاب ہوئے وہ تو اسرار کے باریک نکات پر مطلع ہوئے جس کی وجہ سے ہر مشکل مسئلہ ان کے دلوں میں جاگزیں ہوگا۔

اس شان کے لائق حضرات کے متعلق یہ تو تصور بھی نہیں کیا جاسکتا کہ وہ علم ہیئت کے مسائل کو سمجھنے کی اہلیت نہیں رکھتے تھے۔ البتہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ ان کو چاند کی حالتوں کے بدلنے کے متعلق غرض وغایت کو بتادیا گیا کہ اسی پر لوگوں کے اوقات مقرر کرنے کی دارومدار ہے اور علم ہیئت کا مسئلہ نہ بیان کر کے اس طرف اشارہ کیا گیا:

" ان سبب الاختلاف ما بین فی علم الهیئة من بعد القمر عن الشمس وقربه الیها وهو باطل عند اهل الشریعة فانه مبنی علی امور لم یثبت جزما شئی منها "

کہ علم ہیئت میں چاند کے زیادہ روشن ہونے یا کم روشن ہونے کا دارومدار جو سورج کے قریب ہونے اور دور ہونے پر رکھی گئی ہے اس کا اعتبار شریعت میں نہیں کیونکہ وہ جن امور اور دلائل پر موقوف ہے وہ کوئی یقینی نہیں بلکہ محض خیالی ہیں۔ اور یہ بھی خیال رہے کہ فلاسفہ کا خود بہت مسائل میں اختلاف ہے کسی نے کہا سورج اور زمین مرکز ہیں اور ستارے ان کے اردگرد گھومتے ہیں کسی نے کہا زمین چلتی ہے کسی نے کہا آسمان چلتا ہے کسی نے کہا تمام سیارے چلتے ہیں یعنی سورج بھی چلتا ہے۔ اس شدید

اختلاف کو مدنظر رکھتے ہوئے یہی کہا جا سکتا ہے کہ جس علم کی تھیوریاں، قوانین بدلتے رہیں وہ علم معتبر نہیں۔ معتبر قرآن وحدیث کے علوم ہیں جن کے قوانین " الیوم اکملت لکم دینکم " کے نزول کے بعد بدلنے کا تصور ختم ہو گیا تاقیامت وہی قوانین رہیں گے۔

ہاں البتہ فلاسفہ کے وہ قوانین اور مسائل جو شریعت سے نہ ٹکرائیں ان سے فوائد حاصل کئے جا سکتے ہیں۔ (ماخوذ از روح المعانی)

اَلْمَوَاقِیْتُ : جمع ہے "میقات" کی جو آلہ کا صیغہ ہے معنی یہ ہوا " ما یعرف به الوقت " جس کے ذریعے وقت کو پہچانا جائے " وھی ان یکون معالم للناس یوقتون بھا امورھم " یہ لوگوں کے لئے علامتیں ہیں جن کے ذریعے وہ اپنے امور کے وقت مقرر کرتے ہیں۔ (از روح المعانی)

روح المعانی کی اس وضاحت کے بعد اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ کے ترجمہ کو دیکھا جائے تو کیا خوب نظر آئے گا "وہ وقت کی علامتیں ہیں" راقم نے بھی اسی خوب ترجمہ کو نقل کیا ہے۔

وقت ومدت وزمان میں فرق: علامہ راغب اصفہانی کے کلام سے ان میں یہ فرق نظر آتا ہے۔

مدت : مطلقاً حرکت فلک کے امتداد کا نام ہے جو مبدأ سے منتہاء تک ہے یعنی آسمان (یا زمین کی حرکت جو ابتدا سے انتہاء تک ہوتی ہے اسی سے ظاہر ہونے والے وقت کو مدت کہا جاتا ہے۔

زمان: اس وقت اور مدت کو کہا جائے گا جس کی تقسیم سالوں اور مہینوں اور دنوں اور ساعات کی طرف کی جائی۔

وقت : معین اور مقدر زمانہ کو کہا جاتا ہے یہ کام اتنے وقت میں کر دوں گا یعنی آٹھ دنوں میں مثلاً (از روح المعانی)

وَالْحَجِّ : کا عطف " لِلنَّاسِ " پر ہے اب معنی یہ ہوا کہ وہ وقت کی علامتیں ہیں لوگوں کے لئے اور حج کے لئے" اگرچہ " لِلنَّاسِ " میں لوگوں کی تمام عبادات کے اوقات کا ذکر ہو چکا ہے لیکن " وَالْحَجِّ " کو علیحدہ ذکر کرنے کا مقصد یہ ہے۔

" ان الحج مقصور علی الاشھر التی عینھا اللہ تعالیٰ لفرضه وانه لا یجوز نقل الحج من تلک الاشھر الی اشھر کما کانت العرب تفعل ذلک فی النسئی "

کہ حج ان مہینوں میں ہوگا جو اللہ تعالیٰ نے حج کے لئے معین کیے ہیں یہ جائز نہیں کہ اپنی مرضی سے حج کے مہینے کو اپنی جگہ سے ہٹا کر ہمیشہ حج موسم بہار میں کیا جائے عرب حج کے مہینے کو اپنی جگہ سے ہٹا دیتے تھے۔ مکمل تفصیل ﴿ اِنَّمَا النَّسِیْٓءُ زِیَادَۃٌ فِی الْکُفْرِ﴾ میں انشاء اللہ آئے گی۔

گزشتہ سے پیوستہ:

صحابہ کرام کے علم ہیئت کے حصول پر شاندار دلیل کی طرف توجہ فرمائیں:

" واخرج الطستی عن ابن عباس ان نافع بن الازرق قالہ لہ اخبرنی عن قولہ مواقیت للناس قال عدۃ نسائھم ومحل دینھم وشروط الناس قال وھل تعرف قال ذلک نعم اما سمعت قول الشاعر وھو یقول:

والشمس تجری علی وقت مسخرۃ　　اذا قضت سفرا استقبلت سفرا

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے نافع بن ازرق نے پوچھا کہ ﴿ قُلْ ھِیَ مَوَاقِیْتُ لِلنَّاسِ﴾ کا کیا مطلب ہے؟ تو آپ نے فرمایا کہ چاند کی حالتوں کے بدلنے کا یہ مطلب ہے کہ وہ اپنی عورتوں کی عدت کے دن پہچان لیں اور اپنے قرض وغیرہ کی ادائیگی کی تاریخوں کا تعین کرلیں اور لوگوں سے جو عہد و پیمان وغیرہ باندھ رکھے ہوں ان کی تاریخوں کا تعین کرلیں۔ نافع بن ازرق نے پوچھا کیا چاند کی حالتوں کی تبدیلی کی باریکیوں کو عرب حضرات جانتے ہیں۔ آپ نے فرمایا ہاں تم نے ایک شاعر کے شعر کو نہیں دیکھا جس نے یہ کہا ہے۔ سورج حکم کا پابند ہو کر ایک وقت پر چلتا ہے جب اس کا ایک سفر ختم ہوتا ہے تو دوسرا سفر اس کا شروع ہوتا ہے۔

☆ " واخرج الحاکم وصححہ والبیھقی فی سننہ عن ابن عمر قال قال رسول اللہ ﷺ جعل اللہ الاھلۃ مواقیت للناس فصوموا لرؤیتہ وافطروا لرؤیتہ فان غم علیکم فعدوا ثلاثین یوما "

حاکم نے حدیث بیان کی جسے صحیح کہا اور بیہقی نے اپنی سنن میں حدیث ذکر کی کہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ تعالیٰ نے چاند کو مختلف حالتوں میں تبدیل کر کے لوگوں کے لئے وقت کی علامتیں بنایا اس لئے تم چاند دیکھ کر روزہ رکھو اور چاند دیکھ کر روزہ افطار کرو اگر

بادل چھا جائیں تو تیس دن مکمل کرو۔

☆ " واخرج احمد والطبراني وابن عدى والدار قطني بسند ضعيف عن طلق بن علي قال قال رسول الله ﷺ جعل الله الاهلة مواقيت للناس فاذا رأيتم الهلال فصوموا واذا رأيتموه فافطروا فان غم عليكم فاكملوا العدة ثلاثين "

طلق بن علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ تعالیٰ نے چاند کی حالتوں میں تبدیلی کر کے لوگوں کے لئے وقت کی علامتیں بنایا ہے جب تم چاند دیکھو تو روزہ رکھو اور جب تم چاند دیکھو تو افطار کرو اگر چاند بادل میں آ جائے تو تیس دن مکمل کرو۔ (درمنثور)

رؤیت ہلال سے متعلق چند مسائل:

رؤیت ہلال کمیٹی کا اعلان چاند کے ثبوت کے لئے معتبر ہے کیونکہ ایک مرکزی رؤیت ہلال کمیٹی ہے اور چند ذیلی کمیٹیاں ہیں جن میں علماء کرام کو نمائندگی حاصل ہے وہ شرعی طور پر شہادتوں پر وثوق کر کے اعلان کرتے ہیں اس لئے ان کا اعلان معتبر ہوتا ہے، کیونکہ البحر الرائق وغیرہ میں ہے کہ اگر چاند دیکھ کر حاکم نقارہ بجوا دے، ڈھنڈورا پیٹ دے توپوں کا فائر کر دے، آگ جلا دے جس سے لوگوں کو معلوم ہو جائے کہ یہ چاند کا اعلان کیا جا رہا ہے تو اس سے روزہ رکھنا اور عید کرنا جائز ہے۔ تو یقیناً ریڈیو کی خبر سے بھی چاند کا ثبوت یقینی طور پر صحیح ہوگا۔ اگر کوئی شخص اس مسئلہ میں تفصیل طلب کرنا چاہے تو فتاوی نوریہ کی جلد ۲ کا مطالعہ کرے۔

مسئلہ: اگر ایک شخص جدہ سے عید کا چاند دیکھ کر آئے لیکن پاکستان میں چاند نظر نہیں آیا عید نہیں بلکہ روزہ ہے تو وہ شخص بھی روزہ رکھے گا اگرچہ اس کے روزے تیس مکمل ہی کیوں نہ ہو چکے ہوں اس لئے فقہاء کرام نے بیان کیا ہے:

" ان المنفرد برؤية هلال رمضان اذا صام واكمل ثلاثين يوما لم يفطر الامع الامام " (تبيين الحقائق، البحر الرائق)

اگر کسی شخص نے رمضان کا چاند اکیلے دیکھا لیکن اس کے قول پر اعتبار نہ کرتے ہوئے حاکم نے رمضان کا روزہ رکھنے کا حکم دیا تو وہ خود اکیلا ہی روزہ رکھے۔ اب اس شخص کے تیس روزے مکمل ہو گئے

اور باقی لوگوں کے انتیس روزے ہوئے ہیں لیکن چاند بادلوں کی وجہ سے نظر نہیں آیا تو باقی لوگ تیس روزے مکمل کریں گے۔ تو یہ شخص جس کے تیس روزے مکمل ہو چکے تھے افطار (عید) نہیں کر سکتا بلکہ حاکم اور دوسرے لوگوں کے ساتھ ہی افطار کرے گا لہذا اسے اکتیسواں روزہ بھی رکھنا پڑے گا۔

رہا مسئلہ اختلافِ مطالع کا تو اس کا عدم اعتبار ظاہر الروایۃ سے ثابت ہے اگر سعودیہ سے چند لوگ اکٹھے پاکستان آئیں اور وہ شہادت دیں کہ ہم عید کا چاند دیکھ کر آئے ہیں تو پھر بھی ان کی شہادت سے پاکستان میں عید نہیں کی جا سکتی بلکہ پاکستان میں چاند دیکھنا اور چاند کی شہادتوں کا موصول ہونا ہی معتبر ہوگا۔ (ماخوذ از فتاوی نوریہ ج ۲ ص ۱۴۴)

چاند کے نام حالتوں کے لحاظ پر: چاند کی پہلی دو راتوں میں اور آخری دو راتوں میں چاند کو ہلال کہا جاتا ہے اور چودھویں رات کو جب چاند مکمل ہو جاتا ہے تو اسے بدر کہا جاتا ہے اور باقی راتوں میں قمر، بلکہ قمر کا اطلاق عام ہے شروع سے آخر تک خواہ ہلال ہو یا بدر ہو یا ان کے سوا ہو ہر حال میں قمر کہا جا سکتا ہے۔

سال، مہینہ، دن اور ساعت کی بحث:

سال: سورج کی حرکت جب فلک کے نقطہ معین سے شروع ہو تو یہ سال کی ابتداء ہے یہ بھی خیال رہے کہ سورج کی حرکت فلک کی حرکت کے مخالف ہوگی۔ جب سورج کی حرکت اسی نقطہ معین پر ختم ہو جائے تو سال کی انتہا ہے۔

سال میں چار موسم: سورج کے دوران کے لحاظ پر سال میں چار موسم ہوتے ہیں۔

سورج جب برج حمل میں ہو تو وہاں سے جب شمالی جانب ہوتا ہے تو ہوا میں گرمی آجاتی ہے پھر یہ گرمی آہستہ آہستہ بڑھتی رہتی ہے کیونکہ سورج برج سرطان کی طرف بڑھ رہا ہوتا ہے جب تک سرطان اور اسد میں رہتا ہے۔ اس وقت تک بہت شدید گرمی ہوتی ہے اور یہ گرمی لگاتار باقی رہتی ہے۔

پھر سورج واپس میزان میں پہنچتا ہے تو اب ہوا معتدل ہو جاتی ہے اس میں معمولی خنکی آجاتی ہے وہ شدت حرارت ختم ہو جاتی ہے۔ پھر حرارت میں آہستہ آہستہ کمی آنی شروع ہو جاتی ہے اور

برودت (ٹھنڈک) میں اضافہ ہوتا چلا جاتا ہے یہاں تک کہ سورج جدی میں پہنچ جاتا ہے جب تک یہاں رہتا ہے اس وقت تک سخت سردی رہتی ہے۔ پھر وہاں سے سورج شمالی جانب چڑھنا شروع کرتا ہے تو آہستہ آہستہ ہوا میں اعتدال آنا شروع ہوتا ہے سردی میں کمی واقع ہوتی ہے اب سورج پھر حمل میں پہنچ جاتا ہے اس وقت ہوا مکمل طور پر معتدل ہوتی ہے۔

واضح ہوا کہ سورج سال کی ابتدا میں جہاں سے شروع ہوا تھا سال کی انتہا میں وہاں ہی پہنچا اس دوران سے چار موسم ربیع (موسم بہار) صیف (موسم گرما) خریف (موسم خزان) شتاء (موسم سرما) معرض وجود میں آتے ہیں۔

مہینہ : چاند کی خاص فلک سے حرکت شروع ہونے سے مہینہ کی ابتداء ہوتی ہے پھر اسی نقطہ پر پہنچنے پر مہینہ کی انتہاء ہوتی ہے۔ چاند کی روشنی کے کم ہونے اور زیادہ ہونے کی وجہ یہ ہے کہ یہ ضابطہ بیان کیا گیا ہے " **نور القمر مستفاد من نور الشمس** " سورج کی ضیاء (روشنی) سے چاند روشنی حاصل کرتا ہے۔

چاند سورج کے سامنے جب ہوتا ہے تو چاند مکمل روشن ہوتا ہے اور جب چاند کا کچھ حصہ سورج کے سامنے ہوتا ہے تو اتنی مقدار میں روشن ہوتا ہے اور باقی دھاگہ کی شکل میں گول دائرہ ہوتا ہے۔ اسی طرح آہستہ آہستہ چاند کی روشنی بڑھتی جاتی ہے پھر چاند کا سورج سے سامنا جب کم ہوتا ہے تو کمی آنی شروع ہو جاتی ہے اور آہستہ آہستہ کم ہوتے ہوتے پہلی حالت میں آ جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب سورج اور چاند کے درمیان زمین حائل ہو جاتی ہے تو چاند کو گرہن لگ جاتا ہے۔

بعض اہل علم کا قول: سورج بھی جسم ہے اور چاند بھی جسم ہے تمام اجسام جسمیت میں برابر ہیں جو اشیاء ماہیت میں برابر ہوں ان کے لئے یہ کہنا ممکن نہیں کہ اس چیز کو فلاں چیز لازم ہے اور اس کو کوئی اور چیز لازم ہے بلکہ تمام کے لوازمات ایک جیسے ہوں گے۔ اس لئے یہ کہنا درست نہیں کہ چاند سورج سے روشنی حاصل کرتا ہے بلکہ یہ کہا جائے۔

" ان حصول النور فی جرم الشمس انما کان بسبب ایجاد القادر المختار وکذا الذی فی جرم القمر "

کہ سورج کی روشنی اللہ تعالیٰ کی ایجاد سے حاصل ہے جو قادر مختار ہے اور چاند کی روشنی بھی اسی قادر مختار سے حاصل ہے۔ (ماخوذ از کبیر)

محشی کا محاکمہ : اگر کوئی شخص اللہ تعالیٰ کی قدرت کا انکار کرے اور صرف یہ عقیدہ رکھے کہ چاند ذاتی طور پر سورج سے فائدہ حاصل کرتا ہے اللہ تعالیٰ کی قدرت کو کوئی دخل نہیں تو یہ ناجائز ہے بلکہ کفر ہے۔ اور اگر کسی کا یہ عقیدہ ہو کہ اصل ہر چیز کا خالق اللہ تعالیٰ ہے وہی سورج اور چاند کو روشنی عطا کرنے والا ہے البتہ اس نے خود ہی یہ سبب پیدا فرما دیا ہے کہ سورج سے چاند کو روشنی حاصل ہو تو یہ کہنا جائز ہے۔

نظام شمسی اور قمری:

سب سے بڑی بات تو یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ فاعل مختار ہے جو چاہے وہ کرتا ہے اس سے یہ نہیں پوچھا جا سکتا کہ یہ تو نے کیوں کیا ہے اور یہ کیوں نہیں کیا ہے لہذا سورج کی روشنی کی و بیشی نہ رکھ کر اور گھٹنا و بڑھنا نہ رکھ کر اور چاند کی روشنی کو کم اور زیادہ رکھ کر اور اس کے گھٹنے اور بڑھنے کی حالت پیدا کر کے اپنی قدرت کاملہ کا ذکر فرما دیا کہ میرے کام کسی غرض کے محتاج نہیں۔

تاہم حضرت قبلہ مفتی احمد یار خان رحمہ اللہ نے نظامِ شمسی اور قمری کو بہت خوب انداز میں پیش کیا جو قارئین کے پیش خدمت ہے:

(۱) قمری مہینے شمسی مہینوں سے افضل ہیں کہ رب نے تاریخیں معلوم کرنے ہی کیلئے چاند کو گھٹایا یا بڑھایا۔

(۲) نیز شمسی مہینوں کی جنتری زمین پر ہے اور قمری مہینوں کی جنتی آسمانوں پر ہے۔

(۳) اور وجہ فرق یہ ہے کہ شمسی مہینوں کی جنتری بندوں نے بنائی ہے اور قمری مہینوں کی جنتری فقط رب تعالیٰ کے قبضہ قدرت میں ہے۔

(۴) اور ذرا غور کیا جائے تو واضح ہوتا ہے کہ شمسی تاریخوں پر سورج کو دیکھ کر کوئی دلیل حاصل نہیں کی جا سکتی لیکن قمری تاریخوں پہ جاہل انسان بھی چاند کو دیکھ کر کافی حد تک سمجھ جاتا ہے کہ آج کیا تاریخ ہونی چاہیے۔

(۵) اور وجہ فرق یہ ہے کہ شمسی مہینوں میں موسم کے تبدیل ہونے کو دخل ہے لیکن قمری مہینوں میں

موسم کی تبدیلی کو کوئی دخل نہیں۔

(۶) اور شمسی مہینوں میں چار سال کے بعد فرق کرنا پڑتا ہے یعنی فروری کا مہینہ 28 دنوں کے بجائے 29 دنوں کا کرنا پڑتا ہے کیونکہ ہر سال سورج کا دور مکمل ہونے سے اتنا پیچھے رہ جاتا ہے کہ جتنا دن کا چوتھائی حصہ ہوتا ہے لہذا چار سال کے بعد مکمل دن کے برابر پیچھے رہ جاتا ہے تو ایک دن کا اضافہ کرنا پڑتا ہے۔

(۷) اور ہندی مہینوں میں بھی یہی صورت حال رہتی ہے کہ کچھ سالوں کے بعد سال 12 مہینوں کے بجائے 13 مہینوں کا کرنا پڑتا لیکن اب اس کمی کو پورا کرنے کے لئے کئی مہینے اکتیس دنوں کے اور کئی بتیس دنوں کے بنانے پڑتے ہیں۔ لیکن قمری مہینے اس کے محتاج نہیں کہ ان میں پنکچر لگایا جائے وہ اس خرابی سے بچ کر صاف وشفاف ہیں۔

(۸) اسلامی کام قمری مہینہ سے ہوں گے لہذا روزے، زکواۃ، حج، عدت وغیرہ سب میں قمری مہینے معتبر ہوں گے نہ کہ شمسی، یہی وجہ ہے کہ تمام اسلامی تہوار قمری مہینہ کے تاریخوں کے مطابق ہوتے ہیں۔

(۹) چاند میں جمال ہے اور سورج میں جلال ہے نبی کریم ﷺ کو بھی جمال حاصل ہے اور آپ کی رحمت اور رب تعالیٰ کی رحمت سے امت کو بھی جمال حاصل ہے لہذا ان کو تاریخیں بھی جمالی حاصل ہیں یعنی قمری تاریخوں کے مطابق ان کا حساب رکھا گیا ہے۔

(۱۰) سورج میں کمی وبیشی نہیں اس لئے شمسی تاریخوں سے حساب لگانے والوں کو اس سے مقام عبرت حاصل نہیں ہوتی۔ لیکن چاند کی کمی اور زیادتی سے عقل مند انسان اپنے کمال وزوال کا اندازہ لگا لیتے ہیں۔ چاند شروع میں باریک ہوتا ہے پھر آہستہ آہستہ بڑھتا ہے پھر چودھویں رات کو اپنی کامل تابانی پر ہوتا ہے۔ اور مکمل دائرہ کی شکل اختیار کر لیتا ہے پھر آہستہ آہستہ اس میں کمی آنی شروع ہو جاتی ہے آخر میں ایک دن آنکھوں سے اوجھل ہو کر گویا کہ درجہ معدومیت میں پہنچ جاتا ہے۔

یہی حال انسان کا ہے معدومیت سے وجود میں آتا ہے چھوٹا بچہ ہوتا ہے پھر آہستہ آہستہ جوان ہو جاتا ہے کامل عروج پر پہنچ کر آہستہ آہستہ زوال کی طرف آتا ہے یعنی بڑھاپا حاصل ہوتا ہے پھر وفات طاری ہو جاتی ہے۔

لہٰذا انسان اپنی زندگی کو غنیمت سمجھے زوال اور فنا سے پہلے جو ہو سکے نیکی کے عمل کر لے اور یہ ہر وقت خیال کرتا رہے کہ کمال کے بعد زوال ہے یہی وجہ ہے کہ صحابہ کرام نے جب آیۃ کریمہ ﴿ اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ ﴾ کو سنا تو سمجھ لیا کہ حضور ﷺ کے وصال کا وقت قریب آ چکا ہے کیونکہ کمال حاصل ہو چکا ہے اب زوال کی باری ہے۔

(۱۱) ستارہ پرستوں کو تنبیہ کی گئی ہے کہ ذرا غور کرو سورج ہو یا چاند یا دوسرے ستارے تمام کے تمام اللہ تعالیٰ کے حکم کے پابند ہیں ایک محور پر گھوم رہے ہیں ایک نقطہ سے چل کر پھر اسی نقطہ پر پہنچ جاتے ہیں یہ خود جب قدرت باری تعالیٰ کے محتاج ہیں اسکے چلانے سے چل رہے ہیں تو یقیناً یہ معبود نہیں بن سکتے۔
(از نعیمی بتصرف)

دن رات : معدل النہار یا نصف النہار کے دائرہ افق سے سورج کا جدا ہونا پھر اسی نقطہ کی طرف لوٹ آنا اسے دن رات سے تعبیر کیا جائے گا۔ فلاسفہ کا ایک قول یہ ہے کہ سورج کا زمین سے اوپر ہونا دن کہلاتا ہے اور زمین کے نیچے ہونا رات کہلاتا ہے کیونکہ آسمان زمین کے اوپر بھی ہیں اور نیچے بھی زمین درمیان میں معلق ہے۔

تنبیہ : فلاسفہ کے نزدیک دن طلوع آفتاب سے شروع ہوتا ہے اور غروب آفتاب پر ختم ہوتا ہے لیکن شریعت میں دن صبح صادق سے شروع ہوتا ہے اور غروب آفتاب پر ختم ہوتا ہے۔

ساعت : کی دو قسمیں ہیں مستویہ اور معوجہ۔ مستویہ ساعت چوبیس ساعتوں میں سے ایک ہے جو دن رات میں پائی جاتی ہیں یعنی دن اور رات کے مجموعی چوبیس گھنٹوں کو ساعات مستویہ کہا جاتا ہے۔ اور دن کی بارہ ساعتوں میں سے ایک یا رات کی بارہ ساعتوں میں ایک کو ساعت معوجہ کہا جاتا ہے۔ اس طرح دن کے بارہ گھنٹوں کو یا رات کے بارہ گھنٹوں کو ساعات معوجہ کہا جاتا ہے۔

خیال رہے کہ دن اور رات کے بارہ بارہ گھنٹے یا تو اسوقت مراد ہو سکتے ہیں جب دن اور رات برابر ہوں۔ لیکن زیادہ گمان یہ ہے کہ جس طرح گھڑیوں میں رات کے بارہ بجے کے بعد ایک دو کا حساب ہوتا ہے اس وقت گویا کہ دن کا آغاز سمجھا جاتا ہے اور دن کے بارہ بجے کے بعد تیرہ چودہ کا حساب ہوتا ہے اسے رات کا آغاز سمجھا جاتا ہے۔ اس حساب سے ہر دن بارہ گھنٹے کا اور ہر رات بارہ گھنٹے کی شمار ہوگی۔ (ماخوذ از کبیر)

وَلَيْسَ الْبِرُّ بِأَنْ تَأْتُوا الْبُيُوْتَ مِنْ ظُهُوْرِهَا وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنِ اتَّقٰى وَأْتُوا الْبُيُوْتَ مِنْ اَبْوَابِهَا وَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ

''اور یہ نہیں ہے نیکی کہ تم آؤ گھروں کو ان کی پچھلی جانب سے، اور لیکن نیکی تو اسے حاصل ہے جس شخص نے تقویٰ اختیار کیا۔ اور گھروں میں آؤ ان کے دروازں سے اور ڈرو اللہ سے تا کہ تم کامیاب ہو جاؤ''۔

شان نزول:

آیۃ کریمہ کے اس حصہ کے شان نزول میں تین وجہ بیان کی گئی ہیں جو مجموعی طور پر مل کر شان نزول ہیں یعنی تین واقعات کے بعد یہ آیۃ کریمہ نازل ہوئی۔

(۱) حضرت حسن اور اصم رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ زمانہ جاہلیت میں اگر کوئی شخص کسی کام کا ارادہ کرتا تو وہ کام اس کا اگر نہ ہوتا تو وہ اپنے گھر دروازے کی جانب سے داخل نہ ہوتا بلکہ پچھلی جانب سے داخل ہوتا اور ایک سال تک اسی پر عمل کرتا، اس طریقہ کو وہ لوگ نیک تفاؤلی یعنی نیک شگونی سمجھتے تھے کہ اس سے کام ہو جائے گا۔ تو رب تعالیٰ نے اس آیۃ کریمہ کو نازل فرما کر ان کو اس سے منع کیا کہ گھروں کے دروازوں سے نیک شگونی کے ارادہ سے داخل نہ ہونے کو تم نیکی کا کام سمجھ رہے ہو حالانکہ یہ نیکی کا کام نہیں۔ نیکی تو اس شخص کو حاصل ہوگی جو اللہ تعالیٰ سے ڈرے گا اور کسی کا ڈر اور خوف اسے حاصل نہیں ہوگا بلکہ اللہ تعالیٰ پر توکل رکھے گا اسی وحدہ لاشریک سے ڈر رکھے اسی وجہ سے رب تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ وَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ﴾، ای لتفوزوا بالخیر فی الدین والدنیا ''

اور اللہ سے ڈرو تا کہ تم دین اور دنیا میں کامیاب ہو جاؤ۔ اور رب تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

﴿ وَمَنْ يَّتَّقِ اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّهٗ مَخْرَجًا ☆ وَيَرْزُقْهُ مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ ﴾

(الطلاق آیۃ ۳،۲)

''اور جو اللہ سے ڈرے اور اللہ اسکے لئے نجات کی راہ نکال دے گا اور اسے وہاں سے روزی

دے گا جہاں اس کا گمان نہ ہو' اور رب تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ وَمَنْ يَّتَّقِ اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّهٗ مِنْ اَمْرِهٖ يُسْرًا ﴾

''اور جو اللہ سے ڈرے اللہ اس کے کام میں آسانی فرمادے گا''

اسی سے واضح ہوا '' **من رجع خائبا فھو ما افلح وما انجح** '' جو شخص اللہ سے نہیں ڈرے گا وہ رسوا ہوگا اور اسے کامیابی حاصل نہیں ہوگی۔ آیہ کریمہ کے اس مذکور شان نزول سے یہ بھی واضح ہوگیا کہ فال نکالنا منع ہے اسی لئے نبی کریم ﷺ نے فرمایا'' **لا عدوی ولا طیرۃ** '' کوئی بیماری متعدی آگے تجاوز کرنے والی نہیں اور نہ ہی کوئی فال کارگر ہے۔

صحابہ کرام نے عرض کیا یارسول اللہ ایک اونٹ خارش کی مرض میں مبتلا ہو تو دوسرے بھی خارش میں مبتلا ہوجاتے ہیں تو اس سے پتہ چلتا ہے کہ بیماری آگے تجاوز کرتی ہے تو آپ نے فرمایا کہ سب سے پہلے کو کیسے خارش لاحق ہوئی؟ مطلب یہ تھا کہ عقیدہ یہ رکھا جائے کہ اللہ تعالیٰ جسے چاہے محفوظ رکھے اور جسے چاہے بیماری میں مبتلا کرے ذاتی طور پر کوئی بیماری متعدی (تجاوز کرنے والی) نہیں۔

اسی طرح کسی چیز کو نیک شگونی سمجھنا یا کسی چیز کو بدگمانی سمجھنا بھی غلط ہے اسی لئے نبی کریم ﷺ نے فرمایا'' **من ردہ عن سفرہ تطیر فقد اشرک** '' جس شخص کو فال نے سفر سے روکا وہ مشرک ہوگیا۔ یعنی یہ سمجھا کہ فلاں وجہ سے میرا کام نہیں ہوگا لہذا مجھے سفر نہیں کرنا چاہئے جب فال کے ذریعے سفر سے رک گیا تو گویا کہ رب تعالیٰ پر کامل ایمان نہ رہا اور کامل توکل اس پر نہ رہا گویا کہ شرک خفی پایا گیا یہاں شرک کا معنیٰ حقیقی نہیں۔

'' **ویحب الفال الحسن** '' اچھی فال محبوب ہے جیسا کہ کسی کام کے لئے چلے تو کوئی نیک آدمی مل جائے یا اچھے نام والا کوئی شخص مل جائے جیسے سعد، طاہر، صالح، محمد حسین، عبداللہ وغیرہ نام کا کوئی شخص مل گیا تو یہ خیال کیا کہ میرے کام میں برکت ہوگی تو یہ جائز بلکہ مستحسن ہے۔

(۲) شان نزول کی دوسری وجہ جو زیادہ مشہور ہے وہ یہ ہے کہ جب کوئی شخص حج یا عمرہ احرام کا باندھ لیتا تو پھر اگر اسے کوئی کام پڑ جاتا تو وہ گھر دروازے سے داخل نہیں ہوتا تھا بلکہ گھر کی پچھلی دیوار کو نقب لگاتا (سوراخ کرتا) اس سے داخل ہوتا۔ اسی طرح خیموں میں رہنے والے بھی داخل ہونے کی سمت

سے داخل نہیں ہوتے تھے بلکہ خیمہ کی پچھلی جانب سے داخل ہوتے تو رب تعالیٰ نے اس آیۂ کریمہ کو نازل فرمایا کہ گھروں کے دروازوں سے داخل نہ ہونا نیکی کا کام نہیں نیکی کا کام تو تقوی حاصل کرنا ہے۔

(۳) ابن ابی حاتم اور حاکم نے حدیث بیان کی اور اس حدیث کو صحیح قرار دیا کہ حضرت جابر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں قریش کو حمس کہا جاتا تھا وہ احرام کی حالت میں گھروں کے دروازوں میں داخل ہوتے تھے (یعنی احرام کے بعد اگر گھر کسی کام کے لئے لوٹنا پڑتا تو گھروں میں دروازوں سے داخل ہوتے) اور انصار اور باقی عرب گھروں میں احرام کی حالت میں دروازوں سے داخل نہیں ہوتے تھے۔ ایک مرتبہ نبی کریم ﷺ ایک باغ سے احرام باندھ کر نکلے پھر اسی باغ کے دروازے سے احرام کی حالت میں داخل ہوئے تو آپ کو دیکھ کر قطبہ بن عامر انصاری بھی دروازے سے اسی باغ میں داخل ہو گئے تو بعض حضرات نے کہا قطبہ بن عامر انصاری فاسق و فاجر ہو گیا کیونکہ وہ دروازے سے داخل ہو گیا حالانکہ وہ انصاری ہے۔ نبی کریم ﷺ نے اس سے پوچھا " ما حملك علی ما صنعت " تمہیں اس فعل پر کس چیز نے برانگیختہ کیا (ابھارا) ہے۔ تو اس شخص نے کہا " رأیتک فعلتہ ففعلتہ کما فعلت " میں نے آپ کو جو کام کرتے ہوئے دیکھا ہے وہی میں نے بھی کیا ہے تو نبی کریم ﷺ نے فرمایا " انی رجل احمس " میں تو احمس شخص ہوں (تم انصاری ہو) تو وہ شخص عرض کرنے لگے "فان دینی دینک " بیشک میرا دین وہی ہے جو آپ کا دین ہے۔

اور ایک روایت میں ان کے جواب کے یہ الفاظ ذکر کیے گئے ہیں:

" انی رضیت بسنتک وھدیک ، وقد رأیتک دخلت فدخلت "

بیشک میں آپ کی سنت اور آپ کی ہدایت پر راضی ہوں جب میں نے آپ کو دروازے سے نکلتے ہوئے اور داخل ہوتے ہوئے دیکھا تو میں نے بھی وہی کام کیا۔ ان کے اس محبت بھرے جواب پر یہ آیۂ کریمہ نازل ہوئی۔ گویا کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے محبت بھرے کلمات کو پسند فرماتے ہوئے ارشاد فرمایا ہاں گھروں میں دروازوں سے داخل نہ ہونا نیکی نہیں بلکہ نیکی تو تقوی سے یعنی اتباع رسول اللہ ﷺ سے حاصل ہوتی ہے۔

حمس کا مطلب کیا ہے؟

یہ لفظ جمع ہے " فعل بضمتين " کا وزن ہے اس کا واحد احمس ہے یہ لفظ " حماسة " سے مشتق ہے جس کا معنی شدت ہے۔ حمس ان قبائل کو کہا جاتا تھا قریش، کنانہ، خزاعہ، ثقیف، خثیم، بنو عامر بن صعصعۃ، بنونصر بن معاویۃ، ان قبائل کو حمس اس لئے کہا جاتا تھا کہ یہ لوگ اپنے دین میں سختی سے کار بند رہتے تھے یہ لوگ احرام باندھ کر گھروں میں نہیں لوٹتے تھے اور جن خیموں سے احرام باندھ کر نکلتے ان کا پھر سایہ حاصل نہیں کرتے تھے اور گھی اور پنیر نہیں کھاتے تھے، ہاں البتہ اگر کوئی مجبوری ان کو درپیش آ جاتی تو گھروں میں ان کے دروازوں سے ہی داخل ہوتے تھے لیکن دوسرے تمام عرب حضرات اور خصوصاً انصار گھروں کی پچھلی دیوار کو نقب لگا کر داخل ہوتے تھے دروازوں سے داخل نہیں ہوتے تھے۔
(از کبیر و درمنثور)

سوال: جب اسی آیۃ کے پہلے حصہ میں ہے:

﴿ يَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الْاَهِلَّةِ قُلْ هِيَ مَوَاقِيْتُ لِلنَّاسِ وَالْحَجِّ ﴾

''کہ وہ آپ سے چاند کی حالتوں کے متعلق سوال کرتے ہیں آپ فرما دو وہ علامتیں ہیں وقت کی لوگوں کے لئے اور حج کے لئے''۔ تو اس شان نزول کی پہلی وجہ (فال والے واقعہ) کی کوئی مناسبت نہیں تو اسے شان نزول کی وجہ کیسے قرار دیا جائے؟

جواب: اللہ تعالیٰ نے ﴿ وَلَيْسَ الْبِرُّ بِاَنْ تَاْتُوا الْبُيُوْتَ مِنْ ظُهُوْرِهَا ﴾ کو ﴿ يَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الْاَهِلَّةِ ﴾ کے ساتھ ذکر فرمایا:

" انما اتفق وقوع القصتين في وقت واحد فنزلت الآية فيهما في وقت واحد "

تو اتفاق یہ ہوا کہ دونوں واقعے یعنی فال کے متعلق سوال اور احرام کے متعلق واقعہ ایک ساتھ در پیش آئے تو آیۃ کریمہ کا نزول ہوا۔ (از کبیر)

شان نزول کی مختلف وجوہ کو علامہ رازی رحمہ اللہ کے اسی قول کی روشنی میں دیکھا جائے اور یہی استاذی المکرم مولنا محمد اشرف سیالوی مدظلہ العالی بیان فرماتے تھے۔

دینی طلباء کرام کی توجہ کے لئے: ﴿ لَیْسَ الْبِرُّ ﴾ میں لفظ "البر" پر رفع (پیش) لازم ہے کیونکہ ﴿ بِاَنْ تَاْتُوا الْبُیُوْتَ ﴾ میں باء داخل ہے باء خبر پر داخل ہوتی ہے نہ کہ اسم لیس پر اس لئے "البر" کا اسم لیس ہونا معین ہو گیا۔ (صاوی)

اور توجہ: اللہ تعالیٰ نے دو جملے خبریئے ذکر فرمائے ہیں اور دو امر ذکر فرمائے ہیں لف ونشر مرتب کلام ہے یعنی پہلے امر کو پہلے جملہ خبریہ پر مرتب فرمایا ہے اور دوسرے امر کو دوسرے جملہ خبریہ پر مرتب فرمایا ہے:

﴿ لَیْسَ الْبِرُّ بِاَنْ تَاْتُوا الْبُیُوْتَ مِنْ ظُهُوْرِهَا ﴾

جملہ خبریہ ہے اس پر امر ﴿ وَاْتُوا الْبُیُوْتَ مِنْ اَبْوَابِهَا ﴾ کو مرتب فرمایا ہے اور ﴿ وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنِ اتَّقٰى ﴾ جملہ خبریہ ہے اور اس پر امر ﴿ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ﴾ کو مرتب فرمایا۔ (صاوی)

ذرا اور توجہ: ﴿ وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنِ اتَّقٰى ﴾ میں یا تو خبر محذوف ہے اصل عبارت ﴿ وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنِ اتَّقٰى ﴾ لیکن نیکی تو معتبر تقوی کرنے والے شخص کی نیکی ہے۔ یا حذف مضاف ہے (وَلٰكِنْ) ذا (اَلْبِرَّ) البار (مَنِ اتَّقٰى) لیکن نیکی کرنے والا نیک شخص تو وہ ہے جس نے تقوی اختیار کیا یعنی محارم اور باطل شہوات سے اپنے آپ کو بچا کر رکھا۔ (روح المعانی)

وَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ: ای لکی تفوزوا بالمطلوب من الهدی والبر" اور اللہ سے ڈرو تاکہ تم کامیاب ہو جاؤ۔ یعنی تم ہدایت حاصل کرنے اور نیکی حاصل کرنے کے مطلوب کو پا لینے میں کامیاب ہو جاؤ۔ (روح المعانی)

شریعت کے خلاف کوئی کام نیکی کا نہیں ہوسکتا:

"عن ابن عباس قال بینما رسول الله ﷺ یخطب اذا هو برجل قائم فی الشمس فسال عنه فقالوا هو ابو اسرائیل نذر ان یقوم ولا یقعد ولا یستظل ولا یتکلم ویصوم فقال النبی ﷺ مروه فلیتکلم ویستظل ولیقعد ولیتم صومه"

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ ایک مرتبہ خطبہ دے رہے تھے تو ایک شخص کو دھوپ پر کھڑے دیکھا آپ نے اس کے متعلق سوال کیا تو صحابہ کرام نے بتایا یہ ابو اسرائیل

ہے (یہ انصاری صحابی ہیں جن کی کنیت ابواسرائیل ہے ان کے نام میں اختلاف پایا جاتا ہے) جس نے نذر مانی ہوئی ہے کہ وہ کھڑا رہے گا اور بیٹھے گا نہیں اور سایہ حاصل نہیں کرے گا اور کلام نہیں کرے گا اور روزہ رکھے گا تو نبی کریم ﷺ نے فرمایا اسے حکم دو کہ وہ سایہ حاصل کرے اور بیٹھ جائے اور اپنے روزہ کو مکمل کرے۔

کیا خوب قانون مقرر فرمایا:

" فابطل النبی ﷺ ماکان غیر قربة مما لا اصل له فی شریعته وصحه ما کان قربة مما له نظیر فی الفرائض والسنن "

نبی کریم ﷺ نے اس شخص کو کھڑے رہنے اور سایہ نہ حاصل کرنے اور کلام نہ کرنے کی نذر سے منع فرمایا کہ اس کی کوئی اصل شریعت میں نہیں لیکن آپ نے روزہ مکمل کرنے کی ہدایت فرمائی کیونکہ اس کی نظیر (مثال) فرضی روزوں اور مسنون روزں سے ملتی ہے۔ (قرطبی)

واضح ہوا کہ ہر وہ کام جو شریعت کے مخالف ہو وہ ناجائز ہوگا لیکن جو کام شریعت کے مطابق ہوگا وہ جائز ہوگا یہ دلیل ناقص ترین ہے کہ جو کام نبی کریم ﷺ نے نہیں کیا وہ جائز نہیں، یہ دلیل دینے والوں کا چلنا پھرنا، تصنیفی کام اور نئی وضع کی مساجد اور نئی طرز پہ مدارس کا قیام سب حرام ہو جائے گا۔

بیان کردہ آیات میں لطیف اشارات:

انسان میں تین قسم کی قوتیں پائی جاتی ہیں درندگی کی قوت، حیوانی قوت اور ملکی (فرشتوں والی) قوت۔ قصاص کا حکم نافذ کر کے اس طرف بھی اشارہ فرما دیا کہ جس طرح قتل کا بدلہ قتل ہے یہ عدل ہے اسی طرح جب تم کسی کے دل کو ستاؤ گے یا کسی کی روح کو تکلیف دو گے تو تم پر قصاص لازم آئے گا کہ تم یا تو اپنے قلب وروح کو اس پر پیش کرو کہ وہ اپنا بدلہ لے لے یا وہ تمہیں معاف کر دے یا تم اس کے قلب وروح کو خوش کر کے گویا کہ خون بہا دے کر اس سے اپنے آپ کو معاف کرالو۔

پھر رب تعالیٰ نے وصیت کرنے کا حکم فرمایا اس میں یہ بھی اشارہ پایا گیا ہے کہ تم اللہ والوں کو

صرف اللہ تعالیٰ کی طرف توجہ کرنے اور اللہ تعالیٰ کے ازلی اسرار کو یاد رکھنے کی وصیت کر کے اپنی قوت ملکی کو محفوظ رکھو اگر تم نے اس وصیت میں کمی کی تو تمہاری قوت ملکی میں بھی کمی ہو گی۔

پھر اللہ تعالیٰ نے روزے رکھنے کا حکم دیا اس میں یہ اشارہ بھی ملتا ہے کہ اے انسان تو اللہ تعالیٰ کی رضاء کے لئے جسطرح روزہ رکھتا ہے اسی طرح اپنے قول و فعل اور حرکت کو صرف اللہ تعالیٰ کی رضاء کے مطابق رکھ تا کہ تیری قوت حیوانی میں کمی آئے کیونکہ حیوانوں کا کام صرف کھانا پینا ہے تو روزہ رکھنے سے ان کی اس قوت حیوانی میں کسی حد تک کمی واقع ہو گی۔ اور حیوان اپنے قول و فعل اور حرکات میں مکلف نہیں تو انسان بھی اپنے آپ کو اس قوت حیوانی کی وجہ سے غیر مکلّف نہ سمجھے بلکہ اپنے اقوال وافعال اور اپنی حرکات کو رب تعالیٰ کی مرضی کے مطابق کر کے اپنے آپ کو مکلّف سمجھے اس طرح اس کی قوت حیوانی میں کمی واقع ہو گی۔

پھر اللہ تعالیٰ نے انسان کو تسلی دیتے ہوئے ﴿ يُرِيدُ اللّٰهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَلَا يُرِيدُ بِكُمُ الْعُسْرَ ﴾ اس طرف اشارہ فرمادیا کہ اللہ تعالیٰ تمہارے لئے آسانی کا ارادہ فرماتا ہے کہ تم اپنے آپ کو واصل الی اللہ (اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل کرنے) کے درجہ پر پہنچاؤ اور اپنے آپ کو رب تعالیٰ کی صفات سے متصف کرو تا کہ تمہیں رب تعالیٰ اپنی قدرت اور صفات کا مظہر بنادے۔

رب تعالیٰ تم پر مشکل کا ارادہ نہیں فرماتا کہ تم اپنے آپ کو رب تعالیٰ کے قریب نہ کرو، بلکہ وہ تو اپنے قریب کرنے کیلئے آسانی کی راہ پیدا فرماتا ہے انسان چونکہ متلون مزاج ہے یعنی اس کا مزاج بدلتا رہتا ہے کبھی اس پر صفات روحانیہ غالب ہوتی ہیں یعنی ملکی قوت جب غالب ہوتی ہے تو یہ انسانی خواہشات سے روزہ رکھتا ہے یعنی گناہوں کو قریب بھی نہیں آنے دیتا اور کبھی انسان پر صفات حیوانیہ غالب ہوتی ہیں یہ وہ وقت غفلت کا ہوتا ہے انسان اپنی خواہشات کی تکمیل کا خواہش مند ہوتا ہے۔ اگر جائز طریقہ سے اپنی خواہشات کی تکمیل کرے یعنی اپنی زوجہ کی جانب رجوع کرے تو اسکی طرف اشارہ ﴿ هُنَّ لِبَاسٌ لَّكُمْ وَاَنْتُمْ لِبَاسٌ لَّهُنَّ ﴾ ''وہ عورتیں تمہارا لباس ہیں اور تم ان کا لباس ہو'' سے کر دیا۔

اور اگر خواہشات کی تکمیل ناجائز طریقہ سے کی تو اسکی طرف اشارہ ﴿ عَلِمَ اللّٰهُ اَنَّكُمْ كُنْتُمْ

تَخْتَانُوْنَ اَنْفُسَكُمْ ﴾ ''اللہ کو معلوم ہے کہ بیشک تم اپنے نفسوں کو خیانت میں ڈالتے ہو'' سے اشارہ کر دیا۔

پھر اگر انسان اپنے گناہوں سے تائب ہو جائے اللہ تعالیٰ کے حضور رجوع کرے تو رب تعالیٰ تو بہ قبول کرتا ہے اور معاف فرماتا ہے اس مسئلہ کی طرف ﴿ فَتَابَ عَلَيْكُمْ وَعَفَا عَنْكُمْ ﴾ ''وہ تمہاری توبہ قبول کرتا اور معاف کرتا ہے'' سے اشارہ فرمادیا۔

چونکہ انسان اگر تمام وقت عبادات میں گزارے تو دنیاوی زندگی اور ذریعہ معاش معطل ہو کر رہ جاتا ہے اسلئے بندے کا عبادت کرنا بھی رب تعالیٰ کو محبوب ہے اور اپنے اہل وعیال کیلئے رزق حلال کے حصول کیلئے کسب کرنا بھی رب تعالیٰ کو پسند ہے بلکہ اسے بھی عبادت قرار دیا۔ اس کی طرف اشارہ:

﴿ كُلُوْا وَاشْرَبُوْا حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَكُمُ الْخَيْطُ الْاَبْيَضُ مِنَ الْخَيْطِ الْاَسْوَدِ مِنَ الْفَجْرِ ﴾

''کھاؤ اور پیو یہاں تک کہ فجر کا سفید دھاگہ ظاہر ہو جائے سیاہ دھاگہ سے) کر دیا'' کہ کسی وقت کھانے اور پینے کی ممانعت کر کے اشارہ کر دیا کہ اللہ تعالیٰ کی طرف مشغول ہونے کے وقت کا بھی لحاظ کرو اور کسی وقت کھانے اور پینے کی اجازت عطا فرما کر اس طرف اشارہ کر دیا کہ اپنے بعض اوقات دنیاوی مشاغل میں بھی گزار لو۔ نبی کریم ﷺ کے ارشاد سے بھی یہی ثابت ہو رہا ہے آپ کا ارشاد گرامی ہے:

" لی مع الله وقت لا یسعنی فیه ملک مقرب ولا نبی مرسل ، ولی مع حفصة وزینب "

میرا اللہ تعالیٰ کے ساتھ ایک وقت ہوتا ہے جس میں کوئی مقرب فرشتہ اور کوئی نبی مرسل دم نہیں مار سکتا اور میرا کوئی وقت (اپنی ازواج) حفصہ اور زینب (وغیرھما) سے گزرتا ہے۔ (از روح المعانی)

﴿ يَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الْاَهِلَّةِ ...... الخ ﴾ اس آیۃ کریمہ سے اس طرف بھی اشارہ کر دیا کہ سیدھی راہ کامل وہ ہے کہ یقینی دلائل کو ظنی دلائل پر ترجیح دی جائے، اگر ظنی دلائل کو یقینی دلائل پر ترجیح دے گا تو معاملہ الٹ ہو جائے گا جو کام واجب ہوگا اس کو انسان واجب نہیں سمجھے گا اور جو واجب نہیں ہوگا اسے واجب سمجھے گا۔ اس کے بعد یہ سمجھنا ضروری ہے کہ رب تعالیٰ عالم، صانع، مختار اور حکیم ہے اور یہ بھی بہت واضح ہے کہ:

" ان الحکیم لا یفعل الا الصواب البرئی عن العبث والسفه "

حکیم ذات کا کوئی کام بھی غلط نہیں ہوتا بلکہ درست ہی ہوتا ہے اس کا ہر کام بے فائدہ ہونے سے خالی ہوتا ہے یعنی ہر کام حکمت کے مطابق ہوتا ہے۔ اس قانون سے ہی یہ پتہ چل گیا کہ اللہ تعالیٰ نے چاند کو مختلف حالتوں میں رکھ کر اپنی حکمت کاملہ کا اظہار فرمادیا۔ لہذا رب تعالیٰ کے ہر امر و نہی کو حکمت پر مبنی سمجھ کر اسے تسلیم کرنا گویا کہ گھروں کو دروازوں کی جانب سے آنا ہے اور اس کے حکم کے خلاف چلنا گویا کہ گھروں کے پچھلی جانب سے آنا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی مرضی کے مطابق چلنے کا نام ہی صراط مستقیم ہے اور اس کی مرضی کے خلاف چلنے کا نام باطل راہ ہے۔ (از کبیر)

ایک انوکھی تفسیر: آیۃ کریمہ وضاحت احادیث مبارکہ اور معتبر تفاسیر سے بیان کر دی گئی اور جو لطیف اشارات پائے گئے ہیں وہ بھی بیان کر دیئے گئے تاہم تمام تفاسیر سے ہٹ کر عقلی ڈھکوسلے کے مطابق تفسیر کو دیکھئے۔

" واما قوله ﴿لَيْسَ الْبِرُّ بِأَنْ تَأْتُوا الْبُيُوْتَ مِنْ ظُهُوْرِهَا وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنِ اتَّقٰى وَأْتُوا الْبُيُوْتَ مِنْ اَبْوَابِهَا﴾ قال نزلت فی امیر المؤمنین علیه السلام لقول رسول الله ﷺ انا مدینة العلم وعلی علیه السلام بابها ولا تدخلوا المدینة الا من بابها " (تفسیر قمی لاهل التشیع)

یہ آیۃ امیر المؤمنین علیہ السلام کے متعلق نازل ہوئی ہے کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا میں علم کا شہر ہوں اور علی علیہ السلام اس کا دروازہ ہیں اور شہر میں سوائے دروازہ کے داخل نہ ہو۔

راقم نے اس تفسیر کو انوکھا کیوں قرار دیا؟

اس لئے کہ اس آیۃ کریمہ کا شان نزول کسی حدیث کی کتاب میں نہیں کیونکہ احادیث سے شان نزول کی وہی تین وجوہ ثابت ہیں جن کو ذکر کر دیا گیا خصوصا درمنثور میں بھی نہ ذکر ہونا واضح کرتا ہے کہ اس انوکھی تفسیر کے مطابق شان نزول پر کوئی ضعیف حدیث بھی نہیں کیونکہ درمنثور میں صحیح اور حسن اور ضعیف تمام احادیث ہی تقریبا مذکور ہیں۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ رئیس المحققین عمدۃ الاذکیاء رازی دوراں استاذی المکرم حضرت علامہ مولنا محمد اشرف سیالوی مدظلہ العالی فرماتے ہیں نبی کریم ﷺ کے ارشاد کا مطلب یہ ہے کہ میں علم کا شہر ہوں

اور علی اس کا ایک دروازہ ہیں۔ یعنی تمام صحابہ کرام اس شہر کے دروازے ہیں ان میں سے ایک دروازہ حضرت علی رضی اللہ عنہ بھی ہیں ورنہ وہ شہر کیسا ہوگا جس کا ایک ہی دروازہ ہوگا۔ استاذی المکرّم کی اس وضاحت کو اور مرقاۃ شرح مشکوۃ کو دیکھیں تو مطابقت نظر آئے گی۔ حضرت علامہ ملا علی قاری رحمہ اللہ فرماتے ہیں ترمذی شریف میں تو حدیث یہ ہے:

" عن علی قال قال رسول اللہ ﷺ انا دار الحکمۃ وعلی بابھا "

" حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا میں حکمت کا دار ہوں اور علی اسکا دروازہ ہیں"۔

" وفی روایۃ انا مدینۃ العلم وعلی بابھا "

" ایک روایت میں ہے میں علم کا شہر ہوں اور علی اس کا دروازہ ہیں"

" وفی روایۃ المصابیح انا دار العلم وعلی بابھا "

" اور مصابیح کی روایت میں ہے میں علم کا دار ہوں اور علی اس کا دروازہ ہیں"

" وفی روایۃ زیادۃ فمن اراد العلم فلیأتہ من بابہ "

" اور ایک روایت میں یہ زیادتی بھی ہے کہ جو شخص علم کا ارادہ رکھتا ہے وہ اس کے دروازے سے آئے"

حدیث پاک کا مطلب کیا ہے؟

" والمعنی علی باب من ابوابھا ولکن التخصیص یفید نوعا من التعظیم وھو کذلک لانہ بالنسبۃ الی بعض الصحابۃ اعظمھم واعلمھم "

حدیث پاک کا مطلب یہ ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ علم کے شہر کے دروازوں میں سے ایک دروازہ ہیں لیکن آپ کا ذکر خصوصی طور پر کرنا آپ کی عظمت پر دلالت کرتا ہے اس بات کا کوئی انکار نہیں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ بنسبت بعض صحابہ کرام کے (نہ کہ بنسبت تمام صحابہ کرام کے) افضل بھی ہیں یعنی آپ کو عظمت حاصل ہے اور بنسبت بعض صحابہ کرام کے آپ زیادہ علم بھی رکھتے ہیں۔

" ومما یدل علی ان جمیع الاصحاب بمنزلۃ الابواب قولہ ﷺ

اصحابی کالنجوم بایھم اقتدیتم اھتدیتم "

اس پر دلیل یہ ہے کہ تمام صحابہ کرام ہی علم کے شہر کے دروازے ہیں خود نبی کریم ﷺ کا ارشادگرامی ہے کہ میرے صحابہ تمام ہی ستاروں کی طرح ہیں ان میں سے جس کی اقتداءکرو گے ہدایت پا جاؤ گے۔ البتہ ستاروں سے تشبیہ دے کر یہ ثابت کر دیا کہ جس طرح بعض ستارے زیادہ نورانیت رکھتے ہیں اور بعض کم، اسی طرح صحابہ کرام بھی انوار ہدایت میں مختلف مراتب رکھیں گے۔

اس پر اور دلیل یہ ہے کہ تابعین نے علوم شرعیہ کی مختلف اقسام یعنی قراءت اور تفسیر اور حدیث فقہ تمام صحابہ کرام سے حاصل کئے ہیں حضرت علی رضی اللہ عنہ سے حاصل نہیں کئے " فعلم عدم انحصار البابیة فی حقه " اسی سے معلوم ہو گیا کہ علم کے شہر کا دروازہ ہونا صرف حضرت علی رضی اللہ عنہ پر بند نہیں۔ ہاں اگر جزوی فضیلت ثابت کی جائے تو اس میں کوئی حرج نہیں:

" اللھم الا ان یختص بباب القضاء فانه ورد فی شانه انه اقضاکم "

ہاں اگر حضرت علی رضی اللہ عنہ کو علم قضاء (عدالتی فیصلے کرنے) کے شہر کا دروازہ مان لیا جائے تو یہ درست ہے اسلئے کہ ان کی شان میں نبی کریم ﷺ نے فرمایا وہ تم تمام سے اچھے قاضی ہیں۔ اس طرح جزوی فضیلت اور صحابہ کرام کو بھی حاصل ہے کیونکہ حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ کے متعلق ارشاد مصطفوی ہے " انه اقرؤکم " وہ تم تمام سے زیادہ اچھے قاری ہیں اور حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کے متعلق ارشاد فرمایا" انه افرضکم " بیشک وہ تم تمام سے زیادہ علم فرائض رکھتے ہیں یعنی وراثت کے مسائل وہ تمام صحابہ کرام سے زیادہ جانتے ہیں اور حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کے متعلق فرمایا "انه اعلمکم بالحلال والحرام " بیشک وہ تم تمام سے حلال وحرام کا زیادہ علم رکھتے ہیں۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے کچھ لوگوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی شان کے متعلق پوچھا تو آپ نے بتایا:

" کان قد ملئی جوفه حکما وعلما وباسا ونجدة مع قرابته من رسول الله ﷺ " (اخرجه احمد)

کہ وہ علم وحکمت اور بہادری ورفعت سے بھرے ہوئے تھے باوجود اس کے کہ رسول اللہ ﷺ

کے ساتھ آپ کو قرابت بھی حاصل تھی۔

"وعن سعید بن مسیب قال عمر کان یتعوذ من معضلة لیس الها ابو حسن" (اخرجه احمد)

حضرت سعید بن میسب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں حضرت عمر رضی اللہ عنہ ان پیچیدہ مسائل سے پناہ مانگتے جن کا فیصلہ کرنے کے لئے حضرت ابوالحسن (حضرت علی) رضی اللہ عنہ نہ ہوتے۔

علامہ طیبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس حدیث (میں علم کا شہر ہوں علی اس کا دروازہ ہیں) سے اہل تشیع کا یہ دلیل پیش کرنا کہ علم اور حکمت صرف حضرت علی رضی اللہ عنہ سے حاصل کرنا خاص ہے کسی اور کی طرف آپ کے واسطہ کے بغیر تجاوز نہیں ہوسکتا کیونکہ دار (گھر) میں داخل صرف دروازے سے ہی ہوسکتا ہے رب تعالیٰ نے فرمایا:

﴿واتوا البیوت من ابوابھا﴾ "گھروں میں ان کے دروازوں سے آؤ"

"ولا حجة لھم فیه اذ لیس دار الجنة باوسع من دار الحکمة ولھا ثمانیة ابواب"

اس میں اہل تشیع کی دلیل ثابت نہیں ہوسکتی کیونکہ جنت کا دار علم کے دار سے زیادہ وسیع نہیں حالانکہ جنت کے بھی آٹھ دروازے ہیں۔ (مرقاۃ ج ۱۱ ص ۳۴۶)

یعنی مقام جنت علم وحکمت کے شہر سے چھوٹا ہے جبکہ آٹھ دروازے جنت کے بھی ہیں تو علم کا شہر کیسا شہر ہوگا جس کا ایک ہی دروازہ ہو ہاں یقیناً اس کے دروازے بہت ہیں وہ سب صحابہ کرام ہی اس کے دروازے ہیں البتہ یوں کہا جاسکتا ہے کہ کوئی دروازہ بڑا ہوگا اور کوئی چھوٹا۔

حدیث پاک پر محدثین کے اقوال:

"رواہ الترمذی وقال ھذا حدیث غریب وقال روی بعضھم ھذا الحدیث عن شریک ولم یذکروا فیه الصنابحی (بضم صاء وکسر موحدۃ ومھملة) ولا نعرف ھذا الحدیث عن احد من الثقات غیر شریک"

یہ حدیث (انا دار الحکمة وعلی بابها) ترمذی نے ذکر کی ہے اور فرمایا یہ حدیث غریب ہے اور یہ کہا کہ یہ حدیث شریک سے بعض نے روایت کی ہے اور سند میں صنابحی کا بھی ذکر نہیں اور بعض کا نام بھی نہیں اور یہ حدیث سوائے شریک کے اور ثقہ راویوں سے ثابت نہیں۔

اورحدیث " انا مدینة العلم وعلی بابها " حاکم نے اپنی مستدرک کے باب المناقب میں ذکر کی ہے " وقال صحیح " اورانہوں نے اس حدیث کو صحیح قرار دیا" وتعقبه الذهبی فقال بل هو موضوع "اورذہبی نے اس کا تعاقب کیا ہے اور کہا ہے بلکہ وہ موضوع ہے" وقال ابو زرعة کم خلق افتضحوا فیه " اورابوزرعہ نے کہا ہے کہ اس میں کتنے لوگ رسواء ہوئے ہیں۔ (یعنی اس کی سند کو صحیح نہیں ثابت کر سکے)۔

" وقال یحی بن معین لا اصل له کذا قال ابو حاتم ویحی بن سعید "

اور یحی بن معین نے کہا ہے کہ اس حدیث کی کوئی اصل نہیں اس طرح ابو حاتم اور یحی بن سعید نے بھی کہا ہے۔ " وقال الدار قطنی ثابت " اوردارقطنی نے کہا ہے یہ حدیث ثابت ہے "ورواه الترمذی فی المناقب من جامعه وقال انه منکر "اورترمذی نے یہ حدیث اپنی جامع کے باب المناقب میں ذکر کی ہے کہ یہ حدیث منکر ہے یعنی ثقہ راویوں کی حدیث معرف کے مقابل ہے جسے منکر کہا جاتا ہے۔

" وکذا قال البخاری انه لیس له وجه صحیح " اور بخاری نے بھی اسی طرح بیان کیا ہے کہ اس حدیث کی کوئی وجہ صحیح نہیں۔" واورده ابن الجوزی فی الموضوعات" اورابن جوزی نے اسے موضوعات میں ذکر کیا ہے۔

" وقال ابن دقیق العبد هذا الحدیث لم یثبتوه وقیل انه باطل "

ابن دقیق العبد نے کہا یہ حدیث ثابت نہیں اور بعض نے کہا یہ باطل ہے۔

صحیح قول بطور محاکمہ: لیکن حافظ ابوسعید علائی رحمہ اللہ نے فرمایا درست قول یہ ہے:

" انه حسن باعتبار طرقه لا صحیح ولا ضعیف فضلا عن ان یکون

موضوعا ذکرہ الزرکشی"

کہ یہ حدیث باعتبار طرق سند کے حسن ہے صحیح بھی نہیں اور ضعیف بھی نہیں۔ جب حسن ہے تو موضوع کہنا کیسے صحیح یعنی موضوع کا قول لغو ہے علامہ زرکشی رحمہ اللہ نے حضرت علائی کے قول کو یوں ہی نقل فرمایا۔ علامہ ابن حجر عسقلانی رحمہ اللہ صاحب فتح الباری شرح بخاری سے اس حدیث کے متعلق سوال کیا گیا تو آپ نے فرمایا:

"انہ حسن لا صحیح کما قال الحاکم ولا موضوع کما قال ابن الجوزی"

یہ حدیث حسن ہے صحیح نہیں جیسا کہ حاکم نے کہا ہے اور موضوع بھی نہیں جیسا کہ ابن جوزی نے کہا ہے۔ علامہ سیوطی رحمہ اللہ نے فرمایا کہ اس حدیث کے متعلق علامہ علائی رحمہ اللہ نے اور علامہ عسقلانی رحمہ اللہ نے بہت تفصیل سے بحث فرمائی ہے۔ (مرقاۃ ج ۱۱ ص ۳۴۶)

ہاں البتہ یہ کہا جائے کہ آیۃ کریمہ میں اس طرف اشارہ ملتا ہے کہ جس طرح احرام باندھنے کے بعد گھروں میں آنے کی ضرورت ہو تو گھروں کے دروازوں کی طرف سے آؤ اسی طرح علم حاصل کرنا چاہو علم کے شہر میں آنا چاہو تو اس کے شہر کے دروازوں سے آؤ وہ دروازے تمام صحابہ کرام ہیں تعلیمات صحابہ کرام کی راہنمائی میں ہی علم ہدایت حاصل ہو سکتا ہے۔

☆☆☆☆☆

﴿وَقَاتِلُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ الَّذِیْنَ یُقَاتِلُوْنَکُمْ وَلَا تَعْتَدُوْا اِنَّ اللّٰہَ لَا یُحِبُّ الْمُعْتَدِیْنَ﴾

۱) ''اور اللہ کی راہ میں لڑو ان سے جو تم سے لڑتے ہیں اور حد سے نہ بڑھو اللہ پسند نہیں رکھتا حد سے بڑھنے والوں کو''۔

۲) ''اور لڑائی کرو اللہ کی راہ میں ان لوگوں سے جو لڑائی کرتے ہیں تم سے اور نہ تجاوز کرو بیشک اللہ نہیں پسند کرتا تجاوز کرنے والوں کو''۔

ماقبل سے تعلق:

پہلی آیۃ کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے تقوی کا حکم دیا یعنی دین میں استقامت اور اللہ تعالیٰ کی معرفت راہ تقوی سے حاصل ہوتی ہے صرف اپنی عقلی رائے کا دخل نہ ہو عقل سے بھی کسی چیز کو سوچنا ہے تو وہ اللہ تعالیٰ اور رسول اللہ ﷺ کے حکم کے تابع ہو۔

تقوی کا حکم دینے کا مطلب یہ ہے " ھو ترک المحظورات وفعل الواجبات " کہ ممنوع چیزوں کو چھوڑ دیا جائے اور واجب چیزوں پر عمل کیا جائے اس بحث سے واضح ہو گیا" ان الاستقامة علم وا لتقوی عمل " بیشک استقامت علم ہے اور تقوی عمل ہے ان دو چیزوں کی ہی مومن کو تکلیف دی گئی ہے کہ علم و عمل دونوں کو ہی حاصل کرو۔ تقوی کے حکم کے بعد:

" امر فی هذه الآية باشد اقسام التقوی و اشقها علی النفس وهو قتل اعداء الله "

اس آیۃ میں تقوی کی سخت قسم کا حکم دیا جو انسان کو بظاہر بہت بھاری اور مشقت آمیز نظر آتی ہے تقوی کی شدید قسم اللہ تعالیٰ کی راہ میں اللہ تعالیٰ کے دشمنوں یعنی کافروں سے جہاد کرنا ہے۔ (از کبیر)

شان نزول:

اس آیۃ کریمہ کے شان نزول میں دو احتمال پائے گئے ہیں ایک احتمال کے لحاظ سے یہ آیۃ کریمہ

منسوخ ہے اور دوسرے لحاظ سے منسوخ نہیں۔ مکہ مکرمہ میں جہاد کرنے کی ممانعت تھی نبی کریم ﷺ مدینہ طیبہ میں آئے تو آپ سے جہاد کی ممانعت کی پابندی اٹھائی لیکن اسے پھر بھی اس شرط سے مشروط کر دیا کہ جو تم سے لڑائی کرے اس سے لڑائی کرو اور جو تم سے لڑائی نہ کرے اس سے لڑائی نہ کرو اس لئے کہ جو لڑائی نہ کرے اگر اس سے لڑائی کرو گے تو تمہاری طرف سے تجاوز پایا جائے گا۔ اس آیۃ کریمہ کے نزول کے بعد:

" کان رسول اللہ ﷺ یقاتل من قاتل ویکف عن قتال من ترکہ "

رسول اللہ ﷺ ان لوگوں سے لڑائی کرتے جو آپ سے لڑائی کرتے اور جو آپ سے لڑائی نہیں کرتے تھے رسول اللہ ﷺ بھی ان سے لڑائی نہیں کرتے تھے:

" و بقی علی ھذہ الحالۃ الی ان نزل قولہ تعالیٰ ﴿اُقْتُلُوا الْمُشْرِكِيْنَ﴾

نبی کریم ﷺ نے اسی پر کچھ دیر عمل کیا پھر اللہ تعالیٰ نے جہاد کا حکم عام کر دیا اور آیۃ کریمہ ﴿اُقْتُلُوا الْمُشْرِكِيْنَ﴾ نازل فرما کر مطلقاً کفار و مشرکین کو قتل کرنے کا حکم دیا جس سے پہلے لڑائی نہ کرنے کی شرط منسوخ کر دی گئی۔

شان نزول کی دوسری وجہ یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ چھٹے سن ہجری میں اپنے صحابہ کرام کو ساتھ لے کر عمرہ کرنے کی غرض سے مکہ مکرمہ کی طرف چلے۔ مقام حدیبیہ میں آپ نے قیام کیا اس جگہ اترنے کی وجہ یہ تھی کہ اس جگہ میں درخت بہت تھے اور پانی بھی تھا۔ لیکن کفار مکہ کو آپ کے تشریف لانے اور حدیبیہ میں اترنے کے متعلق معلوم ہو گیا تو انہوں نے آپ کو مکہ مکرمہ میں داخل ہونے سے منع کر دیا، ایک مہینہ تک آپ نے وہاں قیام کیا اور کفار سے بات چیت کے بعد ان سے چند شرائط پر صلح ہو گئی جن میں ایک شرط یہ تھی کہ تم اب واپس چلے جاؤ اور آئندہ سال آؤ عمرہ کر لو یعنی طواف کرو اور ہدی کے جانور ذبح کرو تین دن تک ٹھہرو اس میں نیکی کے کام جو چاہو کرو اور تین دن کے بعد پھر واپس لوٹ جانا۔

صلح کے بعد نبی کریم ﷺ اور صحابہ کرام مدینہ طیبہ میں لوٹ گئے آئندہ سال عمرہ کی تیاری کی تو صحابہ کرام کے دل میں خیال آیا کہ ہو سکتا ہے قریش وعدہ کی وفا نہ کریں ہمارے ساتھ لڑائی شروع کر دیں تو ہم شہر حرام اور حرم شریف میں ان سے لڑائی نہیں کر سکیں گے تو ہم کیا کریں گے۔ اللہ تعالیٰ نے اس

آیۃ کریمہ کو نازل کر کے ان کے اس خدشہ کو دور کر دیا کہ اگر وہ تمہارے ساتھ پہلے لڑائی کریں تو جواباً تم بھی ان سے لڑائی کر سکو گے تمہارے لئے یہ لڑائی جائز ہوگی۔

شان نزول کی اگر یہ وجہ ہو تو آیۃ کریمہ منسوخ نہیں ہوگی کیونکہ حرم شریف میں اگر کوئی لڑائی کرے تو اس کے جواب میں لڑائی جائز ہے لیکن لڑائی کی ابتداء کرنا جائز نہیں یہ حکم باقی ہے۔ بعض حضرات نے پہلے شان نزول کے مطابق بھی آیۃ کریمہ کو منسوخ نہیں مانا کہ تجاوز کرنے کا مطلب کفار کی عورتوں اور بچوں اور بوڑھوں کو قتل نہ کرنے کا حکم دیا گیا ہے جس کی تفصیل انشاء اللہ احادیث مبارکہ کے بیان میں آئے گی۔

راقم کا موقف: تفاسیر کے مختلف اقوال دیکھنے کے بعد راقم نے یہ رائے قائم کی ہے کہ نبی کریم ﷺ جب مکہ مکرمہ میں تھے جہاد کرنا بالکل منع تھا لیکن مدینہ طیبہ میں آنے کے بعد اس آیۃ کریمہ کے نزول سے ممانعت کے حکم میں کچھ نرمی کر دی گئی آہستہ آہستہ حکم کو مزید نرم کیا گیا لہذا اس آیۃ کریمہ کے منسوخ ہونے کی کوئی خاص وجہ نہیں۔

جب مسلمانوں کی تعداد قلیل تھی تو لڑائی سے مکمل منع کیا گیا تاکہ لڑائی میں زیادہ تکلیف نہ اٹھانی پڑے۔ جب مسلمانوں کی تعداد زیادہ ہوگئی تو پھر بھی ابتدائی طور پر حکم یہ دیا کہ جو تمہارے ساتھ لڑائی کرے اس سے لڑائی کرو اور جو لڑائی نہ کرے اس سے لڑائی نہ کرو پھر حکم اور عام کر دیا گیا کہ کافروں سے جہاد کرو خواہ وہ تمہارے ساتھ لڑائی کریں یا نہ کریں۔

پھر صلح حدیبیہ کے بعد دوسرے سال عمرہ کی تیاری میں جب صحابہ کرام کے دل میں خدشہ پیدا ہوا کہ وہ حرم شریف میں ہمارے ساتھ اگر لڑائی کے درپے ہوئے تو ہم کیا کریں گے تو اسی آیۃ کریمہ سے پھر ان کو متنبہ کیا کہ حرم میں پہلے تم پر لڑائی کو منع کیا گیا ہے اگر کافر تمہارے ساتھ لڑائی کریں تو تم اپنا دفاع حرم میں بھی کر سکتے ہو۔

(ماخوذ از کبیر بتصرف)

﴿ وَاقْتُلُوْهُمْ حَيْثُ ثَقِفْتُمُوْهُمْ وَاَخْرِجُوْهُمْ مِّنْ حَيْثُ اَخْرَجُوْكُمْ وَالْفِتْنَةُ اَشَدُّ مِنَ الْقَتْلِ وَلَا تُقَاتِلُوْهُمْ عِنْدَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ حَتّٰى يُقَاتِلُوْكُمْ فِيْهِ فَاِنْ قَاتَلُوْكُمْ فَاقْتُلُوْهُمْ كَذٰلِكَ جَزَآءُ الْكَافِرِيْنَ ﴾

۱) ''اور کافروں کو جہاں پاؤ مارو اور انہیں نکال دو جہاں سے انہوں نے تمہیں نکالا تھا اور ان کا فساد تو قتل سے بھی سخت ہے اور مسجد حرام کے پاس ان سے نہ لڑو جب تک وہ تم سے وہاں نہ لڑیں اور اگر تم سے لڑیں تو انہیں قتل کرو کافروں کی یہی سزا ہے''۔

۲) ''اور قتل کرو ان (کافروں) کو جہاں تم ان کو پاؤ، اور نکالو ان کو جہاں سے انہوں نے نکالا تمہیں اور فتنہ سخت ہے قتل سے اور تم نہ لڑو ان سے مسجد حرم کے پاس یہاں تک کہ وہ لڑائی کریں تمہارے ساتھ اس میں تو اگر وہ لڑائی کریں تمہارے ساتھ تو ان کو قتل کرو اسی طرح بدلہ ہے کافروں کا''۔

مختصر وضاحت:

ثقف یثقف کا لغوی معنی ہے کسی چیز میں مہارت حاصل کرنا خواہ علم کے لحاظ پر ہو یا عمل کے لحاظ پر ہو۔

'' فهو يتضمن معنى الغلبة فالمعنى حيث تمكنتم على قتلهم ''

پھر یہ غالب آنے کے معنی کو متضمن ہے اب معنی یہ ہے جہاں بھی تم ان کو قتل کرنے پر قادر ہو وہاں ہی ان کو قتل کر دو (مظہری) اسی معنی کے مناسب زیادہ مفسرین نے ﴿ حَيْثُ ثَقِفْتُمُوْهُمْ ﴾ کا ترجمہ کیا ہے '' حیث وجدتموھم '' اور قتل کرو ان کو جہاں تم ان کو پالو۔

﴿ وَاَخْرِجُوْهُمْ مِّنْ حَيْثُ اَخْرَجُوْكُمْ ﴾

''اور نکال دو ان کو جہاں سے انہوں نے تمہیں نکالا''

یعنی کفار نے تمہیں مکہ سے نکالا تھا اب تم ان کفار کو مکہ سے نکال دو فتح مکہ کے بعد جن لوگوں نے اسلام قبول نہیں کیا تھا ان کو مکہ مکرمہ سے نکال دیا گیا۔ مکمل تفصیل تو چھبیسویں پارہ میں ہے یہاں صرف اتنا سمجھ آئے کہ حدیبیہ میں اگر چہ صلح کا معاہدہ دس سال کے لئے ہوا تھا لیکن کفار نے خود ہی عمرہ کی قضا کے بعد اس معاہدہ کے خلاف کام کرنا شروع کر دیا تھا جس کی وجہ سے انہوں نے خود ہی معاہدہ پہلے توڑ دیا تھا۔ اس لئے فتح مکہ اور کفار کو مکہ سے نکالنا مسلمانوں کی طرف سے نہ کوئی زیادتی تھی اور نہ ہی وعدہ کی خلاف ورزی تھی۔

وَالْفِتْنَةُ اَشَدُّ مِنَ الْقَتْلِ : ''اور فتنہ سخت ہے قتل سے''۔

یعنی تم جو خوف کر رہے ہو کہ ہم احرام میں ہوں گے اور حرم کی سرزمین ہو گی تو ہمارے ساتھ اگر کافر لڑائی کریں گے تو ہم کیا کریں گے؟ تو اس پر اللہ تعالیٰ تمہیں بتا رہا ہے کہ کفار کا شرک کرنا اور تمہیں مسجد حرام سے روکنا اور طرح طرح کا فساد برپا کرنا فتنہ ہے اور اللہ تعالیٰ کے ہاں فتنہ عظیم جرم ہے اور عظیم گناہ ہے بنسبت لڑائی کرنے اور ان کو قتل کرنے کے، اگر چہ تمہاری طرف سے قتل کی ابتدا تو رب تعالیٰ کو پسند نہیں لیکن اگر وہ تمہارے قتل کے درپے ہوتے ہیں۔ تو تم بھی ان کو قتل کر دینا تمہارے لئے حرم میں دفاعی جنگ کو حلال کر دیا گیا ہے۔

﴿ وَلَا تُقَاتِلُوْهُمْ عِنْدَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ حَتّٰى يُقَاتِلُوْكُمْ فِيْهِ فَاِنْ قٰتَلُوْكُمْ فَاقْتُلُوْهُمْ ﴾

''اور تم نہ لڑو ان سے مسجد حرام کے پاس یہاں تک کہ وہ لڑائی کریں تم سے اس میں تو اگر وہ لڑائی کریں تمہارے ساتھ تو تم قتل کر دو ان کو''۔ یہاں ذکر مسجد حرام کا ہے مراد تمام حرم ہے یعنی ذکر جزء کا ہے اور مراد کل ہے جسے مجاز مرسل کہا جاتا ہے۔

مطلب یہ ہے کہ حرم میں تم ان سے لڑائی نہ کرنا جب تک وہ تمہارے ساتھ لڑائی نہ کریں ہاں اگر وہ حرم شریف کا احترام نہ کریں اور تمہارے ساتھ لڑائی کریں تو تم بھی ان کو قتل کر دینا۔

مطلب واضح ہوا کہ حرم شریف کے احترام کا حکم تا قیامت موجود رہے گا مسلمانوں کے لئے جائز نہیں کہ وہ حرم شریف میں لڑائی کریں ہاں اگر کافر مسلمانوں کو حرم شریف میں اس لئے قتل کرنا شروع کر دیں کہ یہ حرم شریف کے احترام کی وجہ سے ہمارے ساتھ لڑائی نہیں کریں گے تو تم اس وقت بہت

شریف اور سیدھے سادے بن کر نہ رہنا بلکہ ان کو بطور دفاع حرم شریف میں ہی قتل کر دینا یہ تمہارے لئے جائز ہے۔ اسی لئے رسول اللہ ﷺ نے فتح مکہ کے دن فرمایا:

" ان هذا البلد حرمه الله يوم خلق السماوات والارض فهو حرام بحرمة الله الى يوم القيامة وانه لن يحل القتال فيه لاحد قبلي ولم يحل لي الا ساعة من نهار فهو حرام بحرمة الله الى يوم القيامة لا يعضد شوكه ولا ينفر صيده " (رواه البخاري ومسلم)

بیشک اللہ تعالیٰ نے اس شہر (حرم مکہ) کو زمین و آسمان کی پیدائش کے دن سے ہی محترم بنا دیا ہے اس لئے اس کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے احترام عطا کرنے کی وجہ سے قیامت تک احترام حاصل رہے گا مجھ سے پہلے کسی کے لئے اس میں جنگ کرنا جائز نہ ہوا اور میرے لئے بھی سوائے دن کی ایک گھڑی کے اس میں جنگ حلال نہ ہوئی تا قیامت اسے اللہ تعالیٰ کی طرف سے احترام عطا کرنے کی وجہ احترام حاصل ہے اس کے کانٹے نہ کاٹے جائیں اور اس کے شکار کو نہ بھگایا جائے۔

حضرت جابر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا " لا يحل لاحدكم ان يحمل بمكة السلاح " (رواہ مسلم) تم میں سے کسی کے لئے حلال نہیں کہ وہ مکہ میں ہتھیار اٹھائے۔

وَكَذٰلِكَ جَزَآءُ الْكَافِرِيْنَ: "اور اسی طرح بدلہ ہے کافروں کا"

یعنی دنیا میں ان کی سزا اور ان کا بدلہ یہ ہے کہ جہاں سے انہوں نے تمہیں نکالا وہاں سے تم ان کافروں کو نکال دو اور اگر وہ تمہارے ساتھ حرم میں اور شہر حرام (یعنی ذیقعد جس میں عمرہ کو قضا کیا جا رہا تھا) میں اور تمہارے احرام کی حالت میں لڑائی کریں تو تم بھی ان کو قتل کر دو اور آخرت میں ان کو دردناک عذاب دیا جائے گا۔

(از جلالین وصاوی ومظہری)

☆☆☆☆☆

﴿ فَاِنِ انْتَهَوْا فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ﴾

۱) ''پھر اگر وہ باز رہیں تو بیشک اللہ بخشنے والا مہربان ہے''۔

۲) ''پھر اگر وہ رک جائیں تو بیشک اللہ بخشنے والا رحم کرنے والا ہے''۔

یعنی اگر وہ کافر کفر و شرک سے اور لڑائی کرنے سے اور فتنہ وفساد سے رک جائیں اور اسلام لے آئیں اور توبہ کرلیں تو اللہ تعالیٰ ان کے پہلے جرموں کو بخش دے گا جب وہ ایمان لے آئے تو اللہ تعالیٰ کے مقرب بندے بن جائیں گے تو اللہ تعالیٰ ان پر رحم فرمائے گا۔ (از جلالین ومظہری)

دینی طلباء کرام توجہ فرمائیں:

اِنْتَهَوْا اصل میں " انتھیوا " ہے یاء متحرک ماقبل فتح ہونے کی وجہ سے یاء کو الف سے تبدیل کردیا الف التقاء ساکنین کی وجہ سے گر گیا تو " انتھوا " رہ گیا۔ (از صاوری)

﴿ وَقَاتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ لِلّٰهِ فَاِنِ انْتَهَوْا فَلَا عُدْوَانَ اِلَّا عَلَى الظّٰلِمِيْنَ ﴾

۱) ''اور ان سے لڑو یہاں تک کہ کوئی فتنہ نہ رہے اور ایک اللہ کی پوجا ہو پھر اگر وہ باز آئیں تو زیادتی نہیں مگر ظالموں پر۔

۲) ''اور لڑائی کرو ان سے یہاں تک کہ نہ رہے فتنہ اور ہو جائے دین خالص (اللہ) کے لئے پھر اگر وہ رک جائیں تو زیادتی نہیں مگر ظالموں پر''

یعنی مشرکوں سے جنگ کرو یہاں تک کہ شرک اور فتنہ وفساد ختم ہو جائے اور مکہ مکرمہ میں دین خالص اللہ تعالیٰ کیلئے ہو جائے عبادت اور طاعت صرف رب تعالیٰ کو ہو اسکے غیر کی عبادت نہ کی جائے۔

☆ "عن ابن عمر قال قال رسول الله ﷺ امرت ان اقاتل الناس حتی یشهدوا ان لا الـه الا الله وان محمدا رسول الله ویقیموا الصلوة ویؤتوا الزکوة فاذا فعلوا ذلک عصموا منی دماء هم واموالهم الا بحق الاسلام وحسابهم علی الله تعالیٰ" (بخاری ومسلم)

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں لوگوں (کافروں) سے لڑائی کروں یہاں تک کہ وہ شہادت دیں کہ اللہ کے بغیر کوئی معبود نہیں اور بیشک محمد اللہ کے رسول ہیں اور نماز قائم کریں اور زکوۃ دیں۔ تو جب یہ کام وہ کرلیں تو انہوں نے اپنے خونوں اور مالوں کو مجھ سے بچالیا سوائے حقوق اسلامیہ کے (کی وجہ سے جوان پر بطور قصاص قتل لازم آئے یا کسی کے مال کے بدلے مال لازم آئے) اور ان کا حساب اللہ تعالیٰ پر ہے۔

اگر وہ لوگ شرک اور لڑائی اور فتنہ وفساد سے رک جائیں تو ان پر کوئی زیادتی نہیں یعنی ان کو قتل نہ کیا جائے اور نہ ہی ان کو قید کیا جائے ہاں البتہ ان میں سے جو شرک پر قائم رہیں تو ان کو قتل کردیا جائے۔
(از مظہری)

﴿اَلشَّهۡرُ الۡحَرَامُ بِالشَّهۡرِ الۡحَرَامِ وَالۡحُرُمٰتُ قِصَاصٌ فَمَنِ اعۡتَدٰى عَلَيۡكُمۡ فَاعۡتَدُوۡا عَلَيۡهِ بِمِثۡلِ مَا اعۡتَدٰى عَلَيۡكُمۡ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعۡلَمُوۡٓا اَنَّ اللّٰهَ مَعَ الۡمُتَّقِيۡنَ﴾

۱) ''ماہ حرام کے بدلے ماہ حرام اور ادب کے بدلے ادب ہے جو تم پر زیادتی کرے اس پر زیادتی کرو اتنی ہی جتنی اس نے کی اور اللہ سے ڈرتے رہو اور جان رکھو کہ اللہ ڈر والوں کیساتھ ہے''۔

۲) ''عزت والا مہینہ بدلے عزت والے مہینہ کے اور حرمت کے بدلے حرمت تو جو تم پر زیادتی کرے تم اس سے انتقام لو اتنا جتنی اس نے زیادتی کی ہے تم پر اور ڈرو اللہ سے اور جان لو بیشک اللہ ساتھ ہے تقوی رکھنے والوں کے''۔

مختصر وضاحت : حضرت صدر الافاضل مولنا نعیم الدین مراد آبادی رحمہ اللہ نے ﴿اَلشَّهۡرُ الۡحَرَامُ بِالشَّهۡرِ الۡحَرَامِ﴾ کی تفسیر میں یوں بیان فرمایا ''جب گزشتہ سال ذی القعدہ 6ء میں مشرکین عرب نے ماہ حرام کی حرمت وادب کا لحاظ نہ رکھا اور تمہیں ادائے عمرہ سے روکا تو بے حرمتی ان سے واقع ہوئی اور اس کے بدلے بتوفیق الٰہی 7ء کے ذی القعدہ میں تمہیں موقع ملا کہ تم عمرہ قضاء کو ادا کرلو۔ (خزائن العرفان)

تاہم جلالین میں یوں ذکر ہے:

﴿ اَلشَّهۡرُ الۡحَرَامُ ﴾ المحرم مقابل ﴿ بِالشَّهۡرِ الۡحَرَامِ ﴾ فكما قاتلوكم فيه فاقتلوهم في مثله رد لا ستعظام المسلمين ذلك"

حرمت والا مہینہ حرمت والے مہینہ کے مقابل ہے اگر وہ حرمت والے مہینہ کا لحاظ نہ کریں تمہارے ساتھ لڑائی کریں تو تم بھی اسی طرح ان سے لڑائی کرو اور ان کو قتل کردو۔ یہ آیۂ کریمہ مسلمانوں کے اس خدشہ کو دور کرنے کے لئے نازل ہوئی جو ان کو لاحق تھا کہ حرمت والے مہینہ اور حرم میں ان سے ہم کیسے لڑائی کریں گے؟

" ﴿ وَالۡحُرُمَاتُ قِصَاصٌ ﴾ اى متى حصل انتهاک من احد لحرمة آخر سقطت حرمته فيقتص له منه"

عزت کے بدلے عزت کا مطلب یہ ہے کہ جب ایک شخص دوسرے کی حرمت وعزت کا لحاظ رکھے تو یہ بھی اس کا لحاظ رکھے اور اگر ایک شخص دوسرے کی عزت کا لحاظ نہ رکھے تو یہ بھی اس کی عزت کا پاس چھوڑ دے۔ (صاوی)

﴿ فَمَنِ اعۡتَدٰى عَلَيۡكُمۡ ﴾ جو شخص تم پر تجاوز کرے زیادتی کرے یعنی حد سے تجاوز کر جائے ﴿فَاعۡتَدُوۡا عَلَيۡهِ بِمِثۡلِ مَا اعۡتَدٰى عَلَيۡكُمۡ ﴾ اى انتقموا منه " تو تم اس سے انتقام لو انتقام لینے اور ان سے قتال (لڑائی) کرنے کو ﴿ فَاعۡتَدُوۡا عَلَيۡهِ ﴾ سے تعبیر کر دیا اس کی وجہ مشاکلت ہے ان کی زیادتی کے بدلے کو زیادتی کہہ دیا چونکہ بظاہر شکل ایک جیسی ہوگی۔

﴿ بِمِثۡلِ مَا اعۡتَدٰى عَلَيۡكُمۡ ﴾ سے وہی مسئلہ بطور تاکید ذکر فرمایا جو ﴿ اَلۡحُرُمَاتُ قِصَاصٌ ﴾ میں ذکر فرمایا کہ جب وہ تم پر زیادتی کریں تو تم بھی ان کی زیادتی کی طرح ان سے انتقام لے لو۔

﴿ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ﴾ اور ڈرو اللہ سے یعنی اللہ تعالیٰ سے تقویٰ حاصل کرو تقویٰ حاصل ہونا درحقیقت اللہ تعالیٰ کی رحمت ہے اپنے بندوں پر اس لئے اپنے آپ کو اس رحمت کا مستحق بناؤ اس سے اپنے آپ کو محروم نہ کرو۔

﴿ وَاعْلَمُوْا اَنَّ اللّٰهَ مَعَ الْمُتَّقِيْنَ ﴾ اور جان لو بیشک اللہ تعالیٰ تقوی کرنے والوں کے ساتھ ہے یعنی خصوصی معیت ان کو حاصل ہے جس کی وجہ سے خصوصی امداد ان کو حاصل ہے ورنہ اللہ تعالیٰ اپنے علم وتصرف کے لحاظ سے ہر انسان کے ساتھ ہے خواہ وہ مومن ہو یا کافر۔ (از جلالین وصاوی)

آیات جہاد کے متعلق تفصیلی بحث:

اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

﴿ وَقَاتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ﴾ ''اور لڑائی کرو اللہ کی راہ میں''

اس سے واضح ہوا کہ وہی جہاد باعث اجر وثواب ہے جس میں اللہ تعالیٰ کی رضاء پائی جائے اور اللہ تعالیٰ کے دین کی بلندی کے لئے جہاد کرے '' **وقال ابن الھمام وھو دعوتھم الی الدین الحق** '' جہاد کا مقصد ہی دین حق کی طرف دعوت دینا ہے۔ (مرقاۃ ج ۷ص ۲۶۴)

☆ '' **وعن ابی موسی قال جاء رجل الی النبی ﷺ فقال الرجل یقاتل للمغنم والرجل یقاتل للذکر والرجل یقاتل لیری مکانہ فمن فی سبیل اللہ قال من قاتل لتکون کلمۃ اللہ ھی العلیا فھو فی سبیل اللہ** '' (بخاری ومسلم ، مشکوۃ کتاب الجہاد)

حضرت ابو موسی اشعری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں ایک شخص نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور پوچھا کہ ایک شخص مال غنیمت حاصل کرنے کے لئے جہاد کرتا ہے اور ایک شخص جہاد کرتا ہے کہ اس کا چرچا ہو اور ایک شخص جہاد کرتا ہے کہ اس کی شجاعت و بہادری کو لوگ دیکھیں ان میں سے کس شخص کا جہاد اللہ کی راہ میں ہے؟ نبی کریم ﷺ نے فرمایا، جس نے جہاد اللہ تعالیٰ کے کلمہ کی بلندی کیلئے کیا، وہی جہاد اللہ کی راہ میں جہاد ہے،،

وضاحت حدیث : '' الرجل '' اس حدیث میں جتنی مرتبہ استعمال ہوا ہے وہ شخص کے معنی میں ہے سوائے پہلی مرتبہ کے ''جاء رجل '' میں ایک مرد آیا، اس کا معنی ہے اگر چہ راقم نے بامحاورہ معنی شخص سے ہی کیا ہے '' **فقال الرجل یقاتل للمغنم** ''اس مقام میں '' قال '' کا فاعل '' ھو ،،ضمیر مقدر ہے۔اور'' الرجل'' سوالیہ جملہ کا مبتداء ہے عبارت اس طرح ہوگی:

" (فقال) ذلک الرجل (الرجل) ای جنس الرجل بمعنی الشخص یقاتل للمغنم "

یعنی وہ شخص جو آپ کی خدمت میں حاضر ہوا اس نے کہا (پوچھا) کہ ایک شخص مال غنیمت کے لئے جہاد کرتا ہے: (والرجل) الآخر (یقاتل للذکر) ایک اور شخص جہاد کرتا ہے کہ اس کا چرچا ہو اس مقام میں "ذکر" کا معنی ہے آواز، شہرت، دکھلاوا، لوگوں کو سنانا یعنی اس کے جہاد کرنے میں مقصد لوگوں کو اپنی بہادری دکھانی اور اپنا چرچا کرنا مقصود ہوتا ہے کہ لوگ میری بہادری کی تعریف کریں:

" ﴿ والرجل ﴾ الآخر (یقاتل لیری) بصیغة المجهول ای لیعلم او یبصر (مکانه) بالرفع ای مرتبته فی الشجاعة "

ایک اور شخص جہاد کرتا ہے کہ اس کا شجاعت و بہادری میں مرتبہ لوگوں کو دکھایا جائے اور ان کو معلوم ہو جائے کہ میں کتنا بہادر ہوں ان میں سے کسی شخص کا جہاد اللہ کی راہ میں شمار ہوگا؟ نبی کریم ﷺ نے نہایت حکیمانہ جواب دیا:

" من قاتل لتکون کلمة الله (ای کلمة التوحید وهی لا اله الا الله) فهو فی سبیل الله "

جو شخص اللہ تعالیٰ کے کلمہ (یعنی کلمہ توحید) کی بلندی کے لئے جہاد کرتا ہے اسی کا جہاد اللہ کی راہ میں شمار ہوگا۔ کیا خوب جواب ہے کہ جہاد کرنے میں مقصد اللہ تعالیٰ کی رضاء حاصل کرنی ہو اور اللہ تعالیٰ کے دین کی بلندی مقصود ہو تو وہی جہاد اللہ تعالیٰ کی راہ میں جہاد ہوگا۔ نیت صرف مال غنیمت کی نہ ہو کیونکہ مال غنیمت خود ہی حاصل ہو جاتا ہے اور اسی طرح نیت صرف اپنا چرچا اور اپنی بہادری کا مرتبہ نہ دکھانا ہو بلکہ صرف دین کی بلندی مقصود ہو تو یہ چیزیں خود بخود حاصل ہو جائیں گی۔ یہ بھی خیال رہے کہ جنت کے حصول کے لئے جہاد اللہ کی راہ میں ہی شمار ہوگا کیونکہ اس میں مقصد ہی اللہ کے دین کی بلندی ہوگی جس پر جنت کا حاصل ہونا مرتب ہوگا اس لئے نبی کریم ﷺ نے جہاد میں شرکت کے لئے فرمایا" قوموا الی جنة " جنت کی طرف جانے کے لئے کھڑے ہو جاؤ "فالمراد بهما واحدو المآل متحد " اس لئے جنت حاصل ہونے کے ارادہ سے اور دین کی بلندی کے لئے جہاد کرنے سے ایک ہی چیز مراد ہے اور مقصد ایک ہی ہے یہ دونوں چیزیں متحد ہیں علیحدہ علیحدہ نہیں۔ (از مرقاۃ ج ۷ ص ۲۸۴)

☆ " وعن ابن عباس قال قال رسول الله ﷺ عینان لا تمسهما النار عین بکت من خشیة الله وعین باتت تحرس فی سبیل الله "

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا دو آنکھوں کو آگ مس نہیں کرے گی ایک وہ آنکھ جو اللہ تعالیٰ کے ڈر کی وجہ سے روئی اور دوسری وہ آنکھ جس نے اللہ کی راہ میں رات نگہبانی کرتے ہوئے گزاری۔ (ترمذی، مشکوۃ باب الجہاد)

پہلی آنکھ نفس سے جہاد کرنے والوں کی مراد ہے جو گناہوں سے توبہ کرتے ہیں عبادت میں رو رو کر رات گزار دیتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا خوف کسی کو بھی حاصل ہو اور روئے خواہ عالم ہو یا جاہل ہے اس کی رونے والی آنکھ سے بھی مراد اس شخص کی ذات ہے کہ وہ شخص جہنم کی آگ سے محفوظ رہے گا لیکن عالم کو یہ مرتبہ زیادہ حاصل ہوتا ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ان کی شان میں بیان فرمایا:

﴿ انما یخشی الله من عباده العلماء ﴾

''اللہ تعالیٰ سے کامل ڈرنے والے اس کے بندوں سے صرف علماء ہی ہیں''۔

اور دوسری آنکھ، یعنی دوسرا شخص وہ مراد ہے جو جہاد میں دشمن کے سامنے کھڑا ہو اور رات نگہبانی کرتے ہوئے گزار دے یعنی صرف اللہ تعالیٰ کی رضاء مقصود ہو اسے بھی جہنم کی آگ مس نہیں کرے گی۔

علامہ غزالی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

" الخوف سوط الله تعالیٰ یسوق به عباده الی المواظبة علی العلم والعمل لینا لوا بهما رتبة القرب الی الله تعالیٰ "

خوف اللہ تعالیٰ کا کوڑا ہے جس کے ذریعے اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو علم و عمل پر قائم رکھتا ہے تاکہ وہ اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل کر سکیں۔ جس کو علم و عمل حاصل ہوگا اس کو ہی حقیقی خوف ہوگا۔ اسی خوف سے رونے والی آنکھ جہنم کو آگ سے محفوظ رہے گی۔ مندرجہ بالا حدیث سے بھی واضح ہوا کہ جہاد ہی اللہ کی راہ میں شمار ہوگا جس میں اللہ تعالیٰ کی رضاء حاصل کرنی مقصود ہوگی۔

☆ " وعن ابی هریرة ان رجلا قال یا رسول الله رجل یرید الجهاد فی سبیل الله وهو یبتغی عرضا من عرض الدنیا فقال النبی ﷺ لا اجر له "

(رواه ابو داؤد، مشکوة کتاب الجهاد)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں بیشک ایک شخص نے عرض کیا یا رسول اللہ (اس شخص کا کیا حکم ہے) جو شخص اللہ کی راہ میں جہاد کرتا ہے لیکن وہ دنیا کے سامان میں سے کسی چیز کو حاصل کرنا چاہتا ہو تو نبی کریم ﷺ نے فرمایا اسے کوئی اجر حاصل نہیں۔

وضاحت حدیث:

" عرض (بفتح الراء) ما كان من مال قل او كثر ، وبالسكون المتاع "

یعنی "عرض" کی راء پر جب زبر ہو تو معنی ہوگا مال خواہ قلیل ہو یا کثیر۔ اور جب راء ساکن ہو تو اس کا معنی سامان ہوتا ہے۔ درہم اور دینار کے بغیر ہر قسم کے مال کو "عرض" کہا جاتا ہے۔ مطلب واضح ہے کہ سائل نے یہ پوچھا کہ اگر کوئی شخص مال حاصل کرنے کی غرض سے جہاد کرے تو اس کا کیا حکم ہے؟ تو آپ نے فرمایا اسے کوئی اجر حاصل نہیں۔

یہ حکم اس وقت ہے جب وہ اللہ تعالیٰ کی رضاء کے لئے جہاد نہ کرے بلکہ صرف جہاد نہ کرے بلکہ صرف مال ودولت حاصل کرنے کے لئے جہاد کرے۔

" واما اذا غزا لله وقصد حصول الغنيمة فلا شك ان له الاجر "

لیکن جب کوئی شخص جہاد تو صرف اللہ تعالیٰ کی رضاء کے لئے کرتا ہے البتہ مال غنیمت حاصل ہونے کی بھی نیت کر لے تو اسے یقیناً اجر حاصل ہونا ہے۔ ہاں البتہ خالص اللہ تعالیٰ کی رضاء کی نیت کرے تو اسے ثواب زیادہ حاصل ہوگا۔

☆ " وعن معاذ قال قال رسول الله ﷺ الغز وغزوان فاما من ابتغى وجه الله واطاع الامام وانفق الكريمة وياسر الشريك واجتنب الفساد فان نومه ونبهه اجر كله واما من غزا فخرا ورياء وسمعة وعصى الامام وافسد فى الارض فانه لم يرجع بالكفاف "

(رواه مالک وابوداود والنسائی . مشکوة باب الجهاد)

حضرت معاذ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جہاد کی دو قسمیں ہیں ایک یہ ہے کہ جہاد میں اللہ تعالیٰ کی رضاء کی طلب پائی جائے اور امام کی اطاعت کرے اور اپنا پسندیدہ مال خرچ کرے اور اپنے ساتھ شریک (دوست) کے لئے آسانی پیدا کرے اور فساد سے اجتناب کرے بیشک

اس کا سونا اور جاگنا سب ہی باعث ثواب ہیں (دوسری قسم جہاد کی یہ ہے) جس شخص نے جہاد کیا فخر کے طور پر دکھلاوا کے لئے اور چرچا کے لئے اور امام کی نافرمانی کی اور زمین میں فساد برپا کیا تو اسے کوئی ثواب حاصل نہیں۔

" فانه لم یرجع بالکفاف ، قال القاضی ای لم یرجع بالثواب ماخوذ من مکفاف الشئی " (مرقاۃ ج ۷ ص ۳۰۲)

(ترجمہ ذکر کر دیا گیا)۔

☆ " عن عبد الله بن عمرو انه قال یا رسول الله اخبرنی عن الجهاد فقال یا عبد الله بن عمرو ان قاتلت صابرا محتسبا بعثک الله صابرا محتسبا وان قاتلت مرائیا مکاثرا بعثک الله مرائیا مکاثرا یا عبد الله بن عمرو علی ای حال قاتلت او قتلت بعثک الله علی تلک الحال " (رواہ ابو داؤد ، مشکوۃ باب الجهاد)

حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص سے مروی ہے کہ انہوں نے عرض کیا یا رسول اللہ مجھے جہاد کے متعلق خبر دیں آپ نے فرمایا اے عبداللہ بن عمرو اگر تم نے جہاد کیا صبر سے اور ثواب کی امید سے اللہ تعالیٰ سے خلوص رکھتے ہوئے تو اللہ تعالیٰ تمہیں صابر و مخلص اٹھائے گا اور اگر تم نے جہاد کیا دکھلاوے اور کثرت پر فخر کرتے ہوئے تو اللہ تعالیٰ تمہیں ریاء کار اور کثرت پر فخر کے حال میں ہی اٹھائے گا۔ اے عبداللہ بن عمرو جس حال میں تم جہاد کرو گے اس حال میں تمہیں اللہ تعالیٰ اٹھائے گا۔

وضاحت حدیث:

جہاد کے متعلق سوال کا یہ مطلب تھا کہ آپ بتائیں کہ کونسا وہ جہاد ہے جو افضل ہے اور باعث ثواب ہے اور مقبول ہے اسی سے غیر مقبول خود بخود سمجھ آ جائے گا۔ " صابرا محتسبا "، صابر کا معنی صبر کرنے والا " محتسبا خالصا لله تعالیٰ " اور محتسب کا معنی اللہ تعالیٰ کی رضاء کے لئے خلوص رکھنے والا یعنی جہاد کرنے والا جب صبر و خلوص سے جہاد کرے گا تو اللہ تعالیٰ اسے صبر و خلوص کی حالت میں ہی اٹھائے گا۔

خیال رہے کہ اگر چہ دونوں مقاموں میں " صابرا محتسبا " نکرہ ذکر ہے لیکن پہلے مقام پر

تنوین تقلیل کے لئے ہے دوسرے مقام پر تنوین تکثیر و تعظیم کے لئے ہے۔ اب مطلب یہ ہوا کہ جہاد کرنے والے نے معمولی صبر و خلوص سے بھی جہاد کیا تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے " انہ لہ اجرا وثوابا لا یقادر قدرہ " اسے اتنا اجر و ثواب حاصل ہوگا کہ اس کا اندازہ نہیں کر سکے گا۔ اور اللہ تعالیٰ اسے کامل صابر کے درجے میں اٹھائے گا اور بے حساب اجر اسے عطا فرمائے گا۔ اور اسے کامل اخلاص کے درجہ میں اٹھائے گا یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ اس سے راضی ہوگا اور وہ اللہ تعالیٰ سے راضی ہوگا۔

" ورضوان من اللہ اکبر " اللہ تعالیٰ کی معمولی رضامندی بہت بڑی چیز ہے۔ تمام انعام واکرام اسی میں موجود ہوں گے۔ روایت میں آتا ہے " کما تعیشون تموتون وکما تموتون تحشرون " جس طرح تم زندگی گزارو گے اس طرح تمہاری موت آئے گی اور جس طرح تم پر موت آئے گی اس طرح تمہیں اٹھایا جائے گا۔

" وان قاتلت مرائیا مکاثرا بعثک اللہ مرائیا مکاثرا "

مرائیا، کا معنی واضح ہے دکھلاوا کرنا، یعنی جو شخص جہاد دکھلاوے کی غرض سے کرے گا وہ اجر وثواب سے محروم ہوگا کیونکہ اسے اٹھایا ہی اس حال میں جائے گا کہ سب کو معلوم ہوگا کہ یہ ریاء کاری کرنے والا شخص ہے۔ خیال رہے جو عمل بھی ریاء کاری سے ہوگا اس میں اجر وثواب حاصل نہیں ہوگا۔

﴿ التکاثر ﴾ کے معنی میں وسعت ہے " التکاثر التباری فی الکثرۃ والتباھی بھا " کثرت میں مقابلہ کرنا اور کثرت میں فخر کرنا ﴿ التکاثر ﴾ کہلاتا ہے کبھی کوئی شخص جہاد کرتا ہے اس غرض سے کہ مال غنیمت حاصل ہوگا اور مال میں زیادتی ہوگی۔ اور کبھی کوئی شخص جہاد کرتا ہے اس پر فخر کرتے ہوئے کہ میرے پاس لشکر زیادہ ہے مددگار زیادہ ہیں مجھے شجاعت زیادہ حاصل ہے اس غرض سے کیا ہوا جہاد اللہ تعالیٰ کے کلمہ اور دین کی بلندی کے لئے نہیں ہوگا اور نہ ہی اس میں کوئی اجر وثواب حاصل ہوگا۔ (از مرقاۃ ج ۷ ص ۳۰۳، ۳۰۴)

اس کے بعد نبی کریم ﷺ نے مطلقاً ایک ضابطہ بیان کر دیا کہ جو شخص جس نیت سے جہاد کرے گا اسی کے مطابق اللہ تعالیٰ اسے اٹھائے گا (واضح ہوا کہ جہاد وہی اللہ تعالیٰ کے حضور معتبر ہے جو اس کی رضاء کے لئے ہو)

جہاد تدریجاً فرض ہوا: اللہ تعالیٰ نے نبی کریم ﷺ کو جہاد کا حکم تدریجی طور پر بالترتیب دیا ہے:

پہلا حکم: "وقد کان ﷺ ماموراً اولاً بالتبلیغ والاعراض (فاصدع بما تؤمر واعرض عن المشرکین"

نبی کریم ﷺ کو پہلے صرف تبلیغ کرنے کا حکم تھا رب تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

﴿ یا ایها الرسل بلغ ما انزل الیک من ربک ﴾

"اے رسول تبلیغ فرمادو اس کی جو تمہاری طرف نازل ہوا تمہارے رب کی طرف سے"

اور ارشاد فرمایا:

﴿ فاصدع بما تؤمروا عرض عن المشرکین"

"تو علانیہ کہہ دو جس بات کا تمہیں حکم ہے اور مشرکوں سے منہ پھیرلو"

یعنی ابتدائی طور پر مشرکوں کی طرف سے ایذاء اور ملامت کرنے کا جواب نہ دینے کا حکم تھا کہ تم درگزر کرو اور ان کو معاف کردو علامہ سیوطی رحمہ اللہ نے "الاتقان" میں بیان فرمایا ہے کہ ایک سو چوبیس آیات قرآن پاک میں وہ ہیں جن میں درگزر کرنے کا حکم دیا گیا ہے کہ کافروں کی زیادتیاں برداشت کی جائیں لیکن ﴿ فاقتلوهم حیث ثقفتموهم ﴾ سے وہ تمام منسوخ کردی گئیں۔

دوسرا حکم: "ثم بالمجادلة بالاحسن ﴿ ادع الی سبیل ربک بالحکمة والموعظة الحسنة وجادلهم بالتی هی احسن ﴾ (النحل ۱۲۵)

پھر اچھے طریقہ سے جھگڑا کرنے کا حکم دیا یعنی دلائل سے ان کا رد کریں اتنی حد تک کفار سے در پے ہونے کی اجازت دی ارشاد باری تعالیٰ کا ترجمہ: "اپنے رب کی راہ کی طرف بلاؤ پکی تدبیر اور اچھی نصیحت سے اور ان سے اس طریقہ پر بحث کرو جو سب سے بہتر ہو۔ اچھے طریقہ سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف اس کی آیات و دلائل سے بلاؤ اسی کو مجادلہ حسنہ (اچھا جھگڑا) کہا ہے۔

تیسرا حکم: "ثم اذن لهم بالقتال اذن للذین یقاتلون بانهم ظلموا و ان الله علی نصرهم لقدیر" (الحج ۳۹)

اجازت عطا ہوئی انہیں جن سے کافر لڑتے ہیں اس بنا پر کہ ان پر ظلم کیا جائے اور بیشک اللہ ان

کی مدد کرنے پر ضرور قادر ہے۔

یعنی اس آیۃ سے مظلومین مسلمانوں کو کفار سے لڑنے کی اجازت دے دی گئی یہ نہیں فرمایا کہ ضرور لڑائی کرو بلکہ ان کی مشیت پر حکم کو موقوف کر دیا گیا چاہیں تو لڑائی کریں اور چاہیں تو درگزر سے کام لیں۔

چوتھا حکم: " ثم امروا بالقتال ان قاتلوهم ﴿ فان قاتلوكم فاقتلوهم ﴾

پھر ان کو لڑائی کرنے کا حکم دیا لیکن مشروط طور پر کہ اگر وہ تمہارے ساتھ لڑائی کریں تو تم بھی ان سے لڑائی کرو لیکن اس میں بھی ان کی زیادتی کے مطابق ان سے انتقام لینے کا حکم دیا، تجاوز نہ کرنے کا حکم دیا اور پہلے مسلمانوں کو لڑائی کرنے سے بھی منع کر دیا گیا۔

پانچواں حکم: " ثم امروا به بشرط انسلاخ الاشهر الحرم (فاذا انسلخ الاشهر الحرم فاقتلوا المشركين)

کافروں کی طرف سے لڑائی شروع کرنے پر بھی حرمت والے مہینوں (رجب، شوال، ذیقعد، ذی الحج) میں مسلمانوں کو پہلو تہی کرنے کا حکم دیا گیا البتہ حرمت والے مہینوں کے گزر جانے پر ان سے لڑائی کرنے کا حکم دیا گیا۔

چھٹا حکم: " ثم امروا به مطلقا ﴿ وقاتلوا في سبيل الله ﴾

پھر مطلقاً حکم دے دیا گیا کہ اللہ کی راہ میں لڑائی کرو اور حکم دیا ﴿ فاقتلوهم حيث ثقفتموهم ﴾ ان کو قتل کرو جہاں ان کو پاؤ۔ لیکن اس حکم میں بھی حرم شریف میں قتل کرنے کی ممانعت جوں کی توں رہی اور اب بھی حکم یہی ہے۔

" واستقر الامر على هذا في جميع الا زمان والاما كن سوى الحرام "

علامہ سرخسی رحمہ اللہ نے بیان فرمایا کہ اب حکم یہی ہے کہ ہر زمانہ میں اور ہر جگہ میں جہاد کرنا جائز ہے لیکن حرم شریف میں اب بھی منع ہے تا قیامت منع رہے گا جیسا کہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد گرامی پہلے ذکر کر دیا گیا ہے۔

تنبیہ: " وفي الخانية ان الا فضل ان لا يبتدأ به في الاشهر الحرم "

قاضی خان رحمہ اللہ نے بیان فرمایا کہ افضل یہ ہے کہ مسلمان حرمت والے مہینوں میں جنگ کی ابتدا نہ کریں کفار کی طرف سے حرمت والے مہینوں میں جنگ چھیڑ دی جائے تو اس کے جواب میں جنگ ضروری جائے کفار کا منہ توڑ جواب دیا جائے۔ اگر مسلمان ہی حرمت والے مہینوں میں جنگ کی ابتدا کریں تو پھر بھی جائز ہے صرف بہتر یہ ہے کہ ہو سکے تو مسلمان ابتدا نہ کریں۔

ساتواں حکم: " والمراد بقوله سوی الحرم اذا لم یدخلوا فیه للقتال فلو دخلوه للقتال حل قتالهم فیه لقوله تعالیٰ ﴿ حتی یقاتلوکم فیه ﴾

حرم شریف میں بھی لڑائی کرنا اس وقت تک منع ہے جب تک کفار حرم میں لڑائی نہ شروع کریں اگر کفار یہ خیال کریں کہ مسلمانوں کو تو منع کیا گیا ہے حرم شریف میں لڑائی کرنے سے اس لئے ان کو حرم میں قتل کر دیا جائے تو اس صورت میں جب وہ حرم میں لڑائی شروع کریں تو مسلمانوں کو بھی حکم دیا گیا کہ تم بھی ان کو حرم میں قتل کر دو شریف بن کر قتل نہ ہوتے رہو۔ (ماخوذ از شامی بزیادۃ ج ۳ ص ۳۳۹ باب الجہاد)

مقام توجہ: اگر چہ بظاہر یہاں یہ وہم ہوتا ہے کہ کافر تو کافر ہیں وہ حرم شریف کی عزت کا لحاظ نہ کریں تو عقل کے مطابق ہے لیکن مومنوں کو ان کے جواب میں حرم شریف میں لڑائی کرنے کا حکم دینا اور بے حرمتی کرنے کی اجازت کا کیا مقصد ہے؟

تو اس کا جواب یہ ہے کہ بظاہر یہ سمجھ آتا ہے کہ حرم شریف کی بے حرمتی ہے لیکن حقیقت میں حرم شریف کی عزت ہے کیونکہ اگر مومنوں کو لڑائی کرنے کی اجازت نہ دی جاتی تو کفار حرم میں خصوصاً حج کے موقع پر آئے دن مسلمانوں کو شہید ہی کرتے رہتے بار بار حرم شریف کی بے حرمتی ہوتی رہتی لیکن جب مسلمانوں کو اجازت دے دی کہ تم بھی ان کو قتل کر دو تو اب کفار کے ارادے خاک میں مل گئے وہ آرام سے (ٹک کر) بیٹھ گئے۔ (ماخوذ از شیخ زادہ)

جہاد فرض کفایہ:

" وهو فرض کفایة ابتداؤه " جہاد کی ابتداء فرض کفایہ ہے۔ یعنی جب بعض حضرات کے جہاد کرنے سے مقصد حاصل ہو جائے تو فرض کفایہ ہے اگر بعض لوگ جہاد قائم کر لیں تو دوسرے حضرات

سے ساقط ہو جائے گا کوئی گنہگار نہیں ہوگا:

" والاثموا بترکه ای اثم الکل من المکلفین "

اگر کوئی بھی جہاد قائم نہ کرے تو تمام گنہگار ہو جائیں گے۔

" وایاک ان تتوهم ان فرضیته تسقط عن اهل الهند بقیام اهل الروم

بل یفرض علی الاقرب فالاقرب من العدو "

تم یہ وہم نہ کرنا کہ ہندوستان کے لوگ جہاد قائم کر دیں تو روم والوں سے جہاد ساقط ہو جائے گا ایسا نہیں بلکہ جو مسلمان کافروں کے قریب ہوں گے ان پر جہاد کرنا فرض کفایہ ہے۔ لہذا واضح ہو کہ ایران پر جہاد علیحدہ فرض کفایہ ہے اور پاکستان پر علیحدہ اور ترکی پر علیحدہ تمام ممالک کا یہی ضابطہ ہے۔

ماں، باپ کی خدمت اور جہاد:

جب تک جہاد فرض کفایہ کے درجہ میں ہوگا اس وقت تک ماں باپ کی اجازت کے بغیر جہاد کا حکم یہ ہے:

"لا یفرض علی صبی وبالغ له ابوان او احدهما لان طاعتهما فرض عین "

بچہ خواہ نابالغ ہو یا بالغ ہو جب اس کے باپ اور ماں موجود ہیں یا دونوں میں سے کوئی ایک موجود ہے تو اس پر جہاد فرض ہی نہیں بلکہ یہ اپنے ماں باپ کی خدمت کرے کیونکہ ان کی اطاعت اس پر فرض عین ہے۔ (درمختار)

دینی طلباء کرام توجہ فرمائیں:

" لان طاعتهما فرض عین " کے تحت شامی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ تجنیس میں ذکر ہے "والجهاد لم یتعین فکان مراعاة فرض العین اولی " ماں باپ کی خدمت فرض عین ہے اور جہاد اس پر معین نہیں، یعنی جہاد اس پر فرض عین نہیں لہذا فرض عین کی رعایت کرنا اولیٰ (بہتر) ہے۔

علامہ ابن ہمام رحمہ اللہ نے فرمایا ماں باپ جب خدمت گزاری کے محتاج ہوں تو ان کو چھوڑ کر جہاد میں جانا" انه یحرم " بیشک حرام ہے فتح القدیر کی اس وضاحت (کہ حرام ہے) پر صاحب

البحر الرائق نے اعتراض کیا ہے اور کہا ہے کہ حرام کہنا صحیح نہیں بلکہ " کراھة الخروج بلا اذنھما " ماں باپ کی اجازت کے بغیر جہاد پر جانا مکروہ ہے۔شامی فرماتے ہیں کہ صاحب البحر الرائق کا قول غلط ہے ان کو غلطی تجنیس کے قول ''اولیٰ'' سے لگی ہے شامی اپنا موقف یوں بیان فرماتے ہیں۔

" فان الاولی ھنا بمعنی الاقوی والارجح ای ان الاقوی مراعاۃ فرض العین لقوته ورحجانه علی فرض الکفایة فحیث ثبت انه فرض کان خلافه حراما "

تجنیس میں جولفظ " اولی " ذکر ہے اس کا مطلب ''زیادہ قوی ہونا اور راجح ہونا'' ہے مطلب یہ ہے کہ ماں باپ کی خدمت فرض عین ہے جس کی رعایت بنسبت فرض کفایہ کے زیادہ قوی اور زیادہ راجح ہے اس لئے یہی ثابت ہے کہ ماں باپ کی خدمت فرض عین ہے اسے ترک کرنا حرام ہے۔

(شامی ج ۳ ص ۲۴۱)

☆ بخاری شریف میں ہے ایک شخص نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور جہاد کی اجازت طلب کی آپ نے فرمایا " احی والداک قال نعم قال ففیھما فجاھد " کیا تمہارے والدین زندہ ہیں؟ تو اس نے عرض کیا ہاں (یارسول اللہ والدین زندہ ہیں) تو آپ نے فرمایا ان دونوں میں جہاد کرو (یعنی ان کی فرمانبرداری اور ان کی خدمت میں کوشش کرو یہی تمہارا جہاد ہے)۔

☆ " عن ابن عباس بن مرداس انه قال یا رسول اللہ انی ارید الجھاد قال الک ام قال نعم قال الزم امک فان الجنة تحت رجل امک "

ابن عباس بن مرداس فرماتے ہیں کہ انہوں نے عرض کیا یارسول اللہ بیشک میں جہاد کا ارادہ رکھتا ہوں تو آپ نے فرمایا کیا تمہاری ماں ہے؟ تو انہوں نے عرض کیا ہاں (ماں تو ہے) آپ نے فرمایا ماں کو لازم پکڑو (یعنی ماں کی خدمت کو لازم پکڑو) بیشک جنت تمہاری ماں کے پاؤں کے نیچے ہے۔

شامی فرماتے ہیں کہ دوسری حدیث یہ ہے'' الجنة تحت اقدام الامھات "جنت ماؤں کے قدموں کے نیچے ہے:

" اعلم تقبیل رجلھا او ھو کنایة عن التواضع لھا واطلقت الجنة علی

سبب دخولها"

حدیث پاک کا ایک معنی یہ ہوسکتا ہے ماں کے قدموں کو چومنا جنت میں جانے کا ذریعہ ہے اور دوسرا معنی یہ ہوسکتا ہے کہ ماں سے عاجزانہ طور پر پیش آنا جنت میں داخل ہونے کا سبب ہے اس سے پتہ چل گیا کہ ماں سے سخت کلامی، بیہودگی انسان کو جنت سے دور رکھے گی کاش کہ نوجوانوں کو یہ مسئلہ سمجھ آجائے۔ (از درمختار وشامی بزیادۃ ج ۳ ص ۲۴۱)

فائدہ : "وفیه لا یحل سفر فیه خطر الا باذنهما وما لا خطر فیه یحل بلا اذن ومنه السفر فی طلب العلم"

اسی بحث سے یہ مسئلہ بھی ثابت ہوگیا کہ تجارت، نوکری، حج اور عمرہ وغیرہ کے لئے سفر ماں باپ کی اجازت کے بغیر جائز ہے جب کہ اس میں خطرہ نہ ہو اگر اس کے ضائع ہوجانے یعنی دشمنوں کے قتل کردینے کا خطرہ ہو تو ماں باپ کو حق پہنچتا ہے کہ اولاد کو روک دیں اس خطرہ والی صورت میں ماں باپ کی اجازت کے بغیر جانا جائز نہیں ہوگا۔

خیال رہے کہ جب تک حج میں جانا کفار وغیرہ کے حملہ اور قتل وغارت سے خالی نہ ہو اس وقت تک حج فرض نہیں ہوتا۔ یہی حکم علم کی طلب میں سفر کا بھی ہے کہ اگر خطرہ نہ ہو اور ماں باپ خدمت گزاری کے محتاج نہیں تو علم حاصل کرنے کے لئے سفر کرے اور اگر ایسے علاقہ میں جانے کا ارادہ ہو جہاں کفار، فساق اور بدمعاش لوگوں کا خطرہ ہو کہ وہ جان سے مار ڈالیں گے اعضاء کاٹ دیں گے تو وہاں ماں باپ کی اجازت کے بغیر نہ جائے بلکہ راقم کے نزدیک وہاں سرے سے جانا ہی منع ہے۔
(ماخوذ از درمختار، و شامی ج ۳ ص ۲۴۱)

عورت اور غلام اور معذور لوگوں کا جہاد میں حکم:

جب تک جہاد فرض کفایہ کے درجہ میں ہو اس وقت عورت جہاد کے لئے نہ جائے کیونکہ خاوند کا حق خدمت فوت ہوگا ہاں اگر خاوند اجازت دے اور ضرورت محسوس کرے تو کسی حد تک جواز ہوگا۔ (کچھ مزید تفصیل انشاء اللہ آگے آئے گی) غلام مولی کی اجازت کے بغیر جہاد میں شریک نہیں ہوسکتا کیونکہ اس کے جہاد میں جانے سے مولی کی خدمتگزاری کا حق ضائع ہوتا ہے۔ معذور لوگ نابینا، لنگڑا اور ہاتھ پاؤں وغیرہ کٹے ہوئے ہوں ایسے لوگوں پر جہاد فرض نہیں۔ (درمختار، شامی)

مسئلہ : "ومدیون بغیر اذن غریمه" مقروض شخص قرض خواہ کی اجازت کے بغیر جہاد میں شریک نہیں ہوسکتا فقہاء کرام کی مختلف عبارات سے جامع مسئلہ یہ ہے کہ اگر ایک شخص پر قرض ادا کرنا اب لازم ہو تو وہ بغیر قرض خواہ کی اجازت کے جہاد میں نہیں جاسکتا اجازت سے اسوقت جاسکتا ہے جب صحیح لوٹنے کی غالب امید ہو یا قرض خواہ اس کی شہادت پر قرض معاف کرنے کا وعدہ کرے یا اتنا ترکہ ہو کہ قرض ادا کیا جاسکے گا۔ اگر قرض ادا کرنے میں وقت موجود ہے اور اسکے زندہ سلامت لوٹنے کی بھی امید ہے یا ترکہ سے قرض ادا کرنے کی صلاحیت ہے تو قرض خواہ کی اجازت کے بغیر جانا جائز ہے

فائدہ : "وعالم لیس فی البلدة افقه فلیس له الغز وخوف ضیاعهم"

اگر ایک شخص عالم فقہی مسائل پر عبور رکھتا ہو اس شہر میں اس سے بڑھ کر کوئی فقہ کا عالم نہیں تو جب تک جہاد فرض کفایہ کے درجہ میں ہے وہ جہاد میں شریک نہ ہو کیونکہ اس کے شہید ہونے سے شہر کے تمام لوگ فقہی مسائل سے محروم ہو کر ضائع ہوجائیں گے۔ (درمختار)

جہاد فرض عین کب ہے؟

"وفرض عین ان هجم العدو فیخرج الکل ولا بلا اذن ویاثم الزوج ونحوه بالمنع"

جب کفار اچانک حملہ کردیں اور ان کا ہجوم ہو کثیر تعداد میں ہوں تو اس وقت جہاد فرض عین ہو جاتا ہے یعنی ہر شخص پر جہاد فرض ہو جاتا ہے بغیر اجازت کے جہاد کے لئے نکل پڑیں۔ جب جہاد فرض

عین ہوتو خاوند اپنی زوجہ کو منع کرے یا مالک اپنے غلام کو منع کرے یا والدین اپنی اولاد کو منع کریں تو وہ گنہگار ہوں گے۔

ہاں البتہ یہ خیال رہے کہ جہاد فرض عین تدریجاً (درجہ بدرجہ) ہوگا یعنی پہلے ان لوگوں پر فرض عین ہوگا جو قریب ہوں گے اگر قریب والے عاجز ہو جائیں کفار کا دفاع نہ کرسکیں یا سست ہو جائیں کفار کا مقابلہ نہ کریں تو جو ان کے قریب ہوں گے ان پر جہاد فرض عین ہوگا اسی طرح اگر یہ عاجز آ جائیں یا اپنی کاہلی (سستی) کی وجہ سے جہاد میں شریک نہ ہوں تو پھر جو ان کے قریب ہوں ان پر جہاد فرض ہو جائے گا۔

”حتی یفترض علی هذا التدریج علی کل المسلمین شرقا وغربا“

یہاں تک کہ اسی طرح درجہ بدرجہ تمام مسلمانوں پر جہاد فرض عین ہو جائے گا یعنی مشرق ومغرب (شمال وجنوب) میں بسنے والے تمام مسلمانوں پر جہاد فرض عین ہو جائے گا۔

فائدہ : ”ویجب ان لا یأثم من عزم علی الخروج وقعوده لعدم خروج الناس وتکاسلهم او قعود السلطان او منعه“

جب جہاد فرض عین ہو جائے تو ایک شخص جہاد میں جانے کا پختہ ارادہ رکھتا ہے لیکن اور کوئی جہاد کے لئے نہیں نکلتا اس لئے کہ لوگ سست ہو گئے ہیں یا مسلمانوں کا بادشاہ ہی ڈر کر بیٹھ جائے یا مسلمانوں کو جہاد سے منع کرے تو ایسی صورت میں وہ شخص گنہگار ہو گا جو جہاد کا مصمم ارادہ (پکا ارادہ) رکھتا ہے۔

تنبیہ : ”وفی البزازیة مسلمة سبیت بالمشرق وجب علی اهل المغرب تخلیصها من الاسر“

فتاوی بزازیہ میں مذکور ہے کہ اگر مسلمان عورت مسرق میں کفار کی قید میں آ جائے تو مغرب والوں پر لازم ہے کہ اسے قید سے آزاد کروائیں۔

محمد بن قاسم نے مغرب میں ایک مظلوم عورت کی آواز مشرق سے سنی تو عرب کی سرزمین سے سندھ میں آ گیا۔ کہاں محمد بن قسم کی یاد میں مجالس کا قیام، تعریف وتقاریر اور اخبارات میں مضامین اور کہاں مسلمانوں کے خلاف نصاری کا ساتھ دینا یہ دوغلہ پالیسی ایک نام نہاد مسلمان تو کرسکتا ہے حقیقی

مسلمان کا یہ شیوہ نہیں کہ وہ یہودیوں اور نصارانیوں کا ساتھی بن جائے اور مسلمانوں کو اور مسلمانوں کی عورتوں اور بچوں کو ذبح کرادے۔

مسئلہ : جس طرح جہاد کے فرض عین ہونے پر عورت بغیر خاوند کی اجازت کے اور غلام بغیر مالک کی اجازت کے اور مقروض بغیر قرض خواہ کی اجازت کے جہاد میں شریک ہوں:

" وکذلک الغلمان الذین لم یبلغوا اذا اطاقو القتال فلا بأس بان یخرجوا ویقاتلوا فی النفیر العام وان کرہ ذلک الآباء والامہات "

اسی طرح وہ بچے جو بالغ تو نہیں ہوئے لیکن جہاد کرنے کی طاقت رکھتے ہوں ان کے جہاد میں شریک ہونے میں کوئی حرج نہیں بلکہ وہ عام لڑائی میں چلے جائیں اگرچہ ان کے ماں باپ اسے ناپسند ہی کیوں نہ سمجھیں۔ (درمختار، شامی ج ۳ ص ۲۴۲)

جہاد کے لئے چندہ جمع کرنا:

" وکرہ الجعل ای اخذ المال من الناس لاجل الغزاۃ مع الفیٔ ای مع وجود شئی فی البیت المال والفیٔ ھنا یعم الغنیمۃ والا لا لدفع الضرر الا علی بالادنی "

غازیوں کے لئے لوگوں سے مال طلب کرنا اس وقت مکروہ ہے جب مسلمانوں کے بیت المال میں مال موجود ہو خواہ مال فے ہو یا مال غنیمت ہو اور اگر بیت المال میں مال نہیں تو پھر لوگوں سے مال طلب کیا جاسکتا ہے اگرچہ لوگوں سے مال مانگنا بھی بظاہر عیب اور نقصان ہے لیکن کافروں کا مسلمانوں پر غالب آنا اور ہی باعث ضرر ہے اس لئے چندہ حاصل کرنا معمولی ضرر ہے لہذا معمولی ضرر سے کفار کا زیادہ ضرر دور کرنا ضروری ہے۔ (درمختار)

تنبیہ : جو شخص جہاد کرنے پر قادر ہو اور اس کے پاس مال بھی ہو تو اس پر جہاد فرض ہوگا اور لوگوں سے مال حاصل کرنا منع ہوگا۔ اور جو شخص خود جہاد کرنے پر تو قادر نہیں لیکن اس کے پاس مال ہے تو وہ دوسرے شخص کی مالی معاونت کرکے جہاد پر بھیجے جس کے پاس مال نہیں اور جب بادشاہ مالی معاونت کرے تو لوگوں سے مالی تعاون حاصل نہ کیا جائے۔

اور جب ایک شخص جہاد کرنے کی طاقت رکھتا ہو خود جہاد کے لئے نہ جائے حالانکہ جہاد فرض عین ہو چکا ہے خود گھر بیٹھ جائے اور اپنی طرف سے دوسرے شخص کو مال دے کر جہاد پر بھیج دے'' فلا یجوز لانہ استجار علی الجھاد ''تو یہ جائز نہیں کیونکہ کرایہ کا جہاد جائز نہیں ہاں یہ نہ کہے کہ تم مال لے کر میری طرف سے جہاد کرو صرف جہاد کے لئے مالی معاونیت کرے تو جائز ہے۔ اور یہ بھی خیال رہے کہ غازی کو اتنا مال گھر چھوڑنا بھی ضروری ہے جو اس کی واپسی تک اس کے اہل وعیال کو کفایت کرے۔

(از شامی ج ۳ ص ۲۴۲)

مسئلہ: اگر ہم کفار کا محاصرہ کریں تو دیکھا جائے اگر ان کو دعوت اسلام پہلے نہیں دی گئی تو واجب ہے کہ ان کو دعوت اسلام دی جائے اور اگر ان کو دعوت اسلام پہلے دی جا چکی ہے تو پھر بھی مستحب ہے کہ ان کو دعوت اسلام دی جائے اگر وہ اسلام لے آئیں تو بہتر اگر وہ اسلام نہیں لائے لیکن جزیہ دینے کو قبول کرتے ہوں تو ان پر جزیہ مقرر کر دیا جائے تو پھر ہم پر لازم ہو جائے گا کہ ہم ان سے وہی انصاف کریں جو مسلمانوں سے کرتے ہیں اور ان کو وہی انصاف دلائیں جو انصاف مسلمانوں کو دلاتے ہیں ان کے مال اور جانوں کی حفاظت ہم پر لازم ہو گی یعنی ان کو ناحق قتل نہیں کیا جائے گا اور ان کا مال غصب نہیں کیا جائے گا۔ اگر وہ جزیہ ادا کرنا بھی نہ قبول کریں تو ان کو قتل کر دیا جائے۔ (از درمختار، شامی)

خصوصی مقام توجہ:

" ویجب علی الامام ان یبعث سریة الی دار الحرب کل سنة مرة او مرتین وعلی الرعیة اعانته الا اذا اخذ الخراج فان لم یبعث کان کل الاثم علیه وھذا اذا غلب علی ظنه انه یکافئھم والا فلا یباح قتالھم بخلاف الامر بالمعروف" (شامی ج ۳ ص ۲۳۹)

مسلمانوں کے حاکم پر واجب ہوتا ہے کہ وہ ہر سال ایک مرتبہ یا دو مرتبہ دار حرب میں اپنا لشکر بھیجے جو کافروں سے جنگ کریں اور رعیت پر بھی لازم ہے کہ وہ امام کے حکم کی فرمانبرداری کریں۔ ہاں اگر امام رعیت سے ٹیکس بھی لے کر جہاد کے لئے یہ ٹیکس دو اور جہاد میں بھی چلو تو رعیت حاکم کے حکم کو نہ مانے اگر مسلمانوں کا حاکم ہر سال ایک یا دو مرتبہ کفار کی طرف اپنا لشکر نہیں بھیجتا تو حاکم اور رعیت تمام

گنہگار ہوں گے۔

ہاں یہ خیال بھی رکھا جائے کہ ہر سال لشکر بھیجنا اس وقت واجب ہوگا جب مسلمانوں کے حاکم کو معلوم ہو کہ ہم غالب رہیں گے لیکن اگر معلوم ہو کہ ہم کفار کو تو کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتے بلکہ اپنے آپ کو تباہ کر دیں گے تو ایسی صورت میں جنگ چھیڑنا منع ہوگا البتہ کفار کو زبان سے اسلام کی حقانیت، دین اسلام کی افادیت اور اللہ تعالیٰ کی وحدانیت اور محمد مصطفیٰ ﷺ کی رسالت اور اقامت قیامت اور عبادت وغیرہ کی تبلیغ کرتے رہیں۔

مسلمانوں کا کفار سے صلح کرنا:

"ویجوز الصلح علی ترک الجهاد معهم بمال منهم اومنا لو خیرا لقوله تعالیٰ وان جنحوا للسلم فاجنح لها"

مسلمانوں کا حاکم جب جنگ نہ کرنے میں اپنی اور مسلمانوں کی بہتری سمجھے تو جہاد کو چھوڑ کر کفار سے صلح کرلے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا اگر وہ صلح کی طرف میلان کریں تو تم بھی صلح پر آمادہ ہو جاؤ۔

دینی طلباء کرام توجہ فرمائیں:

"وفی المصباح والسلم بالکسر والفتح الصلح یذکر ویؤنث"

مصباح میں یہ ذکر کیا گیا ہے کہ سلم کے سین پر فتح اور کسرہ دونوں جائز ہیں معنی اس کا صلح کرنا یہ لفظ مذکر اور مؤنث دونوں طرح استعمال ہوتا ہے "فاجنح لها" میں "ها" ضمیر مؤنث لائی گئی جو "سلم" کی طرف لوٹ رہی ہے کیونکہ اس میں تانیث کا اعتبار کیا گیا ہے۔

پھر سے مسئلہ کی طرف توجہ: کفار سے مال لے کر صلح کرنے کا مطلب یہ ہے کہ جنگ کے حالات پیدا ہو گئے تو ایک دوسرے نے اپنے قاصد بھیجے مسلمانوں کو جب جنگی برتری حاصل ہوئی تو یہ ان سے مال لے کر صلح کرلیں کہ مسلمانوں کا فائدہ اس میں ہے کہ زیادہ تباہی سے بچ جائیں تو یہ بھی جائز ہے۔ اور اگر مسلمانوں کو برتری حاصل نہیں جنگ میں زیادہ بربادی ہو تو مسلمانوں کے لئے یہ بھی جائز ہے کہ مال دے کر صلح کرلیں:

" ان نصلح بمال نعطیه لهم ان خاف الامام الهلاک علی نفسه والمسلمین بای طریق کان "

لیکن یہ خیال رہے کہ کفار سے صلح اس وقت جائز ہے جب مسلمانوں کا اس میں فائدہ ہو ان کو اس میں مصلحت نظر آئے کفار کی چالبازیوں اور دھوکا بازیوں اور غداریوں سے مسلمان غافل نہ ہوں۔ مسلمان وقتی مصلحت کے لئے صلح کر لیں لیکن اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد سے غافل نہ رہیں۔ ﴿وَاَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ﴾ تم ان کافروں کے لئے تیاری رکھو جتنی تم طاقت رکھتے ہو۔

کفار اگر وعدہ کا پاس نہ کریں تو مسلمان بھی وعدہ توڑ دیں:

نبی کریم ﷺ نے کفار سے دس سال کے لئے صلح کی اور معاہدہ کیا لیکن جب کفار مکہ نے وعدہ کو توڑ دیا تو اللہ تعالیٰ نے آپ کو بھی حکم دے دیا کہ اب آپ پر بھی وعدہ کی پابندی لازم نہیں رہی ایسا نہ ہو کہ مسلمان وعدہ کی پابندی کا خیال کرتے رہیں اور کفار وعدہ کو توڑ کر ان کی سرکوبی کرتے رہیں ہاں جب وہ وعدہ توڑ دیں تو مسلمانوں کو چاہئے کہ ان کو قتل کر دیں۔ (ماخوذ از شامی ج ۳ ص ۲۴۷)

اسلامی جہاد اور کفار کی جنگ میں فرق:

اسلامی جہاد میں کفار کی سرکوبی کا حکم بھی اسلام نہ قبول کرنے پر اور جزیہ نہ قبول کرنے پر ہے مقصد کفار کو ذلیل کرنا نہیں بلکہ اسلام کی سربلندی مقصود ہے۔ اسلامی جہاد میں ظلم کرنے سے منع کیا گیا ہے رب تعالیٰ نے فرمایا ﴿وَلَا تَعْتَدُوْا اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِيْنَ﴾ اور تجاوز نہ کرو بیشک اللہ تعالیٰ تجاوز کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔

☆ " عن عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنهما قال نهى رسول اللہ ﷺ عن قتل النساء والصبیان " (بخاری ومسلم، ترمذی ابن ماجہ ابوداؤد، مشکوۃ کتاب الجهاد)

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے عورتوں اور بچوں کو قتل کرنے سے منع فرمایا۔

عورتوں کے قتل کا حکم:

عورتوں کو قتل کرنے سے اس وقت نبی کریم ﷺ نے منع فرمایا جب آپ نے ایک عورت کو مقتول پایا لیکن یہ حکم اس وقت ہے جب عورتیں جنگ میں کسی طرح بھی نہ شریک ہوں لیکن ''ان قاتلن قتلن '' اگر وہ جنگ میں قتال کر رہی ہوں تو ان کو قتل کر دیا جائے۔

عورت کی جنگ میں اگر مالی امداد ہو تو پھر بھی عورت کو قتل کر دیا جائے۔ اور اگر وہ زبان سے یعنی تقریر سے مردوں کو جنگ پر ابھار رہی ہے تو پھر بھی اسے قتل کر دیا جائے اور اگر وہ اشعار اور گانوں سے مردوں کو جنگ پر ابھار رہی ہو تو پھر بھی اسے قتل کر دیا جائے۔

'' قال سحنون فی حالة المقاتلة وبعدها '' سحنون رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ان صورتوں میں عورت کو جنگ میں بھی قتل کیا جائے جنگ کے بعد بھی۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ جنگ میں قتال کرنے والوں کو قتل کرنے کا حکم اللہ تعالیٰ نے عام فرمایا ہے

﴿ وَقَاتِلُوْ فِیْ سَبِیْلِ اللهِ الَّذِیْنَ یُقَاتِلُوْنَکُمْ ﴾

''اور لڑائی کرو (قتل کرو) اللہ کی راہ میں ان لوگوں سے جو تمہارے ساتھ قتال کرتے ہیں''

اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ وَاقْتُلُوْهُمْ حَیْثُ ثَقِفْتُمُوْهُمْ ﴾ ''اور ان (کافروں) کو قتل کرو جہاں ان کو پاؤ۔

اسی طرح عورت جب کفار کی ملکہ ہو یا صدر یا وزیرہ عظمیٰ (وزیر اعظم) ہو تو اسے قتل کر دیا جائے کیونکہ جنگ تو اسی نے برپا کر رکھی ہے۔

بچوں کو قتل نہ کیا جائے:

نبی کریم ﷺ نے کافروں کے بچوں کو بھی قتل کرنے سے منع فرمایا ہے لیکن بچے بھی اگر جنگ میں قتل کر رہے ہوں تو ان کو قتل کر دیا جائے کیونکہ وہ جنگ میں شریک ہیں اسی طرح اگر نابالغ بچہ ان کا بادشاہ یا صدر یا وزیر اعظم ہو تو اسے بھی قتل کر دیا جائے۔

راہبوں کو نہ قتل کیا جائے:

یہود ونصاری میں راہب وہ ہوتے ہیں جو دنیا سے کنارہ کش ہوتے ہیں دنیا والوں سے ان کا تعلق نہیں ہوتا اسی طرح ہندوؤں میں جوگی ان کو جنگ میں قتل نہ کیا جائے اور نہ ہی ان کو غلام بنایا جائے
حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے یزید بن سفیان رضی اللہ عنہ کو فرمایا:
"وستجد اقواما زعموا انهم حبسوا انفسهم لله فذرهم وما زعموا انهم حبسوا انفسهم له"
کہ تم ایسے لوگوں کو پاؤ جو دنیا سے کنارہ کش ہو کر اپنے گمان کے مطابق وہ اللہ کی عبادت میں مشغول ہوں تو ان کو چھوڑ دو اور ان کے لئے ضرورت کے مطابق رزق چھوڑ دیا جائے۔ ہاں اگر یہ راہب لوگ بھی قتال میں شریک ہوں یا انہوں نے اپنے عبادت خانوں میں اور کافروں کو بھی ساتھ رکھا ہوا ہے جن کو یہ قتال کی ترغیب دے رہے ہیں یا وہ دوسرے کافران کی وجہ سے اپنا بچاؤ چاہتے ہیں تو ان راہبوں کو بھی قتل کر دیا جائے۔

معذور لوگوں کو قتل نہ کیا جائے:

معذور لوگوں کو اس وقت تک قتل نہ کیا جائے جب تک ان کی طرف سے مسلمانوں کو تکلیف نہ ہو اگر معذور لوگ بھی جنگ میں کافروں کو جنگی تدابیر بتا رہے ہوں اور جنگ میں کسی طرح معاونت کر رہے ہوں تو ان کو بھی قتل کر دیا جائے۔

بوڑھوں کو قتل نہ کیا جائے:

جنگ میں بوڑھے کافروں کو قتل نہ کیا جائے:" ان کان شیخ کبیرا هو مالا یطیق القتال" لیکن اس وقت جب کہ وہ اتنے بوڑھے ہوں کہ وہ جنگ کرنے کی طاقت ہی نہیں رکھتے۔ "ولا ینتفع به فی رأی ولا مدافعة فانه لا یقتل" اور نہ ہی ان کی رائے پر جنگ میں کوئی عمل ہو رہا ہو اور نہ ہی ان میں دماغ کی صلاحیت ہو تو ایسی صورت میں بوڑھوں کو قتل نہیں کیا جائے گا۔ اگر بوڑھے کافر جنگ میں اپنی رائے دے رہے ہوں یا دفاع کر رہے ہوں یا قتال کر رہے ہوں یا بوڑھا

شخص ان کا حاکم ہو تو ایسی صورت میں بوڑھے کو بھی قتل کر دیا جائے گا۔

معتوہ (نیم پاگل) کو قتل نہ کیا جائے:

جو شخص کسی وقت پاگلوں والی باتیں کرتا ہے کسی وقت عقل مندوں والی باتیں کرتا ہے اس کو جنگ میں قتل نہ کیا جائے ہاں اگر وہ قتال میں شریک ہے یا ان کا سربراہ مملکت ہے تو اسے بھی قتل کر دیا جائے۔

خادم کو قتل نہ کیا جائے:

" عن رباح بن الربيع قال كنا مع رسول الله ﷺ في غزوة فرأى الناس مجتمعين على شئي فبعث رجلا فقال انظر على ما اجتمع هؤلاء فجاء فقال على امرأة قتيل فقال ما كانت هذه لتقاتل وعلى المقدمة خالد بن الوليد فبعث رجلا فقال قل لخالد لا تقتل امرأة ولا عسيفا " (رواه ابو داؤد ، مشكوة باب القتال في الجهاد)

رباح بن ربیع رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ہم رسول اللہ ﷺ کے ساتھ ایک غزوہ میں تھے تو آپ نے لوگوں کو دیکھا کہ وہ کسی چیز پر جمع ہیں آپ نے ایک شخص کو بھیجا کہ دیکھو وہ لوگ کیوں جمع ہیں؟ وہ شخص آئے تو کہا کہ وہ ایک مقتول عورت پر مجتمع ہیں تو آپ نے فرمایا اس عورت کو قتل نہیں کیا جانا تھا۔ آگے والے لشکر کے قائد حضرت خالد بن ولید تھے تو نبی کریم ﷺ ایک شخص کو بھیجا کہ ان کو کہو کسی عورت اور خادم کو قتل نہ کرو۔

" ولا عسيفا اى اجيرا وتابعا للخدمة ولعل علامته ان يكون بلاسلاح "
(مرقاة ج ۷ ص ۳۶۲)

عسیف کا معنی خادم اور تابعدار ہے جو خدمت کے لئے مقرر کیا جائے اس وقت ان کی علامت یہ ہوتی تھی کہ ان کے پاس کوئی ہتھیار نہیں ہوتا تھا۔ مطلب اس میں بھی یہی ہے کہ نوکر صرف خدمت کے لئے میدان جنگ میں ہو وہ خود لڑائی نہیں کر رہا اور کوئی مشورہ نہیں دے رہا تو اسے قتل نہ کیا جائے اور اگر جنگ کرنے میں کسی قسم کا بھی تعاون کر رہا ہے تو اسے قتل کر دیا جائے۔

کفار کے اعضاء نہ کاٹے جائیں:

" عن بریدة قال کان رسول الله ﷺ اذا امر امیرا علی جیش او سریة اوصاه فی خاصته بتقوی الله ومن معه من المسلمین خیرا ثم قال اغزوا بالله فی سبیل الله قاتلوا من کفر بالله اغزوا ولا تغلوا ولا تعتدوا ولا تمثلوا ولا تقتلوا ولیدا " (مسلم)

حضرت بریدہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ جب کسی لشکر پر امیر مقرر فرماتے تھے تو اسے خصوصی طور پر نصیحت فرماتے کہ اللہ تعالیٰ سے تقوی رکھنا یعنی رب تعالیٰ سے ڈرتے رہنا۔ اور اپنے مسلمان ساتھیوں سے بہتر سلوک رکھنا پھر آپ فرماتے اللہ تعالیٰ کی امداد سے اللہ تعالیٰ کی راہ میں جہاد کرو جو شخص اللہ تعالیٰ سے کفر کرنے والا ہوا سے قتل کر دو۔ جہاد کرو اور مال غنیمت میں خیانت نہ کرو، اور تجاوز نہ کرنا اور کفار کو مثلہ نہ بنانا (یعنی ان کے اعضاء نہ کاٹو اور ان کی شکلیں نہ بگاڑو) اور بچوں کو قتل نہ کرو۔
(از خازن)

غدر سے منع فرمایا: کفار سے وعدہ کر کے کہ ہم تم سے جنگ نہیں کریں گے پھر اچانک ان پر حملہ کر کے ان کو قتل کرنا حرام ہے اسے غدر کہا جاتا ہے۔

☆ " عن ابن عمر قال قال رسول الله ﷺ اذا جمع الله الاولین والآخرین یوم القیامة یرفع لکل غادر لواء فقیل هذه غدرة فلان بن فلان " (مسلم ج ۲ ص ۹۱ باب تحریم الغدر)

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جب اللہ تعالیٰ اولین و آخرین کو قیامت کے دن جمع کرے گا تو ہر غدر کرنے والے کا جھنڈا بلند کیا جائے گا تو بتایا جائے گا یہ شخص فلاں ابن فلاں کا غدر ہے۔

حدیث پاک کا مطلب واضح ہے کہ جنگ میں وعدہ کر کے اس کے خلاف دھوکا بازی حرام ہے لیکن پہلے ذکر کیا جا چکا ہے کہ کفار اگر وعدہ کو توڑ دیں تو مسلمانوں پر بھی وعدہ کی پابندی ختم ہو جاتی ہے۔

جنگی چالبازی جائز ہے:

" عن ابی هریرة قال قال رسول الله ﷺ الحرب خدعة "

''حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جنگ چالبازی ہے''۔

وضاحت:

" خدعة (بفتح الخاء وسكون الدال ، بضم الخاء واسكان الدال ،
بضم الخاء وفتح الدال "

" خدعة " کا معنی ہے دھوکا دینا یعنی کفار کو جنگ میں دھوکا دینا جائز ہے:

" كيف امكن الخدع الا ان يكون فيه نقض العهد او امان فلا يحل "

جس طرح بھی ممکن ہو کفار کو جنگ میں دھوکا دیا جائے البتہ وعدہ کر کے توڑنا اور کسی کو امن دے کر قتل کرنا حلال نہیں۔ جنگ میں دھوکا دینے سے مراد جنگی چالبازی ہی ہے کہ فوجیں ایک طرف کھڑی کی جائیں وہ سمجھیں فوجیں ادھر ہیں لیکن حملہ دوسری جانب سے کرا دیا جائے اس طرح کی ہر قسم کی چالبازی جائز ہوگی۔

کفار کی جنگ: ابھی تک بیان کردہ مضمون سے قارئین کرام نے واضح طور پر سمجھ لیا ہوگا کہ مسلمانوں کو کفار سے جنگ کرنے میں ظلم کرنے سے منع کیا گیا ہے بلکہ احسان کرنے کا حکم دیا گیا ہے کیونکہ بچوں اور عورتوں وغیرہ کو قتل نہ کرنا احسان نہیں تو اور کیا ہے لیکن کفار کی جنگ میں سراسر ظلم ہی ظلم ہے۔

پہلے پارہ میں شیطانی وسوسہ کے اثرات غزالی دوراں علامہ سید احمد سعید کاظمی رحمہ اللہ کی تفسیر سے نقل کئے تھے ان میں سے ایک اقتباس کا اعادہ کیا جا رہا ہے اسی سے سمجھیں کہ کفار کی جنگ ظالمانہ ہے۔

شیطانی وسوسہ سے متاثر ہونے والا دوسرا گروہ وہ ہے جس میں جسمانی استعداد تو باقی رہی مگر شیطان کے بھٹکانے سے بھٹک گیا اور روحانی استعداد کو ضائع کر دیا اس لئے روحانی تقاضوں کو بروئے کار لانے سے وہ محروم ہو گیا معرفت الٰہیہ تو در کنار اللہ تعالیٰ کی ہستی سے بھی منکر ہو گیا اس نے صرف جسم اور مادہ کو اپنا مقصد سمجھ لیا اور اپنی بقیہ استعداد کا رخ مادیات کی طرف موڑ دیا وہ عقلی پیچیدگیوں میں گم ہو کر رہ گئے بعض نے جدید انکشافات اور مادی ایجادات میں بڑی کامیابی حاصل کر لی بیشمار مفید چیزیں ایجاد کیں فضاء میں اڑنے والے طیارے اور خلانورد سیارے کے ذریعے زمین و آسمان تک رابطے قائم کر لئے، حیرت انگیز آلات ایجاد کر لئے اب ان کی ترقی کا آخری مرحلہ ہے کہ انہوں نے بنی نوع

انسان کی ہلاکت کے لئے ہزاروں میل تک مار کرنے والے میزائل تیار کر لئے ایٹم بم، نیپام بم بنائے، آواز سے زیادہ تیز رفتار ہوائی جہاز تیار کئے جن کے ذریعے چند سیکنڈ میں روئے زمین کو ہلاکت خیز منظر میں تبدیل کیا جا سکتا ہے اور ایٹم بموں کے ذریعے کرۂ ارض (زمینی کرہ) کو آنکھ جھپکنے کی مقدار میں اڑا کر تباہ و برباد کر دینا آسان ہے۔

خلافت الٰہیہ کی وہ استعداد جو بنی نوع انسان کی جسمانی، روحانی، دنیوی اور اخروی فوائد کے لئے تھی اسے انسانوں کے ہلاک کر دینے والے آلات کے لئے وقف کر دیا گیا۔ اب معاملہ یہاں تک پہنچ چکا ہے کہ ان ہتھیاروں کو ایجاد کرنے والے خود اپنے آپ کو ان کی زد میں محسوس کر رہے ہیں انہیں ہر وقت یہ خطرہ لاحق ہے کہ ہمارے ایجاد کئے ہوئے آلات نہ معلوم کس وقت ہم پر پھٹ پڑیں اور کرۂ ارض کے ساتھ ہم بھی لقمہ اجل بن کر رہ جائیں۔

اس اقتباس کو ذرہ ہوش وحواس سے پڑھیں پھر خود انداز لگائیں کے کفار کے ایجاد کردہ آلات اور جنگ میں ظلم ہی ظلم ہے یا نہیں کیا انہوں نے کبھی سوچا کہ بچوں، عورتوں، بوڑھوں، عبادت گزاروں، معذوروں اور خدام کو نہیں قتل کرنا، کیا انہوں نے کبھی یہ خیال کیا کہ کسی کے اعضاء نہیں کاٹنے، انہوں نے تو صرف تباہی و بربادی کے آلات ایجاد کئے انہوں نے تو تمام مسلمانوں کو تباہ کرنے کے منصوبے تیار کئے۔

دہشت گرد کون؟

ذرا غور کیجئے دہشت گرد کون ہے؟ دہشت گرد یقیناً وہ ہے جو صرف ایٹم بم بنانے والا نہیں بلکہ دو مرتبہ ایٹم بم چلا چکا ہے۔ دہشت گرد وہ ہے جو فلسطینی مسلمانوں پر نصف صدی سے زائد عرصہ مظالم ڈھا چکا ہے ابھی تک ظلم کئے جا رہے ہیں عراق اور افغانستان کو برباد کر چکا ہے ابھی تک پھر بھی عراق اس کی آنکھ میں کھٹک رہا ہے پاکستان اور ایران پر بھی اس کی ناپاک نظریں لگی ہوئی ہیں وہی بڑا دہشت گرد اور بڑا ظالم ہے مسلمان اپنا دفاع کرنے والا، مسلمان اپنے مسلمان بھائیوں کو کفار کے چنگل سے آزاد کرانے میں تعاون کرنے والا کبھی دہشت گرد نہیں ہو سکتا۔

افسوس کہ مسلمانوں کے حکمران دہشت گردوں کے ساتھی بن کر مسلمانوں کو دہشت گرد کہنے لگ

گئے۔جن کی تربیت کی ان کو دہشت گرد کہنا ناانصافی ہے جن کو اپنے ساتھ ملا کر کئی سال روس سے جنگ کرائی ان کو عیسائیوں اور یہودیوں کے ہاتھوں برباد کرا دینا اور یہود و نصاری کا ساتھی بن جانا ظلم عظیم ہے۔مسلمان تجھے انصاف کرنا چاہیے لیکن افسوس تو ظالم بن گیا اے مسلمان تو مسلمان کا بھائی ہے افسوس کہ تو نصاری اور یہود و ہنود کا بھائی بن بیٹھا۔

مسلمان کفار سے انتقام لیں:

﴿ فَمَنِ اعْتَدٰى عَلَيْكُمْ فَاعْتَدُوْا عَلَيْهِ بِمِثْلِ مَا اعْتَدٰى عَلَيْكُمْ ﴾

''جو شخص زیادتی کرے تم پر، تم اس سے انتقام لو اس کی مثل جو اس نے زیادتی کی ہے تم پر''

تفسیر صاوی کے حوالہ سے پہلے بیان کیا جا چکا ہے کہ ﴿ فَاعْتَدُوْا عَلَيْهِ ﴾ کا مطلب یہ ہے تم ان سے انتقام لو لیکن کافروں کی زیادتی کے انتقام کو مشکلات کی وجہ سے زیادتی سے تعبیر کر دیا جس کا بظاہر مطلب یہ ہے کہ جو تم پر زیادتی کرے تم اس پر زیادتی کرو جیسا کہ اس نے تم پر زیادتی کی۔

تو اسی سے واضح ہو گیا کہ کافر اگر میزائل تم پر گرائیں تو تم بھی میزائلوں سے ان سے انتقام لو وہ توپوں کے گولے برسائیں تو تم بھی ایسی ہی جوابی کروائی کرو، وہ طیاروں سے لڑائی کریں تو تم بھی طیاروں سے لڑائی کرو وہ ایٹم بم گرائیں تو تم بھی ایٹم بم گراؤ۔

کافروں کے ظالمانہ رویہ کا بڑھ کر جواب دو کافروں کے ظلم کا جواب ظلم نہیں۔یہ اسی وقت ہو سکتا ہے جب سب مسلمان متحد ہو کر یہود و نصاری کو سبق سکھائیں ایک اسلامی ملک کو تباہ کرانے میں مسلمان بھی یہود و نصاری کے ہمنوا بن جائیں تو کس طرح ان کفار کا مقابلہ کیا جائے۔اے مسلمانو جاگ جاؤ، ذرا ہوشیار ہو جاؤ، خواب غفلت میں نہ رہو، کفار کے دام فریب میں نہ آؤ، اسلامی احکام پر عمل کرو پھر کامیابی تمہارے قدم چومے گی۔

" وترى الامة الاسلامية لما كانت تعظم الأعمال الدينية وترعاها حق رعايتها غلبت اعداء ها فلما تفرقت اهوائها وخضدت شوكتها تخطفتها الاعداء من كل جانب ، فان الناس اذا استعبد والشهواتهم وذلوا لا هوائهم تفرقت كلمتهم وذهبت ريحهم وذاق بأس بعضهم

بأس بعض " (جواهر طنطاوی)

امت اسلامیہ کے ماضی کی طرف جھانک کر دیکھو، تاریخ کا مطالعہ کرو تو تمہیں پتہ چلے گا کہ جب تک دینی اعمال کی عظمت کا مسلمان پاس کرتے رہے تو دشمن پر غالب رہے جب ان کی خواہشات بکھر گئیں ان کا دبدبہ جاتا رہا تو ہر طرف سے دشمن ان کو گدھوں کی طرح نوچ رہے ہیں بیشک لوگ جب اپنی خواہشات کی وجہ سے غلام بن گئے اور اپنی خواہشات کی وجہ سے ذلیل ہو گئے تو ان کی اجتماعیت ختم ہو گئی جتنے منہ اتنی باتیں ہونے لگیں، ان کے رعب اور دبدبہ کی ہوا اڑ گئی، ان کی بہادری کا چرچا جاتا رہا اور لوگوں کے رعب میں آ گئے جو ان کو اپنا تر نوالہ بنا رہے ہیں۔

جہاد قیامت تک جاری رہے گا:

نبی کریم ﷺ نے فرمایا " الجهاد ماض الى يوم القيامة " جہاد قیامت تک جاری رہے گا اسی سے یہ بھی واضح ہو گیا کہ جہاد منسوخ نہیں ہوا کیونکہ نبی کریم ﷺ کا مندرجہ بالا ارشاد گرامی جب قیامت تک کے متعلق ایک حکم کو ثابت کر رہا ہے تو منسوخ کس نے کرنا تھا۔

☆ " وعن جابر بن سمرة قال قال رسول الله ﷺ لن يبرح هذا الدين قائما يقاتل عليه عصابة من المسلمين حتى تقوم الساعة " (رواه مسلم، مشكوة كتاب الجهاد)

حضرت جابر بن سمرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا یہ دین ہمیشہ قائم رہے گا مسلمانوں کی ایک جماعت جہاد کرتی رہے گی یہاں تک کہ قیامت قائم ہو جائے گی۔

وضاحت حدیث: " يقاتل عليه " میں " على " مذکور ہے جو دلالت کر رہا ہے کہ یہ جملہ " يظاهر " کے معنی کو متضمن ہے معنی ہو گیا:

" يظاهرون بالمقاتلة على اعداء الدين يعنى ان هذا الدين لم يزل قائما بسبب مقاتلة هذه الطائفة "

کہ جب تک مسلمانوں کی کوئی نہ کوئی جماعت جہاد کرتی رہی تو دین قائم رہے گا۔ اور یہ بھی نبی کریم ﷺ کے ارشاد سے واضح ہے کہ مسلمانوں کی کوئی نہ کوئی جماعت قیامت تک جہاد کرتی رہے گی اور قیامت تک دین قائم رہے گا۔

" لا یخلو وجہ الارض من الجھاد ان لم یکن فی ناحیۃ یکون فی ناحیۃ اخری "

یعنی زمین جہاد سے خالی نہیں رہے گی اگر زمین کے ایک علاقے میں جہاد نہیں ہوگا تو دوسرے علاقے میں جاری رہے گا۔ (مرقاۃ ج ۷ ص ۲۷۵)

جہاد اصغر اور جہاد اکبر:

جہاد کا لغوی معنی ہے مشقت اٹھانا، لغت کی کتاب مغرب میں ذکر کیا گیا ہے " جھدہ حملہ فوق طاقتہ " جب کوئی شخص طاقت سے زائد بوجھ اٹھائے تو کہا جاتا ہے " جھدہ " پھر غالب طور پر اس کا استعمال کفار کے ساتھ جنگ کرنے پر ہونے لگا۔ اب شرعی طور پر اس معنی میں استعمال ہونے لگا:

" بذل المجھود فی قتل الکفار مباشرۃ او معاونۃ بالمال "

کفار سے قتال میں اپنی جان پیش کرنا یا مالی معاونت سے کوشش کرنا۔ اور کہا جاتا ہے "جاھدت العدو اذا قابلتہ فی نحمل الجھد" کہ میں نے دشمن سے جہاد کیا یعنی خوب کوشش کی اور مشقت برداشت کی۔

" وھو دعوتھم الی الدین الحق وقتالھم ان لم یقبلوا "

جہاد دین حق کی طرف دعوت دینا ہے اور اگر کفار دین حق کی دعوت کو نہ قبول کریں تو ان سے قتال (لڑائی) کرنا ہے:

" وفضل الجھاد عظیم وکیف وحاصلہ بذل اعز المحبوبات وادخال اعظم المشقات علیہ وھو نفس الانسان ابتغآء مرضاۃ اللہ وتقربا بذلک الیہ تعالیٰ "

اور جہاد میں بہت بڑی فضیلت پائی گئی ہے اس فضیلت کی اصل وجہ واضح ہے کہ اس پر عظیم محبوب چیز یعنی اپنی جان کو اللہ تعالیٰ کی رضاء مندی حاصل کرنے کے لئے اور اللہ تعالیٰ کا تقرب حاصل کرنے کے لئے پیش کیا جاتا ہے اور بہت بڑی مشقت کو برداشت کیا جاتا ہے لیکن اس سے بھی زیادہ فضیلت کس میں ہے؟

" واشق منه قصر النفس علی الطاعات فی النشاط و دفع الکسل علی الدوام و مجانبة اهویتها "

اور جہاد سے بھی زیادہ اس میں مشقت پائی جاتی ہے کہ ہمیشہ اپنے نفس کو چستی سے عبادات وطاعت میں لگایا جائے اور اپنی خواہشات نفسانیہ سے مکمل طور پر اجتناب کیا جائے اس کے مشقت آمیز ہونے کی وجہ سے ہی تو نبی کریم ﷺ نے جہاد سے واپس لوٹتے ہوئے ارشادفرمایا" رجعنا من الجهاد الاصغر الی الجهاد الاکبر " ہم چھوٹے جہاد سے بڑے جہاد کی طرف لوٹے ہیں۔
حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی ایک روایت سے اس پر دلیل پائی گئی کہ نماز اپنے وقت میں ادا کرنا افضل ہے اسی وجہ سے نبی کریم ﷺ نے نماز کو وقت پر ادا کرنے سے افضل قرار دیا پھر جہاد کو:

" عن ابن مسعود قلت یا رسول الله ای الاعمال افضل ؟ قال الصلوة علی میقاتها قلت ثم ای ؟ قال بر الوالدین قلت ثم ای ؟ قال الجهاد فی سبیل الله ولو استزدته لزادنی رواه البخاری "

حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ میں نے عرض کیا یا رسول اللہ کون سا عمل افضل ہے؟ تو آپ نے فرمایا نماز اپنے وقت میں ادا کرنا۔ میں نے کہا کہ پھر کون سے عمل افضل ہے؟ تو آپ نے فرمایا والدین کی فرمانبرداری، میں نے عرض کیا پھر کون سے عمل افضل ہے؟ تو آپ نے فرمایا اللہ تعالیٰ کی راہ میں جہاد اور اگر میں آپ سے اور زیادہ سوال کرتا تو آپ اس کا جواب مجھے ارشادفرماتے (لیکن میں نے اتنا ہی سوال کیا)۔

اعتراض : ایک اور روایت میں ایمان کے بعد جہاد کو افضل قرار دیا گیا تو پھر کس طرح کہا جائے گا کہ نماز افضل ہے۔

☆ " عن ابی هريرة رضی الله عنه قال سئل رسول الله ﷺ ای العمل افضل ؟ قال الایمان بالله ورسوله ، قیل ثم ما ذا ؟ قال الجهاد فی سبیل الله ، قیل ثم ماذا ؟ قال حج مبرور " (بخاری ومسلم)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ سے سوال کیا گیا کہ کون سا عمل افضل ہے؟ تو آپ نے فرمایا اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول (ﷺ) پر ایمان لانا پھر پوچھا گیا کہ پھر کون سا عمل

افضل ہے؟ تو آپ نے فرمایا حج مقبول۔

جواب : اگر چہ بظاہر احادیث میں تعارض ہے لیکن صحیح ترتیب یہ ہے کہ ایمان سب سے افضل ہے کیونکہ تمام عبادات کی دار و مدار ایمان پر ہے ایمان نہیں تو کوئی عبادت کارگر نہیں۔ اس کے بعد نماز اور وہ عبادات جو فرض عین ہیں وہ افضل ہیں:

" الصلوة علی میقاتها افضل من الجهاد لان هذه فرض عین وتتکرر والجهاد لیس کذلک "

کہ جہاد فرض ہی اس لئے ہوا ہے کہ کافر ایمان لائیں اور اللہ تعالیٰ کے دین کو بلندی حاصل ہو اور لوگ نماز ادا کریں لہذا واضح ہوا کہ جہاد مقصود لغیرہ ہے اور حسن لغیرہ ہے یعنی جہاد ایمان اور نماز کے لئے ہی مقصود ہے اور ان کی وجہ سے ہی حسین ہے لیکن نماز ذاتی طور پر مقصود ہے اور اس میں حسن ذاتی پایا گیا ہے۔ نبی کریم ﷺ سے ایک طویل حدیث حضرت معاذ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے جس میں یہ الفاظ گرامی مذکور ہیں:

" والذی نفس محمد بیده ما شجت وجه ولا اغبرت قدم فی عمل یبتغی به درجات الآخرة بعد الصلوة المفروضة کجهاد فی سبیل الله صححه الترمذی "

قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ قدرت میں محمد کی جان ہے کوئی چہرہ زخمی نہیں اور کوئی قدم غبار آلود نہیں جس کے ذریعے آخرت کے درجات حاصل کئے گئے ہوں فرض نماز کے بعد جیسے اللہ کی راہ میں جہاد کرنا ہے۔ یعنی نماز فرض کے بعد جہاد ہی وہ عبادت ہے جس کے ذریعے آخرت کے درجات حاصل ہوتے ہیں اور اس میں مشقت اٹھائی جاتی ہے اور اللہ کی راہ میں انسان اپنے آپ کو زخمی کرتا ہے اور اپنے قدموں کو غبار آلود کرتا ہے۔

ہاں البتہ جب جہاد فرض عین ہو جائے تو اس وقت جہاں تک ممکن ہو نماز بھی ادا کرے اور جہاد بھی کرے اگر سخت مشکل درپیش آجائے کہ نماز ادا کرنی ممکن نہیں ہو رہی تو نماز مؤخر بھی ہو سکتی ہے اس صورت میں یقیناً ایمان کے بعد افضلیت کے لحاظ پر پہلا درجہ جہاد کا ہوگا۔ اس پر دلیل یہ ہے کہ خندق

کے دن نبی کریم ﷺ اور صحابہ کرام کی چار نمازیں قضاء ہوگئی تھیں۔

(ماخوذ از مرقاۃ ج ۷ ص ۲۶۴ ، وشامی ج ۳ ص ۲۳۷)

کون سے جہاد افضل ہے؟

" عن عبد الله بن حبشی ان النبی ﷺ سئل ای الاعمال افضل ؟ قال طول القیام قیل ای الصدقة افضل ؟ قال جهد المقل قیل فای الهجرة افضل ؟ قال من هجر ما حرم الله علیه قیل فای الجهاد افضل ؟ قال من جاهد المشرکین بما له ونفسه ، قیل فای القتل اشرف ؟ قال من اهریق دمه وعقرجواده رواه ابوداؤد وفی روایة النسائی ان النبی ﷺ سئل ای الاعمال افضل ؟ قال ایمان لا شک فیه وجهاد دلاغلول فیه وحجة مبرورة " (مشکوۃ کتاب الجهاد)

حضرت عبداللہ بن حبشی (بضم مهملة وسکون موحدة) رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں بیشک نبی کریم ﷺ سے پوچھا گیا کون سا عمل افضل ہے؟ آپ نے فرمایا لمبا قیام پھر پوچھا گیا کون سا صدقہ افضل ہے؟ آپ نے فرمایا جو تھوڑے مال والا شخص مشقت سے صدقہ کرے پھر سوال کیا گیا کون سی ہجرت افضل ہے؟ آپ نے فرمایا جن چیزوں کو اللہ تعالیٰ نے حرام فرمایا ان کو چھوڑ دینا پھر پوچھا گیا کون سا جہاد افضل ہے؟ آپ نے فرمایا مشرکین سے اپنے جانوں اور مال سے جہاد کرنا پھر سوال کیا گیا کون سا قتل ہونا افضل ہے؟ آپ نے فرمایا کہ اس شخص کا مقتول (شہید) ہونا افضل ہے جس کا خون بہایا گیا ہو اور اس کے گھوڑیں کی کچیں کاٹ دی گئی ہوں۔ (ابوداؤد)

نسائی کی روایت میں ہے کہ نبی کریم ﷺ سے سوال کیا گیا کونسا عمل افضل ہے؟ تو آپ نے فرمایا ایمان جس میں شک نہ ہو اور جہاد جس کے مال غنیمت میں خیانت نہ پائی جائے اور حج مقبول۔

وضاحت حدیث: لمبا قیام افضل ہونے کی وجہ یہ ہے کہ اس میں قراءت بھی لمبی ہوگی اور مشقت بھی زیادہ ہوگی جس عبادت میں مشقت زیادہ ہو وہ یقیناً افضل ہوتی ہے:

" واما ماورد من اطالة السجود افضل فلکونها تدل علی کمال المسکنة الموجبة للقرب الی الله تعالیٰ "

بعض روایات میں لمبا سجدہ افضل ہونے کا ذکر ہے اس کی وجہ بھی یہ ہے کہ وہ کامل مسکینی پر دلالت کرتا ہے انسان جب رب تعالیٰ کے حضور کامل مسکینی سے سجدہ ریز ہوتا ہے تو اسے اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل ہوتا ہے۔

" جهد المقل " بضم الجيم وضم الميم و كسر القاف وتشديد اللام اى طاقة الفقير ومجهوده "

یعنی قلیل مال والا فقیر شخص جو مشقت سے اللہ تعالیٰ کی راہ میں مال خرچ کرے وہ افضل ہے البتہ شرط یہ ہے کہ اپنے اہل وعیال کو محتاج نہ کرے یا اس کے اہل وعیال نہ ہوں۔

" ولهذا ورد سبق درهم مائة الف درهم رجل له درهمان اخذ احدهما فتصدق به ورجل له مال كثير فاخذ من عرضه مائة الف فتصدق بها رواه النسائى عن ابى ذر "

اسی وجہ سے وارد ہے کہ ایک درہم ایک لاکھ درہم سے سبقت لے جاتا ہے کیونکہ جب ایک شخص کے پاس دو درہم ہوں ایک اپنے پاس رکھ لے اور ایک اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ کردے اس کا ایک درہم اس شخص کے لاکھ درہم سے سبقت لے جائے گا جس کے پاس کثیر مال ہے تو اس نے اس سے ایک لاکھ درہم صدقہ کر دیا۔

ہجرت کے سوال پر (کہ کونسی ہجرت افضل ہے)؟ آپ نے جواب دیا جن چیزوں کو اللہ تعالیٰ نے حرام کیا ان کو چھوڑ دینا کیونکہ لغوی معنی ہی " هجر يهجر " کا چھوڑنا ہے عام مشہور ہجرت کو بھی اسی لئے ہجرت کہا جاتا ہے کہ اس میں انسان اپنے وطن کو چھوڑ کر دوسرے وطن میں چلا جاتا ہے۔ افضل جہاد ہے وہ جس میں مشقت زیادہ پائی جائے اسی لئے نبی کریم ﷺ نے جان اور مال سے جہاد کرنے کو افضل قرار دیا " ولتوقف هذا الجهاد على مجاهدة النفس " کیونکہ اس جہاد میں نفس پر مشقت ہوتی ہے:

" ورد افضل الجهاد ان يجاهد الرجل نفسه وهواه رواه ابن البخارى عن ابى ذر "

اور یہ روایت بھی مذکور ہے کہ انسان کا اپنے نفس اور اپنی خواہشات سے جہاد کرنا افضل ہے وجہ

اس کی بھی یہی ہے کہ اسمیں مشقت پائی جاتی ہے اسی لئے اس کو جہاد اکبر کہا گیا ہے۔

اعتراض: نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے " افضل الجهاد كلمة حق عند سلطان جابر " افضل جہاد کلمہ حق ظالم بادشاہ کے سامنے کہنا ہے (تو ان تمام میں تطبیق کیسے؟)۔

جواب اول: " هـذا لا ينا فيه لانه اشق على النفس " یہ حدیث پہلی احادیث کے مخالف نہیں کیونکہ افضیلت کی وجہ جب نفس پر مشقت ہے تو یہ بھی افضل جہاد ہے کیونکہ جابر اور ظالم بادشاہ کے سامنے کلمہ حق کہنا اپنے آپ کو شدید مصائب میں مبتلا کرنا ہے تو اس سے بڑھ کر اور نفس پر مشقت کیا ہوگی۔

دوسرا جواب: " او الا فضلية اضافية " یا افضیلت اضافی پائی گئی ہے کہ بعض جہادوں سے افضل جہاد یہ ہے کہ ظالم اور جابر بادشاہ کے سامنے کلمہ حق کہا جائے۔ " اشرف القتل " کے سوال کے جواب کا مطلب یہ ہے کہ انسان ثابت قدمی سے جہاد کرے پیٹھ پھیر کر بھاگے نہیں اس کا خون بہا دیا جائے گا اس کے گھوڑے کی ٹانگیں کاٹ دی جائیں تو یہی شہادت افضل درجہ رکھتی ہے۔
(از مرقاۃ ج ۷ ص ۲۹۵)

مجاہدین کی ازواج کی حرمت:

" عن بريدة قال قال رسول الله ﷺ حرمة نساء المجاهدين على القاعدين كحرمة امهاتهم وما من رجل من القاعدين يخلف رجلا من المجاهدين في اهله فيخونه فيهم الاوقف له يوم القيامة فيأخذ من عمله ما شاء فما ظنكم " (رواه مسلم، مشكوة كتاب الجهاد)

حضرت بریدہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا مجاہدین کی عورتوں کی عزت پیچھے رہ جانے والوں پر ایسے ہے جیسے ان کی ماؤں کی عزت ان پر ہے مجاہدین میں سے کسی شخص نے پیچھے رہ جانے والوں میں سے کسی کو اپنی اہل میں اپنا جانشین بنایا (کہ وہ ان کی دیکھ بھال رکھے اور ان کا کام میں ہاتھ بٹائے) تو اس نے خیانت کر لی تو قیامت کے دن اسے کھڑا کیا جائے گا وہ اس کے اعمال میں سے جو چاہے گا لے لے گا تمہارا کیا گمان۔

وضاحت حدیث: جو لوگ جہاد میں نہ شریک ہو سکیں ان پر لازم ہے کہ مجاہدین کی بیویوں

کی عزت اسی طرح کریں جس طرح وہ اپنی ماؤں کی عزت کرتے ہیں اگر ان سے کسی نے دست درازی کر کے خیانت کی تو قیامت کے دن ضرور اس کے اعمال میں سے مجاہد کو لینے کا حق دے دیا جائے گا کہ تو اس کے نیک اعمال سے جو چاہے لے لے ﴿ فَمَاظَنُّکُمْ ﴾ تمہارا کیا گمان ہے؟ یعنی وہ شخص جو اپنے نیک اعمال سے مکمل محروم ہو گیا اور مجاہد کو اس کی نیکیاں لینے کا حق دے دیا گیا تو اس کے متعلق تمہارا کیا گمان ہے کہ وہ خیانت کرنے والا کتنا بدبخت ہوگا اور مجاہد اور اس کی زوجہ کا مقام کتنا بلند ہوگا۔

مجاہد کی فضیلت:

☆ " عن ابی هريرة قال قال رسول الله ﷺ مثل المجاهد فی سبيل كمثل الصائم القائم القانت بآيات الله لا يفتر من صيام ولا صلوة حتى يرجع المجاهد فی سبيل الله "

(بخاری ومسلم ، مشكوة كتاب الجهاد)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں اللہ کی راہ میں جہاد کرنے والا جہاد سے لوٹنے تک اس درجہ میں ہوتا ہے جس درجہ میں روزے دار، قیام کرنے والا اور اللہ تعالیٰ کی آیات پڑھنے والا ہوتا ہے جو کہ روزے رکھنے میں اور نماز ادا کرنے میں سستی سے کام نہیں لیتا۔

وضاحت حدیث: اللہ کی راہ میں جہاد کرنے والوں کو وہ اجر و ثواب حاصل ہوتا ہے جو نفلی روزے رکھنے والوں اور رات کو نوافل ادا کرنے والوں کو ہوتا ہے حالانکہ مجاہدین نفلی روزے نہیں رکھ رہے ہوتے اور نہ ہی نوافل ادا کر رہے ہوتے ہیں "القانت بآيات الله ای القارئ بها " یہاں قانت کا معنی قاری ہے یعنی اللہ تعالیٰ کی آیات کی تلاوت کرنے والا۔ مراد عبادت ہی ہے صاحب نہایہ نے بیان فرمایا ہے کہ احادیث میں " قانت " چند معانی میں استعمال ہوا ہے وہ یہ ہیں:

طاعت، خشوع، نماز، دعا، عبادت، قیام، لمبا قیام اور سکوت۔

" شبه المجاهد الذی لا يضيع لمحة من لمحاته من اجر وثواب سواء كان قائما او نائما يقاتل العدو ام لا بالصائم القائم الذی لا يفتر عما هو فيه فهو من التشبيه الذی المشبه به مفروض غير محقق "

مجاہد کو اس روزہ دار اور رات کو قیام کرنے والے اور اللہ تعالیٰ کی آیات کی تلاوت کرنے والا

سے تشبیہ دی گئی جن کو عبادت سے ملال نہیں ہوتا تھکتے نہیں اور ست نہیں ہوتے گویا کہ ان کا ہر لمحہ عبادت میں گزر رہا ہے اسی طرح مجاہد کا ہر لمحہ یعنی حرکت وسکون عبادت شمار ہوتا ہے اگرچہ وہ روزہ دار نہیں ہوتا قیام کرنے والا نہیں ہوتا۔ (از مرقاۃ ج ۷ ص ۲۶۷)

☆ " عن ابی هریرة قال قال رسول الله ﷺ انتدب الله لمن خرج فی سبیله لایخرجه الا ایمان بی وتصدیق برسلی ان ارجعه بما نال من اجر او غنیمة وادخله الجنة "
(بخاری ومسلم، مشکوة کتاب الجهاد)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ تعالیٰ ضامن ہے اس شخص کا جو اللہ تعالیٰ کی راہ میں نکلتا ہے اور صرف اللہ تعالیٰ پر ایمان رکھتے ہوئے اور اللہ تعالیٰ کے رسول (ﷺ) کی تصدیق کرتے ہوئے نکلتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کو اجر وثواب یا غنیمت سے لوٹاتا ہے اور اسے جنت میں داخل کرتا ہے۔

وضاحت حدیث: جو شخص اللہ تعالیٰ پر ایمان رکھتے ہوئے اور اللہ تعالیٰ کے رسول ﷺ کی تصدیق کرتے ہوئے جہاد میں شریک ہو اللہ تعالیٰ نے اس سے وعدہ کر رکھا ہے کہ اسے اجر وثواب عطا کرے گا اور یا مال غنیمت عطا کرے گا اور یا اسے درجہ شہادت عطا کرے گا کہ وہ جنت میں داخل ہوگا۔

☆ " عن سهل بن سعد قال قال رسول الله ﷺ رباط یوم فی سبیل الله خیر من الدنیا وما علیها "
(بخاری مسلم مشکوة کتاب الجهاد)

سہل بن سعد رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ تعالیٰ کی راہ میں ایک دن (دشمن کے مقابل) ٹھہرنا دنیا اور دنیا کی تمام چیزوں سے بہتر ہے۔

وضاحت: " رباط بکسر اوله هو الاقامة فی مکان یتوقع هجوم العدو فیه لقصد دفعه لله تعالیٰ "

" رباط " کا معنی یہ ہے کہ ایسی جگہ ٹھہرنا جہاں دشمن (کفار) کے ہجوم کا خطرہ ہو کہ جب دشمن آئیں گے تو میں اللہ تعالیٰ کی رضامندی کیلئے ان کو مندفع کروں گا۔

☆ " وعن انس قال قال رسول الله ﷺ لغدوة فی سبیل الله او روحة خیر من الدنیا وما فیها "
(بخاری ومسلم، مشکوة کتاب الجهاد)

حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ تعالیٰ کی راہ میں ایک صبح یا ایک شام دنیا اور دنیا میں پائی جانی والی چیزوں سے بہتر ہے۔

وضاحت : یعنی جہاد میں ایک صبح اور ایک شام گزارنا دنیا کی تمام نعمتوں سے بہتر ہیں۔ اسی طرح جہاد میں ایک صبح اور ایک شام گزارنے سے جو ثواب حاصل ہوتا ہے وہ دنیا کی نعمتوں کو اللہ کی راہ میں خرچ کرنے سے بھی افضل ہے۔

☆ "عن ابی هريرة قال قال رسول الله ﷺ افشوا السلام واطعموا الطعام واضربوا الهام تورثوا الجنان ، رواه الترمذی وقال هذا هديث غريب" (مشکوۃ کتاب الجهاد)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا سلام کو عام کرو اور طعام کھلاؤ اور کھوپڑیوں کو اڑادو کہ تمہیں جنت عطا کردی جائے۔

وضاحت : "تورثوا" باب افعال سے مجہول کا صیغہ ہے "جنان" بکسر الجیم جمع ہے جنت کی یعنی جنات نعیم سلام کو عام کرنے کا مطلب یہ ہے کہ اپنے مسلمان بھائیوں کو سلام کرو اور ان کے سلام کا جواب دو۔ طعام کھلانے کا مطلب یہ ہے کہ فقیروں، غریبوں، یتیموں کو طعام کھلاؤ کیونکہ یہ باعث برکت ہے اور ذریعہ جنت ہے۔ کھوپڑیاں اڑانے سے مراد کفار سے جہاد کرنا اور میدان جہاد میں ان کے سر اڑا دینے کا حکم دیا گیا ہے۔

مسئله : " ورميهم بنبل ونحوه وان تترسوا ببعضنا ونقصدهم ای الكفار وما اصيب منهم ای من المسلمن لادية فيه ولا كفارة "

کفار اگر اپنے بچاؤ کے لئے مسلمانوں کو آگے کر کے اپنی ڈھال بنا دیں تو ہم ان مسلمانوں کا خیال کرتے ہوئے کفار کو نہیں بچائیں گے بلکہ ان پر اپنے ہتھیار چلا دیں گے اس کی زد میں آکر مسلمان قتل ہو جائے تو ہم پر کوئی کفارہ اور دیت لازم نہیں آئے گا کیونکہ ہم نے کافروں کو قتل کرنے کا ارادہ کیا نہ کہ مسلمانوں کو۔ اسی طرح کوئی گناہ بھی ہم پر لازم نہیں آئے گا۔ (درمختار)

ہاں یہ بھی خیال رہے کہ اگر مسلمانوں کو زبردستی آگے کر لیا گیا تو وہ مسلمان گنہگار نہیں ہوں گے بلکہ کفار کے جبر کی وجہ سے ان کو درجہ شہادت بھی حاصل ہو گا لیکن اگر مسلمان کافروں کی فوج میں ہوں

کافروں کا ساتھ دے رہے ہوں اور کافر مسلمانوں پر حملہ آور بھی ہیں تو پھر بھی ان مسلمانوں کی پرواہ نہ کرتے ہوئے کفار کو قتل کیا جائے گا۔اس صورت میں کفار کا بچاؤ کرنے والے مسلمان گنہگار ہوں گے اور مسلمانوں کی تلوار کی زد میں آنے سے درجہ شہادت سے بھی محروم ہو گئے کیونکہ انہوں نے دنیاوی لالچ یعنی تنخواہ کی وجہ سے کافروں کا ساتھ اپنی خوشی سے دیا جبر سے نہیں۔ہاں فتح کے بعد مسلمان اس علاقے کے کفار کو تہ تیغ نہیں کر سکتے جس میں مسلمانوں اور ذمی لوگ اس کی زد میں آ رہے ہوں پہلے وہاں سے ان کو نکال لیا جائے پھر کفار کے سر اڑا دیئے جائیں۔

مسئلہ : جب جنگ میں کافروں کے غالب آنے کا خطرہ ہو اور یہ بھی خطرہ ہو کہ اگر ہمارے پاس قرآن پاک ہوا تو وہ اس کی بے حرمتی کریں گے تو ایسی صورت میں قرآن پاک میدان جنگ میں لے جانا منع ہے۔

مسئلہ : مسلمانوں پر حرام ہے کہ وہ اپنا اسلحہ جنگی آلات وہتھیار کفار پر بیچیں کیونکہ اس سے کفار کو طاقت حاصل ہو گی اور مسلمانوں کی بربادی کا ذریعہ بنے گا۔لیکن اس مسئلہ کا تعلق غالباً اس وقت سے تھا جب مسلمان واقعی مسلمان تھے کفار پر غالب تھے اپنے اسلحہ میں خود کفیل تھے،اب تو مسلمان زبوں حالی کا شکار کفار سے دب کر جی حضوری بن کر وقت گزار رہے ہیں اب انہوں نے کیا اسلحہ بیچنا ہے بلکہ کفار سے اسلحہ خریدنے کے لئے منت سماجت کرنی ہے ایک علاقے کے کافر نے جو دوسرے کافر کو اسلحہ دینا ہے وہ مسلمانوں کو نہیں دینا بلکہ ناکارہ دینا ہے۔

کاش کہ گزرا ہوا دور واپس آ جائے ایک مرتبہ پھر کفار مسلمانوں کو دیکھ کر کانپنے لگ جائیں وہ ہم سے اسلحہ مانگیں نہ کہ ہم ان سے دست سوال دراز کریں۔

☆☆☆☆☆

﴿ وَاَنۡفِقُوۡا فِیۡ سَبِیۡلِ اللّٰهِ وَلَا تُلۡقُوۡا بِاَيۡدِيۡكُمۡ اِلَى التَّهۡلُكَةِ وَاَحۡسِنُوۡا اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الۡمُحۡسِنِيۡنَ ﴾

۱) ''اور اللہ کی راہ میں خرچ کرو اور اپنے ہاتھوں ہلاکت میں نہ پڑو اور بھلائی والے ہو جاؤ بیشک بھلائی والے اللہ کے محبوب ہیں''۔

۲) ''اور خرچ کرو اللہ کی راہ میں اور نہ ڈالو اپنے آپ کو ہلاکت میں اور احسان کرو بیشک اللہ تعالیٰ محبت کرتا ہے احسان کرنیوالوں سے''۔

ماقبل سے رابطہ:

(۱) اللہ تعالیٰ نے جب کافروں سے جنگ کرنے کا حکم دیا تو جنگ میں آلات قتال (اسلحہ) کی محتاجی ہوتی ہے یقیناً اس میں مال خرچ کرنے کی ضرورت ہوتی ہے اس لئے اللہ کی راہ میں مال خرچ کرنے کا حکم دیا پھر خصوصاً کئی لوگ مال دار ہوتے ہیں لیکن بیماری، ضعف اور کسی نہ کسی عذر کی وجہ سے جہاد میں شریک نہیں ہو سکتے اور کئی لوگ جہاد کرنے کی طاقت رکھتے ہیں لیکن ان کے پاس ہتھیار خریدنے کی طاقت نہیں ہوتی۔ اس لئے رب تعالیٰ نے مال خرچ کرنے کا حکم دیا کہ مالی طاقت رکھنے والے جب جانی طور پر خود جہاد میں شریک نہیں ہو سکتے تو دوسروں کی مالی معاونت کر کے بھی جہاد میں شرکت کا ثواب حاصل کیا جا سکتا ہے۔

(۲) جب آیۂ کریمہ ﴿ اَلشَّهۡرُ الۡحَرَامُ بِالشَّهۡرِ الۡحَرَامِ وَالۡحُرُمٰتُ قِصَاصٌ ﴾ نازل ہوئی تو ایک شخص نے عرض کیا قسم ہے اللہ تعالیٰ کی یا رسول اللہ ہمارے پاس خرچ نہیں اور کوئی ایک بھی ہمیں کھلاتا نہیں۔ (مالی معاونت نہیں کرتا)

" فامر رسول الله ﷺ ان ينفقوا فی سبيل الله وان يتصدقوا وان لايكفوا ايديهم عن الصدقة ولو بشق تمرة تحمل فی سبيل الله فيهلكوا "

تو رسول اللہ ﷺ نے حکم فرمایا کہ اللہ کی راہ میں مال خرچ کرو اور صدقہ کرو اور اپنے ہاتھوں کو

صدقہ کرنے سے نہ روکو (اپنی طاقت کے مطابق خلوص سے صدقہ کرو) اگرچہ کھجور کا کچھ حصہ بھی دے دو جو اللہ تعالیٰ کی راہ میں جانے کے لئے معاون بن سکے ورنہ ہلاک ہو جاؤ گے تو اللہ تعالیٰ نے اس آیۃ کریمہ کو نازل فرمایا۔ (کبیر)

شان نزول:

دو وجہ یہی جو ماقبل سے رابطہ کے لئے کبیر میں ذکر کی گئی ہیں یہ شان نزول ہی ہیں پہلی وجہ کی وضاحت عام مفسرین کرام نے بطور شان نزول ذکر فرمائی۔ ابو عمران روایت کرتے ہیں کہ ہم قسطنطنیہ میں تھے تو رومیوں کا ایک بہت بڑا لشکر ہمارے مقابلہ کے لئے آ گیا تو مسلمانوں میں سے ایک شخص ان کے لشکر میں گھس کر لڑائی کرنے لگا تو دوسرے مسلمان حضرات کہنے لگے " القی بیدیه الی التهلکة " اس شخص نے اپنے آپ کو اپنے ہی ہاتھوں ہلاکت میں ڈال دیا (مطلب یہ تھا کہ اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈالنے سے تو اللہ تعالیٰ نے منع فرمایا ہے) تو مسلمانوں کے لشکر میں حضرت ابو ایوب انصاری بھی تھے وہ کھڑے ہوئے انہوں نے فرمایا تم رب تعالیٰ کے ارشاد گرامی ﴿ وَلَا تُلْقُوْا بِاَيْدِيْكُمْ اِلَى التَّهْلُكَةِ ﴾ کی یہ وجہ بیان کرتے ہو حالانکہ یہ وجہ نہیں بلکہ یہ آیۃ ہم انصار کے حق میں نازل ہوئی اس کی اصل وجہ نزول یہ ہے:

> " ان لما اعز الله تعالیٰ دینه وکثر ناصروه قال بعضنا لبعض سرا دون رسول الله ﷺ ان اموالنا قد ضاعت وان الله تعالیٰ قد اعز الاسلام وکثر ناصروه فلو اقمنا فی اموالنا فاصلحنا ما ضاع منها فانزل الله تعالیٰ علی نبیه ما یرد علینا "

جب اللہ تعالیٰ نے اپنے دین کو عزت دے دی یعنی غلبہ عطا فرما دیا اور دین اسلام کے بہت مددگار ہو گئے تو ہم میں سے رسول اللہ ﷺ کی غیر موجودگی میں بعض حضرات بعض سے آہستہ آہستہ کہنے لگے کہ اب اللہ تعالیٰ نے اسلام کو غلبہ عطا کر دیا ہے عزت عطا فرما دی ہے اور اس کے کثیر مددگار ہو چکے ہیں ہم پہلے ہی بہت مال خرچ کر چکے ہیں اب ہمیں اپنے مالوں کی حفاظت کرنی چاہئے اور اپنی ضروریات واصلاح کے لئے مال بچا کر رکھنا چاہئے تو اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کریم ﷺ پر ہمارے اس

قول کے رد میں یہ آیۃ کریمہ نازل فرمائی کہ اللہ کی راہ میں مال خرچ کرو اگر مال خرچ نہیں کرو گے کفار سے جنگ کی تیاری نہیں کرو گے تو اپنے ہاتھوں سے ہی اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈال دو گے۔

(روح المعانی)

(۲) شان نزول کی دوسری وجہ یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ جب عمرہ کی قضاء کے لئے مکہ مکرمہ میں جانے لگے تو صحابہ کرام کے دلوں میں خیال پیدا ہوا کہ ہوسکتا ہے کفار ہمیں پھر روک دیں اور ہمارے ساتھ جنگ چھیڑ دیں اور ہمیں بھی ان سے لڑنا پڑے تو ہمیں بھی تیاری رکھنی چاہئے اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں کی تسلی کے لئے آیۃ کریمہ کو نازل فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کی راہ میں مال خرچ کرو:

" فکانت عمرة وجهادا واجتمع فيه المعينان فلما كان الامر كذلك لا جرم قال الله تعالىٰ ﴿ وَاَنفِقُوا فِي سَبِيلِ اللهِ ﴾ ولم يقل وانفقوا في الجهاد والعمرة "

قرآن پاک کا یہ خصوصی کمال ہے کہ مختصر الفاظ کثیر مطالب کو حاوی ہوتے ہیں اگر چہ مسلمانوں کو جہاد اور معرہ کے لئے مال خرچ کرنے کا حکم دیا لیکن لمبا جملہ " وانفقوا في الجهاد والعمرة " (اور خرچ کرو جہاد میں اور عمرہ میں) ذکر نہیں کیا بلکہ مختصر جملہ ذکر کیا جو طویل مقصد کو شامل ہے ارشاد فرمایا:

﴿ وَاَنفِقُوا فِي سَبِيلِ اللهِ ﴾ ''اور اللہ کی راہ میں مال خرچ کرو''

فائدہ جلیلہ : شان نزول کی پہلی وجہ حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے ان کی روایت کو ذکر کرنے کے ساتھ مفسرین کرام نے یہ بھی ذکر فرمایا:

" قال البغوى فمازال ابو ايوب رضى الله عنه يجاهد فى سبيل الله حتى كان آخر غزوة غزاها بقسطنطنية فاستشهدو دفن فى اصل سور قسطنطنية وهم يستسقون به "

بغوی رحمہ اللہ نے ذکر فرمایا کہ حضرت ابوایوب انصاری ہمیشہ اللہ تعالیٰ کی راہ میں جہاد میں شریک ہوتے رہے یہاں تک کہ آپ نے سب سے آخری جہاد قسطنطنیہ میں شرکت کی جس میں آپ شہید ہو گئے اور قسطنطنیہ کے قلعہ کی دیواروں کے ساتھ ہی آپ کو دفن کر دیا گیا لوگ قحط سالی میں آپ کے توسل سے رب تعالیٰ سے بارش طلب کرتے ہیں۔ (مظہری)

روح البیان نے بھی یہ واقعہ ذکر کیا ساتھ وضاحت کی کہ یہ قسطنطنیہ کی وہ جنگ مراد ہے جو حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں ہوئی (یعنی پہلی جنگ جو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں حضرت امیر معاویہ رضی اللہ کی زیر قیادت ہوئی وہ مراد نہیں):

" فتوفی هناک و دفن فی اصل سور قسطنطنية وهم يستشقفون به "

وہ وہاں ہی شہید ہوئے اور قسطنطنیہ کی دیواروں کے ساتھ ہی آپ کو دفن کر دیا گیا اور لوگ آپ کے وسیلہ جلیلہ سے اللہ تعالیٰ سے شفا حاصل کرتے ہیں۔

سبحان اللہ کیا خوب مسئلہ حل ہوا کہ اللہ تعالیٰ اپنے نیک بندوں کے وسیلہ سے اپنی خصوصی رحمت کا نزول فرماتا ہے جس کی وجہ سے لوگوں کو بارش بھی حاصل ہوتی ہے اور بیماریوں سے شفا بھی یعنی حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ کا مزار پرانوار مرجع خلائق ہے اور رب تعالیٰ کی رحمت کے نزول کا ذریعہ ہے۔

وَاَنْفِقُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ : "اور خرچ کرو اللہ کی راہ میں"۔ انفاق ، کا معنی ہے کہ مال خیر کے کاموں میں صرف کیا جائے اگر کوئی مال ضائع کر دے تو اس ضائع کرنے والے کو عربی میں " مضیع المال " کہا جائے گا "منفق " نہیں کہا جائے گا۔ پھر " انفاق " کو ﴿ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ ﴾ سے مقید کر دیا کہ اللہ تعالیٰ کی راہ میں مال خرچ کرو اللہ تعالیٰ کی راہ سے مراد دین اسلام ہے سبیل کا معنی "راستہ" اور "سَبِیْلِ اللّٰہِ" کا معنی اللہ کا راستہ یعنی دین اسلام۔

اب آیۃ کا مفہوم وسیع تر ہو گیا کہ اللہ تعالیٰ نے دین میں جہاں بھی مال خرچ کرنے کا حکم دیا ہے وہ اس میں داخل ہیں:

" سواء كان انفاقا فی حج او عمرة او كان جهادا بالنفس او تجهيزا للغير او كان انفاقا فی صلة الرحم او فی الصدقات او علی العيال او فی الزكوات والكفارات او عمارة السبيل وغيره ذلک "

خواہ وہ مال حج میں خرچ کرنا ہو یا عمرہ میں خواہ اپنے نفس سے جہاد کرنے میں مال خرچ کرنے کی ضرورت یا غیر کی تجہیز و تکفین میں مال خرچ کرنا ہو، یا صلہ رحمی کے طور پر مال خرچ کرنا یا بطور صدقات

مال خرچ کرنا اسی طرح رفاہ عامہ کے لئے کنوواں کھدوانے اور تیار کرنے میں مال خرچ کرنا ہو وغیرہ تمام نیکی کے کاموں میں مال خرچ اس آیۃ کریمہ میں داخل ہے کیونکہ یہ سب کام دین اسلام نے ہی تو بتائے ہیں کہ یہ نیکی کے کام ہیں۔ ہاں البتہ جہاد کا ذکر ساتھ ہی پہلے آچکا ہے اس لئے یہ آیۃ کریمہ جہاد میں مال خرچ کرنے کو زیادہ واضح کر رہی ہے۔ (کبیر)

کیا خوب حکمت:

سبحان اللہ رب تعالیٰ کا کلام کتنی ہی حکمت سے لبریز ہے اور کیا خوب انداز بیان ہے جب مال خرچ کرنے کو واجب کیا گیا تو اس وجوب کی علت اور وجہ ﴿وَاَنْفِقُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ﴾ ''اللہ کی راہ میں مال خرچ کرو'' سے یوں بیان کردی:

'' وذلک لان المال مال الله فیجب انفاقه فی سبیل الله ''

کہ جب مال ہی تمہیں رب تعالیٰ نے عطا کیا ہے اور در حقیقت مال ہی اس کا ہے تو تم پر واجب ہے کہ اسی کی راہ میں خرچ کرو یعنی مال اس طرح خرچ کرو جس طرح رب تعالیٰ نے بیان فرمایا:

'' ولان المؤمن اذا سمع ذکر الله اهتز ونشط فیسهل علیه انفاق المال ''

اور رب تعالیٰ نے ﴿فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ﴾ کہا ہے اس میں حکمت یہ ہے کہ مومن جب اللہ تعالیٰ کا نام سنتا ہے تو خوشی سے جھوم اٹھتا ہے اور خوشی سے پھولے نہیں سماتا تو اس پر اللہ کی راہ میں مال خرچ کرنا آسان ہوجاتا ہے۔ (کبیر)

وَلَا تُلْقُوْا بِاَیْدِیْکُمْ اِلَی التَّهْلُکَةِ: ''اور نہ ڈالو اپنے آپ کو ہلاکت میں'' اس میں ایک قول یہ ہے کہ باء زائدہ ہے اور '' ایدی '' سے مراد نفس (ذاتیں) ہیں یعنی ذکر جزء کا اور مراد کل ہے۔ '' والمعنی لا تلقوا انفسکم الی التهلکة '' اور معنی یہ ہے کہ اپنے آپ کو ہلاکت میں نہ ڈالو (راقم کا ترجمہ اسی کے مطابق ہے)

اور ایک قول یہ ہے کہ باء اپنے اصل ہے پر زائدہ نہیں اور کلام میں عبارت محذوف ہے تقدیر عبارت کی یہ ہے '' وَلَا تُلْقُوْا اَنْفُسَکُمْ بِاَیْدِیْکُمْ اِلَی التَّهْلُکَةِ '' اور اپنے ہاتھوں ہلاکت میں نہ پڑو یہ ترجمہ اعلیٰ حضرت کا ہے جو با محاورہ ہے اصل میں ان الفاظ کا ترجمہ یہ ہے (اور نہ ڈالو اپنے آپ کو

اپنے ہی ہاتھوں سے ہلاکت میں)۔ (خازن)

تاہم مفتی احمد یار خان رحمہ اللہ نے ظاہری الفاظ کے مطابق ترجمہ کیا ہے ''اور نہ ڈالو اپنے ہاتھوں کو ہلاکت میں'' ضیاء القرآن کا ترجمہ بھی اعلیٰ حضرت کے ترجمہ کے مطابق ہی ہے۔

دینی طلباء کرام توجہ فرمائیں:

﴿ وَلَا تُلْقُوْا ﴾ اصل میں مضارع کا صیغہ '' تلقیون '' ہے لاء نہی کے ذریعے نون اعراب گر گیا۔ ''لا تلقیو '' ہو گیا۔ ضمہ یاء پر ثقیل تھا نقل کر کے ماقبل کو دے دیا۔ یاء کو التقاء ساکنین کی وجہ سے حذف کر دیا '' ولا تلقوا '' ہو گیا۔

'' الالقاء ، طرح الشئی ، والقی بیدہ لا یستعمل الا فی الشر ''

القاء کا معنی ڈالنا اور پھینکنا ہے '' القی بیدہ '' صرف شر میں استعمال ہوتا ہے خیر کے معنی میں استعمال نہیں ہوا۔ '' الی '' سے فعل کو متعدی کیا گیا کیونکہ اس میں معنی انتہاء کا پایا گیا ہے یعنی ایسا کام نہ کرو جس کی انتہاء ہلاکت ہو۔ (مظہری)

'' اِلَی التَّھْلُکَةِ '' ای الھلاک '' یعنی ہر وہ چیز جس کا انجام ہلاکت ہو اسے '' تھلکة '' کہا جاتا ہے۔ بعض حضرات نے یہ بیان کیا ہے کہ جس ہلاکت سے بچنا ممکن ہو اسے '' تھلکة '' کہتے ہیں اور جس سے بچنا ممکن نہ ہو اسے ''ہلاک'' کہا جاتا ہے۔ (مظہری)

''تھلکۃ'' کا بہت وسیع مفہوم ہے:

یعنی اپنے آپ کو اسباب ہلاکت میں نہ ڈالو وہ اسباب ہلاکت کیا ہیں؟

'' امساک الاموال والانفس عن الجھاد لان بہ یقوی العدو وتکثر المصائب فی الدین والذل لاھلہ کما ھو مشاھد ''

جہاد کے لئے مال خرچ نہ کرنا اور اپنی جانوں کو اللہ تعالیٰ کی راہ میں قربان نہ کرنا کیونکہ اس سے دشمن کو قوت حاصل ہوتی ہے اور دین میں زیادہ مصیبتیں حاصل ہوتی ہیں اور مسلمانوں کو ذلت حاصل

ہوتی ہے جسے ہم آئے دن دیکھ رہے ہیں۔ بخلاف اس کے جو لوگ اللہ تعالیٰ کی راہ میں اپنا مال اور جان پیش کرتے ہیں ان کو اللہ تعالیٰ دنیا اور آخرت میں دائمی عزت عطا فرماتا ہے یہی لوگ اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کے مستحق ہوتے ہیں:

﴿ اُولٰٓئِکَ عَلَیۡھِمۡ صَلَوٰتٌ مِّنۡ رَّبِّھِمۡ وَرَحۡمَةٌ ﴾

''ان لوگوں پر اللہ تعالیٰ کی مہربانیاں اور رحمت ہے''

(صاوی)

" الا ترون ان الامة الاسلامية لما نكصت على اعقابها ونامت على وسادة الراحة الوثير وتقهقرت الى الوراء ونامت عن جمع المال وانفاقه فى الجهاد وسبقتها الامم اخذت تبيد وتهلك "

کیا تم دیکھتے نہیں جب ملت اسلامیہ نے پیچھے کی جانب جانا شروع کر لیا اور آرام دہ بستر پر سونے کی عادت بنالی اور الٹی چال چلنے لگے اور جہاد میں مال جمع کرنے اور خرچ کرنے سے آنکھیں بند کرلیں تو دوسری قومیں ان پر سبقت لے گئیں اور انہوں نے مسلمانوں کو تباہ و برباد کرنا شروع کر دیا۔

(جواہر طنطاوی)

کفار نے مسلمانوں کی ہلاکت کے لئے طیارے تیار کر لئے ، میزائل بنالئے ہر قسم کی تباہی پھیلانے والے آلات حرب تیار کر لئے اور مسلمانوں نے قرض لے لے کر محافل سرود و رقص قائم کیں بسنت پر کروڑوں روپے اڑا دیئے جب جنگ کی باری آئی تو نوے ہزار مسلمانوں کو قید کرا کے اپنے ملک کو دولخت کر کے ایسی ذلت حاصل کی جس کی مثال نہیں ملتی۔ حق تو یہ تھا کہ اس پر شرم آتی لیکن کرتوت وہی رہے۔ چال وہی رہی۔

قاضی بیضاوی رحمہ اللہ نے یہی مضمون بیان کرنے کے ساتھ زیادہ یہ بھی بیان کیا:

﴿ وَلَا تُلۡقُوۡا بِاَيۡدِيۡكُمۡ اِلَى التَّهۡلُكَةِ ﴾ بالاسراف وتضيع وجه المعاش "

تم اپنے مالوں میں اسراف کر کے (بیجا خرچ کر کے) اور اپنے ذرائع معاش ضائع کر کے اپنے آپ کو ہلاکت میں نہ ڈالو۔ (بیضاوی)

" وقال بعضهم نزلت الآية فى البخل وترك الانفاق فى سبيل الله "

بعض حضرات نے بیان کیا ہے کہ آیۃ کریمہ بخل اور اللہ کی راہ میں مال خرچ کرنے کو چھوڑنے کے متعلق نازل ہوئی یعنی مقصد یہ ہے کہ تم کنجوسی کر کے اور اللہ تعالیٰ کی راہ میں مال خرچ کرنے کو چھوڑ کر اپنے آپ کو ہلاکت میں نہ ڈالو۔ (مظہری)

خرچ میں اعتدال سے کام لینا:

قاضی بیضاوی رحمہ اللہ نے ایک معنی جو تحریر فرمایا کہ اسراف کر کے اور ذرائع معاش کو ضائع کر کے اپنے آپ کو ہلاکت میں نہ ڈالو اسی کی وضاحت میں شیخ زادہ رحمہ اللہ تحریر فرماتے ہیں۔

☆ "عن سعید بن المسیب ومقاتل بن حیان رضی اللہ عنھما قالا لما امر اللہ تعالیٰ بالانفاق قال رجال امرنا بالانفاق فی سبیل اللہ ولو انفقنا اموالنا بقینا فقراء فانزل اللہ تعالیٰ ولا تلقوا بایدیکم الی التھلکۃ"

حضرت سعید بن مسیب اور مقاتل بن حیان رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں جب اللہ تعالیٰ نے مال خرچ کرنے کا حکم دیا تو کچھ لوگ کہنے لگے کہ ہمیں اللہ کی راہ میں مال خرچ کرنے کا حکم دیا گیا ہے لیکن ہم نے اپنے مال اگر خرچ کر دیئے تو ہم خود فقیر ہو جائیں گے تو اس وقت اللہ تعالیٰ نے نازل فرمایا ﴿وَلَا تُلْقُوْا بِاَیْدِیْکُمْ اِلَی التَّھْلُکَۃِ﴾ یعنی تمہیں یہ حکم نہیں دیا گیا کہ تم اللہ کی راہ میں سارا مال ہی خرچ کر دو خود بھوکے اور ننگے ہو جاؤ اور اپنے اہل وعیال کو بھوک کی وجہ سے ضائع کر دو بلکہ مال خرچ کرنے میں اعتدال سے کام لو کچھ مال اپنے لئے اور اپنی زوجہ اور اولاد اور اپنے ضعیف والدین کے لئے بھی رکھ لو اور کچھ اللہ تعالیٰ کی راہ میں بھی خرچ کر دو سارا مال خرچ کر کے اپنے آپ کو ہلاکت میں نہ ڈالو یہ مسئلہ اللہ تعالیٰ کے ارشادات گرامیہ سے واضح طور پر ثابت ہے:

﴿وَلَا تَجْعَلْ یَدَکَ مَغْلُوْلَۃً اِلٰی عُنُقِکَ وَلَا تَبْسُطْھَا کُلَّ الْبَسْطِ فَتَقْعُدَ مَلُوْمًا مَّحْسُوْرًا﴾ (بنی اسرائیل ۲۹ پ ۱۵)

"اور اپنا ہاتھ اپنی گردن سے بندھا ہوا نہ رکھ اور نہ پورا کھول دے کہ تو بیٹھ رہے ملامت کیا ہوا تھکا ہوا"

﴿وَالَّذِیْنَ اِذَا اَنْفَقُوْا لَمْ یُسْرِفُوْا وَلَمْ یَقْتُرُوْا وَکَانَ بَیْنَ ذٰلِکَ قَوَامًا﴾

"اور وہ کہ جب خرچ کرتے ہیں نہ حد سے بڑھیں اور نہ تنگی کریں اور ان دونوں کے درمیان اعتدال پر رہیں"

(از شیخ زادہ)

اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کے چند اوصاف ذکر فرمائے ان میں یہ بھی ذکر کیا کہ وہ خرچ میں اعتدال رکھتے ہیں نہ حد سے زیادہ مال خرچ کرتے ہیں اور نہ ہی کنجوسی سے کام لیتے ہیں لیکن راقم کا موقف یہ ہے کہ یہ عام نیک لوگوں کا وصف ہے البتہ وہ حضرات جو تقوی میں بہت بلند مقام رکھتے ہیں اور اللہ تعالیٰ پر کامل توکل رکھتے ہیں وہ اللہ تعالیٰ کی راہ میں سارا مال بھی خرچ کر دیں تو یہ ان کی شان ہے جیسا کہ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے سارا مال نبی کریم ﷺ کی خدمت میں غزوہ (جہاد) کی تیاری کے لئے پیش کر دیا۔ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ نے ان کی اس فعل پر تعریف فرمائی:

گناہوں میں مبتلا ہو کر ہلاکت میں نہ پڑو:

"اخرج عبد بن حمید وابن المنذر وابن مردویہ والطبرانی والبیھقی فی الشعب عن النعمان بن بشیر قال کان الرجل یذنب الذنب فیقول لا یغفر اللہ لی فانزل اللہ ولا تلقوا بایدیکم الی التھلکۃ"

حضرت نعمانی بن بشیر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں جب کوئی شخص گناہ کرتا تو کہتا اللہ تعالیٰ میری مغفرت نہیں کرے گا (اس طرح وہ مزید گناہوں میں مبتلا ہوتا) تو اللہ تعالیٰ نے ان الفاظ مبارکہ کو نازل کیا ﴿ وَلَا تُلْقُوْا بِاَيْدِيْكُمْ اِلَى التَّهْلُكَةِ ﴾ اب اس کا مطلب یہ ہوگا کہ گناہوں میں مبتلا ہو کر اپنے آپ کو ہلاکت میں نہ ڈالو۔

☆ "واخرج وکیع وسفیان بن عیینۃ والفریابی وعبد بن حمید وابن جریر وابن المنذر وابن ابی حاتم والحاکم وصححہ والبیھقی عن البراء بن عازب انہ قیل لہ ﴿وَلَا تُلْقُوْا بِاَيْدِيْكُمْ اِلَى التَّهْلُكَةِ ﴾ ھو الرجل یلقی العدو فیقاتل حتی یقتل قال لا ولکن ھو الرجل یذنب الذنب فیلقی بیدیہ فیقول لا یغفر اللہ لی ابدا"

حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ سے پوچھا گیا کہ رب تعالیٰ کے ارشاد گرامی ﴿ وَلَا تُلْقُوْا بِاَيْدِيْكُمْ اِلَى التَّهْلُكَةِ ﴾ کا کیا یہ مطلب ہے۔ کہ ایک شخص دشمن سے مقابلہ کرے اور لڑائی کرتے ہوئے مقتول ہو جائے (کیا اس سے منع کیا گیا ہے کہ تم اپنے آپ کو ہلاکت میں نہ ڈالو) تو انہوں نے فرمایا نہیں بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ کوئی شخص گناہوں میں مبتلا ہو کر یہ نہ کہے کہ وہ مجھے اللہ تعالیٰ کبھی بھی نہیں بخشے گا تو وہ اور گناہوں میں مبتلا ہو کر اپنے آپ کو ہلاکت میں نہ ڈالے۔

رب تعالیٰ کی رحمت سے ناامید ہو کر اپنے آپ کو ہلاکت میں نہ ڈالو:

ابھی جو دو حدیثیں بیان کی ہیں ان کا ایک وہی مطلب ہے جو ذکر کر دیا گیا ہے جس کو اس حدیث سے تائید حاصل ہے:

" واخرج ابن جرير وابن المنذر وابن ابی حاتم عن ابن عباس قال التهلكة عذاب الله "

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ ﴿ وَلَا تُلْقُوْا بِاَيْدِيْكُمْ اِلَى التَّهْلُكَةِ ﴾ میں " التهلكة " کا معنی اللہ تعالیٰ کا عذاب ہے اور دوسرا مطلب یہ ہے جواب عنوان قائم کیا ہے کہ کوئی شخص گناہ کر کے یہ نہ کہے کہ اللہ تعالیٰ کبھی بھی مجھے نہیں بخشے گا یہ رب تعالیٰ کی رحمت سے ناامیدی ہے جو انسان کو ہلاکت میں ڈال دیتی ہے اس لئے توبہ کرے اور رب تعالیٰ کی رحمت کی امید رکھے کہ وہ مجھے بخشے گا اس مسئلہ کو اس حدیث سے تائید حاصل ہے۔

" واخرج وكيع وعبد بن حميد وابن جرير عن عبيدة السلمانی فی قوله ﴿وَلَا تُلْقُوْا بِاَيْدِيْكُمْ اِلَى التَّهْلُكَةِ﴾ قال القنوط "

عبیدہ سلیمانی رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کے ارشاد گرامی ﴿ وَلَا تُلْقُوْا بِاَيْدِيْكُمْ اِلَى التَّهْلُكَةِ ﴾ کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی رحمت سے ناامید ہو کر اپنے آپ کو ہلاکت میں نہ ڈالو۔

(ماخوذ از در منثور)

مال کم سمجھ کر، خرچ نہ کر کے ہلاکت میں نہ پڑو:

" قال ابن عباس انفق فی سبيل الله وان لم يكن ذلك الاسهم او مشقص ولا يقولن احدكم لا اجد شيئا "

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ اللہ کی راہ میں مال خرچ کرو اگرچہ سوائے ایک تیر یا تیر کی نوک کے تمہارے پاس اور کچھ نہ ہو تم میں سے کوئی ایک یہ نہ کہے کہ میں کچھ نہیں پاتا۔ اب مطلب یہ ہو گیا کہ مال کو تھوڑا سمجھ کر اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ کرنا چھوڑ کر اپنے آپ کو ہلاکت میں نہ ڈالو

" ونحوه عن السدی انفق ولا عقالا ولا تلقی بيدك الی التهلكة

فتقول لیس عندی شئی "

حضرت سدی رحمہ اللہ فرماتے ہیں اللہ تعالیٰ کی راہ میں مال خرچ کرو خواہ تمہارے پاس اونٹ کی ایک رسی ہو تو وہی اللہ تعالیٰ کی راہ میں دے دو لیکن یہ کہہ کر کہ "میرے پاس دینے کے لئے کوئی چیز نہیں" اپنے آپ کو ہلاکت میں نہ ڈالو۔ (قرطبی)

اپنی اولاد کی فکر میں مال خرچ نہ کر کے ہلاکت میں نہ پڑو:

حضرت حذیفہ بن یمان اور حضرت ابن عباس اور حضرت عکرمہ اور عطا اور مجاہد اور جمہور حضرات نے یہ معنی بھی تحریر فرمایا ہے:

" لا تلقوا بایدیکم بان تترکوا النفقة فی سبیل الله وتخافوا لعیلة فیقول الرجل لیس عندی ، والی هذا ذهب البخاری "

اپنی اولاد کی فکر میں اللہ تعالیٰ کی راہ میں مال خرچ کرنا چھوڑ کر اور یہ کہہ کر کہ میرے پاس دینے کے لئے کچھ نہیں اپنے آپ کو ہلاکت میں نہ ڈالو بخاری رحمہ اللہ نے بھی یہ معنی لیا ہے۔

ثواب سے محروم ہو کر ہلاکت میں نہ پڑو:

" لا تمسکوا اموالکم فیرثها منکم غیرکم فتهلکوا بحرمان منفعة اموالکم ومعنی آخر ولا تمسکوا فیذهب علکم الخلف فی الدنیا والثواب فی الآخرة "

اپنے مال روک کر اور اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ نہ کر کے اپنے آپ کو دنیاوی منافع اور اخروی ثواب سے محروم کر کے اپنے آپ کو ہلاکت میں نہ ڈالو کیونکہ وہ تمہارا مال تمہارے پیچھے رہ جانیوالے ورثاء سمیٹ لیں گے بلکہ دنیا میں بھی تمہیں اس مال سے محروم کرنے کیلئے مختلف ہتھکنڈے استعمال کریں گے۔

حرام مال خرچ کر کے اپنے آپ کو ہلاکت میں نہ ڈالو:

" لا تنفقوا من حرام فیرد علیکم فتهلکوا " حرام مال خرچ نہ کرو کیونکہ اگر تمہیں بھی حرام مال ہی عطا کر دیا گیا تو تم ہلاکت میں پڑ جاؤ گے اور اگر تم نے حرام مال ثواب کی غرض سے خرچ یا تو اس کے بدلے تمہیں جو جزاء حاصل ہوتی ہے وہ جزاء خیر تو ہوتی نہیں اس لئے تم اپنے آپ کو ہلاکت

میں نہ ڈالو۔

جنگ میں بلاخطر کود پڑنا اس آیۃ کا مصداق نہیں:

ایک مسلمان کفار کے ایک بڑے لشکر پر حملہ کرتا ہے اس امید پر کہ میں ان پر غالب آ جاؤں گا "اذا طلبت الشهادة وخلصت النية فليحمل "اوراس کی نیت بھی خالص ہے اور شہادت کی طلب کے لئے وہ کفار پر حملہ کرتا ہے تو یہ جائز ہے۔ اگر چہ بعض حضرات نے کہا" فان لم تكن فيه قوة فذلک من التهلكة " کہ اگر کسی شخص میں اتنی طاقت نہیں کہ وہ کفار کے ساتھ مقابلہ نہیں کرسکتا تو پھر جنگ میں اکیلے شخص کا شریک ہونا اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈالنا ہے۔ (از قرطبی)

لیکن راقم کے نزدیک یہ ہلاکت میں واقع ہونا لازم نہیں آتا۔ اسی پر علامہ قرطبی اور علامہ رازی رحمہ اللہ کے دلائل ملاحظہ ہوں ایک دلیل تو علامہ رازی نے وہی بیان فرمائی جو شان نزول میں حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ کا ارشاد ذکر کیا گیا۔

☆ " الثانی روی الشافعی رضی الله عنه ان رسول الله ﷺ ذکر الجنة فقال له رجل من الانصار ارأیت یا رسول الله ان قتلت صابرا محتسبا قال علیه الصلوة والسلام لک الجنة فانغمس فی جماعة العدو فقتلوه بین یدی رسول الله ﷺ "

دوسری دلیل اس پر روایت امام شافعی رحمہ اللہ ہیں بیشک رسول اللہ ﷺ نے جنت کا ذکر فرمایا تو ایک انصاری شخص نے عرض کیا یا رسول اللہ اگر میں صبر وخلوص سے رب تعالیٰ کی راہ میں شہید ہو جاؤں تو آپ کی رائے کیا ہے؟ آپ نے فرمایا تمہارے لئے جنت ہے تو وہ شخص دشمن کی جماعت میں گھس گئے دشمن لوگوں نے ان کو رسول اللہ ﷺ کے سامنے شہید کر دیا۔ (واضح ہوا کہ بلاخطر جنگ میں کود پڑنا اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈالنا لازم نہیں آتا):

" وان رجلا من الانصار القی درعا کانت علیه حین ذکر النبی ﷺ الجنة ثم انغمس فی العدو فقتلوه "

ایک اور انصاری شخص نے رسول اللہ ﷺ سے جنت کا ذکر سنا تو انہوں نے اپنی زرہ کو اتار پھینک دیا اور دشمن کی جماعت میں گھس گئے ان لوگوں نے ان کو شہید کر دیا۔

☆ " والثالث روی ان رجلا من الانصار تخلف عن بنی معاویة فرأی الطیر عکوفا علی من قتل من اصحابه فقال لبعض من معه سأتقدم ای العدو فیقتلوننی ولا تخلف عن مشهد قتل فیه اصحابی ففعل ذلک فذکروا ذلک للنبی ﷺ فقال فیه قولا حسنا "

اور تیسری دلیل یہ ہے کہ روایت میں ہے کہ ایک انصاری شخص بنی معاویہ سے پیچھے رہ گئے ان کے کچھ دوست شہید ہو گئے انہوں نے جب شہداء احباب کے پاس پرندوں کو دیکھا تو اپنے کسی ساتھ کو کہا کہ میں دشمن سے مقابلہ کے لئے آگے بڑھ رہا ہوں دشمن اپنی کثرت کی وجہ سے مجھے شہید کر دیں گے لیکن میں اپنے احباب کے ساتھ میدان جنگ میں رہوں گا ان سے پیچھے نہیں رہوں گا۔ جب نبی کریم ﷺ کو اس کی خبر ملی تو آپ نے اس شخص کی تعریف کی حضور ﷺ کا اس کی تعریف کرنا ہی دلالت کر رہا ہے کہ جنگ میں مسلمانوں کا بلاخطر کود پڑنا ہلاکت میں ڈالنا نہیں بلکہ قابل تحسین ہے۔

☆ " والرابع روی ان قوما حاصروا حصنا فقاتل رجل حتی قتل فقیل القی بیده الی التهلکة فبلغ عمر بن الخطاب رضی الله عنه ذلک فقال کذبوا الیس یقول الله تعالیٰ ﴿وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّشْرِيْ نَفْسَهُ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ وَاللّٰهُ رَءُوْفٌ بِالْعِبَادِ﴾

(البقرة ۲۰٦ پ ۲)

اور چوتھی دلیل یہ ہے کہ ایک قوم نے ایک قلعہ کا محاصرہ کر لیا تو ایک شخص بلاخطر لڑائی میں مشغول ہو گیا یہاں تک کہ شہید ہو گیا تو اس کے متعلق بعض حضرات کہنے لگے کہ اس نے اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈال لیا ہے جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو یہ خبر ملی تو آپ نے کہا وہ جھوٹ کہتے ہیں کیا اللہ تعالیٰ نے نہیں فرمایا (ترجمہ) اور کوئی آدمی اپنی جان بیچتا ہے اللہ کی مرضی چاہنے میں اور اللہ بندوں پر مہربان ہے۔

(از کبیر)

☆ " وفی صحیح مسلم عن انس بن مالک ان رسول الله ﷺ افرد یوم احد فی سبعة من الانصار ورجلین من القریش فلما رهقوه قال من یردهم عنا وله الجنة او هو رفیقی فی الجنة فتقدم رجل من الانصار فقاتل حتی قتل ثم رهقوه ایضا فقال من یردهم عنا وله الجنة اوهو رفیقی فی الجنة فتقدم اجل من الانصار فقاتل حتی قتل فلم یذل کذلک حتی قتل السبعة "

مسلم شریف میں حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے مروی ہے بیشک رسول اللہ ﷺ احد

کے دن سات انصار اور دو مہاجرین کے ساتھ (باقی صحابہ کرام سے کٹ کر) علیحدہ رہ گئے جب کفار نے آپ کو گھیرے میں لے لیا تو آپ نے فرمایا کون وہ شخص ہے جو ہماری طرف دفاع کرے ان کو واپس دھکیل دے وہ جنت میں میرا رفیق ہوگا۔تو ایک انصاری صحابی آگے بڑھے ان سے لڑائی کی یہاں تک کہ وہ شہید ہو گئے۔ پھر ان کفار نے جب گھیرا ڈالا تو پھر نبی کریم ﷺ نے وہی ارشاد فرمایا پھر ایک انصاری صحابی آگے بڑھے جنہوں نے قتال کیا یہاں تک کہ شہید ہو گئے اسی طرح ایک ایک کر کے سات انصاری صحابی شہید ہو گئے۔

حضرت امام محمد رحمہ اللہ کی خوبصورت تفصیل:

(۱) اگر ایک مسلمان ایک ہزار کافر پر حملہ کرتا ہے اور اسے اپنی نجات کی امید ہے یا اس کا یہ خیال ہے کہ میرے حملہ سے مسلمانوں کو فائدہ ہوگا اور دشمن کا نقصان ہوگا تو یہ صورت جائز ہے۔

(۲) اور اگر اس لئے حملہ کرے کہ میرے ایک کے حملہ کرنے سے دوسرے مسلمان بھی حملہ کریں گے اور بہادری کا مظاہرہ کریں گے کہ جب ہمارا ایک بھائی اکیلے میدان جنگ میں کود پڑا ہے تو ہم کیوں پیچھے رہیں تو یہ صورت بھی جائز ہے کیونکہ مسلمانوں کا اس میں بھی نفع پایا گیا ہے۔

(۳) اور اگر دشمن کو ڈرانے کے لئے حملہ کرے کہ وہ سمجھیں کہ ایک شخص ہزار کی پرواہ نہ کرتے ہوئے اگر حملہ آور ہو چکا ہے تو دوسرے بھی جب حملہ آور ہوئے تو ہماری تباہی ہو جائیگی اس طرح ان کے دلوں پر رعب طاری کرنے کے لئے حملہ کرنا بھی جائز ہے۔

(۴) جب مسلمانوں کا کامل نفع ہو اور دین کو عزت وعظمت حاصل ہو اور کفار کو ذلت حاصل ہو تو اس صورت میں اس شخص کا اپنی جان قربان کا قابل مدح ہے ایسے حضرات کی شان میں ہی فرمایا:

﴿ اِنَّ اللّٰهَ اشۡتَرٰى مِنَ الۡمُؤۡمِنِيۡنَ اَنۡفُسَهُمۡ وَاَمۡوَالَهُمۡ بِاَنَّ لَهُمُ الۡجَنَّةَ يُقَاتِلُوۡنَ فِىۡ سَبِيۡلِ اللّٰهِ فَيَقۡتُلُوۡنَ وَيُقۡتَلُوۡنَ ﴾ (التوبة ۱۱۱ پ ۱۱)

"بیشک اللہ نے مسلمانوں سے ان کے مال اور جان خرید لئے ہیں اس بدلے پر ان کے لئے جنت ہے اللہ کی راہ میں لڑائیں تو ماریں اور شہید ہو جائیں۔

(۵) اگر ایک شخص ہزار پر حملہ کرتا ہے جس سے مسلمانوں کو کوئی فائدہ نہیں ہوتا تو یہ شہید ہو جاتا ہے

اگر چہ شہادت بذاتہ باعث اجر وثواب ہے لیکن اس لئے مکروہ ہے کہ کم از کم ایسی صورت کو اختیار کرنا جس سے مسلمانوں کو نفع حاصل ہوتا کافروں کو ذلت حاصل ہوتی پھر یہ شہید ہوتا تو زیادہ بہتر تھا۔

(از قرطبی)

فائدہ : اسی سے یہ فائدہ بھی حاصل ہو گیا جو فقہاء کرام نے تحریر فرمایا ہے کہ جب مسلمانوں کا حاکم یہ دیکھے کہ ابھی ہمیں شکست نظر آتی ہے تو وقتی طور پر جنگ کو ٹال دے اور تیاری کر کے جنگ کریں لیکن ہمیشہ خرگوش کی نیند نہ سو جائیں اور غفلت میں وقت نہ گزاریں اور ہمیشہ ہی کافروں سے شر کر وقت نہ گزاریں یعنی نہ ہی اپنے آپ کو ہلاکت وتباہی میں ڈالیں اور نہ ہی ہمیشہ کے لئے خوف وہراس میں رہیں۔

وَاَحۡسِنُوۡا اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الۡمُحۡسِنِيۡنَ :

''اور احسان کرو بیشک اللہ تعالیٰ محبت کرتا ہے احسان کرنے والوں سے'' احسان کے دو معنی ہیں:

" احدهما فعل فعلا حسنا في نفسه سواء تعدى نفعه الى غيره اولا "

احسان کا پہلا معنی یہ ہے کہ اچھا فعل کرنا خواہ اس کا نفع غیر کو پہنچے یا نہ پہنچے اس معنی کا لحاظ پر جس شخص نے نماز ادا کی اور روزہ رکھا اور کوئی نیکی کا کام کیا اس کے متعلق کہا جا سکتا ہے ''احسن الرجل'' فلاں شخص نے احسان کیا یعنی اچھا عمل کیا۔ (شیخ زادہ) اسی معنی کے لحاظ سے بعض صحابہ کرام سے مروی ہے کہ رب تعالیٰ کے ارشاد کا مطلب یہ ہے " **احسنوا في اعمالكم بامتثال الطاعات** " کہ اپنے عمل اچھے کرو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کے احکام کو تسلیم کرو اور ان پر عمل کرو۔ (قرطبی)

یہ معنی ماخوذ ہے " **الاحسان هو فعل الحسن** " سے یعنی اچھا کام۔ اسی معنی کے لحاظ پر یہ بھی کہا جا سکتا ہے " **فالضرب والقتل اذا حسنا كان فاعلهما فحسنا** " ضرب اور قتل جب اچھے ہوں تو ان پر عمل کرنے والے کے متعلق بھی یہ کہا جائے گا کہ وہ احسان کر رہا ہے:

" واخرج ابن جرير عن رجل من الصحابة في قوله واحسنوا قال ادوا الفرائض "

ایک صحابی سے مروی ہے کہ " احسنوا " کا مطلب یہ ہے کہ فرائض ادا کرو۔

" واخرج عبد بن حميد وابن جرير عن عكرمة في قوله ﴿ وَاَحۡسِنُوۡا

اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ الْمُحْسِنِیْنَ ﴾ قال احسنوا الظن باللّٰہ "

حضرت عکرمہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ ﴿وَاَحْسِنُوْا اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ الْمُحْسِنِیْنَ ﴾ کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ پر اچھا گمان کرو کہ تم نیک عمل کرو اور اللہ تعالیٰ پر اچھا گمان کرو کہ وہ تمہیں جزاء عطا فرمائے گا۔ (درمنثور)

اسی معنی کے لحاظ پر ایک حدیث پاک کے یہ الفاظ گرامی بھی مدنظر رہیں:

" قال (یعنی جبرائیل) اخبرنی عن الاحسان قال (علیہ السلام) ان تعبد اللّٰہ کانک تراہ فان لم تکن تراہ فانہ یراک (یعنی بالحضور والخشوع)

جبریل علیہ السلام نے نبی کریم ﷺ سے سوال کیا احسان کیا ہے؟ تو آپ نے فرمایا کہ احسان یہ ہے کہ تم اللہ تعالیٰ کی عبادت کرو (یہ تصور کرتے ہوئے) گویا کہ تم اللہ کو دیکھ رہے ہو اگر تم نہیں دیکھ رہے تو وہ تمہیں دیکھ رہا ہے یعنی حضور قلب اور خشوع سے عبادت کرو۔ عجز وانکساری سے عبادت کرنے والوں سے محبت کرتا ہے۔ ابھی تک احسان کا جو معنی بیان کیا ہے اسے الاحسان فی العبادات کہا جاتا ہے (مظہری)

احسان کا دوسرا معنی یہ ہے:

" ایصال الخیرا الی المحتاج " محتاج تک بھلائی کو پہنچانا۔ اس معنی کے لحاظ پر نماز پڑھنے یا روزے رکھنے کو احسان نہیں کہا جائے گا بلکہ صدقہ کرنا یا اور کسی طرح محتاج نفع پہنچانے کو احسان کہا جائے گا۔ (شیخ زادہ)

یہ معنی ماخوذ ہے "احسان" سے:

" فـفـاعـل الحسن لا یوصف بکونہ محسنا الا اذا کان فعلہ حسنا واحسانا معا "

اچھا کام کرنے والا اس وقت تک محسن نہیں ہو سکتا جب تک کہ اس کا کام اچھا نہ ہو اور دوسرے کو نفع نہ پہنچائے یعنی حسن اور احسان دونوں بیک وقت جس میں پائے جائیں گے وہ محسن کہلائے گا۔ (کبیر)

اسی معنی کا اعتبار کرتے ہوئے کہا جاتا " الاحسان فی المعاملات " (معاملات میں احسان) (مظہری) اب مطلب یہ ہوگا " واحسنوا فی الانفاق علی من تلزمکم مؤنت ونفقته " کہ جن لوگوں کا خرچ تمہارے ذمہ ہے تمہاری زوجہ اور اولاد اور ضعیف والدین یا محتاج رشتہ داران پر خرچ کر کے احسان کرو اور اس خرچ میں اعتدال رکھو نہ حد سے زائد خرچ کرو اور نہ ہی حد سے کم (کبیر)

احسان معاملات پر احادیث مبارکہ :

" قال رسول الله ﷺ تحب للناس ما تحب لنفسک وتکره لهم ما تکره لنفسک " (رواه احمد عن معاذ)

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تم لوگوں کے لئے وہی پسند کرو جو اپنے لئے پسند کرتے ہو اور لوگوں کے لئے وہی ناپسند کرو جو اپنے لئے ناپسند کرتے ہو۔

☆ " قال رسول الله ﷺ المسلم من سلم المسلمون من لسانه ويده ، رواه اصحاب السنن عن ابی هريرة "

رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں مسلمان تو حقیقت میں وہی ہے جس کی زبان اور جس کے ہاتھوں سے مسلمان محفوظ رہیں۔

☆ " ورواه احمد عن عمرو بن عنبسة فی جواب ای السلام افضل قال ان من احبکم الی احسنکم اخلاقا "

عمرو بن عنبسہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ سے سوال کیا گیا کون سا اسلام (اسلام کا کون سا عمل) افضل ہے؟ آپ نے فرمایا تم میں سے جس کے اچھے اخلاق ہوئے وہی مجھے محبوب ہوگا۔

" رواه البخاری عن عبد الله بن عمرو وفی الصحيحين بلفظ من خيارکم احسنکم اخلاقکم "

بخاری ومسلم نے روایت ذکر کی جو بخاری میں حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جو شخص تم میں سے اچھے اخلاق رکھتا ہو وہی تم میں سے بہتر ہے۔

☆ " قال رسول الله ﷺ ان الله کتب الاحسان علی کل شئی فاذا قتلتم فاحسنوا

القتلة واذا ذبحتم فاحسنوا الذبحة ولیحد احدکم شفرته ولیرح ذبیحته"

(رواہ مسلم)

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا بیشک اللہ تعالیٰ نے ہر چیز پر احسان کرنے کا حکم فرمایا اس لئے جب تم کسی کو قتل کرو تو اچھے طریقہ سے قتل کرو (یعنی ان کے اعضا نہ کاٹو شکل نہ بگاڑو اور جب (قصاص وغیرہ کے طور پر) قتل کرو تو پھر بھی تیز دھار آلہ سے قتل کرو کند آلہ سے تکلیف نہ پہنچاؤ) اور جب جانور کو ذبح کرو تو اس پر ذبح میں احسان کرو یعنی تم اپنی چھری کو تیز کرلو اور اپنے ذبیحہ (ذبح ہونے والے جانور) کو راحت پہنچاؤ۔ (مظہری)

تنبیہ: جتنے معانی احسان کے بیان کیے گئے ہیں وہ تمام ہی ﴿ اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ الْمُحْسِنِیْنَ ﴾ میں اسی ترتیب سے مراد لئے جائیں یعنی عبادات ومعاملات میں احسان کرنے والوں کو اللہ تعالیٰ پسند فرماتا ہے۔

مخالفین جہاد کے اعتراضات:

مخالفین اسلام تعصب وعناد سے جہاد کے متعلق یہ اعتراض کر کے اسلام پر دھبہ لگاتے ہیں

۱) پہلی کتب میں اخوت اور محبت اور عفو کا سبق دیا گیا ہے انجیل میں ہے "جو تیرے گال پر ایک طمانچہ مارے تو اس کی طرف دوسرا گال کردے اور جو تیرا برا چاہے تو اس کی بھلائی چاہ۔ لیکن قرآن واسلام سے اس سے خالی ہے بلکہ اس کا حکم پہلے انبیاء کرام کی تعلیمات کے خلاف ہے۔

۲) تمام انبیاء کرام کی تعلیمات کے خلاف قرآن نے بزور شمشیر اسلام پھیلانے کا حکم دیا جو اسلام نہ لائے اس کو بے رحمی سے قتل کردیا جائے اور قیدیوں کو غلام بنالیا جائے۔

۳) جہاد کے مسئلہ نے مسلمانوں کو غیر مذہب والوں پر ظلم وستم کی اجازت دے دی حالانکہ کفار کے ممالک میں مسلمان بھی آزادی سے حفاظت میں رہتے ہیں۔

یہ اعتراضات یورپ کے مخالفین اسلام اور ان کے مرید مشنری یعنی نام نہاد روشن دماغ جہاد اور اسلام اور قرآن پاک اور نبی کریم ﷺ پر کرتے ہیں۔

جواب: یہ کہنا ہی لغواور باطل ہے کہ پہلے انبیاء کرام نے جہاد نہیں کیا یا کفار اور بدطینت لوگوں کی بربادی کے لئے دعا نہیں کی موسیٰ علیہ السلام کا بنی عمالقہ سے جہاد کرنا اور حضرت حزقیل علیہ السلام اور حضرت سمویل علیہ السلام کا جہاد کرنا بہت واضح طور پر ثابت ہے نوح علیہ السلام اور کئی انبیاء کرام کا اپنی کافر قوم کی بربادی کے لئے دعا کرنا بھی بہت ہی روز روشن کی طرح ثابت ہے۔

کیا کسی قاتل، چور اور ڈاکو کو سزا دینا یہود و نصاریٰ اور ان کے ہمنواؤں کے نزدیک جرم ہے؟ کیا انہوں نے کبھی سزائیں نہیں دیں؟ جب وہ بھی سزائیں دیتے ہیں تو صرف اسلام پر اعتراض کیوں؟

ذرا ماقبل اوراق پر نظر دوڑائیں تو آپ کو راقم کی بیان کردہ بحث سے واضح ہو جائے گا کہ اسلامی جہاد اور کافروں کی جنگوں میں کتنا عظیم فرق ہے۔ اسلام نے جنگ میں بھی بچوں، بوڑھوں اور عورتوں پر رحم کرنے کا حکم دیا۔ مقتولین سے بھی اچھا سلوک کرنے کا حکم دیا اور کفار نے مسلمانوں کو تباہ و برباد کرنے کا ہمیشہ ہی منصوبہ بنایا اور اسی پر عمل کیا۔ کوئی مسلمان حاکم ڈر کے مارے جرات نہیں کر سکتا کہ وہ یہ کہے کہ دہشت گرد تو تم ہو مسلمانوں کو دہشت گرد کیوں کہتے ہو؟ ستم بالائے ستم یہ ہے کہ مسلمان بھی ان کے ساتھ مل کر مسلمانوں کو ہی دہشت گرد کہہ رہے ہیں۔

اسلام چند صورتوں میں جہاد کا حکم دیتا ہے:

اول یہ کہ مخالفین اسلام مسلمانوں کے ملک اور مساجد پر قبضہ کرنے کے ارادہ سے حملہ آور ہوں اور مسلمان پر چڑھائی کریں جیسا کہ احزاب کی جنگ میں کفار سے جہاد کرنا اور اپنا دفاع کرنا فرض کیا گیا۔

دوم یہ کہ کسی جگہ مسلمان اور کافر قدیم وقت سے ملے جلے رہتے ہیں اور پھر کفار مسلمانوں کو مذہبی رسوم و عبادات پر عمل کرنے کی اجازت نہ دیں تو ایسی صورت میں وہاں رہ کر کفار سے مقابلہ کر سکیں تو مقابلہ کر کے اپنی مذہبی آزادی حاصل کر کے رہیں لیکن کفار سے جب ان کے ملک میں رہتے ہو مقابلہ ممکن نہ ہو تو وہ وہاں رہ کر اپنے اسلام شعار کو نہ چھپائیں بلکہ وہ وہاں سے ہجرت کر لیں جیسے صحابہ کرام نے مکہ مکرمہ سے مدینہ منورہ میں ہجرت کر لی جب مذہبی آزادی کوئی چھیننے کی کوشش کرے تو وہاں سے ہجرت کرنا ضروری ہو جاتا ہے۔

سوم مسلمان اپنی شان وشوکت اور سامان حرب وقتال بہم پہنچا کر اپنے آس پاس کے بادشاہوں اور قریب وبعید ملکوں کو دین حق کی منادی کریں اور بت پرستی اور دیگر بری عادات ترک کرنے اور فطرت اسلامیہ کے مطابق ان کو عمل کرنے کے متعلق کہیں۔

اسی عظیم مقصد کے لئے اللہ تعالیٰ نے انبیاء کرام کو معبوث فرمایا اور اسی مقصد عظیم کے لئے نبی کریم ﷺ تشریف لائے اسی پر آپ علم کے وارث علماء کرام تا قیامت عمل کرتے رہیں گے۔ اگر کفار امر حق اختیار کرلیں اور فساد سے باز آئیں تو ان سے کچھ نہ کہا جائے ورنہ اللہ کا نام لے کر مسلمان اس طرح حملہ کریں جیسے صحابہ کرام جہاد کرتے رہیں۔

یہود ونصاری اپنے گریبان میں جھانک کر دیکھیں:

اور جو نا انصاف یہود ونصاری اب بھی اعتراض سے باز نہ آئیں اور ملحدانہ طور سے کہیں کہ قران نے ریلجس لبرٹی اور کانشنس کا ستیاناس کر دیا اور مذہبی آزادی کو باقی نہ رکھا اور آسمانی حقوق کے لئے کیوں تلوار اٹھائی اور کیوں کافروں پر قہر وغضب کیا تو وہ پہلے بائبل اور اپنی دینی پیشواؤں پر بھی اعتراض کریں جنہوں نے مذہبی جنگیں قائم کیں اور جنہوں نے کفار سے عہد باندھنے کی سخت ممانعت کردی۔

توراۃ سفر خروج باب نمبر ۲۲ اور درس نمبر ۱۸ میں ہے، تو جادوگرنی کو جینے مت دے جو کوئی چار پائے سے مباشرت کرے مارا جائے جو کوئی خدا کے سوا اور معبود کی عبادت کرے مارا جائے عذاب دے کر۔ پھر باب نمبر ۱۷ میں ذکرہ قوم عمالیق سے جنگ کی اور نسل درنسل ان سے جنگ کرنے کا حکم دیا۔

پھر باب نمبر ۳۳ میں خدا کا کفار سے دشمنی رکھنا اور تمام کفار کی ہلاکت کا وعدہ کرنا اور ان سے معاہدہ کرنے کی سخت ممانعت مذکور ہے۔ پھر باب نمبر ۳۲ میں بسبب گوسالہ پرستی کے بھائی کو بھائی اور دوست کو دوست کے ہاتھ سے قتل کرنے کا حکم اور نیز ہزاروں کا قتل بھی مذکور ہے۔ پھر کتاب استثناء کے باب نمبر ۲ میں ''حسبوں کے بادشاہ موری سے جنگ کرنے کا حکم'' مذکور ہے۔ پھر باب نمبر ۳ میں عوج کو اس کی تمام قوم سمیت قتل کرنے کا ذکر ہے جس میں ان کی عورتیں اور معصوم بچے بھی بحکم خدا قتل کئے گئے اس طرح کے سینکڑوں مقامات میں یہود کی مذہبی کتاب میں قتال کا ذکر ہے۔

اب عیسائیوں کے بزرگوں کی طرف آیئے۔ قسطنطین اعظم نے عیسوی چوتھی صدی میں مذہبی قتل عام کیا پھر ایرین چرچ نے مقلدین اتناسیس کو کس بے رحمی سے افریقہ میں قتل کیا۔ اور ''روس چرچ کر'' نے جرمن و برطانیہ وفرانس میں اور اٹلی کے شمال میں ایلس کے پہاڑوں میں دریا خون خاص مذہب کے لئے ہی بہائی۔ اسٹریا میں تیس برس تک مذہبی جنگ رہی۔ ملک فرانس میں چارلس نہم عیسائی نے تین لاکھ پراٹسٹنٹ کو بے رحمی سے قتل کیا۔

پھر یہ دیکھئے کہ کوئن میری اور لوئیس چہاردہم نے کیسا قتل عام مذہب کے لئے کیا اور ہنری ششم شاہ انگلستان نے کاتھولیک لوگوں قتل کر کے مذہب پراٹسٹنٹ پھیلایا۔ پھر انگلستان میں ایک سو تیس برس تک پراٹسٹنٹوں نے اپنا مذہب جاری کرنے کے لئے کیسے کیسے ظلم وستم کئے پھر جان کالوں نے شاہ سروئیس کو ترغیب دی کہ جو ہمارے مذہب کو نہ مانے قتل کیا جائے۔ پھر اسپین میں مسلمانوں پر پادریوں نے کیا کچھ جوروستم نہ کئے؟

پھر ہندوؤں میں ویدوں اور بدمذہب والوں میں سالہا سال تک کیسے کیسے قتل عام ہوئے اگر مذہبی آزادی خدا کا حکم ہے تو ان نام نہاد روشن دماغوں نے یہ قتل عام کیوں کئے ا؟ کے لئے سب کچھ جائز تھا اور صرف مسلمانوں کے لئے ناجائز ہے کیا ان کی طرف سے عدل تھا اور مسلمانوں کی طرف سے ظلم ہے۔ کیا اب بھی یہود ونصاری بنی نوع انسان کو اپنا غلام بنانے کے لئے طرح طرح کے جابجا مظالم نہیں ڈھا رہے۔

کیا مسلمانوں کو اور اسلام کو بزعم خویش مٹانے کے لئے وہ فلسطین، عراق، افغانستان، کشمیر اور چیچنیا میں ظلم نہیں کر رہے انسانی ہمدردی کا جھوٹا ڈھنڈورا پیٹنے والے مسلمانوں کو دہشت گردی کا الزام لگا کر دہشت گردی کر رہے ہیں بے جان مسلمان حکمران، ڈرپوک، خوف زدہ ان درندوں کا نام سن کر کانپ رہے ہیں اور ان کے ہمنوا بن کر جہاد کو دہشت گردی کہہ رہے ہیں۔ تُف تمہاری عقل پر۔

(ماخوذ از حقانی بتصرف)

☆☆☆☆☆